

دل پھولوں کی بستی



نگہبخت عبداللہ



نگہت عابدی

خواتین ڈائجسٹ
اردو بازار کراچی

دل پھولوں کی بستی

صبح کے لیے کپڑے استری کرتے ہوئے اُس نے اچانک جھجھانے والی خاموشی کو محسوس کیا اور بالکل غیر ارادی طور پر سر اٹھانے کے لیے جھٹکے کو دیکھنے لگی۔ اصل میں سارا ہنگامہ اوپر برہا تھا اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہی بڑے بھینا اور بھائی کا آپس کا جھگڑا جس نے سارے گھر کا سکون غارت کر رکھا تھا۔ اور دونوں میں سے کسی کو احساس نہیں تھا حالانکہ شادی کو نو دس سال ہو چکے تھے۔ ایک ہی پختہ فیملی جو کہ سات آٹھ سال کا تھا۔ اُس کی خاطر بھی دونوں آپس میں کھجھوٹا کرنے کو تیار نہیں تھے۔ بڑے بھینا اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے اور بھائی اپنی ضد چھوڑنے کو تیار نہیں تھیں۔ اماں جی اور ابا جی بھائی کو تو کچھ نہیں کہتے تھے البتہ بڑے بھینا کو سمجھانے میں انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور بتا نہیں کیوں ماں باپ کی ہر بات پر سر جھکانے والے بڑے بھینا ایک یہی بات مان کے نہیں دے رہے تھے۔ سر جھکا کر عاجزی سے کہتے۔

”ابا جی! آپ اس معاملے میں نہیں بولیں“

حالانکہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ اصل میں بھائی بہت بڑے گھر کی تھیں۔ زمانہ طالب علمی میں ہی غالباً ان کی بھینا کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی اور شادی کا پیغام بھی ان کی ہی طرف سے آیا تھا اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ بڑے بھینا تھے ہی بہت لائق فائق۔ غمی اور بہت ہندو سم۔ اس کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو بھی بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ماں باپ۔ ان سے چھوٹے میں بھائی، غمیل، شکیل، عدیل اور ایک بہن آسیہ۔ گو کہ اُس وقت ابا جی بھی ملازمت کرتے تھے اور ڈیڑھ دو سال میں ان سے چھوٹے غمیل بھی ابا کا سہارا بننے والے تھے۔ ایسے میں اگر بھینا چاہتے تو اپنا الگ گھر بنا سکتے تھے لیکن ایک توان میں خود غرضی نہیں تھی دوسرے انہیں ماں باپ بہن بھائیوں کا خیال بھی تھا اور خصوصاً اپنے بھائیوں کے لیے وہ مثال بنا چاہتے تھے۔ یعنی اُن کے خیال میں اگر آج وہ اپنا گھر بنا کر الگ ہو گئے تو اپنی باری کتنے پر اُن کے بھائی بھی ایسا ہی کریں گے اور آخر میں اُن کے ماں باپ اکیلے رہ جائیں گے۔

گو یا دور اندیشی سے سوچتے ہوئے انہوں نے بھینا بھائی کو شادی سے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ کسی قیمت پر اپنے ماں باپ اپنا گھر نہیں چھوڑیں گے اور اس وقت یقیناً محبت پروری قدموں پر تھی۔ جب ہی بھینا بھائی نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ بڑے بھینا سے وعدہ کیا کہ وہ ہمیشہ اُن کے ساتھ اسی گھر میں خوش رہیں گی اور بس ابتدائی چند ماہ ہی انہوں نے ہنسی خوشی گزارے تھے اس

کے بعد انہیں یہ گھر بہت چھوٹا لگنے لگا۔ پہلے دیے نفلوں میں پھر واضح الفاظ میں کہ وہ یہاں نہیں رہ سکیں۔ یہاں ان کا دم گھٹتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اُس وقت وہ یعنی اسیا صلاح الدین کافی چھوٹی تھی۔ غالباً ساتویں آٹھویں میں پڑھتی تھی تب اُسے نیند بھائی کا روز بروز دواؤں چانا اور بڑے مٹھا کو تنگ کرنا سخت برا لگتا تھا اور اب جبکہ وہ میڈیکل کے آخری سال میں تھی تو اُسے بڑے مٹھا پر غصہ آتا تھا کہ آخر وہ نیند بھائی کی بات مان کیوں نہیں لیتے۔ خواجہ اپنا اپنی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ کم از کم نیند کا ہی خیال کریں۔ بے جا راجہ ہر روز کے جھگڑوں سے کیسا سہم کر رہ گیا ہے۔ نیند بھائی کے بچوں کی طرح شرارتی ہے۔ اُن کی طرح ہنستا کھیلتا ہے پتا نہیں پڑھائی میں کیسا ہے۔ وہ سوچتے ہوئے استری شدہ کپڑے پہن کر رہی تھی کہ میمونہ بھائی دروازے سے جھانک کر آہستہ آواز میں پوچھنے لگیں۔

”اے۔ چائے پیو گی؟“
اُس نے چونک کر دیکھا اور اُن کے سرگوشیانہ انداز پر ہنس کر کہہ دی۔

”مزدور ہوں گی لیکن کیا چائے پینے پر پابندی لگ چکی ہے؟“

”نہیں تو؟ میمونہ بھائی کا انداز نہ سمجھنے والا تھا۔“

”پھر اپنی رازداری سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”ابھی بتائی ہوں، پہلے چائے لے لوں گی۔ میمونہ بھائی کہتے ہوئے وہیں سے پلٹ گئیں۔ کچھ دیر بعد دو گنگ لے کر آئیں اور انکے اُسے ہنسا کر کہنے لگیں۔

”جیسے تم رازداری کہہ رہی ہو وہ خوف ہے۔“

”کیسا خوف؟“
”لوٹنا نہیں تم نے۔ ابھی اوپر کتنا شور تھا۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ آج نیند بھائی کچھ زیادہ ہی غصے میں تھیں۔“

میمونہ بھائی ابھی بھی آواز دبا کر بول رہی تھیں۔ قصداً وہ خدا سا ہنسی پھر اُن کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔
”یہ اُن کا معاملہ ہے بھائی! آپ کیوں ڈر رہی ہیں۔ پھر یہ تو روز کا معمول ہے۔ اتنے سالوں سے آپ خود دیکھ رہی ہیں اور اب تک تو آپ کو عادی ہو جانا چاہیے۔“

”عادی تو میں ہو چکی ہوں اور اتنی کم از کم کسی دن اُن کا جھگڑا نہ ہو تو مجھے تشویش ہونے لگتی ہے۔“
”اپنی بات پر میمونہ بھائی خود ہی ہنسی پھر کہنے لگیں۔“ نیند بھائی تو تکلیف کیا ہے۔ انا جتنے پورے سہرا پرورش انہیں دے دیا ہے۔ ہم لوگوں سے تو بالکل الگ تھلک ہی ہیں پھر اُن کا الگ گھر کا مطالبہ

پر میری سمجھ میں نہیں آتا۔“
”ان کا مسئلہ الگ گھر نہیں ہے بھائی! اصل بات یہ ہے کہ وہ ہمارے ماحول میں ایڈجسٹ ہی نہیں ہو پائیں۔“

”ہے تو یہ حقیقت لیکن سچ یہی ہے کہ وہ آزادی چاہتی ہیں۔“
”وہ تا سب بھرے انداز میں سیدھی سادی میمونہ بھائی کو سمجھاتے ہوئے کہنے لگی۔

”کلب، پارٹیز، آواز مردوں سے میل جول یہ ساری باتیں ہمارے ہاں محبوب سمجھی جاتی ہیں اور نیند بھائی یہاں رہ کر یہ سب نہیں کر پائیں۔ اس لیے الگ گھر چاہتی ہیں۔ وہ بھی ہم سے بہت دور۔“
”لیکن جتنا اُن کی شادی کو نو دس سال ہوئے ہیں۔ پھر بچے کی مال بھی ہیں۔“

”یہ ساری باتیں ہم، ہمارے طبقے کی عورتیں سوچتی ہیں بھائی۔ انہیں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ آپ نے اُن کے انداز نہیں دیکھے اور اسرار نہیں کہیں سے بھی شادی شدہ عورت لگتی ہیں؟“ میمونہ بھائی نفی میں سر ہلا دیں۔

”اُن کی نگاہوں میں نیند بھائی کا سراپا سایا ہوا تھا۔ اب وہ موضوع بدلنے کی خاطر پوچھنے لگی۔
”نیند بھائی اور بچے سوچتے کیا؟“

”نہیں، غلیل دونوں کو، ہوم ورک کر رہے تھے۔ میمونہ بھائی کو جیسے ہی احساس ہوا کہ وہ اتنی دیر سے یہاں بیٹھی ہیں۔ فوراً چائے کے خالی مگ اٹھا کر کھڑی ہو گئیں تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”آپ تو کبھی ہوم ورک کرنا ہے؟“
”نہیں میرا آج کا ہوم ورک ختم ہو گیا۔“ میمونہ بھائی ہنستی ہوئی چلی گئیں تو کچھ دیر تک وہ اُن کے بارے میں سوچتی رہی پھر اپنی کتابیں لے کر بیٹھ گئی۔

صبح کا ذہن بک وقت شاہ سکندر جات نے اُٹھتے ہی کھرکی کے پردے سمیٹ دیے اور تازہ ہوا میں چند گہرے سانس لینے کے بعد واش روم کا رخ کیا۔ اُسے تیار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی تھی اور کم وقت میں ہی اُس کی تیاری بھر پور ہوتی تھی۔ ٹھیک بندہ منٹ بعد قدامت آئینے میں اُس نے خود پر بس ایک نظر ڈالی۔ آسمانی شلوار سوٹ پر سیاہ ڈیسٹ کوٹ نے اُس کی وجاہت میں اضافہ کر دیا تھا۔ قیمتی رسٹ وائچر کمانی پر سجتا ہوا اپنے کمرے سے نکل کر بابا جان کے کمرے میں آیا تو جا نماز پر بیٹھے ہوئے بابا جان نے آہٹ پر گردن موڑ کر اُسے دیکھا۔

”السلام علیک بابا جان! اُس نے مؤذناں سلام کیا۔

”جیتے۔ ہو۔ کہاں کی تیاری ہے؟“ دعا دینے کے ساتھ ہی بابا جان نے پوچھا۔

”میں ایک کام سے کراچی جا رہا ہوں۔ آپ کوئی کام ہو توں تکیئے؟“

”کراچی تا تو کوئی کام نہیں ہے البتہ زمینوں پر جانا تھا۔ کم تک لوٹو گے؟“

بابا جان نے قدر سے سوچتے ہوئے انداز میں کہتے ہوئے اُس سے واپسی کا پوچھا۔

”شاید شام تک۔“

”یقین سے کہو تو پھر ہم کل تمہارے ساتھ چلیں گے ورنہ اُن ہارون کو بھیج دیتے ہیں۔“
”اگر میرا آپ کے ساتھ جانا ضروری ہے تو پھر میں یقیناً شام تک آ جاؤں گا۔“ اُس نے کہا تو بابا جان ہنس کر بولے۔

”ٹھیک ہے۔ ہم کل چلیں گے۔“

”مجھے اجازت ہے؟“

”ہوں۔ اپنی بی بی جان سے پوچھ لو۔ انہیں شہر سے کوئی کام ہو تو۔“

”بی بہتر۔“

وہ انہیں سلام کرتے ہوئے کمرے سے نکل آیا۔ پھر بی بی جان سے بہت غلٹ میں بات کر کے باہر آیا تو مورچہ طلوع ہو رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی کمرے لینڈ کروزر میں کراچی جا رہا تھا اور اُسے اپنا تو کوئی کام نہیں تھا بلکہ اُس کے دوست احمد حسن کی بہن کو کچھ ممبروں کی کمی کے باعث میڈیکل میں ایڈمیشن جنس مل رہا تھا اور احمد حسن نے سفارش کے طور پر اُسے بلایا تھا۔ وہ کیونکہ وعدہ کر چکا تھا اس لیے آج اُس کا جانا ناگزیر تھا۔ پھر ویرت کا معاملہ تھا ورنہ اپنے معمولی کاموں کے لیے وہ خود زحمت نہیں کرتا تھا۔ بہر حال تین گھنٹے کا سفر ڈھائی گھنٹے میں طے کر کے وہ احمد حسن کے گھر پہنچا تو وہ منتظر تھا۔ اور چاہتا تھا کہ پہلے اُس کی کچھ خاطر مدارت کرے لیکن وہ منع کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں احمد حسن! جو ضروری کام ہے پہلے وہ کر لینا چاہیے۔ تم چلو گے یا؟“

”میں چل رہا ہوں۔ احمد حسن فوراً دوسری طرف سے آ کر اس کے برابر بیٹھ گیا تو اس نے گاڑی آگے بڑھادی پھر پوچھنے لگا۔

”گھر میں سب تیز ریت ہے ناں؟“

”اللہ کا شکر ہے۔ جس دن نائڈ نے ایڈمیشن نہ ہونے کی وجہ سے رو رو کر برا حال کیا ہوا ہے۔“

احمد حسن نے بتاتے ہوئے اُسے یوں دیکھا جیسے اس کی طرف سے کوئی یقین چاہتا ہو لیکن اُس نے قہراً خاموشی اختیار کر لی۔ اور جب اُس کا کام ہو گیا یعنی نالندہ کا ایڈمیشن تب مسکرا کر بولا۔

”میرا خیال ہے۔ نالندہ کے لیے یہ بڑی خوشخبری ہوگی۔“
 ”واقعی وہ تو خوشی سے باہل ہو چلے گی۔ نالندہ کی خوشی کے خیال سے احمد حسن خوش ہو کر بولا۔“
 ”جلد پھر اُس روٹی ہوئی تو کی کوئی ہنسائیں؟“ اُس نے کہا پھر معاً خیال آئے پر رک کر بولا۔ ”ایسا کرو احمد حسن تم جا کر نالندہ کو خوشخبری سننا اور اُس سے کہنا اپنے ہاتھوں سے میرے لیے شامی کباب بنا رکھے۔ میں دوپہر کے کھانے تک پہنچ جاؤں گا۔“

”ابھی کہاں جا رہے ہو؟“ اُس کے غصے سے بھرے انداز پر احمد حسن نے فوراً پوچھا۔
 ”بی بی جان کا ایک کام ہے۔ بس منشا کر آتا ہوں۔ کہو تو نہیں ڈرا پ کرتا جاؤں؟“ اس نے گاڑی کا لالک کھولتے ہوئے پوچھا۔
 ”میں چلا جاؤں گا۔ نو پر اہم۔ بس تم یہ یاد رکھنا کہ کھانا نہیں ہمارے ساتھ کھانا ہے۔“ احمد حسن نے تاکید کرنی ضروری سمجھی۔

”یاد رکھوں گا۔ وہ مسکراتا ہوا گاڑی میں بیٹھ گیا۔“
 پھر بی بی جان کے کام سے فارغ ہو کر اُس کا دل چاہا وہیں سے واپسی کی راہ لے۔ احمد حسن سے اگلی ملاقات پر معذرت کر کے گا۔ پھر نالندہ کا خیال آیا جس نے یقیناً اُس کے لیے خاص اہتمام سے شامی کباب بنا رکھے ہوں گے۔ یوں بھی بقیہ احمد حسن وہ دور دور کر بلکان ہو رہی تھی اور اُس کے نہ جانے پھر پھر دے بیٹھ جانے کی۔ بس اُسی با خیال کر کے اُس نے واپسی کا خیال ترک کر دیا اور گاڑی احمد حسن کے گھر کے راستے پر ڈال دی۔
 دو بج رہے تھے اور اُسے واپس بھی آج ہی جانا تھا کیونکہ بابا جان سے کہہ چکا تھا۔ اسی حساب سے وہ واپسی کا سوچنے لگا کہ چار بجے تک سے پر وہ سارے چھ سات بجے تک حویلی پہنچ جائے گا۔ اور گریزوں کے دن تھے۔ سات بجے تو شام بھی پوری طرح نہیں اُترتی تھی۔ گویا وہ اطمینان سے ہو گیا اور گاڑی کی اسپید بڑھا دی تاکہ سگنل بند ہونے سے پہلے نکل جائے۔ لیکن اس سے پہلے ہی ریڈ سگنل آن ہو گیا۔ اُس نے کچھ جھجکا کر گھڑی پر نظر ڈالی پھر پلو بھی دائیں جانب گردن موڑی تو یکجہت ساری جھجکا ہٹ دوڑ ہو گئی۔ حالانکہ وہ کوئی دل چسپک شہر کا نوجوان نہیں تھا نہ ہی کسی خوبصورت لڑکی کو پہلی بار دیکھ رہا تھا اور وہ کوئی بہت زیادہ حسین و جمیل بھی نہیں تھی لیکن کوئی بات تو ضرور تھی اُس میں جو شاہ سکندر حیات کی نظر میں اُس پر معطر گئی تھیں۔ سگنل ٹرن ہو گیا۔ پیچھے گاڑیوں کے ہارن غور چلنے لگے تب اُس نے چونک کر گاڑی اگلے بڑھائی لیکن سارا دھیان وہیں رہ گیا تھا۔

پریکٹیکل کی وجہ سے آج آئے آئے میں خاصی دیر ہو گئی تھی۔ سب لوگ کھانا کھا چکے تھے کپڑے بدل کر کچن میں آگئی اور کھانا گرم کرنے لگی۔ پھر ایک پلیٹ میں سالن اور ڈاٹ پاٹ سے ایک روٹی نکال کر وہ ڈائننگ روم کے بھالے امان جی کے کمرے میں آگئی۔

”آگئیں بیٹا؟“ امان جی اُسے دیکھ کر بولیں۔
 ”جی اور دیکھ لیں، کھانا بھی کھا رہی ہوں۔ پھر آپ کہیں گی میں نے کچھ کھایا نہیں۔“ وہ ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔
 ”اتنی سی روٹی کھاؤ گی تو یہی کہوں گی؟“ امان جی نے اُس کی سمیٹ میں دینی روٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”یہ بھی بہت ہے امان جی اگر میں تو کھلنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔“ یہی نیل دروازے میں آکر پوچھنے لگا۔

”امان جی! میں آپ کے پاس سو جاؤں، ادھر ادھر سو گیا مجھے سوئے نہیں دے رہے۔“
 ”آج اور میرے پیچھے۔“ میری جان! امان جان نے پکچھارتے ہوئے نیل کے لیے بائیں پھیلا دیں اور

اُس نے کھانا چھوڑ کر نیل کو امان جی کی آغوش میں سماتے ہوئے دیکھا پھر دھیمی آواز میں پوچھنے لگی۔
 ”کیا ہوا امان جی۔ نیل بھائی کہاں ہیں؟“
 ”بیکے گئی ہوں گی۔ یعنی امان جی کو خود بتا نہیں تھا۔ اپنے طور پر فرض کر لیا۔ وہ ان کی بے بسی محسوس کرتے ہوئے نیل سے کہنے لگی۔“

”نیل بیٹا! آپ میرے کمرے میں چلے جاؤ۔ ابھی میں بھی آرہی ہوں پھر ہم مل کر سوئیں گے۔“
 ”مجھ کو کھانا بھی سنائیں گی؟“ نیل امان جی کی آغوش سے نکل کر پوچھنے لگا تو وہ اُس کا گال تھپک کر بولی۔

”کہانی رات میں۔ ابھی ہم سوئیں گے۔ جلدو شاباش۔“
 نیل دوسرے پتھوں کی طرح کبھی ضد نہیں کرتا تھا۔ جو کہ وہ امان لیا۔ پتا نہیں یہ بات اُس کی فطرت میں شامل تھی یا اپنے ماں باپ کی طرف سے نظر انداز ہونے پر عدم تحفظ کا شکار ہونے کے ساتھ اندر سے خائف تھا۔ ابھی بھی چپ چاپ جا رہا تھا تو قدرے توقف سے وہ امان جی سے کہنے لگی۔
 ”امان جی! آپ بڑے بھیا تو سمجھائیں۔ ان کے لیے بھائی کی بات مان لینا ہی بہتر ہے۔ آخر وہ کیوں اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ پیچھے کا بھی کوئی خیال نہیں؟“

”میں کیا کروں۔ اتنی دفع تو کہہ چکی ہوں۔ اور ابھی کا کہنا بھی ٹھیک ہے کہ یہاں تو نیل کو دیکھنے والے ہم سب ہیں۔ اکیلے گھر میں نیل اُسے چھوڑ کر جانے کی تب بچے کا کیا حال ہوگا؟ امان جی اس معاملے میں خاصی مجبور نظر آئیں۔“

”جیپ مشکل میں ہیں بڑے بھیا۔ پتا نہیں کیا ہوگا؟“ وہ کہتے ہوئے آنکھ کھری ہوئی۔
 ”اللہ بہتر کرے والا ہے۔“ امان جی نے گہری آہ کھینچی۔ پھر اُسے نیل کے پاس جانے کا کہا تو وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ نیل کی آنکھوں میں نیند مچھری ہوئی تھی لیکن اُس کے انتظار میں زبردستی آنکھیں کھولے ہوئے تھا۔

”کیا بات ہے جا نہ اتم سوئے نہیں؟“ وہ اس کے پاس لیٹتے ہوئے بولی۔
 ”میں آپ کا انتظار کر رہا تھا پھوپھو۔“

”سو رہی بیٹا! میں امان جی سے بات کرنے بیٹھ گئی۔ چلو سو جاؤ۔“
 وہ اُس کی پیشانی پر خوم کر رہا تھا۔ ہستہ چھیننے لگی۔ نیل فوراً سو گیا اور کچھ دیر بعد اُسے بھی نیند آگئی تھی۔
 شام میں اچانک شور سے اُس کی آنکھ کھل گئی تو وہ گھبرا کر آٹھ بیٹھی۔ دل بھی زبردور سے دھڑکنے لگا تھا کیونکہ نیند میں سے اُس کی سمیٹ اُس لیے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ سوئے ہوئے نیل کی طرف سے اطمینان کر کے کمرے سے نکل کر آئی تو ادھر سے آتی میمور بھائی نے بتایا کہ اسلام آباد سے شکیل بھائی بھائی پتھوں سمیت آئے ہیں۔ اُس نے خوش ہو کر امان جی کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی اور کمرے میں ہی اسی تیزی سے داخل ہوئی تو امان جی اُسے دیکھ کر بولیں۔

”لو آگئی! آگئی!“
 ”السلام علیکم۔“ اُس نے سلام کیا پھر پہلے بھائی سے ملی اس کے بعد بھائی کے گلے لگ گئی۔
 ”بھئی پتھوں سے تو ملو۔ اتنا یاد کرتے ہیں نہیں؟ شکیل بھائی نے کہا تو سہما بھائی سے الگ ہو کر اُس نے ٹیڈ اور اشو کو ایک ساتھ بازوؤں میں لے لیا پھر اُن سے پوچھنے لگی۔

”چچا جانا! تم دونوں میں سے کون زیادہ یاد کرتا ہے مجھے؟“
 ”دونوں؟“ پتھوں سے پہلے سہما بھائی بول پڑیں۔ ”دونوں بہت یاد کرتے ہیں تمہیں؟“
 ”اور آپ؟“ اُس نے شہزاد سے پوچھا تو سہما بھائی نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔
 ”مجھے قسمت ہی نہیں ملتی۔“ وہ ہنس پڑی۔
 تب ہی میمور بھائی چلے اور پتھوں کے لیے اسکاٹش لے کر آگئیں تو وہ اس کے بعد کے کام

سوچ کر کہے سے نکل آئی۔ پھر پہلے نبیل کو اٹھا کر اس کا منہ ہاتھ دھویا اس کے بعد خود منہ ہاتھ دھو کر سیدھا کچن کا رخ کیا۔
 شکیل بھائی ابھی چھ ماہ پہلے ہی ٹرانسفر ہو کر اسلام آباد آئے تھے۔ اس سے پہلے ہمیں کراچی میں ان کی جانب مئی اور اسی گھر میں سب کے ساتھ بہتے تھے۔ سولہ نئے بھائی کے اس گھر میں سب مل جل کر محبت سے رہتے تھے۔ جیسی کوسیا بھائی کا اسلام آباد میں دل نہیں دل لگتا تھا۔ ہر تیسرے دن ان کا فون آتا اور تنہائی کا رونا رونق مٹیں۔ لیکن کیا کرتیں مجبوراً۔ رہنا بہر حال انہیں میل کے ساتھ تھا۔ ابھی بھی شکیل بھائی آفس ٹور پر صرف دو دن کے لیے آئے تھے اور وہ بھی خد کر کے ساتھ چلی آئیں۔ رات میں شکیل بھائی، اماں جی کے سامنے باقاعدہ ان کی شکایت لے کر بیٹھ گئے۔
 "میں آفس کے کام سے آ رہا تھا اماں جی! یہ خواہ مخواہ تیار ہو گئیں۔ بتائیے دو دن میں ان کی طبیعت یہ ہو جائے گی؟"

"صرف دو دن؟ اماں جی نے تعجب سے پوچھا۔
 "جی! اس سے زیادہ ایک دن نہیں اور بچوں کے سکول کی وجہ سے انہیں یہاں چھوڑ بھی نہیں سکتا! شکیل بھائی نے کہا تو اماں جی ان کے بچلے بھائی کی طرف ذرا سی دیکھنے لگیں۔
 "کیا کرے بچی بے چاری۔ وہاں اکیلے گھبراتے ہو گی؟
 "لیجئے اب تو انہیں اور شرم دے رہی ہیں" شکیل بھائی نے سر ہٹا دیا اور سہما بھائی بننے لگیں۔
 دو دن گھر میں خوب رونق رہی۔ احمد اور سونیا بھی سمیٹے اور اشعر کے آنے سے بہت خوش تھے۔ البتہ نبیل اسی طرح جب چپ سا رہا جو کہ ان سے بڑا تھا پھر بھی وہ چاروں اس پر رعب جم رہے تھے۔
 وقت وہ بھی دیکھ رہی تھی۔ سمیٹے کہا۔
 "نبیل! تم وہاں بیٹھ جاؤ" وہ بیٹھ گیا۔ پھر اشعر نے کہا۔
 "نبیل! وہ کرسی اٹھا لاؤ" اور وہ اس کے حکم کی تعمیل میں کھڑا ہو گیا۔ بالآخر اس سے رہا نہیں گیا۔ سب کو ہلا کر ان سے کھڑا کرتے ہوئے بولی۔
 "کتنی بڑی بات ہے۔ نبیل تم سب سے بڑے اور تم لوگ بھائے اس کی عزت کرنے کے اس پر رعب جم رہے ہو!"
 "میں سمیٹا نبیل نے" سمیٹہ جلنے لگا کہنے جا رہی تھی کہ وہ فوراً لوٹ کر بولی۔
 "اول ہوں۔ نبیل نہیں۔ نبیل بھائی کہہ رہے ہیں۔ تو اس نے قدرے تعجب سے انہیں پھینک دیا۔
 "پوچھا۔"

"نبیل؟" سمیٹہ کی معصومیت جو غالباً یہ سمجھ رہی تھی کہ بڑا بھائی مارا تاخیر ہے۔
 "بالکل نہیں! اس نے سمیٹہ کو قریب بلا لیا اور بازو کے حلقے میں لے کر بولی: "نبیل بہت اچھا بچہ ہے کسی کو نہیں مار سکتا۔ آپ اسے نبیل بھائی کہو گی تو یہ آپ کا خیال رکھے گا؟"
 "اشعر! بھی؟" سمیٹہ کو فوراً چھوٹے بھائی کا خیال آیا۔
 "ہاں اشعر! بھی! احمد اور سونیا کا بھی سب کا خیال رکھے گا؟"
 "اور پھر سمیٹہ! نبیل بھائی کا خیال کون رکھے گا؟"
 آخری سی سونیا نے آخری بھاری سے پوچھا کہ وہ بے ساختہ ہنس پڑی پھر نبیل کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے بولی۔

"میں۔۔۔ بلکہ ہم سب نبیل کا خیال رکھیں گے!"
 "تجبی میمو نہ بھائی! اور سہما بھائی لاؤں سے نکلیں اور اسے بچوں میں گھرے دیکھ کر سہما بھائی ہنس

ہونے لگیں۔

"لوہر مستقبل قریب کی ڈاکٹر صاحبہ بچوں کے ساتھ کھیل رہی ہیں لا۔
 "جناب! میں ان پر دلیرانہ کر رہی ہوں لا وہ مسکرا کر بولی۔
 "ماشاء اللہ! دو دنوں میں دیکھیں کہ کیا اس کے قریب کھینچ کر بیٹھ گئیں تو اس نے پہلے بچوں کو اکام سے کھینچنے کی تاکید کی پھر ان کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔
 "تو صبح ایک جا رہی ہیں؟"

"ہاں دیکھو اپنے بھائی کو۔ ایک دن اور نہیں رگ رہے لا سہما بھائی کا بالکل جلنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ منہ بچلا کر بولی۔

"آپ نے غلطی کی ناں بھائی! اگلے مہینے بچوں کی چٹیاں ہو رہی ہیں! اب اطمینان سے آئیں۔ شکیل بھائی تو جب بھی آئیں گے ایسے ہی آئیں گے لا وہ بھائی کی تجویز کا احساس کر کے بولی۔
 "ہاں تمہارے بھائی بھی۔ ہی کہہ رہے تھے۔ خیر تم چلو ہمارے ساتھ۔ آج کل اسلام آباد کا موسم بہت اچھا ہے!"

"سہما بھائی نے محبت سے اسے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔
 "میں کیسے جا سکتی ہوں بھائی! آپ کو خیال ہے میرا آخری سال ہے۔ اس کے بعد انشاء اللہ فرار ہوؤں گی!"
 اس نے کہا تبھی نبیل بھائی انگلی میں کی رنگ بھائی اپنے مخصوص انداز میں اونچی ہیل کی ٹنگ کرتی آئیں اور میرے بالوں پر اسے ان کے قریب رک کر سہما بھائی سے پوچھنے لگیں۔
 "تم صبح جا رہی ہو؟"

"جی! سہما بھائی مختصر جواب دے کر خاموش ہو گئیں۔ تب وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔
 "پہنچیں بھائی!"

"نہیں۔ بس تم بیٹھو۔ اچھا سہما! صبح تو جب تم جاؤ گی میں سو رہی ہوں گی!"
 اس کے بعد کچھ کہا نہیں لیکن انداز کو باہمی وقت خدا حافظ کا ساتھ۔ اور جلنے لگیں کہ نبیل دیکھ کر مجھا گا کیا۔

"میں! نبیل نے ان کی ٹانگوں سے لیٹ کر پکا لا تو وہ اسے بازو سے پکڑ کر پرے دھکیلتے ہوئے بولی۔
 "یہ کیا بد قیسی ہے۔ اپنے باپ کے ساتھ کیا کر رہے ہو چلے!"
 اس نے ساتھ ہی ٹنگ کرتی سیرٹیاں چڑھ گئیں تو وہ جو بلا ارادہ ان کے پیچھے دیکھنے لگی تھی سر جھٹک کر دوبارہ بیٹھ گئی۔ کو نظر نبیل پر پڑی۔ بچہ ماں کی بے رحمی کو شدت سے محسوس کر رہا تھا اس نے اندر ہی اندر گڑھتے ہوئے اسے ہلا کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

وہ ابھی بابا احسان کے ساتھ زمینوں سے لوٹا تھا۔ شاور لینے کے بعد جلنے اس نے اپنے کپے میں ہی منگوا لی تھی۔ اور رگ رگ کر جلنے کے سبب لپکتے ہوئے وہ کپے سے نکل کر ٹیڑھیں پر اٹھ کر ہوا تو سلونی شام میں اسے وہ بڑی شدت سے یاد آئی جسے تین روز پہلے اس نے پتی دھوپ میں سرک کے کنارے غالباً بس کے انتظار میں کھڑے دیکھا تھا اور ان تین دنوں میں مسلسل تو نہیں لیکن وقفے وقفے سے فرد اس کا دھیان اس کی طرف کیا تھا۔ اور وہ خود حیران ہو رہا تھا کہ اس طرح تو اس نے کبھی کسی کے بارے میں نہیں سوچا تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ صنف نازک کو اس نے کبھی اہمیت دی ہی نہیں تھی۔ گزشتہ سال جب شہر بانو اور شاہ ہارون کی منگنی کے ساتھ بدلے میں اس کی مہر انشاء سے نسبت ملے ہوئی تھی تب بھی اس کے اندر کوئی خوشگوار احساس نہیں جاگا تھا۔ نہ ہی اس کے بعد مہر النساء کا اس کے سامنے آنے سے گزر کر نا اچانک سامنا ہو جانے پر لجا نا اسے متوجہ کر سکا۔ جبکہ وہ بہت خوبصورت بھی تھی لیکن ساری بات تو دل کی ہے۔ رگ کہاں ہے اختیار ہو جائے کچھ پتا نہیں چلتا اور شاہ سکندر حیات

نہیں خیر۔ رات تو وہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ سب بچے ساتھ ہیں اس کے اور شاہ یونس کے بھی ۛ
اُس نے بی بی جان کی بات سن کر مزید کچھ نہیں کہا اور اپنے کمرے میں آگیا۔

اُسی روز کی طرح وہ پستی ہوئی دھوپ میں بس کے انتظار میں کھڑی نظر آئی اور اُسے دیکھتے ہی شاہ سکند جات کو اپنے کرائی آنے کا مقصد سمجھ میں آیا۔ اور واقعی وہ حیران رہ گیا یعنی صرف اس لڑکی کو دیکھنے کی خاطر وہ شاہ پور سے یہاں آتا تھا۔

”نہیں یہ اُس نے اس حقیقت کو جھٹلانا چاہا لیکن کسی طرح حقیقت جھٹلائی نہیں گئی۔ اُسے دیکھ کر ہی

تو اُس کا اضطراب اچانک ختم کیا تھا۔ وہ رگزشتہ دو گھنٹے سے انتہائی مضطرب حالت میں گاڑی مختلف سڑکوں پر دوڑاتے ہوئے وہ مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ وہ یہاں کس کام سے آیا ہے، حالانکہ کل شام بی بی جان کے استسنان بر اُس نے کہا تھا سو کام ہوتے ہیں اور ہوتے بھی تھے، لیکن آج تو کوئی کام نہیں تھا پھر بھی اُسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی خاص مقصد سے آیا ہو اور اب مقصد کا ادراک اُسے سخت حیرت میں مبتلا کر گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ تجزیے سے نکلتا وہ بس میں سوار ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی اور اپنے پیچھے منظر میں جو وہ خلا چھوڑ گئی تھی اُسے شدت سے محسوس کرتے ہوئے وہ چونک کر رادھرا دھر دیکھنے لگا۔ اور وہ تو کہیں نظر نہیں آئی البتہ نالئمہ اُسے دیکھ کر بھاگ آئی۔

”ارے سکندر بھائی آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”وہ ایک کام سے آیا تھا،“ وہ ہنسل کر بولا۔

”کچھ گئی کسی کا ایڈمیشن کروانے آئے ہوں گے؟“ نالئمہ نے کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”خیر اب ایسا اندھیر بھی نہیں چھا کر مرے کہنے پر وہ تم جیسی نالائقی لڑکیوں سے کالج بھر دیں؟“

”جی، میں نالائقی نہیں ہوں؟“ نالئمہ منہ جھٹلا کر بولی۔

”اچھا چلو بیٹھو، میں تمہاری طرف جا رہا ہوں؟“ اُس نے دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تو نالئمہ رک کر شوق سے پوچھنے لگی۔

”ابنی دوستوں کو نہیں بلالوں؟“

”کیا؟ میں تمہیں اتنا فالٹو نظر آتا ہوں؟“ چلو بیٹھو۔“

اُس نے ناگواری اور رعب سے کہا تو نالئمہ بڑ بڑاتی ہوئی دوسری طرف سے آکر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر خاموشی سے ڈرائیو کرنے کے بعد وہ پوچھنے لگا۔

”تمہاری کلاسز شروع ہوئیں؟“

”جی،“ نالئمہ ابھی اُس کے رعب سے نکلی نہیں تھی جیہی اُس کے حلق سے مشکل سے آواز نکلی اور وہ سمجھ کر وقتاً بوقتاً انجان سا ہنسیا۔

پھر اُس نے چاکر کر نالئمہ کو اُس کے گھر پر اتار کر چلا جانے کیونکہ احمد حسن اس وقت گھر پر نہیں تھا لیکن نالئمہ نے اسے جانے نہیں دیا۔ گو کہ اس گھر میں اُس سے کوئی پردہ نہیں تھا پھر بھی نالئمہ اور اُس کی امی کے ساتھ وہ پہر کا کھانا کھاتے ہوئے وہ کچھ جھجک رہا تھا۔ کھانے کے دوران نالئمہ کی امی نے اس کے گھر کے ایک ایک فرد کی خیریت پوچھی پھر کہنے لگیں۔

”کبھی ابی بی بی جان اور بہنوں کو رکے کر آؤ کیا وہ بالکل بھی چوبلی سے باہر نہیں نکلتیں؟“

”نہیں ان کا کراچی آنا جانا رہتا ہے۔ لیکن کبھی کبھار البتہ مری اسلام آباد دو سال میں دو بار جاتی ہیں تو وہ بھی بچوں کی وجہ سے۔“

اس نے بتایا تو بہنوں نے نام بھی کے عالم میں کہا۔

”بچوں کی وجہ سے؟“

”جی، اصل میں میرے بھائیوں کے بچے مری کاؤنٹیٹ میں پڑھتے ہیں، جھٹیوں کے علاوہ جب بی بی جان کا دل چاہتا ہے خود جا کر ان سے مل آتی ہیں۔“

پہلی بار اپنے دل کو اپنے اختیار سے باہر محسوس کر رہا تھا۔
”بھائی! آپ کو بی بی جان بلا رہی ہیں؟“ عقب سے شہر بانو نے پکار کر کہا تو اس نے اپنے خیال سے چونک کر جلت کر دیکھا اور کوئی بھی پوچھ لیا۔

”خیریت؟“
”خیریت نہیں لگتی بھائی! بی بی جان کچھ ناراض لگ رہی ہیں؟“ شہر بانو نے کہا تو وہ اپنی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”مجھ سے؟“

”جی نہیں آپ سے یا کسی اور سے۔ آپ چلیں تو؟“
”ہاں چل رہا ہوں۔“ وہ چلے گا خالی کپ اُسے فکرا کر بی بی جان کی ناراضگی سوچتا ہوا میٹھاں اتر کر آیا تو وہ بڑے بال کرے میں بیٹھی نظر آئیں۔ اُس نے قریب آکر سلام کیا تو بی بی جان اُسے دیکھ کر قدرے خشکی سے بولیں۔

”ماشاء اللہ۔ تین دن بعد لوٹے ہو، اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ پہلے ناں کو اپنی صورت دکھا دو؟“
”سوری بی بی جان!“ وہ اپنی کوتاہی پر نادم ہوا اور ان کے قریب بیٹھ کر ان کے گرد اپنے بازوؤں کا گھیرا کر صفائی پیش کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اصل میں راستوں کی گرد سے طبیعت بوجھل ہو رہی تھی سوچا پہلے نہالوں پھر آپ کی خدمت میں پیش ہوں گا۔“

”کچھ کھانا بھی ہے کہ نہیں؟“ بی بی جان نے اپنا آپ جھڑتے ہوئے پوچھا۔
”جیسے بی بی چکا ہوں، اور کھانا رات میں ہی کھاؤں گا؟“ گویا اس وقت اُس نے کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا۔

”اتنی گرمی میں چائے، کتنی بار منع کیا ہے، کم از کم گرمی نہیں چلے نہیں پیا کر دم صحت خراب کر رہے؟“ بی بی جان نے حسب عادت چائے کا سن کر ٹوکنا ضروری سمجھا۔

”بی بی جان جس چیز کی عادت ہو وہ پھر گرمی سردی نہیں دیکھتی، شیریں بتائیے خاموشی کیسی ہے میرا مطلب ہے بچے سب کہاں ہیں؟“

اُس نے اچانک خاموشی محسوس کرتے ہوئے اپنے بھتیجے بھتیجیوں کے بارے میں پوچھا۔
”بچے سب شاہ جہانگیر کے ساتھ تمہارے بچا جان کی طرف گئے ہیں؟“

”خیریت؟“
”ہاں صبح مہر النساء آئی تھی تو شہر بانو نے اُسے روک لیا ابھی سب اُسے چھوڑنے گئے ہیں جہانگیر جا رہا تھا تو بچے بھی ساتھ تیار ہو گئے۔“

بی بی جان نے بتایا تو وہ ذرا سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔ پھر قدرے توقف سے پُرسوج انداز میں بولا۔

”میں صبح کراچی جاؤں گا۔“
”کیوں، ابھی اُس دن تو گئے تھے؟“ بی بی جان نے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”بی بی جان! سو کام ہوتے ہیں، پھر کراچی کون سا دور ہے۔ ابھی جاؤ ابھی آؤ۔“
اُس نے کام کی نوعیت نہیں بتائی، پھر اُٹھتے ہوئے بولا۔

”میں اپنے کمرے میں ہوں، جہانگیر بھائی آئیں تو کھجے بلا لیجئے گا۔“
”جہانگیر کو تمہارے بچا اتنی جلدی تو نہیں آنے دیں گے؟“ بی بی جان نے کہا تو وہ جلتے جلتے روک کر بولا۔

”کیا مطلب؟“ رات دین رکیں گے؟“

”اچھا اچھا!“ انہوں نے سمجھ کر سر ہلایا پھر کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے بولیں: ”گری بہت ہے تم ایسا کرو سکنڈ ریج دیر آرام کر لو۔ احمد حسن کے کمرے میں یا نالکھ سے کہو گیسٹ روم کھول دے“ جی۔ وہ اسی قدر کہہ کر سوچنے لگا کہ آیا اسے یہاں لکنا چاہیے یا والیسی کی راہ لے۔

چلیں سکندر بھائی کہاں بیٹلنا ہے احمد بھائی کے کمرے میں یا۔“

”میرا خیال ہے مجھے گیسٹ روم میں پہنچا دو یا ایک بل میں فیصلہ کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔“

میونہ بھائی کے پاں تھیرے بچے کی آمد تھی۔ اماں جی انہیں لے کر ہاسٹل گئی ہونی تھیں اور نبیلہ بھائی تو بڑوں ہی گھر پر نہیں رہتی تھیں۔ وہ کالج سے لوٹی تو تینوں بچے نبیل احمد اور سونیا۔ آبا جی کے پاس بیٹھے نظر آئے۔ اسے دیکھتے ہی سونیا وہیں سے پکار کر بولی۔

”بھو بھو! اماں جی اور امی نہیں ہیں۔“

”کہاں گئی ہیں؟“ اس نے پوچھا لیکن پھر فوراً ہی اُسے میونہ بھائی کی کنڈیشن یاد آئی تو اس سے پہلے کہ سونیا آبا جی کے سامنے کچھ اٹا سیدھا بولتی وہ اپنے کمرے میں آگئی پھر منہ ہاتھ دھو کر نکل کر پوچھنے آبا جی اور بچوں سے کھانے کا پوچھا۔

”ہم کھا چکے ہیں بیٹی۔ تم کھا لو یا آبا جی نے کہا۔“

”مجھے ابھی بھوک نہیں ہے“ اس نے کہا پھر آبا جی کے آرام کے خیال سے تینوں بچوں کو لے کر اپنے کمرے میں آگئی۔

”جیلو اب تم سب آرام سے سو جاؤ۔ شام میں اٹھو گے تو میں تمہیں ایک پیارا سا گول مٹول سامنا دکھاؤں گی۔“

اپنے تینوں اُس نے بچوں کو لالچ دیا لیکن سونیا بڑے آرام سے بولی۔

”مجھے بتا ہے۔ امی لینے گئی ہیں۔“

”چلا کو ماسی! تمہیں لینے بتا ہے؟“ وہ سونیا کے چھوٹے گال پر ہلکے سے چٹکی کاٹ کر بولی۔

”اماں جی نے بتایا ہے۔ کہہ رہی تھیں۔ ہم تمہارے لیے منسا بھائی لینے جا رہے ہیں۔“

یقیناً اماں جی انہیں پہلے کہتی ہوں کہ اور سونیا نے ان کا حرف بہ حرف دہرایا۔ پھر پوچھنے لگی۔

”بھو بھو! وہ منسا بھائی میرا بھوکا ناں۔ نبیل کا تو نہیں ہوگا؟“

”کیوں نبیل کا کیوں نہیں ہوگا؟“ اس نے نبیل کے معصوم چہرے پر نظر ڈال کر پوچھا۔

”اس لیے جاری امی اتے کر آئیں گی۔ نبیل کی امی تو۔“

”سونیا۔“ اس نے فوراً ٹوک دیا۔ بڑی بات ہے بیٹا! ایسی باتیں نہیں کرتے۔ نبیل بھی تمہارا بھائی ہے اور تم سب کو مل جل کر رہنا ہے۔“

”بھو بھو! سونیا گندی بچی ہے۔ یہ نبیل بھائی کو نبیل کہتی ہے۔“ احمد نے خود کو سمجھا دیکر غصہ کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ میں گندی بچی نہیں ہوں۔“ سونیا کو سخت برا لگا۔ رونے لگی تو وہ اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر بولی۔

”نہیں! آخر! سونیا بہت اچھی بچی ہے۔“

منسا نبیل پر نظر پڑی۔ وہ سونیا کو روکتے ہوئے چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ تب وہ بہت پیار سے اُسے مخاطب کر کے بولی۔

”کیا بات ہے نبیل تم کیوں خاموش ہو۔“ جواب میں معصوم بچے کے سینے میں جانے کب سے دلی ہوئی گہری سانس آہ کی صورت خارج ہوئی تو اس نے تڑپ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

”میرا خیال۔“ وہ لبس یہی کہہ کر کیونکہ اسی وقت عدیل بھائی آگئے اور زوردار سلام کے ساتھ لپکا

”نیا بھتیجا مبارک ہو!“

”نیا بھتیجا۔“ اس نے چونک کر دیکھا پھر پوچھنے لگی: ”آپ ہاسٹل سے آ رہے ہیں۔؟“

”نہیں! آفس سے۔“ عدیل بھائی سونیا کو گود میں اٹھا کر اُس کی جگہ بیٹھتے ہوئے بولے۔

”پھر آپ کو کیسے تاجیلا۔“

”اماں جی کا فون آتا تھا غلطی سے۔ یعنی نہ ملنا چاہ رہی تھیں خلیل بھائی کے مل گئے میرے۔“

عدیل بھائی محفوظ انداز میں بتا کر بیٹھے تو وہ بھی نہیں بڑی پھر پوچھنے لگی۔

”اور کچھ کہا اماں جی نے۔؟“ عدیل بھائی سونیا کو گود گرائے میں لگ گئے تھے۔ جب ہی اُس کی بات سنی نہیں۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا پھر قدر سے اونچی آواز میں اُن سے کھانے کا پوچھا۔

”ہاں، کھانا کھاؤں گا۔“ انہوں نے کہا تو وہ کچھ کرکچن میں چلی گئی۔

اگلے دن صبح اُس کی سمجھ میں نہیں آ گیا کرے۔ کیونکہ اماں جی اور میونہ بھائی دونوں نہیں تھیں اور اس کا کالج جانا ناگزیر تھا۔ بچوں کو تو اُس نے آرام سے اسکول بھیج دیا۔ اس کے بعد مسئلہ دوسرے کا ہوا کا تھا خصوصاً بچوں کے اسکول سے واپس آنے پر انہیں اٹینڈ کرنا اور اُس وقت تک وہ کالج سے نہیں لوٹی تھی۔

”کیا بات ہے تمہیں کالج نہیں جانا؟“ عدیل بھائی نے اُسے تیار نہ دیکھ کر پوچھا۔ روزانہ صبح وہ انہی کے ساتھ جاتی تھی۔

”کیا کروں بھائی! جانا بھی ضروری ہے۔“ وہ پریشانی سے گویا ہوئی۔

”پھر کیا مسئلہ ہے۔؟“

”انتان جی اور بھائی نہیں ہیں۔ بچے اسکول سے آئیں گے تو پریشان ہوں گے، کیا کروں، چھٹی کر لوں۔“

”نہیں چھٹی کرنے سے تمہارا نقصان ہوگا۔ ایسا کرو نبیلہ بھائی سے کہہ آؤ۔ وہ دیکھ لیں گی بچوں کو۔“

عدیل بھائی بڑے آرام سے کہہ کر تیار ہونے چلے گئے اور وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔

”ناامن۔ نبیلہ بھائی ایک اپنے بچے کا تو خیال کرتی نہیں ہیں۔“

اس نے نبیلہ بھائی کے پاس جانے کا خیال جھٹک دیا اور آبا جی کے پیکار نے پرکچن سے نکل کر برآمدے میں آئی تو وہ کہنے لگی۔

”بیٹا! بچوں کی فکر نہیں کرو! میں ہوں ناں!“

”لیکن آبا جی! آپ کھانا تو نہیں کھا سکتے۔ اور بچے تو آتے ہی کھانا مانگیں گے۔“

”کھانا بازار سے آجائے گا۔ اور خلیل میاں بھی ابھی ہاسٹل کا چکر لگا کر آجائیں گے۔ کوئی پریشانی نہیں ہوگی، تم جاؤ۔“

آبا جی نے اسے اطمینان دلایا اُدھر سے عدیل بھائی چلائے۔

”جلدی کرو آسیہ! صرف دس منٹ ہیں۔“

”دس منٹ۔“ وہ تیار ہونے اپنے کمرے کی طرف بھاگ تھی۔

اور جب یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ صرف اُس لڑکی کی خاطر سیلوں مسافت طے کر کے آیا تھا تو اب خود اُس نے طے کر لیا تھا کہ اُس تک رسائی حاصل کیے بنا وہ واپس نہیں جائے گا کیونکہ گزشتہ نام اُس نے جتنی بار واپس کا قصد کیا اُسے لگا وہ کل پھر آئے گا۔ اور روزانہ شاد پور سے آنا جانا اُس کے لیے کوئی اتنا مشکل تو نہیں تھا لیکن بس یہ خیال کہ وہاں باا جان اُسے کسی کام میں مصروف کر سکتے تھے۔

وہ وہ جانتا تھا کہ اب وہ کوئی کام نہیں کر سکے گا۔ جب تک اُس کے بارے میں جان نہ لے۔

وہ جو کوئی بھی تھی پہلی نظر میں نہ صرف اُسے اچھی لگی بلکہ اُس کے حواسوں پر چھا گئی تھی اور شاہ سکندر نیات کے لیے یہ بھی تو حیران کن بات۔ اس کے ساتھ وہ اپنی کوفیات سے لطف بھی لے رہا تھا

اور اُسے عجیب سا بھی لگ رہا تھا۔ کیونکہ اُس نے صنف نازک کو کبھی اتنی اہمیت نہیں دی تھی۔ حالانکہ وہ کوئی کھدو یا جذبات سے عاری شخص نہیں تھا، البتہ مغرور ضرور تھا۔ اور شاید یہ اس کا حق بھی تھا، بے پناہ وجاہت کے ساتھ تو بڑا دون جیسی شان و شوکت ہر ایک کے حقیقت میں تو نہیں آتی۔ پھر خود سے واقف بھی تھا۔ جانتا تھا کہ جس راستے پر قدم رکھتا ہے وہ خود ہر رشک کو ہے۔ بہ حال یہ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ وہ خود کسی لڑکے کی تلاش میں جا رہا تھا۔ یورپی تہذیب کے ساتھ اور یہ تہذیب کر کے کہ اپنی تین رائوں کی بے خرابی اور دونوں کا انتظار اب اس کے کھاتے میں ڈال آئے گا۔

اتنا زعم۔ یعنی اُسے یقین تھا کہ اُسے دیکھ کر وہ اپنی نیندیں گھوٹا بیٹھے گی۔ اتنا تو وہ جان گیا تھا کہ وہ میڈیکل کالج کی اسٹوڈنٹ ہے۔ کیونکہ اوّل روز وہ سینڈ کوٹ پر نظر آئی تھی، اور کل اُسے دیکھنے کے بعد نہیں سے اس نے نالندہ کو یک کیا تھا۔ اور وہ چاہتا تو نالندہ کے ذریعے آسانی سے اس کا نام پتا جان سکتا تھا لیکن اپنے دل پر گزرنے والی واردات میں فی الحال وہ کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس مجتہد کا ایک الگ مزہ تھا۔ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اُس نے گاڑی کی اسپید کم کر دی۔ پھر جیسے ہی سمنے دیکھا وہ بہت عجلت میں رو کر اس کوئی نظر آئی، اور اسی بل وہ اسپید بڑھا کر گاڑی یوں اُس کے قریب لے گیا جیسے اُسے چیلنا ہوا نکل جائے گا۔ حقیقتاً دیکھنے والوں کو بھی یہی لگا اور وہ جو اسی طرف دیکھ کر چل رہی تھی، وہ ایک گاڑی کو اتنی اسپید سے اپنی طرف آنے دیکھ کر لو کھلا گئی اور بہت کوشش سے بھی اپنے حواس قابو میں نہیں رکھ سکی۔ ادھر ادھر کئی گاڑیوں کے بریک چرچر آئے اور اس نے بھی گاڑی روکی تو لیکن اُسے بھی سی ضرب لگانے کے بعد۔

پھر بھڑکی کی تیزی سے اُس کو اس کے قریب آیا تو پتی ہوئی مرکب پر گرتے ہی وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے گرد لوگ جمع ہونے لگے تب اس نے جلدی سے اسے بازوؤں پر اٹھایا اور اپنی نگاہوں کی پچھلی نشست پر لٹا دیا۔ پھر ایک ہی نظر میں سب کو دیکھ کر بولا۔
”زادہ چیٹ نہیں ہے، میں انہیں اسپڈ لے جاتا ہوں تا اس کے ساتھ ہی ڈرائیونگ پر بیٹھا اُس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اور راستے میں جو پیلا کلینک نظر آیا، وہ وہیں رگ گیا۔۔۔ ابتدائی مراحل سے گزرنے کے بعد اُسے طبی امداد ملنے تک وہ قدرے بے چین رہا۔ پھر سکون سے ہو کر اُس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے کے ساتھ اُس کا تفصیلی جائزہ لینے لگا، کہ آخر اس میں ایسی کیا بات ہے اور کوئی بات تو تھی جو اُس کی جستجو بڑھتی جا رہی تھی۔ سمجھنے لے چپ چاپ سرک گئے۔

وہ اگر بیڈ پر بے حس و حرکت بڑی تھی تو وہ بھی اپنی جگہ جم کر رہ گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں وہاں زندگی ہے ہی نہیں محسوس کی جانے والی خاموشی تھی، مگر اس کی پلکوں نے ذرا سی حرکت کی تو جیسے ہر شے متحرک ہو گئی۔
وہ جو ایک ملک اُسے دیکھ رہا تھا۔ تیزی سے اُس کے میڈ کے قریب آگیا۔ دوسرے بل اُس

نے آنکھیں کھولیں تو نظروں کے عین سامنے ایک اجنبی کو دیکھ کر فوراً طور پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا بلکہ وہ چپ چاپ اُسے دیکھنے لگی۔ تب بیڈ کی پی پر ایک ہاتھ جاکر وہ قدرے جھک کر پوچھنے لگا۔

”کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“ ہو کر اُس کی آواز دھیمی تھی پھر بھی اُس کا سوا ہوا ذہن یکلفت پیدا ہونے کے ساتھ بے شمار سوالات کی زد میں آگیا۔ بولی تو پیشانی پر لہکی سی ناگواری کی شکلیں نمودار ہو گئی۔
”کون ہیں آپ؟“

”خاکسار کو سکندر کہتے ہیں۔ شاہ سکندر جی۔۔۔“

گھٹی مچھلی تھے اُس کے لبوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی کہ وہ اندر ہی اندر تیز بڑی ہو کر اُس پر سے نظروں بٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی، پھر اٹھنا چاہتی تھی کہ وہ ہاتھ اٹھا کر لولا۔

”پلیز ایجی آپ آرام کریں۔“
شکریہ میں جھجک ہوئی۔ وہ کہتے ہوئے اُن کے ہاتھ لگ گئی۔ اور کہیں چوٹ کا احساس ہوا تو لیکن قطعاً اُس نے خود کو دیکھنے اور جاننے کی کوشش نہیں کی۔

”ابھی آپ شیک نہیں ہیں۔ پلیز آپ۔“
”مجھے یہاں کون لایا ہے؟“ وہ اُس کی بات کاٹ کر بولنے لگی۔
”خاہر ہے میں۔ اور پلیز اب آپ یہ مت کہیے گا کیوں لائے ہیں۔ مجھے وہیں مرجانے دیتے

و غیر وغیرہ۔“
اُس نے کہا تو وہ ہونٹ پیچ کر دوسری طرف دیکھنے لگی، تب سکندر حیات سوچ کر لولا۔
”میرا خیال ہے۔ میں ڈاکٹر کو لے آؤں۔ وہی بتائیں گے کہ آپ کچھ جاسکتی ہیں یا نہیں۔“

وہ خاموش رہی اور جب وہ کمرے سے نکل گیا تب اپنے بدن کو جگہ جگہ سے چھو کر دیکھنے لگی کہ کہاں چوٹ آئی ہے۔ باہاں بازوؤں کا اس سے کہیں تنگ چھل گیا تھا اور گاڑی کی ٹکر کے باعث کمزور شدہ در کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ انسان کہیں چوٹ کا نشان نہیں تھا پھر بھی ٹکر کے علاوہ بھی اُسے کہیں درد کا احساس ہو رہا تھا۔ اور ابھی وہ جھجک سے دیکھ نہیں پاتی تھی کہ کوئی بدوور میں قدموں کی آواز سن کر دوبارہ اسی طرح بولنے لگی۔ سکندر حیات ڈاکٹر کے ساتھ اندر آیا اور خاموشی سے ایک طرف کھڑ ہو گیا۔

”کہیں تکلیف تو نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے معاند کرتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

”کم میں درد ہے اور شاید میرے پیس میں موقو لگی ہے۔“
وہ یوں بولی جیسے پیر کی مویج اُسے تکلیف کے ساتھ شدید کوفت میں مبتلا کر رہی ہو۔ ڈاکٹر نے چیک کرنے کے بعد اُس کے شے کی تصدیق کی۔ پھر میڈیسن لکھنے کے ساتھ سکندر حیات سے کہنے لگا۔
”کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ فکر کریں معمولی ایک سیڈنٹ تھا۔ یہ میڈیسن فوراً لے لیں۔ اور چاہیں تو ابھی انہیں گھر لے جاسکتے ہیں۔“

وہ ڈاکٹر کی آخری بات پر ہٹا کر دیکھنے لگی۔
”تھیک یو۔“ سکندر حیات نے ڈاکٹر کے ہاتھ سے ہر چالے لیا پھر اُس کے ساتھ ہی کمرے سے نکل گیا تو وہ خود کو دوبارہ اُس کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ کر سکی۔

کچھ دیر بعد وہ پورے اعتماد سے کمرے میں داخل ہوا جیسے وہ اس کی قریبی عزیز ہو۔ لیکن جب اُس پر نظر پڑی تو جھجک گیا۔ کیونکہ اُس کے ہر انداز سے ناگواری ظاہر ہو رہی تھی۔

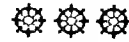
”آئی ایم سوری۔ میں ناک کرنا بھول گیا۔“ وہ کچھ نہیں بولی تو قدرے رک کر کہنے لگا۔
”اب کیا پروگرام ہے آپ کا۔“ میرا مطلب ہے گھر چلیں گی تو چلیں میں آپ کو چھوڑ دوں؟“
”بہت بہت شکریہ سکندر حیات صاحب آپ کو پہلے ہی اتنی زحمت اٹھانا پڑی۔“
”اُسے رسیات بھانے کا خیال آیا تو فوراً اپنی ناگواری چھپا گئی۔

”مجھے بالکل زحمت نہیں ہونی میں۔“ وہ بظاہر سیدھے سادے انداز میں کہہ کر اُس اور سولہ نظروں سے دیکھنے لگا تو وہ جیسے ناچار بولی تھی۔

”آسیہ یہ پہلے مرحلے کی کامیابی پر اس کی سرانجام دہی ایک لحظہ کو چکیں پھر فوراً سنبھل کر کہنے لگا۔
”میرا خیال ہے میں آسیہ۔“ مجھے آپ کو گھر تک چھوڑنے میں کوئی زحمت نہیں ہوگی۔“
”جو سکتا ہے، پھر بھی میں چلی جاؤں گی۔“ اُس نے ایک طرح سے انکار کر دیا۔
”کیسے جائیں گی۔ آپ تو چل بھی نہیں سکتیں، میرا مطلب ہے آپ کے پیس میں موقو؟“

اُس نے فوراً احساس دلایا تو وہ خاموش ہو کر اپنے سر کو دیکھنے لگی۔ واقعی چلتا مشکل تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس کے ساتھ جانا مناسب نہیں لگ رہا تھا اور عجیب میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔
 ”آپ کی سوچنے لگیں؟“ بالآخر اُسے ٹوٹنا پڑا۔ اندر ہی اندر پریشان ہونے کے ساتھ خود کو لقمین بھی دلایا تھا کہ اس لڑکی کے پاس اُس کے ساتھ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔
 ”جی۔“ اُس نے چونک کر دیکھا پھر لقمین میں سر ہلا کر بولی۔

”کچھ نہیں۔“
 چلیں پھر آپ کے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔“
 اُس نے کہا تو اُسے اگے دم سے گھر کا خیال آیا اور وہ پریشان ہو گئی۔ کیونکہ آج تو یوں بھی اُسے جلدی گھر جانا تھا۔ بیٹھے آج ہی کو تنگ کر رہے ہوں گے اور چاہیں کھانا بھی کھا یا ہوگا کہ نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور ان ساری باتوں کا خیال آنے کے باوجود وہ اُسے دیکھ کر حتمی انداز میں بولی۔
 ”سوری، میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی۔“



۱ ص صاف انکار پر شاہ سکندر حیات کو سخت توہین کا احساس ہوا۔ اس کی پیشانی پر گہری لکیریں نمودار ہوئیں۔ اس کی بچی اگر کوئی اور ہوتی یا ہوتا تو وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اُسے اٹھا کر باہر پھینک دیتا لیکن اس کے سامنے وہ خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اور یہی بے بسی ہی تو اُس کی کمزوری کا سبب بنی تھی۔ مقدوی کو شش سے خود پر قابو پا کر قدرے خوشگوار لہجے میں بولا۔
 ”اوکے، جیسے آپ کی مرضی، اور میرا خیال ہے اس سے پہلے کہ آپ مجھے گینٹ لاسٹ کہیں مجھے خود ہی چلے جانا چاہیے۔“
 ”نہیں پلیز۔ آپ کچھ درز رک جائیں۔“ اُسے نے کچھ مدت سے کہا تو وہ حیران ہو کر دیکھنے لگا۔ سمجھ کچھ نہیں پایا تھا کہ وہ کیوں روک رہی ہے۔ کوئی سوال نہیں کیا تب وہ ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگی۔
 ”وہ میری کتابیں اور میرا بیگ؟“

”میری گاڑی میں ہے۔ لے کر آتا ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے جانے لگا تو وہ فوراً بولی۔
 ”ایک منٹ، ایک فنون کرنا ہے اگر آپ۔“
 ”جی منبر تائیے، وہ دروازے کے قریب رک کر پوری توجہ سے دیکھنے لگا تو وہ نمبر بتا کر کہنے لگی۔
 ”عدیل صاحب ہوں گے۔ ان سے کہئے گا، مجھے یہاں سے لے جائیں۔“
 ”عدیل صاحب؟“ اُس نے سوچتے ہوئے انداز میں دہرایا اور دھڑکے سے نکل گیا۔ تو وہ بدبختی پتی پر سر رکھ کر سوچنے لگی۔

یعنی یہ حادثہ بھی آج ہی ہونا تھا۔ کتنے پریشان ہو رہے ہوں گے اباجی اور بچے۔ پریکٹیکل کے دلوں میں بھی وہ اتنی لیٹ نہیں ہوتی تھی۔ بہت دیر ہو گئی۔
 اُس نے وقت دیکھنے کے لیے کلائی پر نظر ڈالی۔ گھڑی نہیں تھی۔ اور پہلا خیال یہی آیا کہ وہیں روڈ پر کہیں گرتی ہوگی۔ اُسے انہوں نہیں بلکہ دنگو ہونے لگا۔ کیونکہ وہ گھڑی اُسے بہت عزیز تھی۔ جب اُس نے میٹرک میں فرسٹ کلاس مقصد پر پوزیشن لی تھی تب اباجی نے اُسے دی تھی۔ مگر اس کے بعد مختلف مباحثوں پر بحثوں نے اُسے بہت اچھی اور خوبصورت گھڑیاں دی تھیں لیکن اس سب سے پہلی اور اباجی کی دنی ہوئی گھڑی کا اہمیت اس کے نزدیک سب سے زیادہ تھی کہ اُسے دیکھتے ہوئے جہاں وہ اپنی پہلی خاندار کا سیانی پر اسی روز کی طرح مسرور ہوتی تو اُن اُس کے اندر مزید کامیابیاں حاصل کرنے کا عزم پختہ ہو جاتا تھا۔ زرتشتہ قید سالوں سے وہ اس کی ساتھی تھی۔ اپنی خالی کلائی کو بہت نرمی سے وہ

دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے چھونے لگی۔ مٹا خیال آیا کہ وہ جو عدیل بجائی کو فون کرنے گیا تھا وہ ابھی تک واپس نہیں آیا۔

”کیس چلا تو نہیں گیا؟“
 وہ اُس نے جانے کا سوچ کر کچھ الجھنے لگی کیونکہ یہی بہت تھا کہ وہ اُسے یہاں تک لایا تھا۔ اس کے بعد میڈیسن اور ڈاکٹر کی فیس غالباً اُس نے ادا کر دی تھی اور اُس نے عدیل بجائی کو بلایا ہی اس لیے تھا کہ وہ جو خرچ کر چکا ہے اُسے لوٹا دیں۔ خواہ مخواہ ایک اجنبی کا مقروض ہونا اُسے بالکل اچھا نہیں لگا۔ اور اگر وہ چلا گیا ہوگا تو واقعی بہت مشکل ہو جائے گی۔ وہ اسی صبح پر سوچ رہی تھی کہ کورڈور میں قدموں کی آواز سن کر فوراً دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ عدیل بجائی کے ساتھ اندر داخل ہوا تو اُسے کچھ اطمینان ہوا۔

”کیا ہوا؟“ وہ تم قہر سے تو ہو؟“
 عدیل بجائی کی پریشانی فطری تھی۔ لیکن کراس کے پاس بیٹھے اور سر سے پاؤں تک اُسے دیکھنے لگے۔
 ”میں تنگ ہوں بجائی، زیادہ جوت نہیں آتی، اُس نے سسکا کر عدیل بجائی کی پریشانی کم کرنے کی کوشش کی۔

”بھیر کینے لگی، اگر میری میں موج نہ آتی تو میں آپ کو زحمت نہ دیتی۔ خود ہی گھر پہنچ جاتی۔“
 ”تھینکس گاڈ، لیکن یہ ہوا کیسے؟“ اتنی لاپرواہی نہیں ہو، عدیل بجائی نے شکر کرنے کے ساتھ پوچھا۔
 ”بس وہ۔“ وہ جانتے کیے کہنے جا رہی تھی کہ نظر خاموش کھڑے سکندر حیات پر پڑی تو عدیل بجائی کو اُس کی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی۔

”میرا خیال ہے بجائی! پہلے آپ ان کا شکریہ ادا کریں۔“
 اور عدیل بجائی کو جیسے اُس کی مورتی کا احساس ہوا فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر اُس کا ہاتھ تھام کر بولے۔

”میں بہت مسزن ہوں شاہ سکندر حیات آپ کا بہت احسان کیا ہے آپ نے ہم پر۔“
 ”کوئی احسان نہیں۔ آپ پلیز مجھے شرمندہ نہیں کریں۔“
 وہ کہہ رہا تھا اور بالکل اچانک عدیل بجائی سے ہوتی ہوئی اُس کی نظرس اُس پر جا پھری تھیں۔

پتا ہے شہر باتو اکبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے شاہ سکندر کو میری ذرہ برابر پروا نہیں ہے بلکہ شاید بڑے سے میرے وجود کو ہی تسلیم نہیں کرتا۔“
 فوراً سے گرد و سنگ مرمی کی جار دلواری کے قریب رک کر مہر النساء نے افسردگی سے کہا تو باوجود تک کہ اُسے دیکھنے لگی۔ پھر اُس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

”کچھ ہی ہو تم، بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بجائی سکندر کو تمہاری پروا نہ ہو؟“
 ”ایسا ہی ہے شہر باتو۔ وہ کسی اور دنیا میں رہتا ہے۔“ مہر النساء نے جھجک کر ہانی میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

”بجائی سکندر کی دنیا صرف اور صرف تم ہو مہر و اور تمہاری دنیا سے نکل کر وہ کہیں نہیں جاسکتے۔“
 بانٹنے لے لیتیں دلایا۔

”پھر وہ مجھ سے ناراض کیوں ہے؟“ مہر النساء اُس کا یقین کر کے عجب بے یقین سی تھی۔
 ”جسے تم ناراضگی سمجھ رہی ہو وہ محبت کا ایک انداز ہے۔ شہر باتو نے اُسے چھیڑا۔
 ”فینک ہے۔“ میں ہارون بجائی سے کہوں گی وہ بھی محبت کا ایسا ہی انداز اپنائیں۔“ مہر النساء نے فوراً اتارا۔

”نامن۔ شاہ ہارون کبھی تمہاری بات نہیں مانے گا۔“ شہر بانٹ کے بچے کا زعم تار ہا تھا کہ اُسے اپنی ت پرکت مہر و سا ہے۔ مہر النساء نے پانی میں سے ہاتھ کھینچ لیا۔ پھر اُسے دیکھ کر کہنے لگی۔

کتنے یقین سے تمہیں بارون بھائی پر۔ میں بھی ایسا ہی یقین پابستی ہوں جو شاہ سکندر نے کبھی میری
تبویلی میں نہیں دلاؤ۔ بتاؤ یہ محبت کا کون سا انداز ہے؟
”تم ناحق بدگمان ہو رہی ہو مہر و ساری بات مزاج کی ہے۔ کوئی اظہار کرتا ہے اور کسی کو اظہار کرنا
اجتناب نہیں لگتا۔“
”تم شکاک کہہ رہی ہو لیکن جذبے کسی اظہار کے محتاج نہیں ہوتے شہر بازو میں دعوے سے کہہ
سکتی ہوں کہ۔ بارون بھائی نے کبھی تم سے یہ نہیں کہا ہوگا کہ انہیں تم سے محبت ہے۔ اس کے باوجود
تمہیں ان کی محبت کا یقین ہے۔ بتاؤ کیوں؟“
مہر النساء براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوالیہ نشان بن گئی۔

”یہ تو تجھے بھی نہیں معلوم۔“
شہر بازو کو کوئی جواب نہیں سوجھا تو دامن بچایا۔ اور مہر النساء فوراً ساہشی۔ تاسف بھری ہنسی ممتی۔
جس پر شہر بازو اندر ہی اندر جزیرہ ہو کر بولی۔

”سنو۔ میں پھر کہوں گی کہ تم ناحق بدگمان ہو رہی ہو۔ کیا سکندر بھائی کی انگلی میں تمہارے نام کی
انگوٹھی نہیں ہے؟“
”ایک اسی خیال کے سہارے تو اپنے تمام خدشات کو مات دیئے میں لگی ہوئی ہوں۔“
مہر النساء کے پیچھے شکفتگی چھپائے نہیں چھپی۔ دوبارہ پانی پر جھلکا بھائی ممتی کو گیت سے داخل ہوتی
گرے لہند کر دوز کو دیکھ کر اپنا دوش بٹا سنبالنے میں لگ گئی۔ اس کے ہر انداز سے گھر اٹھ خاں ممتی
جیسے محسوس کر کے شہر بازو نے یٹ کر دیکھا۔ شاہ سکندر حیات گاڑی سے اتر رہا تھا۔ تب کچھ سوچ کر شہر بازو
نے اسے اس طرف آنے کا اشارہ کیا پھر مہر النساء کی طرف ہٹ کر سرگوشی میں بولی۔

”دیکھ لو۔ کچی ڈور سے بندھے چلے آ رہے ہیں۔“
”کون؟“ مہر النساء نے چونک کر اسے دیکھا۔

”جن سے آئی بدگمان ہو۔“ شہر بازو نے خسارت سے کہا اور جواب میں دیکھ کر کہنا چاہتی ممتی کہ۔
سکندر حیات کے قریب آنے پر فوراً ساریج موڑ کر کڑی ہو گئی۔
”السلام علیکم بھائی۔“ شہر بازو نے فوراً سنبال کر اسے سلام کیا۔
”و سلام۔ کیسی ہو؟“ سکندر حیات نے ہمیں کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”میں تو مشک ہوں بھائی۔ البتہ لوگوں کو آپ سے بڑی شکایتیں ہو گئی ہیں۔“
شہر بازو کا اشارہ مہر النساء کی طرف تھا وہ سمجھ گیا اور اتفاق سے بہت اچھے موڈ میں تھا بلکہ سرمستی
عالم میں جیسے ہی سونے سے بولا۔

”لوگ براہ راست شکایت کریں تو بات بھی بنے۔“
”ابھی بات بن جاتی ہے یا شہر بازو بیٹے ہوئے بولی اور مہر النساء کو کندھوں سے تمام کر اس کی طرف
موڑنا چاہتی ممتی لیکن مہر و جلدی سے اس کا ہاتھ ہٹا کر جند قدم آگے چلی گئی کیونکہ اس طرح وہ شاہ
سکندر حیات کا سامنا نہیں کر سکتی ممتی۔ جب دل پوری قوت سے دھککنے لگا تھا اور اپنے چہرے پر
اتری قویں قزح وہ خود بھی محسوس کر رہی تھی۔ شاہ سکندر نے ہمیں کو دیکھ کر ذرا سے کندھے پر چکائے پھر
بنی جان کا پوچھ کر اندر چلا گیا۔ شہر بازو نے لپک کر زور سے مہر النساء کے بازو میں چٹکی لگائی۔
”اب بتاؤ، کون کس سے ناراض ہے؟“

”مجھے نہیں پتا۔“ اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے میں معروف مہر النساء دھیرے سے بولی۔
”بڑی بے ایمان ہو تم۔ خواہ مخواہ میرے بھائی پر رشک کرتی ہو۔ شہر بازو اس موقع سے فائدہ اٹھا
اسے وہ ہم سے نکالنا چاہتی تھی کہ شاہ سکندر کو اس کی پروا نہیں اور وہ خفیہ ہو کر بولی۔
”خواہ مخواہ تو نہیں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا شہر بازو نے آنکھیں نکالیں تو وہ کھل کر ہنس پڑی۔ بڑی دلاؤیز ہنسی ممتی۔

وہ جوان دونوں اپنی کوئی ایک کلاس میں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ پیر میں مومج کے باعث تین دن سے
بستر پر پڑی ممتی اور بے حد جھنجھلا کر سوچ رہی تھی کہ اگر اس روز کان بڑجانی تو حادثہ بھی نہ ہوتا لیکن زندگی
میں آنے والے حادثوں کو کون روک سکتا ہے۔ اس روز نہ سہی پھر کسی دن یہ حادثہ تو اس کے ساتھ
ہونا ہی تھا۔ جس میں کسی گاڑی سے ٹکرا نا شرط نہیں۔ اس کے ساتھ بس اتفاق تھا اور اصل حادثے کی
خبر تو کسی کو نہیں ممتی۔ جو اس کی نیندیں اڑالے گیا تھا۔ اس وقت اس سے ہٹ کر وہ حرف اپنے تعلیمی نقصان
کا سوچ کر جھنجھلا رہی تھی۔ ظاہر ہے میڈیکل میں اس کا آخری سال تھا۔

”مجھو مجھو! کیا بہت درد ہو رہا ہے؟“
اس کی جھنجھلاہٹ سے نیل بھی سمجھا کہ وہ درد سے بے چین ہو رہی ہے۔ اس کا چہرہ انھوں میں
لے کر یوں پوچھنے لگا جسے اس کی تکلیف کو محسوس کر رہا ہو۔
”نہیں بیٹا! کوئی درد و درد نہیں ہو رہا۔ وہ نیچے کی اتری خٹک دیکھ کر قصداً مسکرائی۔ دیکھو بالکل ٹھیک
ہوں میں۔ بس ذرا چلنے میں پاؤں میں تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہے۔ صبح تک وہ بھی نہیں ہو گی۔ پھر میں
آرام سے کان جا سکوں گی۔“

”نہیں مجھو! اب آپ کان نہیں جانیں۔“
”کیوں؟“ وہ سمجھ گئی ممتی نیل کیوں منع کر رہا ہے پھر بھی انجان بن کر پوچھا۔
”پھر آپ کی ٹکڑ ہو جائے گی۔“ نیل کا خدشہ فوراً ظاہر ہو گیا۔

”ارے نہیں میری جان! بار بار تھوڑی ایسا ہوتا ہے۔“ اس نے نیل کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا اور اس
کے گرد اپنے دونوں بازو لپیٹ کر ممتی کی خیال میں گھر کر بولی۔

”وہ تو جس سے ٹکرا نا ہوتا ہے، اس اسی سے ٹکڑ ہوتی ہے اور پتا نہیں دوبارہ کبھی۔ لا حول و لا قوت یہ
تم نے مجھے کہاں! لجا دیا۔ جاؤ دیکھو اترا اور سونیا کیا کر رہے ہیں۔“
نیل نے حیران ہو کر اسے دیکھا پھر چپ چاپ کمرے سے نکل گیا تو اپنی حماقت پر پہلے اس نے خود
کو ڈکا پھر آپ ہی آپ ہنس پڑی۔

گزشتہ تین دنوں سے اس سے ایسی ہی حماقتیں سرزد ہو رہی تھیں۔ بات کرتے کرتے اچانک ذہن
بمٹک جاتا اور پہلے پتا ہی نہ چلتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اور یہ بھی غیبت تھا کہ ابھی زیادہ تر نیچے ہی
اس کے اس پاس رہتے تھے۔ میمونہ بھائی تو اپنا پیشل سے آ کر ابھی اپنے کمرے تک ہی محدود تھیں اور
بے باری اتان جی کو گھر کے سارے کام کرنے پر بڑے ہتھے کسی وقت اس کے کمرے میں آ کر کھڑے
کھڑے اس کا احوال پوچھ جاتیں۔ رات میں پتا نہیں کیسے نیند بھائی بڑی فراغت سے اس کے پاس
آئی نہیں۔ کتنی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر اس سے آئندہ کے بارے میں پوچھنے لگیں۔
”یہ تمہارا آخری سال ہے اس کے بعد کیا کرو گی؟“

”ظاہر ہے ہاؤس جاب۔“ اس نے سیدھا سا جواب دیا تو نبیلہ بھائی غصے سے بولیں۔
”مشکل ہے۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے ہال ڈیپان سارا پڑھا لکھا جو بھلے میں جھونکتی ہیں۔“
اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اور وہ مزید گویا ہوئیں۔

”تمہارے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ ادھر امتحانوں سے فارغ ہوئی نہیں کہ اتان جی اور آجی تمہاری شادی کی
ٹکڑ میں لگ جائیں گے، ہے ناں؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ وہ جزیرہ ہی ہو کر بولی۔
”یہی تو غلط ہے۔ پڑھ کر کبھی دی جاہلوں جیسی بات کر میں کیا کہہ سکتی ہوں؟“

بہت کچھ سوچ ڈالا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ اس کی ہر سوچ پر اپنا نام لگا گیا تھا۔

کلاسز آف ہوتے ہی اُس نے لائبریری کا رخ کیا۔ پانچ دن کی عین حاضری سے واقعی اُس کا بہت نقصان ہوا تھا۔ اور امتحان جی تو آج بھی اُسے نہیں آئے تو دے رہی تھیں لیکن وہ مندرکہر چلی آئی۔ ساتھ ہی امتحان جی سے یہ بھی کہہ آئی تھی کہ اُس کی دلچسپی دیر میں ہوگی کیونکہ اُسے گزشتہ دنوں کے نوٹس اتارنے تھے۔ لائبریری میں اس وقت خاصا سکون تھا۔ جتنے اسٹوڈنٹس موجود تھے سب اپنے کام میں مصروف تھے وہ ایک نظر میں سب کا جائزہ لے کر آخری بیس پر آئی تھی اور فائل کھول کر اپنے کام میں مصروف ہوئی تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا چار دن چکے تھے اور مسلسل لکھتے لکھتے اُس کی انگلیاں دکھنے لگی تھیں۔ پھر بھی اُس نے ہاتھ نہیں دھو کر کیونکہ اب وہ دین صحنہ لکھتے رہ گئے تھے اور کل پر پھوٹنے کے بجائے اُس نے سوچا اسی وقت تکمل کر لے۔ وقت گزرنے کا احساس بھی تھا ابھی وہ اور تیز ہاتھ چلانے لگی۔ تبھی اُس کی نظروں کے عین سامنے وہ گھڑی آگئی جس کے کھولنے کا اہتمام اس کے اندر سے حضرت نہیں ہوا تھا۔ اُس کا چلتا ہوا ہاتھ رک گیا اور بے اختیار سر اٹھانے لگا تو بہت قریب شاہ سکندر حیات ہونٹوں میں دلغریب مسکراٹھ دہانے کھڑا تھا۔

”آہ“ سراسیمہ سی آپ کہنے کی کوشش میں اُس کے ہونٹ نیم دا ہو کر رہ گئے۔
”جی شاہ سکندر حیات“ وہ ایک ہاتھ سینے پر رکھ کر ذرا سا جھکا تو وہ اُس پر سے نظریں ہٹا کر باہر گھڑی ہاتھ میں لے کر پوچھنے لگی۔

”یہ آپ کو کہاں سے ملی؟“
”اُس روز میرے پاس رہ گئی تھی بلکہ میں نے قصداً اپنے پاس رکھ لی تھی“ شاہ سکندر نے صاف گویا سے کہا۔
”کیوں؟“

”دوبارہ ملاقات کو بہانا چاہیے تھا“ اتنی جرات پر اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیکن وہ کمزور لڑکی نہیں تھی نہ ہی اتنی جلدی خود کو اُس پر عیاں کرنا چاہتی تھی جب ہی پہلے میں قدرے ناگواری سمجھ کر بولی۔
”کیوں؟“

”یہ تو آپ اپنے آپ سے پوچھیں“ وہ کہتے ہوئے اُس کے دامن جاب کر سی کیچ کر بیٹھ گیا تو اُس نے ایک لمحے کو اُسے دیکھا پھر گریبا بات ختم کرنے کی عرض سے بولی۔
”بہر حال آپ کا بہت بہت شکریہ“
”کس بات کا؟“

”گھڑی لوٹانے کا“ وہ کچھ بے نیازی سے کہہ کر اپنی چیزیں سیٹھنے لگی۔ اندازاً ایسا تھا جیسے ابھی اُنہ کر چل دے گی۔ اور واقعی فائل سینے سے لگا کر گھڑی ہوئی تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔
”سینس میں! میں اتنی دور سے آپ کو صرف گھڑی لوٹانے نہیں آیا“ وہ پھر کچھ کہتے رہ گئی اور ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔

”میرا خیال ہے۔ یہاں بیٹھنا مناسب نہیں ہے“
”میرا بھی یہی خیال ہے“ وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ دونوں باہر نکل کر آئے تب وہ کہنے لگا۔
”میں پہلے آپ کے کھر گیا تھا۔ وہاں آپ کے آجاتی سے ملاقات ہوئی۔ اُن سے میں نے آپ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا۔ آپ یہاں ملیں گی“
”جی!“ وہ واقعی بے حد حیران ہوئی۔ ”آپ نے آجاتی سے میرے بارے میں پوچھا۔“

نبیلہ بھابی پہلے تیز ہو کر بولیں پھر جیسے موڑ میں آکر اُسے سمجھانے لگیں۔
”دیکھو۔ تم بہت ذہین لڑکی ہو۔ اپنے پیشے میں بہت نام کما سکتی ہو۔ تمہیں گائے بکری بننے کی ضرورت نہیں ہے کوہاں باب جس کھونٹے سے چاہیں باندھ دیں۔ تمہیں اپنے بارے میں سوچنے کا حق ہے اس حق کو ضرور استعمال کرنا۔ سمجھ رہی ہوں؟“

وہ ایک لفظ جی تک نہیں کہہ سکی۔ کچھ کم صم سے انداز میں دیکھنے لگی۔ تب نبیلہ بھابی اُس کا ہاتھ ہلا کہنے لگیں۔

”مجھے غلط مت سمجھو۔ میں تمہیں اسکا نہیں رہی بلکہ تم پر تمہاری اہمیت واضح کر رہی ہوں۔ میٹرک سے پوزیشن لیتی آ رہی ہو۔ مزید کامیابیاں تمہاری منتظر ہیں۔ اسکا لارٹب ریلیٹ آرس ایس کے باہر جا سکتی ہو لیکن میں جانتی ہوں امتحان جی اور آجاتی ہرگز تمہیں باہر نہیں جانے دیں گے۔ اس کے برعکس دیکھنا تو وہ تمہاری شادی پر زور دیں گے اور میں یہ نہیں کہہ رہی کہ شادی نہیں کرنا، فیروز کرنا لیکن ایسے شخص کے ساتھ جو تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف کرنے کے ساتھ انہیں استعمال کرنے کی تمہیں پوری آزادی اور ایسا شخص تمہارا ہم پیشہ ہی ہو سکتا ہے“

انہوں نے کچھ دیر خاموش ہو کر ٹوٹتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھا پھر رازداری سے پوچھنے لگیں۔
”اس عرصے میں کسی نے پروپوز تو کیا ہوگا تمہیں؟“ اُسے بہت شرم آئی کیونکہ نبیلہ بھابی کے سا، اُس کی بے لکھی نہیں تھی۔ سر جھکا کر دھیرے سے بولی۔

”نہیں بھابی!“
”اس میں قصور کس کا ہے۔ سراسر تمہارا کیونکہ کتابوں سے ہٹ کر کبھی ادھر ادھر دیکھا ہی نہیں ہوگا اُنے“

نبیلہ بھابی یوں افسوس سے بولیں جیسے اُس نے وقت گنوا یا ہو۔
”شاید ایسا ہی ہے“ اُس نے اعتراف کیا۔

”شاید نہیں یقیناً۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں میں تمہیں۔ اور بتاؤ تو کون سا معاملہ ملے گا تمہیں ڈگری کے ساتھ اعترازی سند ملے گی؟“

نبیلہ بھابی جل کر بولیں اور وہ بمشکل اپنی ہنسی روک پائی۔ پھر ایک طرح سے اپنی جان چھڑانے کا خاطر اُن کے ہاتھ تمام کر بولی۔

”بھابی! آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کیا ضرورت ہے اپنے بارے میں سوچنے کی؟“

”صدقے تمہاری معذرت مندی کے“ نبیلہ بھابی کا انداز تیار تھا کہ انہیں اُس کی بات پسند نہیں آئی۔ مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اُنہ گھڑی ہوئیں پھر دروازے تک جا کر پلٹ کر بولیں۔
”سنو! میری باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنا“

”جی!“ اُس نے فوراً سر ہلایا اور اُن کے جلتے ہی گہری سانس کیچ کر بڑکی بچی پر سر رکھ لیا۔ اُسے نبیلہ بھابی کی باتوں سے اختلاف نہیں تھا لیکن اتفاق کرتے ہوئے بھی وہ خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی۔

یہ صبح ہے کہ گزشتہ چار سالوں میں اُس نے کتابوں سے ہٹ کر کبھی ادھر ادھر دیکھا ہی نہیں تھا اور گوکہ ابھی وقت اُس کی دسترس میں تھا لیکن اب وہ کہاں دیکھتی۔ یہاں وہاں ہر طرف ایک ہی جہاں تھی جس کے بارے میں وہ صرف اتنا جانتی تھی کہ اُس کا نام شاہ سکندر حیات ہے۔ حالانکہ اُس روز وہ کلینک سے ہی حضرت نہیں ہو گیا تھا بلکہ اُسے اور عدیل بھابی کو گھر تک چھوڑنے آتا تھا اور عدیل بھابی اُس سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ صرف اسے بٹھایا بلکہ اُس کی خاطر مدارت بھی کی تھی۔ آجاتی بھی اُس سے ملے تھے اور ظاہر ہے اُس نے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا ہوگا لیکن وہ کیونکہ اُس روز سے اپنے کمرے ہی تک محدود تھی۔ اس لیے کچھ زیادہ نہیں جان سکی تھی۔ البتہ اپنے آپ اُس کے بارے میں

”کیوں نہیں پوچھنا چاہیے تمہارا؟“ وہ بظاہر بہت سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں چمکتی شوقی چٹنی نہیں رہ سکی۔ جس پر وہ خشکی سے دیکھنے لگی، تو قدرِ اس باتیں کرو وہ کہنے لگا۔
”بس فوراً سی غلطی ہو گئی ہے۔ اصل بات پچھ لوں ہے کہ میں نے آپ کے آبائی سے آپ کی خیریت معلوم کی تھی جس پر انہوں نے بتایا کہ آپ اب بالکل ٹھیک ہیں اور آج کانج کبھی گئی ہیں؟“
”اور اب سیدھے یہاں پہلے آئے پڑوہ فوراً آگئی۔“

ماشاء اللہ! اندر آپ کی طبیعت کیسی ہے؟
 ”جھٹک بری، بس ذرا“ میمونہ بچائی جانے کیوں خاموش ہو گئیں تو اس نے فوراً ٹوٹا۔
 ”ذرا کیا؟“

کے اندر کسی بے نام سی آرزو نے انکڑائی لی وہ یہ کہہ کر خود کو اطمینان دلاتا کہ کیا کمی ہے۔ میرے پاس سہ کچھ تو ہے۔ اور واقعی سب کچھ تھا لیکن دل کی دنیا خالی۔ ویران کھنڈر جس میں مہر النساء کی محبت بھی پھول نہیں کھلا سکی تھی۔ حالانکہ وہ بے خبر نہیں تھا۔ لیکن کیا کرتا۔ اس کا دل بھی مہر النساء کی طرف مائل ہو سکا۔ اس وقت بھی نہیں جب بابا جان نے ان دونوں کی نسبت طے کی تھی اور اس نے احتجاج کیا کہ کیا تھا کہ کسی اور کا خیال نہیں تھا۔ اور اب خیال، خراب بلکہ دل کی دنیا میں بھی جو پھل بھی تھی وہ اسے مل رہی تھی۔ بڑے برکیت لمحات تھے جب وہ تصور میں اسے مخاطب کر رہا تھا۔ تبھی ملازم جیرا آواز سے اس کا تصور چٹکا پھوڑ گیا۔ بے حد ناگواری سے اسے دیکھ کر غصے سے بولا۔

”کیا بات ہے؟“

”اوجی، تسال ٹول دوڑے شاہ جی نے یاد کیا اسے“

جیرا اس کے غصے سے سہم کر بولی تو وہ مزید سوال جواب کیے بغیر اُٹھ کر اندر چلا آیا۔ بابا جان خلاف معمول اس وقت ہال کمرے میں بی بی جان کے پاس بیٹھے نظر آئے۔ وہ انہیں سلام کرتے ہوئے فاصلے پر بیٹھ گیا تو بی بی جان فوراً اس کی طرف متوجہ ہو کر بولیں۔

”ہم تمہاری آپا نور بانو کی طرف جا رہے ہیں۔ تم بھی چلو“

”میں۔ میرا مطلب ہے اس وقت۔ خیریت تو ہے؟“ اس نے کھوجتی ہوئی نظروں سے باری بارہ کو دیکھ کر پوچھا۔

”سب خیریت ہے بیٹا، بس تمہاری بی بی جان کو اٹانک بیٹی کی بادشاہی مل گئی ہے۔“

بابا جان نے اس کی تشلیش پر تسلی دیتے ہوئے کہا تو بی بی جان کچھ ناراض سی ہو کر بولیں۔

”اٹانک تو نہیں شاہ جی اتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں نور بانو کی خیر خبر نہیں آئی اور اب تو گھبرا رہا ہے۔“

”بڑے یوتھ کی ماں۔ بچوں کے سامنے روتے نہیں ہیں۔ بی بی جان کی آواز مہترانے پر بابا جان انہیں لٹو کا پھر اس سے پوچھنے لگے۔

”چل رہے ہو سکندر؟“

”اگر آپ کا حکم ہے تو ناں نہیں سکتا۔ وہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

”جیتے رہو بیٹا! لیکن یہ میرا حکم نہیں ہے۔ چلتا جا ہو تو چلو۔“ بابا جان نے اس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

”مشکریہ بابا جان! پھر آپ ہوا کہیں۔ میں پھر کسی دن چلا جاؤں گا۔“ اس نے فوراً شکریے کے ساتھ سے معذرت کر لی۔

”اچھی بات ہے۔ ذرا ٹور سے کہو گاڑی نکالے۔ ہم آتے ہیں۔“

بابا جان نے کہا تو وہ باہر نکل آیا۔ اور فوراً ٹور سے گاڑی نکالنے کا کہہ کر وہیں رک کر بابا جان بی بی جان کا انتظار کرنے لگا۔ پھر انہیں رخصت کرنے کے بعد اندر آ رہا تھا کہ معاً شہر بانو کا خیال آیا وہ بی بی جان کے ساتھ نہیں گئی۔ یہی پوچھنے وہ اس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

”شہر بانو! شاہ سکندر نے پہلے پکارا پھر اس کے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہ دوپٹا سنبھالتے ہو کھڑی ہوئی۔

”بی بی جان!“

”تم بی بی جان کے ساتھ نہیں گئیں۔ آپا کی طرف؟“ اس نے پوچھا۔

”میں تو جانا چاہتی تھی لیکن بی بی جان نے منع کر دیا۔ شہر بانو نے کہا۔ انداز سے ظاہر تھا کہ اسے افسوس ہے۔

”کیوں۔ کیوں منع کیا بی بی جان نے؟“

”بتائیں۔“

”اچھا جانے دو۔ میں تمہیں کراچی لے جاؤں گا۔ وہ میرا دوست ہے ناں احمد حسن اس کی امی اکثر کہتی ہیں کہ بی بی جان اور شہر بانو کو لے کر آؤ۔ اس بار میں تمہیں ضرور لے جاؤں گا۔“

اس نے مسکرا کر ایک طرح سے اسے بھلائی کی کوشش کی لیکن وہ منہ پھلا کر بولی۔

”بی بی جان نہیں جانے دیں گی۔“

”میں کہوں گا بی بی جان سے اور دیکھنا وہ منع نہیں کرے گی۔ چلاؤ بھلدی سے موڑ ٹھیک کرو۔ وہ اس کا سر ہلا کر لولا تو وہ ذرا سا ہنسی پھر ہلچلتے لگی۔

”آپ کب جائیں گے کراچی؟“

”چار دن رہ گئے ہیں۔ وہ جیسے دن گن رہا تھا۔ بے وصیائی میں اُسی حساب سے کہہ گیا پھر فوراً احساس ہونے پر قدرے پشیمان ہوا۔ لولا! میرا مطلب ہے۔ تین چار دن میں چلیں گے۔ تمہیں کچھ لینا ہے وہاں سے؟“

”جی، میں بہت ساری شاپنگ کروں گی۔ شہر بانو خوش ہو کر بولی۔

”اچھی بات ہے۔“ وہ اس کے خوش ہونے پر اطمینان سے ہو گیا۔ پھر جاتے جاتے رک کر بولا۔ اب ذرا اچھی سی جائے میرے کمرے میں معبود دو۔“

”ایک منٹ رکھ بھائی!“ شہر بانو کچھ یاد آنے پر اسے روکے ہوئے الماری کی طرف بڑھ گئی۔ وہ خاموشی سے دیکھنے لگا۔ شہر بانو الماری میں سے ایک بیگ نکال کر اس کے قریب آئی اور دونوں ہاتھوں پر بیگ رکھ کر اس کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

”یہ مہر النساء نے آپ کے لیے پیسی ہے۔“

”کیا ہے اس میں؟“ اس کا سارا اشتیاق پل میں رخصت ہو گیا۔

”بھلا میں نے کھول کر نہیں دیکھا۔ ہزار تجسس کے باوجود۔“

شہر بانو شرمی سے مسکرا رہی تھی۔ اور وہ ایک سرسری نظر پیکٹ پر ڈال کر کہنے لگا۔

”میری طرف سے اجازت ہے۔ بے شک کھول کر دیکھو۔ اس کے بعد مہر النساء کو لٹو کر کہنا کہ اسے کسی ایسے شخص کے لیے سنبھال رکھے جو اس کی قدر کر سکے۔“

”بھائی!“ شہر بانو کا دل انجانے اندیشوں سے کانپ کر رہ گیا اور وہ فوراً اس کے کمرے سے نکل گیا تھا۔

اتنا جی آج کل سارا وقت عمر کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ اسے تیل کی مالش کرنا پھر نہلانا اس کے بعد پاؤں دھو، آنکھوں میں بھر بھر سرمہ۔ پھر اپنے پاس ہی سلا لیتیں۔ بس دودھ کے اوقات میں ہی وہ میمونہ بھائی کے پاس نظر آتا تھا۔ اور میمونہ بھائی بڑے آرام سے تھیں۔ اس وقت کچن میں اس کے پاس کھڑی کہہ رہی تھیں۔

”میں نے تو صرف بچے پیدا کیے ہیں۔ ان کی پرورش کی تکلیفیں تو میں جانتی ہی نہیں۔“

”دعا میں دیں اماں جی کو؟“ اس نے کھولتا ہوا پانی کی پاٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”اماں جی کو میری دعاؤں کی کیا ضرورت ہے۔ البتہ تمہارے لیے دعا کرتی ہوں کہ اللہ تمہیں اماں جی جیسی ماس دے۔“

میمونہ بھائی نے بڑے غلوں سے کہا۔

”بیٹے۔ اگر میری قیمت میں سرے سے ساس ہی نہ ہو تب؟“

اس نے شرات سے کہا اور میمونہ بھائی اپنی دھن میں بول گئیں۔

”کیوں نہ ہو، ضرور ہوگی۔“

”اب کہہ دیجئے جیسا ساس کے بنا بھی کوئی زندگی ہے۔“

”بالکل، اپنے لیے تو میں یہی کہوں گی۔ بتا ہے اسلام آباد سے سیما کا فون آیا تھا۔ بہت اصرار سے

امان جی اور تاجی کو بھاری تھی۔ اور میں اس وقت سے یہ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں کہ اگر امان اور تاجی کچھ دنوں کے لیے بھی اسلام آباد چلے گئے تو ہمارا کیا ہوگا؟
میمونہ بھائی نے سانس سسک کر اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا تو وہ بڑے آرام سے بولی۔

”فکر نہیں کریں، ہم بھی ساتھ چلیں گے۔“

”ہاں سارا گھر جانے گا۔ ہمیں تو کھانا ہے اسلام آباد۔“

”اچھا چلیں، پہلے چائے پی لیں۔“

وہ مڑے اٹھا کر بولی اور میمونہ بھائی کے ساتھ کچن سے نکل کر امان جی کے کمرے میں آئی تو وہاں امرا سونیا امان جی کی گود سے ٹھوکنے کی ضد کر رہے تھے اور امان جی انہیں ڈانٹ رہی تھیں۔

”کیوں تنگ کر رہے ہو امان جی۔ کوئی چلو کیا گو بہاں سے۔“

میمونہ بھائی نے سختی سے ڈانٹ کر دونوں کو چھٹکا یا تو امان جی ان پر ناراض ہونے لگیں۔

”ہائیں دلہن! اس طرح ڈانٹتے ہیں بچوں کو۔ دیکھو تو کیسے چھوٹا سامنے کر گئے ہیں یا

میمونہ بھائی تو کچھ نہیں بولیں لیکن وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی۔

”اور جو آپ ڈانٹ رہی تھیں امان جی۔“

”میں کب ڈانٹ رہی تھی؟“

”خیر چھوڑیں، چلے نہیں۔ وہ مڑے میں کب سیدھے کرتے ہوئے بولی۔ پھر چلے بنا کر پہلے آتا پھر میمونہ بھائی کو دیتی۔ اور اپنا کپ لے کر تخت پر آرام سے بیٹھ گئی۔ تب ایک دم نیل کا خیال پوچھنے لگی۔

”نیل نظر نہیں آیا۔ اوپر سے کیا؟“

”نہیں، بڑی دلہن آج اسے اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔“

امان جی نے انکو اسے انداز میں بتایا تو اس نے مزید کچھ پوچھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور تدریس سے محض امان جی کو خوش کرنے کی خاطر کہنے لگی۔

”امان جی! اب عدیل بھائی کی شادی کر دیں۔ گدی رونق میں اضافہ ہو جائے گا۔“

”ہاں امان جی! اب تو ماشاء اللہ عدیل ابھی پوسٹ پر ہے۔ اس کی شادی ہو جانی چاہیے۔ میمونہ نے فوراً اس کی تائید کرتے ہوئے کہا، لیکن امان جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نیلے کیا سوچنے لگا۔

”آپ کو چاہیے عدیل بھائی باہر جانے کا سوچ رہے ہیں؟ اس نے کہا تو امان جی جو تنگ کر لگیں۔

”تم سے کس نے کہا؟“

”خود عدیل بھائی نے۔ کسی جرمن فرم میں ایلائی کر رکھا ہے انہوں نے۔ مجھ سے کہہ رہے تھے میرا ایڈمنٹ ہو جائے تو پھر میں جرمنی چلا جاؤں گا۔ آپ کو نہیں بتایا انہوں نے؟“

”آخر میں اس نے کچھ تعجب سے پوچھا پھر خود ہی کہنے لگی۔

”آپ پریشان ہو جاتی ہیں ناں۔ اس لیے نہیں بتایا ہوگا۔“

”حالانکہ یہ پریشانی کی نہیں خوشی کی بات ہے۔“ میمونہ بھائی کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئیں۔

”بھائی ٹھیک کہہ رہی ہیں امان جی!“

”ہاں تم سب ٹھیک کہتے ہو۔ ایک میں ہی غلط سوچتی ہوں۔“

امان جی رنجیدہ ہو کر بولیں۔ انہیں انھوں اس بات کا بتا کر عدیل بھائی نے انہیں نہیں بتا وہ اندر ہی اندر ہتیاں ہونے لگی کہ ناحق یہ موضوع چھیڑا۔ پھر ان کی دہکونی کی خاطر ان کے گلے ڈال کر بولی۔

”آپ سمجھ غلط نہیں سوچ سکتیں امان جی۔ خیر چھوڑیں اس قصے کو عدیل بھائی کی شادی کی بات کریں۔ کوئی لڑکی ہے آپ کی نظر میں؟“

”ہاں۔ ایک دو لڑکیاں تو ہیں نظر میں لیکن میں سوچ رہی ہوں تم امتحانوں سے فارغ ہو جاؤ پھر تم دونوں کی ایک ساتھ کہیں بات چلاؤں گی؟“

امان جی نے پرسوج انداز میں کہا تو وہ کچھ ٹھنک سی گئی۔ بہت دھیرے سے ان کے گلے میں سے بازو کھینچ کر تدریسے سمت کرتے تھے، یہی تو نیکہ بھائی کی بات یاد آئی۔

”تمہارے ہاں لڑکیاں سارا بڑھا کھا چولے میں تھوکتی ہیں۔ دیکھنا تمہارے ساتھ بھی یہی ہوگا۔ ادھر امتحانوں سے فارغ ہوئیں نہیں کہ امان جی تمہاری شادی کی فکر میں لگ جائیں گی۔“

امان جی اب اسی موضوع پر رول رہی تھیں۔ وہ کچھ غائب و غامض سے سنتی رہی پھر اسی خاموشی سے ان کے پاس سے اٹھ کر آگئی اور اس رات وہ بہت سنجیدگی سے بید بھائی کی باتوں کو سوچ رہی تھی

وہ اس سے پہلے وہ بڑے آرام سے نظر انداز کر چکی تھی۔ کیونکہ بید بھائی خود سری و ہٹ دھرمی کے باعث اپنا وقتا کو بچتی تھیں۔ اس لیے خیال یہی آتا تھا کہ جو عورت اپنا گھر نہیں بنایا رہی۔ وہ دوسرے کو کیا اچھا سبق سکھائے گی۔ اور اب اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں اور انہوں نے یہ بھی تو کہا تھا

”تمہیں اپنے بارے میں سوچنے کا حق ہے اور اس حق کو مزور استعمال کرنا۔“

اور جب وہ اپنے بارے میں سوچنے لگی تو اس کا دل اندر ہی اندر ٹھہرنے لگا کہ سوچ پر وہ قابض تھا جو اس کے ساتھ دن اور وقت طے کر گیا تھا۔ گو کہ وہ جذباتی لڑکی نہیں تھی نہ ہی ایڈمنٹ پر نہیں کھتی تھی لیکن کیا کرتی کہ مقابل شاہ سکندر حیات آگیا تھا جس کی وجہ سے میں ایسا سوچتا کہ اگر کہیں وہ سر راہ نظر آتا

تب بھی شاید وہ ایک بل کو ٹھہر کر اسے مزور دیکھتی جبکہ اب تو وہ خود جل کر آیا تھا اور مزید ریسط بڑھانے کا خواہش مند بھی تھا۔ وہ جانتی بھی تو اسے نہیں روک سکتی تھی۔ جیسے اب بہت کوشش کے

بلو جو اس سے بہت کم نہیں سوچ پا رہی تھی۔ حالانکہ ابھی تک وہ اس کے لیے سوالیہ نشان تھا لیکن وہ جو کوئی بھی تھا۔ آسیہ صلاح الدین اس سے متاثر ہو چکی تھی۔ اور ابھی ہر کوشش میں ناکامی کے بعد بالآخر

اس نے بارمان لی اور نیکہ بھائی کی باتوں کی روشنی میں سوچتے ہوئے اس نے پہلے ہی قدم پر شاہ سکندر حیات کا ہاتھ تھامنے کی خواہش کو دبا یا نہیں تھا۔ جیسا کہ نیکہ بھائی نے کہا تھا۔

”میں یہ نہیں کہہ رہی کہ شادی نہیں کرنا، مزور کرنا لیکن ایسے شخص کے ساتھ جو تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف کرنے کے ساتھ انہیں استعمال کرنے کی باتیں پوری آزادی دے اور ایسا شخص تمہارا ہم پیشہ ہی ہو سکتا ہے۔“

اور نیکہ بھائی کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے وہ سوچنے لگی کہ اگر شاہ سکندر حیات اس کا ہم پیشہ میں سے تب بھی وہ پہلے مقام پر اسے اپنے ارادوں سے آگاہ کر دے گی اور اگر وہ اس کے لیے سنجیدہ

والتو پھر یقیناً اس کی مزید تعلیم اور پھر پریکٹس پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یوں اپنے طور پر وہ سارے طوفان پر سوچ کر اطمینان سے سو گئی تھی۔

اور جس روز شاہ سکندر حیات کو آنا تھا۔ اس روز پہلی بار اس کا دھیان یکدم کے بجائے ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ کبھی نظمیں کہنے کی سے باہر اور کبھی گزری پراکھٹیں۔ جس کی سونیاں پی ایم کی حدود میں داخل ہو جی ہیں۔ اور وہ تنہا خود پر جبر کے بیٹھی تھی۔ پیر یڈ آف ہونے کے بعد بھی وہ فوراً باہر نہیں نکل جاتا تھیں

میں کی آزمائش طلب تھی یا اپنی بہر حال اس کے طے کیے ہوئے وقت کے ہوئے ایک گھنٹہ بعد وہ برنگل کرائی تو پہلی نظر اسی پر پڑی جو اس کے اسباب سے چند قدم آگے لپٹی گاڑی کے ساتھ نیکہ بھائی کے گھر آتا تھا۔ کچھ دیر کو واقعی وہ بڑی طرح رُوس ہوئی لیکن پھر بہت جلد خود پر قابو پا کر قدم اس کی

طرف بٹھا دیے۔ اور اس کے قریب پہنچ کر فوراً معذرت کرتے ہوئے بولی۔

”سوری مجھے بتا ہی نہیں چلا وقت کا۔ آپ کو شاید کافی انتظار کرنا پڑا۔“
 ”مجھ آپ کا انتظار کرنا اچھا لگا۔ پلیز اس نے کہتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ بانگسی پس و پیش کے بعد بیٹھ گئی۔“
 ”کیسی ہیں آپ؟“ وہ ڈرائیونگ پر بیٹھا تو اسے دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ اس نے قصداً سیدھا سا جواب دیا۔
 ”میری آمد کا یقین تھا آپ کو؟“ شاہ سکندر نے بڑی خوبصورتی سے اسے گھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ سہولت سے دامن بچا کر بولی۔

”میرا خیال ہے۔ ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے آپ اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیں۔“
 ”جلدی کیا ہے۔ کہیں اطمینان سے بیٹھ کر بات کر دیں گے۔“

شاہ سکندر نے قدرے بے نیازی سے کہہ کر گاڑی کی اسپید بڑھا دی اور وہ کیونکہ خود کو بہت براعتاؤ ظاہر کر رہی تھی اس لیے ذرا سے کندھے اچکا کر کھینچنے سے باہر دیکھنے لگی۔ تمام راستے اس کے دیکھنے ہوئے تھے۔ جب شاہ سکندر نے ایک فائو اسٹار ہوٹل کے سامنے گاڑی روکی تو وہ یونہی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے کچھ پریشان ہیں؟“ شاہ سکندر نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا اور وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولی۔

”میں زیورہ دیر نہیں روکوں گی۔“
 ”آپ کا اختیار صرف آپ کے لئے ہے۔“ شاہ سکندر نے کہا۔

وہ بات ادھوری چھوڑ کر نیچے اتر گیا، پھر اس کی طرف کا دروازہ کھولا تو وہ خود کو اس کے قدم و کمر پر محسوس کر کے کچھ پریشان سی ہو گئی لیکن جب اس کے ساتھ چلنے لگی تو اپنا آپ بہت محضوظ بہت اچھا لگا۔ گزشتہ دنوں کا سارا اضطراب ساری بے چینی ختم ہو گئی اور اس کے سامنے بیٹھے ہوئے وہ پہلی بار اسے دیکھ کر ذرا سا مسکرائی تو وہ خوشگوار سے احساس میں گھر کر بولا۔

”شکریہ۔“
 ”کس بات کا؟“ اس نے یونہی پوچھ لیا۔

”تمہاری مسکراہٹ نے میرے اس یقین پر مہر ثبت کر دی ہے آسید کہ تمہاری زندگی میں میں اس مقام پر فائز ہو چکا ہوں جہاں مجھ سے پہلے کوئی نہ تھا۔“ میرے بعد کوئی ہو سکتا ہے۔“

شاہ سکندر نے بہت یقین سے کہا پھر ہل پر اپنا ہاتھ پھیلا کر رکھ دیا۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور سوچ کر کہنے لگی۔

”میرا ہاتھ تمہارے سے پہلے سوچ لیجئے شاہ سکندر، اگر میں کوئی بہت عام سی لڑکی نہیں ہوں۔ میرے خواب میری سوچیں صرف ایک خوبصورت گھرنک محدود نہیں ہیں۔ جس مقصد کے تحت میں نے تعلیم حاصل کی اسے میں پس پشت نہیں ڈال سکتی۔ میرے نزدیک یہ سراسر بددیانتی ہوگی۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں؟“

آخر میں اس نے اچانک سر اٹھا کر پوچھا تو وہ جو بہت غور سے اس کی بات سن رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اثبات میں سر ہلانے لگا اور کچھ دیر تک کھڑک بولا۔

”میں تمہارے مقصد کی راہ میں حائل نہیں ہوں گا۔ بلکہ تمہیں مدد دے گا۔“ اور کچھ۔“
 ”اور؟“ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اس ڈور سے داخل ہوتی ہیل بجائی کو دیکھ کر الفاظ اس کے ہونٹوں میں ی رکنے لگے۔ ہیل بجائی اکیلی نہیں تھیں ان کے ساتھ جو کوئی بھی تھا بہت بے تکلفی سے ان کی گریڈ باز دوڑا لے ہوئے تھا اور وہ یہ تو جانتی تھی کہ ہیل بجائی آزاد ماحول کی پروردہ آزاد خیال خاتون ہیں لیکن

اور خیال ہے کہ روی کی جد چھو لے گی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ کوئی اور اگر ہیل بجائی کے ایسی بات کرتا تو شاید وہ کبھی یقین نہ کرتی اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی وہ بھٹانے کی کوشش نہ کرتی لیکن سامنے منظر بہت واضح تھا۔ آف وائٹ سلک کے شلوار سوٹ میں دوپٹے سے بے نیاز بی کہیں سے بھی ہیل کی ماں نہیں ملے گی۔ نہ انہیں بڑے ہیتا کی عزت کا خیال تھا۔ غیر کے اعلیٰ فائز ہونے کی شہرتیں چڑھ گئیں۔ اور وہ سناٹے میں بیٹھی تھی۔

بے فائز کام کہاں کھو گئیں؟ شاہ سکندر نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر کہا تو وہ یونہی گم سم سی بیٹھ گئی۔

”جنت تو تمہارے سامنے موجود ہے۔“ شاہ سکندر نے مسکرا کر اپنی بات پوری کی تو وہ ذرا سا پوچھ کر بولی۔

”میں طرے سے اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر کو ذرا سا جھٹکا دینے کے بعد کہنے لگی۔“
 ”خیال سے چلنا چاہیے۔“

”اگر تیرے تیرے گھر کے کمرے کی بات کو یونہی نظر انداز کر دو گی۔“ شاہ سکندر کا موڈ یکلخت بگڑ گیا۔
 ”میری بات نہیں سنی جا سکتی نہیں کہ تمہارا اختیار اٹھانے کے لئے تمہارے ساتھ تھا۔ اب جب میں جا ہوں گا تب اسکو کی۔ اندر ایسٹنڈ۔“

”یرے خدا! وہ اندر ہی اندر سہم کر رہ گئی۔“



شاہ سکندر نے کچھ دیر خاموش ہو کر مئے دیکھا۔ پھر اپنے لیے پر نام ہو کر کہنے لگا۔
 ”آئی ایم سوری۔“ مجھے تم سے اس طرح بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اصل میں میں۔“

”بلکہ شاہ سکندر؟“ وہ عاجزی سے ٹوکی کر بولی۔ ”میں یہاں بہت دسٹرب ہو رہی ہوں۔ آپ میری کیفیت سن سکتے ہیں۔ چلیں باقی باتیں رستے میں۔“

”اؤکے تم جلد میں آتا ہوں۔“ وہ اس کی عاجزی نظر انداز نہیں کر سکا۔ بلکہ کچھ ٹھٹھک سا گیا تھا۔ جیسی تن کی بات مان کر جانے کا کہا تو وہ ممنون نظروں سے دیکھتی ہوئی جلدی سے باہر نکل آئی اور۔

”مندر کے آتے تک وہ خود دیر قابو پا چکی تھی۔“

شاہ سکندر کا ارادہ آسید کو گھر تک چھوڑنے کا تھا۔ لیکن وہ راستے ہی میں آڑ گئی تب اس سے اگلی ملاقات طے کر کے وہ احمد حسن کے گھر کی طرف چل پڑا۔ جہاں سے اسے شہر باز کو لینا تھا۔ اپنے وعدے کے

دو شہر باز کو ساتھ لے آیا تھا۔ لیکن ابھی اسے ٹھانک کر ان باقی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی چار بجے تھے۔ وہ اسپید بڑھا کر منٹوں میں احمد حسن کے گھر پہنچ گیا۔ شہر باز شدت سے اس کی منظر تھی۔

”ٹھیک کہی میں وہ باتیں فوراً نہیں جانتی تھی۔ لیکن اسے دیکھ کر اب بھی کا خیال تھا۔ بی بی جان نے بہت تاکید اٹھا کر شام دھنسنے سے پہلے واپس آجانا۔ اس نے شاہ سکندر کو دیکھتے ہی وہ منہ پھلا کر بولی۔“

”جانی! آئی دیر لگا دی۔“ اب ہم بازار کو نہیں جاسکتے گے۔“

”فکر نہیں کرو۔ یہاں بازار بہت دیر تک کھلے رہتے ہیں۔ تمہاری شاپنگ آرام سے ہو جائے گی۔“ شاہ سکندر سے اطمینان دلایا۔

”میری شاپنگ تو آرام سے ہو سکتی ہے اور جو بی بی جان نے جلدی آنے کو کیا تھا۔ شہر باز نے اسے اب کیا کر دیں، دیر ہو گئی۔ چلو نا مل جلدی سے چلے پلاؤ پھر ہم چلتے ہیں۔ اور ہاں احمد حسن آفس سے ہیں۔ وہ شہر باز سے بات کرتے ہوئے ایک دم نا مل کی طرف متوجہ ہو گیا۔“

”احمد ہجائی ابھی نہیں آئے۔ آتے ہیں ہوں گے ہنا ملدے کہا تو وہ صوفے پر بیٹھ کر بولا۔“

”اچھا تم جانتے تو بلاؤ گی“
”جانتے تو میں آپ کو بلادی ہوں۔ سکندر بھائی اور وہ بھی بیت ابھی ہی لیکن آپ کو میری ایک بات ماننی ہوگی“
”کیا؟“ وہ سوالیہ لفظوں سے دیکھنے لگا۔

”آج آپ لوگ یہیں تنگ جاؤں۔ محل چھٹی کا دن ہے۔ ساحل پر چلیں گے بیت مزہ آئے گا۔ ناٹلہ نے خوش ہو کر پروگرام بنا لیا تو وہ فوراً شہر بازو کو دیکھنے لگا کہ آیا دونوں نے پہلے سے یہ پروگرام بنایا ہے یا وہ ناٹلہ کی خواہش ہے۔ اور اس کے دیکھنے پر شہر بازو نے اشارے سے منع کر دیا۔ تب وہ ناٹلہ سے معذرت کرتے ہوئے بولا۔

”سوری ناٹلہ۔ آج ہمارا رکننا ممکن نہیں ہے۔ پھر کسی دن بلکہ خاص چھٹی ہی کے دن میں شہر بازو کو لے آؤں گا۔“
”مجھے بتا تھا آپ میری بات نہیں مانیں گے۔“ ناٹلہ روٹھ کر بولی۔

”اور اب تم مجھے جانتے بھی نہیں بلاؤ گی؟“
”نہیں خیر چلنے تو ضرور بلاؤں گی۔“ ناٹلہ فوراً خشکی بھول کر چائے بنانے چلی گئی تو وہ شہر بازو سے کہتا تھا۔
”تم انہی سے مل لو اور ان سے جاننے کی اجازت بھی لے لو۔ شہر بازو خاموشی سے چلی گئی تب وہ دریا ٹانگیں جھلک کر آرام سے بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا تھا۔ وہ آج ہی شہر بازو کو آسیہ کے گھر لے جائے گا۔ لیکن وقت ہی نہیں تھا۔ چائے پینے کے بعد اس نے احمد حسن کا انتظار بھی نہیں کیا اور اس کی امی سے دو جلد آئے کہ کبہر شہر بازو کو خانیک کے لیے طاق روڈ لے گیا۔

شہر بازو بی بی جان کے درے بہت جلدی کر رہی تھی۔ حالانکہ اس نے بار بار اطمینان دلایا کہ بی بی جان ناراضگی کو وہ خود فیس کرے گا۔ وہ آرام سے خریداری کر لے۔ لیکن شہر بازو بہت جلدی فارغ ہوئی۔ ”بس جہاں آجے اور کچھ نہیں لینا۔“ شہر بازو نے مزید کہی خود بے سے انکار کر دیا۔
”چلو پھر کسی دن صرف اور صرف تمہاری شانیک کے لیے آؤں گے۔“ وہ بوجھ گیا شہر بازو کو بی بی جان کی ناراضگی خیال پر لیٹان کر رہا ہے۔ جیسی مزید اصرار نہیں کیا۔

”شام تو یہیں ہوگی۔ ہر رات میں یہیں ہے۔ شہر بازو نے گاڑی میں بیٹھے ہی کہا۔
”شام تو یہیں ہوگی۔ ہر رات میں یہیں ہے۔ شہر بازو نے گاڑی میں بیٹھے ہی کہا۔
”ہوں۔“ اس نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ اور احتیاط سے گاڑی بیک کرتے لگا۔ پھر جب کشادہ شہر تک پہنچا تو اس کا دھیان بٹانے کی خاطر پوچھنے لگا۔

”کیسا وقت گزرا تمہارا ناٹلہ اور اس کی امی کے ساتھ؟“
”بیت اچھا۔ کبھی آپ انہیں شاہ پور سے کرا آئیں ناں۔“
”تم نے دعوت دی انہیں؟“

”ہاں۔“
”پھر ضرور آئیں گی۔“ اس نے کہا تو شہر بازو تعجب سے پوچھنے لگی۔
”کیوں آپ نے کبھی نہیں بلایا انہیں؟“

”یہ بات نہیں ہے اصل میں وہ شاید اس انتظار میں تھیں کہ پہلے میرے گھر سے کوئی آئے۔ آ۔ جو تو اب وہ بھی آئیں گی۔“ اس نے کہا تو شہر بازو فوراً بولی۔
”پھر تو مجھے بہت پہلے آنا چاہیے تھا۔“

”میں؟“ وہ یوں کبہر خاموش ہو گیا۔ اصل بات شروع کرنے سے پہلے کی خاموشی تھی۔ ایک طرح سے ذہن کو تیار کر رہا تھا اور یہ کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ پھر ایکدم سے یاد آئے پر بظاہر سرسری اچھوٹے ہوئے لگا۔

”سنو۔ تم نے میرا سنا دوس کا پکیٹ لوٹا دیا تھا؟“
”نہیں۔“ شہر بازو جو سری ہوئی۔

”کیوں؟“ سنو سرسری انداز لیکن پیشانی پر گہری لکیر نمودار ہو گئی تھی۔
”کیا میں بوجھ لگتی ہوں کہ آپ اس کا اتنی محنت سے دیا ہوا تحفہ کیوں لوٹنا ناچاہتے ہیں؟ شہر بازو نے اٹل سوال کر کے گویا اس کی شکل آسان کر دی۔ برصے آرام سے بولا۔

”یہی بتانے کے لیے تو میں یہیں لے کر آیا تھا۔ لیکن انہیں تمہاری اس سے ملاقات نہیں کرا سکا۔“
”گس ہے؟“ شہر بازو غواہی دینا اور انہیں بہت دور سے سناتے دی۔ شہر بازو نے اس کی روز ہو گیا تھا۔ لیکن مسلسل جھوٹے سلاطین کی کشاہ سکندر کی کیفیت پر ہم ہنسنا سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ کیونکہ بدے میں وہ شاہ دادوں سے منسوب ہے۔ اس کا بھائی اتنا خود غرض نہیں ہو سکتا کہ اپنی کسی خواہش سے مغلوب ہو کر بہن کے ارمانوں کا حق کر دے۔ کتنا مان تھا بہن کو اپنے بھائی پر جسے ٹوٹنے میں ایک بل لگا۔

”آسیہ سے؟“ وہ اسی قدر کبہر خاموش ہو گیا۔ بلکہ انتظار کرتے لگا کہ وہ سوال پر سوال کرے گی۔ کون ہے کہاں رہتی ہے۔ آپ کو کہاں ملی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن دوسری طرف سنا تھا۔ جسے محسوس کر کے شاہ سکندر نے اپنے طور پر آخری بات کہی۔

”خیر آسیہ سے تمہاری ملاقات ہو جائے گی۔ لیکن بی بی جان کو تم ابھی بتا دینا کہ میں میرا سنا سے شادی نہیں کروں گا۔ اور مارے صدمے کے شہر بازو سے بولا ہی نہیں گیا۔ ورنہ اگر کچھ نہیں تو اتنا ضرور کہیں کہ وہ یہ بات خود بی بی جان سے کہہ دے، اسے دریا میں ڈالتے۔ اور شاہ سکندر نے اس کے بعد کچھ کہنا ضروری ہی نہیں تھا۔ بتانے پر شہر بازو کی کیفیت سمجھ نہیں رہا تھا یا اقصاء نظر انداز کر رہا تھا۔ باقی دو گھنٹے کے سفر میں یوں اجماع بنا رہا جسے وہ اس کے ساتھ موجود ہی نہ ہو۔

پھر سولہ کے برے گھٹ سے داخل ہو کر گاڑی ابھی ڈرائیو سے پر رنگ رہی تھی کہ شہر بازو بہت جلدت میں اتر کر تیز تیز دروں سے اندر چلی گئی۔ وہ ہونٹ بیٹھے اسے دھکتا رہا۔ پھر محل جان کو لیکر گھر کے گاڑی پورج میں کھڑی کر کے کہہ کر اندر آتا تو سیدھا بی بی جان کے کمرے کا رخ کیا۔ بی بی جان وفتا کی مٹا پر پڑھنے میں مصروف تھیں۔ وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھ کر ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

”میونہ بھائی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے وہ ایکدم خاموش ہو گئی۔ کیونکہ ادھر سے بیلہ بھائی آ رہی تھیں۔ اور ان پر نظر پڑتے ہی اسے دوہرا واقعہ یاد آ گیا تھا۔ حسب عادت بیلہ بھائی سرسری انداز میں بیلہ بھائی ہوتی ہوتی ان دونوں کے قریب سے گزرتی رہا جیسا چوہہ کیوں۔ تب بھی وہ ایسے ہی کچھ کسم کسم ہی تھی۔
”کیا انہوں نے؟“ ایمان سے مجھے تو رشک آتا ہے۔“ میونہ بھائی نے کہا تو وہ چوہہ کمر بٹھپنے لگی۔
”کیا کیا؟“

”میں کبہر ہی ہوں اصل زندگی تو بیلہ بھائی کی ہے۔ کوئی فکر ہی نہیں۔ آرام سے دن چڑھے تک سوئی ہوں۔ اس کے بعد جہاں دل چاہے گویا کوئی مردک لوگ نہیں آ رہا جیسا دیکھو کشان سے آتی ہیں۔ میونہ بھائی کے لیے میں حسرت نہیں محسوس کرتی بلکہ کچھ مذاق کا عنصر تھا۔ وہ ذرا سا مسکرائی اور اس موضوع سے بچنے کی خاطر بولی۔

”ہم کیا باتیں کر رہے تھے۔ ہاں عدیل بھائی کی شادی، اماں جی بتا رہی تھیں ان کی نظر میں ایک دو لڑکیاں ہیں۔“
”اچھا کون ہے؟“ میونہ بھائی نے دلچسپی سے پوچھا۔ تو اس نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔
”بتا نہیں۔“

”کہاں تم نے پوچھا نہیں اماں جی سے؟“ میونہ بھائی نے تعجب سے کہا۔
”یہ تو بھئی۔“ میونہ نے عدیل بھائی کے ساتھ میری شادی کا ذکر فیئر دیا تھا۔ اس لیے میں خاموشی سے ان کے پاس سے اٹھ گئی تھی یا اس نے اپنی مجبوری بتائی تو میونہ بھائی ہنسنے لگیں۔
”آپ نہیں کہیں کہیں رہی ہیں؟“

”ہاں نہیں کہیں۔ ویسے میری کچھ مین رہیں آتا کہ ہمارے ہاں لڑکیاں اتنا پڑھ لکھ کر بھی اپنی شادی کے ذکر نہیں کرتیں۔“

پر خاموش کیوں ہو جاتی ہیں۔ میمونہ بھائی نے بڑے مخطوط سے انداز میں کہا۔

”بھیر کیا کہیں؟ اسے میمونہ بھائی کے مخطوط ہونے پر مبنی آئی۔
”میں نے کم از کم اپنی مرضی تو ضرور بتایا کرتی۔ ویسے ہتھاری کیا مرضی ہے؟“ میمونہ بھائی نے اتنا اچانک بول چا کر وہ بھائی کی گئی۔

”میری کیا مرضی ہو سکتی ہے؟“
”کیوں نہیں۔ آخر اپنے بارے میں کچھ سوچا تو ہو گا تم نے؟“
”ابھی تک تو نہیں سوچا۔ لیکن اب ضرور سوچوں گی۔ اس نے لیے جھکے انداز میں بات اٹائی تھی عدیل بھائی اپنے کمرے سے نکل کر آئے اور انہیں دیکھ کر لوٹے۔

”نوٹو، دو غائبین جہاں بٹھ جائیں؟“
”تم بھی آ جاؤ؟“ میمونہ بھائی نے کہا تو اس نے کرسی کھینچ کر آگے کر دی۔
”مجھے یارنی دکھاں ہے؟“ عدیل بھائی نے بیٹھتے ہی پوچھا۔
”مجھے سب سو گئے۔ میمونہ بھائی نے بتایا تو وہ تعجب سے بولے۔

”آئی جلدی؟“
”بہت شور کر رہے تھے، تمہارے خلیل بھائی نے ڈانٹ کر سلايا ہے۔“
”یہ زیادتی ہے۔ مجھ سے کہا تو میں انہیں باہر لے جاتا، یوں بھی کل چھٹی ہے۔“

عدیل بھائی نے آخر میں اس سے پوچھا۔
”نیل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ شام میں بڑے بھیا اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے وہاں سے واپسی پر کچھ دیر آسٹاں جی کے پاس لیٹا پھر بڑے بھیا اُسے اوپر لے گئے۔“ اس نے بتایا تو عدیل بھائی تشویش سے پوچھنے لگے۔

”زنا وہ طبیعت خراب تو نہیں ہے؟“
”نہیں موسیٰ بخار ہے۔ مع تنگ انشاء اللہ اتر جائے گا۔“ اس نے تسلی دی پھر پوچھنے لگی۔ ”آپ کے لیے چلتے لاؤں؟“
”نہیں پہلے ہی نیند نہیں آرہی۔“ عدیل بھائی نے منع کیا تو میمونہ بھائی انہیں دیکھ کر شرارت سے ہنستے ہوئے بولیں۔

”بچہ جوان ہو گیا ہے اب اکیلے میں اسے نیند نہیں آتی۔“
”اٹ یہ میمونہ تجاں؟“ اسے بے حد شرم آئی اور عدیل بھائی بھی اس کی موجودگی کے باعث سٹپا کر لوٹے۔

”آپ تو خاموش ہی رہا کرتی ہیں۔“
”کیوں خاموش رہا کروں؟ خلیل کہتے ہیں۔ تم بولتی ہو تو بہت اچھی لگتی ہو۔“ میمونہ بھائی نے ایک ادا سے کہا جس پر وہ سبے ساتھ ہنس اور مٹی تو عدیل بھائی کو بھی آئی لیکن منہ بنا کر لوٹے۔
”اؤں یوں بڑے بددوق ہیں خلیل بھائی یا پھر انہوں نے آپ کو خاموش دیکھا نہیں ہو گا؟“

”تمہارا مطلب ہے؟“
”جناب آپ خاموش بیٹھی بہت اچھی لگتی ہیں۔ کیوں آسیر؟“ عدیل بھائی نے اس سے تائید چاہی۔
”بھائی! مجھے تو میمونہ بھائی ہر حالت میں اچھی ہی لگتی ہیں۔“ اس نے کہا تو عدیل بھائی مصنوعی حیر سے بولے۔

”ماہم تم جھوٹ بھی بولتی ہو؟“
”کوئی جھوٹ نہیں۔ بالکل سچ کہہ رہی ہے یہ۔“ قدر سے خوش میں میمونہ بھائی کی آواز اور بچی ہو گئی تھی۔
”غالباً ان کی آواز پر ہی خلیل بھائی کی آنکھ کھل اور انہوں نے وہیں سے انہیں دیکھ لیا۔
”جلئیے۔“ آپ کے جوان کو نیند نہیں آرہی؟ عدیل بھائی کو بدلدہ اُتارنے کا موقع مل گیا۔ سرگوشی میں

بھانج کو چھڑ کر کہا تو وہ انہیں گھورتے ہوئے اُٹھ کر چل گئیں۔ تب عدیل بھائی بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

”چلو بھی آسیر، تم بھی سو جا کر۔“
”جی جانی! میں ذرا آگین دیکھ لوں۔“ دہکتے ہوئے اُٹھ کر کچن میں آگئی۔ دو چار برتن میز پر رکھے تھے انہیں دھویا پھر لائٹ آف کر کے نکلی تو سڑھیں پر بڑے بھیا کو دیکھ کر ٹھٹھک کر وہیں رُک گئی۔

”کیا بات ہے بڑے بھیا۔ کچھ چاہیے؟“ بڑے بھیا آخری سیریلی تک آئے تو اس نے پوچھ لیا۔
”ہاں، نہیں۔“ بڑے بھیا کا ذہن جیسے کام نہیں کر رہا تھا۔ پھر سوچ کر بولے۔ ”ہاں وہ تم ذرا نیل کو دیکھ لو، بہت بے چین ہو رہا ہے۔ بخار بھی تیز ہو گیا ہے۔“

”جیس؟“ وہ کچھ پریشان سی ہو کر بڑے بھیا سے پہلے ہی سڑھیاں بھلا گئی ہوئی اوپر آگئی۔ اس بخار کی حالت میں بھی نیل کمرے میں اکیلا تھا۔ اسے مقصود تھے پیرست رحم آنا۔ جس کی ماں دوسرے کمرے میں اطمینان سے سو رہی تھی۔ وہ اندر جی اندر کڑھتی ہوئی نیل کو جیک کر کے نکلی، بخار بہت تیز تھا لیکن بڑے بھیا کے سامنے اس نے تشویش ظاہر نہیں کی۔ بلکہ تسلی دی۔

”پیر لسانی کی بات نہیں ہے بڑے بھیا۔ بخار اتر جائے گا، اسے میں اپنے پاس لے جاتی ہوں۔“
”نہیں بھیا۔ اسے یہیں رہنے دو، تمہیں تنگ کرے گا۔“
”نہیں بھیا! میرے پاس یہ آرام سے سوتے گا۔“ وہ کہہ کر نیل کو اٹھانے لگی کر بڑے بھیا آگے بڑھ آئے۔

”نکو۔ میں لے چلتا ہوں۔ تم اسے اٹھا یا نہیں جائے گا؟“ وہ بیچھے بیٹ لگی پھر اسی طرح بڑے بھیا کے پیچھے چلتی ہوئی سڑھیاں اتر کر اپنے کمرے میں آئی۔ اور جب بڑے بھیا نیل کو اس کے میڈر برٹا کر چلے گئے۔ تب وہ کٹورے میں ٹھنڈا پانی لے کر آئی اور اس میں کچھ اچھو بھلو کر نیل کے ماتھے پر رکھنے لگی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد جا کر کچن بخار کم ہوا۔ تب وہ قدرے اطمینان سے ہو کر اس کے ساتھ لیٹ گئی۔ ابھی بھی اسے نیند نہیں آرہی تھی اور اس نے سونے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کچھ دیر تک نیند بھائی کے بارے میں سوچتی رہی پھر سر جھٹک کر ان کی طرف سے دھیان مٹا یا تو ذہن کے دہیکوں پر شاہ سکندر حیات دستک دینے چلا آنا۔ اب وہ اس کے لیے سواہی نشان نہیں تھا۔ واپسی کے راستے میں اس نے اپنے بارے میں اسے بتایا تھا۔

چار سال سے وہ امیر کیس تھا۔ وہاں سے ایگر یکو میں ماسٹر کر کے گزشتہ سال لوٹا تھا اور ظاہر ہے بڑے رزیندار کا بیٹا تھا۔ اسے لوگ کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک طرح سے شاہی زندگی گزار رہا تھا۔ اور اُسے اس نے یقین دلایا تھا کہ شاہ پور میں وہ اُسے پورا کام پھیل کر دے گا۔ اور اس کے لیے کوئی بڑی بات بھی نہیں تھی۔ اس وقت اسے سوچتے ہوئے وہ خود کو کبھی حویل اور کبھی ہاسٹل میں چلتا پھرتا محسوس کر رہی تھی۔

”مع تنگ نیل کا بخار اُتر چکا تھا۔ بڑے بھیا اُٹھتے ہی نیچے اُتر کر آئے۔ اُس وقت وہ نیل کو اپنے ماتھے سے ناشتا کر رہی تھی۔ بڑے بھیا کو دیکھ کر ابھی جگہ سے اٹھنے لگی کہ انہوں نے ہاتھ سے بیٹھے نہتے کہا اشارہ کیا پھر نیل کے قریب آکر پوچھنے لگے۔

”اب کیسی طبیعت ہے بھیا؟“
”پاپا! میں تو رات کو آپ سے پاس سویا تھا پھر بھوکے پاس کیسے آگیا؟“ ان کی بات کا جواب دینے کی بجائے نیل غالباً جو سوچ رہا تھا وہی پوچھ لیا۔
”آپ کو کس لے کر آئی تھی؟“ بڑے بھیا نے نیلے وہ بول بڑی۔

”اب بخار تو نہیں ہے اسے؟“ بڑے بھیا اس سے پوچھنے لگے۔
”نہیں بھیا! بالکل نہیں ہے۔ آپ بیٹیں ناں۔“ اس نے پھر اٹھنا چاہا۔
”بس چلتا ہوں، تم اس کا خیال رکھنا۔“ بڑے بھیا جانے کیوں نظر میں چرا کر لوٹے اور نونہا کمرے سے

نکل گئے۔ ”بھو بھو! کیا کہاں ہیں؟“ نبیل نے پوچھا تو وہ جو بڑے بھیا کے جانے پر اُن کے پیچھے دیکھ رہی تھی چونک کر بولی۔

”سو رہی ہیں۔ چلو تم جلدی سے یہ ضمیمہ کرو بھرا اور سونیا آجائیں گے تو تم اُن کے ساتھ باتوں میں لگ جاؤ گے۔“

”بس بھو بھو! اچھا نہیں لگ رہا۔“ نبیل نے منہ بنایا تو اُس نے ہنسی سے ہنسی میں رکھ دیا۔ اور اُسے آرام سے بیٹھنے کی تاکید کرتے ہوئے اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اس کے امتحانوں میں صرف دو مہینے رہ گئے تھے۔ اور وہ بالکل اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گئی۔ سب جانتے تھے امتحانوں کی وجہ سے وہ سب سے کٹ جاتی ہے اور کوئی اُسے دُشرب بھی نہیں کرتا تھا۔ پھر اب تو اُس کا آخری سال تھا۔ اس لیے میوزن بھائی بھی اس کے کمرے میں کم ہی آتی تھیں۔ ورنہ انہیں کہاں چین آتا تھا۔ جب تک گھنٹوں کے حساب سے اس سے باتیں نہ کر لیں۔ اُن کا کھانا پیچہ نہیں پڑتا تھا۔

اب ہجاری سارا وقت اماں جی کے پاس بیٹھی اُن کی سُننی دیتی تھیں۔ کسی کسی وقت اُسے چائے دینے جاتیں تو اُن کی ہنسی شکل دیکھ کر وہ مسکرا کر کہتی۔

”بس بھائی کچھ دنوں کی بات ہے پھر ہم بہت فراغت سے مل بیٹھیں گے۔“

”یہ کچھ دن ہی تو نہیں گزر رہے؟ اُس وقت اُس کے تسلی دینے پر وہ اُٹھا کر بولیں۔

”اچھا چلیں میرے چائے پیئے تک آپ یہیں بیٹھ جائیں۔ اور اتنے دُلت میں جتنا بول سکتی ہوں بولیں۔ اُسے اُن پر رحم آگیا۔ کتاب بند کر کے ایک طرف رکھی اور چائے کا کپ اٹھا کر پوری طرح اُن کی طرف متوجہ ہو کر میوزن بھائی بہت خوش ہو کر بیٹھیں لیکن پھر فوراً ہی بھڑکیں۔

”کیا بولا؟“ وہ حیران ہوئی۔

”اُس وقت نہیں بیٹھ سکتی۔ مہمان کو چائے وغیرہ بھجوانی ہے۔ میوزن بھائی نے عجلت میں بتایا۔

”کون آیا ہے؟“ اُس نے یونہی پوچھ لیا۔

”وہ آیا ہے عدیل کے ساتھ۔ لیکن نام ہے اس کا شاہ سکندر۔ میوزن بھائی ایسے ہی عجلت میں بتاتے ہوئے چلی گئیں۔ اگر ایک لمحہ بھی ٹھہرتیں تو اُس کی دھڑکنوں کی آواز سُن سکتی تھیں۔

کیسا اُلٹا کھانا خوشگوار احساس تھا کہ وہ ہیں اُس کے پاس موجود ہے۔ ایک بل کو پلکیں موند کر اُس نے اُس کی موجودگی کو شدت سے محسوس کیا۔ پھر جلدی سے چائے پی کر خالی کپ رکھنے کے۔ یہاں تک کہ اُن کو عدیل بھائی میوزن بھائی سے کہہ رہے تھے۔

”جانے فرسٹ کلاس ہونی چاہیے بھائی اور یہ ٹرائل میں کیا سجا رکھا ہے آپ نے۔ ہٹائیے یہ سب میں اور سامان لے کر آ جا ہوں۔“

”ادوفو۔ تم تو بول کر رہے ہو، جیسے کوئی نواب آیا ہو۔“ میوزن بھائی کچھ ہنسنے لگے۔

”نواب سے کچھ نہیں۔“ عدیل بھائی کہتے ہوئے بہت تیزی میں باہر نکل گئے، تب وہ آگے بڑھ کر آئی اور ٹرائل پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

”یہ سب ٹھیک تو ہے اور کیا چاہیے عدیل بھائی کو؟“

”تیار نہیں، ایسے ہی اس کے آئے پر لو کھلا جاتا ہے۔ خیر، ہٹاؤ یہ سب۔“ میوزن بھائی نے کہا تو وہ ٹرائل میں کبھی مختلف لوازمات سے بھری بیٹھیں نکال کر رک پر رکھنے لگی۔

”کچھ دیر بعد عدیل بھائی جانے کی کچھ لے کر آ گئے۔ اور شاہ پرزائے تھا کہ میوزن بھائی سے کہنے لگے۔

”بھائی پلینز آپ اب اندر آئے آئیے گا؟“

”نہیں بھئی، میں نہیں پکار لوں گی۔ خود ہی آکر لے جانا۔“ بھائی نے حذر پر نظر ڈالتے ہوئے گویا اپنے حزبِ جیلے کا احساس دلایا۔ تب وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

”میں بے آؤں گی بھائی۔ آپ جائیں۔“ عدیل بھائی نے کچھ چونک کر اُسے دیکھا لیکن وہ شاہ پرزائے کھلنے میں مصروف ہو چکی تھی۔ پھر نے سر سے سے ٹرائل سجا کر میوزن بھائی کو اس میں چائے رکھنے کا کہا اور ہاتھوں سے بال ٹھیک کرنے لگی۔

”تیرا خیال ہے دوپٹہ کوئی ڈھنگ کا اور ڈھ۔“ میوزن بھائی نے کہا تو وہ مسکرا کر بولی۔

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ پھر ٹرائل دھکیلے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئی تو سامنے آبا جی کو بیٹھے دیکھ کر قدرے جھج کر دروازے کے پاس ہی رُک گئی۔ پھر وہیں سے پلٹا چاہتی تھی کہ آبا جی نے اُسے اشارہ کر دیا۔

”السلام علیکم! شاہ سکندر اُسے دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں جو جھجک لہرائی تھی اُسے یکسر نظر انداز کر کے وہ سادہ سے انداز میں پوچھنے لگی۔

”کیسے ہیں آپ؟“

”ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟“ اُس نے ذرا سا سر ہلانے کے ساتھ اُسے بیٹھے کا اشارہ کیا پھر عدیل بھائی کو بول دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو میرے لیے کیا حکم ہے۔ اور عدیل بھائی اُسے میرا بی کے فرائض سونپ کر خود اطمینان سے اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تباہیوں کے دونوں کس ممنوعہ پر بات کر رہے تھے۔ جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا دوبارہ وہیں سے شروع ہو گیا۔ اُس نے ٹرائل میں سے نکال کر تمام لوازمات نبیل پر رکھے پھر چائے بنانے کے لیے ٹرائل کھینچے ہوئے آبا جی کے پاس آ بیٹھی۔

”یہ اتنا ٹھیک کر ڈالا آپ نے؟“ عدیل بھائی کے کہنے پر وہ ٹرائل کی طرف بڑھائی تو وہ کہنے لگا۔

”کچھ بھی نہیں ہے آپ نہیں تو؟“ عدیل بھائی نے پلٹ اٹھا کر اُس کی طرف بڑھائی تو وہ کہنے لگا۔

”پیلے آبا جی کو؟“

”نہ تو سامان۔ میں بس چائے پیوں گا۔“ آبا جی نے کہا تو اُس نے ایک اچھٹی نظر اُس پر ڈالی جو بڑے ہی کپ سیدھے کر رہی تھی پھر اُلکیم سرا پوچھا کہ اُس سے پوچھنے لگی۔

”آپ چینی کتنی لیں گے؟“

”ایک پیچ۔“ وہ اس کے اچھٹی انداز پر مظلوم ہو کر بولا۔ پھر پوچھنے لگا۔ ”آپ کی بڑھائی کیسی جا رہی ہے؟“

”بس اب تو ڈاکٹر بننے والی ہے۔“ اُس سے بیٹے عدیل بھائی بول پڑے۔

”اچھا۔ مگر ہم بی وغیرہ کر لیتی ہیں۔“ شاہ سکندر نے اُڑاؤ مذاق کہا تو وہ بھی اُس کے انداز میں بولی۔

”مگر ہم بی نہیں جیہ بھائی کر لیتی ہوں۔“ شاہ سکندر کے ساتھ عدیل بھائی بھی بے ساختہ ہنسنے اور آبا جی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

”میری بیٹی بہت قابل ہے۔“

”اسی لیے میں کہتا ہوں آبا جی کہ اسے ایف آر سی ایس کے لیے باہر بھیج دیں۔“ عدیل بھائی نے کہا تو اُس نے چونک کر انہیں دیکھا لیکن دھیان آبا جی کی طرف تھا کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں اور آبا جی نے اُن کے جواب میں کچھ نہیں کہا بلکہ ممنوعہ ہی بدل گئے۔

”شاہ سکندر کچھ لے نہیں رہے۔“ لوناں بیٹیا۔ اور اُس نے دیکھا شاہ سکندر اطمینان سے ہو گیا تھا۔

تب وہ باری باری سب کو چائے نکھا کر کمرے سے نکل آئی۔ اور نبیل برآمدے میں بیٹھے کیرم بورڈ فیل رہے تھے۔ اُس نے کچھ دیر رُک کر اُن کے کھیل کو دیکھا پھر اتار لئی کہ کمرے میں آئی۔ میوزن بھائی بھی وہیں موجود تھیں۔ اُسے دیکھتے ہی پوچھنے لگیں۔

”مہمان چلا گیا؟“

”نہیں میں چلی آئی۔“ اپنے ہی کسی خیال میں رہ کر اُس نے کہا اور اماں جی کے پاس بیٹھ گئی۔

تبی ہولی طویل دوپہر میں ختم ہونے میں ہی نہیں آکر رہی تھیں۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے شہر بازو نے ٹیس پر ہرگز کر دیر تک نظر ڈال کر دھوپ میں سرخسے جگ رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں زیادہ دیر تک دھوپ میں نہیں دیکھ سکیں۔ اس طرف سے رُخ موزا آؤں آئینوں کے سامنے وارے سے بٹنے لگے۔ کچھ دیر بعد منظر صاف ہوا تو عجب وہ سست روی سے اپنے کمرے میں آگئی۔ ان طویل دوپہروں میں ہمیشہ وہ بھرپور زندگی گزارتی تھی۔

لیکن جس روز سے شاہ سکندر نے اپنا بوجھ اُس کے کانہوں پر ڈالا تھا۔ دوپہر کو کیا رات کی نیندیں بھی اُچاٹ ہوگئی تھیں۔ اور خود شاہ سکندر گتے آرام سے تھا۔ اُس کا اطمینان دیکھ کر نئے شہر بازو نے اندر والا دمک اٹھاتا تھا۔ یعنی اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کتنی عموں کا خون کرنے جا رہا ہے۔ اپنی محبت میں اسنا خود غرض ہو گیا کہ بہن کا بھی خیال نہیں اُٹا اپنا بوجھ اُس پر ڈال دیا۔

”بی بی جان سے کہہ دینا میں تمہارا سارے شادی نہیں کروں گا۔“ آج صبح بھی وہ اُسے بہت تاکید سے کہہ گیا تھا اور اُس کے لیے بی بی جان تک اُس کا پیغام بھی بنا کچھ مشکل تو نہیں تھا۔ لیکن اس نے بعد اُٹھنے والے طوفان کو سوچ کر ہی وہ اب تک خاموش تھی۔ جانتی تھی کہ اُس طوفان میں اس کا بھی اتنا ہی نقصان ہو گا جتنا ہم انسان کا۔ اتنے دن اُس نے بہت کوشش کی کہ خود کو فریب دینے کی کہ شاہ سکندر کا انکار اُس کی زندگی پر اتنا نڈر نہ ہو کہ ہرگز کہیں اُسے کامیابی نہیں ہوتی۔ یہ نہیں تھا کہ اُسے اپنی یا شاہ بارون کی محبت پر بھروسہ نہیں تھا۔ بہت یقین تھا۔ لیکن اس کے ساتھ وہ بی بی جان کی روایات کو بھی اچھی طرح جانتی تھی۔

اس لیے اپنے دل میں کسی خوش فہمی کو جگہ نہیں دے سکی۔ مسلسل ذہنی اشتراک کے باعث اُسے اپنا جو کسی نامعلوم ٹکٹے میں جکڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ شام میں بی بی جان کے بلانے پر وہ اُن کے کمرے میں آئی تو دل جا بان کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ کم از کم دل کا بوجھ تو ہلکا ہو رہی جائے گا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی۔ کیونکہ بی بی جان پہلے ہی کچھ برہم دکھائی دے رہی تھیں۔

”سکندر آج پھر کراچی گیا ہے۔“ وہ جیسے ہی بی بی جان کہنے لگیں: میں نے تمہارے بابا جان سے پوچھا ہے اُن کا تو ایسا کوئی کام نہیں ہے پھر سکندر کس کام سے ہر چوتھے دن کراچی جانا جاتا ہے؟

”میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ فردی طور پر وہ بھی کہیں کسی کو نہ کچھ نہیں پاتی تھی کہ بی بی جان اُسے شاہ سکندر کا یہ بیانیوں بتا رہی ہیں یا اُس سے سوال کر رہی ہیں۔“

”کیوں اُس روز تمہیں بھی تو اپنے ساتھ لے گیا تھا، کوئی خاص خریداری بھی نہیں کی تم نے پھر سارا دن کہاں رہے؟“ بی بی جان نے اُسے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

”میں سارا دن جہان کے ساتھ نہیں تھی بی بی جان؛ وہ مجھے اپنے دوست احمد حسن کے گھر چھوڑ کر کسی کام سے چلے گئے تھے۔ سہمہ پیر میں واپس آئے تب مجھے شاپنگ کے لیے لے گئے اور وہاں سے ہم سیدھا یہاں چلے آئے تھے۔“ اُس نے کچھ رُک کر عارف کو لے بتایا تو بی بی جان بوچھنے لگیں۔

”احمد حسن کے گھر کون کون ہے؟“

”اُن کی والدہ اور جھوٹی بہن۔ دونوں بہت اچھی ہیں۔ مجھ سے بہت محبت سے ملیں۔“ اُس نے بتانے کے ساتھ تعریف بھی کی۔

”سکندر کے سامنے آئی ہیں وہ خواتین، پردہ نہیں کرتیں۔“ بی بی جان کے مشکوک انداز پر وہ جمر بنز کر بولی۔

”نہیں۔“

”ہوں۔“ بی بی جان ہنسا رہا بھر کر جلنے کیا سوچنے میں لگ گئیں۔ اُسے اُلجھن ہونے لگی۔ قدرے توجہ سے محنت کر کے بولی۔

”اب شادی کسی غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہیں بی بی جان سکندر جہان نائلہ کو بالکل بہنوں کی طرح بچہ ہیں۔“ بی بی جان نے ایسی تیز نظروں سے گھورا کہ وہ اندر ہی اندر سہم کر وہ گئی۔ اور وہاں سے اُٹھنے کا بہ

سوچنے لگی۔

”شہر بازو، میں بتیاری ماں ہوں۔ مجھ سے اگر تم کچھ پچھنا یا بھی چاہو گ تو نہیں چھپا سکو گ۔“ بی بی جان نے پہلے اُسے گویا تینسنگ بھر کینے لگیں۔

”میں دیکھ رہی ہوں۔ جس روز سے تم سکندر کے ساتھ کراچی سے ہو کر آئی ہو پریشان ہو۔ ایسی کیا بات ہوئی ہے وہاں یا تم نے کیا دیکھا ہے؟“

”میں کچھ نہیں جانتی بی بی جان؛“ وہ اُنھوں میں چہرہ ہچکا کر رو پڑی۔

”گناہ نہیں جانتیں؟“ بی بی جان نے اُس کا رد ناقصاً نظر انداز کر دیا۔ اور ایسے جھمٹے لیے میں پوچھا کہ وہ ڈر کر جلدی سے بولی۔

”آسیہ کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتی۔ جہان نے بھی زیادہ کچھ نہیں بتایا بس اتنا کہا ہے کہ وہ مہر النساء سے شادی نہیں کروں گے۔“

”کیا؟“ بی بی جان چکر لگیں۔ ”یہ۔ یہ کہہ کہہ سکندر نے تم سے؟“

”اسی روز، جب میں اُن کے ساتھ کراچی تھی کچھ بدشکل مرحلے سے گزر کر اب وہ در سے پرسکون ہو گئی تھی۔“

”اور تم نے اُس روز مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

”تانا چاہتی تھی اور جہان نے تو بہت تاکید کی تھی کہ میں فوراً آپ کو بتا دوں لیکن میری بہت نہیں ہوا۔“ اُس نے صاف گوئی سے اپنی بے بسی ظاہر کی تو بی بی جان کچھ دیر تک اُسے دیکھی رہیں پھر کہیں سانس کے ساتھ جیسے اپنے آپ سے بولی۔

”تو شاہ سکندر کسی ٹوکی کے چتر میں ہر تیسرے چوتھے روز کراچی جاتا ہے؟ پھر ایک دم نرم ہو کر اُس کا ہاتھ تھپک کر کہنے لگیں۔

”تم اپنے دل و دماغ پر کوئی بوجھ مت ڈالو۔ ماں باپ کے ہوتے ہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے جہاں اور سنا بھی یہ بات اپنے تک ہی رکھنا۔“

”جی۔“ اُس نے جھجکے ہوئے سر کو آہستہ سے ہلایا پھر بوچھنے لگی۔ ”میں جاؤں بی بی جان؟“

”ہاں اور دیکھو سکندر اُسے تو اسے میرے پاس بھیج دینا بی بی جان کی اجازت ملے ہی وہ اُن کے کمرے سے نکل آئی۔“

”بی بی جان یہ بات کس بات پر جہاں کو ڈانٹ رہی تھیں۔ وہ کیسے نظر انداز کر کے رہا رہا میں نے ٹھہر گئی اور وہاں سے برآمدے میں نکل آئی شاہ سکندر نے صبح سے اپنے جانے کا بتایا تھا لیکن واپسی کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا اور جلنے آج اُس کی واپس مکن تھی یا نہیں۔ وہ کتنی دیر تک دوش پر قبل کر اُس کا انتظار کرتی رہی۔ پھر تھک کر فوراً سے کنڈیر پر آجیجی۔ دن بھر کی گرمی کے بعد اب کچھ ہوا چلنے لگی تھی۔

شاہ لوہس جات اور شاہ جہاں کی جات کے نیچے یوں جھلکتے ہوئے کمروں سے نکلے جیسے انہیں قدر سے رہا ملی ہو۔ اُن کے شور پر وہ آپ ہی آپ اُن کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اور کچھ دیر تک انہیں کیستے اور ایک دوسرے کے پیچھے جھلکتے ہوئے دیکھ رہی پھر اُن کا اُٹھنے کو بھی کہ بڑے گھٹ سے داخل ہوتی پھر و کو دیکھ کر اُس نے اُٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اُس کا دھیان شاہ سکندر کی طرف تھا۔ اور وہ انتظار بھی اُسی کا کر رہی تھی۔ لیکن اُس کی بجائے شاہ مارون کے ساتھ مہر النساء کو دیکھ کر اُس کا دل اندر ہی اندر پیٹنے لگا۔

ہنسی کی طرح وہ بے اختیار مہر النساء کی طرف لپکی بھی نہیں بلکہ اُس طرح اپنی جگہ بیٹھ رہی۔ شاہ مارون نے اندر جاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اُسے سلام کیا تب وہ کچھ ہوش میں آکر کھڑی ہو گئی۔ اور مہر النساء کو دیکھ کر کوشش سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”آنا ہی تھا تو صبح سے آئیں۔“

”باقاعدہ پروگرام کے تحت نہیں آئی۔ وہ تو ابھی مارون جہان اُسرے تھے مجھ سے پوچھا چلو گ اور میں جیل پر رہی۔“ مہر النساء نے یوں بتایا جیسے اُس کے من کی مراد برائی ہو۔

”اچھا کیا۔ آؤ اندر چلیں۔“ وہ ہمیشہ کی طرح میرا ساؤ کھینچنے کی بجائے نظریں چڑھا کر بولی۔
 ”تم تیناں اکل بیٹی کیا کر رہی تھیں؟“ میرا ساؤ نے اُس کے ساتھ چلتے ہوئے یونہی پوچھ لیا اور وہ
 بلا ارادہ سچ بول گئی۔
 ”میں سکندر بھائی کا انتظار کر رہی تھی۔“
 ”کہاں گئے ہیں؟“ میرا ساؤ کے لیے میں ہمیشہ والی بے قرار رہتی تھی۔ اور اس بار وہ سنبھل کر بولی۔
 ”کراچی۔ اصل میں، میں نے اُن سے کچھ چیزیں منگوائیں تھیں خصوصاً دو تین ناول جن کا کچھ شدت
 سے انتظار تھا۔ اور میں نے بھائی سے کہا بھی تھا کہ آج مجھے بہ حال میں مل جائے چاہیں۔ لیکن دیکھا بھی
 تک نہیں آئے۔“

”بیت غیر ذمہ دار ہیں مبتادے جہاں اور لاہور ابھی؟“ میرا ساؤ نے کہا تو وہ ہمیشہ کی طرح اُسے جھٹلا
 نہیں سکی۔ بلکہ یوں بن گئی جیسے اُس کی بات سنی ہی نہیں۔ اور اندر داخل ہو کر کھینچنے لگی۔
 ”تم نے بی جان سے مل لو پھر اوپر آ جانا۔ بی بی جان اپنے کمرے میں ہوں گی۔“ میرا ساؤ کچھ کہے بغیر
 بی بی جان کے کمرے کی طرف مڑ گئی اور وہ اوپر چل آئی۔

اس وقت میرا ساؤ کی آمد نے اُسے خاصا پریشان کر دیا تھا۔ کیونکہ ذہنی طور پر وہ بہت ایک سیٹ
 تھی۔ اور اُسے خدشہ تھا کہ کہیں میرا ساؤ کے سامنے بے دھانی میں وہ کوئی ایسی بات نہ کہہ جائے جو اُسے
 شبہ میں مبتلا کر دے۔ جیسا اُس کے اوپر آنے تک وہ مسلسل خود پر قابو پانے میں لگی رہی۔
 ”آف، اتنی گرمی میں کیسے بیٹھی ہو۔ پردے تو ہٹاؤ، میرا ساؤ نے کمرے میں آتے ہی کہا تو اُس نے
 جلدی سے پہلے پٹیلے کا تین آن کیا پھر کھڑکی سے پردے کھینچنے لگی۔ میرا ساؤ نے اپنا بڑا سا دوپٹہ اتار
 کر ایک طرف رکھا پھر کھڑکی کے قریب آ کر اندھیرے میں دیکھنے ہوئے بولی۔

”بارش ہونے کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ لیکن شکر ہے ہوا چلتے لگی ہے۔ دن میں اتنی گرمی تھی
 ”ہوں۔“ وہ اپنے ذہن کو حاضر رکھنے کی خاطر بلوری توہم سے اُس کی بات سن رہی تھی۔ لیکن جواب میں صرف
 ہوں کہہ کر رہ گئی۔

”کیا بات ہے؟“ کچھ دیر بعد میرا ساؤ اُس کی خاموشی محسوس کر کے ٹوکتے ہوئے بولی: ”آج تم کچھ چپ
 چپ سی ہو۔ بی بی جان نے بھی زیادہ بات نہیں کی۔“
 ”بی بی جان آج کچھ غصے میں ہیں۔“ اُس نے یونہی بات بنا ڈالی۔

”خیر مت۔“ وہ اسی قدر کہہ سکی پھر فوراً موضوع بدلتے ہوئے کہنے لگی: ”یاد آ یا ہو۔ میں کراچی سے بہت
 اچھے گاؤں کی ٹیکس لائن ہوں سنو گی؟“
 ”معلوم۔“ میرا ساؤ نے اشتیاق سے کہا تو وہ فوراً ریک کے پاس آ کر لیٹ دیکھنے لگی۔ لیکن پھر یاد آ یا کہ
 اُس روز اُس نے ساری چیزیں الماری میں رکھ دی تھیں۔ ریک چھوڑ کر الماری کھولی اور جیسے ہی شاپرنگ لٹنے
 لگی آگے رکھا میرا ساؤ کا پکیٹ جو اُس نے شاہ سکندر کے لیے دیا تھا۔ بیچے آ رہے تھے اُس سے پہلے ہی میرا ساؤ
 نے پیک کر اٹھا لیا اور بہت خاموشی غلوں سے اُسے دیکھنے لگی تھی۔

”میں جانتا ہوں بتاؤ وقت کتنا قیمتی ہے۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب جب تک تم امتحانوں سے
 فارغ نہیں ہو جاؤ گی شہر تو کیا بتاؤ میرا ساؤ نے خیالوں میں بھی نہیں آؤں گا۔“ شاہ سکندر کے بلائے پر وہ آگے
 مٹی لیکن شاہی بھی تھی جس سے وہ اُس سے آئندہ احتیاط کا وعدہ کرتے ہوئے بولا۔ تو اُس کی آخری بات پر وہ اپنی
 بے ساختہ مسکراہٹ چھپانے کی خاطر چہرہ موڑ کر لہروں کی سرکشی دیکھنے لگی۔ لیکن وہ اُس کی مسکراہٹ دیکھ کر
 تھا۔ پھر بھی قصداً انجان بن کر چند قدم آگے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ قریب آ کر پوچھنے لگی۔

”جب آپ جانتے ہیں میرا کچھ قیمتی ہے پھر ملنے پر آنا ضرور کیوں تھا؟“
 ”میں شاہ پور جانے سے پہلے یہ یقین چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے حالات میں تم میرا ساتھ دو گی۔“ شاہ سکندر

اُس کے چہرے پر نظریں جھا کر کہا۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ کچھ اُلجھتی تھی۔ اور اُس نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ ادھر ادھر لوں دیکھنے لگا۔
 جیسے بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہا ہو۔ پھر جیسے اپنے آپ سے بولا۔
 ”میرا خیال ہے یہاں تک نہیں ہے آؤ ادھر ریسٹورنٹ میں بیٹھیں۔“ وہ کچھ نہیں بولی خاموشی سے
 اُس کے ساتھ چل پڑی۔ ریسٹوران میں داخل ہو کر شاہ سکندر نے ایک میبل کی طرف ہاتھ اٹھا کر اُسے وہاں
 بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی مدد دہانے کے تحت ٹرے اٹھا کر اُس کی سینڈویچز اور ڈرنکس رکھنے لگا۔
 پھر آ کر ٹرے اُس کے سامنے رکھتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”کیسے یاد آ دام آپ کے لیے؟“
 ”نہیں۔“ اُس نے ہاتھ اٹھا کر اُسے مزید بولنے سے روک دیا اور اُس کے بیٹھنے پر کہنے لگی۔
 ”ترے جبر کا امتحان اب پھر بھی لے لیتے گا۔ اس وقت میں سخت الجھن محسوس کر رہی ہوں۔“
 ”سو رہی، میں تمہیں اُلجھانا یا پریشان کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی تم پریشان ہونا۔“ وہ ایک دم سنجیدہ

ہو کر بولا۔
 ”کیا کوئی ایسی بات ہے؟“ اُس نے اُس کے لیے میں آپ ہی آپ اندر بیٹھ سٹ آئے تو وہ اُس کی آنکھوں
 میں دیکھ کر قصداً مسکرایا پھر کہنے لگا۔

”تینا نہیں تم کچھ رہی ہو۔ میں تو تمہیں بیڑنا نا چاہتا ہوں کہ تمہارے امتحانوں کے فوراً بعد میں اپنے
 گھر والوں کو آؤں گا۔ تمہیں جانتا ہوں گھر والوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا ناں۔“ وہ جو اُس پر نظریں
 جماتے بیٹھی تھی۔ اُس کی بات پر نہ شرمائی نہ لجائی اُسی طرح اُسے دیکھتے رہتی پھر پلکیں جھکا کر بولی۔

”میرا خیال ہے اصل بات کچھ اور ہے۔“
 ”اصل بات یہی ہے۔ باقی ساری باتیں اس کے بغیر ہیں؟“ وہ فوراً بولا۔
 ”میں سن رہی ہوں۔ آپ بلا جھجک باقی ساری باتیں بھی کہہ ڈالیے؟“ وہ مزید شفاف سطح پر انگلی سے
 آؤی ترچھی لکیر میں کھینچتے ہوئے بولی تو وہ کچھ دیر تک اُس کی جھکی ہوئی پلکیں کو دیکھتا رہا پھر سوچ کر کہنے

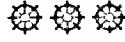
لگا۔
 ”مجھے غلط نہیں سمجھنا آسیہ، میں تمہارے ساتھ اتنا ہی غلط ہوں جتنا اپنے آپ کے ساتھ۔ میں
 نے تمہیں دیکھا۔ پسند کیا اور پھر تمہیں اپنانے کا فیصلہ کر کے ہی میں نے تمہاری طرف پیش رفت کی۔ اگر
 محض دوستی یا دقت گذری کا خیال ہوتا تو میں کبھی تمہارے گھر تک نہ پہنچتا۔ بہر حال مجھے یقین ہے تمہارے
 گھر میں کوئی بھی مجھے ناپسند نہیں کرتا۔ لیکن اصل مسئلہ میرے گھر کا ہے۔ جہاں برادری کے باہر شادی
 کا تقوید نہیں ہے۔“ وہ جو سر جھکے سکون سے اُس کی بات سن رہی تھی۔ ذرا سی پلکیں اٹھا کر اُسے دیکھنے
 لگی۔ لیکن وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ جیسی رکنا نہیں۔

”صرف جامد لاؤ گی وجہ سے آپس ہی میں رشتے طے کر دیے جاتے ہیں۔ اگر اچانک تم نے آ کر میری
 زندگی میں پہنچ کر نہ جانی ہوئی تو شاید بلکہ یقیناً میری زندگی کی ناؤ بھی ایک محفوظ دھارے پر بہہ نکلتی۔ لیکن
 اب ایسا نہیں ہے۔ بلکہ تم سے ہٹ کر سوچ بھی نہیں سکتا اور میری پہلی کوشش یہی ہو گی کہ میرے
 والدین غور سے میرے فیصلے کو قبول کر لیں۔ دوسری صورت میں؟“ وہ خاموش ہو کر ایک دم اُس کی آنکھوں
 میں دیکھنے لگا۔ تو وہ ہونٹ جھینچ کر نظروں کا زاویہ بدل گئی۔ شاہ سکندر سمجھ نہیں پایا کہ وہ کیا سوچ رہی
 ہے۔ قدرے وقت سے کہنے لگا۔

”تم نے پوچھا نہیں کہ دوسری صورت میں کیا ہوگا؟“
 ”میں جانتی ہوں، دوسری صورت میں آپ سب چھوڑ کر چلے آئیں گے۔“ اُس نے کہا تو وہ فوراً بے تاب

سے بولا۔
 ”اور میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ اس صورت میں تم میرا کتنا ساتھ دو گی۔“ اُس کی بے تاب شدت سے
 محسوس کرنے کے باوجود وہ فوراً جواب دینے کی بجائے سوچ کر بولی۔

”بی بی جان! وہ شہر باؤنے آپ کو بتایا ہوگا۔ میرا مطلب ہے، آسیہ کے بارے میں۔“
 بی بی جان بہت خاموش نظروں سے اُسے دیکھنے لگی تھیں۔ وہ اپنے آپ رگ گیا۔ اور محض اُن کی نظروں
 سے بچنے کی خاطر اُلٹھ کر کھڑکی سے دُرا سا پردہ سرکایا پھر وہیں سے کھینے لگا۔
 ”اگر نہیں بتایا تو میں بتا رہا ہوں کہ میں آسیہ کو پسند کرتا ہوں۔ اور اُس سے شادی کا فیصلہ کر چکا ہوں۔“
 کتنے دیر بعد اُسے احساس ہوا کہ بی بی جان نے کچھ کہا نہیں۔ پلٹ کر دیکھا تو ایک پل کر اُس کی رنگوں میں ہلکی گردش
 قسم کی جھٹی سامنے بابا جان کھڑے تھے۔



شاہ سکندر نے سکینڈ کے ہزاروں حصے میں خود پر قابو پایا اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔
 ”بڑی مبارک ساعت ہے کہ بی بی جان اور بابا جان میرے کمرے میں موجود ہیں۔ ایسے موقع پر وہ کیا
 باتیں کہیں گی اُن کو۔“
 ”سکندر حیات! ہمیں چکر دینے کی کوشش مت کرو، تم جانتے ہو ہم ہر اچھری پسند نہیں کرتے۔“
 بابا جان نے ٹوکتے ہوئے غصہ ناک لہجے میں کہا ”تو وہ اُن کے غصہ سے مرعوب ہوا بھی تو ظاہر نہیں کیا
 بنت سبیل کر بولا۔“
 ”میں بھی ہر اچھری پسند نہیں کرتا بابا جان پوچھ لیجیے بی بی جان سے۔ سیدھے صاف گفتگو میں نہیں
 نہیں بتایا ہے کہ۔“
 ”اُن سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے برخوردار ہم تہا ری بات سن چکے ہیں۔ اب تم سن لو کہ ہمارے فیصلے
 ہر کچھ ہو رہے ہیں۔“
 بابا جان نے خورہ ہی اس انداز میں اُس پر واضح کیا کہ مزید اس سلسلے میں کچھ نہیں سنیں گے اور وہ بھی
 ذرا بولی پڑا۔

”میں آپ کے فیصلے کو چیلنج نہیں کر رہا بابا جان۔“
 ”پھر تمہارا مقصد کیا ہے؟“
 ”آپ دیکھ رہے ہیں میری بات سنیں؟ وہ چاہتا تھا سہولت سے بیٹھ کر اپنا مدعا بیان کرے۔ لیکن بابا جان
 نادہ نہیں ہوئے۔“
 ”تم تہا ری کوئی بات نہیں سنیں گے۔ اس لیے کہ تم انسا سے تمہاری نسبت ہم نے بالائی بالا طے نہیں
 تھی۔ تم نے پوچھ کر تمہاری مرضی سے بد رشتہ طے سوا تھا۔ کیوں پولیس کی ماں؟ بابا جان نے ایکدم بی بی جان کو
 مایہ دل کیا تو وہ جو بہت خاموشی سے بابا جان کی گفتگو سن رہی تھیں۔ اثبات میں سر ہلانے لگیں۔
 ”تو پوچھو اس سے کہ اب اسے میرا انسا میں کون سے عیب نظر آنے لگے جو۔“
 ”خدا کے لیے بابا جان! ایسی باتیں نہیں کروں۔“ وہ عاجزی سے بولا۔ ”میں ایسے کسی سبب سے مہر انسا کو
 جکڑ نہیں کر رہا۔ بلاشبہ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔“
 ”اور میں اچھی لڑکی اس کھڑی بہو بنے گی۔“ بابا جان کے حتمی انداز پر وہ ہونٹ بھیج کر بی بی جان کو دیکھنے لگا۔
 ”شاید وہ کہیں کسی پھر اُن کی طرف سے سالیوں سو کر قدرے جرات سے بولا۔“
 ”کہ اُن میں تو اُسے بیانیے نہیں جاؤں گا۔“
 ”کیا کہا۔“ انتہائی غصے سے بابا جان کی آواز بیٹھ گئی۔ ”سُرخ آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے چند قدم
 اُسے گھر کرک گئے۔ اور کچھ دیر تک اُس پر نظریں جھانڈے رکھنے کے بعد کھینے لگے۔“
 ”میرا ہی وقت تمہیں شرف کر سکتے ہیں۔ یا اگر چاہیں تو عاقبت کر کے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے نکال دیں۔“
 ”تو ایک ہی ہے۔ لیکن ہم ایسا نہیں کر دیں گے۔ تمہارے بچاؤ ہو کیوں؟“
 اس قدر ٹھہرا ہوا سفاک تہج تھا کہ اس کو ٹل جان کا پورا وجود سن ہو گیا۔ بہت کوشش کے باوجود وہ

”لو کہ میرے بارے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار میرے والدین کو ہے۔ لیکن میں جانتی
 میری مرضی کے بغیر وہ خود سے کوئی فیصلہ نہیں کریں گے، اور شاہ سکندر جبات آپ ہی نے لو کہ
 کہ آپ میری زندگی میں اُس مقام پر فائز ہو چکے ہیں۔ جہاں آپ سے پہلے کوئی تھا نہ آپ کے
 کوئی ہو سکتا ہے۔“
 ”آسیہ! شاہ سکندر نے بے اختیار اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ تو وہ گہرا کر بولی۔

”بلیز کچھ خیال کریں۔“
 ”سواری!“ وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا۔
 ”میرا خیال ہے چلنا چاہیے۔“ وہ گھڑی دیکھ کر بولی۔ اور فوراً کھڑی بھی ہو گئی تو مجبوراً شاہ سکندر
 اٹھنا پڑا۔
 ”والہی کے رستے میں وہ لقصاً اس مومنوع سے ہٹ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اور جب وہ
 اسٹاپ پر اُترنے لگی تب روک کر کہنے لگا۔
 ”سنو! تم ابھی کچھ مدت سوچنا میرا مطلب ہے اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالنا۔ ہو سکتا ہے تم
 امتحانوں کے بعد جب میں اُن دنوں میرے ساتھ بی بی جان اور بابا جان بھی ہوں۔ وہ کیا کہی۔ ذرا
 پلانے پر اتفاق کیا۔ پھر سچے اُتر کر اُسے دیکھنے لگی تو وہ مسکرا کر بولا۔
 ”جلدی آؤں گا۔ خدا حافظ۔“ اس کے ساتھ ہی گاڑی آگے بڑھائی اور ویو مہر میں اُسے دیکھنے
 لمحہ بہ لمحہ دور ہونے کے باوجود اُسے اپنے ساتھ ساتھ محسوس ہو رہی تھی۔

شاہ سکندر تمام راستہ ہی سوچتا آیا تھا کہ اگر شہر باؤنے بی بی جان کو آسیہ کے بارے میں
 بتایا ہوگا تو آپ وہ خود ہی سبلی فرصت میں بی بی جان سے بات کرنے کا۔ کیونکہ اب زیادہ دن
 تھے۔ اور وہ جانتا تھا کہ بی بی جان اور بابا جان آسانی سے نہیں مانیں گے، اگر مہر انسا سے اُس کی
 طے نہ ہوئی ہو تو تب بھی اُن کا ماننا مشکل تھا۔ اور اب تو ظاہر ہے اُن کے پاس جواز موجود تھا۔
 حوالی آتے ہی اُس نے سیدھا اپنے کمرے کا رخ کیا۔ خیال تھا شاید لینے کے بعد پہلے شہر باؤنے
 گا۔ لیکن جیسے ہی منادوں نے گھر کا کسی وقت بی بی جان اُس کے کمرے میں آگئیں۔ انہیں دیکھ کر وہ
 ہونے کے ساتھ کچھ نادام ہو کر بولا۔
 ”میں ابھی آپ ہی کے پاس آ رہا تھا بی بی جان۔“ بی بی جان اُس کے بیڈ پر آرام
 گئیں اور اُس کی بات کی نظر انداز کرتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”کراچی سے آ رہے ہو؟“
 ”جی ہاں۔“ وہ دُور پردہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ لیکن اُن کے چہرے پر کوئی غیر معمولی تا
 تھا۔
 ”تھوڑے کہاں تھے؟“
 ”جی ہاں میں۔“

”وہاں کوئی ننگہ کیوں نہیں خرید لیتے۔ اکثر جانا ہوتا ہے۔ تمہارے بابا جان بھی جاتے رہتے۔“
 گھر بیٹا جیسے۔ میں کہوں گی تمہارے بابا جان سے بی بی جان نے سرسری سے انداز میں کہا پھر
 کہ وہ اُن کے گفتگوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
 ”میں جس نان بی بی جان، کہاں جا رہی ہیں؟“

”میں تمہارے لیے جاتی ہوں۔ منتر سے آ رہے ہو۔“
 ”ہاں چائے کی غائیش تو ہے۔ لیکن آپ بیٹھیں۔ میں جہاں سے کہہ آ رہی ہوں۔“ وہ کہتا ہوا کہ
 نکل آیا۔ زینہ اُترتے ہی جہاں نظر آئی۔ اُسے جلدی سے جانے لائے گا کہ وہ دیں گے پلٹ
 بی بی جان کے پاس بیٹھے ہی ہیں اچانک بلا ارادہ ہی کھینے لگا۔

اُن کی طرف دیکھ نہیں سکا۔
 "کیونکہ ابھی میرا لہو اس حویلی کی پہر بننا ہے۔ جسے تم بیاہ کر لاؤ گے۔"
 باباجان اسے ٹوٹا کر منہ کا سبب بنا کر فوراً اُس کے کمرے سے چلے گئے۔ اور جب بی بی جان
 پیچھے جانے لگیں تب ایک دم ہوش میں آکر وہ ایک ہی جست میں اُن کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اور اُن کے
 کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"بی بی جان! میں آپ کو اور باباجان کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔
 اور کس طرح ناراض کروں گے؟" بی بی جان کے شان کی لہجے پر وہ زنج پرور بولا۔

"آپ میری بات تو سنیں؟
 "نہیں سکندر راجا! جو کچھ تمہارے باباجان کہہ گئے ہیں اسے حرف آخر سمجھو۔"
 بی بی جان نے اُس کی بات سننے سے صاف انکار کر دیا۔ تو گہری سانس لیجئے ہوئے اُس نے اُن
 کندھوں پر سے ہاتھ ہٹا لیے پھر اُن کے سامنے سے ہٹے ہوئے بولا۔
 "کہہ دیجیے باباجان سے کہ میرا لہو کو بیاہنے میں نہیں میری لاش جلنے گی۔"
 بی بی جان نے دہل کر اُسے دیکھا تھا۔

شاہ سکندر کے لیے کوئی بات غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا باباجان اور بی بی جان کو رام کرنا آسان
 پھر بھی وہ مالوس نہیں تھا۔ اور ابھی تو بات شروع ہوئی تھی۔ اُس کے خیال میں پہلے چلے پر ہی ہوتا
 باباجان اسے ٹوٹ کر منہ کی دھکی دے گا۔ پھر کچھ دن ناراضی کا اظہار اس کے بعد آپ ہی آپ
 جائیں گے۔ اس وقت وہ یہی سب سوچتا ہوا اپنے کمرے سے نکل کر ٹیس پر آ کھڑا ہوا۔ شام اُڑ
 چنے اُسے بے پناہ خاموشی کا احساس ہوا۔ اُس جیسے اُس کے پاس بلکہ پوری حویلی میں اور کوئی
 نہ ہو۔ پھر اچانک ہلچل مچ گئی۔ اُس نے رینگ رینگ کر کچھ جھانک کر دیکھا۔ باباجان شاہ لو
 کے ساتھ بہت تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے اُن کے پیچھے دو تین ملازم جھانک
 باوجود درمیان فاصلہ کم نہیں ہونے دے رہے تھے۔
 اُس نے بہت خاموشی سے باباجان اور شاہ لوئس کو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا اور جب گاڑی
 ہونی حویلی کی حدود سے نکل کر سیاہ چٹائی ہوئی سڑک پر فرارے پھرنے کی تک اُسے ہلکا خیال نہیں آیا
 وقت باباجان کہاں گئے ہیں۔ اور اس خیال کے ساتھ ہی وہ کچھ ٹھٹھک گیا۔ کیونکہ یہ باباجان
 نہیں تھا۔ اور ابھی وہ اس غیر معمولی بات پر غور کر رہی رہا تھا کہ عقب سے شاہ جہانگیر نے اُسے

"سکندر!"
 "جی بھائی!" وہ بے اختیار فوراً پلٹ کر انہیں دیکھنے لگا تو قریب آکر انہوں نے یونہی
 "کہاں کیا کر رہے ہو؟"
 "کچھ نہیں، باباجان کو دیکھ رہا تھا، کہاں گئے ہیں؟" اُس کی سوچ آپ ہی آپ سوال کی صورت
 آگئی۔
 "باباجان کہاں گئے ہیں؟" شاہ جہانگیر نے اُن کا اُس سے پوچھا۔ انداز ایسا تھا جیسے انہیں
 جلنے کی خبر ہی نہیں۔

"جانتا نہیں، میں نے ابھی انہیں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ لوئس بھائی بھی ساتھ تھے۔"
 "اچھا، مجھے نہیں معلوم، شاہ جہانگیر کے بے نیازی دکھانے پر وہ خاموش چور ہوا۔ اُس
 دھڑاتے ہوئے شاہ جہانگیر نے خود گاڑی کے انداز میں کہا۔
 "شام ہو رہی ہے، پھر اُسے دیکھ کر بولے۔ "آؤ اندر چلیے ہیں۔"
 "جی۔" وہ اُن کے ساتھ اپنے کمرے میں آگیا۔ ٹیوٹ لائیٹ اُن کی پھر انہیں بیٹھنے کا

"گناہ ہے۔ آپ کو بچتے یاد آ رہے ہیں۔"
 "ہاں ہاں! بس اب جلدی سے چھٹیاں ہوں تو جا کر انہیں لے آؤں! شاہ جہانگیر بیٹھے ہوئے بولے۔
 "میرا تو خیال ہے بھائی! بچوں کو گراچی کے کسی اچھے اسکول میں داخل کرادیں۔ قریب ہی ہے ہر

یک اینڈ پر آ سکتے ہیں۔"
 اُس نے کہا تو شاہ جہانگیر منہ بناتے ہوئے بولے۔
 "نہیں یار! مجھے کراچی کی آب و ہوا پسند نہیں ہے۔ موسموں کا ہوتا ہی نہیں چلتا ہے۔
 "سوں! وہ کیا کہتے ہیں اُن کی نائید کر کے رہ گیا۔

"سننا ہے۔ تمہیں کراچی کا موسم راس آگیا ہے؟"
 شاہ جہانگیر نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ ذرا سا چونکا پھر اُن کا اشارہ سمجھ کر اُس کے ہونٹ
 ے ساتھ مسکراہٹ کی گرفت میں آگئے۔ جبکہ نظروں میں وہ خوبصورت سراپا آن سما تھا جس کی خاطر وہ اپنی
 بذاتی روایات تو کیا ساری دنیا سے لڑکتا تھا۔ شاہ جہانگیر نے گہری نظروں سے اُسے کھوجا پھر کہنے

"محنت محنت کی ہے تم نے، جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟"
 "زیادہ سے زیادہ باباجان مجھے ٹوٹ کر دیں گے، اُس نے اسے آرام سے کہا کہ شاہ جہانگیر کو واقعی
 مدید ٹھکانا لگا۔ بے حد شائستہ سے بولے۔

"بس اپنے بارے میں سوچ لیا تم نے، اور ہم سب؟ ہم سب کی کوئی اہمیت نہیں تمہاری نظر میں۔"
 "یہ بات نہیں ہے بھائی!" وہ نظروں جبرگیا۔

"پھر؟"
 "میں نے کوئی جرم کوئی گناہ نہیں کیا۔ اپنی زندگی جینا چاہتا ہوں۔ آپ اگر جان ہی گئے ہیں تو میرے بجائے
 بی جان اور باباجان کو سمجھائیں۔"

"کیا کہاؤں؟" شاہ جہانگیر نے اپنی نشست کا انداز بدلتے ہوئے پوچھا تو وہ انہیں اپنی بات تو جہ
 ے سننے پر آمادہ دیکھ کر کہنے لگا۔

"میں کوئی لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھنا چاہتا بھائی، سیدھی صاف بات یہ ہے کہ میں اسیہ سے شادی
 نا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے اگر بی بی جان اور باباجان خوشی سے راضی ہو جائیں تو ابھی بات ہے دوسری
 ورت میں میں خود یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"گویا فیصلہ کر چکے ہو؟" شاہ جہانگیر نے کہتے ہوئے سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور سگائے کے بعد کہنے
 لگے۔

"ٹھیک ہے۔ میں مانتا ہوں کچھ حادثات اچانک زندگی کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب
 نہیں ہے کہ ہر ایک دم سے ہوتا ڈال دے۔ اُس لڑکی کی طرف پیش رفت سے پہلے تمہیں کم از کم یہ نو
 دھنا چاہیے تھا کہ میں شہر مانو اس گھر میں منسوب ہے جہاں تمہاری نسبت مٹھ چکی ہے۔"

"میں اگر یہ سب سوچتا کہ بھی خود کو اُس کی طرف بڑھنے سے نہیں روک سکتا تھا۔"
 اُس نے صاف گوئی سے اپنی بے بسی کا اظہار کیا تو شاہ جہانگیر نے ہنسیوں اچکا کر تعجب سے اُسے

دیکھا پھر کہنے لگے۔
 "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے جذباتی ہو، اور اب تو نادان بھی کہوں گا۔ کیا ضرورت تھی اتنی جلد بازی کا
 نظام بکرنے کی۔ کچھ حکمت عملی کے کام لیتے، اُس نے دیکھنے والے انداز میں دیکھا تو کہنے لگے۔

"ایک دم سے یہ کہہ دینا کہ میرا لہو اسے شادی نہیں کروں گا، محنت کے ساتھ خود غرضی بھی ہے۔ کتنی
 تدابیر مٹا رہے ہوں گی تمہارے انکار سے اگر پہلے نہیں سوچا تو اب سوچو۔ جلد دوسروں کو چھوڑ دو صرف اپنے

بارے میں سوچ کر بتا دیکر یہاں سے نکل کر کیا کر دینگے؟
 ”ظاہر ہے، آسیہ سے شادی، وہ بنا سوچے بول گیا تو شاہ جہانگیر ذرا سا مسکرائے۔
 ”تمہارے ذہن پر صرف آسیہ سوار ہے۔ بانیِ دواؤں کیا کرتی ہے؟“
 ”انہوں نے پہلے بار اُس لڑکی کے بارے میں اشتیاق سے پوچھا۔
 ”میرے لڑکے آخری سال میں تھی، میرا مطلب ہے آج کل فاضل امتحان دے رہی ہوگی؟“
 وہ اُن کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ آسیہ کی تعریف کرنے لگا۔
 ”بیتِ ذہین لڑکی ہے، میری ک سے پوزیشن لیتی آکر ہی ہے۔“
 ”اس کا مطلب ہے مستقبلِ قریب کی کامیاب ڈاکٹر یا انہوں نے سوچتے ہوئے انداز میں جیسے آپ
 آپ سے کہا۔ پھر اُسے دیکھ کر تائیف سے بولے۔
 ”اسی لیے اسنے اطمینان سے ہونم، باباجان عاق کر دیں یا تم خود سب چھوڑ کر چلے جاؤ۔ آگے کوئی
 تمہیں کرنا پڑے گا تمہیں۔“
 ”نہیں، جہانگیر بھائی، جوشِ جذبات سے اجانک اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
 ”اتنا بے غیرت نہیں ہوں میں کہ عورت کی گئی پر تکیہ کرے لگوں۔ میں اُسے لڑکی کی اجازت
 اُس وقت دوں گا جب میرے گھر میں اس کے پیسے کی ضرورت نہیں ہوگی۔“
 ”اور اس سے پہلے کیا کر دینگے؟ شاہ جہانگیر کا انداز ہنوز تھا، جھپٹا ہوا، دوستانہ، جیسے اُس سے
 اگلوں نے کا سوچ کر آئے ہوں۔
 ”میں خود کیوں گا۔ لڑکی یا کوئی چھوٹا موٹا بزنس۔“
 ”ہوں، یہی میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہاں سے نکل کر کیا کر دینگے اور تم نے فوراً آسیہ سے
 کی بات کر دی۔“
 ”انہوں نے کہا تو وہ اپنی جلد بازی پر غریبی سا ہنوس کر کھانے لگا۔
 ”بہر حال، یہ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ اس لیے میرا مشورہ مانو، باباجان
 مت کرو۔ انہوں نے کہا تو وہ پھر فوراً بول پڑا۔
 ”میں آسیہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔“
 ”میں اُسے چھوڑنے کو نہیں کہہ رہا۔ اور نہ ہی میں یہ چاہتا ہوں کہ اُس کے لیے تم یہاں سے سارے
 توڑ کر چلے جاؤ۔ بلکہ کوئی اور راستہ سوچو۔“
 ”تمہارے پیش نظر صرف اپنی ذات نہیں ہونا چاہیے۔ یہ سراسر خود غرضی ہے۔ سمجھ رہے ہونا؟
 پتا نہیں اُسے کیا سمجھانا چاہیے تھے۔ وہ بے حد خاموش نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔

آسیہ کو اپنا سابقہ ریکارڈ برقرار رکھنا تھا۔ اس لیے امتحانوں کے دوران اُس نے کسی خیالِ
 قریب ہیٹکتے نہیں دیا۔ پوری کیسوں اور دعوے سے بڑھنے میں لگی رہی تھی۔ خدا خدا کر کے امتحان ختم ہوا
 جہاں اُس نے سکون کا سانس لیا وہاں اُس کے پیچھے بیٹیاں خوش ہو گئیں۔ کیونکہ امتحانوں کے دو
 کو اُس کے کمے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اور سب نیچے اُس سے اسنے مانوس تھے۔ جب
 دن بھر کی روداد اُسے سنا لیتے انہیں چین نہیں آتا تھا۔
 وہ سب سے محبت بھی تو بہت کر تی تھی۔ اکثر اُن کے ساتھ بچہ بن جاتی۔ اُن کے کیل میں
 ہوتی۔ اور ادھر اتنے دن وہ اپنے کمرے میں بند رہی تو ظاہر ہے بچے پریشان ہو گئے تھے۔ میو
 الگ بولائی بولائی پھر رہی تھیں۔ اور وہ جو آخری پیر کے بعد یہ سوچ کر سوئی تھی کہ اب لگے دن؟
 گی، میمونہ بھائی نے سر شام ہی اُسے جھپٹ ڈالا۔
 ”بس اب فوراً اٹھ جاؤ۔ بچے پیار سے تمہاری صورت دیکھنے کو ترس گئے ہیں۔“

”تو یہ آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ وہ آنکھیں ملنے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ پھر انہیں دیکھ کر پوچھنے لگی۔ کہاں
 جا رہے؟“
 ”اُسے احمد اور سونیا تو یہ ہیں دھاوا بولنے والے تھے۔ بڑی مشکل سے انہیں روکا ہے۔ چلو اب تم
 مدی سے منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ چائے بھی تیار رکھی ہے۔“
 ”میونہ بھائی جانے جاتے چائے پینے کا بن بند کر لی گئیں۔ غالباً اس خیال سے کہ کہیں وہ دوبارہ نہ سوجھلے
 درنا جاوے اُسے اٹھنا پڑا۔ منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے نکلی تو اُسے دیکھتے ہی احمد اور سونیا نے شور مچا دیا۔
 ”چھوڑ آگئیں، پیپو آگئیں۔“ وہ کھل کر سلائی اور باری باری اُن کے کال چھو کر اماں جی کے پاس
 منت بڑی پریشانی اور اُن کی گود سے ٹکر کواٹھاتے ہوئے بولی۔
 ”ناشا اللہ، یہ تو بہت مبارک ہو گیا ہے کس پر گیا ہے؟“
 ”تم بتاؤ۔“ اماں جی نے کہا تو وہ خور سے ٹکر کو دیکھنے کے بعد بولی۔
 ”مجھے تو بیل کی طرح لگ رہا ہے۔“
 ”ہاں پشانی اور آنکھیں نیل جیسی ہیں۔“
 ”بیل سے کہاں؟“ اُسے اچانک بیل کی کمی محسوس ہوئی کادھر اُدھر دیکھ کر بھوچھا۔
 ”ابھی تمہارے آبا جی کے ساتھ باہر گیا ہے۔“ اماں جی نے بتایا بھی میمونہ بھائی چائے لے کر آئیں۔
 ”اُسے دریاں نہیں رکھی پھر بیٹھیں تو کھینے لگیں۔“
 ”بچوں کی چٹھیاں ہونے وال ہیں۔ کیوں نہ ماناں جی اسلام آباد چلیں۔“
 ”ہاں برسوں سینا کا فون آیا تھا۔ وہ بھی بہت اصرار سے بلارہی تھی۔ اب دیکھو تمہارے آبا جی کیا کہتے ہیں؟
 اُن جی نے کہا تو وہ پوچھنے لگی۔
 ”آبا جی منع کر دیں گے کیا؟“
 ”نہیں، منع کیوں کر دیں گے۔ لیکن سارا گھر ایک ساتھ بھی تو نہیں جاسکتا ناں۔ یہاں خلیل اور عدیل لڑکی
 لے لیں انہیں بھی کہاں ملے گی اور اُن کے لیے گھر میں ایک عورت کا ہونا بھی ضروری ہے۔“
 ”اماں جی کی بات سنی ٹھیک تھی، وہ تاخیر کرتے ہوئے میمونہ بھائی کو دیکھ کر شرارت سے بولی۔
 ”یہ تو ہے۔ بس میمونہ بھائی یہیں رہ جائیں گی۔“
 ”کیا؟“ میمونہ بھائی چہچہا پڑیں۔
 ”میرا مطلب ہے، ابھی اماں جی اور آبا جی کو جانے دیں، ہم بعد میں چلیں گے میں آپ اور بچے۔“
 ”فورا وضاحت کر کے خود ہی ہنس پڑی۔
 ”نہیں اگر جانا ہوا تو پہلے تم دونوں چلی جانا بچے خوش ہو جائیں گے۔“
 ”اماں جی نے کہا تو میمونہ بھائی کے اشارے پر اُسے خاموش رہنا پڑا۔ ورنہ وہ منہ کرنا چاہتی تھی۔
 لہ اُسے شاہ سکندر کا خیال تھا۔ جانتی تھی کہ وہ بے خبر نہیں ہوگا۔ آج امتحان ختم ہوئے ہیں تو اب
 آنا جانا رہے گا۔ اور جب تک چھوٹے نہ ہو جائے گا وہ کہیں نہیں جانا چاہتی تھی۔
 ”امتحانوں کی وجہ سے اس نے ہر سوچ کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ لیکن یہ نہیں تھا کہ اُسے شاہ سکندر
 یاں آبا جی نہیں۔ بلکہ اس کا خیال تو کوئی نہیں ہوا تھا۔ البتہ اُس کے بارے میں کچھ بھی سوچنے سے وہ گریز
 کرتی تھی۔ اور اب وہ آزاد تھی۔ اُس رات درمیک وہ یہی سوچتی رہی کہ وہ جو کہہ کر گیا تھا کہ اس بار
 بے والدین سے بات کرے گا۔ وہ مان گئے تو ٹھیک ورنہ سب چھوڑ آئے گا۔ تو جانے اس کی آمد گس
 نہ ہوگی، البتہ والدین کو لے کر آئے گا یا نہ۔“
 ”میر دو موٹوں میں اُس نے اُسی دم سے اپنا دل انتظار کی دلمیز پر رکھ چھوڑا تھا۔
 ”میں وہ معمول کے مطابق اٹھ گئی۔ اور جب تک میمونہ بھائی بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرتیں اُس نے
 ستیا کر لیا۔ بڑے بیٹیا بیل کے ساتھ نیچے اترے تو میمونہ بھائی نے احمد اور سونیا کے ساتھ بیل کو

بھی جھٹلایا۔ اور میوں کو ناشتا کرنا اسکو بھیجا۔ اس کے بعد خلیل اور عدیل کی باری آئی تو اس کی نظر بڑے ہتیا کو تلاش کرنے لگیں لیکن وہ جا چکے تھے۔ پھر بھی وہ میونہ بھائی سے پوچھنے لگی۔

”بڑے ہتیا چلے گئے کیا؟“

”ہاں شاید یہ میونہ بھائی کی مٹا میں چائے دم کر رہی تھیں۔ مصروف انداز میں جواب دیا۔“

”ناشتا بھی نہیں کیا؟“ اسے آفسوس ہو رہا تھا کہ اس نے جب بڑے ہتیا کو دیکھا تھا تو اسی وہ انہیں روک کیوں نہیں لیا۔

”وہ ناشتا نہیں کرتے، شاید انہیں صند ہو گئی ہے کہ اپنی بیوی ناشتا بنا کر دے گی تو کرس۔“

ورنہ نہیں؟

میونہ بھائی نے اپنا خیال ظاہر کیا پھر ٹی پاٹ اٹھا کر اسے دیکھتی ہوئی بولیں۔

”میں یہ اندر دے آؤں۔ تم اب اپنے اور میرے لیے ناشتا بنا لو۔“

”امان جی اور اباجی۔“

”وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔“

میونہ بھائی کہتے ہوئے چل گئیں۔ تو اس نے جلدی سے دو انڈے ذرا کیے پھر کیتلی میں مزید پکا کر چوبلیا تیار کر دیا۔ اور جب تک میونہ بھائی، خلیل بھائی کو کسی آف کر کے آئیں تو وہ رشتے میں ناشتا رکھا تھی۔ انہیں دیکھتے ہی پوچھنے لگی۔

”کہاں بیٹھیں گی؟“

”اپنے کمرے میں جلو، کیونکہ میرا کمرہ اس وقت بیٹھنے کے قابل نہیں ہے۔“

میونہ بھائی یونہی بولی ہوئی ہیں، اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔ ان کے پیچھے اپنے کمرے میں داخلہ ناشتے کی طرف سے ٹیبل پر رکھ کر ٹیبل پر رکھ کر قریب کھینچ لی۔ پھر بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

”میرا دل چاہ رہا ہے۔ ایک کپ چائے بنالہ بھائی کو دے آؤں ہو سکتا ہے انہیں کچھ احسا۔“

اس کے لیے پہلے کہیں جلد کا ٹیبا پر سے گا۔ تاکہ مٹاری چائے کی پیالی میں کچھ انثر ہو۔“

میونہ بھائی نے بظاہر بڑی سنجیدگی سے کہا پھر بھی اسے بے ساختہ ہنسی آئی۔

”آپ بھی کس کمال ہیں۔“

”اچھا جلو ناشتا کر، اس کے بعد جودل چاہے کرنا۔“

میونہ بھائی نے ٹوک کر خود کھانا شروع کر دیا تو وہ کب سیدھے کر کے ان میں چائے ڈالنے پھر ناشتے کے بعد وہ واقعی چائے کا کپ لے کر اوپر چل آئی۔ بنیلہ بھائی بے خبر سو رہی تھیں

کی سمجھ میں نہیں آیا انہیں کیسے اٹھائے اندر ہی اندر ڈھکی رہی تھی کہ بتا نہیں اٹھائے جانے پر ان کا دل کیا ہو۔ حوکر اس کے ساتھ ان کا ردیہ شیک ہی تھا۔ لیکن جس طرح وہ بڑے ہتیا کے ساتھ تلخ گلائی کہ

اس سے وہ اپنے آپ ان سے خائف رہتی تھی۔ کچھ درخشش و بچ میں کھڑی رہی۔ پھر بیکار تو آواز؟

نکلے یا شاید بے خبر سوئی بنیلہ بھائی تک نہیں پہنچی۔ تب آہستہ سے ان کا کندھا ہلا کر بولی۔

”بھائی جان، اچانک سے لیجیے۔“

”ہوں۔“ بنیلہ بھائی نے کسما کر ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر وال کلاک پر نظر ڈالی جس کا

نوجوا رہی تھیں۔ اور غالباً وہ ابھی پوری طرح۔ میدان نہیں ہوئی تھیں جب ہی اٹھی ہوئی بولیں۔

”بارہ بج رہے ہیں۔“

”نہیں، ابھی تو بجے ہیں۔ یہ چائے کا کپ انہیں تھامتے ہوئے بولی۔“

”تمہارا آج پھر نہیں ہے؟“ انہوں نے چائے کا سب لے کر پوچھا۔

”نہیں کل آؤی میری بہن۔“

”اچھا، کیسے ہوئے پرہیز؟“

”بہت اچھے۔“

”اس کا مطلب ہے اس بار بھی ٹاپ کر دی، ویری گڈ۔ اور یہ تم کھڑی کیوں ہو، بیٹھو نا۔ اب تو نارس

ہی بہن انہوں نے اسے سر ہانپنے کے ساتھ بیٹھنے کو کہا تو وہ در سے تکلف سے بیڈ کے کنارے بیٹھتے ہوئے

بولی۔

”میں نے آپ کو جلدی اٹھا دیا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ دل سے کوئی کام ہے جیسے؟“ انہوں نے پوچھا تو وہ جزبہ زہر ہو کر بولی۔

”نہیں، ابھی سب ناشتے سے فارغ ہوئے ہیں، میں نے سوچا آپ سے بھی پوچھ لوں۔“

”میں ناشتا نہیں کرتی۔ خیر تم سناؤ۔ اب کیا ارادے ہیں۔“ بڑے آرام سے اسکا ریشپ پر باہر جاسکی ہو۔

گولڈن چائس ہے بس نہیں کرو۔“ انہوں نے اس کا ارادہ پوچھنے کے ساتھ مشورہ بھی دے ڈالا تو وہ قہقہہ

سکڑ کر بولی۔

”میںیں بریکسٹ کر لوں، بڑی بات ہے۔“

”ہاں تمہارے لیے ہی بڑی بات ہے۔“ بنیلہ بھائی قدر سے استہزائیہ ہنسیں تو وہ وہاں سے اٹھنے

کے بہانے ڈھونڈنے لگی، اور فوری طور پر یہی بہانا سوچا۔

”آپ کے لیے اور چائے لاؤں؟“

”نہیں بس۔“ اب شاد زلوں گی۔ بنیلہ بھائی کہتے ہوئے بیڈ سے اتریں تو وہ بھی ان کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

چائے کا خالی کپ اٹھایا اور آنے لگی تو وہ بیکار کر بولیں۔

”سنو، بنیل آئے تو ذرا اسے چیک کر لیتا مجھے اس کی آواز بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔“

”جی۔“ وہ اختصار سے کام لیتی ان کے کمرے سے نکل آئی۔ پھر کتنے دن گزر گئے۔ بچوں کی چھٹیاں ہو

گئیں تو میونہ بھائی سنجیدگی سے اسلام آباد جانے کا پروگرام بنانے لگیں، جبکہ وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ

کسی طرح اس کا جانا نہ ہو سکے۔ لیکن اس روز جب خلیل بھائی نے میونہ بھائی کے ساتھ اسے بھی تیار دی

کرنے کو کہا تو وہ سچ بچ پریشان ہو گئی تھی۔

”میں آہستہ کو چھوڑنے کو نہیں کہہ رہا اور نہ ہی یہ جانتا ہوں کہ اس کے لیے تمہیں سے سارے ناتے

توڑ کر چلے جاؤ۔ بلکہ کوئی اور راستہ سوچو؟ شاہ جہانگیر نے اس سے کہا تھا اور اس وقت سے وہ الجھ رہا۔

تھا۔ بہت سوچنے کے بعد بھی اسے کوئی تیسرا راستہ کچھ نہیں آیا۔ وہی دورا سے تھے کہ مٹہر بالو کی خاطر اپنی

جیت قربان کر دے یا سب چھوڑ کر چلا جائے۔ کیونکہ بابا جان اور پھر بی بی جان بھی اس کی مزید کوئی بات

سننے پر تیار نہیں ہوتی تھیں۔ جس سے ظاہر تھا کہ وہ بہر محبت پر مہر انسداد کو ہونا کر لائیں گی۔ اس لیے میں دنوں

ل مسلسل ذہنی کش مکش کے بعد بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس ٹوک کی خاطر سب چھوڑ دے گا۔ جس نے

اسے خوبصورت اور پر کیف لمحات بخٹنے تھے گو کہ وہ ساتھ تھی نہ کوئی ایسا پھر بھی اس میں کوئی ایسی بات

غزوہ تھی کہ پہلی نظر میں ہی شاہ سکندر حیات اپنی ہستی کا غرور تک بھلا بیٹھا تھا۔ اور اب یہ کسی طرح ممکن

نہیں تھا کہ وہ اسے اپنی زندگی سے ہی نکال دے۔ جیہی اس کے پاس جائے کا فیصلہ کر لیا۔ اور کیونکہ

شاہ جہانگیر نے اس روز سہولت سے اس کی بات سنی تھی اس لیے اس نے سوچا وہ انہیں اپنے ارادوں سے

گاہہ کر دے۔ اسی خیال سے وہ ان کے کمرے میں آیا تو بھائی جان کو ایک ٹھوٹا سوٹ کیس تیار کرتے دیکھ

کر بولیں پوچھ لیا۔

”کہاں کی تیاری ہے؟“

”تمہارے بھائی جا رہے ہیں مری، بچوں کو لینے۔“ بھائی جان بتاتے ہوئے الماری کی طرف بڑھ گئیں۔

وہ سوٹ کیس پر نظر ڈال کر پوچھنے لگا۔

”صرف بچوں کو لانا ہے یا کوئی اور کام بھی ہے؟“
”تائیں۔ لودہ آگئے ان ہی سے پوچھ لو، جہاں انہی کے پٹیس لو اندر آتے شاہ جہا کو دیکھ کر لولیں۔“

”کیا پوچھنا ہے؟“ شاہ جہانگیر نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”وہ آپ کی واپسی کب ہوگی، میرا مطلب ہے مری سے؟“
”پرسوں یا اس کے اگلے دن، کیوں؟“ شاہ جہانگیر تلنے کے ساتھ پھر سوالیہ نشان بن گئے تو وہ رگ کر بولا۔
”مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی، خیر آپ مری سے ہوائیں۔ تب تک میں بھی کراچی کا چکر لگاؤ، شاہ جہانگیر سمجھ گئے اُسے کیا بات کرنی ہے، لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ فیصلہ بھی کر چکا ہے۔ کچھ گہری نظروں سے اُسے دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔
”کراچی جانے کے بجائے میرے ساتھ چلو، اُس نے فوراً سر اٹھا کر دیکھا تو مسکرا کر بولے۔ ”دیں الو سے بات کریں گے۔“

”بیان اطمینان سے بات نہیں ہو سکتی کیا؟“ وہ بھی مسکرا یا تو وہ اس کا کندھا تھپک کر بولے۔
”جاؤ، اپنے ایک دوست لاکر اس سوٹ کپس میں رکھ دو پھر نکلتے ہیں۔“

”لیکن؟“
”لیکن دشمن چھوڑو، جلدی کرو، چھنکے کی فلائیٹ ہے۔ ابھی نکلیں گے تو پانچ ساٹھے پانچ نمک پہنچیں گے۔“ وہ اُسے ٹوک کر بہت غصت میں بولے، تو وہ کچھ سوچتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا، اپنے کمرے پر دوستوں نکالے اور جبریل کو بکار کر اُس کے ساتھ جہاں جان کو بچا دے۔ پھر فوراً واس روڈ کا راز کچھ دیر بعد سیدھے آکا تو شاہ جہانگیر کی بی جان کے پاس کھڑے غالباً انہیں یہی اشارہ تھے کہ وہ بھی گئے ساتھ جارہے۔ قریب آکر اُس نے سلام کیا تو بی بی جان نے صرف جواب دینے پر اکتفا کیا؟ شاہ جہانگیر کی طرف متوجہ ہو گئیں، تو وہ باہر نکل آیا۔ جہاں ڈرامیٹر گاڑی لیے منتظر کھڑا تھا۔

شاہ پور سے کراچی اور وہاں سے بالی ائیر اسلام آباد تک کے سفر میں اُس نے آسیہ سے متعلق کوئی بات نہیں کی، کیونکہ پہلے ہی اُسے بے مبری اور جلد بازی کا مظاہرہ کرنے کے بعد خالالت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیے خاصا محتاط ہو گیا تھا۔ ہر رات میں شاہ جہانگیر نے خود ہی بات چھیڑی۔
”ہاں، اب تادیہ کیا سوچا ہے تم نے؟“ اور وہ مایوسی سے سر ہلا کر کہنے لگا۔
”مجھے ایسا کوئی راستہ نہیں آتا جو مجھے بیک وقت دونوں مقام پر سرخرو کر سکے۔ باباجان کہ پیر نہیں مائیں گے اور میں آسیہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بسے شک باباجان مجھ پر اپنے کھر کے دروازے دیں نہیں۔“

”ایک منٹ۔“ شاہ جہانگیر ٹوک کر بولے ”میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہارے پیش نظر صرف ذات نہیں ہونی چاہیے۔ کیا نہیں شہر بانو سے ذرا محبت نہیں یا اپنی محبت میں اتنے خود غرض ہو کر شہر بانو کے لیے کئی نہیں ہے جہانگیر جانی؟“ وہ چونک کر آخر یہ کیوں سمجھ لیا جانتا ہے کہ اُسے شہر محبت نہیں یا اس کا خال نہیں اور اُس کے برعکس شاہ جہانگیر کا لوجہ بھڑا ہوا تھا۔
”کئی تو میرا انداد کو بھی نہیں یہ سکندر۔“

”بھئی؟“
”بھئی تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ہم شاہ دستد ہیں۔ اور شاہوں کی بیٹیاں غیہ خاندان میں نہیں یا اپنے خاندان میں اور کون ہے جس کے ساتھ شہر بانو کا رشتہ جوڑیں اُس کے جوڑ کا نہیں تو کون ہے بتاؤ جیسے شہر بانو کے ساتھ ہوا۔ کیا کئی بھی اُس میں۔ لولی لکڑی تھی جو چار بچوں کے باپ سے بیاباں تھی

نے بہت طریقے سے اُس کے احساسات کو جھنجھڑا۔
”انست سے شہر بانو کا اچھا جوڑ ملا ہے تو اب تم نہیں سکندر یا یہ ٹھیک نہیں ہے۔ بہن پر زندگی کے ایسے تنگ کر کے تم آئیں زندگی جینا چاہتے ہو؟ اُس نے بے حد خاموش اور کچھ شاک نظروں سے دیکھا تو شاہ جہانگیر بھٹکتے ہوئے کہنے لگے۔
”دیکھو، میں نہیں آسیہ کو چھوڑنے کو نہیں کہہ رہا۔ تم اُس سے شادی کرنا چاہتے ہو ناں، اس پر بھی مجھے ذرا اعتراض نہیں۔ بلکہ میں خود مختار سے ساتھ چلوں گا۔ اُس کی آنکھوں میں غیر یقینی کے ساتھ ہملانے لگے تو شاہ جہانگیر سب سے مسکرا ہٹ کے ساتھ بولے۔

”میرا یقین کرو آسیہ سے شادی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اصل مسئلہ تو اپنے گھر کا ہے۔ تمہارے جانے سے صرف شہر بانو کی زندگی متاثر نہیں ہوگی۔ اس کے ساتھ میرا شہر بانو کے بارون پھر باباجان اور بی بی جان ستنے یوں کو نانا بھی کر دے گئے، اس لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ کوئی اور راستہ سوچو اور مختاری مجھ میں تو نہیں آیا۔ میں نہیں بتانا ہوں شاہ جہانگیر سرکٹ سٹاٹے کے لیے رکے تو یہ چند گنے اس پر بے حد گراں گذرے تھے۔

آسیہ کے پاس نظام ہے اب کوئی ہانا نہیں تھا۔ اس لیے اُسے میمونہ جہاں اور بچوں کے ساتھ۔ اسلام آباد آباد کرنا پڑا سیما جہاں ان کی آمد میرا واقعی بہت خوش ہو گئیں۔ ابھی تک ان کا یہاں دل نہیں لگتا تھا۔ جب نند جہاں فراغت سے بیٹھیں تو سیما جہاں اُس سے کہنے لگیں۔
”آسیہ! اب تم یہاں سے جانے کی بات نہیں کرنا۔ میں نے شکیل سے کہہ دیا ہے کہ یہیں کسی ہاسٹل میں تمہیں جاب دلا دیں۔“

”کیا؟“ وہ اچھل پڑی ”آج ہی سے بھی پوچھا ہے آپ تے؟“
”وہ منع تو ہوئی کرس گئے۔ یہ بھی تمہارا اپنا گھر ہے کیوں میمونہ؟“ سیما جہاں نے آخر میں میمونہ جہاں سے میڈیا جی تو وہ اُسے دیکھ کر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔
”اپنا گھر تو اس کا یہ ہے نہ وہ۔ وہ تو کوئی اور ہی گھر ہو گا جسے یہ اپنا کہے گی؟“

”وہ تو جوب ہو گا تب۔“ ابھی تو یہی اس کے گھر میں سیما جہاں نے کہا تو وہ فوراً بول۔
”بالکل یہی میرے گھر ہیں۔ میں اتان جی کے پاس رہوں یا آپ کے پاس کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہاں میں سب محبت کرنے والے ہیں، یہاں بھی کبھی تو مجھے خود پر رشک آتا ہے۔ زندگی میں کبھی مجھے بہن کی غمیں ہوتی تھیں۔ اللہ نے آپ دونوں کی صورت وہ بھی پوری کر دی؟“
”تیسری جہاد کا نام نہیں لیا تم نے؟“ سیما جہاں نے خنونی سے کہا تو اُس سے چونک کر دیکھا پھر سنبھل بولی۔

”اصل میں جب بڑے مٹھا کی شادی ہوئی اُس وقت میں کان چھوٹی تھی اس لیے بیلہ جہاں کے ساتھ۔“
”تکلف نہیں ہو سکی۔ جہاں کا مزاج بھی کچھ الگ ہے؟“
”ابھی بھی الگ گھر کا مطالبہ کرتی ہیں؟“ سیما جہاں نے پوچھا تو اُس سے پہلے میمونہ جہاں بول پڑیں۔
”اب مطالبہ نہیں کرتیں موصی دیتی ہیں کہ چھوڑ کر چلی جاؤں گی؟“
”بڑے جیسا غلطی کر رہے ہیں۔“ اُس سے پہلے کہ دونوں جہادیں تیسری کے خلاف بولیں اُس نے سارا زام بڑے جیسا کے سر رکھ دیا۔

”بیلہ جہاں کا مطالبہ ناجائز نہیں ہے۔ بڑے جیسا کی مذنا جا کر ہے۔ جب وہ انور ڈک سکتے ہیں تو پھر وہ نہیں انہیں الگ گھر میں رکھتے۔ جبکہ اتان جی اور بابا جی بھی اجازت دے رہے ہیں؟“
”وہ تمہارا حق کے مقابلے میں جہاں کو غلط کہہ رہی ہو، میمونہ جہاں تعجب سے بولیں۔
”میں جی بات کر رہی ہوں پھر چھوڑیں۔ یہ ان کا معاملہ ہے وہ جانیں یا اُس نے اس موضوع کو ختم کر دینا

ہی مناسب سمجھا پھر ادھر ادھر دھجھ کر بول : "یوں کی آواز نہیں آ رہی لگتا ہے سو گئے۔" ہاں اور ات جہیں بھی ہونا چاہیے، درمیان سمجھ نہیں سکے گی، سیما جہاں والی لڑک پر نظر ڈالتے ہوئے ہوئیں تو اس نے ان کی تقلید کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں کہاں سوئی گئی؟" "ادھر ٹیمپ اور اشعر کے کمرے میں چلی جاؤں دونوں کو ایک میڈ پر کر دو اور نیل تھارے ساتھ ہاں، وہ اکثر میرے پاس سوتا ہے۔" وہ کہتے ہوئے سمجھ کے کمرے میں آئی تو ایک میڈ پر بند اشعر سو رہے تھے، دوسرے پر سمیرا لیٹی تھی وہ اسی کے پاس لیٹ گئی۔ اس وقت سے باتوں میں چلا تھا۔ اب بیٹھے ہی لیے سرکلنگ ٹکان ٹھوس پور ہی تھی۔ بدن میں ٹپکے ٹپکے درد کے باعث نیند بھی تھی۔ کچھ درجے جن سے کمر میں بدلنے کے بعد اس نے خود کو دھلا پھوڑ کر پلکیں موند لیں۔ تو دھلا کر طرف منتقل ہو گیا جہاں ان کے چلے آنے کے بعد خاموش چٹائی ہوئی۔ اور کپڑا اس خاموشی میں نہ سنا دینے لگیں، جن کی وہ شدت سے منتظر تھی۔ جیسا کہ آخری ملاقات میں شاہ سکندر نے کہا، سکتا ہے اس بار میں آؤں تو میرے ساتھ لی جان اور بابا جان بھی ہوں۔ اور اس کی بات یاد آنے نیچ پر سوچنے لگی، کہ شاید وہ اپنے گھروالوں کو پھوڑ کر کرنے میں لگا ہوگا۔ جیسی نہیں آیا۔ اور تانہ گھروالے مائیں گئے بھی یا نہیں۔ پھر ہر دو صورتوں میں وہ اماں جی اور بابا جی کا رد عمل سوچنے لگی، گو اور عدیل جہاں اس کی بہت تعریف کرتے تھے، وہ آتا تو اس کی بہت عزت کرتے اور اس کے بعد کتنی دیر تک اس کی باتیں کرتے تھے، پھر بھی اسے خدشہ ہوا کہ اگر شاہ سکندر اپنے گھروالوں میں ناکام رہا تو شاید ابانی کبھی ہیں مائیں گے، لیکن اگر ابانی اور عدیل جہاں کو بھی یہ معلوم ہو جائے سکندر کرتی ہوں تو یہ اس مقام سے آگے نیند نے اسے سوچنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ صبح وہ بہت دیر سے اٹھی۔ اس وقت تک سب ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے سیما جہاں کے باوجود اس نے اپنے لیے خود ہی ناشتا بنایا۔ دو سالہ کرم کیے، ایک انڈا، فرائ اور چائے لے کھا جو اس کے پاس لاؤنج میں آ بیٹھی۔ وہ دونوں جانے کس موقع پر بات کر رہی تھیں۔ اس نے ناہمگ آن کی طرف دھیان نہیں دیا۔ نہ ہی ان دونوں نے اسے مخاطب کیا۔ جب وہ خالی برتن پکڑ کر آئی تب سیما جہاں اسے دیکھ کر تھکے لگیں۔

"گو کر تمہارا ہمان نہیں ہو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آتے ہی کام میں لگ جاؤ۔" "اور میں یہاں بلیگ توڑنے بھی نہیں آئی۔ خیر چھوڑیں۔ یہ بتائیں بچے کہاں ہیں؟"

"ادھر برآمدے میں کھل رہے ہیں!" "آئی خاموشی سے کیے کھیل رہے ہیں؟" وہ تعجب سے کہتی وہیں سے پلٹ کر برآمدے میں آئی اپنے دائرے کی شکل میں بیٹھے بڑے اہانک سے سینکڑی ہنرے بالوں والی گڑیا کو دیکھ رہے تھے اور بارے میں بنا کر اپنے طور پر انہیں حیران کر رہی تھی۔ "دیکھو، یہ روٹی بھی ہے، پیمینہ نے گڑیا کے منہ سے چھنی نکالی تو گڑیا دوتے لگی جس پر بخورہ جیسے حیرت دغوشی سے چپکے لگے۔

"اب اسے چپ کر دو، سو نیانے کہا تو سمیرہ نے گڑیا کے منہ میں دوبارہ چھنی لگا دی۔ گڑیا گئی تو نیل پوچھنے لگا۔

"یہ ہنسی بھی ہے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں۔ بس روٹی ہے،" سمیرہ نے لاعلمی کا اظہار انیسوں کے ساتھ کیا۔

"مبتاری طرح اور سونیا کی طرح،" نیل نے کہا تو سونیا تڑخ کر بولی۔

"میں کب روٹی ہوں؟" "جب میں تمہارے بال نوچتا ہوں؟" امر نے کہتے ہوئے سونیا کے بال پکڑ کر کھینچ لیے جس سے وہ دائی نے فکری تو وہ جو خاموشی سے اپنی موجودگی کا احساس دلانے بغیر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ فوراً آگے بڑھ آئی سونیا کو گود میں اٹھا کر اس کی جگہ پر بیٹھتے ہوئے امر کو ڈانٹنے لگی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے، تم نے اس کے بال کیوں نوچے؟"

"دور سے تھوڑی نوچے ہیں، پوچھ لیں اس سے؟"

"اس سے کیا پوچھیں، میں خود دیکھ رہی تھی۔ بہت بڑی بات ہے۔ آئندہ خبردار اسے ہاتھ نہیں لگانا۔"

"نہ سوچا کو چپ کرانے کے ساتھ امر کو تینہ کی، تو وہ تیز ہو کر بولا۔

"یہ جھوٹ کیوں بولتی ہے؟"

"کیا جھوٹ بولا ہے اس نے؟" امر کے تیز بولنے پر اس کی پیشانی پر پرل بڑھ گئے۔

"کہتی ہے میں کب روٹی ہوں اور اب رو رہی ہے؟" امر نے سونیا کا جھوٹ بتایا تو وہ سر جھٹک کر بولی۔

"بہت قوت ہو تم۔" پھر سب کو اٹھا کر اندر لے آئی۔ دونوں بھادیں ہنسی، گوشت پر بات کر رہی تھیں۔

نیل کے لیے یہ کیا پکنا چاہیے اور یہ بڑا میٹر حائل تھا جیسی وہ ان سے کترا کر ادھر سے اخبار اکٹھا کرنے میں لگ گئی۔

دوہ میں کھانے کے بعد سیما جہاں نے سب بچوں کو سلاوا، میوہ بھائی بھی عمر کو بغل میں دبائے آرام سے لیٹیں۔ اللہ اس نے پورا گھر چھان مارا، کوئی ایک کتاب نہیں ملی، جسے پڑھنے میں وہ وقت گزارتی محنت بھر رہی تھی، اس وقت لی دی بھی لیس شام میں چلتا تھا۔ یعنی صبح کی نشریات کا آغاز نہیں ہوا تھا نہ ہی دی سی آر تھا، بلکہ محنت پابندی تھی۔ اس لیے مطالعے کی طرف رجحان زیادہ تھا۔ متوسط گھرانوں کی لڑکیاں ایسے ذراعت لے دون میں ناولز پڑھتیں۔ ان دنوں رفیع بٹ اور سنی کوئی کے ناولوں کا بڑا چراغ تھا۔ اس نے سیما جہاں سے

چھا تو وہ مکین کی شکل بنا کر بولیں۔

"کہاں آؤں؟" "یوں میں کہاں فرصت ملتی ہے پڑھنے کی؟"

"مجھے نہیں پتا، آپ اس وقت مجھے کہیں سے منگوا کر دیں؟" وہ بچوں کی طرح صند کرتے ہوئے بولی۔

میں بہت بڑھ رہی ہوں اور اگر یہی عالم رہا تو دونوں میں واپس چلی جاؤں گی۔

"ارے رے، یعنی بلیک میننگ۔" سیما جہاں نہیں پھر مٹا کچے یاد آنے پر کہنے لگیں، "اچھا پھر وہاں چلے ہیں مجھے درزی سے اپنے کپڑے لینے ہیں، تم کچھ میٹروں وغیرہ لے لیتا۔"

"چلیں؟" وہ فوراً تیار ہوئی پھر اپنے چلنے پر گھڑ وال کر پوچھا، "دور تو نہیں جانا؟"

"نہیں بیدل کا راستہ ہے۔ جاؤ میوہ سے کہو سونے نہیں ہم بھی آتے ہیں، سیما جہاں کہتی ہوئی اپنے

لے میں چلی گئیں تو اس نے میوہ جہاں کے پاس جا کر لیس کپڑے کھڑے انہیں بتایا پھر پنا پر اس اٹھا کر واپس آئی تو سیما جہاں اپنے پرس میں جانے کی تلاش کرتی ہوئی آ رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ پچھ بول رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟" ان کے قریب آنے پر اس نے پوچھ لیا۔

"میرے کپڑوں کی رسید اسی میں رکھی تھی، مل گئی، اب تو نے رسید ہاتھ میں لے کر پرس بند کیا پھر لے

بھڑک کر بولیں۔ "چکو۔"

"گھر کے قریب ہی مارکیٹ تھی، گو کہ زیادہ بڑی نہیں تھی پھر بھی ضرورت کی ہر شے موجود تھی، اور کوئی نہ

قاعدہ شاپنگ کا پروگرام نہیں تھا۔ اس لیے جو پہلی کت بول کی دکان نظر آئی وہ اسی میں داخل ہوئے لگی کہ

باجائی روک کر بولیں۔

"سو، وہ اس رو میں جو چوتھی دکان ہے۔ میں وہاں ہوں۔ تم اطمینان سے رسالے دسلے دیکھ

و ادہاں پیسے چاہیں؟"

نہیں، میں میرے پاس:۔“
 ”اچھا، میں اپنے پڑے کے کرتی ہوں۔“ سیما بھائی آگے بڑھ گئیں تو اُس نے رک کر انہیں دیکھ کر
 دکان میں داخل ہوتے دیکھا پھر قدم آگے بڑھنے، اور شیشے کے رک کے پاس رک کر اُس میں ترتیب
 رکھی کتا ہیں دیکھنے لگی، حالانکہ چند نام سوچ کر آئی تھی۔ لیکن اب انتخاب کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ پھر جب
 نے دیکھا سلیزمن کی نظر میں اُس پر بھی ہیں تب جلدی سے ایک دو کتاہوں کے نام بتا کر دوسری طرف
 گئی۔ اور اہم فیض کا غور تلاش کر رہی تھی کہ اس آواز سماعتوں سے یوں ٹکرانے کہ وہ بے اختیار پلٹ کر
 لگی، شاہ سکندر کا فون پر کھڑے شخص سے مخاطب تھا۔
 ”ایک سکری، فون کر سکتا ہوں؟“ اور وہ جس طرح بے اختیار پلٹی تھی اُسی بے اختیاری سے اُس
 قریب آکر ٹولی۔
 ”سیلو،“ شاہ سکندر نے چونک کر دیکھا پھر خوشگوار حیرت میں گھر کر بولا۔

”ا۔ س۔ س۔ تم یہاں کیسے؟“
 ”کچھ کتاہیں لی ہیں، اُس نے تصدیق اُس کے سوال کو دوسرے معنی پہنا کر جواب دیا۔
 ”نہیں میرا مطلب ہے یہاں اسلام آباد میں؟“ اُس نے وضاحت کی تو ایک نظر گلاس دُور سے باہر
 بولی۔

”بھائی کے پاس آئی ہوں؟“
 ”کون عدیل صاحب؟“
 ”نہیں، وہ تو وہیں کراچی میں ہوتے ہیں۔ اُن سے بڑے شکیل بھائی، ابھی کچھ عرصہ قبل سیما سیٹل
 ہیں۔ اور آپ؟“ آخر میں اُس نے اُس کی سیما موجودگی کا سبب پوچھا تو وہ ذرا سے کندھے اٹکا کر بولا۔
 ”میں اپنے بھائی کے ساتھ آیا ہوں۔ شاید میں نے نہیں بتایا تھا کہ میرے جیتے جیتیجاں مری کا لونا
 پڑھتے ہیں۔ آپ چھٹیاں ہوتی ہیں تو ہم انہیں لینے آئے ہیں؟“
 ”لیکن آپ تو یہاں موجود ہیں۔“ اُس نے کہا تو وہ اُسے نظروں کی گرفت میں لیتا ہوا بولا۔
 ”تیار رہے کیسے؟“

”اچھا،“ وہ ذرا سانسہ ہی: آپ کو کیسے معلوم کر میں سیما ہوں؟“
 ”معلوم تو نہیں تھا لیکن محسوس ہو رہا تھا کہ تم ہیں اُس پاس کہیں موجود ہو؟“ وہ اطراف سے بیگانہ
 تھا تب اس نے ذرا سا کھانسنے کا احساس دلایا پھر کہنے لگی۔
 ”آپ شاید فون کرنا چاہتے تھے؟“

”اب نہیں کرنا، اللہ تم اپنی کتابیں لے تو اُس نے کہا تو وہ پلٹ کر سلیزمن کو دیکھنے لگی۔ وہ نہ
 تھا۔ تو اُن کتاہوں کا بیٹک اُس کی طرف بڑھا دیا۔ جسے لے کر وہ پرس میں سے پیسے نکالنے لگی۔ لیکن اُس
 پہلے ہی شاہ سکندر نے بے منت کردی۔ وہ پس دیکھتی رہ گئی۔ پھر اُس کے ساتھ دکان سے نکلے ہوئے
 اُسے یاد نہیں رہا کہ اُس کے ساتھ سیما بھائی بھی ہیں اور اُسے ایک اجنبی کے ساتھ دیکھ کر جانے دو
 ”چلو کسی اچھی پرسکون جگہ بیٹھتے ہیں؟“ شاہ سکندر نے کہا تب اچانک اُسے سیما بھائی کا خیال آیا اور
 وقت وہ آگئیں۔ اپنی دھن میں تھیں شاہ سکندر کو اگر دیکھا بھی تو یہ خیال نہیں آیا کہ وہ اُس کے سا
 ہے۔ اپنے انداز میں اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگیں۔
 ”مل گئے نہیں نا دلز؟“ اور وہ سیما بھائی کو دیکھتے ہی شش در پنج میں گرفتار ہو گئی تھی کہ آباؤ کا لہ
 کرائے یا خاموشی سے چل پڑے۔ جہی ان کی بات کا جواب نہیں دے سکی۔ اور اس سے پہلے کہ وہ ڈوٹیہ
 نے اُن کی توجہ کھینچی۔

”آداب!“ سیما بھائی نے چونک کر شاہ سکندر کو دیکھا پھر لپکے سے اُس کا کندھا دبا یا تو وہ سنبھل
 ”بھائی، یہ شاہ سکندر حیات ہیں۔ عدیل بھائی کے دوست، وہاں گھر میں ان کا آنا جانا رہتا۔“

”اچھا، سیما کیا کر رہے ہیں؟“ سیما بھائی نے براہ راست شاہ سکندر سے پوچھا۔
 ”بھائی میں ایک کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔ میرا قیام پوٹل میں ہے اگر آپ آنا چاہیں تو:۔“
 ”شکریہ،“ سیما بھائی درمیان میں ٹوک کر پھر اس سے بولیں۔

”جلد آئیے، یا ابھی کچھ اور لینا ہے؟“
 ”نہیں، اور تو کچھ نہیں لینا۔“ اُس نے یوں کہا جیسے اُسے کچھ نہ لینے کا افسوس ہو رہا ہو۔
 ”جلد پھر آؤ گئے سکندر صاحب!“ سیما بھائی نے ایک طرح سے اُسے خدا حافظ کہہ دیا۔ جبکہ وہ اندر ہی
 اندر خاصی جڑ جڑ ہو رہی تھی۔ سست روی سے اُس کے قریب سے گزرنے لگی تو وہ دھڑکے سے بولا۔
 ”اے اسی عجب!“ وہ اُس کی طرف دیکھ نہیں سکی۔ لیکن نفی میں سر ہا کر مزدوری کا اظہار کرتے ہوئے قدموں
 کی رفتار تیز کر دی۔ اور جب تک موڑ نہیں آیا تو وہ اُس کی نظروں کی گرفت سے نکل نہیں سکی۔ اس دوران
 سیما بھائی جانے کیا بول رہی تھیں اُس نے سنا ہی نہیں۔
 ”کہاں کوئی ہو؟“ میری بات کا جواب تو وہ سیما بھائی نے اُس کے بازو میں پٹکی کاٹ کر کہا تب وہ
 اپنے دھان سے نکل کر شیشا گئی۔
 ”کیا۔ کیا پوچھ رہی ہیں آپ؟“
 ”میں ان صاحب کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔ میں تو جب کراچی میں تھی۔ اسے کبھی گھر آتے جاتے نہیں
 دیکھا۔“

”تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ وہ اپنا بازو سہلاتی ہوئی بولی۔
 ”اچھا غلط سیاق کے کہتی ہو میرا کیا قصور ہے؟“
 ”میں نے کوئی غلط سیاق نہیں کی۔ بیوقوف بھائی سے پوچھ لیجیے گا۔“ وہ اُن کی گھورتی نظروں کے جواب میں
 ہنسی ہوئی بولی اور سامنے گھر دیکھ کر بھاگ کر گھٹ سے اندر داخل ہو گئی۔
 اچانک پہلی محبت کا نشہ سارے احساسات پر چھا گیا تھا۔ وہ کچھ نہ کہتی تب بھی اُس کا انگ انگ
 بول رہا تھا۔ اور اس مقام پر اس کا دل چاہا کوئی ہو جسے وہ اپنی زندگی کے اس خوبصورت راز میں شریک
 کر سکے۔ اور یہ دونوں بھائی ہیں اُس سے بہت محبت کرنے والی اُس کی بہترین دوست تھیں۔

شاہ جہانگیر بچوں کو مری سے لے کر آئے تو جیسا کہ اُس کے ساتھ طے کر کے گئے تھے، سیدھا ایر پورٹ
 پہنچ گئے۔ جہاں وہ ٹکٹیں لیے اُن کا منتظر تھا۔ سب بچوں کو باری باری پیار کرنے کے بعد وہ ٹکٹیں شاہ جہانگیر
 کو تھاتا ہوا بولا۔

”ٹکٹ لینے جانے میں نہیں آدھا گھنٹہ ہے۔ آپ لاؤنج میں چلے جائیں۔“
 ”تم کہاں جا رہے ہو؟“ شاہ جہانگیر نے اُس کے ہاتھ سے ٹکٹ لیتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔
 ”کہیں نہیں، میرا مطلب ہے میں ابھی آپ کے ساتھ نہیں جا رہا۔“ اُس نے کہا تو شاہ جہانگیر ٹھٹک کر بولے۔
 ”کیوں؟“
 ”کوئی خاص بات نہیں ہے بھائی، بس میں کچھ دن تنہا رہنا چاہتا ہوں۔“ شاہ جہانگیر نے بغور اُسے
 دیکھا پھر کہنے لگے۔

”دوچو، جتنا سوچو گے، اُلٹے جاؤ گے!“
 ”سے نہ کر رہی ہیں۔ میں خواہ کتنا سوچوں کتنا اُلٹوں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ بلکہ آپ پر بھروسہ کر کے میں
 ایک طرح سے آپ کی بات مان چکا ہوں۔ اب آپ مجھ پر بھروسہ کریں۔“
 ”اچھا، بات ہے؟“ شاہ جہانگیر نے اُس کا کندھا تھپکا پھر پوچھنے لگے۔ ”کتنے دن رہو گے یہاں؟“
 ”کچھ کہہ نہیں سکتا۔ دو دن، چار دن یا:۔“
 ”بس چار دن سے زیادہ نہیں۔“ ٹھٹک یا بچی دن نہیں اپنے گھر ہونا چاہیے؟ شاہ جہانگیر نے ٹوک

کر کہا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر جب شاہ جہانگیر نے اس کے لئے کراؤنچ میں چلے گئے تب خاصا مطمئن سا ہو کر وہ بول چلا آیا۔

اُس کا خیال تھا ان چار دنوں میں وہ آسمیہ سے مل کر اُس کے بیان تک بھی رسائی حاصل کرے گا۔ اس کا مقصد سب پر چھا جانا تھا۔ گو کہ اُس کے لیے اُسے کسی تردد کی ضرورت نہیں تھی۔ اُس کی شخصیت بھی ہی اتنی متاثر کن تھا کہ ملاقات میں ہی مقابلہ برقرار نہ رہتا تھا۔ جیسے آجانی اور عدیل جانی اُس کے گردیدہ تھے۔ اسی طرح وہ چاہتا تھا یہاں جو آسمیہ کے بھائی، بھائیوں جی ان پر بھی وہ اپنا اثر چھوڑ جائے تاکہ بعد میں جب وہ آسمیہ سے شاہ کی بات کرے تو اس طرف سے سب اُس پر اعتماد کریں۔ ورنہ اگر کسی ایک نے بھی بی بی جان اور باباجان کے شرکت نہ کرنے پر اعتراض کیا یا یہ شرط رکھ دی کہ اُس کے والدین ہی اگر بات کریں تو اُس کے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔

اور وہ اپنے گھر میں تو مشکل میں اور پریشان تھا ہی اس طرف سے کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور آسمیہ سے یہاں ملاقات کو وہ جو ایک خوبصورت اتفاق سمجھ رہا تھا تو اب اس اتفاق کو بھی اپنے منہ میں سوچنے لگا تھا۔ لیکن اپنی سوچوں کے برعکس اُسے شدید کوفت اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ یعنی اگلے تین دن وہ گھنٹوں کے حساب سے اسی یک شاپ کے اُس پاس موجود رہا اور وہ نہیں آئی۔ گو کہ اُس نے آٹے کا وعدہ تو کیا ہاں بھی نہیں بھری تھی پھر بھی اُسے یقین تھا اور اُس کا یقین ابھی ٹوٹا نہیں تھا نہ ہی وہ ملایو ہوا۔ اور اس آخری دن پھر اسی جگہ جا بیٹھا۔

جب سی بے قراری تھی۔ اور اسی بے قراری میں وہ قرار ڈھونڈ رہا تھا تب اُس پر نظر پڑی۔ نیل کا ہاتھ سے اسی طرف آ رہی تھی۔ وہ مزید صبر نہیں کر سکا۔ تیز قدموں سے لوں میں درمیان کا فاصلہ سیٹ کر اُس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ تو گزشتہ تین دنوں کی ساری کوفت بھٹاکر بولا۔

”مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گی۔ اور وہ جو اُس کے اچانک سامنے آنے پر حیران تھی۔ نیل کی موجودگی پر اُس کے والدینہ انداز پر پریشان ہو گئی۔ اور کچھ گھبرا کر نیل کو دیکھا تو وہ کہنے لگا۔

”پھوپھو! یہ وہ والے انکل ہیں ناں جو آج ابھی کے پاس آئے ہیں؟“

”ہاں بیٹا! آپ نے انہیں سلام نہیں کیا؟“ آسمیہ نے اُسے مخاطب بنے کا اشارہ کرتے ہوئے نہیں سے کہا۔

”السلام علیکم! نیل نے فوراً سلام کیا۔

”وصلام! کیسے ہو بیٹا!؟“ سر اسر رسمی انداز تھا۔ پھر اُسے دیکھ کر بولا۔ ”چلو کہیں بیٹھ کر بات کریں گے؟“

”نہیں سکندر۔ میں۔۔۔“ وہ فوراً ٹل کر کہنے لگا۔ ”میں بس آج کا دن یہاں ہونا کل صبح کی فلائیٹ سے واپس جا رہا۔ اور یہ اتنے دن میں صرف تمہارے لیے یہاں دیکھ کر روزانہ یہاں آکر مہمانی راہ دیکھتا رہا ہوں اور تم۔۔۔“

”میں کیا کروں؟“ وہ اُس کے خفا ہونے پر بے بسی سے بولی۔

”میرے ساتھ چلو۔“

”نہیں شاہ سکندر! میں اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔ میرا بھتیجا میٹرھوں سے گر گیا ہے۔ اُس لیے بندہ تیج اور میڈیسن لینی ہے۔ اُس کی مجبوری سن کر وہ کبری سانس کھینچتا ہوا بولا۔

”اُس کا مطلب ہے اب تم سے کراچی میں ملاقات ہوگی؟ اُس نے ذرا سا اثبات میں سر ہلا دیا پھر بولے۔

”آپ خفا تو نہیں ہیں؟ وہ خاموشی سے اُسے دیکھنے لگا اور جب اُس نے ذرا سی پلکیں اٹھا کر تب اُس کے ہونٹوں پر آپ ہی آپ مسکراہٹ پھیل گئی۔

”شکریہ!۔۔۔ وہ منونیت سے کہتی آگے بڑھنے لگی۔ کہ وہ راستہ روک کر پوچھنے لگا۔

”یہاں کتنے دن ہو؟“

”زیادہ سے زیادہ پندرہ دن۔ اگر اس سے پہلے کراچی سے ملاوا لگتا تو پھر نماز سے پہلے حل جاؤں گی؟“

”جھک ہے پھر میں اسی حساب سے آؤں گا۔“ اُس نے کہا تو وہ بے اختیار پوچھ گئی۔

”کیسے؟“

”نہیں بارات کے ساتھ؟“ وہ قدرے متوجہ ہو کر بولا تو وہ جھنب کر آگے بڑھ گئی۔ شاہ سکندر نے اُسے ایک منڈیکل اسٹور میں داخل ہوتے دیکھا پھر اُس کی واپسی کا انتظار کرنے کے بجائے قریب سے زور قیچی روک کر اُس میں پیچھے گیا۔

اگلے روز جب وہ پہلی فلائیٹ سے کراچی پہنچا تو ڈرا نیور کا ڈی ایے موجود تھا۔ وہ سمجھ گیا اُسے۔ شاہ جہانگیر نے بھیجا ہو گا۔ اور ان کا خدشہ سوچ کر وہ اپنے آپ مسکرا رہا تھا۔ پھر ڈرائیور نے اُس سے پوچھ کر ڈرائیو شاہ کو رستے پر پوری اسپید سے دروازے شروع کر دی۔

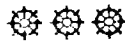
اور تین گھنٹوں کے اس سفر میں وہ پوری یکسوئی سے شاہ جہانگیر کی ایک ایک بات کو سوچتا رہا۔ دران کے سامنے تو وہ ان کی کسی ایک بات سے بھی اختلاف نہیں کر سکا تھا اور اب ہر بات عجیب سی لگ رہی تھی۔ آخر میں اُس نے سوچا وہ سب سے پہلے شاہ جہانگیر سے بات کرے گا۔ ان سے بے جا کہہ کر وہ ہر گز بھی ٹھٹھکیلی نہیں بن سکتا۔ بہتر یہی ہے کہ اُس کے حال پر پوچھ دیا جائے اس کے بعد ایک آخری کوشش کے طور پر وہ خود باباجان سے بات کرے گا۔ اگر وہ آسمیہ کے ساتھ اُس کی شادی رستے پر رضامند ہو گئے تو جھک ورنہ!

کاؤنٹی رکنے سے اُس کی سوچیں بھی اسی مقام پر پھریں۔ ڈرائیور نے فوراً اُس کی طرف کا دروازہ کھولا تو کاؤنٹی سے اُسے غیر معمولی چیل ہیل کا احساس ہوا۔ اپنے طور پر قیاس کرتا ہوا وہ اندر آیا تو اُسے دیکھتے ہی بی بی جان کے پاس بیٹھی دو لکیوں میں بول چل رہی تھی۔ وہ تعجباً نظر انداز کرتا ہوا بی بی جان کی طرف بڑھا۔ اور انہیں سلام اُس کے ہونٹوں میں تھا کہ بی بی جان خوش ہو کر بولیں۔

”ماشاء اللہ بڑی عمر ہے تمہاری۔ ابھی سب متیار پلو پھر رہی تھیں۔ تمکے ہونے لگتے رہے ہر جادو جلدی سے غسل لے لو پھر میں کھانا تمہارے کمرے میں لے جوائی ہوں؟“ وہ اس پر حیران ہوتا اپنے کمرے میں جانے لگا کہ بی بی جان کی آواز نے اُس کے قدم روک لیے۔ وہ دو لکیوں سے کہہ رہی تھیں۔

”اب تو دیکھ لیا دو لہا کو۔ جادو اب ڈھولک بٹھا لو، اور کوئی تمہارا سے کہو بڑے شاہ بی کو خبر کرے ناہ سکندر، کیا ہے؟“

خوشی سے بھر پور بی بی جان کی کھٹکی ہونی آواز نے اُسے چکر دیا تھا۔



فوری طور پر اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ بی بی جان اُس کے بارے میں کیا کہہ رہی ہیں۔ بے مدد متوش نظروں سے پاروں طرف دیکھنے لگا۔

کھلائی رکیاں۔ ڈھولک اور۔۔۔ اور۔۔۔ اُس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ تب ہی عتب سے شاہ جہانگیر نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور خوش دلی سے بولے۔

”اگے یار! اگر ڈی ایچ کی مٹی ایر پورٹ؟“

”ہی؟“ وہ جو خاموش نظروں سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔ ان کی بات کے جواب میں جی کہہ کر فوراً دھڑکھڑاتا ہوا کہنے لگا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے بھائی؟“

”شادی؟“ شاہ جہانگیر مختصر جواب دے کر غائب اُس کے اگلے سوال سے بچنے کی خاطر سامنے سے گزرتی

جیراں کو بکار کر اُس سے جانے کیا بات کرنے گئے لیکن وہ میر نہیں کر سکا۔ اُن کا بازو کھینچ کر پوچھنے لگا۔
 ”کس کی شادی؟“ شاہ جہانگیر نے پہلے جیراں کو جانے کا اشارہ کیا پھر اُسے دیکھ کر بولے۔
 ”شہر بانو کی، پھر اُس سے مل لو۔ پھر شام تک تو گھر کے مردوں سے بھی اُس کا پردہ ہو جائے گا۔“
 ”کیوں؟“

”جیتا نہیں یاد آیا۔ رعیں میں میری سچھی میں نہیں آتیں۔“
 شاہ جہانگیر نے خود کو خاصا الجھان خاص کر کے ہوئے اُس کے بازو میں بازو ڈال کر سیڑھیاں چڑھ
 لگے۔ پھر شہر بانو کے کمرے کے سامنے رنگ گریسٹ اُسے اندر جانے کا اشارہ کیا تو اُس نے دھتک
 لیے باغیچہ بڑھایا لیکن پھر چانک کسی خیال کے تحت رُک کر بولا۔
 ”آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ ابھی بی بی جان تو لڑکیوں سے بھلا اور کبہ سی یقیں۔“
 ”بی بی جان جو کبہ رہی یقیں، وہ بھی شک ہے۔“ شاہ جہانگیر لکھنؤ سے بھیدہ ہو گئے۔ ”شادی مرد
 شہر بانو کی نہیں تمہاری بھی ہو سکتی ہے، اور تم اس وقت کوئی اعتراض نہیں اٹھاؤ گے کیونکہ تم
 سے وعدہ کر چکے ہو۔“
 ”وعدہ میں نے خاموش رہنے کا کیا تھا شادی کا نہیں۔“ اُس نے تھمک کر احتجاج کیا اور شاہ جہانگیر بڑ
 آرام سے بولے۔

”تو خاموش رہو۔“
 ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“
 ضبط کرتے کرتے بھی وہ جتن چڑھا کر شاہ جہانگیر نے انگلیوں سے دروازے کی طرف اشارہ کر کے اُن
 بہن کی موجودگی کا احساس دلایا پھر ایک دم اُس کا ہاتھ پکڑ کر دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو
 سامنے میٹر پر شہر بانو لکھنؤ کے گرد بازو پھیلتے پشانی گھٹنوں پر ٹکائے یہ بھی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آ
 پر بھی اُس نے سرواٹھا نہیں کیا۔ جس سے ظاہر تھا کہ وہ ان کی باتیں نہیں تو اواز سن چکی ہے۔
 ”شہر بانو! شاہ جہانگیر نے بکا رتب اُس نے فلا سا سر او پٹھا کیا لیکن ان دونوں کی طرف دیکھا
 اور اس وقت شاہ سکندر کو اُس کا نہ دیکھنا ہی غیبت لگا۔ فوراً پلٹ کر جانے لگا کہ شاہ جہانگیر نے
 کا بازو تھام لیا اور بہن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔
 ”جب تک شہر بانو اس گھر سے رخصت نہیں ہو جاتی، ہمیں خاموش رہنا ہے۔ یہی وعدہ لیا تھا نا
 نے تم سے۔“ اُس نے بے حد خاموش نظروں سے اپنی دیکھا تو کہنے لگے۔
 ”اب یہ تمہاری قسمت کہ اس کی رخصتی سے پہلے اس گھر میں مہرا نسا دہی ڈولی اُترنا طے پانی ہے۔“
 ذہن ماؤٹ ہوئے لگا۔

”مجھے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا۔ جیسے کچھ کہنا ہو تو شہر بانو سے کہو۔ یہ سن سکتی ہے البتہ بو
 حق اسے نہیں دیا گیا۔“
 شاہ جہانگیر نے ستائے میں چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے تو کتنی دیر بعد اُس نے دھیرے دھیر
 گردن موڑ کر شہر بانو کو دیکھا۔ اُس نے دوبارہ پشانی گھٹنوں پر ٹکائی تھی۔ اُس کے دھڑکنے کو
 نہیں تھی۔ پھر بھی اُس کا رونا محسوس کر کے وہ اُس سے پاس چلا آیا اور آہستہ سے اُس کے سر پر ہا
 کر بولا۔

”رو دو نہیں شہر بانو! میں جہانگیر بھائی سے کیا وعدہ میں توڑوں گا۔ پھر فوراً اُس کے کمرے
 نکل آیا۔“
 پھر شام آتے ہی حرم کی رونق اور جھل جھل میں اضافہ ہو گیا تھا اور وہ اپنے کمرے کی کھڑک
 نظر اُٹھان میں جھجکاتے رعیں مقبور کو دیکھ رہا تھا لیکن اس کا ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا
 سب کچھ اُٹاننا تھا ہو گیا یعنی اُسے اپنے محاذ پر لڑنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ لہذا مہر و ساقی اُسے

آپ سر اگر یہاں اپنی بات منوانے میں ناکام ہو گیا تو سب چھوڑ کر چلا جانے کا اور اس کے لیے وہ
 نہ وقت خود تیار تھا بلکہ سیر کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی وہ یوں مضطرب ہوا کہ اُس کی نظریں
 یہاں وہاں اُسے تلاش کرنے لگی تھیں یہی زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور اُس کے کمرے پر طور چلتے
 ہوئے اندر آ گئے۔

”یارا تم بھی لڑکیوں کی طرح مایوس بیٹھے ہو۔ چلو باہر نکلو۔“
 ابراہنے آتے ہی اس کا بازو پکڑ کر یلغیے ہوئے کہا لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلانا نہ نہیں۔
 ”گناہ ہے اسے دُعا ڈولی کر کے لے جانا پڑے گا۔“
 ”بڑی بے عزتی ہوگی سکندر! ایسے ساری لڑکیاں موجود ہیں۔ شرافت سے چلے چلو۔“
 نادرنے اُس پر صورت حال واضح کرتے ہوئے چلے کر کہا۔ وہ تب بھی اسی طرح کھڑا رہا۔ خاموش ہو کر
 خاموش رہنے کا وعدہ کر چکا تھا۔
 پھر سب کے اصرار پر اسی خاموشی سے جیجا کر آیا تو اچانک دھتک کی تھاپ تیز ہو گئی لیکن اُس
 کے اندر کے ستائے میں کوئی پھل نہیں بچی تھی۔

اگر تم مل جاؤ زمانہ چھوڑ دیں گے ہم
 تمہارے واسطے یہ ساری دُنیا چھوڑ دیں گے ہم
 اگر تم مل جاؤ
 نہ ہو جس میں تم شامل وہ بہاریں ہم نہیں ہیں گے
 نظر جس میں نہ اُسے وہ شیش توڑ دیں گے ہم
 اگر تم مل جاؤ
 رہنمائی کے قریب بیٹھی وہ مندر کے ساتھ ساتھ خود بھی لنگنوں کی تھی۔ صاف لگ رہا تھا جیسے اچانک
 کسی نے اُس کے دل کے تاروں کو تھیس دیا ہو۔ آنکھوں میں کوئی حسین خیال یوں جھلک رہا تھا کہ لنگناتے
 بون پر شیشی مسکان سج گئی تھی۔
 بدن کے سائے تمہارے رنگ میں رنگ ڈالیں

جدا کیا کر کیسے گے تم کو مجھ سے یہ جہاں دلے
 مخنثی کی قسم تقدیر کا رخ موڑ دیں گے ہم
 اگر تم مل جاؤ۔
 سیما بھائی نے کہنی مار کر میوڑ بھائی کو اُس کی طرف متوجہ کیا۔ پھر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر منس
 پڑیں لیکن وہ اتنی عموختی کہ اُسے ہنسی کی آواز سنائی ہی نہیں دتی تھی۔ نہ یہ احساس کہ اس کے بعد
 دوسرا گانا شروع ہو چکا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی اگر تم مل جاؤ تھا۔

”مل جانے کا لیکن خدرا زمانہ چھوڑنے کی بات نہیں کرو۔“
 سیما بھائی نے آخر رہا نہیں گیا اتنی آواز میں ٹوکا کہ وہ اچھل پڑی۔ پھر دونوں بھاو جوں کی شوخ و
 محی خیر ہنسی سے جھینپ کر بولی۔
 ”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

”تمہارے کہنے کو کبہ رہ گیا ہے۔ سب کچھ تو تم نے خود ہی کہہ دیا۔ کیوں بھائی؟“
 میوڑ بھائی نے باقاعدہ اُسے چھیرنے کا آغاز کرنے کے ساتھ ہی سیما بھائی سے تائید چاہی تو وہ فوراً
 بولیں۔

”اور کیا، بنا لام تو اب دُعا کرنا ہی رہ گیا ہے۔“
 وہ سمجھتی اب یہ دونوں اس کا ناک میں دم کر دیں گی۔ اس لیے فوراً خود پر قابو پا کر مسکین سی شکل

بنکر بولی۔

”صرف دعا“
”اے کیا سمجھتی ہو ہماری دعاؤں کو ابھی ہاتھ اٹھا دوں تو کچھ دعا کے سے بندھ چلا آئے گا تمہارا وہ۔
کیا نام ہے اس کا؟“ بیومنہ بھائی ہمیشہ اس کے نام پر انگ جاتی تھیں۔

شاہ سکندر حیات نہ بھائی نے یاد دلایا۔

”ہاں شاہ سکندر۔ بتاؤ انھوں نے ہاتھ“

”ہنیں“ دادو نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہنس پڑی۔

”کیوں؟“ سیما بھائی نے تعجب سے پوچھا تو اس سے پہلے بیومنہ بھائی بول پڑیں۔

”اے سیما ہے۔ میری دعاؤں میں اثر نہیں ہے“

یہ بات نہیں ہے، ”وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان دونوں کے پاس ایمنی اور ایکدم سنجیدہ ہو کر کہنے لگی۔

”دعا کا مرحلہ بعد میں آئے گا بھائی! پہلے اب اماں جی اور اتا جی سے تو بات کریں“

”اے اُن سے تو میں جلتے ہی بات کروں گی۔ تجھے یقین ہے ادھر سے کوئی اعتراض نہیں آئے گا۔

کیونکہ اتا جی اور عدیل بھی اس کی کتنی تعریف کرتے ہیں۔“

بیومنہ بھائی نے کہا تو وہ یونہی بے خیالی میں انہیں دیکھنے لگی جس پر وہ پوچھنے لگیں۔

”میں غلط کہہ رہی ہوں یا تمہیں کوئی اور خبر ہے؟“

”خبر ہے“ وہ اپنے آپ سے پوچھنے لگی۔

”دیکھو کیا خبر بھی بات ہے صاف کہو کیونکہ ہمیں تمہاری دکالت کرنی ہے۔ ایسا نہ ہو بے خبری کی

بنیاد پر ہم سے کوئی غلطی ہو جائے“

سیما بھائی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی پھر سر جھٹکا کر کہنے لگی۔

”مجھے کوئی خبر نہیں ہے بھائی! البتہ شاہ سکندر کہہ رہے تھے کہ ان کے والدین شاید ہی راضی ہوں۔

کیونکہ اُن کے ہاں تادیباں خاندان ہی میں ہوتی ہیں“

”پھر تو اُسے تمہاری طرف نہیں بڑھنا چاہیے تھا؟“ سیما بھائی بلا ارادہ فوراً کہ گئیں لیکن پھر اپنی بات

کی نفی کرتے ہوئے بولیں۔

”نہیں خیر یہ تو بے اختیاری جذبہ ہے۔ بندے کو کچھ یاد نہیں رہتا۔ ہاں تم جاؤ۔ ایسی صورت ہو

کیا کرے گا؟“

”کہہ رہے تھے ان کے والدین راضی نہیں مانے تو وہ چلے آئیں گے اور انہیں یہ بھی یقین تھا کہ زیادہ عرصے

تک اُن کے والدین ناراض نہیں رہ سکیں گے“

وہ یونہی سر جھٹکے رک رک کر بول رہی تھی۔ سیما بھائی معاملے کی جہ تک پہنچ کر پوچھنے لگیں۔

”وہ اپنے والدین کے ماننے تک انتظار کرے گا یا پہلے ہی شادی کرنا چاہتا ہے؟“

وہ کچھ نہیں بولی لیکن جن نظروں سے سیما بھائی کو دیکھا اس سے وہ سمجھ کر بولیں۔

”ہوں۔ پہلے شادی۔ اور کم از کم مطلب ہے۔ تم نے سوچ لیا ہے؟“

”میں تو بس آنا جانتی ہوں بھائی! کہ میری زندگی میں آئے والا وہ پہلا اور آخری شخص ہے۔“

سے میری شادی اب ہمارا دس سال بعد ہو سکتا ہے اور فیصلہ کرنا آپ سب کا کام ہے۔“

اس کے مضبوط ہاتھ پر دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو غصے سے دھکے مارے۔

مذاق سے شہرہ ہو کر بخیرگی کا روپ دھاتے ہی ماحول کو جو جھل کر گئی تھی۔

جانک اُسے احساس ہوا کہ اتنی محنت کرنے والی بھائیوں کو اس نے مشکل میں ڈال دیا ہے۔

”اُس کی آنکھوں سے تھوڑا سا آنسو نکل کر اُس کے ہاتھوں کی پشت پر گرنے لگی۔

”اے! بیومنہ بھائی کی نظر پڑی تو مزہ پڑا کہ اُس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر ٹوکا۔“ اس میں

کی کیا بات ہے؟“

”اُس کے اُسنوا اور روانی سے پہنچ گئے۔

”ہشت پگی! رو رو گی تو ہم دس سال بعد کا فیصلہ سنائیں گے۔“

”سیما بھائی نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا ساتھ ہی بیومنہ بھائی کو بٹانے کیا اشارہ کیا کہ وہ آچھل

کر بولیں۔

”دس سال نہیں بھئی۔ میں تو جلتے ہی اماں جی کی منتیں شروع کر دوں گی کہ فوراً اسیہ کو رخصت

کر دیں۔“

”شاہ سکندر کے ساتھ؟“ سیما بھائی نے مزید لقمہ دے کر اُکسایا۔

”ہاں! چاہیے اُس کے اماں ابا آئیں یا نہ آئیں۔ کیوں اسیہ؟“

”آخر میں اُسے لگدایا تو وہ اپنے آپ میں سمٹنے لگی۔

”ایسے ہنیں ہنس کر دکھاؤ۔“

”ساتھ کا نا بھی سناؤ۔ اگر تم مل جاؤ لیکن دیکھو زمانہ چھوڑنے کی بات نہیں کرنا۔“

سیما بھائی کی پیار بھری وارزنگ پر وہ ہنس پڑی تو بھادو جوں کی چھیر چھاڑے ماحول پھر سے

دشگوار ہو گیا تھا۔

اماں جی۔ میں ہمدرد کو ملاؤ دے رہا ہوں۔“

بڑے بیٹا کا چرسکون انداز تار تار تھا کہ یہ اچانک فیصلہ نہیں ہے بلکہ سارے طوفانوں سے گزرنے

کے بعد ہی وہ اماں جی اور اتا جی کے پاس آئے ہیں۔ اور اپنی بات کے رد عمل پر ٹھنکے بھی نہیں۔ یعنی اماں

جی اور اتا جی سناٹے میں آگئے تھے اور وہ ہنوز اسی انداز میں گویا ہوئے۔

”میں جانتا ہوں میرا یہ اقدام آپ کو ڈر دے گا۔ اتنا عرصہ اگر میں خاموش رہا تو صرف یہی سوچ کر

لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ دس سال کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ میں سمجھتے پر سمجھتا کرنا گیا اس

امید پر کہ شاید کبھی وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگے لیکن۔“

گھر بھر کر بولتے بولتے انہوں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا پھر ہونٹ بھینچ لے کر اتا جی ڈکھ

سے بولے۔

”اگر تم شروع ہی میں اُسے الگ گھر لے دیتے تو ہمیں اتنے سمجھوتے نہ کرنے پڑتے۔“

”حق یہ کہتے ہیں آپ۔ تب تو دس دن میں ہی فیصلہ ہو جاتا۔“

ان کے بچے میں کتنی سمٹ آئی۔

”کیونکہ وہ اپنے رد عمل میں آزاد ہو جاتی۔ اُس نے اپنی سوسائٹی کے لوگوں کو اگر اس گھر کا راستہ نہیں

دیکھا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُسے آپ کا اماں جی کا یا میرا خیال رہا نہیں۔ ہم سب کی عزتوں کی

تو اس کے نزدیک سارے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔ وہ اپنا گھر اس کی عورت کی طرح مڈل کلاس

سے اپنا تعلق ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ اس لیے کسی کو اس گھر کا راستہ نہیں دکھایا اور اگر میں اُسے الگ گھر

سے دیتا تو جو کچھ وہ باہر کر رہی تھی۔ وہی میرے گھر میں بھی ہوتا۔“

”اُسے اتنی ذہیل بھی تو تم ہی کے دی بیٹا! جہاں مرضی آئی گئی۔ سمجھی تو کام نہ۔ اسے تم نے تو یوں ہی

کی طرف سے انکھیں بند کر لیں جیسے تمہارا اُس سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔“

اماں جی بھی انہیں الزام دینے بیٹھ گئیں۔

اور اب اتنے عرصے بعد تمہاری عزت جا کے ہے تو ایکدم سے اسے چھوڑنے کی بات کر رہے ہو۔

”بیٹا! ایسا ہمارے خاندان میں کبھی نہیں ہوا۔ اُسے آرام ہے۔ پیار سے سمجھاؤ۔“

”آپ کا مطلب ہے۔ میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ ہر طرح سے سمجھا کر دیکھ لیا ہے اماں جی۔

اب تو میری قوت برداشت جواب دے چکی ہے۔
ان کی بے بسی پر ابائی کر دھک دے گئے۔

میر سے بیٹا۔ میر سے۔

”بہت صبر کر لیا۔ مزید کی طاقت نہیں۔ اگر آپ لوگوں نے مجھ پر بازو ڈالا تو کسی دن میرے دارا کی شریانیں پھٹ جائیں گی۔“

”اللہ نہ کرے برائیاں جی نے دل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔“

”تو چھوڑ دس اس کی طرف داری۔ مت کہیں اس سے ساتھ ہمدردی۔ وہ عورت ہرگز اس قابل نہیں ہے۔ نیل کی وجہ سے میں سناں کا بہت لالچ کیا لیکن اُسے اس کی بھی پروا نہیں ہے کتنے دن ہو گئے ہیں نیل کو گئے ہوئے۔ ایک دن بھی اُس نے آپ سے پوچھا کہ وہ کب آئے گا۔“

ایک طویل عرصے بعد وہ اتنا بول رہے تھے۔ گویا برسوں کا غبار تھا۔

”مجھ بھی بیٹا! نیل کا خیال کر کے تم ٹھنڈے دل سے سوچو۔“

اتناں جی سنی طرح ان کے فیصلے کے حق میں نہیں تھیں۔ ایک آخری کوشش کے طور پر انہیں پڑا کا احساس دلایا تو وہ کہنے لگے۔

”نیل کا خیال ہی تو کر رہا ہوں۔ ماں کی بے توقہ جی سے مر تھا کہ وہ گیا ہے اور جس دن اُس نے ماں کا

بے راہ روی محسوس کر لی بالکل ٹوٹ جائے گا۔“

”نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کی زبان پر نیل کی بے راہ روی کا ذکر آ گیا۔“

”بچے کی شخصیت کو بنانے اور بگاڑنے میں ماں کے کردار کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ

کو میرا بچہ اپنے وجود پر ی دلوم ہوا اور کسی سے سزا ٹھاکر بات نہ کر سکتے۔“

اس کے بعد اگر اُن کے پاس کہنے کو کچھ تھا بھی تو ابائی کو سر جھکائے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے پھر

جائے جاتے ہوئے تھے۔

”مجھے افسوس ہے۔ میں آپ کو دھک دے رہا ہوں۔“

ان کے جانے کے بعد ابائی نے سزا ٹھاکر اتناں جی کو دیکھا تو وہ رونے لگیں۔ چتا نہیں ان کے آنسوؤں

کے دھک پر جھلکے تھے آپ اس عورت کے لیے جو دھک کا باعث تھی۔ ابائی جی نے بہر حال انہیں رونے سے

منع نہیں کیا۔ کبھی ماضی کی بھینٹ نہ بنے۔

”یہ سچ ہے میرے بیٹے نے اپنی طاقت سے زیادہ برداشت کیا۔ دعا کر ڈالو اسے سکون دے۔“

اتناں جی دوپٹے کے پوسے اُسو صاف کرتے لگیں۔

”شاید اسی میں خدا کی مصلحت ہوگی۔“

ابائی اُٹھتے ہوئے بیٹے اپنے آپ سے بولے۔ تبھی عدیل نے آکر سلام کیا تو جواب دے کر ابائی

اپنے کمرے میں چلے گئے۔ عشاء کی آذان ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ اتناں جی نماز کی نیت سے اُٹھتے

عدیل نے کھانا مانگا لیا۔

”نماز سے پہلے مجھے کھانا دے دیں اتناں جی! پھر بیٹھے ہوئے اتناں جی پر نظر پڑی تو ٹھٹھک گئے

دیکھا بات ہے اتناں جی! آپ رویوں سی ہیں؟“

”کچھ نہیں۔“ اُٹھنے لگیں تو عدیل نے جلدی سے اُن کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ اور انہیں بتانے پر

کرنے لگے۔ اسی وقت اوپر سے نیل بھیانی گھر میں داخل ہوئیں اور ادھر سے بڑے بھیا بہت تیز

سر میاں آرتے ہوئے آگے یوں جیسے انتظار میں تھے۔ فیثا انہوں نے اوپر سے نیل کو کھاتے ہوئے

دیکھ لیا تھا اور بجائے اُن کا اوپر اٹھا کرنے کے خود ہی نیچے آکر اُن کا راستہ روک لیا۔

”کیا بات ہے؟“ نیل کا اچھا انداز تھا۔ غیر معمولی بات پر بھی اُس کے تناظر میں فرق نہیں آتا

پیشانی پر دل ڈال کر بولی۔ ”اس طرح راستے میں کھڑے ہونے کا مطلب؟“

”واپس لوٹ جاؤ، جہاں سے آئی ہو اور جس کے ساتھ آئی ہو۔“

”اُن کے لیے کامیاب اس بات کا نماز تھا کہ وہ منہ کی انتہا پر کھڑے ہیں۔“

نیل نے تدریس میں اتناں جی اور عدیل کو دیکھا پھر اُن سے بولی۔

”میں ہرگز نہیں اپنی اسلٹ کی اجازت نہیں دوں گی۔ جو کچھ کہنا ہے اور چل کر کہو۔“

”کہنے کے لیے طاقت نکال گیا ہے نیل بیگم۔ ایک ہفتہ پہلے میں نے نہیں وارنٹ دی تھی۔ اپنی روش

بدلو۔ اگر نہ بل مکتو تو اس گھر میں مت آنا۔ آج کی تاریخ دیکھ لو۔ یہی دن طے ہوا تھا ناں؟“

انہوں نے چپچپے ہوئے پہلے میں اسے یاد دلایا تو وہ کبھی سانس لینے لگی۔

”تو نے فیصلہ کر لیا؟“

انہوں نے ہونٹ پیچ کر اثبات میں سر ہلایا تو اُس نے اُن پر سے نظریں ہٹا کر اتناں جی کو روتے

ہوئے اور عدیل کو کم دم دیکھا پھر درود یار پر نظر ڈالنے کے بعد آخر میں انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

”اگر میں نیچے درجے کی کوئی عام سی عورت ہوتی عقیل احمد تو تمہاری منتیں کرتی یا پھر کہتی کہ جو کچھ تم

نے میرے ساتھ کیا تو تمہاری۔“

”خبردار۔ وہ جو بہت منہ پر رہے تھے۔ پیچ پڑے۔ تمہاری زبان پر میرے گھر کی کسی عورت کا

نام نہ آئے۔“

”بہت بار ساہن تمہارے گھر کی عورتیں۔ ہا۔“ وہ تھمرا کر ہنسی۔ بڑی زہریلی ہنسی تھی۔ عدیل اپنی جگہ

سے اٹھ کر دونوں کے درمیان آکھڑے ہوئے۔

”بڑے بھیا، پلیز، آپ اوپر جائیں، پھر اس کی طرف پلٹے۔“ بھائی پلیز۔“

”مت کہو اسے بھائی! طلاق دے رہا ہوں میں اسے۔“

”طلاق دے رہا ہوں۔“

نیل کو اگر افسوس نہیں تھا تب بھی ایک لحظہ کو دل کا پناہ ورت تھا۔ اس کے بعد کچھ نہ کہہ کر خود کو پھلے

دے گی عورت ثابت کرنے سے روکتے روکتے بھی دہلیز پر کھڑی ہو کر وہ پیچ کر بولی تھی۔

”عقیل احمد! مت بھولنا کہ تمہاری ایک بہن بھی ہے۔“

اتنے شور اور ہنگامے میں اُس کا دم گھٹ رہا تھا۔ بی بی جان کی رسمیں بھی تو ختم ہونے میں نہیں آ رہی

تھیں۔ جہاں سے کس چیز پر اُس کا اور اُس کے پہلو میں کھڑی مہر النساء کا ہاتھ لگا کر دونوں کے اوپر سے

دار رہی تھیں۔

اگر یہ سب اُس کی خواہش کے مطابق ہو رہا ہوتا تو وہ کتنا خوش ہوتا۔ بھادو جوں اور کزنز کی چھین چھاڑ

پر صرف ملاحظہ ہوتا بلکہ برابر سے جواب بھی دیتا لیکن وہ تو ایسا کم کم گھبراہٹ کا پہلو میں کھڑی مہر النساء

کے وجود کا احساس بھی نہیں تھا۔

”بس کہیں بی بی جان! ذہن تھک گئی ہے۔“ آخر بڑی بھائی کو احساس ہوا تو بڑھ کر مہر النساء کو تمام

لیا تو اُٹھی بھاری کپڑوں اور زینت کے بوتھ سے تھکی جا رہی تھی۔ بی جان نے ہاتھ میں پکڑا تھا

بیسرل کو تھا یا پھر ایک طرف ہنستے ہوئے مہر النساء سے بولیں۔

”سنبھل کے۔ پہلے دایاں پاؤں آگے بڑھاؤ۔“

”جیل بھی شہزادے! تو بھی آگے بڑھو! پھر بی بھائی نے اُس کے بازو میں چبکی کاٹتے ہوئے کہا اور

اُس سے قدم کھینچا بڑھا کر پھر کھینچا ہی نہیں۔ یہ عجیب سے سب شور مچا رہی تھیں۔

”ارے اپنی ذہن تو لیتے جاؤ! اُس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ رابڈ آری سے نکل کر میٹر میاں چڑھنے

کے بجائے پھیل طرف بارہ درمی میں نکل آیا۔
 دن بھر کی تھکاوٹ دینے والی گرمی کے بعد ابھی بھی گرمی ہو رہی تھی پھر بھی قدرے سکون تھا۔
 ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایک تو ذہنی انتشار دوسرے تھکا دینے والی گرمیوں کے
 اعصاب تل کر گئی تھیں۔ کتنی دیر تک وہ بالوں میں انگلیاں پھسلنے خود کو سہارا دینے کی کوشش
 رہا پھر اٹھ کر بیٹھ لگا۔

جب وہ کئی حد تک سوچنے کے قابل ہوا تب بھی وہ کیسوی سے کچھ نہیں سوچ سکا۔ البتہ اب
 آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنی آسانی سے کیسے سازش کا شکار ہو گیا۔ شاید اُس کے گمان
 بھی نہیں تھا کہ شاہ جہانگیر نے جو اُس سے شہر بانو کی شادی تک خاموش رہنے کا وعدہ لیا تھا تو
 سے پیسے وہ اسے بھی باند کر دیں گے اور اسے باند کر کے سب لوگ کتنے خوش تھے۔ اندر سے آتی ہمت
 کی آوازیں اُس کے ذہن پر ہتھوڑنے برس لے رہی تھیں تو اس کا دل چاہا وہ اسی وقت سب کی خوشیوں
 رو متا ہوا چلا جائے لیکن ابھی شہر بانو وحشت نہیں ہوئی تھی۔ کل تک اُسے انتظار کرنا تھا۔ اس کے بعد
 ایک بل یہاں نہیں مہرے گا۔

اُس کا ذہن اچانک اپنے کل کے بارے میں سوچنے لگا تو پھر اسے کچھ خبر نہیں ہوئی۔ کتنی رات بزد
 گئی۔ اندر باہر ہر طرف خاموشی چھا گئی تھی۔ شاید سب کو یقین تھا کہ وہ اپنے کمرے میں جا چکا ہے مگر
 اُسے ڈھونڈنا ہوا اس طرف نہیں آیا بلکہ سب اطمینان سے سو گئے تھے۔ اور وہ اپنا اگلا اقدام سوچنے
 بعد جب پوری طرح مطمئن ہو گیا تب وہاں سے اٹھ کر اندر آیا۔

اس وقت گھڑی کی سوئیاں دو بج رہی تھیں۔ وہ مہر النساء کے سوجانے کا یقین کر کے اپنے کمرے
 آیا اور قفسہ اُس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے سیدھا ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔
 اس کا خیال تھا کہ پڑے بدل کر اسی خاموشی سے اس کمرے سے نکل کر بیچے کہیں جا کر سوجانے کا۔ اب
 نہیں اُس نے بہت احتیاط کی یعنی کوئی آہٹ نہیں ہونے دی۔ آبا بھی دہانے پاؤں تھا۔ پھر کمرے کا
 کراسی احتیاط سے ڈرائنگ روم سے نکلا تھا کہ بے اختیار نظر مچ پر بیٹھی اُس لڑکی پر جا ٹھہری جس کا
 غیر معمولی حسن بھی اُسے متاثر نہیں کر سکا تھا لیکن اس ایک بل میں جانے کتنا سحر تھا جس کی گرفت
 وہ یوں اٹکا کہ اُس پر سے نظر ہٹا ہی نہیں سکا۔ پتا نہیں اُس کا انتظار کتنے کرتے وہ سو گئی تھی یا نہ
 پلکیں موندی تھیں۔ خود سے قدرے بے نیاز اور قدرے بے ترتیب سی ہو کر ہوش اُڑانے دے رہا
 تھی۔ اور اسی مدھوشی کے عالم میں اُس نے درمیان فاصلہ سینا تو اُس کے ہونٹ بے آواز جنبش کر
 تھے۔ مہر۔ مہر۔ مہر۔

اور یہ محبت کا نشہ نہیں تھا جس کا کیف ساری زندگی پر محیط ہو جاتا۔ اس کے برعکس وقتی جذبات
 تھے۔ نفسیاتی خواہش جس سے مغلوب ہو کر وہ اپنی اولین شب اُس کے نام کر گیا تھا جس کے ساتھ ذہن
 گزارنے پر اس کا دل آمادہ ہی نہیں تھا۔ اور گو کہ اُس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ پھر بھی صبح ہونے
 پہلے مڑ پڑا کر اٹھ بٹھا۔ اور بے حد وحشت زدہ مہر النساء کو دیکھنے تک جو با لینے کے احساس سے
 نیند میں بھی مسکرا رہی تھی۔ جس سے وہ جنونی سا ہو کر اُسے جھنجھوڑنے لگا۔

”مہر۔ مہر النساء۔“
 ”جی۔“ وہ گہرا کر اٹھ بیٹھی۔
 ”تم یہاں کیوں آئی ہو؟“ عجیب سوال تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔
 ”جی۔“

”تم نے مجھے روکا کیوں نہیں۔ تم نے مجھے روکا کیوں نہیں؟ وہ اُسے کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑ
 لگا۔ تو بڑی مشکل سے اپنا آپ چھڑا کر وہ بیڈ سے اتر کر لوٹی۔
 ”آپ۔ شاید آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ پھر جلدی سے گلاس میں پانی ڈال کر لے آئی۔

بیچے۔ پانی پانی لیں۔“
 اُس نے گلاس لے کر ایک ہی سانس میں خالی کر دیا پھر بیڈ کی پشت پر سر رکھتا ہوا لولا۔
 ”یہ اچھا نہیں ہوا مہر النساء؟ یہ اچھا نہیں ہوا؟“ اُس کے لیجے میں بے بسی تھی۔ مہر النساء کی جسم میں
 نہیں آتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اُس کے ہاتھ سے گلاس لے کر قبل بھر کھا پھر قریب آ کر لوٹی۔

”تب لیٹ جائیں، میں آپ کا سر دباؤ دیتی ہوں۔“
 اُس کے اندر اچانک تنفر پھر گیا۔ ذرا سی آنکھیں کھول کر اُسے دیکھتا ہوا نہر خند سے بولا۔
 ”کیا سمجھتی ہو تم؟ اس طرح میرا دل جیت لو گی۔“
 ”جیتے تو آپ میں شاہ جہانگیر کی تو رائی؟“ بڑا غرور تھا۔ بڑا دلنشیں انداز تھا اس کا لیکن شاہ سکندر حیات
 اب برش میں اچکا تھا۔ کچھ دیر تک اُس کی جھلک ہوئی پلکیوں کو دیکھتا رہا پھر بے لطف چھٹنے لگا۔

”بارے کا دکھ نہیں ہے تمہیں؟“
 ”دکھ۔“ مہر النساء نے زبردست دہرایا پھر جیسے اپنی ہار سوچ کر مسکرائی۔ اور ایسے ہی جھلک ہوئی
 نظروں سے اُسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”آپ کو جیتنے کی خوشی نہیں ہے؟“
 شاہ سکندر کی آنکھوں میں خیر سمٹ آیا۔ کیا کہے اُس سے کہ جسے وہ جیت کہہ رہی ہے۔ وہ اس
 کی سب سے بڑی ہار ہے۔

کل جب مہر النساء کی ڈولی اس جوبلی میں اُتری تھی تو جوبلی کی رونق میں کمی گنا اضافہ ہو گیا تھا اور وہ
 ساری رونقیں شہر بانو کے رخصت ہوتے ہی ماند پڑ گئی تھیں۔

رواج کے مطابق مہر النساء بھی اس کے ساتھ بیٹھے جل گئی تھی۔ اور تین دن اُسے وہیں رہنا تھا۔ بہر حال
 شاہ سکندر کو اس سے کوئی محسوس نہیں تھی۔ وہ شہر بانو کی رخصتی تک خاموش رہنے کا وعدہ بھانچا تھا اور
 مزید خاموش رہنا اُس کے اختیار میں نہیں تھا نہ ہی صبح ہونے کا انتظار کر سکا۔ اسی وقت جا کر شاہ جہانگیر
 کے کمرے کا دروازہ کھٹکھا دیا۔

”کون ہے آج؟“ اندر سے شاہ جہانگیر کی آواز آئی تو اُس نے ہینڈل گھا کر دروازہ کھول دیا لیکن
 سامنے بھائی پر نظر پڑی تو وہیں رگ کر لوٹا۔
 ”بھائی! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

”ہاں ہاں۔“ مجھے معلوم ہے بلکہ یاد ہے۔ کچھ دن صبر کر لو۔ میرا اطمینان ہے۔“
 ”سہاں ایک ایک بل بجا رہی ہے۔“ وہ درمیان میں بول پڑا تو شاہ جہانگیر نے اپنی سیم کو دیکھ کر گویا
 اسے ان کی موجودگی کا احساس دلایا پھر اُسے دیکھ کر پوچھنے لگے۔
 ”کیا صبح تک انتظار بھی نہیں کر سکتے؟“

”ارے ابھی تو وہ گئی ہے۔ اتنی بے قراری؟“
 ”بھائی! ابھی سب کے مطابق مہر النساء کے خولے سے اُسے چھپ کر رہیں تو اُس نے شاہ جہانگیر کو دیکھا۔
 ”صبح۔“ انہوں نے اسی قدر کہا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ ان کا دروازہ بند کر کے اپنے کمرے
 میں آیا۔

رات کے پندرہسوں لمحات کی خوشنوا بھی اُس کے کمرے سے گئی نہیں تھی، جو اُس کے سوچنے کی
 راہ میں عامل ہو کر بار بار اُس کا دھیان مٹا دیتی۔ تب بھی اُس کے لیے میں منہ جھپا لیا تھا۔
 پھر صبح ناخستے کے بعد وہ بی بی جان کے پاس آ بیٹھا۔ اُس کی بڑی بہن تو بڑا زہنی دین موجود تھیں۔
 اور اپنے جانے کی بات کر رہی تھیں۔ وہ سن کر کہنے لگا۔
 ”اتنی جلدی کیوں جا رہی ہیں آپ؟ ابھی رہیں ناں؟“

”تم کہاں میرے پاس بیٹھے ہو، سادقت تو اپنے کمرے میں بند رہتے ہو، نور بالو نگہ کر رہے ہو۔“
 بولیں۔ ”میرے پاس آنے بھی نہیں ہو، اب میرا مذاق کونے کر آنا۔“
 ”جی۔“ وہ اسی قدر کہہ کر فوراً بی بی جان کو مخاطب کر کے پوچھنے لگا۔ ”جہانگیر جہان نے ناظر لیا؟“

”ہاں، وہ تو سویرے ہی نکل گیا ہے۔“ بی بی جان نے بتایا تو وہ چونک گیا۔
 ”کہاں؟“
 ”رہنے پر گیا ہے۔“
 ”کیسے؟“

”نہیں۔“ تیار سے بابا جان بھی ساتھ گئے ہیں۔ پھر سرسری انداز میں پوچھنے لگیں۔ ”تہیں کوئی؟“
 ”اُس سے؟“
 ”جی۔ جی نہیں۔“ وہ اکیدم اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جاتے جاتے ٹک کر بولا۔ ”بی بی جان! میں تو اُن سے“
 ”گاہ میں اس سے زیادہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔“
 ”کیا کہہ رہے ہو؟“ بی بی جان نے ٹھیک سے سنا نہیں یا سمجھیں نہیں اور وہ اچانک سار مصلحتوں کا دامن چھوڑ کر چیخ پڑا۔

”میں جا رہا ہوں بی بی جان یہاں سے، جہنم کے لیے، اب نے اور بابا جان نے میری با سنی ہی نہیں تھی اور جہانگیر نے اتنا احسان کیا کہ نہ صرف میری بات سنی بلکہ سمجھ کر لکھے یقیناً دلا یا تھا کہ وہ میرے بھائی ہیں۔ آپ لوگوں کو ہوا کر میں گئے۔ لیکن وہ میرے ساتھ فاضل تھیل سے اس سے زیادہ میں اپنی زندگی کے ساتھ کھیلنے کی اجازت کسی کو نہیں دے سکتا۔“
 ”ک۔ کیا مطلب ہے عتبار؟“ بی بی جان نے بوکھلا کر کہا اُس سے اور دیکھا نور بالو کو

صورت حال کو نہ سمجھتے ہوئے بھی پریشان ہو گئی تھیں۔
 ”آپ ابھی طرح جا رہی ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوئی ہو جس نے جہانگیر پر اعتبار ان سے کیسے کیا میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی گناہ گوار نہیں ہوں نہ ہی ان کے سہارے کا محتاج نہ ہوں۔“
 ”نکل کر اگر چہ نہ کرو گناہ۔“ اب بھی پلٹ کر کہاں نہیں آؤں گا؟
 ”اُس نے جاتے کا فیصلہ بنا کر بی بی جان کے حواس چھین لیے۔“

”بابا جان کے الفاظ حرف آخر تھے ناں تو میرا فیصلہ بھی اٹل ہے۔ اُن ہی کی اولاد ہوں میں۔“
 ”اے بی بی جان! اب میری باری ہے جا رہا ہوں میں۔“
 ”وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ ورنہ اس سے پہلے کہیں بی بی جان کے سامنے اتنی اونچی آواز بات نہیں کی تھی۔“ جاتے کیسے سارے لحاظ بھلا گیا۔

”سکندر، سکندر میرے بھائی؟“ نور بالو انہی تجھ سے اٹھ کر اُس کی طرف لپکیں۔ ”کہاں جا رہے“
 ”بی بی جان جانتی ہیں؟“ وہ نور بالو کے قریب آنے سے پہلے ہی دودھانے کی طرف بڑھ گیا۔
 ”بی بی جان اکیدم بوش میں آکر پکار کر بولیں۔“
 ”سکندر! اپنے بابا جان کو تو آنے دو۔“ وہ اُن سنی کرتا آگے بڑھ گیا۔ تو بی بی جان شاہ یونس بہوؤں کو پکارنے لگیں۔

”کوئی روکو اسے۔ میں تیار سے بابا جان کو کیا جواب دوں گی؟“
 اور غلطی شاہ جہانگیر کی تھی۔ اگر اُن کی بات سن لیتے تو آرام سے سمجھا بھی سکتے تھے۔ جیسے پہلے رام کر لیا تھا۔ شاید اپنے طور پر انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ اب وہ کچھ نہیں کر سکتا اور وہ اس کو جو گیا تھا کہ بڑی بہن اور بھائی صفتیں کرتی رہ گئیں شاہ یونس نے ہر طرح روکنے کی کوشش کی وہ نہیں رکھا۔ اسی وقت اپنا ضروری سامان لے کر حویلی سے نکل گیا تھا۔

”اسیہ!“ اُس نے تشکیل جہان کی پکار سن کر سب بچوں کو آرام سے کھینے کی تاکید کی پھر کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آئی تو وہ اُسے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

”بیٹا! وہ عدیل کا فون آیا تھا۔ کہہ رہا تھا، اتان جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“
 ”کیا سہرا اتان جی کو؟“ ادھر سے سیما جہان سنتی ہوئی آ رہی تھیں۔ فوراً پوچھنے لگیں۔
 ”بیٹا نہیں، زیادہ کچھ نہیں بتایا عدیل نے۔“ میرا خیال ہے اکیلے میں گھبرائی ہوئی کہ تشکیل جہان بڑی کو جواب دے کر اُسے دیکھنے لگے۔
 ”تو ہم چلے جاتے ہیں؟“ اُس نے کہا تو تشکیل جہان بڑی سوج انداز میں ذرا سا سر ہلا کر بولے۔

”جوں۔“ عدیل بھی کہہ رہا تھا کہ اب جی سب کو واپس بلا رہے ہیں۔
 ”عدیل نے یہاں فون کیوں نہیں کیا۔ تم انکم ہم اتان جی کے بارے میں تفصیل سے تو معلوم کر لیتے۔“
 ”اسی لیے اُس نے یہاں فون نہیں کیا۔ کیونکہ وہاں گھر کا فون خراب تھا اور آفس میں بیٹھ کر وہ تم خواتین سے لمبی چوڑی بات نہیں کر سکتا تھا۔“ تشکیل جہان نے زور دے کر بیوی کو بتایا پھر اس سے کہنے لگے۔

”بیٹا! تم بتادی کرو۔ کل صبح کی ٹرین سب سے؟“
 ”یعنی آپ ٹکٹ بھی لے آئے؟“ سیما جہان نے تعجب کا اظہار کیا۔
 ”ٹھیک تو ہے جہان! ہمیں فوراً جانا چاہیے۔“ پتا نہیں اتان جی! اُس کا دھیان اتان جی کی طرف تھا۔ اس بحث سے اُٹتا کر بولی۔ تشکیل جہان نے چونک کر اُسے دیکھا پھر تسلی دیتے ہوئے بولے۔

”زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بس وہی اکیلے میں گھبرا گئی ہیں۔ تم جاؤ تیار ہی کر دو۔“
 ”اُسے محسوس ہوا۔ جیسے تشکیل جہان کچھ چھپا رہے ہیں۔ تب اندر ہی اندر اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اور کیونکہ بات اتان جی کی تھی۔ اس لیے کسی اور طرف اُس کا دھیان ہی نہیں گیا۔ فوراً جا کر پہلے میوڑہ جہان کو بتایا پھر اُس کا پنا سوٹ کیس بیک کرنے لگی جیسے اسی وقت روانہ ہوئی۔ اور اس کا دل توڑ ہی جا رہا تھا کہ اسی وقت اتان جی کے پاس پہنچ جائے بڑی مشکل سے رات کئی تھی اور پھر آگے طویل سفر تھا۔ گو کہ تشکیل جہان اور جہانگیر جہان تھیں وقت رخصت بھی کہی رہی تھیں کہ یہ صرف تم لوگوں کو بلانے کا ہانا ہے۔ لیکن اُس کا دل ماننے کو تیار نہیں تھا۔

”آنا جی ایسے زلاتے تب بھی نہیں جانا تھا۔ ضرور کوئی بات ہے۔“
 ”تمام راستہ وہ میوڑہ جہان کی تھی۔ اُسے کراچی اسٹیشن پر عدیل موجود تھے۔ اور وہ جو تشکیل جہان کے سامنے کسی بے قراری یا تشویش کا اظہار نہیں کر سکتی تھی عدیل جہان سے اپنی کیفیت چھپانے لگی۔“
 ”کیجی بتائیں عدیل جہان کیا بات ہے؟“
 ”کیا بات ہے؟“ وہ اُٹا اُس سے پوچھنے لگے۔

”اتان جی تو ٹھیک ہیں ناں؟“
 ”اب ٹھیک ہیں اور بڑی بے قراری سے تم لوگوں کا انتظار کر رہی ہیں۔ پھر فوراً میوڑہ جہان کی طرف گھوم کر کہنے لگے۔“
 ”آپ نے بھی تو صدمہ کر دی جہان! سب بچوں کو لے کر بچل پڑیں۔ ایک دو کو اتان جی کے پاس چھوڑ جائیں۔“

”ایک تو جھوٹا لڑکی تھی میوڑہ جہان کا اشارہ اپنے حیاں کی طرف تھا۔ عدیل سمجھ کر زور سے ہنسنے لگی۔
 ”میں بیل پر نظر پڑی تو اُسے اپنے ساتھ لگا کر لوٹے۔“
 ”اور پارا ستر کیسے ہو، یہ بیک اٹھا لو گے؟“

”میں اٹھاؤں گا! اھر نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔ تو میونہ بھابی ٹوکتے ہوئے بولیں۔
 ”کتنوس آدمی، نکلی بلاؤ۔ پیسے ہیں دسے دوں گی۔“
 ”خواہ رہنا آسیہ! یہ بعد میں نگر جانی ہیں۔“

وہ بجاوے کو شہزادہ سے دیکھتے ہوئے بولے۔ تو اس جھڑپ جھڑپ میں آسیہ بہت حد تک دوسروں سے نکلا۔ آئی۔ ظاہر ہے اگر کوئی سرپیس بات ہوتی تو عدیل بھابی اسے آرام سے بنیں ہو سکتے تھے تمام راستہ وہ میونہ بھابی کے ساتھ اس طرح مذاق کرتے رہے اور میونہ بھابی بھی گو کر برابر سے جواب دے رہی تھیں۔ لیکن سفر کی تھکان کے باعث ان کے لہجے میں شگفتگی نہیں تھی۔
 اپنے گھر آنے کی خوشی ہی الگ ہوتی ہے۔ بچوں نے دروازے سے داخل ہوتے ہی اماں کی اور ابائی کو بیکارنا شروع کر دیا۔ اھر اور سونیا جھاک کر اماں کی کے تخت — پر جھڑپ کرانے سے لیٹ گئے۔ بنیل بھی ان کی تقلید کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی ابائی نے اُسے اپنے بازو میں سے کھینچ لیا۔
 ”اف اماں جی! میں تو پریشان ہو گئی تھی“ جب اُس کی باری آئی تو اماں جی کے گلے لگتی

ہوئی بولی! ”عدیل بھابی نے آپ کی بیماری کا کیوں کہا؟“
 ”میں نے متعہ بھی کیا تھا اُسے۔ خیر تم سناؤ۔ وہاں شکیل کے ہاں سب خیریت ہے ناں۔ بچوں کی چھٹیاں تھیں۔ سب ابھی آجاتے تو لوگوں کے ساتھ۔ اماں جی مومنوع بدل گئیں۔“
 ”ماں! سب بھابی کا دل بھی چاہ لیا تھا۔ لیکن شکیل بھابی کو کھانے وغیرہ کی پرہیز ہو جاتی۔ اس لیے اب آپ اب آپ جانیے گا۔“
 اُس نے کہا تو اماں جی قصداً ان سے عدیل سے کہنے لگیں۔

”عدیل! یہ تو تھکی ہوئی آئی ہیں۔ اس وقت چائے تم بنا لو۔“
 ”نہیں اماں جی! وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”عدیل بھابی کیوں بنائیں گے۔“
 ”بنانے دو۔ بنانے دو۔ میونہ بھابی کو موقع مل گیا۔“ چلو عدیل شاباش کام کیا کر دو۔“

”نہیں بھابی! یہ کام میرا ہے۔“
 وہ کمر کھانے لگی کہ بنیل کو سر پٹھیاں اُترتے دیکھ کر وہیں رک گئی۔ ”بنا نہیں کس وقت وہاں جلاگ تھا۔ حالانکہ اُسے اچھی طرح پتا تھا کہ اس وقت اوپر کون نہیں ہوتا۔ پھر بھی آخری سیدھی ہلکے آکر کھینچے لگا۔“

”بھئی! اوپر کون نہیں ہے۔“
 ”بابا! تو غلام ہیں آتے ہیں پٹیا اور مٹی بھی آجائیں گی۔ آپ جاؤ اماں جی کے پاس بیٹھو، چائے پیو گئے ناں۔“
 وہ اُسے نرمی سے سمجھا کر کہیں میں آگئی۔ اور ابھی چوہا جلا کر کتیل میں پانی رکھ رہی تھی کہ عدیل بھابی اُس کے پیچھے آگئے۔

”میں سناؤں گی بھابی! وہ میری سمجھی اُس کا ہاتھ بٹانے آئے ہیں۔“
 ”نہیں کیا کہہ رہا تھا؟“ انہوں نے اُس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔ تو وہ معروف سے اندک میں بولی۔

”بچہ ہے ناں۔ اتنے دن ماں باپ سے دور رہا۔ انہی کا پوچھ رہا تھا۔“
 ”سوفیہ! عدیل بھابی اُسے معروف سے نکال کر کہنے لگے۔ ”اس بچے کو نہیں کسی طرح بھلا نا۔“
 ”کیا مطلب؟“ وہ ان کے لہجے پر جھٹک گئی۔ اور انہوں نے پہلے اپنے پیچھے دیکھ کر گویا کسی نہ ہونے کا یقین کیا پھر آواز دبا کر نولے۔
 ”بڑے بھیا نے بنیل بھابی کو طلاق دے دی ہے۔“

”کیا؟“ اُسے شدید دھچکا لگا تھا۔ انتہائی دکھ سے بولی۔ ”کیوں عدیل بھابی؟ بڑے بھیا نے لیا کیوں کیا؟“
 ”میرے حساب سے تو بڑے بھیا کو یہ قدم بہت پہلے اٹھانا چاہیے تھا۔ پتا نہیں اتنی دیر کیوں کی؟“
 عدیل بھابی بڑے آرام سے کہہ کر کہیں سے نکل گئے۔ اور اُس کے آسنہ جھلک بڑے۔ حالانکہ بنیل بھابی اس گھر میں اجنبیوں کی طرح رہتی تھیں۔ پھر بھی اُسے دکھ ہو رہا تھا۔

اُس کے خیال میں بنیل کو بھلانا مشکل نہیں تھا۔ کیونکہ پہلے ہی وہ سارا وقت اُس کے اور اماں جی کے پاس رہتا تھا۔ بس رات میں سونے کے لیے ہی اوپر جاتا۔ تب بھی بنیل بھابی کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی تھی۔ اور اب بھی ان کی طرف سے بنیل کو ملنے یا لینے کا کوئی مطالبہ نہیں ہوا تھا۔ جس سے ظاہر تھا کہ وہ اُسے اپنے پاؤں کی زنجیر نہیں بنانا چاہتیں۔ اور حیرت انگیز طور پر بنیل کے دل میں اُس عورت کے لیے اتنا لگاؤ تھا کہ اس کی کسی خوشدت سے قفس کرے ہوئے بیاد پڑ گیا۔ رات رات بھر جاگ کر انتظار کرتا پھر اُس سے پوچھتا۔

”بھئی! تم کیوں نہیں آئیں؟“

”میں کہاں جاتی تھیں؟“

”بابا! کہہ رہے تھے۔ مٹی اب کہیں نہیں آئیں گی۔ ہیں بھو بھو؟“

وہ اُس کے سوالوں سے کبھی پریشان ہو جاتی تھیں جیران۔ اور حیرت اُسے اسی بات پر تھی کہ وہ کیسے اُس عورت سے اتنی محبت رکھتا ہے، جو اُسے صرف تنہ دینے کی سزاوار تھی۔ بہر حال وہ جو سوچ رہی تھی کہ اسے بھلانا مشکل نہیں ہے۔ تو یہ آسان بھی نہیں تھا۔ اُس کا سارا وقت اس کا دھیان ادھر ادھر رکھنے میں گزر جاتا۔ یہ بھی غیبت تھا کہ وہ تعلیم سے فارغ ہو چکی تھی، درنہ اماں جی کسی طرح بنیل کو نہیں بھجال سکتی تھیں۔

بڑے بھیا نے پتا نہیں کونس معروف سے ڈھونڈ لی تھی۔ رات میں اتنی دیر سے آتے تو اُس کے کمرے میں بس دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھتے۔

”بنیل سو گیا؟“

”نہیں زیادہ تنگ تو نہیں کرتا؟“

اور وہ جی ادوری نہیں سے زیادہ کہہ نہیں کہتی تھی۔ لیکن اندر ہی اندر کڑھتی ضرور تھی کہ ماں نے تو چھوڑا ہی باپ بھی اتنا لا بردا ہو گیا ہے۔

”کم از کم بڑے بھیا کو تو احساس ہونا چاہیے۔ اُس وقت وہ میونہ بھابی کے سامنے کھڑ رہی تھی۔ اسی لیے بنیل زیادہ حساس ہو رہا ہے کہ ماں باپ دونوں میں سے کوئی اُسے نظر نہیں آتا۔ ہم اس سے کتنی محبت کریں۔ اس کے ماں باپ تو نہیں ہو سکتے۔“

”ہوں!“ میونہ بھابی گو کر دیکھ اُسے ہی رہی تھیں لیکن جلنے دھیان کہاں تھا۔

”ایمان سے بھابی! مجھے بڑا ترس آتا ہے۔ رات میں کتنی بار چونک کر اٹھتا ہے۔ پھر ہم کمرے سے سینے میں منہ چھپا لیتا ہے۔“

”ہوں!“ میونہ بھابی کا انداز ابھی بھی سوچتا ہوا تھا جس پر اُس نے ڈک کر انہیں دیکھا پھر ان کا ہاتھ لاکر پوچھنے لگی۔

”آپ کیا سوچ رہی ہیں؟“

”میں۔ بنیل کا سوچ رہی ہوں اور ساتھ ساتھ ابھی!“ میونہ بھابی نے بغیر چونکے کہا تو وہ متعجب ہوئی۔ ”میرا؟“

”ہاں تم جو نبیل کو اپنا اتنا عادی بنا رہی ہو تو یہ اچھی بات نہیں ہے، کل کو جب ہتھاری شادی ہو جائے گی تو وہ کیا کرے گا؟“
 میمونہ بھابی اُسے سمجھاتے ہوئے بولیں: ”میں یہ نہیں کہتی کہ اس کا خیال نہیں رکھو البتہ اُسے بالکل اپنا محتاج نہیں بناؤ۔ ورنہ وہ ایک بار پھر لوٹ جائے گا۔ اس سے ہتھاری دُوری برداشت نہیں ہو گی۔ میری بات سمجھ رہی ہوں؟“
 ”ہوں۔“ اُس نے پرسوج انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگی: ”میں کیا کروں۔ وہ سارا وقت میرے ساتھ لگا رہتا ہے۔“
 ”تھوڑا نظر انداز کرو، تب وہ ادھر ادھر کھینے میں لگے گا، اور میں اماں جی سے کہوں گی، اُسے اپنے پاس سلا کر میں۔“

”نہیں بھائی، ابھی نہیں۔“ اس کا اپنا دل بھی تو ایسا ہی نرم تھا۔
 ”بالکل مت بند ہوتا ہے جانے کے بعد ہم سب کو مشکل ہوگی۔ میمونہ بھابی نے ٹوکا پھر اُسے متوجہ کر کے پوچھنے لگیں: ”سنو۔ ابھی تک وہ آیا نہیں۔ کب آئے گا؟“
 ”کوئی وقت تو مقرر نہیں کیا تھا۔ بس یہ پوچھا تھا کہ میں کب جاؤں گی؟ وہ اپنے ناخون کو دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”گراہی آئے ہوئے بھی ہیں بندہ بیس دن ہو گئے ہیں۔ اُسے کم از کم فون تو کرنا چاہیے تھا۔ کچھ حالات کا پتہ چلتا کہ وہ اپنے ماں باپ کو راضی کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوا، میں غلط تو نہیں کہہ رہی ناں؟“
 اُس کے دیکھنے پر میمونہ بھابی نے پوچھا تو ذرا سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔
 ”اچھا سنو، میں اپنے طور پر اماں جی سے ذکر کروں، میرا مطلب ہے یوہی پہلے ہتھاری شادی کی بات پھیلوں گی پھر اس کا نام لوں گی۔“
 میمونہ بھابی نے اچانک کسی خیال کے تحت کہا۔
 وہ کچھ نہیں بولی، بس سر جھکا لیا تو یوں ان کی بات سے اتفاق کر لیا تھا۔
 اور اُس رات نبیل کو کہانی سناتے ہوئے، وہ اپنی ہی کہانی میں گھوبی۔ میمونہ بھابی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ شاہ سکندر کو فون مزدور کرنا چاہیے تھا۔ یہاں نہیں کن کاموں میں الجھ گیا ہے۔ اور جانے؟
 نے اپنے گھر میں میرا ذکر کیا بھی ہے یا نہیں۔ یا شاید: ”نہنہزادہ نہیں آئے گا تو نہنہزادی کی شادی پھیلے۔“
 نبیل اُس کی ادھوری کہانی میں الجھ رہا تھا۔ ”نہنہزادہ نہیں آئے گا تو نہنہزادی کی شادی کس سے ہوگی؟“

”نہنہزادہ کیوں نہیں آئے گا؟“
 وہ اپنے خیال میں بولی پھر چونکی تو ہنس بڑی اور نبیل کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولی تھی: ”نہنہزادہ ضرور آئے گا۔“
 ”اور اگر وہ راستہ بھول گیا؟“
 ”جبت کرنے والے راستہ نہیں بھولتے البتہ ان کے راستے میں رکاوٹیں کٹری کر دی جاتی ہیں۔
 جنہیں دور کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔“
 اُس نے سوچتے ہوئے پلکیں موند لیں۔

شاہ سکندر سیدھا احمد حسن کے پاس آتا تھا۔ کیونکہ اُس کے اکاونٹ میں جو رقم تھی۔ اُسے وہ ادھر رہائش اور دوسرے اخراجات میں خرچ نہیں کر سکتا تھا۔ یعنی بہت احتیاط سے چلنے کی ضرورت تھی۔ اور اُس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جو کس بھی خرچ سے پہلے اُسے سوچنا پڑتا تھا۔ ورنہ وہ

شانے کا عادی تھا۔ اور کبھی حساب بھی نہیں رکھا۔ جیسا کہ اُسے مشکل پیش آرہی تھی۔ مجھ میں نہیں آتا کہ جاکر اتنی رقم میں وہ کوئی چھوٹا موٹا گھر خریدے یا کا دو بار شروع کرے اور کاروبار کا بھی اُسے کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

بالآخر اُسے اپنا مسئلہ احمد حسن کے سامنے رکھنا پڑا۔ گوکہ اُس نے آتے ہی اُسے بتا دیا تھا کہ اپنے والدین کے ناراض ہو کر سب کو چھوڑ آیا ہے اور سب بھی بتایا البتہ اپنی شادی چھپا گیا تھا۔ اُس کی وجہ صرف اس کا احساس برتری تھا۔ جسے وہ قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اُسے یہ ہرگز گوارا نہیں تھا کہ وہ کسی ایک پہلو سے کم اور نظر آئے۔
 ”میں اپنی زندگی خود بناؤں گا۔ آسیہ کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ گوکہ میرے اور بھی بہت دوست ہیں لیکن مجھے سب سے زیادہ تم پر ہوسا ہے۔ اسی لیے میں تمہارے پاس آیا ہوں احمد حسن کہ تم پورے لمبے سے میرا ساتھ دو گے۔“

اُس نے احمد حسن کے کہا تو جواب میں وہ بولا تھا۔
 ”تم نے میرا مان بڑھا دیا ہے شاہ سکندر۔ میں پہل تمہارے ساتھ ہوں۔“
 ”میں نہیں زیادہ تنگ نہیں کروں گا۔“ اُس نے کہا۔
 اور پھر دو تین روز وہ خود ہی سوچتا رہا کہ پہلے اُسے کیا کرنا چاہیے۔ جب سمجھ میں نہیں آیا تب احمد حسن کو بلایا۔ اور اپنی چپک ٹیک اُس کے سامنے رکھتا ہوا بولا۔
 ”میرے پاس کل اتنی رقم ہے۔ جبکہ فوری حل طلب مسئلے دو ہیں گھر اور کاروبار۔ بتاؤ اتنی رقم میں یہ دونوں مسئلے حل ہو سکتے ہیں؟“
 احمد حسن کی چپک بک کا جائزہ لے کر موضوع میں پڑ گیا اور غالباً فوری طور پر اُس کی کچھ میں بھی ہنسی آجائی کہنے لگا۔

”اتنی جلدی کیا ہے بار! اطمینان سے سوچیں گے۔“
 ”نہیں احمد میرے پاس اطمینان سے سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ ادھر آسیہ انتظار میں ہوگی اور میں اُس کے پاس اسی وقت جاؤں گا جب میری اپنی کوئی حیثیت ہوگی۔“
 اُس نے اتنی سنجیدگی سے کہا کہ احمد حسن کو پھر سے سوچنا پڑا اور کتنی دیر بعد اُسے دیکھ کر مسکرائی تو وہ فوراً بوجھنے لگا۔
 ”کچھ سمجھ میں آیا؟“

”ہاں ایک صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ فی الحال گھر خریدنے کے بجائے کوٹ پارٹمنٹ کرائے پر لے لو، اُس میں کچھ زیادہ خرچ نہیں ہوگا باقی رقم سے کوئی بزنس شروع کر دو۔“
 احمد حسن دونوں مسئلوں کا۔ فوری حل بنا کر بوجھنے لگا۔
 ”کوئی بزنس سے تمہارے ذہن میں یا وہ بھی مجھے سوچنا پڑے گا۔“
 ”حل کر سچیں گے۔“ وہ ہنسا۔ اُس کی ہنسی اس بات کی غمان زدگی کو اُسے احمد حسن کا مستورہ پسند آیا تھا۔

پھر اگلے کئی دن اُسے گھر دیکھنے میں لگ گئے۔ اب تک اُس کا جو معیار زندگی رہا تھا ناں ہر چیز وہ اکیس سے اُس سے بہت نیچے نہیں آسکتا تھا۔ اور اُس معیار کو برقرار رکھنا بھی مشکل تھا۔ اس لیے اُس نے ایک اچھے صاف ستھرے علاقے میں تین کمروں کا پارٹمنٹ کرائے پر لے لیا۔ پھر اُسے کیوریٹ کرنے میں گوکہ اپنے حساب سے اُس نے بہت بخل سے کام لیا تھا۔ پھر بھی بہت خوبصورت سے بنایا۔

اُس کے بعد یوں اطمینان سے ہو گیا جسے سارے مسئلے حل ہو گئے ہوں۔ یا شاید اُس کے نزدیک محل مسئلہ ہی تھا۔ اور روزگار کی کیونکہ پہلے کبھی اُسے فکر نہیں کرنی پڑی تھی اُس لیے لا شعوری طور پر وہ

کچھ ملٹن سا تھا۔ جیسے یہ مسئلہ اپنے آپ حل ہو جائے گا۔ یا ہو سکتا ہے اتنی بڑی جائیداد میں اُسے نہ
 حقے کا خیال ہو۔ بہر حال گھر کی سنگت کرتے ہی وہ آسیر سے ملنے کو بے چین ہو گیا۔ لیکن وہ اس طرح نہیں جا
 جاتا تھا۔ بلکہ جیسا کہ اُس کے کہہ آیا تھا کہ اپنے گھر والوں کو لے کر آئے گا اور اب گھر والے
 تنہے تو اُس نے احمد حسن اُس کی والدہ اور بہن نالہ کو اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ نالہ کو
 میں اتنے تھی اس لیے بڑے شوق سے تیار ہو گئی اور تیار تو اُس کی امی بھی ہو گئی تھیں لیکن انہیں
 دھڑکا لگا ہوا تھا۔

”بھئی! متاڑے ماں باپ ہم سے ناراض نہیں ہوں گے کہ ان کی اجازت کے بغیر ہم نے تمہا
 شادی کرادی“

”آپ سے کیوں ناراض ہوں گے آنٹی! آپ اپنی مرضی سے تو نہیں جاری ہیں۔ میں آپ کو لے
 جا رہا ہوں۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ میرے والدین کو خبر ہی نہیں انہیں سب پتا ہے۔ بس یہ ہے
 وہ یہاں میری شادی کے حق میں نہیں ہیں۔ اسی لیے تو میں گھر چھوڑ آیا ہوں۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے
 کہ میرے گھر والے زیادہ عرصہ میری دودری نہیں سہہ سکیں گے، میرے پاس آنے کے لیے انہیں ہر
 چاہیے ہوگا۔ اور وہ سناٹا ظاہر ہے اُن کی بہو ہو گی“

”اُس نے بڑے اعتماد سے انہیں یقین اور اطمینان دلایا۔ حالانکہ اُسے ایک فی صد بھی یقین نہ
 تھا۔

”ہاں، ماں باپ کو اولاد کی خوشی کے سامنے جھکنا ہی پڑتا ہے“ آنٹی نے کہا تو وہ اندر ہر
 اطمینان سے ہو کر بولا۔

”جی۔ اور ان لوگوں سے بھی آپ نے خبر ہی کہنا ہے۔“

”فکر نہیں کروں سکندر بھائی! ان کے سامنے میں آپ کی وہ تقریریں کروں گی وہ تقریریں
 کے جوش کے سامنے اس نے بند باندھ دیا۔

”بس۔ تم براہ میرانی خاموش ہی رہنا“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ تم خاموش اچھی لگتی ہو۔ اُس نے مذاق میں ٹالا پھر احمد حسن کو چلنے کا اشارہ کیا تو
 گاڑی کی چابی اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

”شام آتے رہی تھی جب اُس نے آسیر کے گھر میں قدم رکھا۔ حسب سابق آبا جی بڑی خدمت
 سے اُس سے ملے پھر اُس کے ساتھ اور لوگوں کو دیکھ کر کچھ ٹھٹھکے تو وہ فوراً تعارف فرماتا ہوا بولا۔

”یہ میرے عزیز ہیں احمد حسن یہ ان کی والدہ اور سہیلی۔“

”اچھا۔ اچھا۔ بہت خوش ہوں، بھئی۔ بیٹھیں آپ لوگ۔“

”آبا جی پر قدرے بوکھلاہٹ سوار ہو گئی تھی، انہیں بھلا کر فوراً کمرے سے نکل گئے۔ کچھ دیر بعد
 آئے تو عدیل کے ساتھ تھے اور پیچھے اتان نہیں۔ ایک بار پھر تعارف ہوا اور جب اتان جی یہیں تو
 لگیں۔

”آپ شاہ پور سے آئی ہیں؟“ یہاں سوال ہی غیر متوقع تھا۔ آنٹی نے بے اختیار شاہ سکندر کو
 لیکن اس سے پہلے نالہ بول پڑی۔

”نہیں! ہم لوگ یہیں رہتے ہیں اور اب تو سکندر بھائی بھی یہیں آگئے ہیں“

شاہ سکندر نے واقعی حیران ہو کر اس لڑکی کو دیکھا جس نے پہلے مرحلے پر ہی اصل موضوع
 پیش رفت کر دی تھی۔ پھر بات کو مزاح کا رنگ دے کر بولا۔

”جی ہاں۔ ایک بھائی پر رعب جگا کر اس لڑکی کا دل نہیں بھرتا تھا اس لیے مجھے بھی یہیں

مہرالنساء حیران تھی کہ شاہ سکندر کس بات پر ناراض ہو کر گیا ہے۔ کون اُسے ستانا بھی نہیں؟ بس اُسی روز جب وہ تین دن کے رہ کر آئی تھی تو بابا جان نے اُسے اپنے کمرے میں بلوا کر کہا تھا۔ ”اب یہی بتاؤ گھر ہے۔ یہاں کی ہر شے پر جتنا راج حق ہے تو عزت و ناموس کی پاسداری؟“ فرمن ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کرو گی۔ اور اب جو میں تم سے کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو، شاہ سکندر مجھ سے ناراض ہو کر یہاں سے چلا گیا ہے۔ اس کی ناراضگی مجھ سے ہے تم سے نہیں۔ اس لیے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جہاں بھی گیا ہے۔ تمہیں اپنے اس بلاتے گا۔ اس کے لیے بہتیں صبر سے انتظار کرو۔ کیونکہ جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوگا۔ تب ہی بتاؤں گے کہ اسے کس طرح سے سوجھ بوجھ سے غصہ اترنے پر وہ خود ہی یہاں آجائے۔ بہر حال تم کسی سے ذکر نہیں کرنا۔ تمہارے ماں باپ تک یہ معلوم نہیں کرنا چاہیے کہ شاہ سکندر یہاں سے چلا گیا ہے۔ وہ یہیں موجود ہے مجھ پر ہی ہونا اور وہ نہ جانتی تھی کہ اب بھی اُسے سمجھنا تھا کہ وہ کہیں باہر سے نہیں آئی تھی۔ اسی خاندان کی لڑکی تھی ایسی ہی جو لی کی پروردہ جہاں پیدا ہوئے ہی لڑکیوں کے ہنر و فن پر عمل لگا دیے جاتے ہیں۔ حقوق و فرائض سمجھانے والے بابا جان یہ بھول گئے کہ اُس کے سینے میں ایک دل بھی ہے جس پر بدقسمتی کے بہت پہلے محبت کی لے پر دھڑکنے لگا تھا۔

کاش بابا جان شاہ سکندر کی ناراضگی کا سبب بھی جانتے۔ وہ اپنے طور پر قیاس کرتے کرتے تو گئی تھی۔ پھر انتظار کے دن بھی گزر گئے تھے جس سے اُس کی سوچیں سیار رخ اختیار لگیں۔ یعنی اُس نے جو بابا جان کی بات پر یقین کر لیا تھا کہ شاہ سکندر کی ناراضگی اُس سے نہیں۔ اور یہ کہ وہ اُسے اپنے پاس بلانے گا۔ تو اب اُسے لگ رہا تھا جیسے بابا جان نے اُس سے کئی کئی یا محض اُسے پہلایا تھا۔ ورنہ اگر وہی سچ ہوتا تو شاہ سکندر کم از کم اُسے ضرور بتا کر جاتا۔ ایک رات کو دہن کو چھوڑ کر جانے والا اُس کے ذہن میں اچانک بھٹکا ہوا تھا۔

”ہرجائی۔!“



”ہاں ہرجائی ہی ہو سکتا ہے۔“ مہرالنساء اس خیال پر گرفت مضبوط کر کے اپنی شب عروس کے ان سوچنے لگی جب شاہ سکندر اس کے پاس آیا تھا۔ ”وہ اسے یاد آیا اس کے اندر پانے کا احساس نہیں کھو رہا تھا۔ پشیمانی اور وحشت تھی۔“

”یہ اچھا نہیں ہوا مہرالنساء! تم نے مجھے روکا کیوں نہیں؟“

”کیا مجھ کو تم اس طرح میرا دل جیت لو گی۔“

شاہ سکندر کے کعبے کی کئی اسے اب محسوس ہوئی تھی تو سارے ارادوں پر سے پردے سرکنے لگے۔ اگر وہ اپنی روایت سے بغاوت کا حوصلہ رکھتی تو اسی وقت چیخ کر حویلی سربراہ خانیہ تکین اس کے برعکس سے سوچ رہی تھی۔

”تم نے میرے جذبول کو پال کر کے اچھا نہیں کیا شاہ سکندر حیات! اس کے باوجود میں تمہارا انتظار کہ یہ میری مجبوری نہیں ضد ہے۔“

اور جب ایک کمزور عورت کسی بات کو اپنی ضد بنالے تو پھر وہ اتنی کمزور نہیں رہتی۔ فوراً ”تو نہیں دیکھ دھیرے مہرالنساء کو احساس ہو گیا کہ وہ اتنی کمزور نہیں ہے بلکہ اگر چاہے تو اس حویلی کے دروازہ پر ہلے بدلے میں شہر مانو کی خوشیاں چھین کر اور اس سچ پر اس نے بس کچھ دیر کو سوچ کر سر جھٹک دیا۔ اس کے اس طرح وہ شاہ سکندر سے اپنی توہین کا دل نہ نہیں لے سکتی تھی۔ وہ تو اسے وہ زخم لگائے گی جو اس کے

سے سونیا بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کے پیچھے احمر بھی تھا۔

”پھوپھو! احمر کو دیکھیں، میرے بال نوچ رہا ہے۔“ سونیا نے اس کی ناگوں سے لپٹ کر احمر سے بچنے کی لیکن احمر کا ہاتھ اس کے بالوں تک پہنچ چکا تھا۔

”پھوپھو!“ سونیا زور سے چیخی تو وہ جو اس اچانک افتاد سے پریشان ہو گئی تھی۔ احمر کی بدتمیزی پر اسے کر پیچھے ہٹا یا پھر دونوں کو ڈانٹنے لگی۔

”ہر وقت لڑتے رہتے ہو۔ کوئی اور کام نہیں ہے تمہیں؟“

”اس نے میری لٹو کیوں پھاڑی ہے۔“ احمر کا لمبی بھی بس نہیں چل رہا تھا اسے کھینچ کر مارے۔

”یہ بے ایمانی کر رہا تھا۔ میری گوشت۔“

”بس خاموش۔“ وہ سختی سے ٹوکتے ہوئے بولی۔ ”چلو جاؤ۔ اپنے اپنے بیک ٹھیک کو“ صبح سے اُ

”میں نہیں جاؤں گا۔“ احمر کے روٹھے لہجے پر وہ قدرے نرم پڑ گئی۔

”کیوں۔ تم کیوں نہیں جاؤ گے۔“

”اس نے میری لٹو کیوں پھاڑی۔“

”لٹو اور آجائے گی۔ اتنی سی بات پر لڑتے نہیں ہیں۔ چلو جاؤ شاباش۔ اسی وقت اپنے ایک وغیرہ ٹھیک اس نے احمر کو پکارتے ہوئے کہا پھر آدے میں آئی تو نیبل اس سے کہنے لگا۔

”پھوپھو! میں نے اپنا بیک ٹھیک کر لیا ہے۔ لیکن میرا یونیفارم نہیں مل رہا۔ پتا نہیں می نے کہاں رکھ دیا۔“

”وہیں الماری میں ہو گا۔ اچھا میں خود نکال دوں گی۔“

”پھوپھو! نیبل بھائی کی مٹی کہاں چلی گئیں؟“ ایسے موقعوں پر سونیا یہ سوال ضرور کرتی تھی۔

”پتا نہیں۔“ وہ قصداً سوالیہ لہجے سے کہہ کر عمر کی طرف متوجہ ہو گئی اور اس کی زبان میں اس سے بولے۔

”دعربھی اشکول جائے گا لیکن ابھی تو یہ بہت ٹوٹا (چھوٹا) ہے۔“

معصوم بچہ ہمار کی زبان پر کھل کھلا لگا تو نیبل احمر اور سونیا کے چہروں پر بھی مسکراہٹیں دوڑ گئیں۔

”شو سے اسے دیکھئے۔“

پھر سب سے پہلے بولے بھیا۔ اماں جی کے کمرے سے نکل کر آئے اور ان سب پر ایک سرسری

سیدھے اوپر چلے گئے۔ ان کے بعد خلیل بھائی آئے تو اسے سب بچوں میں گھرے دیکھ کر کہنے لگے۔

”میونہ تو فائیر ہو چکی ہیں۔ کوئی کام نہیں کرتیں، بچوں کو بھی تمہارے سر پر چھوڑ دیتی ہیں۔“

”یہ کیس کی تعریف ہو رہی ہے۔“ میونہ بھابھی پیچھے سے سنتی ہوئی آگئیں۔

”آپ کی۔“ وہ بے ساختہ مسکرا کر بولی تو میونہ بھابھی نے ناک سیکڑ کر شوہر کو دیکھا پھر اس سے کہ

”یہ میری ایسی ہی تعریف کر سکتے ہیں۔“

”کیسی یا کیسی۔ تعریف ہی کی ہے ناں۔“ خلیل بھائی مسکراہٹ ہو نونوں میں چھپا کر بولے۔

”ارے آپ کیا تعریف کریں گے میری۔ میں تو۔“ شاہانہ انداز میں کہتے ہوئے میونہ بھابھی کو

پیچھے سے عدیل بھائی ان کی بات پوری کرتے ہوئے بولے۔

”سر! تعریف ہیں، چلیے اس بات پر کھانا گادیں اگر تیار ہے تو۔“

”جی بھائی! کھانا تیار ہے۔ میں لگاتی ہوں۔“ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ اور کچن کی طرف جاتے جاتے

خلیل بھائی کہہ رہے تھے۔

”جب آسیہ چلی جائے گی تب کیا کرو گی۔“

پتا نہیں میونہ بھابھی نے کیا جواب دیا۔ وہ سن نہیں سکی۔ کوشش بھی نہیں کی۔ اور کچن میں آکر

گئی۔

پھر کھانے کے بعد نیبل نے اسے اپنا یونیفارم یاد دلایا تو وہ اسی وقت اور چلی آئی۔ بڑے بھیا کھلی ہمت پر اکیلے تھے۔ انہیں دیکھ کر اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ جانے انہوں نے خود کو اتنا تنہا کیوں کر لیا تھا۔ اس نے سوچا وہیں واپس پلٹ جائے لیکن جس کام سے آئی تھی وہ بھی ضروری تھا۔ کچھ شش و پنج میں کھڑی تھی کہ بڑے نے اسے دیکھ لیا اور پکار کر بولے۔

”آسیہ! یہ بات ہے یا نہیں؟“

”ہاں۔“ وہ قدم بڑھا کر روشنی میں آکر بولی۔ ”میں نیبل کا یونیفارم لینے آئی تھی۔ صبح اسے اسکول جانا ہے۔“

”مکمل کھل گئے؟“ انہوں نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

”جی کل سے کھل رہے ہیں۔“ اس نے بتایا اور ان کے خاموش رہنے پر پوچھا۔

”میں اس کا یونیفارم لے لوں۔؟“

”ہاں ہاں۔“ وہ اپنے خیال سے نکل کر بولے۔ ”دیکھو وارڈروب ہی میں ہو گا۔ اور اس کے شووز وغیرہ۔“

”جی میں لے لیتی ہوں۔“ وہ کھتی ہوئی اندر چلی گئی اور کچھ دیر بعد نیبل کی ساری چیزیں لے کر نکلی تو بڑے بھیا موجود نہیں تھے۔ پتا نہیں کہاں چلے گئے تھے۔ وہ یونہی دیوار کے پاس رک کر باہر دیکھنے لگی تبھی عقب سے

”آواز سنائی دی۔“

”نیل گئے کپڑے۔“

”جی!۔“ وہ نہ صرف چونکی بلکہ اس کا دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگا۔ عجیب سا خوف محسوس ہوا جیسے

بھیا انسان نہیں جن ہوں اور غائب ہوئے اور پھر حاضر۔ وہ ان کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے ہونہی

رکھنے کے ساتھ نیچے آئی تو میونہ بھابھی چائے لیے اس کے کمرے میں موجود تھیں۔ دیکھتے ہی پوچھنے لگیں۔

”کہاں چلی گئی تھیں۔؟“

وہ فوراً ”جواب نہیں دے سکی۔ نیبل کا بیک ریک پر رکھا پھر الماری کھول کر کپڑے بیگلر میں لٹکائے۔ اس کے

ران کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”میں اوپر گئی تھی۔ نیبل کی چیزیں لینے۔“ پھر ایک دم ان کے ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔ ”مجھے بڑے بھیا سے بہت

لگا۔ اتنے پر سرار لگ رہے تھے۔“

”اس کا مطلب ہے جلدی ان کی شادی کرانی پڑے گی۔“ میونہ بھابھی ہنستے ہوئے بولیں تو وہ ان کے ہاتھ

دور کر پیچھے ہٹ گئی۔

”آپ کو تو ہر وقت مذاق سوچتا ہے۔“

”کیا تو مشکل ہے کہ تم لوگوں کو میری ہر بات مذاق لگتی ہے۔ حالانکہ میں بہت کم مذاق کرتی ہوں۔“ میونہ

بھابھی ایک دم سنجیدہ ہو کر بولیں اور اس بار اسے ہنسی آگئی۔

”واقعی۔؟“

”جسب! اُڑا بناؤ بڑے بھیا کی شادی میں مذاق کی کیا بات ہے، ساری زندگی انہیں ایسے تو نہیں رہنا۔ ماں شاہد

ان جہان ہیں۔ دوسری بیوی آئے گی تو پہلی کا زخم بھرے گا۔ اور وہ بوں پر سرار نظر نہیں آئیں گے۔“

میونہ بھابھی باقاعدہ اسے لپکھ دینے بیٹھ گئیں اور کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں۔ جنہی وہ حیرت سے انہیں

دیکھتی۔

”ضرور ہے کہ میری بات میں مزاح کا رنگ شامل ہوتا ہے لیکن وہ مذاق نہیں ہوتا۔ سمجھیں تم یا مزید

نہیں۔“ آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ ”وہ فوراً بول پڑی۔

”جھٹک سے۔“ میں جاری ہوں۔ صبح جلدی اٹھنا ہے۔“ میونہ بھابھی اٹھتے ہوئے بولیں تو اس نے پہلے بے

ماہیں سر ہلا کر گویا انہیں جانے کی اجازت دی لیکن پھر اچانک خیال آنے پر ان کا ہاتھ پکڑ کر روک کر بولی۔

”اصل بات تو بتائیں کیا فیصلہ ہوا۔“

”اتنی جلدی فیصلے نہیں ہوتے ابھی تو سب اپنی اپنی رائے دے رہے تھے بس وہی بار والدین کو اتنا چاہیے یا اگر وہ بعد میں بھی نہیں مانے تو وغیرہ وغیرہ۔“ میمونہ بھائی نے کہا بولی۔

”یہ خدشہ تو مجھے بھی ہے۔“

”سب کو بے سوائے عدیل کے نہ صرف شاہ سکندر کی پر زور حمایت بلکہ مسلسل سہ کوشش کرنا پڑے گی۔“

”عدیل بھائی! کیا کہہ رہے تھے؟“ اس نے چونک کر پوچھا تو میمونہ بھائی مسکرا کر بولیں ”وہی سب جو میں کہنا چاہتی تھی۔ یعنی اول تو شاہ سکندر کے والدین کی ناراضگی زیادہ دوسری صورت میں کوئی خاص فرق تو نہیں پڑے گا کیونکہ شاہ سکندر یہاں سیٹ ہو رہا ہے لکھی ہے۔ دونوں اپنی زندگی گزار سکتے ہیں۔“

میمونہ بھائی نے رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر کہنے لگیں۔

”اس کے علاوہ جو ایک بات عدیل نے کہی اور جسے سن کر سب خاموش ہو گئے۔ وہ اس ط میں نہیں کہہ سکتی تھی۔“

”کون سی بات۔؟“ اس کی آنکھوں میں تحیر سمٹ آیا۔ اور میمونہ بھائی جیسے خود بھی حیران اسی حیرت سے بولیں۔

”کہہ رہا تھا۔ ان ساری باتوں سے زیادہ ہمیں آسیہ کی پسند اور خوشی کا خیال کرنا چاہیے۔ ا۔ چلا کہ تمہاری پسند اور خوشی شاہ سکندر حیات ہے۔“

”میرے خدا! اس کا دل رکنے لگا۔ اس نے تو صرف میمونہ بھائی اور سہما بھائی کو شرع عدیل بھائی نے کیسے جان لیا اور سب کے سامنے کہہ بھی دیا۔ وہ کیسے سامنا کرے گی ماں جی اور

وہ احمد حسن کا انتظار کرتے کرتے اب بالکونی میں آکر باقاعدہ اس کی راہ دیکھنے لگا تھا۔ دوپہر یہی بی بی کہا تھا کہ آفس کے بعد وہ سیدھا اس کے پاس آئے گا اور اب چھن کر رہے تھے۔ اسے تشویش احمد حسن نہ ٹولا پروا اور غیر ذمہ دار تھا اور نہ بھولنے والا۔ اگر کسی کام میں الجھ گیا ہو تا تب بھی اسے بتاتا۔ اس نے سوچا اسے خود ہی اس کے گھر فون کر کے معلوم کرنا چاہیے شاید وہ بھولنے کی غلطی

اس سوچ کے ساتھ ہی وہ اندر آیا تو پہلے تمام کمروں کی لائٹیں ان میں پھر احمد حسن کے کمرے کا لائٹ بجھ گئی۔ اس نے فوراً فون رکھ دیا اور اگر دروازہ کھولا تو سامنے عدیل کو دیکھ کر وہ پتا ہوا یا خوش۔ کچھ لمبی جلیبی کیفیت انھیں جو غالباً ”ظاہر بھی ہو رہی تھیں جب ہی عدیل پوچھنے لگے

”کیا میری آمد غیر متوقع ہے۔؟“

”نہیں آئیے پلیز سب۔“ اس نے فوراً ”سنجھل کر خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں راست انہوں نے ایک طائرانہ نظر سے سارے گھر کا جائزہ لیا پھر قصداً بے نیاز سے ہو کر کہنے لگے۔

”ادھر سے گزر رہا تھا۔ سوچا آپ سے ملتا چلوں۔“ سب تو نہیں کیا آپ کو؟“

”بالکل نہیں۔ آپ اطمینان سے بیٹھیں کیا پتہ لگے چائے یا۔“ شاہ سکندر کو حقیقتاً ”عذب“ ایک گونہ اطمینان دے گئی تھی۔

”چائے کون بنائے گا۔؟“ عدیل نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ فوراً بولا۔

”میں خود۔“

”پتلیں پھر کسی وقت خاص طور سے آپ کے ہاتھ کی چائے پینے آجاؤں گا۔“ عدیل نے ایک

منع کر دیا تو وہ پوچھنے لگا۔

”اس وقت کیوں نہیں۔؟“

”اصل میں میں ابھی چائے پی کر آ رہا ہوں۔ البتہ سگریٹ۔“

عدیل نے کہتے ہوئے اپنی جیب سے سگریٹ نکالنی چاہی، لیکن اس سے پہلے ہی اس نے پیکٹ ان کی طرف

عائد کیا۔

”تھینک یو۔“ عدیل ایک سگریٹ نکال کر سلگانے لگے تب ہی ٹیل کی آواز پر وہ ابھکسی کیڑی کہہ کر دروازہ

بولنے چلا گیا۔ واپس آیا تو احمد حسن ساتھ تھا۔ وہیں سے اپنے دیر سے آنے کا سبب بتاتا ہوا آ رہا تھا جب عدیل پر

برزی تو ایک دم خاموش ہو گیا۔ پھر بڑھ کر ان سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔

”بڑی خوش ہوئی آپ سے دوبارہ مل کر۔ اور اب تو اکثر ملاقات رہے گی۔“

”انشاء اللہ۔“ عدیل اپنی بے ساختگی پر خود ہی جزم ہو کر رہ گئے جبکہ احمد حسن نے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ جلدی

ہو بولا۔

”تم عدیل صاحب کے پاس بیٹھو۔ میں چائے لاتا ہوں۔“

”خدا کے لیے میرے لیے مت لانا۔“ احمد حسن اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”تمہاری میں زہر گھول کر دے

میں شوق سے پی لوں گا لیکن تمہاری چائے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا۔“ اس نے بری طرح احمد حسن کو گھور کر عدیل کی موجودگی کا احساس دلایا۔ تو وہ اپنی

ت سنبھالتا ہوا بولا۔

”میرا مطلب ہے تمہاری چائے اتنی عمدہ ہوتی ہے کہ ایک کپ سے دل نہیں بھرتا۔ اور تین چار کپ پینے

لے لیے میرے پاس بائیم نہیں ہے۔“

عدیل ہنسنے اپنی ہنسی روک پائی۔

”چلو پھر کبھی وقت فرصت سے آنا۔ تب تمہیں۔“

”ہاں ہاں پھر کبھی وقت۔“ احمد حسن جلدی سے بول پڑا پھر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”اس

نات تو اپنے کام کی بات سن لو۔ میں تمہارے لیے شوروم دیکھ آیا ہوں۔ تم کل گیارہ بجے میرے آفس آ جانا تو

بڈیلرے تمہاری ملاقات کرادوں گا۔ باقی معاملات اس کے ساتھ تم خود طے کر لیتا۔“

”اچھی بات ہے۔ ویسے شوروم میں کتنی گاڑیاں تھیں۔؟“

اس نے ہائی بھرتے ہوئے پوچھا تو احمد حسن ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے میں چار یا ہو سکتا ہے۔“

”خیر کل دیکھ لیں گے۔“ اس نے عدیل کا خیال کر کے اس موضوع کو ہمیں روک دیا۔ تو احمد حسن بھی سمجھ کر

”کھڑا ہوا۔“

”مجھے اجازت دو۔ کل ملاقات ہوگی۔“ پھر عدیل کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ”اے عدیل بھائی! آپ سے تو

ناؤ اللہ ملاقات رہے گی۔“

”جس۔!“ اس بار عدیل بس اس قدر کہہ سکے۔

پھر جب وہ احمد حسن کو رخصت کر کے دوبارہ آکر بیٹھا تو عدیل اس سے کہنے لگے۔

”آپسے اتنے بڑا اس کا انتخاب کیا ہے۔ ابتدائیں تھوڑی مشکل تو ہوگی، لیکن جلدی سیٹ ہو جائیں گے۔“

”میں بھی جلدی سیٹ ہونا چاہتا ہوں۔“ اس نے بے اختیار کہا تو جواباً ”عدیل کا جملہ بھی بے ساختہ تھا۔

”ناؤ چائے بنانے سے جان چھوٹے۔“

وہ تدریس نجل سا ہو کر بس پڑا۔ تو عدیل نے بغور اسے دیکھا پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر اصل موضوع چھیڑتے

سے کہنے لگے۔

”آپ جانتے ہیں شاہ سکندر! ہماری ایک بی بی، بہن ہے، اچھی تربیت کے ساتھ ہم نے اسے بہترین اور آئندہ بھی اس کے لیے بہتری کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس کے لیے آپ ہمیں کیا ضمانت دیں گے؟“

شاہ سکندر کو غالباً ”امید نہیں تھی کہ اس سے براہ راست بھی بات ہو سکتی ہے۔ جب ہی اندر سے پریشان ہو گیا لیکن بظاہر سکون سے ان کی بات سنی پھر پوچھنے لگا۔

”آپ کیسی ضمانت چاہتے ہیں۔ انی میں شخصی ہائی یا۔۔۔“ عدیل کو نفی میں سر ہلاتے دیکھ کر اسے ادھوری چھوڑ دی اور ان کے بولنے کا انتظار کرنے لگا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد عدیل کہنے لگے۔

”مجھے صرف اپنی بہن کی خوشیوں کی ضمانت چاہیے۔ اور خوشیاں ان ضمانتوں کی مرہون منت نہیں جن کا ذکر آپ نے کیا ہے۔ زندگی میں نشیب و فراز تو آتے ہیں۔ ساری عمر بندہ صرف چھاؤں میں نہیں صرف دھوپ میں۔ دھوپ چھاؤں کے ششم سے ہی زندگی کا حسن نکھر رہا ہے۔

جہاں تک شخصی ضمانت کی بات ہے تو اپنی ضمانت آپ خود ہیں۔ دوسرے یہاں کوئی کاروبار نہیں ہو،

آپ سے مالی ضمانت طلب کروں۔ شادی ایک مقدس بندھن ہے اور مجھے اس بندھن کی مضبوطی واپار یقین چاہیے۔ کیونکہ میرے نزدیک آپ کا گھر بار، دھن دولت چھوڑ آنا کوئی معنی نہیں رکھتا اکثر انسان میں ایسے فیصلے کر گزرتا ہے لیکن بعد میں پچھتاوے صرف عورت کے حصے میں آتے ہیں۔“

عدیل ذرا دیر کو خاموش ہوئے تھے کہ وہ بول پڑا۔

”میرا فیصلہ جذباتی نہیں ہے۔ نہ ہی میں اپنے گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ آیا ہوں لیکن یہ طے ہے کہ اسی وقت جاؤں گا جب میری بیوی کو اس گھر میں وہی مقام دینے کا اعلان ہو گا جو اس گھر کی دوسری بیویوں کا ”رہی بندھن کی مضبوطی و پائیداری کی بات تو اس کے لیے میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں۔ لکھ کر دو زبان پر بھروسہ کر لیں گے آپ۔“

آخر میں وہ بڑی بے تاب نظروں سے انہیں دیکھنے لگا جیسے فوراً ”جواب سننا چاہتا ہو۔ اور اس بل عدرا کے جذبوں کی سچائیوں کا نہ صرف اندازہ ہوا بلکہ ایمان بھی لانا پڑا تو قدرے توقف سے مسکرا کر بولے تھے

”مجھے یقین مل گیا ہے۔“

~~*

وہ کتنی دیر سے نالکہ کی خوشامد کر رہا تھا کہ فون پر آئیہ کو بلاوے۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے لیکن نا کے نہیں دے رہی تھی۔ مقصد محض اسے تنگ کرنا تھا۔ اور احمد حسن نے پہلے تو نالکہ کا ساتھ دیا پھر ا کھاتے ہوئے بولا۔

”بے چارے کو اس کی آواز سنوا دو نالکہ! اور نہ رات بھر جاگتا رہے گا۔“

”اچھا ہے جاگتے رہیں۔“ نالکہ نے لا پرواہی سے کہا تو وہ احمد حسن کو دیکھ کر بولا۔

”یہ نہیں ہائے گی۔“

”تو رات نام خود بڑی کر لوں گا۔ کیا پتا قسمت باوری کر جائے اور ادھر سے وہی رہیو کریں۔“

احمد حسن نے کچھ جھنجھلا کر مشورہ دیا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”اوکے میں چلتا ہوں۔“

”کیا مطلب ہے؟“ احمد حسن سمجھا۔ وہ ناراض ہو گیا ہے۔ ”کیا میں نے کوئی غلط بات کی ہے۔“

”نہیں بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ میں خواہ خواہ اتنی دیر سے اس لڑکی کی خوشامد کر رہا ہوں۔“ اس نے کر کہا۔

”تو جا کہاں رہے ہو۔؟“

”تمہارے مشورے پر عمل کرنے یعنی گھر بیٹھ کر اطمینان سے بڑائی کروں گا۔“

”وہ ملیں گی نہیں۔“ اس کی مسکراہٹ پر نالکہ نے جل کر کہا تو وہ اسے مزید چڑا کر بولا۔

پہلی بار میں نہیں ملیں گی اور مجھے افسوس ہے تم نے چانچیز کا بڑا اچھا موقع گنوا دیا۔

”میں رشوت کو حرام سمجھتی ہوں۔“ نالکہ کہتی ہوئی جلدی سے کمرے سے نکل گئی تو اسکے ساتھ احمد حسن کا بھی بے ساختہ تھا۔

پھر اپنے بار نمٹ میں آتے ہی وہ آئیہ کے نمبر ڈائل کرنے لگا اور یہ سلسلہ رات تک چلتا رہا کیونکہ دوسری فون کبھی میمونہ بجا بھی فون اٹھاتی تھیں کبھی عدیل اور ایک بار اباجی کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ جس کی آواز سننا نا تھا۔ وہ پتا نہیں کہاں تھی۔ اسے سچ جاس پر غصہ آنے لگا کہ وہ اتنی بے خبر کیوں ہے۔ فون کی تیل پر اسے یہ ن کیوں نہیں ہو تاکہ کوئی اسے پکار رہا ہے۔ اور اسی کیفیت میں وہ ایک بار پھر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ جب دوسری فون اس کی آواز سنائی دی تو وہ بے اختیار چیخ پڑا۔

”کہاں ہو تم میں اتنی دیر سے تمہیں۔“ غالباً ”سوچ کے مطابق کہنے جا رہا تھا پکار رہا ہوں۔“ کہ احساس ہونے خاموش ہو گیا۔

”میں جاتی ہوں۔ آپ بہت دیر سے فون کر رہے ہیں اور میں ریسو اس لیے نہیں کر سکی کہ اباجی اور اماں جی مدے میں بیٹھے تھے۔“ اس نے تجوری بتائی تو وہ پوچھنے لگا۔

”کیوں ان کی طرف سے کوئی پابندی ہے۔؟“

”اس کا جواب دینے سے پہلے میں یہ پوچھوں گی کہ جب اباجی نے فون اٹھایا تھا تو آپ نے ان سے یہ کیوں

ن کہہ دیا کہ آپ مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ فوراً ”فون بند کیوں کر دیا۔“

ا دوسرے براہ راست جواب نہ دے کر بھی جواب آیا تو وہ ہچکچاہٹ سے اس کی ذہانت کا قائل تھا۔ مسکرا کر بولا۔

”میں تم سے نہیں جیت سکتا۔“

”کیسی کوئی خواہش ہو تو بتائیں۔“ آئیہ کی آواز میں ہلکی سی شوشی تھی۔

”اوں ہوں۔ میں تم سے ہر گز خوش رہتا ہوں۔“

”بس کریں شاہ سکندر! میں میں خود کو بہت بلند بول رہی محسوس کرنے لگوں۔ جس مقام پر ہوں۔ مجھے وہیں

بٹھیں۔“ اس کے لمبے کی انکساری پردہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا پھر پکار کر بولا۔

”سنو آئیہ! میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ منع نہیں کرنا مکمل دن میں کسی وقت۔“

”لیکن۔۔۔“ وہ بوکھلا گئی۔

”کوئی مشکل نہیں ہے۔ میں گیارہ بجے تمہارے قریبی اسٹاپ پر انتظار کروں گا۔“

وہ غالباً ”تمہرے کچھ کا تھا کہ اس کا کوئی عذر نہیں سنے گا جب ہی اسے مشکل میں ڈال کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اور پھر

کی بوکھلاہٹیں سوچ سوچ کر مسکراتا رہا تھا۔

اور اس کے نہ آنے کا تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے برعکس پچھتے یقین کے ساتھ اگلے روز مقررہ وقت پر

رہ جبکہ پہنچ گیا۔ اور اسے زیادہ انتظار بھی نہیں کرنا پڑا۔ دس منٹ بعد ہی وہ اسے دوسرے آتی ہوئی نظر آگئی۔

نہ پر اعتماد نظر آنے والی اس وقت بہت محتاط ہو کر چل رہی تھی۔ وہ اس کا ایک ایک قدم گنتے لگا تو جانے کیوں

سے یوں محسوس ہوا جیسے درمیانی فاصلہ بجائے سینے کے بردھتا جا رہا ہو۔ تب فوراً ”سر جھٹک کر اس نے اسپینڈ

ے گاڑی بھاگا کر اس کے قریب جا کر وہ اچھل کر ایک طرف ہو گئی پھر جب اسے دیکھا تو یوں سر ہلایا جیسے اس کی

مت کو نامناسب قرار دیا ہو

”سوری۔!“ وہ اس کی طرف کا دروازہ کھولتا ہوا بولا۔ ”میرا مقصد تمہیں ہراساں کرنا نہیں تھا۔“

”ہیسے ہیں آپ۔؟“ وہ اس کی بات یکسر نظر انداز کر گئی۔

”اُپس وراش کی کیفیت میں ہوں۔“ اس نے کہا۔ تو وہ اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپا نہیں سکی۔ جس پر وہ

ٹھٹھکے میں بولا۔

”بڑے افسوس کی بات ہے۔ تمہیں مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں۔ نہ میری پردا ہے۔“

”مگر ماں جی سے پوچھو، ہفتے میں ایک بار تو ضرور ان کی دین خراب ہوتی ہے۔“
”تو آپ ان کے اسکول جا کر بات کریں۔ یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے، بچے بیچارے پریشان ہو جاتے ہوں گے میں

سونا کی آواز پر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ وہیں سے چلاتی ہوئی آ رہی تھی۔
”اُمی، چھو پھو۔“ پھر کمرے میں آکر پھولی سانسوں کے ساتھ بولی۔ ”وہ ناں نیل بھائی، وہ ہمارے ساتھ
میں آئے۔“

”کیا؟“ وہ چیخ ماری۔ ”کہاں ہے نیل؟“
”جائیں۔“ اس کی چیخ پر سونا سم گئی اور میمونہ بھابی کی ٹانگوں میں چھپنے کی کوشش کرنے لگی، ”تو اچانک کسی
نیل کے تحت اس نے گیت کی طرف دوڑ لگا دی۔ باہر ڈرائیور احمد سے پتا نہیں کیا کہ رہا تھا وہ اس کے سر پر جا
کھڑی ہوئی۔“

”نیل کہاں ہے۔۔۔؟“
”جائیں نیل بی! اسکول میں تو نہیں ہے۔ میں نے سارا اسکول چھان مارا۔“ ڈرائیور نے حد درجہ عاجزی دکھائی
لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہنوز تیکھے لمحے میں بولی۔

”اسکول میں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے۔ فتح من نے اسے کہاں چھوڑا تھا۔“
”صبح تو ہی اسکول میں ہی چھوڑا تھا۔ آپ ان بچوں سے پوچھ لیں۔“
”تم نے پہلے سے معلوم کیا۔۔۔؟“ اس کے جارحانہ انداز میں اندرونی اضطراب بھی شامل ہو گیا تھا۔
”جی بی بی۔“ نیل کی مس کمرے رہی تھیں کہ ٹھہری میں وہ ان کے سامنے نکلا ہے۔ لیکن بی بی! وہ دین میں آکر
میں بیٹھتا نہیں کس طرف۔“

ڈرائیور اپنی غفلت پر سخت پشیمان اور گھبرایا ہوا تھا لیکن وہ اس سے کوئی رعایت برتنے کو تیار نہیں تھی تبھی
گیت کے اندر سے ماں جی نے اسے بکار لیا۔
”ماں جی! پوچھیں اس سے نیل کو کہاں چھوڑ آیا ہے۔“
اندر آتے ہی وہ بے قابو ہو گئی تو میمونہ بھابی اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئیں اور زبردستی بٹھاتے ہوئے
بولیں۔

”آجائے گا نیل۔ تم پہلے اپنے حواسوں پر قابو پاؤ پھر سوچو کہ وہ کہاں جا سکتا ہے۔“ میمونہ بھابی نے اس کے
کندھے پر دباؤ ڈال کر کہا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی پھر فوراً نفی میں سر ہلا کر بولی۔
”وہ ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا کہ خود کہیں جاسکے؟“

”لے جایا تو جا سکتا ہے اور ایک ہی ہستی لے جا سکتی ہے۔“ میمونہ بھابی کا انداز سوچنا ہوا تھا۔
”نیل بھابی۔“ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور بے حد خاموش نظروں سے وہ دیکھنا میمونہ بھابی کو
بلیا تھی لیکن دروازے سے داخل ہوتی ماں جی سامنے آ گئیں۔ بے حد مضطرب جیسے ابھی ڈھکے جائیں گی۔
”ماں جی۔“ وہ سارے حوصلے بجا کر کے ابھی اور بڑھ کر اماں جی کو قہام لیا پھر انہیں بٹھا کر کہنے لگی۔ ”پریشانی
لبات نہیں ہے اماں جی! میں ابھی عدیل بھائی کو فون کرتی ہوں۔ وہ آتے ہوئے نیل کو لیتے آئیں گے۔“

”کہاں سے لے آئے گا۔۔۔؟“
”فوس! اس نے پٹیا کر میمونہ بھابی کو دیکھا تو وہ اماں جی کے پاس بیٹھتے ہوئے اس سے بولیں۔
”تم جاؤ کھانا کھاؤ! احمد اور سونا کو بھی کھلاؤ۔“
پھر انہوں نے اسے ”میں سنبھال لوں گی۔“ کا اشارہ کیا تب کچن میں آکر اس نے کھانا نکالا لیکن اس کا نابالکل
سامنے چاہا کھانے کو۔ احمد اور سونا کو آرام سے کھانے کی تاکید کرتی ہوئی لابی میں آکر سوچنے لگی کہ کسے فون
کرے۔ عدیل بھائی یا بڑے بھیا کو۔

”بروانہ ہوتی تو آتی کیوں۔۔۔؟“
وہ گم کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی تو اسے متوجہ کرنے کی خاطر وہ پوری اسپینڈ سے گاڑی دوڑانے لگا۔ لیکن اس
پر تکیب کامیاب نہیں ہوئی کیونکہ وہ بڑے سکون سے بیٹھی رہی تھی۔

”ماں لیا تمہیں خود پر بڑا اختیار ہے۔“ ریٹورنٹ کے خوبصورت ماحول میں بیٹھتے ہی وہ اس کے کمال پر
سراہ کر کہنے لگا۔ ”اچھی بات ہے لیکن پلیز تھوڑی دیر کے لیے خود کو ان دیکھی بندشوں سے آزاد کر دو۔ میں تم
بست سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں نے آپ کو منع تو نہیں کیا۔“ وہ قصداً مسکراتی تو کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھنے کے بعد وہ پوچھنے لگا
”تمہیں پتا ہے ابھی دو تین روز پہلے عدیل بھائی میرے پاس آئے تھے۔؟“
”اچھا! اسے جیسے حیرت ہوئی۔

”ہوں۔“ وہ پرسوج انداز میں سر ہلا کر کہنے لگا۔ ”تمہارے گھ والوں کے خدشات اپنی جگہ درست ہیں
بھی شخص ایسے حالات میں بہت سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کرے گا۔ گو کہ عدیل بھائی میرے پاس سے بہت متاثر
کر گئے تھے پھر بھی میں خاصا پریشان سا ہوں۔“

”کیوں۔۔۔؟“ وہ اسے اچھے دیکھ رہی تھی۔
”جائیں۔“ اس نے ذرا اسے کندھے اچکا کر گویا اپنی بے بسی کا اظہار کیا تو وہ فوراً ”کچھ نہیں بولی۔ نہ
طرف مچھنچ کر چائے پیالیوں میں ڈالنے لگی، پھر ایک کپ اس کے سامنے رکھا اور اپنے کپ میں چٹچ چلاتے
بولی۔

”کہا مجھے ہمیشہ آپ ہی کی بات وہ پرانی پڑے گی۔ کہ میرے دل میں آپ اس مقام پر فائز ہو چکے ہیں جا
سے پہلے کوئی تھا نہ آئندہ کوئی ہو گا۔“

اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ اور وہ یونہی سر جھکائے دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔
”جس یقین سے آپ نے کہا تھا۔ اسے ٹوٹا نہیں چاہئے شاہ سکندر! اسی یقین پر میں نے اپنے دل کا
آپ کے نام کا پہلا بیج بویا تھا اور پھر ہر روز ایک نیا بیج اس یادگار کے نام کرتی گی۔ اب تو آپ شمار بھی نہیں
کہ میرے دل کی زمین پر یہاں سے وہاں تک کتنے پھول کھلے ہیں۔ جن کی ہر پتی پر آپ کا نام ہے اور اس پر
بستی کو اجاڑنے کی سعی وہی کر سکتا ہے جسے مجھ سے میری زندگی سے چار نہ ہو۔“
شاہ سکندر کو اپنے دل سے بوجھ سرکنا محسوس ہوا اور ہونٹوں پر کھلی مسکراہٹ لمحہ بہ لمحہ مہری ہوتی
تھی۔

~~*

اس نے اماں جی سے تو کالج میں کسی کام کا بہانہ کیا تھا لیکن میمونہ بھابی کو بتا کر گئی تھی کہ وہ شاہ سکندر
بلانے پر جاری ہے۔ اس لیے دیر ہو جانے پر بھی اطمینان سے تھی کہ میمونہ بھابی نے اماں جی کا دھیان
لگا دیا ہو گا اور وہی ہوا۔ اماں جی نے اس سے پوچھا ہی نہیں کہ اتنی دیر کیوں ہوئی۔ انکانے لگیں۔
”پتا نہیں کب تمہاری کالج سے جان چھوٹے گی۔ اتنا بلکان ہوئی ہو۔ جاؤ منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھاؤ۔“
”آپ نے کھا لیا۔۔۔؟“ اس نے میمونہ بھابی کی معنی خیز مسکراہٹ سے نظریں چرا کر پوچھا۔

”ہاں میں نے تو کھالیا البتہ دلہن بچوں کا انتظار کر رہی ہے۔“
”کیا مطلب؟“ ابھی تک اسکول سے نہیں لوئے؟“ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے تعجب سے کہا۔ ”وہ
کیوں بھابی ابھی تک آئے کیوں نہیں۔“

”جائیں۔ مجھے لگتا ہے۔ راتے میں کہیں دین خراب ہو گئی ہوگی۔“ میمونہ بھابی نے پہلے لا علمی کا
قیاس کیا جس پر وہ پوچھنے لگی۔
”پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟“

”جیت بھوک لگی ہے۔“ میمونہ بھابھی آتے ہی شروع ہو گئیں۔
 ”ہاتھ تو دھو لیں اور چلیں ادھر برآمدے میں بیٹھتے ہیں۔“ اس نے ٹرے اٹھانی چاہی لیکن میمونہ بھابھی روکتے ہوئے بولیں۔

”بس یہیں ٹھک ہے ہم بیٹھنا چاہو تو اسٹول کھینچ لو۔“
 ”اے! یہاں کب سے بھوک لگی ہے۔“ اس نے اسٹول کھینچ کر انہیں بٹھادیا اور خود کھڑے کھڑے کھانے لگی۔
 ”نبیل! کھلادیا۔“ میمونہ بھابھی کو اچانک خیال آیا تو ہاتھ روک کر پوچھا۔
 ”نہیں۔ میں ابھی اس کے پاس نہیں گئی۔ اور کھانا تو اسے نبیلہ بھابھی نے کھلادیا ہو گا۔“

”وہ تمہاری بھابیوں کی لسٹ سے خارج ہو چکی ہیں۔“ میمونہ بھابھی نے احساس دلایا تو وہ دکھ سے بولی۔
 ”برسوں کی عادت چند دن میں کیسے چھوٹ جائے گی پھر میں انہیں صرف نبیلہ بھی نہیں کہہ سکتی۔ ویسے میرا خیال ہے بھابھی کتنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔“
 آخر میں اس نے جیسے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا پھر ہاتھ دھو کے کیتلی اٹھاتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ”چائے پیس گی آپ۔؟“

”بارہی ہو تو پی لوں گی۔“ میمونہ بھابھی بقیہ روٹی دسترخوان میں لپیٹتی ہوئی بولیں پھر ٹرے ایک طرف رکھ کر دوبارہ بیٹھیں تو اپنے مخصوص انداز میں شروع ہو گئیں۔
 ”جان میں جان آگئی۔ دماغ بھی فریش ہو گیا ہے۔ اب مزہ آئے گا تم سے بات کرنے میں۔ بھوک میں تو کچھ سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔ خیر اب تم جلدی سے بتاؤ کیا باتیں ہوئیں شاہ سکندر سے۔۔۔؟“
 ”جی نہیں۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔“ وہ ان کے انداز پر ہنستے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے۔ وہ جو آج اماں جی اور بابا جی اپنی منظوری دینے کے لیے شاہ سکندر کے عزیزوں کو بلوانے کی باتیں کر رہے تھے تو میں منع کر دیتی ہوں اماں جی کو کہ اتنی جلدی نہ کریں۔ تم ہم پر بھاری تھوڑی ہو۔“
 میمونہ بھابھی نے بڑی بے نیازی سے اسے اس کی خوشیوں کی نوید دی اور وہ اپنی جگہ اچھل پڑی۔
 ”کیا کہا بھابھی آپ نے کیا باتیں کر رہے تھے بابا جی اور اماں جی۔؟“
 ”جی نہیں۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔“

”میمونہ بھابھی نے فوراً بدلہ لیا بھی اندر سے عمر کے رونے کی آواز آئی تو ”میرا لال اٹھ گیا۔“ کہتی ہوئی کھڑی ہو گئیں پھر جاتے جاتے اسے دیکھ کر شرارت سے بولیں۔
 ”تمہو کا دلن طے ہوا ہے۔ تمہاری بات پکی کرنے کے لئے۔“

”نئی کھانے تولیتی جائیں۔“ ان کی عجلت پر اس نے جلدی سے مگ اٹھا کر ان کی طرف بڑھا دیا۔ جسے لے کر وہ اندر چلی گئیں اپنے پیچھے اس کے لئے سوچنے کو زندگی کا خوبصورت موڑ چھوڑ گئی تھیں۔ ان ہی سوچوں کے دھارے پر بہتی وہ اپنے کمرے میں آئی تو نبیل کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلائے جانے کس سوچ میں تھا۔ اس کے ہونٹ ساکت تھے اور نظرس ہتھیلیوں پر نہی ہو چکا۔ کچھ سمجھ نہیں سکی تو اس کے پاس اگر بھی اور آہستہ سے اس کی کلائیوں کو ہاتھ کر پونچھنے لگی۔
 ”نبیل! کچھ رہے ہو بیٹا۔“

”نبیل نے اپنی ہتھیلیاں اس کے سامنے پھیلا دیں تو ان پر نظر ڈالنے کے بعد وہ قدرے الجھ کر بولی۔
 ”کیا ہوا ہے۔ مجھ تو کچھ نظر نہیں آ رہا۔“

پھر لڑکھی اپنے ہونٹوں سے اس کی ہتھیلیوں کو چوما تو وہ بے چین سا ہو کر اٹھ بیٹھا پھر ایک دم اس کی گردن میں انڈول کر اس سے پلٹ گیا تو اس محبت اور دالمانہ انداز پر اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا اور جواباً اسے بازوؤں میں لپیٹ لیا۔

نبیل اسے چھوڑنے پر آمادہ ہی نہیں تھا۔ کتنی دیر بعد اس نے ہمت آہستہ سے اسے خود سے الگ کیا اور

اور ابھی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ اپنے پیچھے بہت ہلکی سی آہٹ محسوس ہوئی تو یونہی اسے خیال میں رہ کر نے پیچھے گردن موڑی اور نبیل کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں سے سچ نما آواز بلند ہونا چاہتی تھی لیکن اس سے بڑا اس نے اپنی آواز کا گلا گھونٹ دیا البتہ بے اختیار جھٹک آنے والے آنسوؤں کو نہیں روک سکی۔ اور بڑھ کر، کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر اس کے سر پر بھی اپنی پیشانی ٹکاتی کبھی ہونٹ۔ گو کہ وہ اس کی ماں نہیں لیکن اس وقت اس کے احساسات ایسے ہی ہو رہے تھے۔ جیسے کسی ماں کو اس کا کھویا ہوا بچہ مل گیا ہو۔ بڑپتے ہوئے دل کو کسی حد تک قرار آیا تب فرش پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر پونچھنے لگی۔

”کہاں چلے گئے تھے۔“
 نبیل جب چپ چاپ اس کے پیچھے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا۔
 ”کس کے ساتھ آئے ہو؟ کون چھوڑ گیا ہے تمہیں۔؟“
 نبیل کی خاموشی نہیں ٹوٹی تو وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اماں جی کے کمرے میں لے اور اسے سامنے کرتے ہوئے بولی۔

”نبیل! آیا ہے اماں جی۔؟“
 اماں جی اور میمونہ بھابھی نے ایک ساتھ چونک کر دیکھا پھر اماں جی نے لپک کر نبیل کا ہاتھ پکڑ کر اپنی ہاتھ کھینچ لیا۔ اور اس سے پہلے کہ اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کریں۔ وہ اس کا دفاع کرتے ہوئے بولی۔
 ”اماں جی! ابھی بچہ ہے سنا سمجھا ہے۔ کہیں ادھر ادھر چھپ گیا ہو گا۔“
 ”اے ہمارے ہمارے جان نکال کے رکھ دی۔“ اماں جی کہتے ہوئے نبیل کو تجھجوڑنے لگیں۔ ”کہاں رہ گیا ارے تیرا باپ آجاتا تو میں کیا جواب دیتی اسے۔“

”چھوڑیں اماں جی! میں سمجھاتی ہوں اسے۔ آئندہ ایسا نہیں کرے گا۔ نبیل! تم کمرے میں جاؤ۔۔۔“
 اس نے نبیل کو الگ کر کے جانے کو کہا پھر اماں جی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔
 ”اس طرح نہیں کریں اس جی وہ پہلے ہی سہا ہوا ہے اور ڈر جائے گا۔ میں آرام سے اس سے معلوم گی۔ میرا خیال ہے نبیلہ بھابھی اسے اپنے ساتھ لے گئی تھیں اور شاید وہی چھوڑ گئی ہیں۔“

اماں جی یوں پریشان ہو گئیں جیسے قیامت آئی نہیں تو آنے والی ہو۔
 ”پریشانی کی بات نہیں ہے اماں جی۔“ وہ انہیں سمجھاتے ہوئے کہنے لگی۔ ”وہ نبیل کی ماں ہیں اور ہم ٹھ کوئی بھی انہیں نبیل سے ملنے سے نہیں روک سکتا۔“
 ”تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن انہیں اس طرح بغیر بتائے نبیل کو نہیں لے جانا چاہئے تھا۔ کتنے پریشان ہم لوگ۔“ میمونہ بھابھی نے کہا۔ تو وہ ان کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

”ہاں۔ یہ بات ان سے کھلائی جاسکتی ہے۔ کوئی دن یا وقت جو بھی ہو ملے کر لیں اور یہ معاملات تو بڑے طے کر سکتے ہیں۔“

وہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی کہ اچانک خیال آنے پر رک کر پوچھا۔ ”بابا جی کہاں ہیں۔؟“
 ”تمہارے پچانے بلوا بھیجا تھا وہیں گئے ہیں۔“

”خیریت۔۔۔؟“
 ”آئیں گے تو خیریت معلوم ہوگی۔“

اماں جی کے جواب پر وہ یونہی سر ملاتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی اور گو کہ اس کا پل یہ چاہو فوراً ”نبیل سے ساری بات معلوم کرے۔ کہ وہ کس کے ساتھ گیا آیا اور نبیلہ بھابھی نے اس سے کیا کیا وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے یہ ایک فطری تجسس تھا لیکن وہ فوراً ”خوب کو باز رکھتے ہوئے کچن میں آکر کھانا گرم کر۔ کیونکہ ابھی میمونہ بھابھی نے بھی نہیں کھایا تھا۔ پھر اس نے وہیں سے انہیں پکار لیا۔

تھیلیوں سے آنکھیں صاف کر رہی تھی کہ وہ کہنے لگا۔
”پھوپھو! میں مٹی کے ساتھ چلا گیا تھا۔ اسکول آئی تھیں مجھے لینے۔“

وہ فوراً ہاتھ نیچے کر اکر اسے دیکھنے لگی۔
”مٹی کہہ رہی تھیں۔ وہ یہاں نہیں آسکتیں۔ پھر مٹی رو رہی تھیں آپ کی طرح۔ انہوں نے میرے ہاتھ چوما اور آنکھوں سے لگایا تھا۔ ہاتھیں وہ کیوں رو رہی تھیں۔ آپ کیوں رو رہی ہیں پھوپھو۔“
وہ جس سادگی سے بول رہا تھا۔ اسی سادہ معصوم انداز میں پوچھا تو وہ بس ذرا سانس لی میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

~~*

شام میں اماں جی نے سب کے سامنے نیپیلہ کا اسکول سے نیپیل کو لے جانے کا بتایا تو ایک ہنگامہ اٹھ کر بڑے بھیا کے ساتھ عدل بھائی بھی غصے میں آگئے تھے اور نیپیلہ کے اس اقدام میں کوئی انتہائی پہلو تلاش کرتے۔ غالباً ”ان کے خیال میں وہ عورت محبت کے ہاتھوں تو مجبور ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یقیناً“ اس کے خطرناک ہونے کے۔

”نیپیل ہے کہاں؟ میں اس سے پوچھتا ہوں کہ وہ کسی کی اجازت سے اس کے ساتھ گیا تھا۔“
بڑے بھیا کا بقیہ غصہ اب نیپیل کی طرف منتقل ہونے والا تھا کہ اباجی فوراً ٹوک کر بولے۔
”نہیں بیٹا! اس میں بچے کا کوئی قصور نہیں۔ اس نے ماں کو دیکھا اور اس کے ساتھ چلا گیا۔ تم اگر روک تو اس کی ماں کو روکو۔“

”اس طرح تو وہ اور ضد میں آجائے گی۔“ بڑے بھیا۔ اباجی کی بات سمجھتے ہی اپنی بے بسی پر تملائے۔
”اسی لیے غصے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ آرام سے ٹھنڈے دماغ سے بیٹھ کر سوچو۔ اس طرح غصے میں نقصان کرو گے۔“

اباجی نے نرمی سے ان کا کندھا سہلاتے ہوئے سمجھایا تو وہ جیسے ٹوٹ گئے۔
”میں کیا کروں اباجی! میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ بتائیے وہ جب تک یہاں تھی۔ اسے نیپیل نہیں تھی۔ اب کیسے وہ۔“
”حوصلے سے بیٹا! حوصلے سے۔“ ان کی آواز بھرانے پر اباجی نے پھر انہیں سہارا دیا۔ ”اپنے آپ پر قہر اور اس بات کو زیادہ اہمیت مت دو۔“
”کیسے نہ دوں۔“

”مصلحت کا تقاضا یہی ہے۔ ابھی تم نے خود کہا کہ منع کرنے سے وہ اور ضد میں آجائے گی۔ اسے ضد دلاؤ۔ ضدی عورت بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ کسی کو نقصان پہنچانے کی ٹھان لے تو پھر اپنا نفع نقصان سوچتی۔“

وہ باتیں جو کتابیں نہیں سکھاتیں اباجی اپنے بڑھے لکھے بیٹوں کو سمجھا رہے تھے۔
”پھر وہ کوئی جاہل کنوار عورت نہیں ہے تجھے تم اور اچھا کاسکو۔ بڑھی لکھی ہے۔ اگر اس نے ماں کا حق کر لیا تو پھر نیپیل کو یہاں سے لے جانے سے اسے کوئی نہیں روک سکے گا اس لئے بہتر یہی ہے کہ خاموشی کر لو بلکہ ڈھیل دے دو اسے کہ وہ جب چاہے۔ نیپیل سے مل لے۔ البتہ یہ ضرور طے ہونا چاہئے کہ وہ کب وقت اسے لے جائے گی تاکہ یہاں کسی کو پریشانی نہ ہو۔ سمجھ رہے ہو ناں۔“
بڑے بھیا جو ایک ٹک انہیں دیکھے جا رہے تھے پہلے اثبات میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔
”لیکن اباجی! میں نہیں چاہتا۔ نیپیل اس سے ملے۔“

”نہ سلسلہ زیادہ عرصہ نہیں چلے گا بیٹا! اس کا مقصد صرف تمہیں پریشان کرنا ہے۔ جب وہ دیکھے گی کہ کوئی ٹوکس نہیں لیا تب خود ہی پیچھے ہٹ جائے گی۔“
اباجی نے کہا تو عدل بھائی فوراً ”ان کی تائید کرتے ہوئے بولے۔

”اباجی ٹھیک کہہ رہے ہیں بڑے بھیا۔ ان کا مقصد صرف آپ کو پریشان کرنا ہے۔ نیپیل سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ بس آپ ایک بار ان سے رابطہ کر کے نیپیل سے ملنے کے اوقات طے کر لیں۔ اس کے بعد نیپیل کو ان کے پاس لے جانے کا نئے کی ذمہ داری میری ہوگی۔“

”ہوں۔ یہ ذمہ داری تو تمہیں قبول کرنی ہوگی کیونکہ میں۔۔۔“
بڑے بھیا جانے کیلئے خاموش ہو گئے۔ پھر کن اکھوں سے خاموش بیٹھی اماں جی کو دیکھ کر اپنے تئیں آواز دبا کر بولے۔

”میں باہر جا رہا ہوں اباجی۔“
”ہائیں۔“ اماں جی نے پھر بھی سن لیا۔ ”باہر کا ہے کو جا رہے ہو۔“
”ظاہر ہے روز گائے۔“

”یہاں بے روز گار تو نہیں ہو۔“ اماں جی نے ان کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ اور وہ اس وقت مزید کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے اٹھتے ہوئے بولے۔

”اباجی! میں پھر بات کروں گا۔“
”کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی۔ ماشاء اللہ! میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔“ اماں جی اپنی کسے جاری تھیں۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گئے۔ تب اباجی ٹوکتے ہوئے بولے۔
”بس کرو۔ وہ کون سا ابجی جا رہا ہے۔“

”ابجی نہ کبھی سمجھا دیں اسے۔“
”سمجھاؤں گا تم نے جی بلکان کرو بلکہ اس کا گھر سامنے کی سوچو۔ کیوں عدیل میاں۔؟“ اباجی نے اچانک عدیل کو مخاطب کیا تو وہ چونک کر بولے۔

”جی۔ جی۔ اباجی۔ ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔؟“
”کیا ٹھیک کہہ رہا ہوں۔؟“ اباجی سمجھے عدیل نے ان کی بات سنی ہی نہیں اور یونہی تائید کر رہے ہیں۔
”وہی بڑے بھیا کی شادی، میرا خیال ہے آسیہ کے ساتھ ساتھ ان کا گھر بھی بس جائے تو اچھا ہے۔“
عدیل نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مشورہ بھی دے ڈالا پھر اماں جی سے کہنے لگے۔
”آپ کا انتخاب لا جواب ہوتا ہے اماں جی! ایسا بھابھی اور میمونہ بھابھی جیسی ان کے لئے بھی لے آئیں۔ پھر باہر نہیں جائیں گے۔“

اماں جی کے چہرے پر مسکراہٹیں دوڑنے لگیں۔
”سوچ تو میں کئی دنوں سے رہی ہوں اور میری نظر میں ایک لڑکی ہے بھی۔“
”کون۔؟“ اباجی فوراً متوجہ ہوئے۔

”سامنے آپ کی بیٹی۔“ اماں جی نے بتایا تو اباجی یوں مطمئن ہو گئے جیسے ان کے دل کی بات کہہ دی گئی ہو۔
نیک عدیل برآمدگوشی کا انگٹھا رکھتے ہوئے بولا۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ آپ کا انتخاب لا جواب ہوتا ہے۔ بڑے بھیا کے لئے سارے جی بہت مناسب ہیں۔
اگر آپ پہلی فرصت میں جا کر بات کریں۔“

”میں تو آج جانے کو تیار ہوں لیکن تمہارے بھائی کا تو پتا چلے۔ وہ کیا چاہتا ہے اور ادھر ساڑھ کے لئے پتا نہیں مارے پچانے کیا سوچ رکھا ہے۔ ایک جگہ بات چل تو رہی تھی اس کی۔“
اماں جی نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا پھر اباجی سے پوچھنے لگیں۔

”آپ آج گئے تھے۔ کچھ بتایا۔ ضائع نہ سارے رستے کے بارے میں طے ہوا یا نہیں۔“
”نہ بتا رہا تھا۔ وہاں بات نہیں تھی۔“
”پس تو پھر آپ عقل سے بات کریں پھر ہم چلیں گے۔“

اباجی اثبات میں سر ملانے لگے، پھر معا "خیال آنے پر عدیل کو مخاطب کر کے پوچھنے لگے۔
 "عدیل! وہ تم احمد حسن کی طرف گئے تھے۔"
 "نہیں اباجی! میرا جانا نہیں ہو سکا لیکن میں نے انہیں فون کر دیا تھا۔ جمعہ کو رات کے کھانے کی دعوت دی ہے۔"
 عدیل بتا کر اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ اوہر میونہ بھابھی پکار رہی تھیں۔ وہ غلت میں باہر نکل گئے۔

"مجھے نہیں معلوم مہر! جو چاہے قسم لے افس۔" شربانو جی عجربیشان ہو گئی۔
 "کھاؤ شاہ! بارون کی قسم کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔" اس نے شربانو کی شہ رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ جس سے وہ اور تان ہو گئی اور قدرے رو ہنسی ہو کر پوچھنے لگی۔
 "کب۔ کب گئے ہیں سکندر بھائی اور تم سے کیا کہہ کر گئے ہیں؟"

"مجھ سے" ارے مجھے تو اس نے اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ میرے آنے کا انتظار ہی کر لیتا۔ نہ میرے نام کوئی اچھوڑا جو بایا جان کی بات کو سچ ثابت کرنا کہ وہ مجھ سے نہیں ان سے ناراض ہو کر گیا ہے۔ اس کی ناراضگی سے نہیں سمجھی۔ اسے ناراض کیا گیا ہے۔ سبب تم جانتی ہو شربانو۔ اور جان تو میں بھی گئی ہوں پھر بھی رے منہ سے سنتا جا رہی ہوں۔"

تفرے ہوئی ہوئی مہر! نے سناٹے میں بیٹھی شربانو کا ہاتھ زور سے ہلایا پھر کہنے لگی۔
 "شاہی کی رات شاہ اس کمرے میں آیا تھا۔ وہ بھی اس وقت جب میں اس کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔ خیر یہ میرا اور شاہ کا معاملہ ہے۔ مجھے تو تم اس حرافہ کا نام ہتاؤ جو شاہ کو سے چھین کر جرات کر بیٹھی ہے۔"

"میرا حق کرو مہر! میں کچھ نہیں جانتی۔ میں تو سکندر بھائی کے جانے کا بھی ابھی تمہارے منہ سے سن رہی ہوں بی جان! یہ بھی بتایا۔"
 "وہ نہیں بتا میں گئی اور سنو۔ تم بھی ان پر ظاہر مت کرنا کہ تم جان چکی ہو کیونکہ یہ اس گھر کا مسئلہ ہے اور تم اس گھر کی فردوس ہو۔"

مہر! نے ہلکی سی طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ جانے اسے کیا اور کرانے کی کوشش کی کہ وہ اگر نہیں سمجھی، بھی یوں سر جھکا لیا جیسے اب مہر! کی ہر جائز ناجائز پر اسے اسی طرح سر جھکانا ہے ورنہ دوسری صورت میں بھاری قیمت ادا کر پڑے گی۔

~~*

سکندر بھائی! آپ کے لئے گڈ نیوز۔"
 اٹلہ نے اسے دیکھتے ہی لٹو لگایا۔ لیکن وہ ایک تو تھکا ہوا تھا دوسرے شوروم کا سودا نہ ہونے کے باعث کچھ سا بھی تھا۔ جب ہی ناکلہ کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور تھکے تھکے انداز میں بیٹھا تو آخر حسن ناکلہ کو ٹوکے بولے۔
 "تھک نہیں کرو۔ جاؤ پہلے چائے لے کر آؤ۔"

میں چائے سے زیادہ اچھی خبر سنانے والی ہوں۔ جو سکندر بھائی کی ساری تھکن پل میں دور کر دے گی اور ان اوس چہرے پر مسکراہٹیں دوڑنے لگیں گی۔ اب بتائیے پہلے چائے یا گڈ نیوز۔"
 اٹلہ نے شاہ سکندر کے سامنے اگر خوشی سے پوچھا تو اس نے پہلے احمد حسن کو دیکھا اور اس کا اشارہ سمجھ کر آرام سے بولا۔
 "چائے۔"

"برگزینہ! یہ" ناکلہ چیخ پڑی۔ کیونکہ وہ خواجھی خبر سنانے کو بے چین تھی اور جانے کب سے ان دونوں کا ار کر رہی تھی۔
 "اچھی خبر دیتی ہے۔ اچھا خیر سناؤ۔ جلدی سناؤ۔" شاہ سکندر نے جیسے اس پر احسان کیا۔ تو وہ منہ پھلا کر بولی۔
 "آئیہ اباجی کے گھر سے فون آیا تھا۔ انہوں نے ہم سب کو کھانے پر بلایا ہے۔"

"کسے آنسے" شاہ سکندر کی ساری بے نیازی رخصت ہو گئی۔
 "جی نہیں جمعہ کو۔" ناکلہ کا انداز ہنوز تھا۔ جس پر احمد حسن ٹوکے ہوئے بولا۔
 "تو اس میں روئے کی کیا بات ہے۔ کیا تمہیں نہیں بلایا۔"

مہر! نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے شربانو اور شاہ! بارون کو آتے دیکھا تھا۔ دونوں کتنے خوش تھے۔ پورا تھا جیسے قسمت کی دیوہی نے مہر! کو کساری رعنائیاں ان کی جھولی میں ڈال دی ہوں۔ شربانو کے ہونٹ ہنسی کھلی پڑ رہی تھی اور شاہ! بارون کی سنگت کا غور اس کے انگ سے عیاں تھا۔ جس نے مہر! سے ایک لگاؤ کی تھی۔ جو اگر وہ اس وقت نیچے اتر کر آتی تو اس ایک کی پیش سے شربانو ہرگز محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ اسی خیال کے تحت وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی اور ادھر سے ادھر نکل کر اپنے اندر دیکھنے والاؤ کو سر کی کوشش کرنے لگی لیکن اسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ خود اپنے لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے ساتھ ساتھ سر ڈالے گی، بڑی مشکل سے وہ خود کر نیچے جانے سے باز رہے، ہونٹ تھکی۔ پھر اپنا دھیان بٹانے کی خاطر اس۔ ریکارڈ میں کیسٹ لگا کر آن کیا اور مسہری پر آ بیٹھی۔ چند لمحوں بعد سو گوارسی دھن نے کمرے کی خاموشی اواسی کا رنگ شامل کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر گھنٹوں کے گرد بازو پیسٹ ٹیپ ریکارڈ پر نظریں جماتے بیٹھی رہی پھر نیم دراز ہو کر مسہری کی بیک پر سر رکھ کر ٹیکس موند لیں۔

اک آگ غم تنہائی کی سارے بدن میں پھیل گئی
 جب جسم ہی سارا جلتا ہو تو دامن دل کو چھایا میں کیا
 اچانک ٹیپ بند ہونے کی آواز کے ساتھ شربانو کی کھلکھلاتی ہنسی نے جیسے بجھتے انگاروں کو پھر سے دی اور وہ ہمیشگی طرح اس کی پذیرائی کو انھنے کے بجائے ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی۔
 "خیر تو ہے کون روٹھ گیا۔؟" شربانو اپنی دھن میں تھی۔

کہاں ہیں سکندر بھائی؟ میں پوچھتی ہوں ان سے۔"
 "بیٹھ جاؤ شربانو! اس کے کمرے ہوئے سروے لیمے شربانو نے چونک کر اسے دیکھا پھر اس کے پاس تکلف سے بیٹھتی ہوئی اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگی۔
 "کیا ہوا مہر! تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔"

"ہوں۔ بہت ہلکی سی ہوں کی آواز اس کے بند ہونٹوں کے اندوم توڑ گئی۔
 شربانو اس کی پراسرایت سے کچھ خائف سی ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ تو اسے سارا ماحول ہی برا جیسے بچپن میں کمانیاں بڑھا کرتی تھی کہ ظالم دیو نے شربانو کی قید کر کے پتھر کا بنا دیا۔ اسے مہر! سے اپنی گمان ہو رہا تھا۔ جس کے وجود میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ بے حد گھبرا کر شربانو اسے غور سے دیکھنے لگی کہ ہونٹ پہلے ذرا سے نیم ہوا ہوئے پھر جیسے وہ خود کو بولنے پر آمادہ کر کے کہنے لگی۔
 "ایک بات پوچھوں شربانو! سچ بتاؤ گی۔"

"ہاں! کیا بات ہے؟" شربانو فوراً بولی۔
 "کیا وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے؟" اس نے اتنے یقین سے پوچھا کہ شربانو سٹپٹا گئی۔
 "کون۔؟"

"وی جس نے شاہ کو میرا نہیں ہونے دیا۔ چند لمحے بس چند لمحے شاہ نے میری جھولی میں خیرات ڈالے تھے شاید اپنی محبت کا صدقہ اتارا تھا۔ کیوں کیا یہی میری حیثیت ہے۔" مہر! نے اچانک پھٹ پڑ شربانو! تم اس کی بہن ہو سب جانتی ہو گی۔ مجھے بتاؤ وہ کہاں گیا ہے؟"

”جی نہیں۔ مجھے سب سے پہلے بلایا ہے لیکن میں جاؤں گی نہیں۔“
وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی تو کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ پھر احمد حسن اسے دیکھ کر مسکرایا۔
مسکراہٹ تھی۔

”مجھے کے دن۔ ضرور چلیں گے۔ اور اب جلدی سے بناؤ۔ کیا طے کرتا ہے۔“
”کیا مطلب۔؟“ وہ سمجھا نہیں۔

”مائی ڈیر ان کی طرف سے بلاوے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں یہ رشتہ منظور ہے اور ہم جا کر باقی ما کریں یعنی شادی کی تاریخ وغیرہ۔“ احمد حسن نے مطلب سمجھایا تو وہ کچھ الجھ کر بولا۔
”لیکن یار؟ تیار تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

”کیا تیار کر لیا ہے۔ پکڑے، زیورات، یہ سب امی اور نائلہ پر چھوڑ دو۔ وہ سب خریداری کر لیں۔
سیٹ کر چکے ہو۔ بالی رہا بزنس تو۔“ میاں احمد حسن خود انک گایا تو اسے کہنا ہوا۔

”بزنس نہیں ہو سکتا۔ آئی میں شادی کے اخراجات کے بعد بزنس کے لئے پیسہ نہیں بچے گا۔“
احمد حسن یہی بات کہنے سے رک گیا تھا اور جب شاہ سکندر اس حقیقت کا اعتراف کر کے مایوس
تب اس کا کندھا ٹھپک کر بولا۔

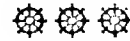
”کم آن یار! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلے ان لوگوں کا ارادہ معلوم ہو جائے اس کے بعد ہم طے کر
آیا شادی پہلے ہوئی چاہئے یا بزنس۔“

”ہوں۔“ شاہ سکندر نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا پھر رستہ واضح پر نظر ڈالی تو چونک کر بولا۔ ”ور
بجے ایک دوست سے ملنا تھا۔“

”رکھو۔ چائے پی کر جانا۔ یہ نائلہ کہاں رہ گئی؟“ احمد حسن اٹھتے ہوئے بولا تو وہ بھی اس کے ساتھ کھڑا
”رہنے دو احمد! دیر ہو جائے گی۔“ وہ احمد حسن سے اجازت لے کر باہر نکل آیا۔

پانچ بجتے ہیں دس منٹ تھے۔ وہ اسپنڈ سے گاڑی بھگانے لگا، لیکن جگہ جگہ ٹریفک جام ہونے کے باو
گھنٹہ لیٹ ہو گیا۔ پھر بھی بہم سی امید کے سہارے اس نے مطلوبہ جیمیر کے سامنے گاڑی روک دی،
لاک لگا رہا تھا کہ اسے اپنے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ کچھ بے دھیانی میں اس نے گردن موڑ کر دیکھ

پل کو اسے اپنا وجود سن ہو ناگ۔
جن پر اعتبار کیا تھا۔ وہی شاہ جاگیر اس کے بے حد قریب کھڑے مسکرا رہے تھے۔



”تم بڑے جلد باز ہو سکندر! میرا انتظار بھی نہیں کیا۔“
شاہ جاگیر اس کے گرم انداز کو قصداً نظر انداز کر کے ہلکے ہلکے انداز میں کہنے لگا۔

”میں کہیں بہت دود تو نہیں کیا تھا۔ بابا جان کے ساتھ رہتے پراودا اسی شام لوٹ بھی آ
وہ لو بھی خاموش کھڑا رہا تو شاہ جاگیر نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔

”یہاں کس کا انتظار کر رہے ہو؟“
اس کا سر آپ ہی آپ نفی میں ہل گیا۔

”جلو جیم کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں بلکہ میرے ساتھ آؤ۔ میں ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں!
شاہ جاگیر نے اس کے کندھے پر یوں ہاتھ رکھا جیسے وہ چلنے کو تیار کھڑا ہو رہا تھا تب اس نے
لب کشائی کی۔

”سوری بھائی۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔“

میراتیں اٹھا کر اسے ارادہ نہیں ہے۔ چلو خیر، جہاں تم کہو وہیں چلتے ہیں۔ یا مجھ سے بات ہی نہیں
نا چاہتے؟“

شاہ جاگیر نے محبت بھرے انداز میں اس کی ناراضگی کو جتا کر پوچھا تو وہ گہری سانس لینے لگا۔
یہ بات نہیں ہے بھائی! اصل میں میں یہاں ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ اگر آپ کو کوئی کام
ہو تو کچھ دیر انتظار کریں۔ میں اس سے مل کر آتا ہوں۔ پھر گھر چلیں گے۔

”میرے گھر؟“ شاہ جاگیر جو کئے کئے کہ وہ بول پڑا۔
”اچھا ہاں! تم جاؤ مل آؤ دوست سے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“

شاہ جاگیر نے خوشدلی اور فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ پھر اطمینان سے گاڑی کے ساتھ ٹیک لگا کر اُسے
تے ہوئے دیکھنے لگے اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تب ان کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں
بے غلی غلی تھیں۔

وہ جب شاہ جاگیر کے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ میں آیا اس وقت تاریکی پر پھیلا چکی تھی۔ وہ ایک
بعد ایک تینوں کمروں میں یو بل لائٹیں آن کرتا ہوا دوبارہ لاؤنج میں آیا تو شاہ جاگیر ٹھٹھکی
اُس کے گھر کا جائزہ لے رہے تھے۔ پھر اُسے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”گھر والی کہاں ہے؟“
”کونسی والی ہے؟“ اُس نے بڑے اعتماد سے مسکرا کر جواب دیا۔

”کیا مطلب۔ کہیں گئی ہوئی ہے یا ابھی شادی ہی نہیں ہوئی؟“
شاہ جاگیر نے ہنسنے ہنسنے استفہار کیا تو وہ اٹھان سے پوچھنے لگا۔

”آپ کو کیا لگ رہا ہے؟“
شاہ جاگیر نے یوں کندھے اچکائے جیسے کہہ رہے ہوں۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا! تب وہ اُن کے سامنے
نئے ہوئے کھینے لگا۔

”آئی جلدی شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ جب تک اسیہ کے گھر والوں کو میری طرف سے اطمینان نہیں ہو
وہ اپنی بیٹی۔“

”کیسا اطمینان چاہتے ہیں وہ؟“ شاہ جاگیر فوراً بول پڑے۔ ”تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو۔ شاہ پور کے
رانا کے بیٹے ہو۔ ساری زندگی صرف خود بلک آنے والی نسل کو بھی بٹھا کر کھلا سکتے ہو۔ کہ تم نے ان پر اپنی
ت واضح نہیں کی؟“

اب باندھتے ہیں وہ۔ یہ بھی کہ جس جاگیر کے بل پر میں اپنی نسل تک کو بٹھا کر کھلا سکتا تھا وہ میں چھوڑ
دن۔ اور آپ غلط سمجھ رہے ہیں بھائی۔ زن کے پیش نظر میری مالی حیثیت کبھی نہیں رہی۔ اب بھی
ہے۔ بس وہ بات سے خائف ہیں کہ کہیں یہ میرا جذباتی فیصلہ نہ ہو۔

اس نے بڑے۔ اور قتل سے کہا تو شاہ جاگیر کچھ دیر پر سوچ انداز میں سر ہلاتے کے بعد
یہ سب تمہاری جلد بازی کا نتیجہ ہے، ورنہ اس وقت اسیہ اس گھر میں موجود ہوتی۔“

”ہر بات کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے بھائی!“ اُس نے کہا تو شاہ جاگیر ذرا سا مسکرائے پھر کہنے لگے۔
”بات تم نے پہلے کیوں نہ سوچی۔ میں مجھ پر اعتبار نہیں تھا یا اسیہ پر، بلکہ میرا خیال ہے کہ میں خود
آپ پر اعتماد نہیں تھا۔ بہر حال تم نے مجھ پر چھوڑ کر سخت غلطی کی ہے۔ وہاں سے تعلق توڑنے
میں اس سے دوسری شادی کر سکتے تھے۔ میں تمہارے ساتھ تھا کیونکہ مجھے اپنا وعدہ ہر حال میں نبھانا
پڑا۔ بابا جان کی ناراضگی مول لے کر تم نے اپنے لیے ہی نہیں میرے لیے بھی مشکل کمزری کر دی ہے۔“

”یہاں رکھ دو۔“
عمران نے جگ رکھ دیا۔ پھر جانے کے بجائے اُس کے سامنے ہاتھ باندھ کر بولی۔
”بی بی جی! ایک بات کہوں۔ آپ برا تو نہیں مائیں گی۔“

بابا جان کے کمرے میں داخل ہوئے سے پہلے مہر النساء نے دوپٹے کو اچھی طرح سہا
اندہ داخل ہو کر سلام کر کے یوں کھڑی ہو گئی جیسے اب اسے صرف بابا جان کی بات سننے
کچھ بھی نہیں، جبکہ کہنے کو اس کے پاس بہت کچھ تھا۔
”یہاں کریمؐ مہر النساء“ بابا جان نے اپنے بڑے بڑا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ دھیر

”کیا بات ہے؟“ اس کی پشانی پر ہلکی سی ٹمکنیں نمودار ہوئیں تو جیراں کچھ ڈرتے ڈرتے کہنے لگا۔
 ”وہ جی۔ جہاں میری نانی کا قہر ہے وہاں ایک سائیں جی رہتے ہیں۔ بڑے پہوپہے (پہنچے) ہیں سائیں جی، ساری عورتیں اُن کے پاس جاتی ہیں۔“
 ”بھیر؟“ اس کی پیشانی کی لکیریں گہری ہو گئیں، لیکن اُن میں غصہ یا ناگواری نہیں تھی جب ہی آرام سے کہنے لگی۔
 ”اگر آپ کہیں تو میں چھوٹے شاہ جی کے لیے تعویذ لا دوں گا۔“
 ”شاہ کے لیے؟“ وہ ایک جھٹلے سے مسہری کی۔ بیک چھوڑ کر سیدھی بیٹھی۔ ”کیا ہوا شاہ کو؟“
 ”اللہ نہ کرے بی بی، جو اپنے چھوٹے شاہ جی کو کچھ ہو، جیراں اس کے بیوروں سے ہم کر چکری بولی۔“

”پھر تم نے اُن کا نام کیوں لیا؟“
 ”غلطی ہو گئی بی بی جی، معاف کر دیں۔“
 ”کانیتی آواز میں کہہ کر جیراں نے پیچھے یوں دیکھا جیسے اُس کا اشارہ ملتے ہی بھاگ کھڑی ہوگی۔
 مہاراجہ کچھ دیر تک اُسے گھورتی رہی پھر دھیرے دھیرے اُس کی پیشانی کی لکیریں صاف ہونے لگی تھیں۔ اس کے بعد جب اُس نے جیراں کو پیٹنے کے لیے کہا تو اس کے بچے میں مالا دھیر نہیں تھا۔
 ”کیا کہو گی سائیں جی سے؟“ وہ اب دھیمی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

”میں انہیں بتاؤں گی بی بی جی کہ چھوٹے شاہ جی گھر نہیں آتے۔ پھر وہ ایسا تعویذ دیں گے کہ چھو شاہ جی بھاگے آئیں گے۔ ساری زندگی غلامی کریں گے آپ کی۔“
 جیراں قدرے جوش سے کہہ رہی تھی اور اس تصور سے ہی اُس کی گردن اکڑی جا رہی تھی۔

”جئے کی نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ اور میمونہ بھائی بچن میں مصروف ہو گئیں۔ دوپہر کا کھانا،
 تے نماز سے پہلے ہی کھایا تھا اور اب رات کے کھانے کی تیاری تھی۔ وہ بھی مہانوں کے لیے۔ اندھا
 خاھا اہتمام کرنا تھا۔ کتاب، کوفتے، بریانی، قورمہ اور سوپ ڈش میں بھی دوا نیم شامل تھے
 پر بھی عدیل بھائی نے بچن میں جتنا تک کرایا ایک آدھ ڈش کا مزید اضافہ کرنے کو کہا تو میمونہ بھائی
 پڑیں۔“

”ہرگز نہیں۔ مجھے تو آج کی تاریخ میں یہ سب بھی بکتا نظر نہیں آ رہا۔“
 ”جیسے کیا کر رہی تھیں آپ؟“ عدیل نے قہر سے آہستہ آہستہ پر نظر ڈال کر کہا تو میمونہ بھائی با
 لڑنے کے لیے تیار ہو گئیں۔
 ”کیوں وہ پہر کا کھانا تم نے پکایا تھا۔ گھر کی صفائی بھی تم نے کی اور بیٹوں کو بھی تم نے ہنپایا
 ہم تو ابھی بستر سے نکل کر کچن میں آئے ہیں۔ ویسے تم اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو تمہارے
 والے تو نہیں آ رہے۔“

”میرے سسرال والوں کو آپ بے شک جانتے بھی نہیں پلویا ئے گا۔“
 عدیل نے کہا تو قہر سے ہنسنے لگی۔ ”اُس کے ہاتھ ایک لحظے کوڑے تھے۔“
 ”اچھا بس، اجاؤ یہاں سے، ابیں کام کرنے دو۔“
 میمونہ بھائی نے انہیں دھکیل کر باہر لکالا۔ پھر اُس سے کہنے لگیں۔
 ”سنو۔ تم کوفتے بناؤ کیونکہ مجھے کوفتے بنانے میں کوفت ہوئی ہے۔“
 ”مجھے آپ سے زیادہ کوفت ہوئی ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے یہ آٹم گول کر جائیں۔“
 ”ڈونگا انہیں تمہا تے ہوئے بولی۔“

”اور عدیل؟“ کیا ضرورت ہے اور مہانوں کے سلسلے تو وہ کچھ کہنے سے رہے۔ بعد میں آپ
 پٹ بیٹھے گا۔ ابھی تو کتاب بنا کر فریق میں رکھیے۔ میں جب تک قورمے کا مسالا تیار کرتی ہوں،
 وہ خاصی عجلت میں اور مصروف رہ کر بول رہی تھی۔ جب میمونہ بھائی بھی باتوں میں وقت ضائع
 کرنے کے بجائے کام میں مصروف ہو گئیں۔
 ”شام تک سب کھانا تیار ہو گیا۔ صرف کتاب تلنے باقی تھیں۔ اُس نے کھانے کے وقت ہی
 لے کر مشرفہ دیا۔ اس کے بعد میمونہ بھائی کے کہنے پر نہانے اور کچھ دیر آرام کرنے کی عرض سے اپنے
 رومے میں آ گئی۔ نوکر اس کا مہانوں کے سلسلے جانا متوقع نہیں تھا۔ البتہ نامہ اور اس کی اتنی اُس
 نے کمرے میں آ سکتی تھیں۔ اسی خیال کے تحت پہلے اُس نے اپنا کمرہ ٹھیک ٹھاک کیا پھر نہانے
 لی گئی۔“

”پھر جب شام گہری ہو کر تاریکی میں ڈوب رہی تھی تب مہانوں کی آمد نے خوشگوار سی پہلی مچا
 ی تھی۔ شاہ سکندر سے مصافحہ کرتے ہوئے عدیل کی نظر شاہ جہاں گھر کو دیکھ رہی تھیں۔ جن کے
 ملازمین وہی تفاخر اور زعم تھا جو اول روز شاہ سکندر میں نظر آیا تھا۔“

”یہ میرے بھائی ہیں۔ بڑے بھائی، شاہ جہاں گھر حیات۔“
 ”شاہ سکندر نے اُن کا تعارف کر دیا تو سب کی نظریں بے اختیار اُن کی طرف اٹھی تھیں۔ یقیناً چونکا
 یے والا سر ہل رہا تھا۔ جس نے خدشوں کے درمیان اطمینان کی لہر دوڑادی تھی۔
 ”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ عدیل کے بعد اب جی پھر خلیں بھائی نے شاہ جہاں گھر کے ساتھ
 صاف کر کے رہتے انہیں بھائی۔“

”مجھے بہت پہلے آنا چاہیے تھا۔ اُس وقت جب شاہ سکندر نے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔“
 ”شاہ جہاں گھر بیٹھے ہی اب جی کو دیکھ کر کہنے لگے۔“ لیکن ایک تو مصروفیات نے پیچھا نہیں چھوڑا۔
 ”دوسرے میں پہلے اپنے والدین کو کنوٹس کرنا چاہتا تھا۔ میری والدہ اور ہمیں تو بہت خوش ہیں۔
 بڑے والد صاحب۔“

”فرہاد، وہ بھی زیادہ دیر ناراض نہیں رہیں گے۔ سکندر نے یہاں آ کر انہیں سوچنے پر تو مجبور
 ہی کر دیا ہے لیکن ظاہر ہے وہ بڑے ہیں اور انہیں اپنی بات تو رکھنی ہی ہے۔ اس لیے انہوں نے
 لدہ اور بہنوں پر باندی لگا دی ہے ورنہ والدہ صاحبہ آئے کو تیار تھیں۔“
 ”اب جی کیا کہتے۔ بس اُن کی باتوں پر سر ہلاتے جا رہے تھے۔“
 ”البتہ والدہ صاحبہ نے۔“

”شاہ جہاں گھر نے کچھ کہتے ہوئے شاہ سکندر اور احمد حسن کو دیکھ کر جلنے کیا اشارہ کیا کہ وہ دونوں اُٹھ کر
 پہلے گئے۔“
 ”بس آہستہ باجی سے مل لوں؟“
 ”ناگوار کو اتنی دیر سے بولنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ ذرا دیر کی خاموشی سے فائدہ اُٹھا کر فوراً کھڑی
 ہوئی۔“

”مزد۔ چلی جاؤ گی یا میں؟“ میمونہ بھائی اٹھنے لگیں کہ وہ بول پڑی۔
 ”میں چلی جاؤں گی۔“

”آپ کھانے سے پہلے کچھ لیں گے۔ سیون آپ وغیرہ۔“ خلیں بھائی نے شاہ جہاں گھر کو متوجہ کر کے
 چھوڑ دیا۔
 ”فرنگس۔“ شاہ جہاں گھر نے منع کرتے ہوئے دروازے کی سمت دیکھا جہاں سے شاہ سکندر اور
 جن بچہ سامان کے ساتھ داخل ہو رہے تھے۔ میمونہ ناٹ سوٹ کیس اور چھوٹے بڑے کی بیٹ

جنہیں اماں جی کے سامنے رکھ کر وہ دوبارہ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ تب شاہ جہاں لگیں کہنے لگا۔
 ”یہ ہماری والدہ صاحبہ نے کچھ تجاؤت بھیجے ہیں۔ یہ سب توڑا عدیل کی سمجھ میں نہیں آیا۔
 ہمارے لیے سب سے بڑا تحفہ ان کی خوشی ہے۔ یہ سب توڑا عدیل کی سمجھ میں نہیں آیا۔
 کہیں۔۔۔“
 اپنی خوشی کا اظہار انہوں نے کسی طرح تو کرنا ہی تھا بلکہ انہوں نے تائید کی تھی کہ شادی کا
 طے کرنے سے پہلے ہم یہ آپ کی نذر کریں کیونکہ یہ ہمارے ہاں کا دستور ہے۔“
 شاہ جہاں بہت اعتماد سے پوری محفل پر اپنی گرفت مضبوط کیے ہوئے تھے۔ یوں کہ اپنی با
 میں کہیں بھی کوئی اختلاف کا پہلو نہیں چھوڑ رہے تھے۔
 ”میرا خیال ہے۔ اب کھانا ہو جائے۔ باقی باتیں۔۔۔“
 خلیل بھائی کے اشارے پر میز پر بھائی آ گئے ہوئے بولیں تو شاہ جہاں لگیں فوراً ہاتھ ا
 مر سید وود میں لے کر اس کا سر سہلانے لگی، تو سیمیا بھائی جو اس کی طرف سے سمیہ کو ڈانٹ
 تھیں اس کے برعکس دیکھ کر یہ کام انہوں نے کر ڈالا۔
 انہیں روک دیا۔
 ”ایک منٹ خاتون! تشریف۔۔۔“
 میز پر بھائی جس طرح کھڑی ہوئی تھیں۔ انہی طرح بیٹھ گئیں۔
 ”کھانے سے پہلے تم بیٹھا پسند کریں گے۔ شاہ جہاں لگیں نے نسبت میں آرام دہ انداز ا
 کرتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو میز پر بھائی تو سمجھیں نہیں لیکن آبا جی فوراً کچ
 پوچھتے گئے۔
 ”آپ کا معمول ہے پہلے میٹھا کھانا یا۔۔۔“
 معمول سے ہٹ کر صرف اس وقت، وہ بھی آپ کی اجازت سے ہم پہلے منہ میٹھا کریں
 شاہ جہاں لگیں نے جواب دینے کے ساتھ اپنی بات کی وضاحت بھی کر دی۔
 آبا جی نے پہلے اماں جی پھر باری باری بیٹوں کو دیکھا اور ان کی آنکھوں میں رضامندی دکھا
 بولے تھے۔
 ”عدیل! جاؤ پہلے میٹھا لے آؤ۔“

”آپ نے کہاں کر دیا بھائی؟“ رات سے شاہ سکندر کی ہر بات کا اختتام اسی جملے پر ہوتا
 ”مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ اتنی قریبی تاریخ پر آمادہ ہو جائیں گے۔“
 ”مجھے اگر اسلام آباد میں جانا ہوتا تو میں اس سے بھی قریبی تاریخ طے کرتا۔ خیر بندہ دن بھر
 نہیں ہیں۔ اتنا وقت تو نہیں بھی تیار کیے لیے چاہیے۔ وہاں کے زیورات اور کپڑوں کی
 کے لیے احمد حسن کی والدہ سے کہو۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ شادی سے دو
 پہلے آسکوں۔ پس دعا کرو بابا جان کہ کوئی کام نہ نکل سکے۔“
 شاہ جہاں لگیں اسے ہدایات دینے کے ساتھ اپنی طرف سے اطمینان بھی دلا رہے تھے۔ پھر
 کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے۔
 ”پیسوں کی بالکل فکر نہیں کرنا۔ اور ہاں کوئی چھوٹا موٹا کام کرنے کا بھی نہیں سوچو۔ شادی کر کے
 ہوجاؤ پھر اپنے لیے کوئی بڑا بزنس سوچنا۔ اپنے شاہان شان۔ اوسکے۔“
 ان بات میں سر ہلاتے ہوئے شاہ سکندر کے ہونٹوں پر جھپکی ہوئی مسکراہٹ تھی۔
 ”اب میں چلتا ہوں۔ دو پہر کے کھانے تک گھر پہنچ جاؤں گا چلیے۔“
 شاہ جہاں لگیں دیکھتے ہوئے گھر سے ہو گئے تو اس نے بھی ان کی ہلیدی کی۔ اور ان سے

ہوادرازے تک آیا۔
 کسی کے لیے کوئی پیغام ہو تو شاہ جہاں لگیں نے دروازے میں دنگ کر اُسے خوش نظرد سے دیکھا
 لیکن وہ ایک دم سنبھرا ہو کر بولا۔
 ”نہیں بھائی! کسی کے لیے کوئی پیغام نہیں۔“
 اوسکے۔ خدا حافظ! شاہ جہاں لگیں اس کا گنڈا جھٹک کر باہر نکل گئے۔ تو کچھ دیر وہ اُن کے پیچھے نظروں
 جلتے ہوئے دروازہ بند کر کے اندر گئے یہاں تک کہ غم کا قہر ڈال کر نے لگا۔ رات سے اُن کا دل
 اُس سے بات کرنے کو چل رہا تھا۔ دوسری دن پہلے ہی اس کی آواز سنائی دی۔ وہ گہری سانس لیچتے
 ہوئے بولا۔
 ”تھینکس گاڈ! میں ڈر رہا تھا کہ میں سا لادن تمہارے ممبر ڈائل کرنے میں ناکام رہتا۔“
 اس کے لیے آپ کو میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے، وہ شکستے ہوئی آواز میں بولی۔
 ”کیوں، کیا نہیں یقین تھا کہ میں فون ضرور کر دوں گا؟“
 ”جی۔ اور اسی لیے میں صبح سے فون کے آس پاس موجود ہوں؟ اُس نے کہا تو وہ جلدی سے بولا۔
 ”بہت بہت شکریہ لیکن ایک شکایت ہے تم سے۔“
 ”کہنا؟“
 ”رات سب کے بلاتے پر بھی تم کھانے میں ہمارے ساتھ شریک کیوں نہیں ہو رہے؟“
 ”کیا مجھے آنا چاہیے تھا؟ وہ الٹا اُس سے پوچھنے لگی۔
 ”کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ خیر تم نے جو کیا ٹھیک کہا۔ یہ بتاؤ ان بندرہ دنوں کے دوران کسی دن
 ملاقات ہو سکتے ہیں؟ وہ بڑی آس سے پوچھ کر اُس کا جواب سننے کو بے تاب ہو گیا۔
 ”نہیں شاہ سکندر! یہ ممکن نہیں ہے اور بلکہ آپ مجھے مجبور نہیں سمجھیں گے۔“
 اُس نے عاجزی سے کہا تو وہ خاموش ہو گیا اور قدر سے توقف سے بیکار کر کہنے لگا۔
 ”سنو آسید! میں بہت خوش ہوں۔ حالانکہ اپنی اب تک کی زندگی میں میں نے جو چاہا، پایا۔
 پھر بھی یوں لگ رہا ہے جیسے میری زندگی کی اولین تمنا پوری ہوئی ہو۔ اور اپنے کے احساس نے
 میری دہلیز تک کو سرشار کر دیا ہے۔ اتنا خوش شاید میں کبھی نہیں ہوا۔“
 ”اپنی خوشی میں یہ نہیں بھولنے کا شاہ سکندر! کہ میں کوئی بہت عام سی لڑکی نہیں ہوں۔ میرے
 خواب، میری سوچیں صرف ایک خوبصورت گھر تک محدود نہیں ہیں۔“
 آسید نے بڑی خوبصورتی سے اپنی بات دہرا کر اُسے اس کا وعدہ یاد دلانے کی کوشش کی۔
 ”مروہ بھولا نہیں تھا۔“
 ”مجھے یاد ہے آسید! میں تمہارے مقصد کی راہ میں حائل نہیں ہوں گا لیکن تمہیں کچھ انتظار کرنا پڑے
 گا۔ اس کے بعد ہم سرگرمی مجھے اپنے ساتھ پاؤں گی۔“
 ”شکریہ شاہ سکندر! مجھے یقین ہے مرا انتظار زیادہ طویل نہیں ہوگا۔“
 آسید نے ممنونیت سے کہہ کر تسلسلہ منقطع کر دیا تو اُس نے ہونٹ بیچ کر بریسپور کو دیکھا پھر
 کریدل پر رکتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں جانے کس سوچ کی پرچھائیاں اترنے لگی تھیں۔
 گوکہ جینی کے پیدا ہونے ہی اُسی وقت سے اُس کی رخصتی کی تیاریاں بھی شروع ہو جاتی ہیں۔
 اُمال دینی نے اُس کے لیے بہت کچھ غور کیا تھا۔ اس کے باوجود بہت کچھ باقی تھا۔ اور اتنے کم
 دنوں میں سب کچھ کرنا تھا کہ وہ اس بڑی اکیل لڑکی تھی۔ بچائیوں کی لاڈلی، بچائیوں کی چینی اور صحیح
 معنوں میں ماں باپ کی آنکھوں کی محنت و دل کی راحت۔
 اماں جی چچا کو بھلائی تھیں۔ اسلام آباد فون کر کے شکیل بھائی اور سیمیا بھائی کو فوراً اُسے کو کہا

اُس نے باری باری سب بچوں کو دیکھا۔ سب کے ہنٹوں میں شریر مسکراہٹ دلی تھی اور ایک دوسرے کیسوں بھی مارد رہے تھے۔ اسے ہنسی آگئی۔
 ”دیکھ لیا اے لادلوں کو، یہ آرام سے بیٹھنے والے ہیں“ سیما بھائی نے کہا اور سر جھٹک کر اپنے منہ مصروف ہو گئیں۔ جو اُس نے اشارے سے سمیٹے کو اپنے اس بلانا اور گود میں جھٹک کر آواز بن اُس سے جانے کیا باتیں کہنے لگی تھی کہ دوسرے بچوں میں بے چینی پھیل گئی کہ جو بھوہو اُن سے باتوں میں نہیں کر رہا۔ اُس نے رہا نہیں کیا تو پکار کر پوچھنے لگا۔

”بھوہو! آپ کی شادی ہو رہی ہے؟“
 اُس نے سخت سوال پر وہ جھینپ گئی تو میمونہ بھائی اُس کے پہلو میں چلکی کاٹ کر لویں۔
 ”اُمیر! تم سے پوچھ رہا ہے، جواب دو؟“
 ”جیسے جتنا ہے، بھوہو دلین نہیں گی“

وہ میمونہ بھائی کو گھورنے لگی تھی کہ ادھر سونیا نے اپنی قابلیت بھائی شروع کر دی۔
 ”اماں! میں نے لال عزا رہ بنایا ہے۔ وہ سنیں گی بھوہو، اتنی باری لگیں گی“
 ”اور دلہا کون بنے گا؟“ اُس نے یوں پوچھا جیسے کوئی ڈراما کھیلا جا رہا ہو جس پر بھوہو کے ماتھے وہ بھی بے ساختہ ہنس پڑی۔

”میں بنوں گا“ سب کے درمیان خاموش بیٹھنے والا نبیل جانے کیسے بولی پڑا۔
 ”افوہ نہیں نبیل بھائی! بھوہو کی شادی آپ کے ساتھ موڑھی ہو رہی ہے۔ وہ تو۔ وہ اچھے والے نکل میں ناں۔ اُن کے ساتھ ہوگی“
 سونیا کی بات پر وہ تینوں ادھر متوجہ ہو گئی تھیں۔

”دی! انکل دلہا بن کر آئیں گے اور بھوہو کو اپنے ساتھ لے جائیں گے، میں ناں بھوہو“
 سونیا نے بات کے اختتام پر اُس سے تائید چاہی تو وہ گردن موڑ کر میمونہ بھائی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”اس جالا کو ماسی کو سب بتا ہے۔ بڑی تیز ہو گئی ہے“
 ”کس پر ہوئی ہے؟“ سیما بھائی تعجب تھیں۔
 ”تھیر پر نہیں گئی۔ میں بہت سیدھی سادی ہوں اور اس کی عمر میں تو مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ شادی کس چیز کا نام ہے“
 میمونہ بھائی نے منہ سے ہونٹے کھلے تھے نبیل اسید کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگا۔

”بھوہو! آپ چل جائیں گی؟“
 ”ہاں!“ اُس نے چونک کر نبیل کو دیکھا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ اور بہت کوشش سے بھی اُس کی بات کا جواب دے سکی نہ کوئی اور بات، کیونکہ نبیل کے چہرے پر انجانا سا خوف تھا۔ میمونہ بھائی اور سیما بھائی بھی دیکھ رہی تھیں۔

”تا میں ناں بھوہو! آپ کہاں جائیں گی؟“ نبیل نے پھر اس کا بازو ہلا کر پوچھا۔
 ”بھوہو اپنے گھر جائیں گی بھائی! ان کی شادی ہو رہی ہے۔ ناں اور یہ تو خوشی کی بات ہے“
 ”سیما بھائی نے فقدا خوشی کا اظہار کر کے نبیل کو بہلانے کی کوشش کی۔

”اماں! دیکھو، سب خوش ہو رہے ہیں“ میمونہ بھائی بھی اپنے انداز میں شروع ہو گئیں۔ یہ اتنے اچھے لمحے پر دیکھ رہے ہو، یہ سب ہمتیاری بھوہو کے ہیں، جب تم سے ملنے آئیں گی تو یہی اچھے لمحے پر دیکھ کر آئیں گی، بہت اتراؤں گی۔ ہاتھوں میں چوڑیاں کنکھنا کر کھکھکا کر سنیں گی، ہے ناں اسید“

اور اسید کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

اور شکیل بھائی غار سے نوکری والے تھے۔ البتہ سیما بھائی کو انہوں نے اگلے دن ہی بھیج دیا۔
 سے میمونہ بھائی کو بڑا سہاوا ہو گیا۔ فرخندہ وغیرہ کے لیے شاہ سکندر نے منع کروا دیا تھا کہ بچوں کے آپارٹمنٹ میں گنجائش نہیں تھی۔ اور اُس نے تو اور بھی بہت چیزوں کو منع کیا۔ لیکن جی نہیں مانیں۔

”میری کون سی دس بیٹیاں ہیں جن کے لیے سنبھال رکھوں۔ یہ سب جو اسید کے لیے ہے۔ کے ساتھ جانے گا“

بھائیوں اور بھائیوں نے ان کی تائید کی۔ میمونہ بھائی کا کہنا تھا کہ لوگ شادی میں آکر زیادہ اس کا جہیز دیکھنے آئیں گے۔ کہ چار لائق فانی بھائیوں کی بہن کیا کچھ لے کر جائے۔

”بھوہو! آپ کو جہیز پر ٹکٹ لگا دینا چاہیے۔ سارے پیسے وصول ہو جائیں گے“
 اُس نے میمونہ بھائی کی بات سن کر شرارت سے کہا۔

بہر حال پہلا سہفہ تو سیما بھائی اور میمونہ بھائی کا بازار دین کے چرہاٹنے میں نکل گیا۔ اس کے پکٹنگ کا مرحلہ آیا تو وہ بھی اُن کے ساتھ شامل ہو جاتی کیونکہ گھر کے کام کاج اماں جی اسے نہیں دے رہی تھیں۔ اور فارغ بیٹھنا اُس کے لیے مشکل ترین کام تھا۔ اُس وقت وہ بھائی

ہاتھ بٹانے کی غرض سے اُن کے پاس آکر بیٹھی تھی کہ میمونہ بھائی اُسے دیکھ کر کہنے لگیں۔
 ”تم جب چلی جاؤ گی تو سب سے زیادہ تمہاری ہی بچی محسوس ہوگی۔ سچ مجھے تو سوچ کر دوا ہو رہی ہے۔ پتا نہیں میرے دن کیسے کیوں گے۔ آف میں تو لرزے بغیر رہ بھی نہیں سکتی“

جس سے میں کیا باتیں کر رہی تھی“ اُس نے بڑے آرام سے کہا تو میمونہ بھائی بے راز

”وہی باتیں جو مجھ سے کرتی ہیں“ اُس نے بڑے آرام سے کہا تو میمونہ بھائی بے راز

”شاہ سکندر کی؟“
 ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ اُچھل پڑی۔

”سیما بھائی پہلے ہی شاہ سکندر کا نام لیتے جلنے پر ہنس رہی تھیں۔ اُس کے اُچھلنے پر بھائی بھی اُن کے ساتھ شامل ہو گئیں تو وہ جڑ بڑسی ہو کر سوٹ کیس کھولنے لگی۔

”اُسے مت چھیرو، بڑی مشکل سے پیک کیا ہے“
 میمونہ بھائی ہنسی روک کر جھلپیں تو اُس نے سوٹ کیس چھڑ دیا اور گھٹنوں کے گرد بازو

بٹھ گئی۔ پھر روٹھا روٹھا سا انداز تھا۔ بھی بیچے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے آئے

گتے سے سمیٹے اُس کے اوپر آن گری۔ ”س کے سر سے ڈکرا یا تھا۔ ایک لحظہ کو وہ چکا لگتی“
 ”آف۔“ سیدھا سر بڑی زور سے اُس کے سر سے ڈکرا یا تھا۔ ایک لحظہ کو وہ چکا لگتی

”ایک جگہ چین سے نہیں بیٹھا جاتا تم لوگوں سے۔ ایسی کیا افتاد آن پڑی تھی کہ بھاگے“
 ”نہیں ڈانٹیں بھائی! بیچتے ہیں“ اُس نے دوسرے ہونٹے معصوم چہروں کو دیکھ کر ان کو

”بچوں کو آرام سے بیٹھا منع ہے کیا۔ چلو سب ادھر آکر بیٹھو“
 سیما بھائی نے لائن سے اشارہ کر کے سب کو ایک جگہ بٹھایا پھر انہیں ہنٹوں پر انگلی

تو اُس نے فوراً احتجاج کیا۔
 ”یہ زیادتی ہے بھائی!“

”نہیں نہیں، یہ خاموش بیٹھیں گے“ سیما بھائی دعایت برتنے کو تیار نہیں ہوئیں۔
 ”ٹھیک ہے میں انہیں اپنے کمرے میں لے جاتی ہوں“ وہ کہتے ہوئے اُٹھنے لگی

نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی، یہیں بیٹھو، بچوں نے کون سا ہادی بات

ہے۔ ابھی دیکھنے کیسے بولیں گے“

”ارے، میں سننے کی بات کر رہی ہوں، تم درود ہی پڑھاؤ، میمونہ جہانی نے سرزنش کے انداز میں کہا تو وہ دھڑکے سے بولی تھی۔“
”بسیل کا خیال رکھیے گا جہانی!“

جب تک وہ آباجی، اماں جی، بھائیوں اور مہاجرین کے حصار میں کھڑی تھی اس کی آنکھیں دوری کے خیال سے سادون برسائی رہی تھیں۔ باری باری سب نے اسے گلے لگا کر دھیروں دن ساری زندگی وہ ان مہاجرین کی غصے میں بیٹی کی تھی۔ کہیں کوئی تنگی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اور ان کرنے والی مہاجرین نے اسے شاہ سکندر کے سنگ رخصت کرتے ہوئے اس کے سارے اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ اس کا ادراک اسے باہل کی دلہن پار کرتے ہی ہو گیا تھا کہ جو ان کی برسات رہی تھیں۔ ان میں یگھت نئے سفر کی رعنائیاں سمٹ گئی تھیں۔ اور وہ یہ رہ جانے والا پرتھوئے کی بجائے اس کا دل اس شخص کی غبت پر ہوئے ہوئے دھڑکنے لگا تھا جو اسے بازو کے حلقے میں لے کر ابراہیم کی ریشیاں چڑھ رہا تھا۔
شاہ جہانگیر نے پہلے جاکر دروازہ کھول دیا تھا اور نالہ بھاگ کر دروازے کے پڑ کھڑی ہو گئی۔

”میرا تنگ کر دوں گا تو کیا کر دوں گا؟ شاہ سکندر کا انداز چڑانے والا تھا۔ جیسے اب وہ کچھ نہیں دیکھتا۔“
”میں آپ سے ہمیشہ کے لیے روٹھ جاؤں گی۔“
”اور میں تمہیں روٹھتے نہیں دوں گا۔ شاہ سکندر نے جیب میں ہاتھ ڈال کر لال لال نوٹ پھیر اس کے سامنے لہرا کر بولا۔“
”پہلے راستہ چھوڑ دو۔“
”نالہ نے راستہ چھوڑنے سے پہلے اس کے ہاتھ سے نوٹ جھپٹ لیا۔ اور بھاگ کر کھائین آن کر دیا۔“

”ہمارے بھائیوں برساؤ، میرا محبوب آیا ہے۔“
شاہ جہانگیر بے حد خاموش نظروں سے جہان کو دیکھتے لگے۔ جس کا چہرہ حقیقی مسرتوں سے رہا تھا۔
”سکندر! ملا ارادہ! انہوں نے اسے آواز دے ڈالی۔ جو شاہ سکندر نے سنی نہ ہو۔
ایک تو بیٹ کی آواز تیز تھی۔ دوسرے اس کا سارا دھیان پہلو میں مٹی آسید کی طرف تھا۔ جب سے گھٹکھٹ کے باعث جھلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

”دیکھو تمہیں شاید بھائی ملا رہے ہیں۔“
امد حسن کی امتی نے اسے آگے آگے آسید کو کھتا ہے ہوئے اس سے کہا تو اس نے فوراً گھر کو پیچھے دیکھا۔ شاہ جہانگیر امد حسن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا رہے تھے۔ وہ آسید کے کپکپ سے دبا کر ان کے پیچھے چلا گیا۔

”اب تو میں دہن دیکھ سکتی ہوں ناں؟ وہ مہری پر بیٹھی تھی کہ نالہ نے بڑھ کر بڑے اس کا گھونٹ کھٹ کھٹ دیا۔ اور بے اختیار واہ کہتے ہوئے بولی۔
”اسی لیے آپ کی تباہیاں دیکھنے نہیں دے دی تھیں کہ ہمیں نظر نہ لگ جائے۔“
لگ رہی ہیں آپ۔“

”ماشاء اللہ! نالہ کی امتی نے عقب سے ٹوکا۔
”ماشاء اللہ! ماشاء اللہ! ماشاء اللہ!“ نالہ ایک ہی سانس میں کہے گئی پھر کھٹکھٹا آسید کے ہونٹ ذرا سی مسکراہٹ کی گرفت میں آ گئے۔

”جلو اب جہان کو تنگ نہیں کرو، جاکر امد حسن سے پوچھو۔ گھر کب چلنا ہے؟“
”نالہ نے کہا۔“
”نالہ نے کہا۔“
”نالہ نے کہا۔“

”نالہ نے کہا۔“
”نالہ نے کہا۔“
”نالہ نے کہا۔“

”نالہ نے کہا۔“
”نالہ نے کہا۔“
”نالہ نے کہا۔“

”نالہ نے کہا۔“
”نالہ نے کہا۔“
”نالہ نے کہا۔“

”نالہ نے کہا۔“
”نالہ نے کہا۔“
”نالہ نے کہا۔“

”نالہ نے کہا۔“
”نالہ نے کہا۔“
”نالہ نے کہا۔“

”نالہ نے کہا۔“
”نالہ نے کہا۔“
”نالہ نے کہا۔“

میں سے کھڑے نکال کر وارش روم میں چلی گئی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ چنانچہ جب تک کہ نکلی تب بھی وہ گہری نیند میں تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ چنانچہ کب اٹھا تھا۔ اور وہ اُسے اٹھانے کے خیال سے جھجک رہی تھی۔ پھر اسی شمس وینچ میں سے نکل کر آئی تو پہلے پورے پارکمنٹ کا جائزہ لیا اس کے بعد کچن میں آکر چائے بنا کر اور چائے بناتے ہوئے اُس نے قصداً کچھ برتنوں کو اٹھانے رکھنے میں آواز پیدا کرنا شروع کیا۔ لیکن وہ بتائیں مردوں سے شرط باندھ کر سوا تھا۔ تیب وہ اُس نیند پر رشک کرتی ہوئی دونوں مگ ٹپنے میں رکھ کر لے آئی۔ اور جیسے ہی اُس کے قریب آکر برسرے رکھنے کے لیے جھکی پشت پر کھلے لائے گیلے بال اُس کے چہرے پر کھیر گئے۔

صبح بخیر! شاہ سکندر اُس کے بالوں میں سے جھانک کر مسکرایا تو وہ گھبرا کر اپنے بال بڑھائی ہوئی سیدھی کھڑی ہو گئی۔

”جائے لیجئے!“ شاہ سکندر کہنیوں پر وزن ڈال کر اونچا ہوا اور اپنے پیچھے تکیہ سیدھا کر کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھنے کے بعد اُسے دیکھ کر کہنے لگا۔

”چائے تم نے کیوں بنائی۔ تجھے اٹھا دیا ہوتا یا“

”آپ گہری نیند میں تھے!“ وہ اپنے آپ غفلتاً ہرک اور جیسے بہت خوشگوار احساس میں گھر کر بولا۔ ”میں ہاں۔“ وہ اپنے آپ غفلتاً ہرک اور جیسے بہت خوشگوار احساس میں گھر کر بولا۔

”بہلی بار میں نے بارگاہہ جیسا ہے۔ بتا دی غنت میں بارگاہے کچھ ہوش نہیں رہا ہے۔“ اور میں نے جیت کر بھی ہوش نہیں کھونے۔ وہ زیر لب مسکرائی۔ اس کی چمکیں جھلکی ہوئی تھیں۔

سر اونچا تھا۔ شاہ سکندر نے چونک کر اُسے دیکھا اور اس تمام عرصے میں پہلی بار اُس کی ذہنی رو بہ جیتے تو اب میں شاہ: میں تو بارگاہی!“

”ہارنے کا دکھ نہیں ہے تمہیں؟“ وہ بے اختیار کہہ گیا۔

”ہاں!“ وہ چونک کر حیران ہوئی پھر نیچے کارپٹ پر بیٹھنے لگا اور کہیں مسہری کا ٹکا کر ایک ہاتھ ٹوڑی کے پیچھے رکھتے ہوئے بولی۔

”آپ تو سچ ہوش کھو بیٹھے ہیں۔ پچھلے آپ جیتے، میں ہاری اور مجھے ہارنے کا دکھ نہیں ہے۔“

شاہ سکندر اپنی بے اختیار دی پر جزیرہ پر ہوا تھا۔ جیسی اُس کی بات کے جواب میں فوراً کچھ سکا تو ہاتھ بٹھا کر چائے کا مگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ تب ہی کال بیل کی آواز پر وہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں دیکھتا ہوں!“ وہ فوراً مگ رکھ کر کمرے سے نکل گیا چند لمحوں بعد میوہ بھا

سنائی دی تھی۔

”آف۔ شادی کے گھر میں اتنی خاموشی!“

وہ جلدی سے بیڑ کی چادر ہٹک کر کے قصداً دروازے کی طرف پشت کر کے بیٹھا۔

میوہ بھائی کا تھا۔ کسی کا کوئی لحاظ نہیں کرتی تھیں جو منہ میں آتا کہہ دیتیں۔

”ارے، یہاں تو گھٹا چھائی ہے!“ کمرے میں داخل ہوتے ہی میوہ بھائی کی نظر اٹھنے لگی۔

”کھلے بالوں پر بڑی تھی۔“

”دیکھو میوہ برس چکا یا!“ سیما بھائی کی معنی خیز منہ پر وہ لجا کر کھڑی ہو گئی اور روپٹے ہوئی اُن کی طرف پلٹ کر بولی۔

”آداب!“

خوش رہو۔ سدا سا گن رہو۔ اور وہ کیا کہتے ہیں دو دھوں نہاد پوتوں پھلو، کھلکھلاتی ہنسی کے ساتھ میوہ بھائی کی زبان چلی پڑی تھی۔

”اس کے ہونٹوں پر شرمیلی مسکان کھینے لگی۔ دوپٹے کا کونا دانتوں میں دبا کر بولی۔

”کچھ دعائیں بعد کے لیے بھی رہنے دیں!“

”بعد کب: یعنی بچوں کے لیے۔“ اُسے انہیں آنے تو دو بھرٹا

”اُس نے ان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں مزید بولنے سے روکا اور سیما بھائی کو دیکھ کر کہنے لگی۔

”ان کو ساتھ لانے کا کیا درست تھی۔ شاہ سکندر کے سامنے یونہی اٹھا سیدھا بولتی رہیں گی!“

”گئے کہاں شاہ سکندر؟“ سیما بھائی نے اپنے پیچھے دیکھا پھر اُسے دیکھ کر بولیں۔ ”ہم ناشتا لائے ہیں، چلو بیٹے، ناشتا کر لو!“

”نہیں بیٹے! انہیں سمجھائیں۔ یہ خاموش بیٹھیں گی۔“ اُس نے میوہ بھائی کے ہونٹوں پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”پھر اچانک خیال آنے پر پوچھنے لگی۔

”آپ دونوں آئیں کس کے ساتھ ہیں؟“

”عدیل کے ساتھ۔ اور دیکھو اُس نے کہا بھی تھا کہ زیادہ دیر نہیں رکتا اور ہم ابھی یہیں کھڑے ہیں۔“

”عدیل کا نام لیتے ہیں؟“ سیما بھائی جلدی جلدی کہتے ہوئے میوہ بھائی کا ہاتھ کھینچ کر کمرے سے نکلے۔

”پھر ب نے ساتھ ناشتا کیا۔ اس کے بعد دونوں بھائیوں نے انہیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔

”جائے شاہ سکندر نے پہلے سے طے کر رکھا تھا یا اسی وقت سوچ کر کہنے لگا۔

”اس وقت آپ کے ساتھ جانا اگر رسم، رواج میں شامل ہے تب بھی مجھے مذرت کرنی پڑے گی۔ کیونکہ ہم آج لاہور روانہ ہو رہے ہیں۔“

وہ چونکی ضرور لیکن یوں بن گئی جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

”ہنرمون کے لیے لاہور!“ میوہ بھائی کو جانے کیوں تعجب ہوا۔

”فرسٹ اسٹےس پہا قیام۔ لاہور اُس کے بعد فری، ایڈیٹ آباد سوات اور جہاں سیر کریں گی۔“

شاہ سکندر نے دمکش مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے اُسے دیکھا تھا۔

”اسلام آباد ضرور آنا ہے ہمارے پاس!“ سیما بھائی نے کہا تو میوہ بھائی فوراً احتجاج کرتے ہوئے بولیں۔

”یہ غلط ہے۔ جو دور ہیں، ان کے پاس آپ پہلے جائیں گے۔“

”آپ کے پاس تو پھر آنا چاہتا ہوں، کیا کیوں؟“

”جی ہاں! اُس نے بس جی کہنے پر اکتفا کیا۔

شاہ جہانگاہ وقت شب کے بعد شاہ لور پہنچے تھے۔ اس لیے صبح بہت دیر سے سوکر اٹھے۔ اور جب معلوم ہوا کہ بابا جہان دو تین بار ان کا پوچھوا چکے ہیں تو بہت جلدت میں ناشتا ختم کر کے میوہ بھائی کے کمرے میں چلے آئے اور انہیں سلام اُن کے ہونٹوں میں تھا کہ بابا جہان پوچھنے لگے۔

”اگر اُسے اُس کی شادی؟“

”جی باباجان! شاہ جہانگیر بڑے مخلوط انداز میں مسکرائے۔
 ”کوئی مسئلہ تو نہیں سوا؟“
 ”نہیں، سب ٹھیک ہوگا۔ بہت خوش تھا سکندر، میں نے اُسے پیسے بھی دے دیے اور ساتھ آج کی تاریخ کے ٹکٹ بھی، میرا خیال ہے ایک مہینہ ضرور گھومنے پھرنے میں گزارا۔
 شاہ جہانگیر کا انداز رورورٹ پیش کرنے والا تھا۔
 ”ہوں، باباجان نے پُر موع انداز میں سر ملایا پھر انہیں دیکھ کر کہنے لگے، ”ٹھیک ہے فریض پورے دو گھونٹے پھرنے دو، کرے اپنے شوق پورے، مہینہ دو مہینہ چھ مہینے، پیسے کی تنگی نہیں ہونے دینا اُسے، سمجھ رہے ہوں؟“
 ”جی باباجان! لیکن کیا مہر النساء اتنا عرصہ خاموش رہ سکے گی؟ شاہ جہانگیر نے خدشہ ظاہر کیا، مہر النساء کو ناامنی کا شادی کا معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ اُسے خاموش کرنا مشکل نہیں ہے۔ البتہ اُسے سکندر کی شادی کا معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ تم یہی ظاہر کرنا کہ تنہا رہی ابھی اُس سے ملاقات نہیں ہوئی، ایک دو مہینے کی بات ہے۔“
 ”میکے کیل جانے کی اور بچے کی پیدائش تک وہیں رہے گی، اس کے بعد میں ہم سنبھال لیں گے کوئی آئسا مسئلہ نہیں ہے۔“

باباجان سر سے مہر النساء کو اہمیت دینے کو تیار ہی نہیں ہوئے۔
 ”اصل مسئلہ وہ شہزادی ہے، کیا بتاتا تھا تم نے کتنا بڑھتی ہوئی ہے؟“
 ”ڈاکٹر نے، شاہ جہانگیر کی نظروں میں آئیں، اس کا چہرہ گھوم گیا۔ جس کی آنکھوں میں ہلاک دہانہ ڈاکٹر، شہزادی کی ڈاکٹر بھرتے پڑے ہیں۔ ایک کم ہو جائے گی تو شہزادوں کو فرق تو نہیں لگے گا۔“

سوچتے ہوئے انداز میں باباجان جیسے اپنے آپ سے لوے تھے۔
 شاہ جہانگیر چونک کر انہیں دیکھنے لگے، تو چھ دیر کی خاموشی کے بعد باباجان موضوع پر گئے۔
 ”تمہیں اس بار الیکشن میں کھڑا ہونا ہے، میں نے راول صاحب سے بات کر لی ہے۔“
 مضبوط ہاتھ اور مضبوط بھی، گزشتہ بار انہوں نے یونس پر بہت زور دیا تھا کہ کم از کم اس سے توڑ پھڑے لیکن یونس کو ساست سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے، تمہیں تو بے ناں! شاہ جہانگیر بے ساست مسکرتے، جانے ان کی مسکراہٹ میں کس بات کا اظہار تھا۔ جیسے ہی سمجھ گئے اور فہمیدہ لگا کر لوے تھے۔

”تم کامیاب سیاست دان ہو سکتے ہو؟“
 ”میں جیوں، بی بی جان صبح سے پوچھ رہی تھیں، ان سے مل لوں؟“
 شاہ جہانگیر اٹھ کھڑے ہوئے اور باباجان کی اجازت مننے پر ان کے کمرے سے بی بی جان اس وقت بڑے کمرے میں ہوتی تھیں، شاہ جہانگیر آبی کمرے جا رہے تھے سے نکل کر مہر النساء سامنے آکھڑی ہوئی، اور بے حد خاموش نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔
 قصداً انہیں بن کر لوے۔

”کیا بات ہے مہر؟“
 ”شاہ کا کوئی آئسا مسئلہ؟“ مہر النساء نے بغیر جھکے براہ راست ان کی آنکھوں میں دیکھا کیا تو ایک لمبو کو وہ ٹھٹھک گئے کیونکہ ایسی بے باک جرأت کا مظاہرہ اس گھر کی عورت نے نہیں تھی۔ بیٹیکل سنبھل کر لوے تھے۔
 ”مل جائے گا تمہارے شاہ کا آئسا۔“
 ”کے؟“ مہر النساء کا استفسار جا رہا تھا۔ جیسے صبر اور ضبط کی حد ختم ہو رہی ہو۔

”سکونش کی کورت رہا ہوں، دیکھو کب کامیابی ہوتی ہے؟ شاہ جہانگیر اس شہنشاہ کی سانسے لے لیں غموس کرے۔ آگے بڑھ گئے، اور بڑے کمرے میں داخل ہوئے تک اس کی چھٹی بی نظریں ابیں گردن پر غموس ہو رہی تھیں۔“

جب زندگی مہر بان ہو جائے تو جانے وقت جہانگیر کیوں لگتا ہے، خوبصورت دلفریب لمبے لمبے چلے جاتے ہیں، ان دنوں لاہور کا موسم بھی غضب کا تھا اور ادھر دل کی لہریں میں بھی جہادیں سے قبوین پر تھیں۔ سارا دن ان کا گھومنے پھرنے میں گزار جانا، تاریخی مقامات میں وہ سب سے وہ شاہی قلعے سے شائر ہوئی تھی، اور وہاں سے آنے کے بعد بھی اس کا ذہن وہیں ٹھٹھک رہا۔
 ”سچ مجھے ایسا لگا جیسے جنت کا کوئی گوشہ زمین پر اتر آیا ہو۔ سبزے اور پھولوں پر کیسا نکھار، کیا اس زمانے میں بھی یہ اتنا خوبصورت تھا؟ وہ جن خوبصورتیوں کو شہرت سے غموس کر رہی تھی، اس وقت انہی کا قصہ لگ رہی تھی۔
 ”کس زمانے میں؟“ شاہ سکندر بڑے اشتیاق سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”بادشاہوں کے زمانے میں۔“
 ”نہیں، شاہ سکندر نے اُسے یقین سے کہا کہ وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔
 ”جس پر وہ مسکرا کر لولا، اس وقت تم نہیں تھیں اور ساری خوبصورتیوں کا تصور تمہارے ساتھ رہتا ہے۔“
 ”اچھا۔“ وہ ڈرا سا ہنسی۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں، اس سے پہلے تو مجھے یہ جگہیں بلکہ دنیا میں کہیں اتنی خوبصورتی نظر نہیں تھی، اور آج مجھے ہر شے حسین لگ رہی ہے، اس لیے کہ کسی۔۔۔ بھی سمت اٹھنے سے پہلے نظر اس کے چہرے پر پڑتی ہے۔“
 ”تمہاری آنکھوں کی گہرائیوں میں اُس کی بات نے جانا تھا کہ سمندر کے اندر کتنے سیپ چھپے۔“

”تمہاری ہلکوں کی جھالروں نے اول روز تین دھوپ میں مجھے پُر کیف چھاؤں کا احساس بخشا تھا۔“
 ”اور میں نے کلیاں چٹکیں ہوں بارہا دیکھی تھیں لیکن ان کی خوبصورتی کا ادراک تمہاری مسکراہٹ جتنے کے بعد ہی ہوا تھا۔“
 ”اُس کے لیے میں جہلوں کی شدتیں تھیں اور لوری طرح اُس کی محبت میں ڈوب کر لوٹ رہا تھا۔ وہ ہم اُسے دیکھے گئی، جبکہ دل اتنی محبت پر رکھنے لگا تھا، اور پھر بے اختیار اُس کا ہاتھ آنکھوں پر رکھ دیتی۔“

”لیکن کون سا سکندر! میں مر جاؤں گی!“
 ”اُسے؟ شاہ سکندر نے حیران ہوتے ہوئے اُسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا، ”تم رونے لگا لگیں؟ کیا میری کسی بات سے تمہیں دکھ ہوا ہے؟“
 ”اُس کے اُسو اور شہرت سے بہہ کر اس کی قمیص میں جذب ہونے لگے تو اپنے سینے پر غمی غموس سے ہی شاہ سکندر اُس کے گرد بازوؤں کا حلقہ تنگ کرتا ہوا بولا۔“

”بتاؤ اُس؟ میں پریشان ہو رہا ہوں۔“
 ”مجھے ڈر لگ رہا ہے، اُس کی آواز آنسوؤں میں جھجک رہی تھی۔
 ”کس سے؟“
 ”شاہ سکندر نے ایک بل میں اُسے خود سے الگ کر کے اُس کا چہرہ اپنے منہ کیاتو وہ ڈرا سا نفی میں سر ہلا سکی۔“

”بھڑ“ وہ اچانک کسی خیال سے غائلے ہو کر بولا۔
 ”وقت سے، جس نے میری جھولی میں اتنی غبت، اتنی خوشیاں ڈال دی ہیں اور وقت کا اعتبار۔“
 وہ جھولیوں سے انھیں صاف کرتے ہوئے بول رہی تھی۔ شاہ سکندر اس کا مطلب سمجھ کر اسے شانت ہو گیا۔ اور پھر اسے اسے بازوؤں کے حلقے میں لے کر لولا تھا۔
 ”وقت خود کتنے پہلو بدلے، میری ہمت میں کسی کمی نہیں ہوگی، تمہیں مجھ پر اعتبار رہے کہ نہہ“
 ”آپ پر تو اپنے آپ سے بڑھ کر اعتبار ہے۔“
 ”بھر وقت سے کیا ڈرنا۔ چلو منہ دھو کر فریض ہو جاؤ۔ میں چائے منگواتا ہوں۔ اور اس بعد ہمیں کیا کرنا ہے؟“
 شاہ سکندر نے خوشگوار موڈ میں آکر فضا کو کھیر بدل دیا۔

”یکٹنگ۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”جناب اور پہلے ہم مری جائیں گے۔ شاہ سکندر نے اپنا اگلا اسٹیشن بتایا تو وہ دائیں کی طرف جاتے جاتے ٹوک کر بولی۔
 ”اسلام آباد کیوں نہیں؟“
 ”اسلام آباد۔ ہم صرف ہمارے بھائی بھائی سے ملنے جائیں گے، وہاں قیام کرنے کا پروگرام نہیں ہے۔“
 شاہ سکندر اپنا پروگرام بتا کر لوں دیکھنے لگا جیسے وہ اس کے پروگرام میں کوئی رد و بدل کر رہی ہو۔ لیکن وہ جانتے کیوں سوچ کر خاموش ہو رہی تھی۔

مری میں ان کا استقبال سرد ہواؤں نے کیا تھا۔ اس کے بعد بارش کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ہواؤں کے کمرے سے نکل نہیں سکے۔ سردی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ سارا دن سامنے بیٹھ کر جانے کب کب کے واقعات دہرائے گئے۔ اور جب وہ اپنے لندہ کے واقعات سن رہا تھا۔ تب وہ درمیان میں بول پڑی۔
 ”پہلے مجھے اپنے گھر کے بارے میں بتائیں۔“
 ”گھر کے بارے میں کیا بتاؤں؟“ وہ کہہ کر سرکٹ سنگھنے لگا۔
 ”میرا مطلب ہے گھر والوں کے بارے میں، بابا جان، بی بی جان اور کون کون ہے؟“
 ”اُس نے جتنے اشتیاق سے پوچھا۔ وہ اس قدر سرسری انداز میں بتانے لگا۔
 ”سب سے بڑے یونس بھائی اور ان کے بیگم اور ان کے چار بچے جن میں سے تین: کافونٹ میں ہوتے ہیں۔ پھر آغا نور بالو ہیں جو اپنے گھر میں ہیں۔ ان کے بعد جہانگیر، تم مل چکی ہو۔ ان کے تینوں بچے بھی یہیں ہیں۔ پھر میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں اور میرا بھی آٹھ نہیں۔“

وہ بری طرح بھیپ گئی۔ لیکن وہ اسی روانی سے بول رہا تھا۔
 ”آخر میں تم بالو تھے وہ بھی اپنے گھر کی سہیلی۔ یعنی اس وقت حویلی میں زیادہ افراد یونس بھائی، بھائی اور ان کی چھوٹی بیٹی جہانگیر بھائی، بھائی، بابا جان، بی بی جان اور مہر النساء، مہر النساء کون؟“ وہ اس اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔
 ”جے خدا کو کھلا کر شاہ سکندر نے گھٹکے کا جھٹکا ہوا سرا ہوٹوں سے لگا لیا تھا۔“



”اب“ آسے نے جھٹکے کے انداز میں اس کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر ایش برے میں پھینکا پھر اس کے ہونٹ پر ہنسا سا ایک دیکھ کر خفگی سے بولی۔ ”یہ کیا کیا آپ نے۔ سارا ہونٹ جلادیا۔“
 ”بس وہ۔“ وہ دھیانی میں سگریٹ الٹا وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے نظریں چا کر بولا۔
 ”بس آج سے سگریٹ بند؟“ وہ قطعیت سے کہہ کر غالباً ڈسٹ بن میں ڈالنے کی عرض سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھانے کی بجائے شاہ سکندر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
 ”اوں بول، یہ نہیں چھوڑ سکتا۔ اب خدا را یہ مت کہہ دینا کہ اسے نہیں چھوڑ سکتے تو مجھے چھوڑ دیں۔“
 وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔
 ”یہ تو کہہ سکتی ہوں کہ سگریٹ دھیان سے پیا کریں۔“

”سارا دھیان تو کم چلا لیتی ہو“ شاہ سکندر بڑی خوبصورتی سے اس کا دھیان بنا کر خود بھی اطمینان سے ہو گیا تھا۔
 ”اگلی صبح بارش ختم ہو چکی تھی لیکن بادل اسی طرح موجود تھے۔ ناشتے کے بعد وہ کچھ دیر گلاس ونڈوسے باہر کا نظارہ کرتی رہی۔ پھر کراخا لے کر بیٹھ گئی۔ اس وقت ذوالفقار علی بھٹو کا دور ختم ہو رہا تھا اور نئے الیکشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سارا اخبار اپنی خروں سے بھرا پڑا تھا اور اسے سیاست سے دلچسپی نہیں تھی لیکن ہر شہری کی طرح یہ ضرور جانتا تھا کہ آئندہ حکومت کس کی ہوگی۔
 ”کوئی خاص خبر ہے؟“ شاہ سکندر واٹس روم سے ڈریس اپ ہو کر نکلا تھا۔ اسے اخبار میں معروف دیکھ کر روہی پوچھ لیا۔
 ”تمام سیاسی جماعتوں نے اتحاد کر لیا۔ ادھر بھٹو صاحب کا کہنا ہے کہ سب مل کر بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ عوام ان کے ساتھ ہیں۔“ وہ اور بھی آواز میں سرخیاں بڑھنے لگی۔
 شاہ سکندر اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر بیٹھے ہوئے بولا۔
 ”ماؤنٹ تیار ہو جاؤ۔ اس سے پہلے کہ دوبارہ بارش شروع ہو مومن گیلانی کے گھر پہنچ جائیں۔“
 ”یہ کون ذات شریف ہیں؟“ اس نے پوچھا تو وہ جو اخبار پر نظر پڑا دھڑکنے لگا تھا، سرسری انداز میں بولا۔

”یہ لودست بہ محسن۔ آکسفورڈ میں ہم ساتھ پڑھتے تھے۔“
 آسے نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور جونی کے بل کھولتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اس نے تیلر بھٹے میں دیر نہیں لگائی اور جب وہ دونوں ہوٹل سے نکلے اس وقت بھی بادل گھر گھر کر رہے تھے۔ کچھ نامعلوم بدلے کرنے کے بعد شاہ سکندر نے نیکی کو اشارہ کیا تھا۔
 پھر پہلے مرحلے پر محسن گیلانی بہت پر خوش انداز میں شاہ سکندر سے بغل گیر ہوا لیکن جب اس کا تعارف ہوا تو فوراً ناراض بھی ہو گیا۔
 ”یارا تم نے شادی کر لی اور مجھے خبر تک نہیں کی۔ ایمان سے اگر بھائی کا خیال نہ ہوتا تو میں نہیں کہنے کے لئے نکال دیتا۔“

”پہلے میری بات سن لو مجھے شک نکال دینا۔ شاہ سکندر دھیرے سے اسے رام کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میری شادی اس طرح نہیں ہوئی جیسے تم سمجھ رہے ہو۔ میرے اپنے گھر سے کوئی شریک نہیں ہوا۔“
 ”لو میں تو میرے بھائی محسن نے قدمے حیرت سے پوچھا۔“

شاہ سکندر نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا اور آسے نے تقدیر انجان بن کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔
 ”میرے دوست محسن موسٹ ویکم کہتا ہے۔“ بھٹو میں امان کو بلاتا ہوں۔ ”محسن ساری ناراضگی ہواں کو فرشتہ ملی سے بولا۔ پھر کمرے سے نکل گیا تو وہ اس سے کہنے لگی۔

کہا ضرورت تھی انہیں یہ سب بتانے کی تو نہ جانتا تو یہ میرا بہت برا حشر کرتا۔ ویسے کوئی غلط بات تو نہیں کہی میں نے۔
شاہ سکندر نے اُسے غور نظروں سے دیکھا تو وہ جھپٹ کر اس سے دودھ ہٹ کر کھڑی ہو گئی
محسن اپنی والدہ کے ساتھ اندھا یا۔ اور اس نے کھڑے دیکھ کر تعجب سے بولا۔

”تم ابھی تک کھڑے ہو۔ ارے کم از کم بھائی کو تو غافلہ
”السلام علیکم“ شاہ سکندر نے محسن کی بات ان سنی کر کے اس کی اماں کو سلام کیا تو امیر ز
فوراً اُس کی قید کر کے اور اس کے بڑے کران کے گلے لگ گئی۔

”جیتی رہو خوش رہو اللہ عمر دراز کرے“ اماں نے دھیروں دعا میں دیں۔ پھر اُسے اپنے
بھاکر پوچھنے لگیں: ”شاہ پر سے آ رہی ہو۔ کیسی ہیں تمہاری بی بی جان اور وہ ان کی بی بی شہر
ہی“ کچھ گھبرا کر وہ بس یہی کہہ سکی۔

”میں ایک بار بھی کبھی تمہارے سسرال۔ کوئی چار سال پہلے کو کئے ہیں“ بڑی بی بی ذہن پر
ہوئے تبتانے لگیں: ”ماشاء اللہ بڑے مستدار بڑے مہمان نواز لوگ ہیں۔ بڑی خاطر مدارت کی تم
نے ہماری۔ پھر میرے محسن کی شادی پر تمہاری ساس آئی تھیں۔ بہت اچھی خاتون ہیں“

”جی“ وہ ابھی بھی گھبرا رہی تھی کہ کہیں بڑی بی بی ان کے بارے میں اُس سے کوئی سوال نہ
”تم ان کی سب سے چھوٹی بہنوئی ہو“ بولا۔
”جی اور آپ کی بہنوئی کہاں ہے؟“ اُس نے فوراً روٹے محسن ان کی طرف موڑ دیا۔

”وہ ہیں اپنی پہن کے گھر گئی ہے۔ میں نے بولا ہے اُسے ابھی آئی ہوگی“ ابھی بات ان
ہونٹوں میں تھی کہ محسن کی بیوی نے کوئٹل میں دباے دروازے سے پوچھتے ہوئے آگئی۔
”کون آیا ہے۔ ارے سکندر بھائی۔ السلام علیکم“

”آپ آتی سردی میں کہاں گھوم رہی ہیں؟“ شاہ سکندر نے سلام کا جواب دینے کے ساتھ
”میں نہیں گھوم رہی۔ یہ بچہ لکھا رہا ہے مجھے“ وہ بچے کو محسن کی گود میں ڈالتے ہوئے بولا
نے فوراً امیر کی طرف اشارہ کیا۔

”بھلے بھائی سے ملو، وہ اماں کی باتوں سے بھر پور رہی ہیں؟“
”تجانی؟“ وہ فوراً امیر کی طرف متوجہ ہوئی لیکن اُس کی طرف بڑھنے سے پہلے سوالیہ نظروں
کو دیکھا تو وہ مسکرا کر بولا۔

”بھگ سکندر حیات“
امیر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور اُس سے مل کر خوشی کا اظہار کیا۔
”بڑے بے مروت ہیں سکندر بھائی۔ یعنی اپنی شادی میں نہیں بلایا۔ خیران سے تو
منوں کی پٹیلے بنا ڈجائے وغیرہ بھی پی یا نہیں؟“ وہ امیر کو پسندیدگی کی نغز سے دیکھ رہا
”نہیں بیٹی! پروین کو تو میں نے نہیں بلانے بھیج دیا تھا۔ چائے کون بناتا؟ اماں نے چا۔
کا سبب بھی بتایا۔

”یہ تو زبانی ہے مہانوں کے ساتھ؟“ وہ کہتے ہوئے جلتے لگی پھر غالباً امیر کے ہر ہونے کا
کے اُسے دیکھ کر بولی۔ ”مہرو! تم بھی آ جاؤ۔“

امیر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کسے مخاطب کر رہی ہے جبکہ دیکھ اُسے رہی تھی۔ کچھ شش
اپنی طرف اشارہ کیا تو وہ کہنے لگی۔

”اماں کی باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی“ میرے ساتھ آؤ
اُس نے شاہ سکندر کو دیکھا وہ محسن کے ساتھ سیاست پر بات کر رہا تھا تب وہ اماں
کرتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

”ابھی آپ نے مجھے مہر و کہہ کر بکا رکھا۔ میرا نام مہر و تو نہیں ہے“

”کچن میں آتے ہی امیر نے اُس سے کہا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی پھر فوراً سنبھل کر ہنسنے ہوئے بولی۔
”سوری، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اب جلدی سے اپنا نام بتاؤ تا کہ دوبارہ غلطی نہ ہو“

”امیر!“
”اچھا نام ہے“ وہ پلٹ کر چو لہا جلائے لگی تو امیر کو لگا جیسے وہ اس کے اگلے سوال سے بچنے کی
فاطمہ کو ٹوٹتی ہے اور اگر یہ پہلی ملاقات نہ ہوتی تو وہ سوال ضرور کرتی۔

شاہ سکندر نے کہا تھا کہ اُس کا اسلام آباد میں قیام کا کوئی پروگرام نہیں اور اُس وقت وہ بھی
ماوش ہو رہی تھی۔ ابھی بھی اُس نے سکندر سے کچھ نہیں کہا۔ خود ہی سوچ رہی تھی کہ اس طرح خوشیل
بھائی اور خصوصاً سہا بھائی ناراض ہوں گی کیونکہ انہوں نے بہت اصرار سے بلایا تھا اور جلتے شاہ سکندر
تو اسلام آباد پھرنے پر راضی تھے۔

”ہیلو کس سوچ میں ہو؟“ شاہ سکندر نے اُس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ اُسے دیکھ
کر ذرا سا سراسیمہ ہوئی۔ آخر یہ اُسی وقت کیوں بھاگتا ہے جب ہم اسے روکنے
کی خواہش رکھتے ہیں؟

”یہ تو وقت سے پوچھنا بڑے گا۔ ویسے تم اسے روکنا کیوں چاہتی ہو؟“ شاہ سکندر نے غور سے
نوں میں دبا کر بولا۔

”روکنا نہیں چاہتی۔ بس یہ بے فکری کے لحاظ کچھ طویل ہو جائیں۔“ وہ برف ممی میں دبا کر اوپر
چلتے ہوئے بولی تو شاہ سکندر قدرے رک کر کہنے لگا۔

”یہ تو ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ ہم کچھ دن اور یہاں رک سکتے ہیں بلکہ جب تک تم چاہو
”وہ بے فکری کا غلط یہاں دماں سے نہیں ہے شاہ سکندر؟“ وہ اُس کی بات پر غور سے دیکھتی ہوئی بولی تو وہ
کہاں لگا۔

”کبھی کبھی تم بہت گہری باتیں کرنے لگتی ہو۔ میں گھبرا سیدھا سادہ بندہ۔ پریشان ہو جاتا ہوں؟“
”پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے؟“ وہ ہنسی۔

”پریشانی کی بات یہ ہے کہ تم بہت دُور نکل آئے ہیں اور یہاں سے کوئی ٹیکسی وغیرہ بھی نہیں
”جی“ شاہ سکندر نے تجھے مرکز دیکھنا اُٹھنے بولا۔
”یہاں سے ٹیکسی لینے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ سامنے کا نوٹ نظر آ رہا ہے۔ چلیں پہلے بیچوں
میں لیں“

اُس نے سامنے اسکول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو شاہ سکندر اندر ہی اندر حیرت زدہ ہو کر بولا۔
”بیچوں سے مل کر کیا کرو گی۔ بہت شرارتی ہیں جیسے تمہارے بچے بھتیجیاں بلکہ اُن سے بھی زیادہ۔
”یہ سب سوالوں سے نہیں پریشان کر کے رکھ دوں گی؟“

”میں پریشان نہیں ہوں گی۔ بس آپ چلیں؟“ اُس کا اشتیاق فطری تھا۔ مجبوراً شاہ سکندر نے
بارڈل صاف کی۔

غالباً شدید سردی کے باعث ہی اسکول کے لان اور برآمدے میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ
پلک کے برآمدے میں چوکیدار مل گیا۔ جس نے شاہ سکندر کو دیکھتے ہی سلام کرنے کے ساتھ
”نیک روم“ کا دروازہ کھول دیا تھا۔

”یہاں آئے ہی تجھے اپنا بچپن یاد آ جاتا ہے؟“ شاہ سکندر نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہے
”جیہاں بابا مہمان جمعہ سے ملنے آتے تھے تو میں کتنی دیر ان سے غبار ہتا تھا کہ انہوں نے مجھے
”میں چھوڑ دیا ہے۔ پھر میں ان کے ساتھ جلتے کو چلتا تھا تو وہ مجھے ہلاتے ہلاتے پریشان
”اُس نے کہے لیکن اُس وقت تک نہیں جلتے تھے جب تک میں بہل نہیں جاتا تھا اور خوشی سے

”شاہنشاہ بننا اچھے تالہ ہے، بہت اچھے تالے ہو، میوز بھائی نے خوش ہو کر کہا اور اسے
 کر اماں جی کو روت دیکھا جسے بہت مشکل مرہڑ سر کر لیا ہو۔
 خوش رہو دلہن! اللہ تعالیٰ عمر دراز کرے۔
 اماں جی کے دل سے دعا میں نکل رہی تھیں۔ میوز بھائی کی آنکھوں میں ہر گز نہیں جلدی رہا
 لگا کر کمرے سے نکل گئیں اور دوپٹے کے پوسے آنکھیں صاف کرنے لگیں۔
 کیا بات ہے میوز! اور صبر سے گزرتے بڑے بچھا ہنٹک کر دنگ گئے۔
 جی! ”میوز بھائی نے چونک کر ہاتھ نیچے کر لیے، ”کچھ نہیں بڑے بھینا۔“

”نبیل کی طبیعت اب کیسی ہے؟“
 ”قدرے بہتر ہے۔ ابھی دوا پلائی ہے اُسے۔ آپ دیکھ لیں۔ میرا مطلب ہے وہ جاگ
 وہ بڑے بھینا کے ملنے پونہی کر رہا جاتی تھیں۔
 ہوں! بڑے بھینا جانے کیا سوچتے ہوئے اماں جی کے کمرے کی طرف دیکھنے لگے تو مورق
 جان کر وہ وہاں سے تھکے لگی تھیں کہ بڑے بھینا اچانک مڑ کر بولے۔
 ”سنو۔ وہ۔ اگر زحمت نہ ہو تو ایک کپ چائے۔ میں ادھر ڈرائنگ روم میں ہوں
 بھینا بیٹھ کر بھی کام کے لیے کہتے ہوئے جھجکتے تھے۔

”کوئی اور بھی ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی مہمان؟“ میوز بھائی نے رگ کر پوچھا۔
 ”نہیں! بڑے بھینا اختصار سے کام لیتے آگے بڑھ گئے تو انہوں نے کچن میں جاتے سے پہلے اپنے
 میں جھانک کر دیکھا۔ آخر ادھر سونیا اپنا بوم ورک کر رہے تھے اور عمر جو لے میں آرام سے تھا۔
 طرف سے ملٹن ہو کر انہوں نے چائے بنائی اور کپ بڑے میں رکھ کر بڑے بھینا کے پاس لے کر آ
 انہیں دیکھتے ہی وہ سیدھے ہو بیٹھے۔

”بہت تکلیف دیتا ہوں میں نہیں۔“
 ”واقتی! میوز بھائی نے بے ساختہ کہہ کر بچلا ہوٹ دانتوں میں دھالیا اور جلدی سے ٹو
 جانا بلکہ بھاننا چاہتی تھیں کہ بڑے بھینا سامنے اشارہ کر کے بولے۔

”بھٹو۔ مجھے کچھ بات کرنی ہے۔“
 ”الٹی رحم! وہ جتنی زندہ دل تھیں اتنا ہی ان کا دل کمزور بھی تھا۔ یوں سہم کر بیٹھیں جیسے
 ان کی کلاس پہلے والے ہوں۔

”میں نبیل کی طرف سے پریشان ہوں! بڑے بھینا چائے کے دو تین سپینے کے بعد
 ”اُس کی ماں کا کئی بار فون آچکا ہے۔ وہ چاہتی ہیں۔ نبیل کو کچھ دنوں کے لیے ان کے پاس
 جائے۔“

”آپ نے انہیں بتایا نہیں کہ نبیل بیمار ہے؟“ اس سنجیدہ موضوع نے میوز بھائی کو ایک
 کر دیا تھا۔

”بیماری کا سن کر ہی تو کہہ رہی ہیں بلکہ دوا کر رہی ہیں کہ ماں سے بہتر اُس کی کوئی دیکھا
 کر سکتا۔ ان کا دوا اچھ ہے لیکن خود ان پر صادق نہیں آتا! بڑے بھینا نے تاسف سے کہہ کر
 بیچ لے کر قدرے توقف سے میوز پوچھنے لگیں۔

”پھر آپ نے کیا سوچا ہے؟“

”جنوری ہے۔ بیچنا پڑے گا نبیل کو۔ اور میرا خیال ہے نبیل جانے کے لیے تیار بھی ہو جائے
 البتہ اماں جی۔ انہیں بچانا بہت مشکل ہے۔ وہ دوتے تھی ہیں اس لیے میں ان سے ا
 کر سکتا۔ تم کہو ان سے۔
 بڑے بھینا نے یہ فتنہ داری انہیں سوچ کر سچ اچ انہیں مشکل میں ڈال دیا تھا۔ کتنی
 کے بعد پوچھنے لگیں۔

”میں کیا کہوں اماں جی سے؟“
 بڑے بھینا اپنی سوچ میں تھے۔ اُن کی بات سنی ہی نہیں۔ البتہ آواز پر چونک کر دیکھنے لگے تو وہ
 ت فہم کرنے کے بجائے اُٹھ کھڑی ہوئیں اور خالی کپ بڑے میں رکھ کر اٹھاتے ہوئے بولیں۔
 میں کو شش کرتی ہوں!۔
 ہاں دیکھو، کل شاید بیل خود بچے کو لینے آجائیں۔ اس سے پہلے اماں جی کو ذہنی طور پر تیار کر لینا!
 بڑے بھینا نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے نکل آئیں۔

اماں جی مسلسل دو روزی تھیں اور رونا اس بات کا نہیں تھا کہ نبیل ماں کے ساتھ جلا گیا تھا بلکہ اُس
 ان کی بے پرواہیاں رولا رہی تھیں۔ آٹھ سال وہ عورت اس گھر میں جس طرح نبیل کو نظر انداز کرتی
 تھی۔ وہ سب کے سامنے تھا پھر بھی سب خاموش مٹا شامی بنے ہوئے تھے۔
 اماں جی آپ خواہواہ روز رہی ہیں۔ ہم نے نبیل کو زبردستی تو نہیں بھیجا۔ آپ کے سامنے اس
 فوجانے راکھ کی ٹاپا ہر کی تھی!۔

اماں جی کی مسلسل گرہ وزاری سے بڑے بھینا زچ ہو کر بولے تھے۔
 ”ارے وہ تو بچہ ہے۔ تم تو بچے نہیں ہو۔ اچھی طرح جانئے ہو کہ وہ عورت اس کی دیکھ بھال نہیں کر
 سکتی۔“ اماں جی کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھیں! ”اُس نے تو بھی ہنسنے لپٹنے نہ کچھ نہیں لگایا تھا۔
 بچہ کا کیا خیال کرے گی!“

آپ کی بات ٹھیک ہے میری ہم کچھ نہیں کر سکتے! بڑے بھینا نے بات ختم کرنے کی عرض سے
 دیا جس پر اماں جی تاسف سے بولیں۔
 ”تم کچھ کہتے تو یہ نوبت ہی کیوں آتی!“
 بڑے بھینا کا جہرا کیلخت سرخ ہو گیا۔

”بس کتنی اماں جی! دو چار دن کی تو بات ہے! عدل سے بڑے بھائی کی لا جارہی دیکھی نہیں گئی۔
 ”ابول بڑے۔“ ”بیلہ کچھ بھی سمجھی نہیں! ہر حال نبیل کی ماں ہیں۔ ایسے دھوپ میں نہیں ڈال دیں
 اسے۔“

اماں جی کو غالباً احساس ہو گیا تھا جب ہی خاموش ہو رہیں۔ اور اب جی جو اس ٹکڑا کے دوران
 شش تھے انہوں نے پہلے ہنگامہ اٹھ کر اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے بعد گویا خود کو بولنے پر تیار
 پھر بڑے بھینا کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”غش میاں! تم نے باہر جانے کی بات کی تھی۔ پھر کیا ارادہ بدل گیا تھا راز؟“
 ”نہیں۔ بس اپنی باری کا انتظار کر رہا ہوں! بڑے بھینا نے کن انہیوں سے اماں جی کو دیکھا جو پوری
 نہ متوجہ ہو گئی تھیں۔

”کیا مطلب؟“ اب جی نے پوچھا تو وہ تعصیل بتاتے ہوئے کہنے لگے۔

”ہماری فرم کی ایک شاخ جدہ میں قائم ہوئی ہے۔ اور اسے ایک بڑا پروڈیکٹ بھی مل گیا ہے
 اس سے کچھ لوگ تھاپکے ہیں۔ ہم یہاں سے نئی لکیر بھرتی کر کے بھیج رہے ہیں۔ جب یہ سلسلہ
 ہو گا تو کم از کم ہمارے باری آئے گی۔ تین چار سال کا ایکریٹ سہ ہے۔ اس کے بعد کوئی نیا۔
 جلد مل گیا تو اس کے لیے ہماری اپنی چوائس ہوگی کہ ہم اس پر کام کریں یا یہاں آجائیں۔ بہر حال
 بعد کی بات ہے۔ ابھی میں چار سال کا ایکریٹ کر چکا ہوں۔“
 ”ہوں!“ اب جی کچھ دیر سوچ انداز میں سر ہلانے کے بعد کہنے لگے۔

”اچھی بات ہے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم کچھ عرصے کے لیے باہر چلے جاؤ۔“
 ”ہائیں!“ اماں جی کچھ بولنے لگی تھیں کہ اب جی نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔ اور اپنی بات
 ختم کرتے ہوئے بولنے لگی۔

”متمارے لیے یہی بہتر ہے۔ بہت عرصہ تم نے ٹینشن میں گزارا ہے۔ اور ابھی نہیں ہو۔ اس لیے متمارے بیان سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔ لیکن تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔“
 ”نیل ابھی چھوٹا ہے۔ آبا جی پھر مجھے زیادہ“
 ”میں صرف نیل کی بات نہیں کر رہا، آبا جی نے درمیان میں لوگ کر نہ صرف ہر کو خاموش کر دیا۔ بلکہ حیران بھی۔ پھر ایک نظر آسمان جی پر ڈال کر بولے تھے۔“
 ”میں متمارے شادی کر رہا ہوں۔ متمارے چچا زاد سائزہ کے ساتھ اور یہاں سے تم شروع کرو گے۔“

”بڑے جتنا پہلے اپنی پسند منوا چکے تھے اور اُس کے بعد دس سال جھگڑے۔ اب اگر کوئی اختلاف یا اعتراض تھا بھی تو ان کے پاس احتجاج کا حوصلہ نہیں تھا۔ پس وہ بھی بچ کر سر جھکا لیا۔“

”میں یہ نہیں کہوں گا کہ پہلے متمارا انتخاب غلط تھا۔“ قدر سے توقف سے آبا جی نے کہا۔
 ”پس تمہیں زندگی گزارنے کا ڈھنگ نہیں آیا۔ اپنی اپنی انہیں تم لوگوں نے ایک دوسرے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس لیے اپنے گھر کو نہیں بچا سکے۔ بہر حال جو غلطیاں پہلے کی

”اُنہیں دوبارہ مت دہرانا۔“
 ”تھے یقیناً ہے سائزہ کے ساتھ تم خوشگوار زندگی گزارو۔ ایک ٹینٹ میں اپنی فیملی کو بھی شامل کر لو۔“

”بڑے جتنا اسی طرح سر جھکا کر بیٹھے۔“
 ”کیوں خاموش بیٹھے۔ تب عدیل انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولے۔“

”کیوں آسمان جی! ابھی بھی آپ بڑے جتنا کے باہر جانے پر اعتراض کریں گی؟“
 ”میں کیوں اعتراض کروں گی؟ آسمان جی چونکہ کر بولیں تو عدیل آبا جی کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔“

”بڑے جتنا اسی طرح خاموش تھے۔“

اسلام آباد میں تشکیل جہاں اور سیما جہاں نے اُن کا پُر جوش استقبال کیا تھا۔ اشعرا پھو پھو کر دیکھ کر خوشی سے دیوانے ہو رہے تھے۔ اور مسلسل اُس کا طواف کر رہے۔
 ”سیما جہاں رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف ہوئیں تب وہ دونوں بچوں کو آواز کرنے کی تاکید کرتے ہوئے سیما جہاں کے پاس پہنچیں۔“

”اب سناؤں جہاں، آپ کراچی سے کب آئیں گے؟“ اُس نے بیٹھنے کے لیے اسٹوا

”لو جہا تو سیما جہاں کیسے اُن کی کر کے اُسے مسکراتے ہوئے دیکھنے لگیں۔ پھر جیسے ہی وہ ٹھوڑی چھوڑ کر بولیں۔“

”بہت پیاری ہو گئی ہو۔ ماشاء اللہ۔“
 ”اچھا،“ وہ جھینپ کر ذرا سا ہنسی۔“

”میں اُس وقت سے دل ہی دل میں متمارے نظارہ رورہی ہوں۔ محبت نے تمہارا بنا دیا ہے۔ یقین کرو۔ جب تم شاہ سکندر کے ساتھ گیٹ سے داخل ہو رہی تھیں تو

”نے تمہیں پہچانتا ہی نہیں تھا۔“

”جی نہیں،“ وہ سچے مزوس ہوئی جا رہی تھی۔
 ”خج کہہ رہی ہوں، تمہارے تو انداز ہی بدل گئے ہیں۔ لگتا ہے شاہ سکندر

”کر دیا ہے۔“ سیما جہاں کو وہ مزوس ہوئی اور انھیں لگی۔
 ”محبت سے بڑا جادو اور کیا ہوگا۔“ وہ کلائی میں بڑی سرخ سبز کالج کی جوتیوں

”دھرنے سے بولی۔“

”یہ تو میں کہہ رہی ہوں۔ خیر، بتاؤ کہاں کہاں گئیں؟“ سیما جہاں نے کسی چیز کی تلاش میں بیٹھ جاتی تھیں۔“

”لاہور اور مری۔ اب یہاں سے سوات جانے کا پروگرام ہے۔ سکندر کہہ رہے تھے صبح ہی کل جیں گے۔“ اُس نے بتایا تو سیما جہاں کام چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔

”کیا مطلب ہے متمارا۔ یقیناً لاہور اور مری میں اسے دن اور ہمارے پاس نہیں، خیر دار جو صبح اُسے کا نام لیا تو۔“

”بھارتی جہاں جہاں بھی ناراض ہوں گے۔“
 ”اچھا آپ تو ناراض نہ ہوں۔ لائیے یہ پیاز میں کاٹ دوں۔“ اُس نے اس مومنوع سے ہٹنے

”خاطر پیاز کی نوکری اٹھالی۔ جسے سیما جہاں فوراً اچھلتے ہوئے بولیں۔“
 ”کوئی ضرورت نہیں کسی کام کو ہاتھ لگانے کی۔ آرام سے بیٹھ رہو۔ تمہارے میاں نے دیکھ لیا

”پھر وہ بھی نہیں ہونے دے گا۔ ابھی کہے گا چلو۔“
 ”وہ ہنس بڑی پھر اچانک خیال آنے پر کہنے لگی۔“

”جہاں! میں مری میں سکندر کے بھتیجے بھتیجیوں سے بھی ملی ہوں۔ مری کالونیٹ میں پڑھتے ہیں

”ب۔ اچھا۔ ویسے یہ زمیندار لوگ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلاتے ہیں البتہ۔“ سیما جہاں نے قصداً

”تادھوری چھوڑ کر اُسے دیکھا تو وہ مسکرا کر بولی۔“
 ”کہہ دیں جو کہنا ہے۔ میں برا نہیں مانوں گی۔“

”نہیں۔ جی! اب تم بھی انہی وڈیروں میں شامل ہو گئی ہو اور متمارے سوچ بدلتے دیر نہیں لگے

”جی نہیں۔ مری سوچ نہیں بدلے گی، آپ دیکھیے گا۔ میں جب بھی شاہ پور گئی سب سے پہلے

”اُن کے بچوں کو تعلیم دلانے پر زور دوں گی۔ اور شاہ سکندر نے میرا ساتھ دینے کا وعدہ بھی اٹھایا۔ اُس نے عزم سے کہا۔“

”اچھی بات ہے، ویسے متمارا شاہ پور جانا کب تک متوقع ہے۔ میرا مطلب ہے سکندر

”ہمارے میں کیا کہتا ہے۔“ سیما جہاں نے اپنے کام میں مصروف رہ کر پوچھا۔

”میں نے ابھی اس موضوع کو نہیں چھڑا جہاں اور نہ ہی اسے مسئلہ بناؤں گی۔ کیونکہ سکندر نے

”بہتر پہلے ہی بتا دیا تھا اور اُس وقت تو انہیں جہانگیر جہاں کے آنے کی امید بھی نہیں تھی۔ البتہ

”زور کہتے ہیں کہ ان کے گھر والے زیادہ عرصہ ناراض نہیں رہ سکیں گے اور میرا خیال ہے ٹھیک

”کہا تھا کہ اب صرف بابا جہاں ہی رہ گئے ہیں۔ باقی سب گھر والے تو اس شادی پر خوش ہیں۔“

”نف بھی بیٹھیں اور جہانگیر جہاں شریک بھی ہوں گے۔“
 ”وہ بہت فطرتی انداز میں بولی رہی تھی۔ تبھی تشکیل جہاں نے لاؤنج سے ہی اُسے پکار لیا۔“

”اسیہ! تم وہاں کیا کر رہی ہو؟“
 ”جاگو سوال سے، نہیں تو میری شامت آج لگے گی۔“ سیما جہاں نے اُسے بوکھلا دیا تھا۔ وہ

”ٹی ہوئی تھی۔“
 ”جی جہاں!۔“

”شاہ! اگر کچا کھانے میں دیر ہے تو سکندر کو چاہئے ہی ملا دو۔“
 ”تشکیل جہاں نے کہا تو اُس نے لیے اختیار شاہ سکندر کو دیکھا۔ کچھ تھکا تھکا سا۔ اتنی دیر تک

”کے نظروں سے اوجھل ہونے پر شاکی بھی ہو رہا تھا۔ وہ فوراً اُس سے نظریں چرا کر بولی۔“
 ”کھانے میں دیر نہیں ہے جہاں! اور چائے کھانے کے بعد ملے گی۔“
 ”اچھا۔ تم یہاں میرے پاس بیٹھو۔ تشکیل جہاں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ پھر اُس

کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے: میں ابھی سکندر سے کہہ رہا تھا کہ تمہیں ہاؤس جاب کرنا
تیار کیا پروگرام ہے؟
”جی، یہی پروگرام ہے؛ اُس نے شاہ سکندر کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھتی تو شاید
میں خاموشی اختیار کر لیتی۔“
”ہاں، وقت ضائع نہیں کرنا، جب تک شاہ سکندر کسی بزنس میں سیٹ ہوں گے۔“
”میں تو فی الحال بیل سے شکیل بھائی کی بات ادھوری رہ گئی۔ اور وہ ایک کیوری کپتے ہوئے اٹو
اینڈ ٹرنس چلے گئے تو شاہ سکندر فوراً بولی پڑا۔“
”سنو، صبح یہاں سے نکل چلیں گے۔“
”کیوں؟“ وہ انجان بیٹے بیٹے بھی ہنس پڑی۔

”متاثری کیوں کا جواب ابھی بھی دے سکتا ہوں؟ شاہ سکندر اپنی جگہ سے اٹھنے لگاؤ
نے گھبرا کر ہاتھ جوڑ دیے۔“

”پلیز، وہیں بیٹھے رہیں۔“
”صبح چلنا ہے؟ شاہ سکندر اسی وقت اپنی بات منوا سکتا تھا۔“
”کہو ہاں۔ ورنہ؟“
”ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔“

”ہائیں، یہ دوبارہ تین بار ہاں کہلوانے کی فزیت کیوں آئی؟“ سیمیا بھابی سنتی ہوئی آگئی
اس کے بجائے انہوں نے براہ راست شاہ سکندر کو ٹوکا تو وہ جھل سا ہو کر سر کھپائے
”ہاں بھی، کھانا تیار ہو گیا؟“ عقب سے شکیل بھائی کی آواز پر سیمیا بھابی ان کی طرف
پوچھنے لگیں۔
”آپ کہاں چلے گئے تھے؟“

”وہ اتانی کا فون تھا؛“ انہوں نے ابھی اس قدر کہا تھا کہ آسیہ نے سوالوں کی بوڑ
”آپانی کا کیا کہہ رہے تھے۔ ٹھیک تو ہیں ناں اور اماں جی۔“
”سب ٹھیک ہیں۔ سب ٹھیک ہیں؛ شکیل بھائی نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے
لگے۔“ ابھی خیر ہے، لیکن کھانے کے بعد سناؤں گا۔“
”نہیں بھائی؛“ پہلے سناؤں ورنہ کھانا نہیں کھا جاوے گا؛“ اُس نے اپنی بے تالا
سے کہا تو شکیل بھابی دوبارہ اسی جگہ پر بیٹھ گئے اور سیمیا بھابی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کر
بولے۔

”بڑے بھیا کی شادی ہے اسی جمعہ کو۔“
”نہج۔“ آسیہ کی آوازیں خوشی کی کھٹک تھی۔ اور سیمیا بھابی خوشی کے ساتھ تعجب
”اسی جمعہ کو؟“
”ہاں۔ بس سادہ سی تقریب ہے۔ اور جلدی میڈلوں طے پائی ہے کہ اگلے آگے
میں بڑے بھیا جا جانے والے ہیں اور میرا خیال ہے ساڑھے چھ بجے ان کے ساتھ
آخر میں شکیل بھائی نے اپنا خیال ظاہر کیا تو آسیہ فوراً پوچھنے لگی۔
”اور نیل؟“

”ظاہر ہے وہ بھی جائے گا۔“
”آسیہ نے چند لمحے توقف کیا پھر شاہ سکندر کو دیکھ کر بولی تھی۔
”بس تو کل ہم پہلی فلائیٹ سے کراچی جائیں گے۔“

شاہ سکندر نے اُس کے پروگرام سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا۔ شاید اس کی خوشی کی خاطر ورنہ
اسے افسوس تھا کہ زندگی کے یہ خوبصورت دن دوبارہ توٹ کر نہیں آئے تھے۔ بہر حال اُس
آسیہ پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اپنا ہی مون پر نیڈ فکڑ ہونے پر ناخوش ہے۔ اُس کے
س اس کی خوشی میں شریک رہا۔ گوکہ بڑے بھیا نے ساڈی پر اصرار کیا تھا پھر بھی ابھی خاصی رونی
ٹی تھی۔ تین چار دن آسیہ اتانی کے گھر میں بے حد معروف رہی۔ اس کے باوجود شاہ سکندر کی
سے غافل نہیں ہوئی تھی۔ وہ جہاں گھر میں داخل ہوتا اُس کی طرف لبک کر جاتی۔ چائے کھانا
ن روم میں کپڑے تیار یعنی ہر بات کا خیال۔ اپنی طرف سے اُس نے شکایت کا کوئی موقع نہیں
پھرائے۔ ابھی احساس تھا کہ وہ اُس کی خاطر سب چھوڑ آیا ہے۔ جیسی دلہن کے گھر آتے
وہ اپنے گھر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ شاہ سکندر جارحانہ کہاں تھا۔ وہ اُسے چلنے کا پتہ کے
بھرے سے نکل کر آئی تو برآمدے میں میمونہ بھابی مل گئیں۔

”شاہ سکندر کو دیکھا ہے؟“ اُس نے میمونہ بھابی کو روک کر پوچھا۔ تو وہ اپنے مخصوص انداز
بولیں۔
”ہاں بہت بار۔“
”میں ابھی کی بات کر رہی ہوں۔ کہاں ہیں وہ؟“
”آدھ ڈرائنگ روم میں، سب وہیں بیٹھے ہیں؛“ میمونہ بھابی غمٹ میں بتا کر جانے لگیں
س نے راستہ روک لیا۔
”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“
”چلنے جانے۔“

”ہاں اے لیے مت بنائیے گا کیونکہ ہم اب گھر جا رہے ہیں؛“ اُس نے ”ہم“ اپنے اوشا مکند
لینے استعمال کیا تھا اور میمونہ بھابی کو کبھی گئیں بھراس کی نقل آتے ہوئے بولیں۔
”ہم اس وقت شوق میں چائے بنانے نہیں جا رہے۔ آپ کے شاہ سکندر نے فزائش
ہے۔ ورنہ ہم تو بہت تھکے ہوئے ہیں۔“
”آپ بھی بس؛“ اُس نے ذرا سا سر جھٹکا پھر کہنے لگی۔ ”رہنے دیں چائے واٹے میں منع کرتی
سکندر کو۔“

”ارے رے، دومنٹ کا کام ہے۔ اور اب تو سب پڑیں گے؛“ میمونہ بھابی کہتے ہوئے
ان کی طرف بڑھیں تو وہ بھی ان کے ساتھ چل پڑی۔
”تم ابھی جانے کی بات کیوں کر رہی ہو۔ صبح جانا؛“ میمونہ بھابی نے کیتلی میں پانی ڈالتے ہوئے
”ابھی کیا اور صبح کیا۔ بس جانے دیں۔ صبح سے میں اپنے گھر کے معمولات سیٹ کر دی گئی۔
نہیں سکندر نے بزنس کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ اب اپنے گھر میں اطمینان سے بیٹھیں
تو سب کچھ سے سوچیں گے۔“
وہ ان کی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے بول رہی تھی۔ میمونہ بھابی نے مسکرا کر اُسے دیکھا تو
پہلے خاموش ہوئی پھر ایک دم موضوع بدل گئی۔
”نیل سے نہیں ملے ہوں تو عجیب سا لگ رہا ہے کب سے گیا ہوا ہے صبح عدیل بھائی سے
یہ گلے لے کر میری طرف آئیں گے۔“
”میمونہ بھابی نے فوراً گھٹی جواب نہیں دیا۔ ٹرے اتاری پھر اُس میں کپڑے رکھتے ہوئے
نیل لگیں۔“

”نیل کا تمہیں نہیں بتا رہا تھا کہ بعد بہت بیمار ہو گیا تھا۔ ابھی بھی پتا نہیں
ہا ہے۔ کیونکہ اسی بیماری کی حالت میں قبیلہ سے لے گئی تھیں۔ اس دعوے کے ساتھ کہ

ماں سے بہت اُس کی جھگڑا کوفی نہیں کر سکتا۔ وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔
 ”کیا کہہ رہی ہیں بھائی؟ یہ سب تو مجھے کسی نے نہیں بتایا۔“ وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔
 ”تو سمجھ رہی تھی بڑے بیٹا کی شادی کی وجہ سے۔“
 ”نہیں بلکہ اُس کی وجہ سے بڑے بیٹا شادی پر رضامند ہوئے ہیں۔ کیونکہ صرف نیل کو
 ساتھ ہاتھ نہیں لے جاسکتے تھے۔ دیکھتے آبا جی نے بڑے موقع پر بڑے بیٹا کو گھیرا تھا۔
 کے پاس باقی بچہ نے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔“
 ”میونہ بھائی کی بات اُس نے بے دھیانی میں سنی، سارا دھیان نیل کی طرف تھا۔ فوراً

لگی۔ نیل کی طبیعت اب کیسی ہے۔ کوئی اُس کے پاس گیا بھی؟“
 ”ایک بار عدیل گیا تھا۔ لیکن نیل نے اُس سے ملنے نہیں دیا۔ کہنے لگیں، جب ٹھیک
 سکا بھیج دوں گی، یہاں آئے کی ضرورت نہیں ہے۔“
 ”میونہ بھائی نے نیل کی بات میں جانے دم کرتے ہوئے بتایا چھر بڑے اٹھا کر اُس کی
 رُخ موڑا تو اُسے پریشان دیکھ کر کہنے لگیں۔

”زادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ اور تم ابھی اماں جی کے سامنے نیل کا ذکر نہیں چھیڑا۔
 رونے لگتی ہیں۔ اور اس خوش گئے موقع پر رونے دھونا ابھی بات نہیں ہے۔ سمجھ رہی ہوں ناں؟“
 اُس نے پوہنی ذرا سا اثبات میں سر ہلا دیا اور اُن کے جانے کے بعد پہلے خود پر قابو آیا
 ڈرائنگ روم کا رخ کیا تھا۔

چھر جانے کے دوران اُس نے آبا جی اور اسکا جی کو اس وقت اپنے گھر جانے کا بتایا تو
 شاہ سکندر کاما دیوس چھر کیلکٹ دیکھنے لگا۔ اتفاق تھا کہ میونہ بھائی اُسے ہی کیونکر ہی تھیں
 ہی بے ساختہ زور سے ہنس پڑیں۔ سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے تو فوراً بولی تھیں۔
 ”اب کوئی یہ نہ پوچھے کہ نہیں کیوں ہنسی؟“

عدیل نے شاہ سکندر کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں، جواب نہیں۔ جو ابا شاہ سکندر نے
 انداز میں سر ہلایا چھر لقمہ چائے ایک ہی گھونٹ میں ختم کر کے کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے آبا جی کو دبا
 لولا۔

اجازت دیجیے آبا جی، گیارہ بج چکے۔ چلیں آسیدہ۔“
 ”جی۔“ وہ اماں جی کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیل کا سن کر کچھ مصلیٰ سی ہوا
 شاہ سکندر نے بغور اُسے دیکھا۔ پھر سب کو سلام کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اپنے اپارٹمنٹ میں اگر بھی وہ کچھ چپ چاپ سی تھی۔ دل چاہ رہا تھا اس وقت فون
 نیل کی خبریت معلوم کرے۔ لیکن اس خیال سے خود کو روک رہی تھی کہ کہیں نیل بھائی آ
 بھی یہ نہ کہہ دیں کہ یہاں فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

”کیا بات ہے، تھک گئی ہو؟“ شاہ سکندر مسلسل اُسے فون کر رہا تھا۔ بہت سے
 جب اپنی جگہ پر آکر لیٹی تو اُس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر پوچھنے لگا۔
 ”نہیں۔“ وہ قہقہہ مسکراتی دکھیں وہ یہ نہ کہہ لے کہ اپنے گھر آکر وہ خوش نہیں۔

چھر اُس کا ہاتھ بالوں میں سے نکال کر اپنے ہونٹوں سے چھو کر بولی۔
 ”اب کی فخت میری ساری تھکن سمیٹ لیتی ہے۔ پتا ہے ابھی یہاں آتے ہوئے
 سوچ رہی تھی۔“

”کیا؟“ شاہ سکندر خاموش ہو کر اُس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔
 ”کہ میں تو بہت عام سی لڑکی تھی چھر آپ۔“
 ”اوں ہوں؟“ شاہ سکندر نے اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ خود کو عام سی لڑکی

بن مت کرو۔“ شاہ سکندر حیات نے کسی عام سی شے کو بھی درخورد اعتنا نہیں کیا۔
 ”وہ اُس کے لیے کے زعم پر سن سی ہو گئی تھی۔
 ”ایک عام سی لڑکی کا میری زندگی میں کیا دخل، نہیں آسیدہ ایسا کبھی نہیں سوچنا، تمہارے لیے
 ایک طرح سے تحت و نواج چھوڑا آیا ہوں۔“ وہ بہت سنبھل کر اُسے ٹوکتے ہوئے بولی۔ ”میں کیا کہنے جا رہی تھی آپ
 ”اب بھی کمال ہیں۔“ وہ بہت سنبھل کر اُسے ٹوکتے ہوئے بولی۔ ”میں کیا کہنے جا رہی تھی آپ
 ”بے نیچہ چھوڑیں۔“ یہ باتیں سنیج ناٹنے میں کیا لیں گے؟
 ”بچہ کی بات سمجھ اور رات کی بات۔“ وہ شروع نظروں سے دیکھتا اُس پر جھک گیا۔

کوئی دو گھنٹے پہلے ہر الساء نے جیرا کو اپنے کمرے میں آئے کو کہا تھا۔ اُس وقت وہ بڑی
 نا کا کوئی کام کر رہی تھی۔ اُس کے بعد بتا نہیں وہ بھول گئی تھی یا ان جان نے اُسے کسی کام سے
 دیا تھا۔ جو اب تک نہیں آئی تھی۔ ہر الساء کا انتظار کے بعد اب بارہ لائی ہو گیا تھا۔ اتنا ہی
 ہیں وہ اپنے کمرے سے نکل کر اُس کی تلاش میں بیچے آئی تھی کہ شاہ سکندر کا نام سن کر ٹھٹھک
 شاہ جہانگیر فون پر غالباً اُس سے بات کر رہے تھے۔ وہ دبے پاؤں اُن کی پشت کی طرف
 خٹکے۔

”میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں ایک اور چیک جمع کر دیا ہے۔ فی الحال تم آرام سے رہو
 ”نہیں سکندر۔ ابھی کوئی زبردستی نہیں ہو سکتا۔ اگلے مہینے الیکشن میں جیتا نہیں نئی حکومت کیا پالیسی
 ر آئی ہے۔ اس لیے اس وقت کسی بھی زبردستی میں پیسہ نکالنا ٹھیک نہیں ہے۔“
 ”ہاں ایک مہینے کی تو بات ہے۔ اس کے بعد دیکھیں گے۔“

”نہیں، میں ابھی تمہارے پاس نہیں آسکتا۔“
 ”اور۔ اور سب ٹھیک ہے۔“
 ”چھر بات کروں گا۔ خدا حافظ۔“

شاہ جہانگیر نے فون بند کر دیا۔ اور پلٹے ہی ہر الساء کی طنز آمیز تائف بھری نظروں کا سامنا
 ”بس ایک بل اُس کے بعد ہم اُسنا فوراً بلٹ کر جانے لگی۔
 ”روکو ہم اُسنا۔“ انہوں نے بھی فوراً ٹکرا کر لیکن رکنے کے بجائے ہر الساء کے قدموں میں

ی آگئی، اور اُن کی نظروں کے سامنے وہ ٹیڑھیاں جھلانے لگی ہوئی اپنے کمرے میں آگئی۔ کچھ دیر
 لے اُسے جیرا کی ریفرت تھا اب اُس کی نوعیت بدلنے ہی وہ باکل ہون جا رہی تھی۔ ایک ایک
 اٹھا کر پھینک لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کمرے کا نقشہ بدل گیا۔ اُس کے بعد چیخ چیخ کر

”اٹھا کر پھینک لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کمرے کا نقشہ بدل گیا۔ اُس کے بعد چیخ چیخ کر
 ”اٹھا کر پھینک لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کمرے کا نقشہ بدل گیا۔ اُس کے بعد چیخ چیخ کر
 ”اٹھا کر پھینک لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کمرے کا نقشہ بدل گیا۔ اُس کے بعد چیخ چیخ کر

”اٹھا کر پھینک لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کمرے کا نقشہ بدل گیا۔ اُس کے بعد چیخ چیخ کر
 ”اٹھا کر پھینک لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کمرے کا نقشہ بدل گیا۔ اُس کے بعد چیخ چیخ کر
 ”اٹھا کر پھینک لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کمرے کا نقشہ بدل گیا۔ اُس کے بعد چیخ چیخ کر

”اٹھا کر پھینک لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کمرے کا نقشہ بدل گیا۔ اُس کے بعد چیخ چیخ کر
 ”اٹھا کر پھینک لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کمرے کا نقشہ بدل گیا۔ اُس کے بعد چیخ چیخ کر
 ”اٹھا کر پھینک لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کمرے کا نقشہ بدل گیا۔ اُس کے بعد چیخ چیخ کر

”اٹھا کر پھینک لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کمرے کا نقشہ بدل گیا۔ اُس کے بعد چیخ چیخ کر
 ”اٹھا کر پھینک لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کمرے کا نقشہ بدل گیا۔ اُس کے بعد چیخ چیخ کر
 ”اٹھا کر پھینک لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے کمرے کا نقشہ بدل گیا۔ اُس کے بعد چیخ چیخ کر

”کیوں نہیں جی، اپنے سائیں جی ایسا جلد کاٹیں گے کہ چھوٹے شاہ جی اُسے ٹھوکر مار کر آپ کے پاس آئیں گے۔ سائیں جی کہہ رہے تھے کہ لیں آپ اجازت دے دیں پھر دیکھیں اُن کا کمال۔ اوجھڑ چالیں دن پورے ہونے نہیں کہ“

”چالیں دن :“ مہر انا جانتے کیا سوچنے لگی تھی۔

”ہاں جی، چالیں دن زیادہ تو نہیں ہوتے، یوں گزر جائیں گے۔ بس آپ دو کالے بکروں کے پیچھے دے دیں۔ سائیں جی کہہ رہے تھے آپ لک گو دھرنے والی ہے۔ پہلے اس کا صدقہ آٹا ریں گے چاند سا بیٹا ہو گا“

جیراں کی آخری بات پر وہ چونک کر دیکھنے لگی تھی۔

”کیوں نہیں جی، اپنے سائیں جی ایسا چلہ کاٹیں گے کہ چھوٹے شاہ جی اُسے ٹھوکر مار کر آپ کے پاس آئیں گے۔ سائیں جی کہہ رہے تھے کہ لیں آپ اجازت دے دیں پھر دیکھیں اُن کا کمال اور چالیں دن پورے ہوئے نہیں کرے۔“

”مہرانا جہانے کیا سوچنے لگی تھی۔“

”ہاں جی، چالیں دن زیادہ تو نہیں ہوتے، یوں گزر جائیں گے۔ بس آپ دو کالے بکروں کے پیچھے دے دیں۔ سائیں جی کہہ رہے تھے آپ کی گود بھرنے والی ہے۔ پہلے اس کا صدقہ آٹا ریں گے چاند سا بیٹا ہوگا۔“

جیروں کی آخری بات بروہ چونک کر دیکھنے لگی تھی۔

”آئی کہاں ہیں؟“ اُسے اچانک احساس ہوا کہ وہ انہیں وہیں جھوڑ کر آگئی ہے۔ انہیں

سارہ۔ اچھا ہاں۔ اُس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی؟“ پھر وہ ہتھ لگا کر بولیں: تمہارا بھائی کے لیے وہی ٹھیک ہے۔ ایک پروین۔“
 آسمیہ کا دل چاہا فون پر سچ دے لیکن نبیل کی وجہ سے مضبوط کر گئی۔
 ”خیر تمناؤ سب پڑھا لکھا جو لیے ہیں جھوٹ دی ہو یا۔“
 ”میری نبیل سے بات کرادیں۔ وہ فوراً بول پڑی۔“
 ”وہ سو رہا ہے۔“ ادھر سے عذر تیار تھا۔

”اچھا میں پھر فون کروں گی؟“ اُس نے فون رکھ کر دوپٹوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ جا کس احساس کے تحت اُس کا چہرہ ہنسنے لگا تھا۔ ”انکھیں جلنے لگی تھیں۔“
 ”اُس! کیا ہوا؟“ شاہ سکندر گھر سے نکلا تھا اُسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر قدر سے پر ہوا ہو گیا۔ تو اُس نے آہستہ سے دوپٹوں کا ہتھ پیچہ کر کر کے دیکھا اور یوں سر ہلایا جیسے کوئی بار نہیں۔

”وہ کیا نام ہے اُس کا۔ تمہارا بھتیجا ٹھیک ہے۔ بات ہو گئی تمہاری اُس سے؟“ شاہ سکا جانتا تھا کہ وہ ابھی نبیل کو فون کر رہی تھی۔
 ”ہاں نہیں۔ میرا مطلب ہے نبیل سے بات نہیں ہوئی؟“ وہ کچھ کنفیوز ہو گئی۔ شاید اُبتانا نہیں چاہتی تھی۔
 ”اچھا چلو۔ فٹا فٹ تیار ہو جاؤ۔“ شاہ سکندر اُس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا تو اُس بے دھیانی میں لو پھریا۔

”کہاں جاتا ہے؟“
 ”کیا مطلب، تمہیں یاد نہیں احمد حسن نے کھانے پر بلایا ہے اور دوپہر میں نالہ کا فون ہوا تھا۔“
 ”اچھے یاد ہے۔“ وہ قصداً مسکرائی۔ ”آپ کی یادداشت کا امتحان مطلوب تھا۔ پاس ہو گئے۔“
 ”صرف اس امتحان میں؟“ وہ اُس کے ہاتھ کو زور سے دبتے ہوئے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگی۔
 ”نہیں۔ اب تک جتنے بھی امتحان آئے۔ البتہ آئندہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔“
 ”کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی پھر چیخ پڑی۔“ آف میرا ہاتھ توڑنے کا ارادہ ہے کیا؟“
 ”ارے۔“ شاہ سکندر نے فوراً اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر قدرے نادم ہو کر بولا۔“

”کچھ زور سے دب گیا۔ لاؤ دکھاؤ۔“
 ”بس رہنے دیں۔“ وہ ہاتھ جھٹکتی ہوئی تیار ہونے چلی گئی۔
 ”احمد حسن نے اگر حضور کا کھانا پر نہ بلایا ہوتا تو وہ اس وقت آبا جی کے گھر جانے کی کرت۔ کیونکہ اُسے نبیل کی فکر سارہی تھی۔ اور وہ بھائیوں کو نبیل کے خیالات سے آگاہ کر دیتی تھی۔ بے شک وہ ماں تھیں اس کے باوجود نبیل ان کے پاس جا کر ٹھیک نہیں ہوا۔ وہ نبیل کو کسی سے ملنے بھی نہیں دے رہی تھیں۔ آج اُسے جی نال دیا تھا۔ وہ اگر فون پر کسی آواز سن لیتی تو اتنی پریشان نہ ہوتی۔“ احمد حسن کے گھر نالہ اور اُس کی امی سے دوران بھی وقفے وقفے سے اُس کا ذہن ہلکتا رہا جس پر خود اُسے کتنی بار شرمندگی ہوئی کہ سوال کیا کیا اور اس نے جواب کیا دیا تھا۔

پھر کھانے کے بعد شاہ سکندر اور احمد حسن کے درمیان سیاست کا موضوع چھوٹے سمجھ گئی کہ اب یہ نشست خاصی طویل ہو جانے لگی۔ اس لیے نالہ کے ساتھ اُس کے کمرے بہت بھرنا ٹھیک ہے۔ نیچے میں سخت وحشت ہوتی ہے۔“ نالہ اُس کے لیے۔
 رکھتے ہوئے بولی؟“ آپ آرام سے بیٹھ جائیں۔ میں جانے نہیں لے آتی ہوں۔“

”آئی اب نماز پڑھیں گی۔ اگر آپ کو کوئی بات کرنی ہے تو۔“
 ”نہیں، میں ان کے اکیلے ہونے کے خیال سے کہہ رہی تھی۔ بس ٹھیک ہے انہیں نماز پڑھنے دو۔“ وہ جلدی سے بولی تھی۔
 ”اوکے میں چائے لاتی ہوں۔“ نالہ مسکرائی پھر جاتے جاتے کارنر پر سے اپنا البم اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”آپ جب تک یہ دیکھیں۔ پور نہیں ہوں گی۔“
 اُس نے البم تمام لیا۔ پھر آرام سے میز پر بیٹھ کر دیکھنے لگی۔ شروع میں نالہ کی تصویریں تھیں۔ اس کی اسکول اور کالج کے دوستوں کے ساتھ۔ پھر کچھ گھر کے لوگوں کی بات کی۔ وہ عدم دلچسپی سے پلٹی جلی گئی۔ پھر کچھ اسکا البم بند کر دیا۔ جب نالہ چائے لے کر آئی۔ وہ گھٹنوں کے گرد بازو پھیلتے بیٹھ گئی۔
 ”آئی جلدی آپ نے تصویریں دیکھ لیں؟“ نالہ نے بقیہ کا اظہار کیا تو وہ مسکرا کر بولی۔
 ”نہیں اکیلے دیکھنے میں مزہ نہیں آ رہا تھا۔ تمہارے ساتھ دیکھوں گی۔“
 ”نالہ نے جھوٹی سی مسکرائی اُس کے قریب دھکی پھر میز پر چڑھ کر بیٹھی اور درمیان میں البم کھولتے ہوئے بولی۔

”جلیں میں آپ کو بتاتی ہوں، میرے ساتھ کون کون ہے؟ پھر وہ اپنی ایک ایک سہیل کا نام بتاتے لگی۔ اس کے بعد کچھ بلو تفریبات کی تصاویر میں اپنے خاندان کے ہر فرد سے متعارف فرمایا۔ پھر ایک تصویر پر انگلی رکھ کر بولی۔

”اور جناب یہ ہیں آپ کے سسرال والے۔“
 وہ بے اختیار تصویر پر جھک گئی۔ شاہ سکندر کے ہتھ جھپٹوں سے وہ مل چکی تھی۔ اس لیے تصویر میں جتنے نیچے نظر آ رہے تھے۔ انہیں وہ پہچان گئی۔ پھر روکیوں کے بارے میں نالہ سے پوچھا تو وہ ایک چہرے پر انگلی سے اشارہ کر کے کہنے لگی۔
 ”یہ شہر بالو تھیں۔ ایک بار سکندر بھائی انہیں لے کر آئے تھے۔ یہ تصویر میں نے انہی سے لی تھی۔ سچ بھائی بہت مشکل سے دی تھی انہوں نے۔ کہہ رہی تھیں۔ سکندر بھائی کو بتا نہ چلے آپ بھی نہیں بتائے گا بھائی۔“

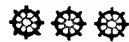
”اچھا۔“ وہ ذرا سانسہ لی۔ اور شہر بالو کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد اس کے ساتھ کھڑی دوسری روکی کے غیر معمولی حسین چہرے پر اس کی نظر میں جہم کر رہ گئی تھیں۔

”گنتی بیاری سے ناں بھائی یہ روکی؟“ نالہ اُس کی نظروں کے نیچے دیکھ کر کہنے لگی۔ میں بھی جب کبھی اس تصویر کو دیکھتی ہوں تو میری نظریں اس چہرے سے ہٹتی نہیں ہیں۔“

”کون ہے یہ؟“ اُس نے اسی مبہوت عالم میں پوچھا۔
 ”بتا نہیں۔“ شاہ سکندر بھائی کی چچا زاد بہن ہیں۔ شہر بالو نے ان کے بارے میں بتایا تو تھا۔
 ”کیا خیر؟“ وہ بولی۔
 ”نالہ نے سچے سچے لکھی تھی کہ اچانک جانے دہن کے کس گوشے سے نکل کر ایک نام آسمیہ کے فون پر آ گیا تھا۔“

”مہر النساء۔“

”ہاں مہر النساء۔“ نالہ خوش ہو کر بولی پھر پوچھنے لگی۔ ”آپ جانتی ہیں انہیں؟“
 ”جی نہیں۔“ جواب نہیں دیا۔ کیونکہ وہ خود حیران ہو کر سوچ رہی تھی کہ یہ نام اُس کی زبان پر



”کہاں گھر گئیں آپ؟“ نالہ نے اُس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو چونکنے کے ساتھ ہی اُم
ذہن میں جھپکا ہوا تھا۔

”جوتیلی میں زیادہ افراد نہیں رہتے۔ بابا جان، بی بی جان اور مہر النساء“

اُسی وقت احمد حسن نے وہیں سے نالہ کو پکارا تو وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

”میرا خیال ہے سکندر چلنے کا نہیں گئے۔ تم آؤ ناں کسی دن۔ صبح سے آؤ۔ سارا دن میرے ساتھ

”آف۔ سارا دن آپ برداشت کر لیں گی مجھے؟“ نالہ اُس کے ساتھ میڈ سے اترتے ہوئے بولا

”تم آؤ تو؟“ اُس نے ہلکے سے نالہ کا رخا جھٹکا۔

”پھر کمرے سے نکل کر آئی مگر۔“ توشاہ سکندر چلنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وہ اُسے دُکے کا کمر

کی امی سے ملنے اُن کے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں سے اُنی توشاہ سکندر احمد حسن کے ساتھ باہر نکلے

اُس نے نالہ کو گھٹے لگا کر خداحافظ کہا اور اپنے ہاں اُسے کی تاکید کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔

”ابھی نہیں ہے۔ بہت پر خلوص اور مہربان! رستے میں وہ ایمانداری سے احمد حسن کے گھر کی نو

کرتے ہوئے بولی۔

”ایسے غصے تو کب بہت کم ہوتے ہیں۔ ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا اور نالہ تو اتنی

بے کر ہے کہ“ وہ اچانک کسی خیال کے تحت ایک ٹھنڈے کوچپ ہوئی پھر ایک دم شاہ سکندر کا بازو

کڑ بولی۔

”سکندر! مجھے ابھی ابھی خیال آیا ہے، نالہ، عدیل بھائی کے لیے کسی رہنے کی۔ وہ کہیں گنج

ہے ناں؟“

شاہ سکندر نے مسکرا کر اُسے دیکھا پھر بلوہنی ذرا سا سر ہلا کر بولا۔

”ساری بہنوں کے جذبات اپنے بھائیوں کے لیے یکساں ہوتے ہیں۔ جہاں کسی اچھی لوگ

فورا بھائی کا خیال آ گیا۔ بے حارے طور ہوں کا خیال کسی کو نہیں آتا“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ جو اُس کا بازو تھامے بیٹھی تھی اس میں ناخن چھو کر بولی۔

”آف، ظالم، بیوی۔ مجھے جوابی کارروائی پر مجبور مت کرو۔ ایکسٹنٹ ہوجانے لگا“ وہ اس کا

سے بازو چھڑا کر پھر اس کی گردن میں ڈالنا چاہتا تھا کہ وہ فوراً پیچھے ہٹ گئی۔

”راتے میں ایسی حرکتیں میں پسند نہیں کرتی“

”پہل تمہاری طرف سے ہوئی تھی؟“ وہ اُس کی گردن میں بازو نہیں ڈال سکا تو بالوں کو ہا

جھٹکا دے کر بولا۔

”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ گھورنے لگی۔

”بہت کچھ۔ تفصیل کو جاکر بتاؤ گا۔ اس وقت تم اپنی بات کرو کیا کہہ رہی تھیں۔ عدیل

میں سکندر! ہم نے بہت گھوم پھر لیا۔ بہت دعوتیں اُڑائیں۔ اب ہم اپنی زندگی میں سیٹ ہونا

چاہیے“ شاہ سکندر نے کوٹ ہنکرتے ہوئے رک کر اُسے دیکھا پھر قصداً خاموش رہ کر اُس کی طرف سے

وضاحت کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ بڑے آرام سے زیورات دراز میں ڈال کر دوش روم میں چلی گئی۔

”نہ ہاتھ دھو کر دایں آئی تب بھی اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں کہا۔ جس سے وہ یہی سمجھا کہ اُس کا دھیان

میں ادھر ادھر ہو کر رہا ہے جبکہ وہ جانتا چاہتا تھا کہ اپنی زندگی میں سیٹ ہونے سے اس کا کیا مطلب ہے۔

”بھیا نیلے درپس چنچ کر کے آیا پھر آرام سے بیٹھ کر پوچھنے لگا۔

”ہاں کیا کہہ رہی تھیں تم کسی یونگ ہوئی چاہیے“

”میرا مطلب اپنے اپنے کام سے لگنے کا ہے۔ یوں وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔ آپ کو جو بھی

کاروبار کرنا ہے اُس کا مشورہ میں اؤں جاں“ بات ابھی اُس کے ہونٹوں میں تھی کہ وہ فوراً

بول پڑا۔

”نہیں“ وہ کچھ بھی نہیں اور کچھ حیران ہو کر دیکھنے لگی تھی۔

”تم ابھی کچھ نہیں کرو گی۔ ہاؤں جاں بھی نہیں“ وہ قطعیت سے کہہ کر سگریٹ سلگانے لگا۔

”کیوں؟“ اُس کی حیرت میں تدریس اُنھن بھی شامل ہو گئی۔

”بس میں نہیں جانتا کہ ابھی سے کھر کے علاوہ دوسری مصروفیات میں آجھ جاؤ بلکہ جب تک

میں پوری طرح اسٹیبلش نہیں ہو جا تا تم سوچنا بھی نہیں۔ اسے تم میری خواہش سمجھ لو اور مجھے یقین ہے

کہ تم میری خواہش کا احترام ضرور کرو گی۔“ حتمی انداز میں کہتے ہوئے آخر میں شاہ سکندر اُسے دیکھ

کر مسکرایا۔

”اور وہ مسکانے کی کوشش میں ناکام ہو کر سر جھٹکا گئی تھی۔

شاہ سکندر نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اُسے کام کے سلسلے میں کچھ دوستوں سے ملنا ہے۔ اس لیے وہ

اس وقت اُسے اپنا بیٹے کے گھر اترنے پر اصرار نہ کرے بلکہ اُس کی طرف سے معذرت بھی کرے اور یہ

کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر وہ احتجاج کرے گی اس لیے جب اُس نے اپنا بیٹے کے گھر کے سامنے گاڑی

رکھ کر اُس کی واپسی کا پوچھنے لگی۔

”دو پہر کے کھانے تک آ جاؤں گے؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔ تم بہر حال کھانے پر انتظار نہیں کرنا۔ اوکے“ وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ

بلا تا گاڑی بڑھانے لگا تو کچھ دیر اُس کے پیچھے دیکھنے کے بعد وہ اندر آ گئی۔ اپنا بیٹا اور عدیل بھائی

حسب معمول برآمدے میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ اُس نے قریب آ کر سلام کیا تو دونوں چونکے اور

عدیل بھائی فوراً کھڑے ہو کر گیٹ کی طرف دیکھنے لگے۔

”سکندر! بہت عجلت میں تھے اس لیے نہیں اس کے معذرت کر رہے تھے۔ آپ بیٹھیں ناشتا کریں“

”میں نے عدیل بھائی کے انداز سے کچھ کر کہا۔

”تم نے ناشتا کیا؟“ اناجی نے اُس سے پوچھا۔

”جی اناجی۔ ناشتا کر کے آ رہی ہوں۔ اناجی جی کمرے میں ہوں گی؟“ وہ جواب دینے کے ساتھ

انماں جی کا پوچھتے ہوئے ان کے کمرے میں آ گئی۔

”السلام علیکم امان“ جی“

”جی جی، بہر خوش رہو۔“ بڑی عمر سے تھاری۔ ابھی میں تھیں یاد کر رہی تھی نا امان جی اُسے دیکھ کر

کس اُنھیں۔

”خیر بہت۔ صبح ہی صبح کس سلسلے میں یاد کر رہی تھیں نا وہ اُن کے گلے لگ کر پوچھنے لگی۔

یہاں تھا تو میں اُس کو یہ کہہ کر دوانی پلائی تھی کہ اگر تم نے دوانی نہیں لی تو پھر پھر ناواں ہوں وہ فوراً ہی لپٹا تھا۔ تم اسی طرح وقتاً فوقتاً اسے ہلاؤ۔ حوصلہ دو اسے۔ مجھے لگتا ہے وہ تھارے سن کر ہی جی اٹھنے لگا۔ بہت پیار کرتا ہے تم سے۔ میں ناں "میمونہ" بھائی نے اسے تم سے حالت نکالنے کے لیے آخر میں زور سے اُکھا ہوا۔

وہ گہری سانس کھینچ کر بولی۔
"میں جانتی ہوں۔ سب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

"جی نہیں، سب میں شامل نہیں ہوں تو میمونہ بھائی کی شوخی خدا لوٹ آئی۔ بتا نہیں ام سنجیدہ گفتگو کیسے کر لی تھی انہوں نے۔"

"اب بھی شامل ہیں۔ وہ زور دے کر بولی تو میمونہ بھائی کھلکھلا کر نہیں۔ تبھی برا دے سے بھائی کے پکارنے پر وہ ہنسی روک کر کچھ تعجب سے بولیں۔
"یہ عدیل اس وقت کیسے آگیا۔"

"آسیہ۔ دوسری آواز کے ساتھ ہی عدیل بھائی کمرے میں آگئے۔
"جی بھائی۔" وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔
"وہ۔" وہ دیکھو نہیں اپنا جی بڑا ہے میں۔"

عدیل بھائی جس طرح ٹک کر بولے اُس سے وہ سمجھ گئی کہ اُسے وہاں سے ہٹانا مقصود اور اگر وہ صاف لفظوں میں کہتے تو وہ محتسب نہ ہوتی بلکہ چپ چاپ چلی جاتی جیکب آباد ملک جا کر فوراً چلی تھی۔
"میں آسیر کمرے کر اپنسل جا رہا ہوں۔ شاہ سکندر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ عدیل بھائی بہت میں میمونہ بھائی کو بتا رہے تھے۔
آسیہ نے متوقع فتح کو روکنے کے لیے ایک ہاتھ ہونٹوں پر اور دوسرے ہاتھ سے جو کہ سہارا لیا تھا۔

بی بی جان کا معمول تھا کہ وہ فجر کی نماز کے بعد تسبیح لے کر جو بڑے کمرے میں بیٹھتی تو پھر ڈھلنے تک اُن کی بیٹھک وہیں رہتی تھی۔ اس دوران مزارعوں کی عودیں انہیں سلام کرتے، اسی پہلے اپنے دکھ شکوہ انہیں سنا جاتی تھیں۔ کسی وقت کوئی بہو آ بیٹھتی۔ یہی اُن کی دعا لیکن اُس روز وہ اپنے کمرے سے نکلی ہی نہیں۔ بڑی بہو ناٹنے کا کہنے آئیں تو خلاف معمول بڑے کمرے کے بجائے ادھر دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگیں۔
"بی بی جان! خیر تو ہے؟"

"خیر ہے بی بی۔ بس بتا نہیں کیوں دل گھبرا رہا ہے؟" بی بی جان نے انہیں تسلی دینے کے کیفیت بھی بتا ڈالی۔
"چلیں آپ آرام کریں۔ میں ناشتا نہیں لے آتی ہوں۔ بڑی بہو جانے لگیں کہ وہ بولیں۔

"میں میرے لیے کچھ مدت لاؤ، میرا دل نہیں چاہ رہا۔ تم سب آرام سے ناشتا کرو پھر میرا پاس بیچ دینا۔"

"جی اتفاقاً بڑی بہو چلی گئیں اور بی بی جان مہر النساء کی شادی سے دن اور مہینے انگلیا کرتے میں تک گئیں۔ غالباً حساب لگا رہی تھیں کہ مہر النساء کی ڈیلیوری میں کتنے دن باقی اس خاندان کے رواج کے مطابق دو مہینے پہلے ہی مہر النساء کو اپنے سینکے چلے جانا تھا اور پھر تک وہیں رہنا تھا لیکن اُس نے خود ہی منع کر دیا تھا۔ بس جس روز نے اس نے شاہ جہاں پر شاہ سکندر رہے بائیں کرتے سنا تھا کہ وہ کچھ اپنی منوانے ہی تھی۔ آخر میں تو اسے

جانی تھی۔ شاہ جہاں گہرے تر تو نہیں جلا تھا نہ وہ اُس کی دھمکی سے مرعوب ہوئے تھے۔ بہر حال جب اُس نے سینکے جانے سے منع کر دیا تو ظاہر ہے کوئی زبردستی نہیں تھی۔ البتہ بی بی جان اُس کی طرف سے نکرہ مند رہنے لگی تھیں کہ ایک تو پہلا بچہ تھا دوسرے وہ اپنا خیال نہیں رکھتی تھی۔ کھانے پینے سے حد درجہ لا پرواہی کی بنا پر بہت کم روز بھی ہو گئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر جب بھی جیکب آباد کے لیے آتی اُس کی کمزوری کا سبب خود رک کی کمی بتاتی تھی۔ پھر بی بی جان سے کہتی کہ اُسے زبردستی کھائیں پلائیں۔ ورنہ کیس میں مشکل ہوگی۔ اور بی بی جان اُس پر ہر حربہ آزمایا کرتی تھیں۔ آرام سے پیاسے اور کسی وقت بڑی طرح اداسی بھی تھیں لیکن اس کا ایک ہی جواب ہوتا۔
"بس میرا دل نہیں چاہتا۔"

آخر کیا چاہتا ہے تھا اولاً، "ایک بار بی بی جان نے اسی طرح غصے میں پوچھ لیا تھا اور جواب میں اُس نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ بی بی جان اپنے آپ مجرم سی بن گئی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے اسے لوگنا چھوڑ دیا لیکن اُس کی نکرہ ہر وقت رہتی تھی۔

موتہ سننے جب لیڈی ڈاکٹر آتی تھی تو اُس نے مہر النساء کی ڈیلیوری میں بیس بائیس دن تلنے تھے۔ اور اُن کے دل اُسے ڈرپ لگنے کا کہا تھا۔ کچھ دیر میں اُس کی آمد متوقع تھی کہ وہ یہیں اُن کے پاس لیٹ جاتے گی۔ اصل میں وہ اُس کے ساتھ ساتھ اپنا دھیان بھی بنا نا چاہتی تھیں۔ جلنے کیوں صبح سے دل گھبرا رہا تھا۔ بابا جان بھی کل سے شاہ جہاں گہرے کماٹھ زینزل پر پڑے ہوئے تھے اور اپنی دایہ کے بارے میں بھی انہوں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔

"میں بی بی جان پر دودھ پی لیں بھوکو کوز ملا کر لاتی ہوں۔ بی بی جان نے ناشتے کو منہ کیا تھا تو بڑی بہو دودھ کا گلاس لے کر آگئی تھیں۔
"خوش رہو! بی بی جان محض اُن کا دل کھانے کی خاطر گلاس تھا مٹا جاتی تھیں کہ مہر النساء کی دل دوز

جستے دودھ کا گلاس دینے اور لینے والے ہاتھوں کے درمیان سے پینے جا رہا۔
"الہی خبر! بی بی جان نے دل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ بھی جیراں بھانجی ہوئی آئی۔
"وڈی بی بی، وہ چھوٹی بی بی میرے پیوں سے گر گئی ہیں۔"

"کون بہو بڑی بہو بھانجی گئیں اُن کے پیچھے تو اس باختر بی بی جان تھیں۔
مہر النساء کا جانے کون سی بیڑھی پر پاؤں مڑنے سے توازن بگڑا تھا کہ وہ فرش پر پڑے ہوش بڑی تھی۔ بی بی جان سے سچا سچ ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ ایک تو وہ پورے وزن سے تھی دوسرے تو اپنسل بھی فریب نہیں تھا۔

بڑی بہو نے جیراں کی مرد سے مہر کو اُٹھا کر وہیں صوفے پر لٹایا پھر پریشان کھڑی بی بی جان سے کہنے لگیں۔
"بی بی جان۔ آپ دیکھیں اسے۔"

"ارے میں کیا دیکھوں۔ وہ ڈاکٹر آئے ہی والی تھی۔ بتا کر اُس کا۔ شاہ سکندر کہاں ہے بھوجو سے لکھا ہٹ میں بی بی جان کے ہونٹوں پر شاہ سکندر کا نام آیا تھا۔
مہر النساء بے ہوشی کے عالم میں ہی کرا رہی تھی۔ شاہ و جو وہیں دردی لہز اسٹھنے لگی تھیں۔

بڑی بہو نے جیراں کو اپنے کمرے کی طرف دوڑایا کہ شاہ یونس حیات کو بلا لائے اور اتفاق سے ہی وقت ڈاکٹر آگئی۔ بڑی بہو نے فوراً اسے مہر النساء کے پیڑھیوں سے گرنے کا بتایا تو وہ اسی تیزی سے مہر النساء پر چھٹک گئی۔ جیکب آپ کے دوران ہی اُس نے سمجھ لیا کہ اب یہ کیس اُس کے پیڑھے باہر ہو چکی ہے۔ جس ایک انجکشن لگایا پھر بی بی جان سے کہنے لگی۔
"بڑی بہو! دونوں کی حالت شریک شاک ہے آپ انہیں کسی ہاسپٹل لے جائیں۔ ہو سکتا ہے آپ ریش

نا پڑے۔
"بڑی بہو سے دل گھبرا رہا تھا۔ کچھ ہوئے کہو۔" بی بی جان وہیں بیٹھ گئیں۔

جلدی کر دی بی۔ ہیں اور بھی کام ہیں۔ سسر نے کہا تو وہ اپنا دوپٹہ کھینچے ہوئے عدیل بھائی کے پیچھے چل پڑی۔
شاہ سکندر انہیں ایک آپریشن خیمہ میں لے گیا۔ اور اُسے کہاں کہاں اور کتنی چوئیں انہیں اس بارے میں احمد حسن بھی کچھ نہیں بتا سکا۔ تودہ بے اختیار ریش پڑی۔

ایک آپ سکندر کے ساتھ نہیں جاتے؟
آرام سے آہستہ اس طرح کر دی تو میں نہیں گھر چھوڑاؤں گا۔ عدیل بھائی نے دھیرے سے اُسے دہاتو اُس نے دونوں ہاتھوں میں چہرا چھپا لیا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی لیکن آنسو آپ ہی آپ چھلکے رہ گئے۔

میرے خدا! تجھے نہیں معلوم تھا کہ اتنی کم ہمت ہو۔ چلو یہاں بھٹو! عدیل بھائی نے اُسے کندھوں سے اٹھام کر بیچ پر بٹھایا پھر اُس کے ساتھ بیٹھے ہوئے احمد حسن سے پوچھنے لگے۔

آپ بتائیں احمد حسن۔ آپ کو شاہ سکندر کہاں اور کس حالت میں ملے؟
آہستہ آہستہ احمد حسن کا جواب سننے کے لیے فوراً پھیلپوں سے انہیں رگڑ کر ہاتھ پیچھے کر لیے۔
مجھے سکندر کہیں نہیں ملا۔ میں تو اسے آفس میں ملتا۔ وہاں ڈاکٹر احسن کا فون آیا اور انہوں نے بتایا کہ سکندر یہاں ہے۔ پھر میں آپ کو فون کرتے ہوئے یہاں آیا تھا۔ اور اسیر بھائی کو ساتھ لے کر آیا ہوں کہہ کر خود ڈاکٹر ہیں، ہم سے زیادہ کچھ سکتی ہیں لیکن! احمد حسن نے یکدم پچھا ہونٹ انہوں میں ڈبایا۔

سناقم نے، اتم سے زیادہ کچھ سکتی ہو۔ جاؤ معلوم کرو سکندر کے ساتھ کیا معاملہ ہے۔ عدیل بھائی نے اہل کا کڈنا لپٹک کر کہا تو اُس نے کاؤنٹر پر گھڑی زس کو دیکھا پھر ہلکی سی سر ہلا کر دلی۔

وہ سسر کچھ نہیں بتا سکے گی۔ ڈاکٹر بار آجائیں۔ اُن سے معلوم کریں گے۔ پھر کسی خیال کے تحت ڈاکٹر کاؤنٹر پر چلی گئی اور سسر کو متوجہ کر کے پوچھنے لگی۔

میں سسر! آپریشن خیمہ میں جویشنٹ ہے اُسے سختی دیر ہوئی ہے۔ آئی مین یہاں آئے ہوئے ہیں! اوجا۔ یون گھنڈہ ہولے! سسر نے گھڑی دیکھتے ہوئے بتایا۔
کوئی سیریس! آپریشن خیمہ کا دروازہ کھلنے پر اُس کی بات ادھوری رہ گئی اور ڈاکٹر کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے کے بجائے وہ جھاک کر اندر چلی تو کئی لیکن پھر اُسے اپنے بیسروں پر گھڑے رہنا شکل ہو گیا تھا۔

شاہ سکندر کا سر اور دھچا چہرہ سینڈیلوں میں جکڑا ہوا تھا۔ پھر ایک کندھے سے ہیٹ تک اور میں نامک پلاسٹک قید میں تھی۔

آہستہ! وہ زسے کو کئی کہ ایک ہاتھ اُس کے کندھے پر ان ہتھلے! تم آہستہ ہوناں! آہستہ! اس نے کم کم انداز میں دیکھا۔ وہ ڈاکٹر عبدالوہاب تھے۔ جن سے پریکٹیکل کے دوران مول احمد حسن نے اس کی کئی بار ملاقات ہوئی تھی۔ بہت مہربان اور شفقت، جن کے بارے میں وہ کہا کرتی تھی کہ اگر کبھی میں اپنی زندگی سے ماویس ہو گئی تو میری آخری امید ڈاکٹر عبدالوہاب ہوں گے۔
سسر! ملو! اسی کم کم انداز میں اس نے شاہ سکندر کی طرف اشارہ کیا تو وہ پوچھنے لگے۔
وہ اس کے ساتھ بولا۔

فونٹ وری۔ ہی اراؤٹ آف ڈیجر۔ (یہ خطبے سے باہر سے) کم ان گول بی بریز! ڈاکٹر وہاب نے کاندھ جھٹک کر بولے پھر اسی طرح اُسے اپنے ساتھ لگے ہوئے آپریشن خیمہ سے باہر لے گئے۔
فونٹ وری! عدیل اور احمد حسن سوائے نظروں سے دیکھنے لگے۔

”جو صدمہ رکھیں بی بی جان! بڑی بھونے کہا اور شاہ یونس کو آتے دیکھ کر ان کے پاس چلی گئی کچھ دیر بعد بی بی جان اور بڑی بھونے مہر النساء کو لے کر شہر روانہ ہو رہی تھیں۔ لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ تھی۔ سفر خاصا طویل تھا۔ عام حالات میں دھانی تین گھنٹے بھاری لگتے ہیں اور اب پیر ہی تھی۔ تمام راستہ بی بی جان قرآنی آیات کا ورد کرتی رہی تھیں۔ انہیں اور بڑی بھونے چٹا نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے۔ ڈاکٹر نے ڈرائیور کی رہنمائی کی تھی۔
اور ایک پرائیویٹ کلینک میں دو دن موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا تھا۔
”پوتا مبارک ہو بی بی جان! ماشاء اللہ بہت خوبصورت ہے۔ بالکل اپنے باپ پر گلیا۔
بھونے پختہ بی بی جان کی گود میں دلستے ہوئے کہا تو وہ نزل آئیں۔

”خیر مبارک۔ تمہیں بھی مبارک ہو۔ مہر و کبھی ہے! بڑی بھونے کے پاس بیٹھے ہوئے کہنے لگیں ڈاکٹر! مہر و ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ بڑی بھونے بی بی جان کے پاس بیٹھے ہوئے کہنے لگیں ڈاکٹر! جو ہو گئی تھی۔ بالکل سفید بڑی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر بوجہ وہی تھی اُسے کھانے کو نہیں دیتے! بتاؤ کھانے کی کمی ہے کیا۔ وہ خود نہیں کھاتی! بی بی جان نے ناکواری سے سر جھٹکا پھر بولا۔
”گھر کب چلنا ہے!“
مہر و اپنے کے قابل ہو گئی تب تو۔ ڈاکٹر کبہ رہی تھی کم سے کم ایک ہفتہ لگے گا! بڑی نے بتایا تو بی بی جان اچھبے سے بولیں۔

”اتنے دن!“
”گھر کب چلنا ہے۔ البتہ آپ جانا چاہیں تو شاہ یونس آئیں گے۔ اُن کے ساتھ آجائیں گے!“
”ہاں۔ میں کہاں اتنے دن گھر چھوڑ کر بیٹھ سکتی ہوں! بی بی جان نے تائیدی انداز میں بھونے کہا تھا۔

آہستہ آہستہ خود کو سمجھنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ تمام رستے وہ کسی سہمی ہوئی بجلی کی طرح کا بازو مضبوطی سے تھامے رہی تھی۔ اور عدیل خود بھی پریشان تھے پھر بھی اُسے مسلسل رہے۔ پھر اُسے بازو کے حلقے میں لے کر کلینک میں داخل ہوئے تو احمد حسن انہیں دیکھتے آیا تھا۔

ارے بھائی! آپ کو کیا ہوا۔ ہمت کریں۔ آپ تو خود۔
”سکندر کیسے ہیں؟“ اُس نے ساری باتیں پکی کر کے نوک دیا۔
”ٹھیک ہو جائیں گے۔ چلیں آپ خود دیکھ لیں! احمد حسن نے کہتے ہوئے لفٹ کی طرف کیا تو عدیل پوچھنے لگے۔

کہاں۔ آپریشن؟
”ہاں۔ یہاں میٹرنٹی ڈیپارٹمنٹ میں تو نہیں ہو سکتے! احمد حسن نے قصداً ہلکا ہلکا اختیار کیا۔ جسے نظر انداز کر کے وہ فوراً لفٹ کی طرف بڑھی تھی گر کڑوں میں ہلکا سا جھٹکا اُس کے قدم آپ ہی آپ ٹک گئے۔ ہلٹ کر دیکھا تو ایک زس اسٹرپچر دھکیلتی ہوئی تھی جس کے کونے میں اُس کا دوپٹا الجھ گیا تھا۔

”سسر! بھونے! وہ اُسے روک کر اپنا دوپٹہ نکالتے گی اور اس دوران بس ایک سرسبز! اسٹرپچر پر بیٹے کندھے بڑی لڑکی پر ڈالی۔ اگر اس وقت اُس کا زہن اس بڑی طرح متاثر نہ ہو ایک بل کر فضیلت ضرور اور پھر کہاں دیکھا ہے!“ میں الجھتی ہوئی آگے بڑھتی لیکن اُسے اپنا نہیں تھا۔

پہر ملتی نظروں سے عدیل بھائی کو دیکھا تو وہ اس کی کیفیت سمجھنے کے باوجود چلنے کا اشارہ کرنے لگے۔

دو میمونہ بھائی سے کہہ کر سوئی تھی کہ اسے دو گھنٹے بعد اٹھا دیں۔ غالباً اس کے خیال میں دو گھنٹے کی بندش کو فریض کر دے گی اور میمونہ بھائی نے باقی تو بھرتی تھی لیکن اٹھایا نہیں کیونکہ عدیل تھی سے منع کرتے تھے۔ پھر وہ خود بھی اس کی حالت دیکھ رہی تھیں، بیچو کی پیاسی رات بھر کی جاگی ہوئی۔ اماں، بی بی نے زبردستی اسے ناشتا کرایا تھا اور پھر جو وہ دو گھنٹے کا کہہ کر سوئی تو وہ پھر نہ چلنے پر ہی اٹھتی تھی اور زندگی میں پہلی بار میمونہ بھائی سے اٹھ پڑی۔

اب کو بتا ہے میں سکندر کو کس حال میں چھوڑ کر آئی تھی پھر آپ نے مجھے اٹھایا کیوں نہیں۔ بہت فکر ہے میری۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔

میمونہ بھائی اس کے فیمز بولنے پر بالکل خاموش رہیں۔ ایک لفظ نہیں کہا۔ یہاں تک کہ اسے خود احساس ہو گیا۔ خاموش ہوئی تو اسے کہنے لگے۔

”دیکھو، دو موت۔ بے شک گالیاں دے لو مجھے، میمونہ بھائی نے فوراً ٹوٹا۔

”ہاتھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ روئے ہوئے میں کہتے ہوئے ان کے پاس سے اٹھ گئی۔ آنا ہی بھی اپنل گئے ہوتے تھے۔ اس لیے اسے انتظار کرنا پڑا کہ عدیل بھائی انہیں چھوڑنے آئیں گے تب وہ ان کے ساتھ چلے گی۔ اس دوران میمونہ بھائی نے اسے کھلانے کے بعد چائے اور ساڑھے میں اپنی باتوں سے بہت حد تک اسے ذہنی امتحان سے نجات دلا دی تھی کہ پھر وہ سکندر کے پاس بہت نازیل حالت میں گئی تھی۔

شاہ سکندر کو محفل ہوش میں آنے میں تین دن لگے تھے۔ اور اسی روز اس کے سر اور ہجرے کی میڈیکل کونسل دی گئی۔ چہرے پر معمولی رقم تھے البتہ سر میں کافی ٹانگے آئے تھے۔ آسینے ڈاکٹر وہاب نے کچھ پرفورمنس کیا پھر معطل سی ہو کر بولی تھی۔

”میرا خیال ہے سر، یہ رقم بھاری بھر جائے گی۔“

”ہوں، جب میں یہ بات کہہ رہا تھا تو تم یقین کیوں نہیں کر رہی تھیں؟ ڈاکٹر وہاب نے مسکرا کر کہا۔

”میں ان کی بے ہوشی سے خائف تھی؟“

”اب تو مطمئن ہونا۔“

”میں سر، وہ شاہ سکندر کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔

”گدا ڈاکٹر وہاب نے اپنے شفیق انداز میں ہلکے سے اس کا سر تھپکا پھر شاہ سکندر کو دیکھ کر کچھ محفوظ انداز میں اس سے کہنے لگے۔ ہمارے ہاں جب لڑکیوں کی شادی ہوتی ہے تو پھر وہ صرف بیوٹی بن کر رہ جاتی ہیں۔ گزشتہ تین دنوں سے میں اس لڑکی کو دیکھ کر حیران ہوا ہوں جیسی ایک لڑکی بھی یہ وہ نظر نہیں آتی جیسا میں اسے دیکھنے کے دوران دیکھتا تھا۔ بہت اکیڈمک، بہت اسارٹ۔ اور ابھی اگر اس سے ایک انجکشن بھی تیار کرتے تو کہتا تو یہ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بھول گئی کہ یہ ایک ڈاکٹر بھی ہے۔“

بہن مسکراہٹ سے شاہ سکندر کے ہونٹ ذرا سے پھیلے تھے۔ جبکہ آسینے نے قدرے جھینپ کر سر تھپکا۔

”آج بھی بات ہے لیکن اس سے اچھی بات یہ ہوگی کہ تم بیوی کے ساتھ اپنا ڈاکٹر ہونا بھی یاد رکھو۔“

”میں نے نہیں اٹھا کر ڈاکٹر صاحب کو چلتے ہوئے دیکھا پھر احتیاط سے شاہ سکندر کے پاس بیٹھی اور آپ کی باتوں میں سے لے کر اس کی سے پوچھنے لگی۔

”تم کیسا عجیب کر رہے ہیں؟“

”آپ کی باتوں کو توئی تم کوئی تکلیف نہیں۔ شاہ سکندر اس کا ہاتھ دبا کر کہنے لگا۔ میں جانتا ہوں مجھے

آسینے نے ذرا سا سر ہلا کر انہیں اطمینان دلایا تھا۔

پھر شاہ سکندر کو کمرے میں منتقل کرنے تک وہ ایک طرف چپ چاپ بیٹھ رہی تھی۔ اس کا بھی شک کام نہیں کر رہا تھا اور اندر گہری خاموشی چھائی تھی۔ عدیل بھائی شاید ڈاکٹر عبدالوہاب کے ان کے کمرے میں چلے گئے تھے اور اچانک حسن میں نرمی کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے بلانے کو کہہ کے طرف نے جایا گیا تب بھی وہ اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھ رہی تھی، پھر عدیل بھائی اسے اٹھایا تھا۔

رات میں میمونہ بھائی اور خلیل بھائی آگئے اور آسینے کے حالات کے پیش نظر انہوں نے بہت اسے اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔ عدیل بھائی نے بھی بہت زور دیا لیکن وہ نہیں مانی اور وہ لڑی اس نے ایک کرسی پر بیٹھ کر گزار دی تھی۔ صبح ہونے سے کچھ دیر پہلے شاہ سکندر کو ذرا سا ہوش آیا تو اسی انتظار میں بیٹھی تھی۔ فوراً اٹھ کر اس پر جھک گئی۔

سکندر! آپ صلیک ہیں ناں؟ شاہ سکندر ایک آنکھ ذرا سی کھول کر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر آنکھ بند کر لی تو اس نے آہستہ آہستہ تمام کر لیا۔

”سکندر! پھر اس کی بغض چمک کی اور قدرے مطمئن سی ہو کر اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ بعد ہی اندر صبر سے چھپنے لگے اور کھڑکی کے شیشوں پر ابلے کی دستک کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں آرتے لگی تو اس نے دوش روم میں جا کر منہ پر پانی کے پھینٹے مارے۔ ابھی بھی وہ ہونا نہیں لیکن نیند غالب آ رہی تھی جسے جھگانے کے لیے وہ اوجھڑے اور صبر کرنے لگی۔ بہت مشکل گھڑی سے کچھ گھبراہٹ نہیں تھا۔ سرانگ دروسے پھٹا جا رہا تھا۔ دروازے کے باہر قدموں کی آواز تو وہ رنگ کر دیکھنے لگی۔

عدیل بھائی کے ساتھ ڈاکٹر عبدالوہاب اندر آئے تھے۔ اس پر نظر پڑتے ہی مسکرا کر بولے۔

”گدا مار ننگ۔ کیسا ہے تمہارا پینٹ؟“

”سر! ایک گھنٹہ پہلے انہیں ہوش آیا تھا۔ بس تھوڑی دیر کے لیے اس نے قریب آکر تپا صاحب کوئی حقیرہ کیے بغیر شاہ سکندر کو چمک کرنے میں لگ گئے۔ پھر سسر کو ہدایات دیں گے بعد عدیل بھائی کی طرف متوجہ ہو کر کہتے تھے۔

”فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ گو کہ جو میں کافی آتی ہیں لیکن شکر کہ اس کوئی گہری جوتھ نہیں پھر آسینے کی طرف اشارہ کر کے پوچھنے لگے۔ آپ اس کے کون ہیں؟“

بھائی، عدیل اس غیر متوقع سوال پر اسے دیکھ کر بولے تھے۔

”بڑے یا چھوٹے؟“ ڈاکٹر صاحب انتہائی سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے جس پر عدیل کو بھی خواب دینا پڑا۔

”کسیے بڑے بھائی ہیں جو انہیں ڈانٹ نہیں سکتے۔ ان کی حالت دیکھ رہے ہیں آپ۔“

”پہنچنا میں درد اس مرہین کی جگہ یہ لیٹی نظر آ رہی گی؟“

ڈاکٹر وہاب عدیل کو قید کر کے بعد اس سے قدرے ذرا عجب سے بولے۔

جلو آسینے کے جاؤ۔ اسلام کو ذرا دیکھ کر فریض ہو کر یہاں آنا۔

میں صلیک ہوں سر، وہ کمزور سی آواز میں بولی۔

اس حال میں دیکھ کر ہمیں ڈنکہ ہو رہا ہے لیکن میں نے جان بوجھ کر تمہیں ڈنکہ نہیں دیا۔
 میں آپ زیادہ باتیں نہیں کر سکتا۔ آج سے لے کر پچھلے دنوں دیا پھر خیال آئے پرکھو
 "سکندر انہیں جہانگیر بھائی کو اطلاع دینی چاہتے ہیں کہ بعد میں وہ ناراض ہوں گے۔"
 شاہ سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا اور یوں انھیں بند کر دیے۔ اب اس میں ہرگز
 نہ ہو۔ وہ کچھ دیر تک انتظار کرتی رہی پھر اسی احتیاط سے اس کے پاس سے اٹھ گئی اور اپنے آپ
 لگی کر وہ شاہ جہانگیر کو فون ضرور کرے گی۔ آخر وہ سکندر کے بڑے بھائی ہیں اور ناراض بھی نہیں
 ہو سکتا ہے اسی پہلے بی بی جان اور بابا جان بھی آج ہیں۔ شاید قسمت میں ان سے ملنے اور
 منولے کا یہی بہانہ نکلا ہو۔ اتنے مشکل تو وہ نہیں ہو سکتے کہ شاہ سکندر کے ایکسڈنٹ کا سن کر
 آئیں۔ ضرور آئیں گے۔

کھڑکی کی جڑ کھٹ پر دونوں کہنیاں لگائے نیچے دیکھتے ہوئے وہ مسلسل اسی بیج پر سوچا۔
 کہ سیاہ چمکتی ہوئی لمبی سی گاڑی میں بیٹھی لڑکی پر نظر پڑے، ہی اس کے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔
 مزید آگے جھک کر اس لڑکی کا پورا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی
 کیونکہ لڑکی اپنی گود میں نورانیدہ بچے کو دیکھنے میں اس قدر غرق تھی کہ اسے گرد و پیش کا بالکل ہوش
 یا وہ قصد اپروا نہیں کر رہی تھی۔

"کون ہے؟" کہیں دیکھا ضرور ہے۔" اس نے اٹھنے کی سعی کی۔ تبھی گاڑی چلنے سے لڑکی نے یونہی برا
 تو بس ایک پل کو اس کا چہرہ سامنے آیا تھا۔ اس کے بعد گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔
 کہاں دیکھا ہے۔" اس نے ابھی بھی الجھ رہی تھی اور شاید مقصدی کوشش سے اسے یاد آ جاتا
 ہے پہلے ہی عتب سے عدیل بھائی نے پکار لیا تھا۔

"آپ کب آئے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔
 کہاں ہے۔" تباہ سے ملنے ہی تو آیا ہوں۔" کیا تم نے نہیں دیکھا؟ عدیل بھائی نے مسکرا کر کہا
 نے بے اختیار پلٹ کر کھڑکی سے باہر دیکھا پھر کھری سانس کھینچتے ہوئے بولی۔

"نہیں، میں کسی اور کو دیکھ رہی تھی۔"
 کہتے؟" عدیل بھائی نے بیچ بکس میں پل پر رکھتے ہوئے یونہی پوچھ لیا۔
 وہ ایک لڑکی۔ شاید میرے ساتھ پڑھتی تھی یا پتا نہیں۔"
 اس کا دھیان عدیل بھائی کے آنے سے ہی ہٹ گیا تھا۔ جیسی سرسری انداز میں کہتے ہوئے
 کہنے لگی۔

"سکندر کی طبیعت اب کیسی ہے؟" عدیل کی نظر میں شاہ سکندر کے چہرے کو دیکھنے لگی تھیں
 کافی بہتر ہیں۔ ابھی باتیں بھی کر رہے تھے۔ پھر سو گئے۔ آپ پکار کر دیکھیں شاید۔"
 نہیں، سوئے دو۔ عدیل بھائی نے فوراً ٹوک کر اسے ڈسٹرب کرنے سے منع کر دیا تھا۔

شاہ سکندر ابھی گھر آئے کو تیار نہیں تھا۔ گو گود میں اس کے تمام زخم بھر چکے تھے
 نالنگ پر پلاسٹر لگائی تھا اور وہ اسی کی وجہ سے منع کر رہا تھا کہ اسے کو پریشانی ہوگی۔ اس کے ذہن
 کام کے لیے دور کرتی رہے گی۔ اپنے نہیں وہ اسے پریشانی سے بچانا چاہتا تھا لیکن اسے
 پریشانی کا خیال تھا۔ صبح شام اسے کھانا پہنچانا، پھر عبادت کو انا۔ گو کہ بھائیوں نے بھی
 نہیں ہونے دیا تھا کہ انہیں ایسا دفرہ چھوڑ کر ناپرتاب ہے لیکن اسے خود احساس تھا اس لیے وہ
 کی اجازت ملتے ہی وہ شاہ سکندر کو گھر لے آئی اور اتنے ہی بولی تھی۔
 اب آپ صرف میرے پیشکش ہیں۔ اور جیسا میں کہوں گی ویسا کر س گے۔

میں پہلے بھی تمہارے حکم کا غلام رہا ہوں۔"
 شاہ سکندر کی شوخ مسکراہٹ پر وہ انگلی اٹھا کر علیحدگی انداز میں بولی۔

"مذاق نہیں، میں بالکل سنجیدہ ہوں۔"
 یہ مذاق ہے۔ بتاؤ میں نے کب تمہاری بات نہیں مانی۔ میری جان تم دن کو رات کہو میں وہ
 بھی مان لوں گا۔" شاہ سکندر نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دے کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے بولا۔
 "میری ساتھیوں کی دوسرا آپ کے ساتھ بندھی ہے سکندر اگر آپ اپنا خیال نہیں رکھیں گے تو۔"
 اس کی آواز بھرا گئی۔
 بے وقوف شاہ سکندر نے اس کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ میں جانتا ہوں تمہارا دل بھول
 کی جیستی ہے۔ جس کی نگہبانی مجھے سوئے کر تم نے کیجئے آنا یا بند کر دیا ہے کہ میں چاہوں تو میری خود سے غانا
 نہیں ہو سکتا۔"

وہ نگہبانی نہیں کھاتی تھی؟ وہ اس کے سینے پر سے سر اٹھا کر اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔
 اپنی میں کوگر ساری سہولتیں موجود تھیں لیکن کچھ کچھ گھر جیسا ہے اور اپنے گھر کی اضافی ضرورتیں
 بھی کم از کم وہی گرفت میں مبتلا نہیں کرتی اور اس کے پاس تو یوں بھی اٹھتی کوئی زیادہ ضرورت
 نہیں کہیں صبح دوادری کا ناشتا منٹوں میں بن جاتا۔ پھر وہ شاہ سکندر کو اخبار پھا کر صاف ستھرت
 گھر کے برائے نام صفائی کرتی، اس کے بعد اس سے دوپہر کے کھانے کا پوچھنے آتی تو وہ کی گھنٹے اسے
 دوسرا دھوکے باتوں میں لگاتے کہتا اور آخر میں کتنا جو تہہ لاول چاہے پکا لو۔ میں سب کھاؤں گا۔"
 پھر بیچتی اٹھ جاتی۔

شام میں عدیل بھائی ضرور پکڑ لگائے تھے جن سے وہ ضرورت کی اشیاء منگوا لیتی تھی۔ چینی کے
 نیل بھائی، میسون بھائی اور بچوں کے ساتھ آئے تھے اور ایک شام بڑے بیٹا سا بڑا بھائی کو لے
 آئے تھے تو انہیں دیکھ کر اسے ہلکا خیال آیا تھا، جسے فون کرنے کا اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔ یا
 شاید اپنی پریشانی میں گھر کر یا دی نہیں رہا تھا۔ اور ایک احمد حسن تھا جو شاہ سکندر کو کچنی دینے
 آتا کسی روز آئے سے مجبور ہوتا تو فون پر اس سے بہت دیر باتیں کرتا تھا۔ اس شام وہ نامانوس
 کر آیا تو وہ اسے دیکھ کر خوش ہونے کے ساتھ ناراض بھی ہوئی۔

میں نے نہیں صبح سے آئے کو کہا تھا۔"
 احمد بھائی سے پوچھیں۔ روزانہ سے کہتی ہوں مجھے آپ کے ہاں چھوڑ دیں۔ لیکن، نہیں، اس سے
 نہ بدیں، بڑی ہے۔" ناموسہ صاف کوئی سے کام لے کر اپنا دامن بچا لیا۔

نور احمد بھائی۔ کیا آپ ناراض نہ ہوئے؟ اس سے یہ نہیں ہو سکتے۔ اس نے احمد حسن سے
 باوجود فوراً بولا تھا۔
 آپ کی خاطر ہی تو جلدی جاتا ہوں۔"

کیا مطلب؟ وہ وہ بھی نہیں۔
 مطلب یہ کہ اس نالٹائی بچی کی عادتیں کچھ بگڑی ہوئی ہیں۔ جتنی اونچی آواز میں بولتی ہے اس سے زیادہ
 دہش آواز میں نیپ بجاتی ہے۔ اگر یہ صبح سے یہاں آگئی تو شام تک آپ دونوں پورے ہیں تو اسے
 گل ضرور ہو چکے ہوں گے۔ اس لیے میں صبح اس جلدی بھانجیوں تاکہ اسے یہاں نہ چھوڑنا پڑے۔

احمد حسن کی وضاحت پر ناموسہ تیار کر بیٹھی تھی تو وہ جلدی سے اس کے گلے میں بازو ڈال کر بولی۔
 مجھ سے نہیں روٹنا۔ میں نے احمد بھائی کی کسی بات پر یقین نہیں کیا۔"
 میں جو یقین کر رہا ہوں۔" شاہ سکندر نے احمد حسن کو اٹھ مارتے ہوئے شرارت سے کہا۔

شاہ سکندر نے اسے سکندر آپ کو نالٹا کو ناراض نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے اسے ٹوکنے کے ساتھ شاہ سکندر
 اس سے بچنے کی منگ کیا پھر ناموسہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے بولی۔" آؤ ہم ادھر چلتے ہیں۔"
 لیکن، شاہ سکندر نے فوراً پوچھا۔

دیں پڑنے بناتے جا رہی تھی۔ عدیل بھائی پتا نہیں کہاں رہ گئے۔ میں نے ان سے دودھ منگوا لیا تھا۔"
 یہ بڑے بڑے ناموسہ کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔

”سکندر بھائی کی ٹانگ کا پلا سٹرکب اترے گا۔ آپ تو خاصی پابند ہو گئی ہوں گی“ نائلہ نے کچن دروازے پر ٹک کر کہا۔
 ”ہاں بس“ ویسے اب ایک ڈیڑھ ہفتے کی بات ہے۔ پلاسٹر اتر جائے گا۔ اُس نے چلنے کا پا جو پلے پر رکھتے ہوئے بتایا۔
 ”دو دو سو ہے نہیں۔ چلنے کیسے بنائیں گی“ نائلہ نے اُس کے چوہا جلاسنے پر لڑکا۔
 ”اُسے ولے ہوں گے عدیل بھائی“ اُس نے کہا تبھی اندر سے شاہ سکندر نے اُسے پکارا تو وہ نائلہ کو آتی ہوں کہہ کر اندر چلی آئی۔
 ”فرمائیے“

”وہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ کھانے میں وہی دو پہر والا سالن ہو گیا کچھ اور بھی“ شاہ سکندر نے غالباً بتانا چاہا کہ احمد حسن اور نائلہ یہیں کھانا کھا رہے تھے۔
 ”اور بھی بہت کچھ“ وہ اس کا مطلب سمجھ کر بولی تھی۔
 ”نہیں۔ ہمارے لیے کوئی لکھت نہیں“ احمد حسن بھی سمجھ گیا اور فوراً منع کرتے ہوئے بولا: ”کھانا پکانے کی ضرورت نہیں ہے بھائی۔ بس چلنے ٹھیک ہے“
 ”تم سے کسی نے پوچھا ہے“ شاہ سکندر، احمد حسن لوگ کُرا اُس سے کہنے لگا: ”ہاں اسیہ میرے بہ کسٹروڈ ضرور بنالینا“
 وہ اثبات میں سر ہلاتے، دوبارہ کچن میں آئی تو عدیل بھائی کو نائلہ کے ساتھ کھڑے دیکھ کر ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیل گئی اور کوئی بات نہ ہوتے ہوئے بھی عدیل بھائی تقدسے کچھ سمجھ رہے تھے۔
 ”دیکھو کوئی تیز تر تو نہیں گئی“

”اس وقت ضرورت صرف دو دوہ کی ہے اور وہ موجود ہے۔ وہ بڑے سے شاپرے دو دوہ نکالتے ہوئے بولی۔ پھر اُسے نائلہ کو تھما دیا۔
 ”وہ دو دوہ کی پتیلی کبھی ہے بلینز سے کھولا دو یا
 ”تم مہاروں سے کام کروانی ہو“ عدیل بھائی نے جاتے جاتے رک کر اُسے لٹکا۔
 ”مہار کسے کہہ رہے ہیں آپ“ انجیے باپ نے آپ کو؟“ اسیہ سے پہلے نائلہ نے بول کر انہیں لاو دیا تھا۔ کام تو وہ بھی بھی بھی کر کے اترے تھے وہ بھی باہر کا۔
 ”کوئی مہار نہیں ہے یہاں، سب میرے اپنے ہیں۔ بھائی میں اور تم۔“ اسیہ نے رک کر دیکھا پھر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دھیمی آواز میں پوچھنے لگی: ”نہیں کیا کہوں؟“
 نائلہ نے اُس کی معنی خیز مسکراہٹ سے بوگھلا کر بے اختیار اُس کے پیچھے کھڑے عدیل کو دیکھا

خلاف رم شاہ سکندر کے بچے کے حقیقت پر خاندان بھر کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ یہاں تک نے اپنی بیٹیوں کو بھی نہیں بلا لیا تھا۔ اتفاق سے شہر بانو خود ہی اُس روز صبح کو دیکھنے اور دیکھنے لگی تھی۔ یہاں اگر جب اُسے بچے کے حقیقت کا معلوم ہوا تو جہاں وہ حیران ہوئی وہاں کر ایسا شاہ سکندر کے یہاں نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ پھر بھی بی بی جان سے کہے بغیر نہیں رہے۔ بی بی جان انخیشاں اپنی خاموشی سے نہیں منانی جاتی تھیں، آپ کو کم از کم میرے تسمیل کرنی چاہیے تھی۔ آخر وہ بچے کے نانائانی ہیں۔
 ”شاہ سکندر راجا جیسے پھر بہت خوشیاں منائیں گے۔ بڑی دھوم کے ساتھ۔ اُنے والا ہے بی بی جان نے دھیرج سے اور یقین سے کہا تھا۔
 ”اگر واقعی سکندر بھائی اُسے ولے ہیں تو یہ خوشی اُن کی آمد پر ہونی چاہیے تھی۔ اچھی کیوں؟“ کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔

مجھ ہی ہے۔ آج پندرہ سال دن کا ہو گیا ہے۔ صد قد منا ہے اس کا۔ اور نام بھی رکھنا ہے۔ بی بی جان ہوری تیار کر فوراً بات بدل گئیں۔ ”تم جاذبہ کے پاس۔ دیکھو وہ بچے کا کیا نام بتاتی ہے نہ۔ وہ سمجھتی ہے اسے“ وہاں سے اٹھنا ناقصو دے اور بی بی جان نے اُسے بھیجی بھی اُس کے پاس جس کے ماننے وہ خود کو جرم محسوس کرتی تھی۔
 ”میں مبارک ہو بہرہ شہر بانو کو خوشی کے اٹھارہ میں بھی کوشش کرنی پڑی تھی۔ لاؤ میری گود میں دو“

مہر النساء نے جب چاپ بچہ اپنی گود سے اٹھا کر اُس کی گود میں ڈال دیا۔
 ”اے یہ تو بالکل۔ شہر بانو اپنی بے اختیاری پر فوراً پختہ ہوئے دانتوں میں دبا گئی۔
 ”تم تو یوں خاموش ہو گئیں جیسے شاہ سکندر کا نام لینا گناہ ہو“ مہر النساء نے سبک کر جتایا، پھر وہ نہر کے انداز میں سر جھٹک کر بولی۔
 ”گناہ صرف میرے لیے ہے۔ میں گناہ گار ہوتی ہوں اُس کا نام لے کر اُس کے بارے میں کوئی سوال کرے۔“
 شہر بانو اُس سے نظر میں چلا کر بچے پر جھک گئی اور قدرے توقف سے اُس کا دھیان بنانے کی خاطر پوچھنے لگی۔
 ”کیا نام سوچا ہے اس کا؟“

”میں نے“ مہر النساء نے کسی خیال سے چونک کر شہر بانو کو دیکھا پھر تلخ آہستہ آہستہ ہنسی کے ساتھ کہنے لگی: ”بچہ۔“ اُس کا نام۔ ”میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں کیا۔ میں تو اس عرصے میں صرف اس کے باپ کو سوچتی رہی ہوں۔“
 ”اُسے ولے ہیں سکندر بھائی“ شہر بانو کو غالباً کچھ اور نہیں سوجھا تو بی بی جان کی بات دہرا دی لیکن ان میاں بچوں کے بلے میں نہیں تھا۔
 ”اتھار کیا انہیں اطلاع مل چکی ہے اس کے کہنے کی؟“ مہر النساء نے بچے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔
 ”بتائیں شہر بانو نے اطلاع کا اظہار کیا پھر ایک دم اُس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگی: ”مہر وہ تم مجھ سے بہت دور ہو گئی ہو۔ ہمارے درمیان ایسی تلخ اور رسمی باتیں تو بھی نہیں ہوتی تھیں۔ سچ جانا کیا ہم دونوں کی محبت اور دوستی سکندر بھائی کی وجہ سے بھی جو ان کی بے مہری سے تم نے مجھ سے بھی وہ مار کے ناتے توڑ لیے ہیں؟“

مہر النساء اچانک گم سم ہو کر اُسے دیکھنے لگی تھی۔
 ”مہر مگر زناوی نہیں ہم راز بھی تھیں گھنٹوں نہیں بارہ دری میں کبھی آہم کے گھنٹے بیٹھتے اور گرمیوں کی لڑائی میں تاروں کی لچاؤں میں ہم کیسے راز چھپا کر کرتی تھیں۔ ہمارے دل شفاف آئینے جیسے جھان پرکھو رتوں کی دھول کیوں جی باکر سکندر بھائی کی وجہ سے تو آج میں تمہارے سلتے قسم عاقی ہوں کہیں زندگی بھر اس بھائی کی نہ اُس کی آواز نہ لگتی۔“
 مہر النساء نے بھی اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”میں نے دو بچے، انہی کی وجہ سے تم مجھ سے دور ہوئی ہو“ شہر بانو نے ہونٹوں سے اُس کا ہاتھ ہٹا کر مزید گویا ہوئی۔ ”میرے ساتھ تو شاید تمہارا کوئی نا تھا ہی نہیں۔ نہ تختہ نہ دوستی کا نور۔ سب سے پہلے تم مجھ سے تھیں کہ شاہ سکندر جو بلی چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس کے بعد بھی تم نے ایسی تمہارے بچوں کے دکھ مجھ میں سلتے۔ کیونکہ کم نے مجھے، بیشہ صرف شاہ سکندر کی بہن سمجھا، اور اگر اُس کے جرم کی سزا مجھے دینے سے تم نے“
 ”نہیں شہر بانو! مہر النساء نے فوراً ٹوک دیا۔ ”میں تمہارا گھر نہیں آ جاؤں سکتی۔“
 ”کیوں؟“ شہر بانو نے خوش ہونے کے شہر بانو نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”تم آج تک اس کو نہیں دیکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مہر النساء آتھیں۔ میں چہرا چھپا کر
شہر بانو نے اسے چپ ہنسی کر دیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دل کے آئینوں پر بھی لکھوڑوں کی دھڑ
آنسوؤں سے بنے گی اور اس نے اپنی ہیکلوں کے بند بھی توڑ دیے تھے۔
اور جب آنسو اب ہی اب ختم ہو گئے آئینوں کی طرح دل کے آئینے بھی دھل کر شگاف ہو گئے
تب مہر النساء بچے کو دیکھ کر سکتا رہے ہوئے۔ بولی۔
”اس شاہ کو دیکھو، کیسا بے خبر سو رہا ہے، ماں! ابھی مجھ کے آنسوؤں کی پروا ہی نہیں۔“
”بہت پروا کرے گا۔ بڑا تو ہوئے دوں شہر بانو بھی کھل کر مسکرائی۔ اور چوہ ویر بعد ان دنوں
ہنسی کا ترنم گھر کے باہر تک سنائی دے رہا تھا۔“

دو مہر کے کھانے کے بعد اس کا ارادہ کپڑوں کی دھلائی کا تھا، لیکن شاہ سکندر نے سختی سے
اسے اپنے پاس بٹھالیا اور لوٹکے ہوئے بولا۔
”جس شوق ہے کام کرنے کا۔ صبح سے آٹھ بجے ہو تو ایک کے بعد ایک کام نکالتی چلی جاؤ۔
اتنی ہی قبول اور نہ زبردستی۔“

اس نے بچہ بچہ کے لیے منہ کھولا لیکن شاہ سکندر نے موقع نہیں دیا۔
”سولے بجے آئے، کھانے کے سب غیر ضروری ہیں۔ تم خواجہ خور کو آگیاؤ دھتی ہو۔ مجھے تمہارا
کی طرح کام کرنا اچھا نہیں لگتا۔ فوراً کسی ماسی کا انتظام کرو۔“
”نہیں، ابھی ماسی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کون سا ہمارے ہاں اتنا گند پھیلتا ہے جو ماسی کو
کمرے لگی۔ اور کپڑے بھی زیادہ نہیں ہوتے۔ اس نے ماسی دھنے کو صاف منع کر دیا۔
”کام زیادہ ہو یا کم تم بہر حال ساڑھ دن معروف رہتی ہو کہ نہیں۔ شاہ سکندر کو غالباً اس کا نام
رہنا کھل رہا تھا۔“

”میں قصداً خود کو معروف کھتی ہوں کیونکہ مجھے فارخ بیٹھا اچھا نہیں لگتا اور معاف کیجیے گاٹا
آپ اپنے گھر کی عمدتوں پر بھول رہے ہیں جنہیں شروع سے ملا زمین کی عادت ہوئی ہے۔ جبکہ
تعلق مڈل کلاس سے ہے۔ وہ ہلکے پھلکے انداز میں اپنے معروف رہنے کا سبب بتاتے جا رہی ہو
ایک دم ٹوٹ کر بولوا۔“

”تمہارا تعلق مڈل کلاس سے تھا۔ اب تم شاہ سکندر حیات کی منکوحہ ہو۔“
شاہ سکندر حیات کی منکوحہ ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں خود کو بیکار کر لوں۔ بس اب
نہیں تو کیسے گے۔ آپ کی بات مان کر میں اس وقت کپڑے نہیں دھو رہی لیکن ڈرائنگ روم کا
پورچ ضرور کروں گی۔ وہ اپنی بات کبھی نہ اٹھنے لگی تھی۔
”صبح تو ایک گھنٹہ لگا یا ہے تم نے ڈرائنگ روم کی صفائی میں۔“ شاہ سکندر نے اس کا ہاتھ

اٹھنے سے روک دیا تھا۔
”کیا کروں۔ بتا نہیں کہاں سے آتی گرد آ جاتی ہے۔ حالانکہ کھڑکیاں بند رکھتی ہوں۔ وہ گرد سے
پریشان تھی۔
”بہر حال اس وقت تمہارے ڈرائنگ روم کو دیکھئے کوئی نہیں آ رہا۔ شاہ سکندر نے قدم
سکھڑے کر کے بتا دیا۔“

”میں بتا کوئی آ جائے۔ وہ اس کی جھنجھلاہٹ سے محظوظ ہو کر شرارت سے بولن۔
”مٹا کون۔“ شاہ سکندر اس کے پر شوق انداز پر پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
آہستہ آہستہ دیکھ رہا تھا اسے مسکراتی ہوئی نظروں سے ڈیکھتی رہی جبکہ وہیں مختلف سوچوں کو
مرکز پر جمع کرتے میں لگا ہوا تھا۔ پھر وہ آرام سے ٹائیس اوپر سمیٹ کر بیٹھ گئی اور اسی اشتیاق
کہنے لگی۔

”یہ شاہ سکندر! مجھے گمان ہوتا ہے جسے جہانگیر بھائی کسی وقت بی بی جان کرے گا آجائیں گے۔ یہ
میں سوچتی ہوں شاہ سکندر کے ساتھ بابا جان بھی ہوں اور مہر النساء بھی۔“
شاہ سکندر جو غصے سے دیکھ رہا تھا آخر میں مہر النساء کے نام پر تعجب سے اس کی آنکھیں دھڑ
سی مٹی تھیں۔ غالباً اسے یاد نہیں تھا کہ کسی وقت وہ خود بھی اسی طرح مہر النساء کے نام لے چکا تھا۔ جیسوس
اپنے اندر اٹھنے سوال کو زبان پر آئے تو نہیں روک سکا۔
”میں مہر النساء کا سنے بتایا، میرا مطلب ہے میں نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔“
”کیوں نہیں کیا۔ آپ ہی نے تو بتایا تھا۔ وہ جب میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ قرعہ میں کوئی
دجا ہے تو آپ نے مہر النساء کا نام بھی لیا تھا۔“ اسے سادہ سے انداز میں اسے یاد دلایا۔

”اچھا ہاں! شاہ سکندر یاد آتے ہی پوری طرح منہل گیا اور شاید دل میں چورتا اس لیے اسے آپ
وضاحت کرنے لگا۔ مہر النساء اب تو وہاں نہیں رہتی۔ وہ تو جب شہر بانو کی شادی نہیں ہوئی تھی
تب وہ آ جاتی تھی اب تو شہر بانو ہی وہاں چلی گئی۔ میرا مطلب ہے اس کے گھر۔ بہت دوستی ہے
ان دونوں کی۔“

آہستہ کی نظروں میں وہ تصویر گھوم گئی جو اس نے نالندہ کے پاس دیکھی تھی۔ شہر بانو اور وہ غیر معمولی
حسن کی مالک مہر النساء۔ اپنا رنگ اس کے ذہن میں جما کا ہوا۔ اور وہ بے اختیار شاہ سکندر کا بازو
تھام کر بولی۔
”وہ۔ وہ مہر النساء تھی سکندر۔ وہاں ہاسٹل میں۔ میں نے اسے دیکھا تھا۔ پہلے اسٹرپچر پر پھر۔
گھڑی میں۔“

شاہ سکندر کی تمام حسیات آنکھوں میں سمٹ آتی تھیں۔
”اس وقت میں سوچتی رہ گئی کہ شاید وہ میری کلاس فلوری ہوگی۔ مہر النساء کی طرف دھیان نہیں
گیا۔ آہستہ کے بلکہ میں اب انہیں بتا کر اس نے اس وقت مہر النساء کو پہچان کیوں نہیں لیا تھا۔
”آف۔ میری یادداشت اتنی کمزور تو نہیں ہے۔ پھر میں نے اسے پہچان کیوں نہیں۔“
”کم از کم جس لڑکی کو تم نے پہلے بھی دیکھا ہی نہیں اسے تم پہچاننے کی بات کر رہی ہو۔ شاہ سکندر
نے انداز میں اندر پریشان ہوتے ہوئے ٹوٹا۔“

”میں نے اس کی تصویر دیکھی ہے۔ وہ بے اختیار کہہ کر کچھ خائف نظر آنے لگی کیونکہ بھولی نہیں تھی کہ
نالندہ تصویر کی بات بتانے سے منع کیا تھا۔
”کہاں کس کے پاس ہے شاہ سکندر کی پیشانی پر بے شمار شکنیں نمودار ہو گئیں۔
”وہ۔ نالندہ کے پاس۔ اس نے جھوٹ نہیں بولا کہ ایک جھوٹ کی وضاحت میں کئی جھوٹ بولنے پڑتے۔
اس لیے مان کوئی سے کام لے کر کہنے لگی۔“

”گو کہ اس نے مجھے منع کیا تھا کہ میں تصویر کی بات آپ کو نہ بتاؤں کیونکہ اس کے بہت مجبور کرنے
پر شہر بانو نے بڑی مشکل سے اور اسی وعدے پر اسے دہی تھی۔ بہر حال یہ کوئی ایسی بات تو نہیں ہے
تو آپ پریشان ہو گئے۔“

”پریشان نہیں تو۔ شاہ سکندر اپنی پیشانی چھو کر بولا۔“ بس تمہاری باتوں نے اچھا دیا۔ تم نے
میں کو روک دیا۔“

”جیس سکندر۔ وہ مہر النساء ہی تھی۔ اس وقت آپ کی وجہ سے میں ذہنی طور پر بہت آپ سیٹ
نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اب میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ مہر النساء ہی تھی۔ آہستہ آہستہ
شاہ سکندر کے ذہن پر بار بار مہر النساء کا نام جھونکنے کی عرصہ لگ رہا تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ
آہستہ آہستہ مز پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کرادے۔“

ہی دیر کرے گی، تاہم سکندر آپ کو میری قسم اور وعدہ کریں مجھ سے کہ ہم اپنے دل میں کبھی کسی معمولی سی ریش کو بھی گھر نہیں کرنے دیں گے، کس قدر جذباتی ہو گئی تھی وہ کہ سبب بتانے کے بعد ہاتھ بھی اسے ہی جوڑنے پڑے تھے۔
چالنے، "آسیہ" آواز پر اس نے چونک کر آنکلیں کھولیں۔ وہ اس کے قریب کارنر ٹیبل پر بس

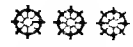
یک کب رکھ رہی تھی۔
آسیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی خاموشی سے پلٹ گئی اور شام تک جانے کن کاموں میں مصروف رہی تھی۔
شب معمول عدیل بھائی اپنے توپیلے آسیہ نے جو سامان منگوانا تھا وہ لا کر دیا اس کے بعد شاہ سکندر کے پاس کتنی دیر بیٹھے رہے تھے اور ان کے جانے کے بعد بھی وہ لاؤنج میں کھڑی جانے لگا کر رہی تھی۔ شاہ سکندر کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر گہرا کر پکا لیا۔
"اس! یہاں آؤ۔"
وہ دروازے تک آکر رُک گئی۔

میرے پاس آکر بیٹھو۔ کیا مجھے وضاحت کا موقع نہیں دو گی؟ شاہ سکندر کا لمبہ لمبی تھا۔ وہ آکر بیٹھ گئی تو کہنے لگا۔ "تم ناراض کی سبب بناؤ، میں وضاحت کروں گا۔"
"میں ناراض نہیں ہوں۔ ناراضی تو آپ ہوئے، میری کس بات سے مشتعل ہو کر آپ چلا آئے تھے؟ وہ ناخوش سے کہتے ہوئے بولی پھر اسے دیکھنے لگی تھی۔
شاہ سکندر جانتا تھا کہ وہ یہی بول چھوے گی، اور اس سارے وقت میں وہ اسی بات کی وضاحت سوچتا رہا تھا۔ جیسا اب بڑے آرام سے کہہ رہا تھا۔
"تم نے میرا انداز کے بارے میں بات ہی ایسی کی کہ مجھے غصہ آگیا۔ یعنی اس کی ڈیوڑی اور بچہ، جبکہ ابھی اس کی شادی بھی نہیں ہوئی۔"
"کیا؟ وہ سچ بول کھلا گئی۔

"وہ لڑکی جسے تم نے دیکھا، ہو سکتا ہے میرا سب سے مشابہت رکھتی ہو۔ لیکن میرا سب سے مشابہت رکھتی نہیں دھوکا سوا ہے۔ اور آئندہ اس کے بلکہ میرے خاندان کے کسی بھی فرد کے بارے میں اس وقت تک یقین سے کچھ نہ کہنا جب تک تم اس سے مل کر اسے جان نہ لو؟ شاہ سکندر کے چہرے پر اسے بے بسی کا واضح نکتہ تھا۔
آسیہ کچھ محرم می پوچھتی تھی کہ پتا نہیں وہ ٹھیک کہہ رہا تھا یا جو اس نے دیکھا وہ سچ تھا۔

نامک کا بلاسٹر اترنے کے بعد شاہ سکندر اب کوئی بھی بزنس کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے متوجہ نہ رہا تھا۔ کیونکہ اتنے دن گھر میں وہ کہہ اٹھتا تھا زندگی مفلوج ہو گئی تھی، جبکہ وہ شروع سے بزنس سے گھبراہٹا تھا۔ ادھر ڈیڑھ دو بیٹے بالکل گھر کا ہو رہے تھے اس کی صحت بھی متاثر ہوئی تھی اور کچھ مزاج بھی۔ اگر آسیہ بھدراری سے کام نہ لیتی تو وہ روزانہ اس سے جھگڑتا، بہر حال اب صحت باب پر دو پہلے کی طرح ایک نظر آنے لگا تھا۔ اور چاہتا تھا جلد سے جلد کوئی کام شروع کرے۔ لیکن باہر بھائی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ بس اس کی شادی پر ہی آئے تھے۔ اور کہا تھا کہ پھر اطمینان سے آئیں گے تو اس کے خایان شان بزنس سوچیں گے، جیسے موٹے بزنس کو انہوں نے منع کیا تھا۔ اور یہاں تک کہ وہ اطمینان دلایا تھا۔ پھر وہ الیکشن میں مصروف ہو گئے، اور اب تو الیکشن کا دور بھی نزدیک تھا۔ ان دو مہینوں میں اس نے کئی بار ان سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ ملے

"میرا سب سے مشابہت رکھتا ہوں، وہ غالباً ڈیوڑی کے لیے آئی تھی۔ اس کی گود میں بچہ بھی تھا۔
شب آپ آسیہ "شاہ سکندر" چانک پڑا تھا۔



ہنسی، "آسیہ اس کے چہنچہ پر قدرے سہم گئی تھی اور ہونٹ بھیج کر سر جھکا لیا پھر سوچنے لگی کہ بات سے وہ مشتعل ہوا ہے۔ کچھ مجھ میں نہیں آیا تب اسی خاموشی سے اس کے پاس سے اڑا۔ شاہ سکندر کو فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ کچھ غلط کر گیا ہے۔ اس کے باوجود اس نے نہیں روکا۔ اور اس کے کمرے سے نکلنے ہی بجٹ کی ایک پر سر رکھ کر دووں ہاتھوں کی انگلیاں پھینکیں۔ حقیقتاً وہ بہت پریشان ہو گیا کہ اس کی شخصیت کا یہ کمزور پہلو سامنے آکر اسے اور زعمہ نور دے جو اس کی شخصیت کا خاصا تھا۔ گو کہ میرا انداز کے ساتھ شادی کو نہ تو وہ شہ نہ اس کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت تھی۔ اس کے برعکس وہ ایک ہی بار خود کو یاد کر چکا تھا کہ بابا جان کی سازش تھی جس میں انہوں نے شاہ جہانگیر کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا جو اسے گھر کرے تھے۔ پھر شہر بالو کو دیکھ کر وہ واقعی مجبور ہو گیا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو پہلے ہی آسیہ کو وہ سارے مال کر اسے اعتماد میں لے سکتا تھا۔ لیکن اس وقت بھی اسے یہی خیال تھا کہ وہ کسی پہلو سے کرا نہ آئے۔ اپنی برتری قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اور احساس برتری کے زعم میں شاید یہ معمول لگا شاہ یورپ سے چند گھنٹوں کی مسافت پر ہے۔ پھر سال میں ایک دوبار ہی اس کے گھر کی آفتاب ضرور تھیں۔ کبیس شاپنگ اور کبیس تفریح کے لیے۔ یا ہو سکتا ہے اس نے یہ سب بھی ہوم اپنے گھر سے وہ اعلان نہ نکالا تھا۔ اس لیے یہ غدشہ نہیں تھا کہ اس کے گھر والوں میں سے کسی نے آسیہ کے ساتھ دیکھ لیا ہو گا۔ البتہ یہ گمان بھی نہیں تھا کہ آسیہ کسی کو پہچان لے گی۔ کم بات تھی اور خود اس کے لیے حیرت انگیز اور لٹو لٹاشاک تر جوابات اس کے گمان میں نہیں گزرتے تھے۔

وہ دیر سے دیر سے بالوں میں انگلیاں پھیر کر خود کو ریلیکس کرنے میں مصروف تھا۔ کہو ہوئی لڑکی کو منانے کے لیے اسے بہت پر سکون رہنے کی ضرورت تھی۔ جانتا تھا نا کہ وہ اچانک غصے میں آنے کا سبب ضرور پوچھے گی۔ اس عرصے میں وہ یہ جان گیا تھا کہ وہ اپنے درمیان ذرا کی غلط فہمی برداشت نہیں کر سکتی۔ اسے یاد تھا، لاہور میں اس کی کوئی بات نہ گزری تھی تو وہ اس پر جتنے کے جاتے خاموش اور اپنے آپ کھنڈا راض ہو گیا تھا۔ کچھ اس نے محسوس کیا تو اس کے سامنے جم کر کھڑی ہو گئی تھی۔
"سکندر! اگر آپ کو میری کوئی بات ناگوار گزری ہے تو بتائیں، میں وضاحت کر دوں۔
بعد بھی اگر ناراضگی کا بیٹون نکلتا ہو تب آپ کو ناراض ہونے کا حق ہو گا۔ اور میں ہاتھ جوڑ کر "تو مناؤ ہاتھ جوڑ کر"، وہ منکر ہٹ چھا کر بولا تھا۔
"نہیں! پہلے مجھے سبب معلوم ہونا چاہیے تاکہ دوبارہ وہ غلطی دہرائی نہ جائے، اور آپ میں جو ذرا سی رنجش پیدا ہوئی ہے وہ بھی فوراً ہو جانے کی۔ وہ اصل بات جلنے پر بیٹھا "وہ تہاری معافی سے دور ہو جائے گی" اس نے کہا۔
"نہیں! سکندر! معافی سے رنجش دور نہیں ہوتی، میرے ہاتھ جوڑ لینے سے یقیناً آپ دور ہو جائے گی، لیکن ناراضگی کا سبب جو رنجش کی صورت آپ کے دل میں ہے اسے میری

ہی نہیں۔ بتا نہیں کہاں مصروف تھے۔ آخری بار اُس کے ایکسڈنٹ سے پہلے اُن کا فون آیا تو انہوں نے کہا تھا کہ فی الحال کسی برنس میں پسہ لگانا ٹھیک نہیں ہے۔ الیکشن کے بعد دیکھیں گے۔

اُس کے اکاؤنٹ میں ڈرافٹ جمع کرانے کا بھی بتایا تھا جو کہ بہت بڑی رقم کا نہیں تھا۔ اُس نے سناڑ لگایا تو اتنا پسہ اُس کے علاج معالجے میں خرچ ہو چکا تھا اور بتا نہیں اُس سے پہلے اُس کے اکاؤنٹ میں کتنا پسہ تھا۔ اس وقت اس بیج پر سوچتے ہوئے وہ حقیقت پریشان ہو گیا کہ اگر وہ ایکدم تھوڑا ہو گیا تو کیا کرے گا۔

”مکرمیت کرو، میں تمہارا اکاؤنٹ کبھی خالی نہیں ہونے دوں گا“ شاہ جہاگیر نے کہا تھا اور اُن بات یاد آتے ہی اُس نے گاڑی بینک جانے والے راستے پر ڈال دی تھی۔

اور پھر ایسے اطمینان — ہو گیا کہ شاہ جہاگیر اُس سے غافل نہیں تھے۔ انہوں نے ایک اور ڈرافٹ اُس کے اکاؤنٹ میں جمع کر دیا تھا۔ لیکن وہ خود کہاں تھے؟ اُسے اُن کی ضرورت تھی، کیونکہ اگلے دن بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر جو ڈرافٹ انہوں نے جمع کر لیا تھا۔ وہ بھی اتنی بڑی رقم کا نہیں تھا۔ جس سے وہ کوئی برنس سیٹ کر سکتا۔ بس اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ تہی دست نہیں ہوا۔ اور شاہ جہاگیر نے اپنا وعدہ نبھایا تھا۔

”کہاں چلے گئے تھے؟“ وہ گھر میں داخل ہوا تو آسیہ نے چھوڑے ہی سوال کیا۔

”لیس ہوئے ذرا آوارہ گردی کو دل چاہ رہا تھا“ وہ اسے چھتر کر لولا۔

”آوارہ گرد نکلے تو نہیں؟“ آسیہ نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

”پھر کیا لگتا ہوں؟“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

”بعد میں بتاؤں گی، ابھی وقت نہیں ہے۔ چلیں جلدی سے سار ہو جائیں۔“ وہ اُس کے چلتی ہوئی ٹخمت میں بول رہی تھی۔ ”پرستے ہاتھ روم میں لٹکا دیے ہیں۔ نہالیں تو اچھا ہے اور“

”جانا کہاں ہے؟“ وہ لوگ کر پوچھنے لگا۔

”لیجیے آپ کو یاد ہی نہیں۔ آج بڑے بھیا اور بھائی جدہ جارہے ہیں۔ آسیہ نے رک کر بتایا ہی اُسے ہاتھ روم جانے کا اشارہ کیا تو وہ کندھے اچھٹا آگے بڑھ گیا۔

آپائی کے گھر میں خاصی چہل پھل تھی۔ بچا جان کے سب گھر والے اُسے ہوئے تھے۔ اماں اُسے بھی صبح سے اُنے کو کہا تھا لیکن شاہ سکندر کی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔

”اپنی اہمیت جتانے کے لیے طریقہ کچھ پرانا نہیں ہو گیا۔ میونہ بھائی نے اُن کی دیر سے آمد کو انفرادی انداز میں جتنا۔

”سوری بھائی! اصل میں سکندر کسی کام سے چلے گئے تھے۔ پھر انہیں یاد بھی نہیں تھا آسیہ کرتے ہوئے بتایا۔

”اچھا جاؤ، اماں جی کو اپنی شکل دکھاؤ۔ بار بار تمہارا پوچھ رہی ہیں۔ میونہ بھائی کہتے ہوئے کچھ جلی گئیں۔

آسیہ نے پہلے اماں جی کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ پھر ڈرائنگ روم میں آگئی۔ سب موجود تھے۔ اور صوفوں کے بجائے نیچے کارپٹ پر دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ اُس نے دیکھا بھی سب کے ساتھ بڑے آرام سے بیٹھا تھا۔ وہ سب کو سلام کرتے ہوئے اماں جی کے پاس اور وہیں آواز میں اُن کا حال احوال پوچھنے لگی۔ اُس کا خیال تھا اماں جی بڑے بھیا کے باپ سے ناراض ہوں گی، لیکن اُس کے بچس وہ خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ وہ سمجھ گئی یہ مامتا کی مجبوری اپنی اولاد کو خوش دیکھنا چاہتی ہیں۔

پھر میونہ بھائی نے وہیں سب کے درمیان دسترخوان بچھا دیا تو وہ اُن کی مدد کے لیے اُ

ہوئی۔ ساڑھ بھائی سے چھوٹی طاہرہ بھی ساتھ مل گئی تھی۔ کھانے میں اسے سارے آئیٹم دیکھ کر وہ تعجب سے میونہ بھائی سے پوچھنے لگی۔

”اسا سارا کھانا آپ نے اکیلے پکایا ہے؟“

”جناب! میونہ بھائی نے پہلے گردن اکڑائی پھر ہنستے ہوئے بولیں۔ ”نہیں طاہرہ نے میری مدد کی تھی۔“

”وہی میں کہوں؟“ اُس نے شرارت سے بات ادا ہوئی چوڑی۔

”تم کچھ بھی کہو لیکن جانی اچھی طرح ہو کہ میں اکیلی بھی یہ سب کر سکتی ہوں“ میونہ بھائی اُس کے ہاتھ میں سالن کا ڈونگ بٹھاتے ہوئے بولیں۔

”میں صرف جانتی ہی نہیں آپ کو مانتی بھی ہوں۔“ وہ بہت جنت سے کہتے ہوئے کچن سے نکل آئی۔

پھر کھانا بہت خوشگوار ہوا جو میں کھا گیا۔ اس کے بعد ساڑھ بھائی اپنی پکننگ دیکھنے کے لیے تھیں تو ان کے پیچھے ساری خواتین باہر آگئیں۔ فلائیٹ چارنجے تھی اور گھر سے روانہ ہو گئی دو بجے گھڑی کی سوئیاں ایک سے کچھ آگے جا رہی تھیں۔

”بھائی جان! یہ تو سارا وقت آپ ہمارے پاس بیٹھ جائیں پھر تو سال دو سال بعد ہی ملاقات ہوگی۔“

”یہ نے ساڑھ بھائی کو غالب کرتے ہوئے کہا۔

”تم اگر صبح سے آجاتیں تو یہ متورٹے سے وقت کی شکایت نہ ہوتی۔“ ساڑھ بھائی نے جتا بھی اور اُس نے پاس بیٹھ بھی گئیں۔

”بس غلطی ہو گئی۔ جب سکندر کام سے جارہے تھے میں اس وقت انہیں یاد دلانا بھولی گئی۔ لیکن آپ مجھے خط لکھنا نہیں بولیے گا۔ میرا ایڈریس ہے آپ کے پاس یا کمپن کر دوں؟“ اُس نے اپنے بیگ تلاش میں نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں لکھ دو“ ساڑھ بھائی اُس سے کہہ کر اماں جی کے پیکار نے برائے کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

کچھ دیر بعد عدیل بھائی نے آکر جلدی جلدی کا شور مچا دیا۔ اور شاہ سکندر کے اشارے پر وہ بھی باہر نکلنے کو تیار ہو گئی۔ درختوں میں سے کوئی نہیں جا رہی تھی اُس کی وجہ سے طاہرہ کو بھی اجازت مل گئی۔ وہ جلدی سے اُس کا ہاتھ تقام کر لولی۔

”تم ہمارے ساتھ چلو، ہم والیس میں نہیں چھوڑ بھی دیں گے۔“

والیس کا کوئی مسند نہیں، الو تو ہی ہیں ناں۔ طاہرہ نے مسکرا کر کہا۔

”ارے ہاں، عجیبان بھی تو جارہے ہیں۔“ وہ خوشدلی سے کہتی ایکدم خاموش ہو گئی، کیونکہ ادھر طے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اماں جی اور بی بی جان کے رونے پر ساڑھ بھائی کی آنکھیں بھی جھللائے لگیں۔ اور میونہ بھائی، اماں جی کو تسلی دینے میں مصروف تھیں۔ پھر آبا جی کے ٹکینے پر سب نے اپنے صوفائیں کر لیں اور ساڑھ بھائی، بڑے بھیا کے اشارے پر جلدی سے باہر نکل گئیں۔

”کتنے بے حس ہوتے ہیں مرد“ ایر پورٹ سے والیسی پر وہ شاہ سکندر کو مخاطب کیے بغیر اپنے آپ بولنے لگی تھی۔ ”بھئیے تو بڑے بھیا پر حیرت ہو رہی ہے۔ کتنی جلدی بدل گئے ہیں۔ ایک بار بھی یہ کام نہیں کیا۔“ آبا جی کہہ دیتے کہ وہ کتنی فوجی بیل کا تیا کرتے رہنا۔ یہ بھی نہیں کہا۔ اور جب اس نے پوچھا کہ آپ بیل سے مل کر جا رہے ہیں تو بڑے آرام سے لوٹے تھے۔ وہ اپنی ماں کے پاس آگئی تھیں۔ انہیں کیسے بتانجب اُس سے ملے ہی نہیں۔

”تم کہیں غافل ہو جاؤ، طاہرہ جی بڑے شاہ سکندر نے اُس کے تپے ہونے چہرے پر نظر ڈال کر کہا۔

”بس مجھے غصہ آ رہا ہے۔ یہ کوئی حرکت ہے۔ جی تو یہ ہیں وہ ہے۔“ وہیں بیٹے کی جگہ پر تھا۔

بچ بڑے جیسا پر بہت غصہ آ رہا تھا۔
 ”اب سارے مردوں کو ایک ہی تعداد میں تو مت کھا کر دو۔ پھر تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ایک دور کے بعد تمہارے جہان کو اب خوشیاں میسر آئی ہیں۔“
 ”ان خوشیوں میں نیل کا حصہ بھی ہونا چاہیے،“ وہ فوراً بولی تھی۔

”وہ اپنی ماں کے ساتھ خوش ہے،“ شاہ سکندر نے جس انداز میں بڑے بھٹکائی بات دہرائی سے وہ کچھ گئی کہ وہ اس سونوٹ کو پسند نہیں کر رہا اور میوہ جہان نے اسے سمجھا یا بھی تھا کہ اسے منسلک وہ شاہ سکندر کے سامنے بیان کرے۔ اسے کوئی وجہ بھی نہیں ہوگی۔ اور وہ کچھ تو اسی وقت بس اس وقت نیل کے لیے کڑھتے ہوئے وہ کچھ جذباتی ہو گئی تھی۔ اور شاہ سکندر کی اکتاہٹ دیکھ کر پڑے بدلنے کے بہانے ہاتھ لہر میں بند ہو گئی تھی۔
 پھر اگلے دن وہ شاہ سکندر کے کہیں جانے کے انتظار میں تھی۔ اور وہ گیارہ بجے کے قریب تھا۔ تب جلدی سے دروازہ بند کر کے اس نے ہمیدہ جہان کے گھر فون کر ڈالا۔ دوسری طرف ملازمہ تھی، اس کے انداز سے پھر کہ وہ پوچھنے لگی۔

”نیل بیگم ہیں؟“
 ”نہیں جی، آپ کون ہو؟“ جواب کے ساتھ ہی سوال ہوا۔
 ”میر سی بیل سے بات کر دو؟“ اس نے اپنے بارے میں قصداً نہیں بتایا۔
 ”نیل تو جی اپنے کمرے میں ہے۔“ ادھر سے بڑے آرام سے کہا گیا۔
 ”تو بلاؤ اسے؟“ اس نے غصے سے کہا۔

”وہ نہیں آسکتا، اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے جی۔“ ادھر سے معذوری ظاہر کی گئی۔
 ”اچھا دیکھو۔“ وہ فوراً غصے پر قابو پا کر رسان سے بولی، ”میں نیل کی بھیجو ہوں۔ وہ مجھے کر کے بہت خوش ہوگا۔ تم ایسا کرو۔ یہی فون سیٹ اس کے کمرے میں لے جاؤ۔ جلدی کرو! اچھا جی!“

اسی بڑی بے تابی سے انتظار کرنے لگی اور پھر اتنے دنوں بلکہ مہینوں بعد نیل کی آواز اس کے آئینہ بے اختیار چھٹک گئی تھی۔
 ”نیل، میری جان!“

”بھوجو! آپ کہاں ہیں۔ مئی کہتی ہیں آپ بہت دور چل گئیں۔ اب میرے پاس کبھی نہیں آئیں۔ نیل کمزور آواز میں بول رہا تھا۔
 ”اڈل گی بیٹا! آؤں گی۔“ وہ تڑپ گئی تھی، آپ ٹھیک تو ہو جاؤ۔ کب سے یہاں بڑے ہو گیا؟

آپ کو؟
 ”نہیں بھوجو! میں چل نہیں سکتا۔ میڈے اترتا ہوں تو میری ٹانگیں کانپتی ہیں پھر میں گر جاؤں۔ نیل کے لیے کیے گئے ایسے ایسے دوا رہا تھی۔
 ”تم دوا نہیں لے رہے؟“

”لے رہا ہوں اور یا میری ٹانگوں کی مالش بھی کرتی ہے۔“ نیل نے بتایا پھر اسے پکار کر کہنے پھونچو! میں اسات جی کے پاس جاؤں گا۔ آپ مئی سے کہیں مجھے اسات جی کے پاس چھوڑ دیں۔ میں نہیں کروں گا!“

”ہاں ہاں بیٹا! میں کہوں گی آپ کی مئی سے۔“ وہ اس کا دل رکھنے کی خاطر فوراً بول پڑی۔
 ”مجھے اسات جی بہت یاد آتی ہیں۔ اور سونیا، امرا اور بھوجو وہ چھوٹا سا عمر، میرا بھی جہان وہ بہت معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں بیٹا!۔“ اسے نے بے اختیار ماڈھ پیس کو جھوم لیا۔
 ”مئی کہتی ہیں، میرا کوئی جہان، کوئی بہن نہیں ہے اور باپ بھی۔“ وہ جانے کیا کہنے جارہا تھا یا شاید نے اپنی بات پوری کی تھی۔ لیکن اسیہ نہیں سن سکی کیونکہ اسے اچانک بڑی زوردار چکر آیا تھا اور نلے بھٹکتے بھی ریسور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

شاہ جہان نے پہلی سیر میں برآمدہ رکھا تھا کہ فون کی بل برادرس پلٹ آئے، اور ریسور اٹھا کر کان سے لے لیا۔ لیکن کوئی کچھ نہیں۔ دوسری طرف بھی خاموشی جہان رہی، جس سے وہ کچھ گئے کہ فون کرنے لاکو! اور نہیں ان کا جہان شاہ سکندر ہے۔ گزشتہ دو مہینوں سے یہی ہو رہا تھا۔ کوئی اور اگر ریسور اٹھا پلٹتا تو دھڑکنے والا بند کر دیتا۔ اور شاہ جہان کے کہیں اس سے کتنا رہے تھے۔ بات میں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے فون ریسور کرنے میں بہت احتیاط برت رہے تھے۔ نکلنے کی خاموشی تھیں۔ ادھر سے میرا اسات کو آتے دیکھ کر شاہ جہان کے اشارے سے اسے پاس بلایا اور ریسور سے تمہا کر گئی میں بولے۔

”سکندر ہے۔ بات کر لو اس سے۔“
 ”شاہ۔ شاہ کیسے ہیں آپ؟“ مہر اسات بے اختیار ہو گئی تھی لیکن اگلے پل مایوسی سے شاہ جہان کے دیکھنے

”کیا ہوا، بند کر دیا اس نے؟“ شاہ جہان نے اس کے ہاتھ سے ریسور لے کر کان سے لگایا۔
 ”کر ڈیڈل پر رکھتے ہوئے بولے۔“ لائن کٹ گئی؟“

”نہیں جہان جی، انہوں نے فون پٹھا تھا۔“ مہر اسات نے فوراً بتایا کہ لائن کٹنے اور فون پٹھنے میں فرق ہے۔

”اچھا! شاہ جہان اب نظرس چرا گئے۔ اپنی غلطی کا احساس بھی ہوا کہ ناحق مہر اسات کو بلایا۔
 ”آپ سے کیا بات کی شاہ نے؟“ مہر اسات پوچھ رہی تھی۔

”کچھ نہیں، میرا مطلب ہے مجھ سے بھی کوئی بات نہیں ہوئی۔ بس ابھی تو فون آیا تھا اس کا اور میں نے نہیں بلایا۔“ شاہ جہان گول مول جواب دے کر بابا جان کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔
 ”السلام علیکم بابا جان!“ کمرے میں داخل ہوتے ہی شاہ جہان کے سلام کیا۔

”وسلام، کہاں سے آ رہے ہو؟“ جواب دینے کے ساتھ ہی بابا جان نے پوچھا۔
 ”میں رحیم یار خان گیا ہوا تھا۔“ وہ بابا جان کے سامنے موٹے پر پٹھے ہوئے کہنے لگے۔ ”الوہی سے مشائخ آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ آپ جانتے ہی ہیں انہیں شکار کا شوق ہی یہاں لاتا ہے۔“

”ہوں۔“ بابا جان کتنی درستک اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب غائب کی بات برزہن میں اسی بات سے متعلق اور مئی بہت سے واقعات گردش کرنے لگتے ہیں۔
 ”ابھی سکندر کا فون آیا تھا بیٹا! شاہ جہان کے ساتھ بابا جان کے منوجہ ہوتے ہی کہنے لگے۔ ”مجھے لگتا ہے بابا جان کچھ پریشان ہے۔ اس لیے جلدی جلدی فون کر رہا ہے۔“

”کچھ کہا اس نے؟“ بابا جان سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔
 ”مجھے کچھ یاد نہیں۔“ وہ بابا جان کے سامنے سر ہلاتے رہے۔ ”کیا کہتے ہیں آپ، اب مجھے اس سے

”نیل چاہیے؟“ شاہ جہان نے پوچھا۔
 ”نہیں، بابا جان نے سختی سے منع کر دیا۔“ اب تمہیں اس سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ ہی کے کاؤنٹ میں میرا کوئی رقم جمع کرنا۔ اب ہم اس کے لیے واپسی کے راستے کھول رہے ہیں۔“

لیکن بابا جان! وہ غالباً پریشان؟
 ”نیل بابا جان نے سختی سے منع کر دیا۔“ اب تمہیں اس سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے، اور نہ ہی کے کاؤنٹ میں میرا کوئی رقم جمع کرنا۔ اب ہم اس کے لیے واپسی کے راستے کھول رہے ہیں۔“

”پریشان ہوگا تو یہاں آنے پر تیار ہوگا۔ باباجان فوراً بولے تھے: ”اور اس کی اصل پریشان وقت شروع ہوگی جب اُس کا اکاؤنٹ بالکل خالی ہو جائے گا۔ ہمارے اندازے کے مطابق دو لکھ کے اور اتنا عرصہ بالکل خاموش رہنا۔ پھر رہے ہونا۔“

”جی۔۔۔ شاہ جہانگیر نے یونہی سر ہلادیا۔ پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے: ”یوں تو باباجان آپ بہت پر کے لیے واپس کے راستے کھول سکتے تھے۔ کیونکہ اُس کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا۔ شادی کرتا تو ہزار جانا اور بزنس کرتا تو شادی میں دیر ہوتی۔ یعنی پریشان تو وہ اُسی وقت تھا۔ آپ نے تو مزید لڑکر ایک طرح سے اُس کے لیے آساناں پیدا کر دی تھیں۔“

باباجان کہے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی اور انکھوں میں ناتماز چمک چکی۔ کچھ دیر بعد گودیکھ کر کہنے لگے۔

”اُس وقت اگر سکندر پریشان تھا تو اُس کے ارادے بھی مضبوط تھے۔ وہ اُس لڑکی کے لیے جاگیر چھوڑ گیا تھا۔ وہاں اُس کی خاطر پتھر توڑنے کا حوصلہ بھی رکھتا تھا۔ اور یہ حوصلے تب تک جواں ہیں جب تک بندہ اپنے مقصد میں کلیاں حاصل نہیں کر لیتا۔ اور حصول کے بعد تو مطمئن۔۔۔“

”اُس وقت اگر ہم سکندر کو اُس کے حال پر چھوڑ دیتے تو وہ معمولی کام کرنے میں بھی عار محسوس ہوا اور پھر اُس کی والدین و اہل خانہ کی نا ممکن ہوجائی، اس لیے ہم نے اُسے اتنی ذمیل دی۔ ہمارے ذریعے چھوڑ کر اُس کے اس احساس کو زندہ رکھا کہ چھوٹا موٹا کام اُس کے شان شان نہیں ہو سکتا۔ آپ پتھر توڑنا تو دودھ کی بات کسی کی ساتھی میں اچھا عہدہ بھی قبول نہیں کر سکتا۔ سمجھیں آئی ہمارے حلقہ یا نہیں۔“

شاہ جہانگیر جو غور سے سن رہے تھے مسکرا کر سر ہلنے کے انداز میں سر ہلایا پھر کہنے لگے۔

”اس طرح مجبور ہو کر وہ یہاں آنے پر تیار ہو تو حائے گائیکن۔“

”اوں ہوں۔“ باباجان لوگ کر بولے: ”ہم لیکن کی گنجائش نہیں چھوڑتے اُسے آنے دو دیکھ لینا۔“

”جی۔ اب میرے لیے کیا حکم ہے؟“ شاہ جہانگیر نے اپنے اندر اٹھتے سوال کو روک کر اپنے اقدام پر پوچھا۔

”چند دن بعد سکندر کی بات سن لینا۔ اور پھر کوئی بھی سامان کر کے پیسے سے معذوری ظاہر اور ماں ذرا اپنی بی بی جان کو مضبوط کر دو۔ وہ آجکل بہت سکندر سکندر کرتی ہیں۔ کہیں ایسا اُن سے باطلہ کرے اور یہ ہمدردی میں اُس کی مدد کر بیٹھیں۔ ان عورتوں کے پاس عقل نام کی نہیں ہوتی، سارے کہے کر اُسے پر پانی پھیر دیتی ہیں۔“ باباجان بولتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے شاہ جہانگیر نے فوراً اُن کی تاکید کی۔

”میں سمجھا دوں گا بی بی جان کو۔“

”ٹھیک ہے۔ اب تم آرام کرو۔ باباجان نے انہیں جانے کی اجازت دی۔ شاہ جہانگیر اُن سے نکل آئے۔

”میں النساء اپنے گول مٹول پیچے کو بازوؤں کا جھولا جھلاتے ہوئے اُس سے باتیں بھی کر رہی تھیں۔ باپ نے میری آواز میں کر فون بند کر دیا۔ اب تو جلدی سے بڑا ہو جا آغا۔“

آواز سن آؤں گی۔ پھر دیکھوں گی کیسے فون بند کرتا ہے۔“

شاہ جہانگیر نے لڑک کر ماں بیٹے کو دیکھا پھر اُگے برقعے ہوئے اُن کے ہونٹوں پر مسکرا

”مئی! میری بیوی چھو دور نہیں گئیں، آج اُنہوں نے مجھے فون کیا تھا۔ میں نے اُن سے بہت ساری باتیں کی ہیں۔ پھر بتا نہیں کیا سوا۔ پھر جو خاموش ہو گئی تھیں، بسیل خوش ہو کر بتا رہا تھا۔“

”بند کی پریشان شکل آلود ہو گئی۔ انکھوں سے ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔ البتہ بیٹے پر قابو پا کر لوچنے میں اپنے خود اچھوکر فون ریسو کیا تھا۔“

”اُس نے فون میں اُن کا دیا تھا۔ مئی! آپ ٹیلی فون میرے پاس رکھ دیں۔ میں روزانہ چھو بیٹے کے فون کروں گا اور اُن کی سے بھی۔“ بسیل نے اُن کی بات کا جواب دینے کے ساتھ التجا بھی کی۔

”نہیں، یہاں فون نہیں ڈسٹرب کرے گا۔“ بنیلدا اُس کی التبا زد کرتے ہوئے بولیں۔ ”جب ہمارے بیوی فون کریں گی تب آپ انہیں فون میں لادے گی۔“

”اور مئی! پھر پھر کہہ رہی تھیں، وہ میرے پاس آئیں گی، میں نے انہیں بتایا تھا کہ میں چل نہیں سکتا۔ بسیل بہت سادگی اور معصومیت سے بول رہا تھا۔

”تم بہ بنیلدا نے غصے سے دانت پیسے۔“ کیا بتایا ہے تم نے پھر پھر کو؟“

”بیل گھر کر چپ۔“ ہو گیا۔

”دیکھو بیل! بنیلدا ایک دم غصے پر قابو پا کر بولیں: ”اس طرح تو ہمارے بیوی پریشان ہوں گی، تمہیں لہنا چاہیے تھا کہ تم اب ٹھیک ہو۔“

”سوری مئی! اب میں پھر پھر پریشان نہیں کروں گا۔“ بسیل نے فوراً سوری کہا کہ کہیں مئی اُسے پھر بوسے بات کرنے سے منع نہ کر دیں۔

”ہاں شاباش۔“ بنیلدا نے جب کہ اُس کا گال تھپکا پھر پلٹیں تو آیا کو کھڑے دیکھ کر اُس سے بولی تھیں۔

”بیل سو جائے تو میرے کمرے میں آنا۔“

”جی۔ پھر پھر آئیں گی ناں؟“ بسیل نے غصے سے پکار کر پوچھا۔

”بندہ تمہارا اُن کی اُن کے کمرے سے نکل آئیں۔ اصل میں وہ جس دعوے سے بسیل کو لے کر آئی تھیں گراؤں سے بہتر اُس کی دیکھ بھال کوئی نہیں کر سکتا تو اپنے دعوے کو وہ سچ ثابت نہیں کر سکتی تھیں بلکہ اُنہوں نے کوشش ہی نہیں کی تھی۔ اور شاید یہ اُن کے بس میں بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اُنہوں نے شروع ہی سے بیل کو خود سے الگ رکھا تھا۔ کبھی اُس کی خاطر اپنی ایکوئیرمنٹ چھوڑی تھیں۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اُس کے ساتھ ٹنگ کر بیٹھ جاتیں، بلکہ طلاق کے بعد تو وہ اور بھی آزاد ہو گئی تھیں۔ یہاں کوئی روک ٹوک نہیں تھی، اُن کے ماں باپ اس عمر میں بھی کلب اور پارٹیز کے دلدادہ تھے، اور کھتے تھے کہ اُن کی بیٹی اتنا غریبہ تیرا داشت کاٹ کر آئی ہے۔ اس لیے اس سے ہمدردی کرنے کے ساتھ اُسے مزید سر چڑھایا تھا۔ اور چاہتے تھے کہ اب وہ اپنے ہی جیسے لوگوں میں کہیں ایڈجسٹ ہو جائے۔ خود بنیلدا بھی یہی چاہتی تھیں۔

اس لیے اُن کا زیادہ وقت کلب اور فائو اسٹار ہوٹل میں ہونے والے فنکشنز میں گزرتا تھا۔ بیل کا طوق تو اُنہوں نے خواہ مخواہ گلے میں ڈال لیا تھا۔ جس پر اب پچھتا رہی تھیں۔

اصل میں اُس وقت بھی انہیں بیل کا خیال نہیں تھا۔ بلکہ چھوڑے ہوئے شوہر کو پریشان کرنا مقصود تھا۔ جیسے پہلے بیل کو بغیر تباہی اسکول سے ہی اپنے ساتھ لے جا کر پریشان کرتی رہی تھیں، لیکن اس بار وہ خود پریشان ہو گئی تھیں، کیونکہ جس وقت وہ بیل کو لے کر آئی تھیں اُس وقت وہ صرف بخار

فوجا میں تھا۔ اور یہاں اُن کی لاپرواہی سے معوم پچھو لپو لپو کا شکار ہو کر چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ لڑکوں کو ڈر تھا کہ اُن کے علاوہ کسی ساتھ پھر پھر روتی تھی، وہ ٹھیک ہو سکتا ہے اور بنیلدا ہر دور سے اُن کو دیکھ کر روتی تھی۔ لیکن تو تب ہمدرد اُس کے لیے آیا کہ چھوڑی تھی، اور یہ بھی چاہتی تھیں کہ وہ ہمدرد سے جلد ٹھیک ہو جائے۔ تاکہ اُسے اُس کے دادا دادی کے پاس بھیج دیں۔ اس حالت

میں اُس نے فوراً اُن کی تاکید کی۔

”میں سمجھا دوں گا بی بی جان کو۔“

”ٹھیک ہے۔ اب تم آرام کرو۔ باباجان نے انہیں جانے کی اجازت دی۔ شاہ جہانگیر اُن سے نکل آئے۔

”میں النساء اپنے گول مٹول پیچے کو بازوؤں کا جھولا جھلاتے ہوئے اُس سے باتیں بھی کر رہی تھیں۔ باپ نے میری آواز میں کر فون بند کر دیا۔ اب تو جلدی سے بڑا ہو جا آغا۔“

آواز سن آؤں گی۔ پھر دیکھوں گی کیسے فون بند کرتا ہے۔“

شاہ جہانگیر نے لڑک کر ماں بیٹے کو دیکھا پھر اُگے برقعے ہوئے اُن کے ہونٹوں پر مسکرا

چاہتے ہیں۔ اس نے کو تو موجود تھا۔ بس میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ اُسے بتانا پڑا۔ پتا نہیں چلا۔ یہاں پہلے جاکر گری تھی پھر اندر جا کر لیٹ تو بند آگئی، ابھی اٹھی ہوں۔
یا ہوا تھا، یہیں پہلے کیوں نہیں جاتی، جیو ابھی ڈاکٹر کے پاس۔ وہ ابھی بیٹھا تھا فوراً کھڑا ہو گیا۔
نہیں اب کوئی شک ہوں، بلکہ بہت بہتر ہوں۔ آپ جب تک بیٹھ کر رہیں میں اتنی دیر میں
بٹ پوچھنے کے لیے کھینچا کر دیتی ہوں۔ وہ غصت میں کہہ کر بچن میں جلنے لگی تھی کہ شاہ سکندر نے
سن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

مگر فوراً نہ ہٹا۔ کہیں میں جانے کی۔ جاؤ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آؤ۔ کھانا بھی باہر کھالیں گے۔
کہوئی ضرورت نہ تھی۔ اُسے کہنے کی طرف دھکیل دیا۔

شاہ سکندر نے اُسے کہنے کی طرف دھکیل دیا۔ وہ اُسے پہلے ڈاکٹر لیکن وہ اُسے پہلے ڈاکٹر کے پاس
وہ اس کی بھوک کے خیال سے کہتی رہی کہ پہلے کھانا پھر ڈاکٹر لیکن وہ اُسے پہلے ڈاکٹر کے پاس
لے گا۔ جہاں سے ہے وہاں کی آمد کی نوید لے کر وہ اُسے فائیو اسٹار ہوٹل میں لے گیا جہاں وہ اس
کے ساتھ پہلی بار آئی تھی۔

یہ تو وہی جگہ ہے۔ وہ بیٹھے ہی بے اختیار گنگناں پھر جھینپ کر پخلا ہونٹ دانتوں میں دبا
لیا۔

شاہ سکندر آنکھوں میں شرارت لیے اُسے دیکھ رہا تھا۔ ہونٹ دلکش سکڑا ہٹ کی گرت میں تھے۔
اس طرح دیکھنا منع ہے، اُس کا چہرہ رنگین ہو گیا تھا۔

شاہ سکندر نے آنکھ مار کر اُسے مزید لو کھلا دیا تھا۔
لگتا ہے آپ ہوش میں نہیں رہے۔ ایسی حرکتیں کریں گے تو میں کھانا بھی نہیں کھاؤں گی، اُس

نے روٹھ کر کہا اور گلاس وال سے باہر دیکھنے لگی۔
اوں ہوں۔ کھانے سے بلا عقلی بانٹ نہیں چلے گی۔ سنا نہیں تھا، ڈاکٹر کیا کہہ رہی تھیں، وہ اُسے

اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہوا بولا پھر ویٹ کے آنے پر سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔
ڈاکٹر نے اُسے ریسٹ بھی بتایا تھا لیکن اس طرح نہیں کہ وہ بالکل لیٹر پر لیٹ جائے، بلکہ ہلکے ہلکے

کام کر سکتی تھی۔ اور وہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن شاہ سکندر نے اُسے یہ نہیں کروا دیا کہ وہ اُپر سے
بیٹھ کر کہہ کر پریشان کر دیا تھا۔ آخر عجز آکر وہ اُس سے اُٹھ بیٹھ گئی۔

میں خود ڈاکٹر ہوں، بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ کھانے کا کیا چاہیے اور کیا نہیں، آپ براہ مہربانی
خاموش رہا کریں۔ اور ہر وقت میرے سر پر سوار رہنے کی ضرورت نہیں ہے، میں پریشان ہو جاتی ہوں۔

میرے ساتھ ساتھ رہنے سے؟ شاہ سکندر نے جانے کس لہجے میں پوچھا۔
نہیں، آپ کے ٹوکنے سے سیدھا سادہ کام خراب ہو جاتا ہے۔ جس کے کمرے میں جائیں میں یہ

دورن دھوکا بھی آتی ہوں۔ وہ اُسے کچن سے نکلے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔
شاہ سکندر مصروفی نارا حلق کا اظہار کرتے ہوئے کمرے میں چلا گیا۔ اور جب وہ فارغ ہو کر اندر آئی تو

وہ فون پر جانے کس سے بات کر رہا تھا۔ اس نے کوئی دھیان نہیں دیا اور چپ چاپ اپنی جگہ پر
بیٹھ گئی۔

تھک گئی ہونا؟ شاہ سکندر فوراً فون رکھ کر پوچھنے لگا۔
نہیں، وہ فقیر مسکرائی پھر اچانک خیال آئے پراس کی طرف کروٹ لے کر کہنے لگی، آج تھکی

کا وقت تھا تو میں باقوں میں عدیل بھائی کی شادی کا ذکر نکلا تو میں نے نالہ کا نام لے دیا۔ ایک بار میں
نے شاید آپ سے بھی کہا تھا۔ ہے ناں؟

ہوں۔ کہا تو تھا۔ پھر؟ شاہ سکندر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔
پھر یہ کہ وہ نساں کی کوئی پسند ہے اور وہ کہہ رہی تھیں کہ میں عدیل بھائی سے بات کر کے دیکھوں

میں یوں نہیں بھیج رہی تھیں کہ بڑے دعوے سے لائیں۔ گو باہر لحاظ سے انہیں اپنا مفاد دے
اور ابھی نبیل سے اسی کے فون کرنے کا سن کر وہ سخت غصے میں آئی ہوئی تھیں کہ پتا نہیں نہیں

آسیہ کو اپنے بارے میں اور کیا کیا بتایا ہے۔
چاہتی تو نبیل سے معلوم کر سکتی تھیں۔ لیکن فقیر اس سے نہیں کر دیا کیونکہ ان کا غصہ ظاہر ہو کر

اور نبیل کے سامنے اُس کے دو خیال کا ذکر وہ اچھے طریقے سے کرتی تھیں تاکہ اُسے واپس ان لوگوں
پاس بھیجنے میں انہیں کوئی پرہیز نہ ہو۔ بہر حال جب آیا ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ پوچھنے

پوچھنے لگیں۔
نبیلی فون نبیل کے کمرے میں کیوں لے کر گئی تھیں؟
”وہ اُس کی بھوپھی نے کہا تھا، آنا ان کے غصے سے کچھ ڈر گئی تھی۔

”بھوپھی ہو یا دادی، کسی سے ثالثیات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آئندہ ایسی حرکت نہ
بند غصت اچھے نہیں بیٹھ کر رہتے ہوئے بولیں۔
”ایک بات اچھی طرح سمجھ لو، کوئی بھی نبیل کا پوچھے کہہ دینا، وہ میرے ساتھ باہر گیا ہوا ہے۔

”جی؟“
”آپ کے ساتھ باہر گیا ہوا ہے، آیا منٹانی۔
”ہاں اور خبردار نبیل کو نہیں بتانا کہ اُس کی کسی بھوپھی، جیاچی، دادی کا فون آیا تھا۔ وہ پوچھ

بھی نہیں۔ بھیں، وہ سارا غصہ اُس پر نکال رہی تھیں۔
”جی؟“
”جدا، اپنا کام کرو۔ وہ آیا کو بیچ کر بھی کتنی دیر تک بیڑا بٹا رہی تھیں۔

میں کی آواز پر اُس کی آنکھ کھلی تھی۔ اور پھر مجبوراً اٹھنا بھی پڑا کیونکہ دروازہ تو کھولا تھا۔ بہت
سستی سے آکر دروازہ کھولا۔ تو سامنے شاہ سکندر بے حد غضب لایا ہوا کھڑا تھا۔
”سورہی تھیں کیا؟“ اُس کی آواز میں بھی جھلجھلاہٹ تھی۔
آسیہ کھنکھاتی اُسے آنکھوں میں دیر ہو گئی ہے۔ جلنے کب سے وہ بیل بھاڑا تھا۔
”ہاں بس نیند آگئی تھی۔“ وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی تو اُس کی آواز بدلی ہوئی تھی۔
شاہ سکندر نے رک کر دیکھا اور پھر اُس کا بازو تھام کر اپنے سامنے کر لیا آنکھیں مڑتی مڑتی
چہرہ سٹا ہوا۔ نیند کے باعث نہیں لگ رہا تھا جب ہی وہ تشویش سے بھر پوچھنے لگا۔
”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔“
”ہوں، ٹھیک ہوں، اُس نے فوراً اپنے چکر اگر کرنے کا جتنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور بات

لگتی۔
”کیا بہت دیر سے بیل بھاڑا ہے تھے؟“
”پورے دس منٹ۔“ شاہ سکندر نے گھڑی اُس کے سامنے کی۔
”منٹ اور گھنٹے میں فرق ہوتا ہے شاہ سکندر حیات، دس منٹ یوں کہہ رہے ہیں جیسے
گھنٹے کھڑے رہے ہوں۔“ وہ اُس کی ٹان کیوں لگا سا جھٹکا دے کر بولی۔
”جناب! جب بندہ کہیں سے تھکا ہوا آئے تب دروازے پر ایک بل رکن بھی غلاب
ہے۔ اور تمہیں ابھی بھی احساس نہیں۔ بھوکا پیاسا کھڑا ہوں۔“ شاہ سکندر نے پیٹ پر ہاتھ دبا کر
”اوہ!“ وہ ایک دم پریشان ہو گئی، ”آئی ایم سوری سکندر! کھانا تو میں نے پکا نہیں
”کیوں، کچھ پکانے کو تھا نہیں یا۔“ شاہ سکندر نے تھکے تھکے انداز میں صوفے پر گر گئے ہو۔

اگر وہ نامی ہوں تو بھر ہم جلیں گے، آئی میں باقاعدہ پروپوزل لے کر۔ میں ناں "آخر میں اس خیال ظاہر کر کے اس سے پوچھا۔" مجھے تو ادھر کی خبر ہے نہ ادھر کی، وہ اس کی بیشانی پر آئی بالوں کی لہ انگلی پر لپیٹتے بیٹھے بولا۔

"آپ کو تو شاید اپنی خبر نہیں ہے، آسیر نے اپنے بال اس کی انگلی سے نکال لئے؟"

"اب رکھیں بیٹے کی، کیونکہ اب میں باپ بننے والا ہوں، وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پھر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور شوق سے پوچھنے لگا۔

"یہ بتاؤ، تمہاری کیا خواہش ہے بیٹا یا بیٹی؟"

"بیٹی، آسیر نے سوچنے کا وقت بھی نہیں کیا فوراً بولی تھی۔

"کیوں؟" شاہ سکندر کی حیرت اس کے فوری جواب دینے پر بھی۔

"آپ نے پوچھا میں نے بتا دیا۔ اب کیوں کا کیا سوال۔؟" وہ اس کی حیرت پر غلط ہو کر "نہیں بتانا چاہتیں مت بتاؤ، ویسے میری خواہش بھی بیٹی ہے" شاہ سکندر نے کہا

بولی

"کیوں؟"

شاہ سکندر کا بھرپور تہمتہ بے ساختہ تھا۔ پھر اس کا ہاتھ دبا کر بولا۔

"پہلے تم بتاؤ؟"

"پہلی حصہ تو یہ ہے کہ میری کوئی بہن نہیں ہے شاید اس لیے مجھے بیٹی کی خواہش ہے اور بیٹیاں ابھی لگتی ہیں؟ آسیر نے تیلے میں یوں جلدی کی کہ اپنے "کیوں" کا جواب سننا "ہاں، بیٹیاں ابھی لگتی ہیں" شاہ سکندر نے تائید کے ساتھ اس کی بات دہرائی پھر "میری خواہش میں ایک غریب پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ باباجان میری شادی کے لئے جب بیٹی کا نہیں گئے توھاگے آئیں گے۔ میں اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کر سکتا ہاں بیٹیاں خاندان سے باہر نہیں دی جائیں۔"

آسیر جو بڑے اشتیاق سے سننے لگی تھی اندہ ہی اندر جزبہ زور کر رہ گئی۔

"ہاں اگر شادی شادی ان حالات میں نہ ہوئی یعنی اس کے برعکس میں ہمیں بیاہ کر جاتا تب یقیناً میں پہلے بیٹے کی آرزو کرنا شاہ سکندر نے اپنی بات پوری کی پھر آہستہ سے چھو کر بولا۔

"بیٹا میرا بیٹی! یہ بتاؤ نام کیا سوچا ہے؟"

"نام؟" وہ قدرے بے دھیانی میں اسے دیکھنے لگی پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"مجھے ایک نام بہت پسند ہے۔ اگر بیٹی ہوئی تو ہم اس کا نام مدیحہ رکھیں گے" نام شاہ سکندر کی آنکھوں میں جانے کس خیال کا عکس تھا۔

"مدیحہ اچھا نام ہے؟ آسیر کے چہرے پر کیسی سی مسکراہٹ پھیل گئی پھر غیظاً لگی "کون ہتی مدیحہ؟"

"ہاں شاہ سکندر نے چونک کر اسے دیکھا پھر سمجھتے ہی اس کے ہاتھ کو زور سے "کیا سمجھتی ہو تم مجھے؟"

"اُف میرا ہاتھ۔" وہ تکلیف سے پیچ بڑی۔

"پہلے میری بات کا جواب دو" شاہ سکندر نے اس کے چہرے کا کوئی نوٹس نہیں لیا

"بہت نیک، شریف، پارسا۔" وہ جو دمہ میں آیا کہتی گئی۔

"ہاں۔" وہ اس کا ہاتھ چھو کر بولا "تم میری زندگی میں آنے والی پہلی اور۔۔۔"

"یہ بات آپ ایسے بھی کہہ سکتے تھے۔ ہاتھ توڑنا ضروری تھا کیا؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

سوری۔ سوری یاد شاہ سکندر نے نادام ہو کر دوبارہ بہت نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے دیا تھا۔

"آسیر کو تنگی الٹیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو رکھنے کا نام نہیں تھا۔ کوئی چیز اس اندر نہیں مٹتی تھی۔ جس سے وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ کوئی کام بھی نہیں کر پاری تھی۔ کھانا پکانے کی ہوتی تو اس کی ملک ناگوار لگتی فوراً چن سے نکل آتی۔ ایسی حالت میں شاہ سکندر کو مجبوراً اسے کچھ کرنے کے لیے اسات فی کے پاس چھوڑنا پڑا۔ کیونکہ وہ خود ایک انداز بھی فرائی نہیں کر سکتا تھا۔ اور اسی ال سے آسیر بھی جانے پر تیار نہیں تھی کہ اسے کھانے کی برابری ہوگی لیکن پھر وہ بھی مجبور ہو گئی تھی۔

کیا حالت بنائی ہے تم نے اپنی میمونہ بھائی اس پر خفا ہونے لگیں۔

"ہاں بیٹی بچہ پیدا کرنا آسان نہیں ہے۔ تم نے اسے ڈاکٹر ہونے کے زعم میں سوچا ہوگا کہ سارے ملے خود ہی ملے کر کے پھر ایک دم بچہ ہمارے ملنے لاکر ہمیں سر پر ہنر دو گی۔"

آسیر بے ساختہ ہنس پڑی۔

"سر پر ہنر اپنے سر والوں کو دینا جنہیں کچھ خبر نہیں۔" اس کے ہنسنے کے باوجود میمونہ بھائی ناکے گئیں، ہم تم سے کہیں بے خبر نہیں ہو سکتے۔ جزبہ زور سے آئی تھیں تب میں نے تم سے یہاں لئے پرکھنا امرار کیا تھا۔ اسی لیے کہ میں جانتی تھی۔ تمہاری یہ حالت ہونے والی ہے۔ اگر تم میری تہان یقین تو کم از کم یوں بولیوں کا دھانچہ تو نہ بنیں؟"

"جی نہیں میں کوئی دھانچہ نہیں ہوں۔" وہ اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے بولی "بس ذرا کمزوری ہے۔"

دو درپ لگیں گی چیک ہو جاؤں گی؟"

"خالی ڈاکوئی تنہا سے کام نہیں چلے گا؟"

پھر اس نے اپنے سینے سے آگے آگے لے کر بے اختیار کے بہت ایکسپرٹ ہو گئی میں ناں "اس نے کہا اور یں جان توڑتے دیکھ کر میمونہ بھائی کو خاموشی رہنے کا اشارہ کیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" عدیل بھائی نے ان کے قریب کرسی کھینچے ہوئے یوں پوچھ لیا۔

"تمہاری شادی کا پر دوگرام بنا رہے ہیں، میمونہ بھائی فوراً بولیں "نالہ کے لیے تو غالباً تم نے منع دیا تھا اس لیے ہم ایک اور؟"

"کیا۔ کب۔ میں نے کب منع کیا تھا؟" عدیل بھائی قدرے بولہلا کر بولے تو میمونہ بھائی بڑی زور سے ہنس اڑنے لگیں۔

آسیر پہلے کچھ کھنکی نہیں پھر جب عدیل بھائی کو جھینپ کر سر کھاتے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔

"دیکھا بھوکے کپڑا۔ بڑے چکر دے رہے تھے۔ میں نے اسے اس انداز سے نہیں دیکھا۔ پتا نہیں سے سوچوں گا۔" میمونہ بھائی ہنستی ہوئی ان کے ایک ایک انداز کی نقل اُتار رہی تھیں۔

"آپ کو تو موقع ملے گا۔" عدیل بھائی انہیں ان کے حال پر تھوڑا کر آسیر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "تم ماؤ آسیر شاہ سکندر آئے تھے؟"

"جی، شام میں آئے تھے۔" آسیر، میمونہ بھائی سے نظر میں ٹپا کر انہیں دیکھنے لگی۔

"روکا نہیں انہیں، کھانا وغیرہ کھایا یا یوں چلے گئے؟"

"کچھ جلدی میں تھے، غالباً کسی سے ملنا تھا۔"

"اب تک کوئی کام شروع نہیں کیا انہوں نے۔" مجھے ان کا ارادہ کچھ ڈالوں ڈول سالگتا ہے۔ بتا نہیں کہ طرف ان کا رجحان نہیں ہے یا کوئی برابری؟ عدیل بھائی کا انداز کچھ سوچتا ہوا تھا۔ پھر بڑھنے لگے۔

پھر بتا نہیں انہوں نے کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

”جہانگیر جہان کے انتظار میں ہیں۔ غالباً وہی کہہ گئے تھے کہ وہ خود اگر کوئی بزنس سید“
آسیہ نے سرسری انداز میں بتایا۔

”تو اب تک تو انہیں آجانا چاہیے تھا کہ ان دنوں بلکہ مہینے ہو گئے ہیں۔ فون وغیرہ آتا ہے“
بھی نہیں، عدیل جہان اس نکتے کو بہت سنجیدگی سے لے رہے تھے۔

”اس عمر سے میں دو یا تین بار فون آیا ہے ان کا۔ مجھ سے تو بات نہیں ہوتی۔ سکندر بتا رہا
پہلے الیکشن کی وجہ سے نہیں آ سکے پھر اپنی زمینوں کے کسی جھگڑے میں آ گئے رہے۔ اب پتا
ہے، آسیہ کا انداز بتا رہا تھا جیسے شاہ سکندر نے اسے پورا اطمینان دلایا ہوا ہے کہ اس معا
نکر مند ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

عدیل جہان کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر جانے کیا سوچنے لگے تھے۔
”بھئی شاہ لوگ بڑے انہیں کیا پروا؟“ میمونہ جہان اپنے مخصوص انداز میں ان کی جھنجھوٹا
ہوئیں۔ ”شاہ سکندر بزنس کریں نہ کریں، میرا خیال ہے انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“
عدیل جہان نے اپنے خیال سے چونک کر میمونہ جہان کو دیکھا پھر اٹھتے ہوئے بولے تھے،
”شاہوں کو بھی پانی شہی قائم نہ کرنے کے لیے کچھ نہ کرنا پڑتا ہے۔“
آسیہ نے انہیں جانے ہوئے دیکھا پھر میمونہ جہان کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

”ٹھیک تو کہہ رہے ہیں عدیل جہان۔ چنانچہ سکندر اتنے اطمینان سے کیوں ہیں، اور یہ
کونہیں کچھ یاد ہے۔ جب طے کر کے گئے تھے کہ وہی اگر بزنس کا بتائیں گے تو سب سے پہلے
کرنا چاہیے تھا۔“

”ستو؟“ میمونہ جہان اچانک کسی خیال کے تحت اس کا بازو دھاکر پوچھنے لگیں: ”تم نے کہ

فون کیا ہے؟“
”نہیں، ایک دوبار سکندر سے کہا تھا کہ میری بی بی جان سے بات کرادیں۔ لیکن
کر دیا۔ کہنے لگے جب سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا تب میں ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

سادہ سے انداز میں بتایا۔
”اس سے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم خود بات کر لو۔“ میمونہ جہان بڑے آرام سے مشورہ
بولیں، ”ہر بات شوہر سے کہنے کی ضرورت ہی ہے خواہ وہ کڑے جانتے ہیں۔ سکندر کی بی بی
پر کتنے مخالف بھیجے تھے۔ بیجاری شوہر کی وجہ سے مجبور ہیں ورنہ ان کا دل تو جاتا ہوگا تمہارے
کو اور تمہاری بیجوری بھی یہی ہے کہ جب شوہر سے جائے گا تب جاؤ گی۔ لیکن ان سے بار
خوش ہو جائیں گی وہ۔“

”ہوں۔“ آسیہ کتنی دیر تک پُرسوز انداز میں سر ملاتی رہی پھر قدم سے مایوسی سے بولی:
”پاس ان کا منہ نہیں ہے۔“

”منہ حاصل کرنا کوئی مشکل بات ہے ڈائریکٹری دیکھ لو، میرا خیال ہے شاہ پور کے
ہوں گے وہ سب تمہارے سسرال میں ملیں گے۔“ آخر میں میمونہ جہان خود ہی غفلت ہو
”اور اگر سکندر کو پتا چل گیا تو؟“ اس نے خدشہ ظاہر کیا۔

”چلتے دو۔“ اس کی ماں کو فون کرونگی ناکر کسی پرانے عاشق کو یہ میمونہ جہان کا جملہ ہے
آسیہ نے پہلے گھورا پھر ہنس پڑی۔

شاہ سکندر نے گھر میں داخل ہوتے ہی ٹیپ ریکارڈ میں کیسٹ لگا کر ان کو دیا
آسیہ نہیں تھی تو اسے بہت شام محسوس ہوتا تھا۔ اور حقیقتاً اس کے بغیر اس کا دل بھی نہ

”اُسے کچھ ابھی صرف تین دن ہوئے تھے۔ پھر وہ صبح شام اس کے پاس حاضری بھی دے رہا تھا۔
بھی گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی کمی شدت سے محسوس ہوتی اور وہ سونے تک خود کو ٹیپ، اخبار
نہیں دیکھتا۔“ وہ اپنے بھائی کے ساتھ ساتھ گنگا نے لگاتار۔ ”جیسی فون کی میل سنانی نہیں دی۔ جب واش روم سے
لاٹ جلدی سے پہلے ٹیپ بند کیا۔ پھر اگر ریسپورڈ لگایا۔“

”پہلو۔“
”گھر میں نہیں تھے کیا؟“ ادھر سے شاہ جہانگیر کی آواز سنائی دی۔
”جہانگیر جہان! السلام نسیم! کہاں ہیں آپ؟“ وہ ان کی آواز سننے ہی بے اختیار ہو گیا تھا۔
”وہ کونسا لڑکے؟“ شاہ جہانگیر اس کا سوال بکسر نظر انداز کر گئے۔

”ٹھیک ہوں، کب سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپ آکیوں نہیں رہے؟“ اس کے بچے سے
شان پوچھا تھی اور جیسے ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔
”میرا نام مشکل ہے سکندر کو نہ۔ ادھر بابا جان نے مجھے بہت سے کاموں میں لگھا دیا ہے، بہت
شش کرتا ہوں کچھ وقت نکال سکوں لیکن، ضرور تم ساد کوئی کام وغیرہ شروع کیا یا نہیں؟“ شاہ جہانگیر اپنی
دبی بات کو رات بدل گئے۔

”کیا کام کروں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ کوئی چھوٹا موٹا بزنس نہیں کرنا اور بڑے بزنس کے لیے
میں پاس پیسے نہیں ہیں۔ پہلے آپ نے جو رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع کرانی تھی وہ میرے علاج
الجے پر خرچ ہوئی اور اب۔“

”خیریت نہیں کیا ہوا؟“ شاہ جہانگیر اس کی بات کاٹ کر بولنے لگے۔
”میرا ایکسٹنٹ ہو گیا تھا۔ تقریباً دس دن ہاسٹل میں اس کے بعد ڈیڑھ دو مہینہ گھر میں، میں بستر
پر رہا ہوں اس نے بہت غفلت میں بتایا۔“

”ادھر۔ اب کیسے ہو؟“ شاہ جہانگیر نے تشویش سے پوچھا۔
”اب ٹھیک ہوں۔ بس بیماری نے پریشان کیا ہوا ہے۔ اس طرح تو کام نہیں چلے گا جہاں کہ آپ
دین مجھے بعد میرے اکاؤنٹ میں پیسے جمع کرادیں سبھے کچھ کرنا چاہیے۔“ اس نے اپنے تئیں انہیں
ماس دلائی۔

”ہاں میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم خود کچھ کرو۔ لیکن مسئلہ پیسوں کا ہے، ادھر بابا جان نے سارا حساب
اب اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔“ شاہ جہانگیر بابا جان کے کہنے کے مطابق اس کے سامنے مزید پیسوں
”معدودی ظاہر کرتے ہوئے بولے۔“ میرے ساتھ ساتھ بزنس جہان کو بھی لگا بندھا خرچ دے رہے
ہیں، ہم بالکل ان کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔“

”پھر؟“ شاہ سکندر کچھ چلا سا گیا تھا۔
”پھر میں کوشش میں لگا ہوا ہوں کہ کوئی بڑی رقم ہاتھ لگ جائے، تب پہلی فرصت میں تمہارے
ن آؤں گا تب تک تم کوئی جواب وغیرہ کر لو؟“ انہوں نے تسلی کے ساتھ مشورہ بھی دیا۔ اور اس کی

”نہیں، کوئی جواب نہ پا کر قدرے وقت سے خود ہی کہنے لگے۔
”میرا خیال ہے تم جواب نہیں کر سکو گے۔ کیونکہ ایک تو تم بہتر کے ہر بڑے آدمی سے متعارف
”دوسرے سسرال میں جو ایجنٹ بنا چکے ہو اسے بھی قائم رکھنا چاہیے ہے ناں؟“

”شاہ سکندر کوشش کے باوجود ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکا۔
”ایک اور راستہ ہے، شاہ جہانگیر اس کی خاموشی محسوس کرنے کے بعد کہنے لگے۔“ تم یہاں چلے آؤ،
”نہیں، وہ غصے سے کہہ کر ہنٹ ہنٹ بیچ گیا۔“

نہیں یا۔ آج تو بس اٹھتے ہی تیار سے پاس جھاگ آیا ہوں، بہت دن ہو گئے ہیں، بس اب چلو۔
 کیوں اُداس ہو گئے ہیں؟ میمونہ جہانی چائے لے کر آ رہی تھیں اُس کی آخری بات سن کر کہتے
 ہیں۔ ”ہاں آنکھوں سے بھی لگ رہا ہے رات بھر کروٹیں بدلتے سہے ہیں شاید، چہچہاٹھ آپ سے
 ہی مدد رہی ہے۔“

شکر یہ اور یہ صرف چائے؟ وہ اُن کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے بولا۔
 ”جہانی! یہ ناشتا بھی کریں گے؟“ آسیہ نے کہا۔
 ”ابھی لاتی ہوں، میمونہ جہانی بیٹھنے کا ارادہ ترک کر کے واپس پلٹ گئیں۔
 ”اچھی خاتون ہیں، بس کچھ زندہ دل اور اسرار،“ شاہ سکندر نے چائے کا سپ لے کر ایمانداری
 میمونہ جہانی کی تعریف کی۔

”آپ واقعی رات میں نہیں سوئے؟“ آسیہ اُس کی آنکھوں کی سرفی دیکھ رہی تھی۔
 ”تیار سے بغیر نیند کہاں آتی ہے، پھر رات میں جہانگیر جہانی کا فون آگیا تو؟“
 ”کیسے ہیں جہانگیر جہانی؟“ وہ درمیان میں بول پڑی۔
 ”ہاں ٹھیک ہیں، تیار رہتے پھر رہے تھے؟ وہ چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔
 ”اور بی بی جان وغیرہ؟“ آسیہ نے اب سنبھل کر پوچھا۔ یعنی اور کسی کا نام نہیں لیا۔

”میں نے کسی کا نہیں پوچھا کیونکہ ایک تو جہانگیر جہانی بحالت میں تھے دوسرے اسلام آباد سے
 ان کر رہے تھے،“ وہ رات میں سوچ کر سوچا تھا کہ اُن کی حالت اس لیے کہ شاہ پور جانے کا نہیں بتائے
 اس لیے اسلام آباد کا بتا کر کہنے لگا۔

”مجھے انہوں نے دیں بلایا ہے۔ کہہ رہے تھے وہ بالکل وقت نہیں نکال پارہے لہذا میں ایک
 دن کے لیے وہاں آ جاؤں۔ اور میں یہی سوچتا رہا کہ تمہیں ایسی حالت میں چھوڑ کر کیسے جاؤں؟“
 ”یہی حالت کوئی ایسی تشویشناک تو نہیں ہے؟“ وہ اُس کی پوری بات سن کر کہنے لگی۔ ”اور یہ بھی دیکھ
 رہا کہ یہاں مجھے کتنے آرام سے رکھا جا رہا ہے، پھر دو دن کی قیامت ہے آپ اطمینان سے ہوا نہیں؟“
 شاہ سکندر نے فوراً ہامی نہیں بھری اور یوں دیکھنے لگا جیسے اُس کی نگاہ میں نہ آ رہا ہو کیا کرے گی
 بونہ جہانی ناشتا لے کر آ گئیں۔ اور دونوں کو خاموش دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”کیا مسئلہ ہے، اگر مجھے بتانے کا ہے تو بتاؤ، فوراً حل کر دوں گی۔“
 ”کوئی مسئلہ نہیں جہانی! آپ بٹھیں ناشتا کریں؟“ آسیہ نے کہا۔

”ہائیں۔ کتنی بار ناشتا کروا دی تھی، اب تو میں اتنا ہی سے کھا سنے کا پوچھنے جا رہی ہوں۔ اور اگر
 نہیں کوئی خاص چیز کھانی ہو تو بتاؤ۔“ میمونہ جہانی رٹے شاہ سکندر کے سامنے رکھ کر آسیہ سے پوچھنے
 میں۔

”نہیں جو کچھ کھا لوں گی۔“ آسیہ قصداً مسکرا کر بولی۔
 ”اور سکندر آپ؟“ میمونہ جہانی نے اخلاقتاً اُس سے بھی پوچھ لیا۔ ورنہ جہانی تھیں کہ وہ کھانے

نے وقت موجود نہیں ہو سکتا۔
 ”نہیں۔ میں تو ابھی جا رہا ہوں۔ ناشتے کے لیے آپ کو زحمت دے کر شرمندہ ہوں۔“ شاہ سکندر

دو طرفہ انہیں زحمت دینا انہیں نہیں لگ رہا تھا۔
 ”بٹھیں ناشتا کریں، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ میمونہ جہانی کہتے ہوئے چلی گئیں۔

”ہاں، کیا کہہ رہے تھے آپ، کب بلایا ہے جہانگیر جہانی نے؟“ آسیہ نے میمونہ جہانی کے جاتے ہی

”پہلے میری پوری بات سنو۔ اس کے بعد کوئی فیصلہ کرنا۔“ شاہ جہانگیر نے اُسے ٹوکا
 ”باباجان! تیار سے منتظر ہیں۔ گوکہ ہم پر ظاہر نہیں کرتے لیکن انہیں اپنی عقلی کا احساس
 نے خود سنا ایک دن بی بی جان سے کہہ رہے تھے کہ انہیں تیار کیا بات مان لین چاہیے؟
 دوسری شدت سے غصوں کرتے ہیں سکندر بہت آزرہ رہتے ہیں۔ اگر اُن کا سوال نہ ہو،
 منانے ضرور آئے۔ بہت جھٹ کرتے ہیں وہ تم سے ہم سب سے زیادہ جھلنے پھولنے
 میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ انہیں اپنے سامنے جھکانے کے بجائے خود اُن کے آگے سے معافی مانگ
 مان رہے جھلنے گا۔ خوش ہو جائیں گے وہ پھر تیار سے لیے کون مسئلہ نہیں ہوگا۔“
 ”آپ بھول رہے ہیں جہانی! میں اکیلا نہیں ہوں۔ آسیہ میرے ساتھ ہے جیسے اگر
 کے ساتھ شادی کو علم ہو گیا تو وہ؟“

”ایک منٹ یا۔“ شاہ جہانگیر فوراً اُسے روک کر کہنے لگے: ”میں نے یہ کب کہا کہ
 لے کر آؤ، بلکہ اُسے یہاں لانے کی عقلی تو کبھی کرنا ہی نہیں، بس تم اگر باباجان کو خامی کر دو
 اپنی ہر بات منوالینا۔“

”مثلاً؟“ اُس کے استفاد میں ہلکا سا استہزا تھا۔
 ”مثلاً یہ کہ تم شاہ پور کے بجائے آسیہ کے ساتھ کراچی میں رہو گے اور بیٹے میں دویم
 بھی اپنا فرم بھالے آ جاؤ گے؟“ شاہ جہانگیر مخی خیر انداز میں بولے تھے۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ پٹٹا لگا۔

”مرد ہو مار! دو کیا چار۔“ یوں اسے کہہ سکتے ہو؟ شاہ جہانگیر نے خود ہی قہقہہ لگایا پھر کہ
 مذاق نہیں کر رہا۔ ”تم بھی جذباتی ہو کر مت سوچنا۔“ سید گ سے عذر کرنا سب سے مناسب
 مہر النساء جاتی ہے کہ تم دوسری شادی کر چکے ہو اُس کے باوجود تھوڑی راہ دیکھتی ہے۔
 تم سے محبت کی انتہا ہے جس نے اُسے اسٹینڈ لینے سے باز رکھا ہوا ہے؟“
 ”میں نے اُسے کبھی پسند نہیں کیا؟“ وہ جیسے اکتا کر بولا۔

”نہی، لیکن اُس کی محبت کو زندہ رکھو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا اور آسیہ کے لیے
 ان باتوں میں میں آسیہ کا پوچھنا تو بھول ہی گیا۔ کسی ہے وہ؟“ شاہ جہانگیر نے اچانک میمونہ
 ”اُس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اور یہاں ریسٹ نہیں مل رہا تھا اُسے اس لیے کہ
 میں نے اُسے اُس کے والدین کے پاس چھوڑ دیا ہے، ایک دو دن میں لے آؤں گا۔“
 ”کیا کر رہے ہو مار! پہلے تمہارا ایکسڈنٹ ہوا اب وہ بیمار ہے، تم نے تو پریشان کر
 اچھی خبر نہیں ہے تمہارے پاس؟“

”اچھی خبر بھی سن لیں گے۔“ شاہ سکندر اپنے آپ مسکرا رہا تھا۔
 ”ہاں! ذرا جلدی سنا اور یہاں آکر۔“ اُسے خدا حافظ! شاہ جہانگیر نے سلسلہ متعلق کر
 ریسپور رکھتے ہوئے شاہ سکندر نے لوں سر بلایا جیسے اُن کی ساری باتوں کو فغول قرار
 جب سوئے کے لیے لیا تو اپنے منے کا کون اور حل سوچتے ہوئے اُس کا ذہن بار بار شاہ
 باتوں میں الجھ رہا تھا۔ اور وہ پوری رات اُس کی یونہی سوچتے اُٹھتے گزری تھی۔ صبح کے قریب
 پہنچ کر وہ بس چوڑی دیر کے لیے سوچا تھا پھر اُٹھتے ہی آسیہ کے پاس جانے کے لیے تیار
 آسیہ کو کسی وقت ڈاکٹر درپ لگا کر لیا تھا جسے دیکھ کر وہ کہنے لگا۔
 ”مریض کو چند گھنٹے مکمل آرام کروانے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ خصوصاً تم جیسی عورت

فضول کا کم کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔“
 ”جناب کوئی کام فضول نہیں ہوتا۔“ وہ تکیہ سیدھا کر کے سرو پٹا کرتے ہوئے بولا
 ”کیا آپ نے یا نہیں؟“

بھروہی بات چھیڑ دی۔
”یہ پوچھنا تو نہیں بھول گیا کہ وہ اسلام آباد میں کب تک رہیں گے، پھر اسی حساب سے طے کر لیتا۔“ شاہ سکندر نے سرسری انداز میں کہا۔

”آپ کو جہاں گئے جانی سے ملنا تو ہے اور انہی میں یہاں ہوں تو آپ آرام سے جاسکتے ہیں۔“ جیسا مناسب سمجھا۔ ”آسیہ پہلے فوراً بولی تھی پھر احساس ہونے پر اس کی مرضی“
”ہوں۔“ شاہ سکندر نے ناشتے میں مصروف رہ کر سر ہلایا۔
”ٹھیک کہتی ہو تم، اپنے گھر میں پھر تیار سے اکیلے ہونے کا خیال ہو گا پھر واقعی میرا ہوجانے کا۔“ پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا، ”میں آج ہی کی فلائیٹ سے چلا جاتا ہوں۔ پرسوں کا آجافن کا“

آسیہ نے یونہی سر ہلادیا۔
”اور پھر اسی وقت تم میرے ساتھ گھر چلو گی، میرا وہاں تمہارے بغیر دل نہیں لگتا۔“
”پہلے میں کتنا غصہ اٹھا رہا ہوں۔ لیکن اب تو ایک ایک پل بھاری لگتا ہے اور سن لو“
”تین دن کے لیے بھی یہاں نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ ناشتا چھوڑ کر بولنے لگا تھا۔ ”اُس کے نتیجہ نہیں جیت پھر دی دھولیں تھی۔“
آسیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

شاہ سکندر اپنی جگہ سے اٹھا اور پہلے اُس کی ڈرپ چیک کی پھر جبکہ اُس کی پیشانی پر ”تم میری جیت میری زندگی ہو اُس“ تم سے ایک پل کی دوری میری جان پر بنا دیتی ہے۔
”دکھا کر دے سوچ کر کہ میری سالنوں کی دور بہتار سے ساتھ بندھی ہے۔“
”اُس کی جیتوں کی شد میں یونہی آسیہ کی کلیں غم کر دیتی تھیں۔ چنپ چاپ سرکتے لمحوں میں لمحہ بہت چپکے سے ان جھپکیں لپکوں پر بسیرا کر لیتا تھا۔“

”رہو صوب کنارا، شام ڈھلے
تلے تلے دو دنوں وقت جہاں
جورات نہ دن، جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دھواں
اُس دھوپ کنارے پل دو پل
ہونٹوں کی لپک
بانہوں کی چٹک
یہ میل بہارا، جھوٹ نہ سچ
کیوں زار کرو، کیوں دوش دھرو
کس کا دن جوئی بات کرو
جب تیری سمندر آنکھوں میں
اس شام کا سورج ڈوبے گا
”سکھ سوئیں گے گھر دروازے
اور راہی اپنی راہ لے گا“



”تقدیر بڑی مہربان ہے۔“ شاہ سکندر کی گاڑی ہائی دے پر فرسٹ بھر رہی تھی۔ آسیہ کے پاس آنے کے بعد اس نے ایک بار پھر تمام حالات کو سننے سے سوچا تو اُس پر بابا جان کی حکمت پوری طرح واضح ہونے لگی تھی کہ کس طرح انہوں نے بظاہر خاموشی اختیار کر کے اُسے ایک طرح سے مجبور بننے کی کوشش کی تھی اور کافی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گئے تھے کیونکہ اُسے فی الفور واپس کے علاوہ کسی اور راستہ نہیں رہا تھا۔ اور اُس نے واپسی کی تیاری کر لی لیکن اس طرح نہیں بیٹے بابا جان چاہتے تھے۔
”اُس نے سوچ لیا تھا کہ اب اُس کی باری ہے۔ بابا جان سے اپنا حق وصول کرنے کے لیے“
”بوری بلاؤنگ کے بعد اپنا سفری بیگ اٹھایا تھا۔“

”وہی دھاتی تین گھنٹے کی مسافت تھی۔ اس دوران وہ جہاں خود کو بابا جان اور بی بی جان کا سامنا کرنے لے تیار کرتا، وہاں یہ خیال بھی تھا کہ اُسے کسی طرح خود کو مجبور ظاہر نہیں کرنا بلکہ ان کی محبت میں وہ جے ملنے کا ہے۔ اس کے علاوہ اُس کی کوئی غرض نہیں۔ اس کے بعد بابا جان کا رد عمل سوچتے ہوئے نے جی ٹیک بر گاڑی آمادی دودھوں اطراف پھیلے کھیتوں میں کام کرتے مزارعوں نے حیرت و خوشی کے ساتھ تاثرات سے اُسے دیکھا جبکہ اُس کی نظریں حوصلی پر بھی تھیں جس کے برے سے گیٹ پر موجود اُس کی گاڑی دیکھتے ہی ہمیشہ کی طرح پورا گیٹ کھول دیتا تھا۔ اور وہ بھی رُکے بغیر گاڑی اندر لے جاتا تھا جب گاڑی سے اُترتا تو سوچ میں پڑ گیا کہ پہلے اُسے کس کے پاس جانا چاہیے۔ بابا جان یا بی بی جان اور پھر کچھ طے کیے بغیر اُس نے قدم اُگے بڑھا دیے۔“

”دوہرا کا وقت تھا۔“ ناگہا سب کھانے کے بعد اپنے اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ وہ طویل راہداری پر زکر لاؤنج میں آیا تو سامنے سے گزرتی جی ران نے اُسے دیکھ کر انتہائی بے یقینی سے پوری آنکھیں بالیں۔
”بی بی جان کہاں ہیں،“ شاہ سکندر پوچھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تو جی ران جواب دینے کے بجائے زیر حیاں لٹی اور چلی گئی۔

”ناں سس“ جی ران کی بدحواسی نے ناگواری سے سر جھکا تو نظر پٹے پر بڑی جوئیں کا کوہِ بیکر ہوئے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالکل غیر ارادی طور پر وہ پوری طرح اس جگہ کی طرف متوجہ ہو گیا جو دوڑیں، کوشش کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ گیا پھر ٹھنوں کے بل ٹھینتا ہوا اُس کی طرف آگے لگا۔ اور ایک قدم کے ہر چھک دو ہاتھوں نے بہت فخری سے اُسے اٹھالیا۔ اور وہ جو بہت اشتیاق سے بچے کو دیکھ رہا تھا۔
”کونٹریں اٹھائیں تو سامنے مہرا لٹا، تھی۔“ اُس کے دیکھنے پر بچے کو سیسے میں چھپاتی لہرا کر بیٹی ادبے نیازی پر مچھل چڑھنے لگی۔ اُس کے گلابی پاؤں سرخ کارپٹ پر نشان نہیں چھوڑ رہے تھے پھر بھی وہ اُس نش پاد کھتا رہ گیا۔

”ارے سکندر اُم کب لے؟“ شاہ جہاں گیر کی آواز نے اُس کی محویت کو توڑا تھا۔
”ابھی۔“ بس ابھی آ رہا ہوں۔“ وہ چونک کر بولا اور بڑھ کر شاہ جہاں گیر کے سینے سے لٹکا ہوا پوچھنے لگا۔
”بیک ہے ناں۔“

”اُم اُسے ہو تو سب ٹھیک ہو گا بی بی جان سے ملے، پھر پہلے اُن سے مل لو۔ بہت یاد کرتی ہیں۔“
”شاہ جہاں گیر اُس کی تندر آمد پر اندر ہی اندر حیران ہو رہے تھے اور بظاہر بہت خوش دلی کا شکر کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگائے بی بی جان کے کمرے تک آئے اور دروازہ کھول کر انہیں مخاطب نہ ہوئے۔

”بی بی جان،“ وہ کہیں کون آیا ہے؟“
”نہ بی بی جان نے تیکے سے سنا تھا تو ان کے ساتھ شاہ سکندر کو دیکھ کر پہلے تو انہیں یقین نہیں آیا۔“
”میں تو کبھی بھولے بیٹے یاد آجاتی تھیں اور اب وہ اپنے آپ پر حیران ہو رہا تھا کہ اتنا عرصہ وہ ان

سے نور کیسے رہا۔ بہت ستا بیٹے تم نے مجھے کوئی اس طرح بھی ماں سے ناراض نہ ہوتا ہے۔ بی بی جان اُس کا پرہیز میں تمام کر سکودہ کرتے کیوں۔ وہ چپ چاپ منتظر ہا پھر ان کے رخساروں پر چمکے آنسو انگلیوں پر ہر

کر بولا۔
”ا تو کیا ہوں بی بی جان۔ اور مجھے آپ کی محبت کیسے لانی ہے۔ ورنہ میں تو ہتھیہ کر کے گیا تھا کہ
”بی بی جان! تم کا ہوا آیا ہے اس سے کھائے وغیرہ کا تو پرہیز نہیں۔“ اُس کے ہونٹوں پر اسیے کا نام
پہلے شاہ جہانگیر بول رہے۔

”نہیں بس۔ اس وقت بھوک نہیں ہے۔“ اُس نے کھانے کا منع کر دیا۔
”تو کوئی چائے، ٹھنڈا بلکہ ایسا کرو پہلے شاد دلے اور شاہ جہانگیر نے کہا تو وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔
”میرا خیال ہے پہلے میں با با جان کے مل لوں۔“

”با با جان تو فوراً لو کی طرف گئے ہیں۔ شام میں آئیں گے۔“
”خیریت۔ آپا تو ریکٹیک تو ہیں ناں؟ اُس نے سوالیہ نظروں سے بی بی جان کو دیکھا۔
”ہاں ٹھیک ہے فوراً فوراً اور شہر یا فوراً بھی۔ ابھی تو تم آئے ہو۔ دو چار روز میں جا کر بہنوں سے
بی بی جان نے کہا تو وہ بس سر ہلا کر رہ گیا۔

”جو کچھ میں ہیں پہلے اُن سے ترمٹنے دیں بی بی جان اسنے۔ شاہ جہانگیر کا اشارہ مہر النساء کی
اور بی بی جان نے غالباً دھیان نہیں دیا۔
”ہاں ہاں جاؤ، تمنا دو توں کو سلام کرو۔“

وہ کی کیوں سے شاہ جہانگیر کو دیکھتا کرے سے نکل آیا اور لاؤنچ میں رُک کر انتظار کرنے لگا کوٹا
جہانگیر اُس کے پیچھے آئیں گے لیکن وہ جلد سے قصداً بی بی جان کے پاس رُک گئے تھے بار دک لیے گئے
وہ کچھ دیر انتظار کے بعد سیڑھیاں چڑھتا اور آیا تو اپنے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر ایک بار ہچک کر گرا۔

مہر النساء کی موجودگی نے شخص وچ میں ڈال دیا تھا۔ غالباً اپنی پلاننگ میں وہ اس بڑی کھجور
جب ہی سمجھیں نہیں رہا تھا کیا کرے۔ جلد سے کیوں وہ کچھ غافل سا ہو رہا تھا۔ بشکل خود کو اس کا سامنا کرنے
کر کے وہ کمرے کے دروازے تک آیا تو سامنے میڈیروہ چمکے گو گو دین لٹانے اُس پر بھی نظر آئی
تک پہنچے کے بارے میں اُس کے ذہن میں کوئی سوال نہیں تھا اور اب اچانک ذہن میں جھٹکا

”وہ مہر النساء ممتی سکندر ایں نے اُسے باپش میں دیکھا تھا۔ غالباً ڈیویری کے لیے آئی تھی۔“
میں پچھ بھی تھا۔
”اُس وقت اُس نے پتلا کر اسیے کو خاموش کر دیا تھا لیکن اب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بے اختیار
آگے آکر بولا۔

”یہ میرا بیٹہ ہے۔“
مہر النساء نے چونک کر اسے دیکھا اور فوراً ہی نظروں کا زاویہ بدل گئی تو وہ اپنی بے اختیاری پر
کر بولا۔
”کیسی ہو تم؟“

مہر النساء نے سر تھکا لیا۔ جانے تمنا یا ناراضگی کا اظہار۔ وہ کچھ دیر رُک کر دروازہ رو بہ گ
گیا اور اپنے کمرے نکال کر دوش روم کی طرف جاتے ہوئے بولا تھا۔
”میں سو نا چاہتا ہوں، تم بی بی جان کے پاس چلی جاؤ۔“

شام آتے ہی ممتی جب با با جان کے کیتے پر مہر النساء نے کمرے میں آکر پہلے کھڑکیوں سے پردہ
پھیر دھیرے سے شاہ سکندر کا بازو ہلایا تو وہ سینڈ میں بڑبڑایا۔
”سوئے دو اس۔“

مہر النساء کے پورے وجود میں جنگاریاں بھر گئیں۔ ایک لمحے کو ہونٹ بیٹھے پھراس کا ہاتھ کھینچ کر لوی۔
”انہیں شاہ آپ کو با با جان بلا رہے ہیں۔“
”ہوں۔ شاہ سکندر نے دُراس آجکھیں کھولیں لیکن جب مہر النساء کا چہرہ نظر آیا تو فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا اور
”یوں بہتوں کی انگلیاں بااوں میں پھینسا کر پوچھا۔

”کیا کہا تم نے؟“
”با با جان وار رہے ہیں۔“
”با با جان آگے پورہ ہاتھ نیچے گرا کر اسے دیکھنے لگا۔

”جی اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں مہر النساء کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔
”کچھ دیر بعد شاہ سکندر نے با با جان کے کمرے میں داخل ہو کر انہیں سلام کیا تو جواب میں وہ اپنی جگہ سے
”تو صبح کا بھولا لوٹ آیا۔“

”شاہ سکندر کے اُن کی طرف بڑھتے قدم وہیں رُک گئے۔ اور اُن کے سینے سے گلے کی خواہش و باکر مضبوط
پہنچے ہیں بولا۔
”آپ غلط تھے با با جان! میں مہیلا نہیں ہوں۔“

”ممتی تو تو نہیں ایک بات کہہ دی۔ بر خور دار اور نہ تھا اسے اراووں کی مضبوطی ہم سے زیادہ کون
جان سکتا ہے۔ خیر رُک کیوں گئے۔ آؤ گلے لگو ہمارے۔ با با جان خوش دلی، فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے
”ایک قدم آگے بڑھتے تو وہ فوراً درمیانی فاصلہ سمیٹ کر اُن کے سینے سے جالگا۔

”خوش تو رہا۔“
”جی۔ دعا میں ہیں آپ کی۔ وہ کھل کر مسکرایا۔
”مجھے رونا با با جان اُس کے کندھے پر دباؤ ڈال کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگے۔ کہاں ہوئے
”جواں مل؟“

”کراچی میں۔“ شاہ سکندر نے اُن کے انجان بننے پر بخور نہیں دیکھا پھر سر تھکا کر کہنے لگا۔ ”میں آپ کو
”ناراض کر کے نہیں جانا چاہتا تھا با با جان اگر آپ اُس وقت میری بات مان لیتے تو میری خرابیوں میں آپ
”میں شریک ہو سکتے تھے۔“

”مجھے خوشی کہہ رہے ہو، اُسے ہم تسلیم نہیں کرتے اور بہتر ہوگا جو تم ہمارے سامنے اس کا ذکر نہیں کرو۔“
”با با جان نے واضح الفاظ میں رُک دیا۔
”شاہ سکندر نے ہونٹ پیچھ لیے تو جیو دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

”اپنے پچھ سے ملے؟“ قدرے توقف سے با با جان نے موضوع بدل کر بھی ایک طرح سے اُس پر چٹھا
”یا کہ وہ مہر النساء کو تسلیم کرنے کا دعو نہیں کر سکتا۔“
”جی۔ بادل خواستہ جواب آیا۔

”خوش نہیں ہوئے۔“ وارث ہے تمہارا با با جان کو اس کا انداز پسند نہیں آیا۔
”وارث۔“ وہ تلخی سے گویا ہوا۔ ”میری کون سی جائیدادیں کھڑی ہیں جس کے لیے میں۔“
”مجھے نہیں غاف تو نہیں کیا؟“ با با جان فوراً بولے تھے۔

”ممتی تو چاہتا تھا؟ وہ سوچ کر رہ گیا اور مزید ملنے سے بچنے کی خاطر وہاں سے اُٹھنے کا بہانا ڈھونڈ رہا تھا
”ارشہ جہانگیر کہنے۔ ایک نظر اُسے دیکھ کر با با جان سے پوچھنے لگے۔
”ممتی پر چلنا ہے با با جان۔“

”ہاں چلیں گے۔“ سکندر بھی جاتے گا ہمارے ساتھ۔ با با جان نے کہا تو وہ چونک کر بولا۔
”میں۔“
”اُس میں تیراں ہونے والی کیا بات ہے۔ کیا پہلے تم با با جان کے ساتھ نہیں جاتے رہے۔“ شاہ جہانگیر نے

اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”ابھی بھی جلنے کا۔ کیوں سکندر؟ بابا جان نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے مخاطب کیا تو وہ دیر سوچنے کے بعد بولا۔

”جی چلوں گا۔ پھر اُن سے اجازت لے کر کمرے سے نکل آیا۔

بی بی جان نے رات کے کھانے میں اُس کی پسندیدہ ڈشز بتوائی تھیں اور وہ کھانے کے لیے بیٹھ لیکن اُس کا ذہن مختلف سوچوں کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا۔ مزید سب کے رویے حیران کر رہے۔ کیونکہ اُس کے خیال میں اُسے یہاں آتے ہی پہلے بابا جان اور بی بی جان کی ناراضگی کا سامنا کرنا تھا۔ معافی مانگ کر انہیں منانے کا مرحلہ تھا لیکن یہاں اُس کے برعکس اُس کے اقدام کو کوئی اہمیت ہی نہیں جاری تھی گویا اُس کا جانا اور آنا معمول کی بات ہو۔ اور ظاہر ہے جب معافی کی لڑائی کا مرحلہ ہی نہیں وہ کس بنیاد پر اپنی شرائط بیان کرتا۔

”کیا بات ہے۔ دوپہر میں بھی تم نے کھانے سے انکار کر دیا تھا اور ابھی بھی کچھ نہیں لے رہے۔ بی بی جان نے اُسے سوچوں میں گم دیکھ کر کہا۔

”جی بس۔ میں کیا چکا، وہ کرسی دھکیل کر اُنک کھڑا ہوا اور جیراں سے چلنے کا کہہ کر باہر لان میں نکل حقیقتاً اُسے بہت کھنکھاس حساس ہونے لگا تھا۔ اپنوں کے درمیان ان کی محبتوں کے باوجود اُسے رہا تھا جیسے وہ مہر کسی پتھر میں چھس گیا ہے۔

تم کو میرے سوا اور میرے ساجنا
اب نہ دیکھے کوئی دوسرا
میں تیری دھوپ ہوں تو بے سایا میرا
زندگی کے عوض پیار یا تیرا
تو رہے ہمسفر تو یہ نہی ڈگر
بنی جانے کی پھولوں بھرا راستہ
تم کو میرے سوا اور میرے ساجنا
اب نہ دیکھے کوئی دوسرا

آسیہ بڑی مگن سی لگتا رہی تھی۔ آنکھوں میں جانے کس خیال کی چمک تھی۔ سبزی بناتی ہوئی میموزہ نے دو تین بار اُسے دیکھا لیکن ٹوکا نہیں۔ شاید اُس کے ہونٹوں پر چمٹا گیت انہیں اچھا لگ رہا تھا۔

رات دن کا جو یہ عجیب کھیل ہے
ہے خدائی کہیں اور کہیں میل ہے
عمر فانی وہی، یہ کہانی وہی
لوگ رکتے ہیں، رگشا نہیں قافلہ
تم کو میرے سوا اور میرے ساجنا
اب نہ دیکھے کوئی دوسرا

”واہ۔ کیا خوبصورت گیت ہے۔ میموزہ بھابی نے بے اختیار تعریف کی۔

”شکریہ اویسے میرا نہیں ہے۔ وہ مسکرا کر بولی۔

”ارے جراتیجہا کا دے آئی کا۔ اور تم سے اچھا۔“

”بس بس۔ زیادہ تعریف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے چاہیے میری آواز کیسی ہے۔“ وہ خود آواز کر بولی اور ہاسکٹ میں سے گارجا کر کھانے لگی۔

”اور بھی لے لو۔ میں اب پکانے جا رہی ہوں۔ میموزہ بھابی پھیلاوا سیٹھے ہوئے بولیں۔

”بس بس۔ کافی ہے۔ اور سلام میں کاٹ دیجیے گا۔ بلکہ اُنھے میں کاٹ دوں۔ یوں بھی ناراض نہ ہوں۔“ اُس نے ہاسکٹ اپنی طرف پھینچ لی اور میموزہ بھابی باقی چیزیں اُنکھا کر کچن میں چلی گئیں۔

”آئیے۔ آماں جی نے اپنے کمرے سے نکل کر اُسے پکارا۔

”جی آماں جی۔“ اُس نے جواب دیا تو آماں جی قریب آکر بولیں۔

”وہ۔ وہ تم نے نالہ کیا کہا تھا۔ عدیل سے معلوم کیا، کیا کہتا ہے وہ؟“

”ابھی کوئی اعتراض نہیں۔ آپ آبا جی سے پوچھ لیں پھر چلیں گے۔ وہ ہاسکٹ ہٹا کر آماں جی کے پیچھے کھینچتا ہوا بولے۔

”تھارے آبا جی سے تو پوچھ لیا ہے اور وہ سکندر کب آنے کا۔ وہ بھی ساتھ چلتا۔“

”سکندر۔ دودن میں آنے کا کہہ گئے تھے۔“ اُس کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

”آج تیسرا دن ہے۔ آماں جی نے کہا تو وہ جو بنگ کر بولی۔

”جی۔ ہو سکتا ہے آج آجائیں۔“

”بس تو اس کے آنے پر چلیں گے۔ اب دیر نہیں ہونی چاہیے۔ بڑے کی طرف سے تو اللہ کا شکر ہے

اظہان ہو گیا ہے۔ ایک یہ عدیل رہ گیا ہے۔ اس کی شادی ہو جائے تو پھر میں اور تھارے آبا جی بڑے کے پاس تھہر جائیں گے۔“

”اچ کے لیے،“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”ہاں بیٹا، ذرا عمارت قسمت میں رخ نکلا ہو۔ بڑی آرزو ہے مکہ مدینے جاؤں۔“ فرط عقیدت سے آماں جی کی آنکھیں جھپک گئیں۔

”انشاء اللہ آماں جی آپ مزور جائیں گی اور اب تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بڑے بیٹا وہاں ہیں۔

آرام سے آپ کر اور آبا جی کوچ گرائیں گے۔“ اُس نے آماں جی کے ہاتھ تھام لیے۔

”آس ایتھا افزون ہے۔“ میموزہ بھابی پکار رہی تھیں۔ ”وہ سکندر کا ہوگا کہتے ہوئے بہت عجلت میں اُنک بھاگی تھی۔“

”جیت کسی ہے تھاری؟“ ادھر سے شاہ سکندر نے پھوٹے ہی پوچھا۔

”بہت بہتر۔ آپ سنائیں، میرا تو خیال تھا آج آپ خود آئیں گے۔ اور ابھی آماں جی سے میں یہی ہر ہی تھی۔“

”ہاں آتا تو تھا لیکن ادھر بابا جان! میرا مطلب ہے جہانگیر بھابی بابا جان کے کسی کام میں اُلجھے ہوئے بسا اُن کے ساتھ ہی آؤں گا۔“ شاہ سکندر بہت جھیل کر بات بنا گیا۔

”کب آئیں گے؟“ وہ نے خود پوچھا۔

”میں بھی بتا رہا ہوں، کچھ دن لگ جائیں گے۔ تم نکر نہیں کرنا۔ کوئی پراہم تو نہیں ہے تمہیں؟“

”نہیں۔ آپ بتائیں، ٹھیک بھابی کے ہاں گئے تھے۔“ اُس نے ایک دم خیال آنے پر پوچھا تو وہ قدرے لکڑ بولا۔

”ابھی تو نہیں کیا۔ موقع ملا تو جاؤں گا۔“

”اچھا سنیں۔ ابھی آماں جی نالہ کے ہاں جانے کی بات کر رہی تھیں۔ وہ عدیل بھابی کے سلسلے میں کہہ رہی تھیں آپ آجائیں تو پھر میرا مطلب ہے آپ کو بھی ساتھ چلنا ہے۔“ اُس نے ایک طرح سے اُسے جلدی نہ کر کہا۔

”یہ ضرورتوں کے معاملات ہیں یا راتم جلی جانا۔“ وہ گھریلو گفتگو سے پہلو تہی کرتے ہوئے بولا۔ ”سُنو کوئی ضرورت کی بات کہو جو میری سماعتوں میں ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے۔“

”جیل میں آکر لکھن کا کاروبار چلے۔“ وہ بے ساختہ ہنسی مٹی۔ اور فوراً خاموش ہو گئی۔ کیونکہ ادھر سے میموزہ بھابی نے ہنسی کی آواز اُن کی سماعتوں سے نکالی تھی۔ ایک لمحہ رک کر پوچھنے لگی۔ ”کون ہے سکندر؟“

”کہاں؟“ ادھر سے بے دھیانی میں کہا گیا۔

ہا اور کون ہے آپ کے ساتھ، عدیل بھائی؟ احمد حسن نے لوازمات سے سچی مزالی پر نظر ڈال کر آہستہ آہستہ جواب دیا۔

ہوئے۔ میں چلنے کر کے آتا ہوں، احمد حسن اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ڈرامٹک روم میں آئی تو غالباً اماں بی اپنی امکا کو عقید بیان کر چکی تھیں۔ جب ہی نا املہ کی اتنے اُسے فوراً واپس جانے کا اشارہ کیا جسے دیکھ کر وہ عقب سے سرگوشی میں بولی تھی۔

”یہاں مہاراجہ کی بات سنا رہی تھی۔“
 ”ہیں۔“ ناگ نے بڑھک کر اسے دیکھا اور اس کی معنی خیز مسکراہٹ سے گھبرا کر جھاگ گئی۔
 احمد حسن کی آنکھوں سے پچھلے سوچوں کی ایک طرح سے نیم رضا مندی کا اظہار کر دیا تھا۔ گھر
 آتے ہی میسرہ مہاراجہ کی غریب مہمانی کو قہقہہ مارتے ہوئے بولیں۔
 ”اف، مہاراجہ کی تعریفیں کر کر کے میں نے اپنا نامہ اعمال خراب کر لیا۔ اللہ تو بہ۔ اللہ معاف
 کرے مجھے۔“

کبھی معاف نہیں کرے گا اللہ آپ کو عیدِ مہمانی چڑ کر لوے۔
 ہاں تہارے عیب چیلے کا گناہ قابلِ معافی تو نہیں ہے پھر بھی اللہ بڑا مہربان ہے! وہ عید کے
 چڑنے پر لکھ لکھا کر لو بی بی۔

باباجان مسلسل شاہ سکنڈر کو اپنے ساتھ مصروف رکھے ہوئے تھے۔ تیسرے دن بمشکل اُسے اسیہ کو لون کرنے کا موقع ملا تھا اور اُسے اپنے مزید چند دن اسلام آباد میں رہنے کا بتا کر وہ کسی حد تک اطمینان سے ہو گیا تھا۔ کیونکہ جس مقصد سے یہاں آیا تھا اُس کے حصول تک وہ باباجان کی کسی بات سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرح سے اُن کی خوشنودی ضروری تھی۔

اس وقت وہ باباجان کے کہنے پر شیر بانوں کے ہاں یعنی اپنے سب سے سہرا ل جہانے کے لیے تیار ہو کر نیچے آلوٹو بی بی جان کے پاس پوری سچ و صبح سے تیار کھڑی مہر اُتار کو دیکھ کر دوڑاڑے میں ہی گر گیا تھا۔

”جاؤ سکندرا گیا، بی بی جان اُسے دیکھ کر مہرِ انساؤ سے بولیں۔
 ”یہ میرے ساتھ“ وہ اس صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھا۔ پیشانی پر گہری لکیر نمودار ہو کر اُس
 بی بی کواری کا رخ کر گئی۔

بہاؤی جان نے یہی نظروں سے دیکھا تو وہ سر جھٹک کر پلٹا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا گاڑی کے پاس ڈرامو موجود تھا اسے دیکھتے ہی دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

”بتاؤ میری عزت نہیں ہے، چہ جائیکہ وہ ڈراما میر کو بیچ کر خود ڈراما ٹیگ سٹریپر بیڈنگ۔ کچھ دیر بعد مہر النساء کو گھونٹا ہے اس کے بل برائے کر بیٹی کو اس نے جھپٹے سے گاڑی آگے بڑھائی تھی۔

[illegible]

جس کے باپ کی طرف سے ایک عرصہ تک رہا تھا کہ اس نے بھلائی کی بات نہ کی تھی۔
 نہیں شاہ، یہاں شاہ باؤ کے علاوہ اور کسی کو نہیں معلوم کہ آپ شاہ پور چھوڑ کر چلے گئے تھے یا
 شاہ سکندر کیجے ہیں بولا۔ لیکن اپنے اعصاب پر قابو پالیا اور غاصب سے سکون نظر آنے لگا تھا۔
 تو یہاں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے شاہ مازوں نے سارا ہوا۔ تو یہ بھی وہ اس کا عرازا تھا

163

میں بہت دانا کو آتی ہے، وہ بڑبڑاتے ہوئے پھر دھیرے دھیرے چلتی اُس کے سامنے آکر کہنے لگی: "ایک بات بتائیں شاہ! اُس نے آپ کو چھوڑ دیا، با آپ خود اسے چھوڑ آئے ہیں؟" وہ ہنسنے میں دبا سر سے نکال کر اسے دیکھنے لگا۔

"ہاں، جس کی خاطر آپ مجھے بلکہ سب کو چھوڑ چکے تھے، مہر النساء برا راست اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر پھوڑ رہی تھی۔" اُس نے کہا کہ اُس نے مجھے یا میں نے اُسے چھوڑ دیا، تم نے نہیں، آپ کی والدہ سے میں نے خود کچھ لیا، مہر النساء نے کہا۔

"اچھا،" وہ اُس کی بوجھ پر ذرا سا ہنسا۔ پھر لائبریریا کے کونے سے شعلہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "مہر النساء! تم اگر اُس کے بارے میں جان سنی ہو تو یہ بھی جان لو کہ وہ میری بخت میری زندگی ہے۔" مہر النساء کی بے اختیاری نے اُسے مشکل میں ڈال دیا تھا، اور فوری جواب سے بچنے کی خاطر وہ گریٹ ایٹش ریلے میں سکنے لگا۔ اس کے بعد بھی سوچ کر بولا تھا۔

"میں بھاری حقیقت اور اہمیت سے انکار نہیں کروں گا مہر النساء! کیونکہ تم میرے بچنے کی ماں ہو۔ مجھے اگر تم سے نفرت نہیں تو نفرت بھی نہیں ہے۔ اور میں یہ بھی جانتا کہ تم دنیا دکھا دے کو حق میرے نام کے سہارے زندگی کو ادا اور اس امید پر کہ کبھی میں اسیہ کو چھوڑ کر بھاری طرف لوٹ آؤں گا۔"

ہو سکتا ہے کہ اُس نے اُس کو یقین دیا ہو کیونکہ وہ خود بھی یہی چاہتے ہیں بلکہ مسلسل اُس کی کوششیں ہی ممدوت ہیں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ مہر النساء، تم خود کو فریب مت دو، میں چند دنوں کے لیے تم پر ہوں، واپس لوٹ جاؤں گا۔ میری طرف سے تمہیں پوری آزادی ہے اپنے بارے میں جو مناسب سمجھو سوچ لو۔" مہر النساء تم کو یہ ہو کر رہ گئی تھی۔

شاہ سکندر نے خاموش ہو کر اُسے دیکھا اور مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر کے دوبارہ لیٹ گیا، لیکن اب بند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

پھر صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی شاہ سکندر والدین جانے کے لیے تیار ہو گیا اور حجاجان سے اجازت لینے اُن کے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ شاہ جہانگیر آگئے، انہیں باباجان نے بھیجا تھا۔ لیکن شاہ سکندر کے سامنے وہ باباجان کا نام لیے بغیر کہنے لگے۔

"میں فارم پر جا رہا ہوں، تم بھی چلو، ذرا فراغت سے بیٹھیں گے، شاہ سکندر خود بھی اُن سے تنہا نہیں فرست سے بات کرنا چاہتا تھا، لیکن مہر النساء کا خیال آنے پر کہنے لگا۔

"مہر النساء بھی ساتھ ہے جہاں؟"

"نہیں، وہ وہ بھی چلے گی۔" شاہ جہانگیر نے کون اہمیت نہیں دی۔

"لیکن اُس کی موجودگی میں مہر النساء کے آنے سے شاہ سکندر کی بات ادھوری رہ گئی۔"

"اب کب آئے جہاں؟"

"مہر النساء نے شاہ جہانگیر کو دیکھ کر پلوچھا۔"

"بس ابھی آ رہا ہوں۔ اصل میں فارم پر جا رہا تھا راستے میں خیال آیا کہ تم کو کبھی ساتھ لیتا چلوں۔"

ذرا کب شب رہے گی، وہ آغا کہاں ہے؟" شاہ جہانگیر نے آخر میں نیچے کا پلوچھا تو مہر النساء کے کمرے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"شہر بانو کے پاس ہے۔"

کا اشارہ اُسے لے کر آؤ، ہم جب تک چچا جان سے مل لیں۔ شاہ جہانگیر نے شاہ سکندر کو چھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ اپنے کسی خیال سے چونکا پھر سر جھٹک کر اُن کے ساتھ چل پڑا۔

پھر چچا جان کے پاس کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ دونوں باہر آئے تو مہر النساء شہر بانو کے ساتھ

اور اُس سے بہت دوستی بھی تھی۔ جب ہاس کے گلے لگتے ہی وہ سب بھول گیا۔ پر لے بلکہ غور کر رہی اور عین حادی ہو گئی تھیں۔

میں کبھی یاد بھی نہیں کیا جاتا سکندر کہ وہ بھی سال میں دو بار نظر آتا ہے۔ شاہ ہارون نے پُر خوش انداز میں اُسے بازوؤں کے حلقے میں پیچھتے ہوئے کہا۔

شاہ سکندر کے پاس جواب نہیں تھا تو ذرا تھک کر گویا اُس کی بات سے غفلت ہو کر مہر النساء نے ایک لحظہ کو رک کر دیکھا پھر مدھن سی آگے بڑھ گئی تھی۔

کچھ دیر میں سارے گھر میں اُس کی آمد کی خبر ہو گئی تو سب اپنے اپنے کمروں سے نکلے لگے شہر بانو بے قراری سے جھانک رہی تھی۔

"کیسی بو شہر بانو! وہ شہر بانو کے سامنے کچھ چورسا بن گیا تھا۔"

"اچھی بول جہاں! آپ سنائیں، آپ تو، شہر بانو! اکیس خاموش ہو گئی۔"

"ہاں، تمہیں پتا ہے میں اس وقت چائے پیوں گا۔" اُس نے خوبصورتی سے شہر بانو کی بار مکل کی۔

"اور وہ بھی میرے ہاتھ کی۔" شہر بانو بات بن جانے پر شکر کرتی کمرے سے نکل گئی تو وہ چارہ کی طرف متوجہ ہو گیا اور اُن کے پوچھنے پر ابن مہر وینا تبتانے لگا۔

شاہ سکندر کا خیال تھا وہ شام سے پہلے کھڑی راہ لے گا لیکن رات کے کھانے تک تو اُسے وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا اس کے بعد چچا جان نے زبردستی روک لیا کہ بغیر کسی حفاظتی انتظام رات میں سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

"بابا ٹھیک کہہ رہے ہیں، آج کل کے حالات تم جانتے ہو۔ اور یہاں تمہیں پریشان کیا ہے۔ گھر میں شہزاد شاہ ہارون اُس کے کندھے پر ہاتھ مار کر اُٹھتے ہوئے بولا۔

"چلو اٹھو، سوئے کی بات کرو، غمناک رہنا بے فائدہ ہے۔"

"بابا شاہ کہو۔" وہ مہر وکی کو دیکھ کر مسکرایا پھر اُسے کر شاہ ہارون کے راجیل بڑا۔ اُس کے پیچھے شہر بانو، مہر النساء سے سرگوشیوں میں جانے لگا کہ ابھی اُس نے اُس کی کوشش نہیں کی پھر بھی ایک سوچ جلد اُس کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا۔

"اب قابو کر کے رکھنا اپنے شاہ کو!"

مڈروم میں داخل ہوتے ہی اُس نے سب کوٹ اُتار کر صوفی کی بیک پر رکھا پھر بیٹھ کر شہزادہ لگا۔ اس کام سے فارغ ہو کر سیدھا ہوا تو نظر مہر النساء پر پڑی، وہ نیچے کو۔ میڈ پر لٹانے کے اُس کی فیڈر اور تھراس لے کر حادی تھی۔ اور اُس کے واپس آنے سے پہلے ہی وہ منہ ہاتھ دھو کر نیچے کے ایک طرف لیٹا اور کچھ دیر سوئے ہوئے نیچے کو دیکھنے کے بعد آنکھیں پر بازو رکھ کر اپنے گھر میں تو مہر النساء جہاں وہ کمرے میں داخل ہوتا وہ وہاں سے چلی جاتی تھی اور یہاں پہنچتی پھر بھی وہ ایک سائے سے چلی گئی تھی تو لا شعوری طور پر وہ اُس کا انتظار کرنے لگا شاہزادہ اس کے اس کا آنا یقین تھا۔ تین دیر گزر گئی اُس کے انتظار پر نیند غالب آگئی، اور وہ جانے کب

رہتی۔

رات کے کسی پہر کڑوٹ بدلتے ہوئے شاہ سکندر کی آنکھ کھلی تھی تو کوئی کے پاس کھڑی ہو کر دیکھ کر وہ یکدمت بیدار ہو گیا۔ اور کہنیوں پر وزن ڈال کر اوچھا ہو کر میک سے میک

بولا۔

"تم سوئیں نہیں۔"

مہر النساء بڑی طرح چونکی اور پھر اُس پر پس ایک نظر ڈال کر رہ گئی۔

"کیا بات ہے۔ نیند نہیں آرہی۔" اُس نے کارنر سے سگریٹ کا بیگ اٹھاتے ہوئے بولا۔

سر سری انداز میں پوچھا۔

کھڑی تیز تیز جلنے کیا بول رہی تھی کہ انہیں دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گئی جیسے اُس کی آنکھیں ابھی بھی کچھ ہونے لگ رہی تھیں۔
 ”اچھی تو ہو شہر بانو؟“ شاہ جہانگیر نے آگے آ کر شہر بانو کے سر پر ہاتھ رکھا۔
 ”جی“ شہر بانو کا دھیان مہر لساؤ کی طرف تھا اس لیے بس جی کہہ کر رہ گئی۔
 ”بارون نظر نہیں آ رہا؟“
 ”انہیں حیدر آباد جانا تھا۔ سویرے ہی نکل گئے۔ اور آپ اتنی جلدی کیوں جا رہے ہیں۔ شاہ رکتے۔“
 ”بس، بٹا کچھ کام ہے۔ پھر آؤں گا۔ جیو سکندر۔“ شاہ جہانگیر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔
 ”اچھا شہر بانو، چلتا ہوں۔“ شاہ سکندر نے شہر بانو کو خود اٹھا کر اپنے لیے بہت جلدت کا منظر کیا تھا۔

مہر لساؤ، لطافہ خاموش تھی۔ لیکن اُس کے ہر انداز سے متغیر ظاہر ہو رہا تھا۔ اور یہ یقیناً اُس کے ماں آسیر سے کبھی وابستگی کے اظہار کا نتیجہ تھا جسے وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ کل تک تو وہ ایسی نہیں تھی اُس سے لائق نظر ظاہر کرنے کے باوجود اپنے جذبات کو چھپا نہیں یاد رہی تھی۔ شاید اس خوش فہمی بنا پر کہ وہ ہمیشہ کے لیے اُس کی طرف لوٹ آیا ہے۔ اور حقیقت یہ معلوم ہونے پر اُس کا تاملنا نا فطری تھا۔ تمام راستہ بھی پیچھے کی معصوم شہزادوں پر اسے بڑی طرح جھپٹتی رہی تھی اور اب ریشٹ ہاؤس کے ملازمین پر سر برس مہی تھی۔
 ”اسے کیا ہوا ہے؟“ شاہ جہانگیر نے بہت آرام دہ انداز میں پوچھے ہوئے شاہ سکندر سے پوچھا تو اُس نے کندھے پر اٹکا کر اعلیٰ کا اظہار کر دیا۔
 ”کیا تم اسے خاموش نہیں کر سکتے؟“ شاہ جہانگیر کا انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہے ہوں کیسے مدد پر ”چلانے دیں بھائی، آخر وہ بھی انسان ہے، گھٹ گھٹ کر تو مر جائے گی تو وہ اپنی ناکواری پر کر بولوا۔“

”اس کے مرنے سے تمہارا ہی فائدہ ہوگا۔“ شاہ جہانگیر نے مذاق کہا اور سمجھنے کے باوجود بڑی طرح سلگ کر بولوا۔
 ”اب میں اتنا خود غرض بھی نہیں ہوں جہانگیر بھائی، کہ اپنے فائدے کے لیے کسی کی جان ہی لے لوں۔“

”بابا بابا۔“ شاہ جہانگیر کا استہزائیہ قہقہہ زور دار تھا۔ وہ بمشکل ضبط کرتا ان کے پاس سے اٹھ کر باہر نکل آیا تھا۔
 پہلے بھی وہ اکثر یہاں آیا کرتا تھا۔ کبھی باباجان کے کام سے اور کبھی یوہن تفریح کی غرض سے۔ خود جب یہ دونوں کی آمد ہوتی اور بالٹوں سے یلوا باش مہک رہا ہوتا۔ ابھی تو ہر طرف ششک تھے کچھ پر طے تھے۔ جنہیں وہ پیروں تلے روندتا بڑی دور نکل گیا۔ عجیب سی سبے بس تھی۔ وہ شان و شکرت جو اس کی ذات کا خاصہ تھی۔ جانے کہاں کوئی بھی کچھ اُسے اپنا آپ اجنبی سالک رہا تھا۔ بہت زیادہ وقت تو نہیں گزرا تھا۔ جب وہ باباجان سے اپنی ہر بات منوالیا کرتا تھا۔ اور اُس وقت تک میں بھی نہیں تھا کہ کبھی زندگی میں یہ مقام بھی آئے گا کہ باباجان اُس کی بات سننے پر ہی آمادہ نہیں ہوں گے اور اُسے بھائی کا سہارا لینا پڑے گا، کتنا غریب تھا اس سہارے میں۔ وہ پہلے جان ہی پڑ پڑا تھا۔
 ”کاش جہانگیر بھائی ہی میرے ساتھ فیئر ہوتے، کچھ نہ کرتے میرے لیے۔ مجھے تنہا چھوڑ دیتے؟“ اپنی زندگی گزارتا۔ اُن کے ہاتھوں میں کچھ پتی تھیں۔ مگر میں کس قدر بے مایا ہو گیا ہوں؟ وہ اپنی

میں اس قدر غمو تھا کہ گاڑی کا پادان بھی سنا نہیں دیا۔

”کہاں ہے جا رہے ہو یاد۔“ شاہ جہانگیر نے تھوڑی اُس کے قریب لاکر کہا تو وہ رک کر کچھ نا سنجی کے عالم میں بھٹک گیا۔
 ”میر کی بات سے ناراض ہوئے ہو؟“ شاہ جہانگیر گاڑی سے اتر کر اُس کے قریب چلے آئے۔
 ”نہیں۔“ نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔ ”وہ گہری سانس لینے کے بعد۔“ فقہاً مسکرایا۔
 ”پھر یوں خفا خفا سے کہاں جا رہے تھے۔“
 ”نہیں نہیں، بس کچھ پرانی یادیں تازہ کرنے نکل آیا۔ آپ کو یاد ہے ایک بار منہر کے اُس طرف خانہ بدوشوں کا قافلہ آ کر ٹھہرا تھا۔ وہ ایک دم سے یوں ہو گیا تھا جیسے اُس وقت سے واقف ان ہی پرانی یادوں کو سوجاتا رہا ہو۔
 ”ہاں۔“ درجے اپنی زندگی میں پہلا عشق اسی قافلے کی ایک لڑکی سے ہوا تھا جس کا مجھے اب نام بھی یاد نہیں، شاہ جہانگیر نے بڑے محفوظ انداز میں کہا۔
 ”پہلا عشق۔“ اس کا مطلب ہے نہرت طول ہے؟ اُس نے فوراً گرفت کی۔
 ”لیکن تو یہ طرح اسیر لیس میں کسی کے ساتھ نہیں ہوا کہ گھر بار چھوڑنے کی نوبت آجائے۔“

شاہ جہانگیر بھی فوراً بولے تھے۔
 ”تو اسے آپ عشق تو نہ کہیں، دل لگی ہو سکتی ہے۔“
 ”تو جی نہیں تو یار۔“ شاہ جہانگیر نے اس بات کو ختم کرنے کی غرض سے کہا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ مار کر گاڑی میں بیٹھے گا اشار کیا تو وہ واپس کے راستے پر نظر لگتے ہوئے بولوا۔
 ”کہاں اپنی دور نکل آیا ہوں؟“

”ہاں، کبھی کبھی خود کو بھی پتا نہیں چلتا۔“ شاہ جہانگیر کہتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھنے لگے کہ اُس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روک دیا۔
 ”بھائی، سیدھی بات سن لیں۔“
 ”شاہ جہانگیر تو کیا پھر اُسے دیکھنے لگے تھے۔“

”میں آپ کے کہنے پر یہاں آیا ہوں؟“ وہ بغیر کسی تہد کے گویا ہوا۔ ”آپ نے تو کہا تھا کہ باباجان سے معافی مانگنے کے بعد سارا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن یہاں تو وہی اول روز والی صورت حال ہے۔“

باباجان کو اس کا ذکر تک سننا گوارا نہیں۔
 ”تو تم نے کس نے کہا ہے کہ ان کے صلے آسیر کا ذکر کرو۔ تم ہمیشہ جلد بازی میں حماقت کر جاتے ہو سکندر، اپنے نہیں عملی طور پر ان پر یہ ثابت کرنا ہے کہ تمہیں مہر لساؤ کا بھی اتنا ہی خیال ہے جتنا آسیر کا۔ اس کے بعد تمہاری کوئی بات سنی جائے گی۔“ شاہ جہانگیر نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔
 ”اس میں بہت وقت لگے گا بھائی، اور میں اتنا عرصہ آسیر سے غافل نہیں رہ سکتا۔ مجھے ایک دو دن میں اس کے پاس جانا ہے؟“ اُس نے نفی میں ہر بات کہتے ہوئے یوں کہا جیسے مزید رکتا تا ممکن ہو۔
 ”کے؟“ کبھی یوں نہیں بائیں کر رہے ہو، اس طرح تو تم بھی باباجان کو آسیر کے حق میں ہموار نہیں کر سکو گے، پھر دن تو تمہیں یہاں رہنا پڑے گا؟ شاہ جہانگیر زنج ہو کر بولے تھے۔

”میں آسیر سے صرف دو دن کا کچھ کر آیا تھا۔“
 ”حق کیا ہوا؟“ وہ ماشاء اللہ بڑے بڑے سحر مار رہی تھی۔
 ”جو وہ کرے گی اُس کے۔“ وہ جاہل غور لوں کی طرح تھکے جرح تو نہیں کرے گی؟
 ”اوہ جرح نہیں کرے گی لیکن آپ نہیں سمجھیں گے کیونکہ آپ نے بھی عشق کیا ہی نہیں؟“ اُس کے بچے کا چہرہ نے شاہ جہانگیر کو خاموش کر دیا تھا۔

رات کا بھرتے کون سا پہر تھا، جب اچانک وہ نیند میں سے ہٹ بڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا

کہیں کوئی آواز کوئی آہٹ نہیں تھی، اور اپنے زور زور سے دھڑکتے دل کی آواز اُسے صاف سنائی رہی تھی، کتنی دیر تک بیٹھے پر ماتھ رکھ کر مغمی روشنی میں وہ چاروں طرف نظر میں کھانکھا کر دیکھتا رہا۔ اپنے قریب سونیا کو دیکھا کہ شاید اس کی نیند ٹوٹنے کا سبب سونیا ہو۔ لیکن وہ بے خبر تھی پھر بھی اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر اس نے دیر سے سے پکارا تو سونیا بس ڈراما کر رہی تھی۔

تب کچھ حیران ہوتی وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ لیکن نیند یوں اُٹا ہوتی تھی جیسے وہ سر سے ہر نہ جو۔ کچھ دیر تک وہیں بدلتے کتے بعد اس نے زبردستی سونے کی کوشش ترک کر دی تو ذہن شاہ کو سوچنے لگا۔ آج سارا دن بھی دھیان اُسی کی طرف رہا تھا اور ابھی شاید حوالوں کی رانگیز برہمی وہ بہ حال وہ جو دو دن کا کہہ کر گیا تھا تو پورے آٹھ دن ہو گئے تھے۔ اور بس وہی ایک بار فون بتایا تھا کہ اُسے آنے میں کچھ دن لگیں گئے۔ گو کہ اس میں تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ اور اب اس کی نظر ابھی اُن کی بات پر تھی۔ لیکن اب اچانک اُس کے اطمینان میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ شاہ سکندر کی طرف سے بدگمانی نہیں تھی۔ بلکہ اس کے بھائی شاہ جہانگیر کچھ پراسرار سے کئے گئے تھے، جو شادی کے بعد پورے ہوئے کہ پھر پلٹ کر جنرل ہی نہیں لی۔ اور ابھی بھی شاہ سکندر اُن کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اُسے وہ قصداً شاہ سکندر کے کام میں دیر کر رہے ہوں۔ پتا نہیں وہ چاہتے ہی نہیں یا کوئی اور ملکہ سوچتے سوچتے صبح کے قریب جا کر سوئی تھی، اس لیے مہقول کے مطابق اُنھیں کا سوال ہی نہیں تھا۔ بھائی نے ناشتے کے لیے اٹھایا تو اس وقت ذرا سی آنکھیں کھول کر اس نے نہ صرف ناشتے کو بلکہ بعد بھی اٹھانے کو منع کر دیا تھا۔

پھر گیارہ بجے کے قریب شاہ سکندر کے فون پر میمونہ بھائی کو مجبوراً اُسے بھڑوٹا پڑا۔
 ”مہار سے سراج کا فون ہے، اس کو پھر سو جانا“ میمونہ بھائی نے اُس کے کان کے قریب اونچی آواز میں کہا کہ وہ فوراً اٹھ لی، اور کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے روٹھے لیجے میں بولی۔
 ”یہ اٹھانے کا لون سے طر لیتا ہے؟“

”جیسے روٹھنے کی ضرورت نہیں ہے، اپنے سراج کی خبر جو ایک بل ممبر نہیں کر رہے، سکندر آگئے کیا؟“ اُس کا اشتیاق پھانے نہ چھوٹا۔
 ”جی نہیں، اُن کا فون ہے۔“ میمونہ بھائی نے کہا تو وہ اٹھ کر لال میں آگئی۔ فون ابھی کے تھا اور وہ سکندر سے بات کر رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر انہوں نے شاہ سکندر کو اس کی آمد کا بتایا اُسے بتا دیا۔

”خیریت، کیا رات میں نہیں سوتی تھیں؟“ شاہ سکندر نے چوڑے ہی پوچھا۔
 ”بس رات کچھ سوئے جا گئے تھیں۔“ اُس کی آواز بوجھل ہو رہی تھی۔

”آپ سائیں ایک آرہے ہیں؟“ شاہ سکندر کی غیر یقینی اُس کے انداز سے ظاہر تھی۔
 ”میں بس دو چار دن میں آ رہا ہوں۔“ شاہ سکندر نے غیر یقینی اُس کے انداز سے ظاہر تھی۔
 بات بھی بدل گیا۔

”سنو لے آجی خیال آیا تھا کہ آج تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ تم میمونہ بھائی کے ساتھ نہیں، آج میرا کہیں جانے کا موڈ نہیں ہے۔ کل چلی جاؤں گی یا جب آپ آئیں گے؟“ اُس نے سستی سے کہا۔

”تم اپنا خیال نہیں رکھ رہی ہو اس، اس طرح کرو گی تو میں“
 ”خداوں میں ڈوبی آواز کی گھبراہٹ اچانک خاموش ہو گئی۔ شاید اُن کٹ گئی تھی۔ اُس نے کڑیل پیر ہاتھ رکھ کر پھوٹا پھوٹا پیر سے ریسپورڈر لکھ کر قدرے سست روی سے براہِ راست آ پٹی۔

”ناشتا کرو گی؟“ میمونہ بھائی نے کچن کی کھڑکی سے بھانک کر پوچھا۔
 ”نہیں۔ صرف چائے پیوں گی اور وہ بھی نہانے کے بعد۔“ اُس نے اس خیال سے منع کر دیا کہ میمونہ بھائی اپنا کام چھوڑ کر اس کے لیے ناشتا بنانے نہ کھڑی ہو جائیں۔ اس کے باوجود جب وہ باغیچہ کی طرف سے گزری تو اس نے اس کے ساتھ ناشتے کے لوازمات بھی موجود تھے۔ اور ابھی وہ جائزہ لے رہی تھی کہ سونیا اور امراٹھوں سے آگئے۔

”جی بھی چھوڑیں گی ناشتا کروں گی؟“ سونیا نے اپنا بیگ اُتار کر تخت پوش پر پھینکے ہوئے کہا تو اُٹھ کر ذرا اُسے ٹوکا۔

”بھوک نہ پڑی! صبح ناشتا کیا نہیں تھا؟“
 ”ہوں، بُری بات۔ تم بیٹھو سونیا، یہ مہار سے ہی لیے ہے۔“ اُس نے اُٹھ کر لوٹ کر سونیا کو ٹھاپا پھر کھڑی دیکھ کر لوٹ کر آگئے۔
 ”آج تم لوگ جلدی کیسے آگئے؟“

”آج ہمارا باپ ڈسے تھا بھرتی فرسٹ ہے ناں؟“ سونیا نے حسبِ عادت قابلیت بتائی۔
 ”اچھا ہاں۔ خیر تم دونوں ناشتا کرو، میں اتنا جی کے پاس جا رہی ہوں اور دیکھو لڑنا نہیں، وہ نرمی سے دونوں کو نصیحت کرتی اتنا جی کے پاس چلی آئی۔
 ”کیا کہہ رہا تھا سکندر؟“ اتنا جی نے اُس کے بیٹھے ہی پوچھا۔

”بات کہاں ہوئی اُن سے۔“ لائن ہی کٹ گئی تھی۔ وہ سرسری انداز میں جواب دے کر عمر کو گدگد لانے لگی۔
 ”ابھی سونیا اور امراٹھ کی آواز آئی تھی۔ اسکول سے آگئے کیا؟“

”جی اُدھر سے کمرے میں ہیں، خیر اب تو وہ میرا کمرہ نہیں ہے۔“ وہ کہہ کر خود ہی ہنسی۔
 ”کیوں نہیں، ابھی بھی مہار سے، تم جب آؤ گی اسی میں رہو گی۔“ اتنا جی کی فبت کے سامنے وہ خاموش ہو رہی تھی۔

پھر دوپہر کے کھانے کے بعد جب میمونہ بھائی عمر کو لے کر اپنے کمرے میں سونے چلی گئیں تب دریت سے کچھ کی خاطر وہ سونیا اور امراٹھ کے ساتھ لٹو کھینچنے بیٹھ گئی۔ لیکن پہلے مرحلے پر ہی اُسے نیل یاد آ گیا۔ اور اُس کی خالی جگہ کو دیکھتے ہوئے شدت سے اُس کی نمی محسوس ہونے لگی۔
 ”تھیں ناں چھو پھو، آپ کی باری ہے۔“ امراٹھ نے اس کا ہاتھ ہلا کر متوجہ کیا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولی۔

”نہیں بس، میرا دل نہیں چاہ رہا۔“
 ”خیر تم کو پورا کر۔“ امراٹھ نے اصرار کیا۔
 ”رات میں کھلیں گے، جب تمہارے عدیل چاہا بھی آجائیں گے۔“
 ”عدیل چاہا میرے پارٹنر نہیں گے، سونیا خوش ہو کر بولی۔
 ”اور میں پھر پھو کا۔“

”اب ٹھیک ہے، جاؤ اب تم دونوں کچھ دیر آرام کرو۔ شام میں اُٹھ کر پہلے ہوم ورک کرنا، پھر کھلیں گے۔“ وہ اُٹھتے ہوئے بولی پھر دونوں کو سونے کے لیے اتنا جی کے پاس بھیج کر لالائی میں ترنم بھائی کے بڑ بڑائی کرنے لگی۔

”خیر اب جب اس نے فون کیا تھا تو نیل سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ اُس کی ملازمت نے بتایا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ کہیں باہر گیا ہو ہے۔ اور ابھی بھی اُس کے پوچھنے پر ملازم نے وہی بات دہرائی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی اُس سے جھوٹ بولا گیا ہے۔ اور ملازم خود سے تو جھوٹ بولی نہیں سکتی تھی۔ لیکن بیسیدہ بیگم نے کہا ہو گا۔ وہ کتنی دیر تک سوچتی اور کڑھتی رہی کہ آخر بیسیدہ ایسا کیوں

کر رہی ہیں۔ حالانکہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ نبیل اس سے کتنا مانوس ہے۔ اور جانے نبیل سے کیا گی، ہم سب سے تنفر کر کے کی کوشش اور وہ ابھی نا کچھ بچہ ہی تو ہے۔

وہ یونہی سوچتے ہوئے اپنی بی بی میں ادھر سے ادھر ٹپل رہی تھی۔ دو بہر کا وقت تھا۔ سب تھے۔ اور وہ کیونکہ دیر سے اٹھی تھی، اس لیے اب جھلک رہی تھی۔ کوئی کام بھی تو نہیں تھا۔ اور تو کون سا میونہ بھائی کرنے دیتیں۔ وہ سخت بور ہو کر شل فون کو گھومنے لگی۔ صبح شاہ سکندر سے بات نہیں ہو سکی تھی۔ اور اس کا کچھ پتا ہی نہیں تھا کہ کہاں چھڑا ہوا ہے۔ ورنہ وہ خود اسے فون اسے فون کرنے کے خیال کے ساتھ ہی اسے میونہ بھائی کی بات یاد آئی جو انہوں نے اسے شاہ پورہ بی بی جان سے بات کرنے کو کہا تھا۔

نہیں اسی وقت اس نے ڈاکٹر کیڑی کھول کر شاہ پور کے منہ تلاش کیے اور شاہ حیات ٹھہرا کر باہر کے منہ داخل کرنے لگی۔ کچھ ملی جلی سی کیفیت تھی اس کی۔ ڈر بھی لگ رہا تھا اور بی بی جان سے بات خوشی بھی تھی۔ دوسری طرف میل جا رہی تھی۔ پھر لیسور اٹھنے کے ساتھ ہنکارا بھرنے کے انداز کی آواز سنائی دی۔ تو وہ بہت سنبھل کر بولی۔

”وہ بی بی جان ہیں؟“

”آپ کون؟“ خامشی بارعب آواز تھی۔ وہ پہچانتی نہیں تھی، پھر بھی کچھ گئی بابا جان ہوں گے نہیں تو کئی یعنی کبھی تو ان سے بات ہوتی ہی تھی پھر انھی کیوں نہیں۔ اس نے سوچا اور پھر غصے جلنے کے لیے قدرے جتا کر بولی۔

”جی میں آسیمہ ہوں۔ آسیمہ سکندر حیات۔“

”یعنی سکندر حیات کی۔“ سوچتے ہوئے انداز میں بس اسی قدر کہا گیا۔
”بیوی۔“ وہ پوری جان سے متوجہ ہو کر بولی جیسے ان کی ایک انگ جنبش محسوس کر رہی ہو۔
”کون سی بیوی، دوسری، تیسری، چوتھی۔“ اتنے آرام سے پوچھا گیا کہ وہ سنبھلا گئی۔

”جی!“

”ہم سکندر حیات کی صرف ایک بیوی کو جانتے اور مانتے ہیں۔ جیسے سکندر پوری شان و بیاہ کر لیا تھا۔ اور وہ ہے مہر النساء۔“ بابا جان نے اس کے سر پر اٹیم ہم دے مارا تھا۔

”نہیں، آپ غلط کہہ رہے ہیں۔“

”اپنی حیثیت جان کر بات کر ورنہ! شاہ سکندر حیات نے اگر تمہیں اپنی رکھیل بنا کر رکھا معاوضہ بھی دیا تو کچھ بابا جان نے انتہائی شفا کی سے اس کی عزت و وقار کی دھیان اُٹا دی نہیں اس کا پورا وجود جھٹکے کھانے لگا۔“

”اور ایک رکھیل کی اتنی جرأت کہ وہ جاری بات کو غلط کہے۔ شاید تم جاری حیثیت و مزہ نہیں ہو یا پھر یہیں بلیک میل کرنا چاہتی ہو، کہہ دیا جائے تمہیں، لیکن پھر وہ مانگتے ہوئے نہ نہیں جاری حیثیت رکھنا۔ ہم اپنے بیٹے کا مصروفہ دینے میں تاخیر نہیں کریں گے، بابا جان کی سناعتوں سے گزری روح میں نشتر چھو رہی تھی۔“

اس کے ہاتھ سے ریسور چھوٹ گیا اور دوسرے پل اس کی دل در پیچ درد و دیوار ہلا گئی تھی
”اماں جی!“

خاموشی کو چیتی ہوئی آسیمہ کی چیخ نے سوتے میں سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ سب سے پہلے میونہ بھائی نے۔
”نہیں، نانا! سب اس کے کمرے میں گئی تھیں پھر ان ہی بیروں ڈرائنگ روم کی طرف بھاگ رہی تھیں کہ وہ فرش پر پڑنے لگی۔“

”اسیوں نے لپک کر اسے کندھوں سے تھام کر سیدھا کیا تو وہ ان کے بازوؤں میں جھول گئی۔
”جی، جلدی آئیں۔“ میونہ بھائی نے گھبرا کر اماں جی کو پکارا ”معا“ نظر ریسور پر پڑی جو اسٹینڈ سے نیچے پڑا تھا انہوں نے فوراً ”تھام کر کان سے لگا کر سیلو کو اتار دھرے جیسے اطلاع دی گئی۔
”سکندر شاہ پور پہنچ چکا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

”ابا جان!“ اماں جی کے پیچھے اماں جی بے حد گھبرائی ہوئی تھیں۔ آسیمہ کی چیخ پر ہی ان کے ہاتھ پاؤں جھمکے تھے اور اب اسے فرش پر پڑے دیکھ کر تو رہے سے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔
”ابا جان! میری بیٹی کو؟“

”وصلہ وصلہ۔“ اماں جی نے انہیں آسیمہ کے قریب نہیں جانے دیا اور پہلے برہہ کر اس کے سر کے نیچے ہاتھ میونہ بھائی کو ادھر سے اٹھانے کا اشارہ کیا اور بے مشکل تمام اسے کمرے میں لا کر لٹاتے ہی بولے۔
”بی بی میونہ! خلیل یا عدیل کو فون کرو، جلدی ڈاکٹر کو لے کر آئیں۔“

ہون بھائی پوری بات سے بغیر فون کرنے دوڑ گئیں تو اماں جی، آسیمہ کے قریب بیٹھ کر اس کی ہتھیلیاں ملنے ان کے آنسو بڑی روانی سے بہہ رہے تھے۔

”ابا جان! آپ بیٹھ جائیں۔“ میونہ بھائی واپس آئیں تو ابا جی کو بے بسی سے ٹپکتے دیکھ کر کرسی ان کے سامنے لڑوئیں۔ پھر گلاس میں پانی ڈال کر آسیمہ کے قریب آئیں اور اس کے منہ پر ہلکا سا چھینٹا مار کر گلاس اماں جی کو

پہلے بھائی ڈاکٹر کے ساتھ آئے اس وقت تک سارے گھر یونٹے آڑے جاکے تھے پھر بھی اس کی۔
”جی، ابھی۔“ اماں جی کی حالت کے پیش نظر عدیل بھائی کے اشارے پر میونہ بھائی انہیں وہاں سے اٹھا کر باہر لے گئیں۔ تب ڈاکٹر اسے چیک کرنے لگا۔

”ڈاکٹر! کھنٹ؟“ ڈاکٹر کینس چیک کرتے ہوئے ڈاکٹر نے پوچھا۔
”جی۔“ عدیل بھائی کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ بمشکل ڈاکٹر کو جواب دے سکے۔
”مڈیٹاٹک۔“ ڈاکٹر نے آسیمہ کو انجکشن لگانے کے بعد کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میں میڈیسن لکھ کر باہر آؤں اگر آؤں گے میں انہیں ہوش آجائے تو یہ دوائیں ٹھیک رہیں گی۔ دوسری صورت میں ہاسپٹل لے جائی۔“

”جی۔ ابھی لے جاؤں؟“ عدیل بھائی نے فوراً ”پوچھا تو ڈاکٹر کندھے اچکا کر بولا۔
”آپ کی مرضی! اگر آپ آؤ گے انتظار نہیں کر سکتے تو ضرور لے جائیں۔“

”جی! پلٹ کر ابا جی کو دیکھا۔ ان کے ساتھ خلیل بھائی کھڑے تھے اور انہوں نے ڈرائیو میں سر ہلا کر گویا ”فون ہاسپٹل لے جانے سے منع کر دیا۔ تب عدیل ڈاکٹر کے ساتھ باہر نکل گئے۔
”یہ بعد دوا میں لے کر واپس آئے تو ابا جی خلیل بھائی کو تار رہے تھے۔

”میں نہیں معلوم، ہم سب سو رہے تھے۔ پتا نہیں آسیمہ کو کیا ہوا؟ بہت زور سے چیخی تھی اور ہمارے آنے پر ہوش ہو چکی تھی۔“

”اس سے پہلے میرا مطلب ہے کھانا وغیرہ کھایا تھا اس نے“ عدیل نے پر سوچ انداز میں پوچھا۔
”جی! ہمارے ساتھ کھانا کھایا اور اس وقت بالکل ٹھیک تھی بلکہ کھانے کے بعد سوینا اور احمر کے ساتھ لٹو



بھی کھیل رہی تھی۔ ”اباجی نے بتایا تو دونوں بھائی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تب ہی میمونہ بھانجی“
 ”اباجی! آپ اندر چلیں! ماں جی کو دیکھیں۔ مسلسل روئے جا رہی ہیں۔“

”کہاں ہیں؟“

”اُدھر آئیے کہیاس۔“
 ”وہاں کیوں جانے دیا ان کو۔“ اباجی کہتے ہوئے آسیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کے بچے جانے لگے لیکن میمونہ بھابھی نے اشارے سے روک لیا اور جب اباجی آسیہ کے کمرے میں داخلہ ہوا، دونوں بھائیوں کو دیکھ کر کہنے لگیں۔

”آسیہ فون پر کوئی بری خبر سن کر بے ہوش ہوئی ہے۔“
”آپ کو کسے معلوم ہے؟“ عدیل نے فوراً پوچھا۔

”تمہیں اباجی نے بتایا نہیں کہ وہ وہاں لائی میں بڑی تھیں اور جب میں اس کے پاس پہنچی تو وہ رہا تھا۔ میں نے کان سے لگایا تو ادھر سے کوئی کہہ رہا تھا کہ سکندر شاہ پور پہنچ چکا ہے۔“ میمیو نے ہمام انداز میں بتا رہی تھیں۔

”سکندر کا شاہ پور جانا تو کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے سن کر آشیہ شاکد ہو اور اور کیا بات ہوگی؟
 اے تاج! اسے میوند بھانجی کو دیکھا تو وہ اپنی سی سرکھائی ہوئی بولیں۔

”اور تو کوئی بات نہیں ہوئی کیونکہ ادھر سے فون بند ہو گیا تھا اور اس سے پہلے آسیہ نے کیا نا
گی۔“

”کیا سنا ہو گا آئیے نے۔ کہیں خدا نخواستہ شاہ سکندر کے ساتھ کوئی حادثہ۔“ تحلیل بھائی کا انداز و عدل نے چونک کر انہیں پھر میمونہ بھابھی کو دیکھا تو وہ کہنے لگیں۔

”خدا خواستہ ایسی کوئی بات ہوئی تو ہم اسیہ کے سامنے تو ابھی ذکر نہیں کر سکتے، ایسا کریں؟“

”مہم میں جا رہا ہوں۔“ عدیل کہہ کر گھڑی دیکھنے لگے۔

”شاہ پور۔“

”میرا خیال ہے آسہ کو ہوش میں آئے دو سائید اس سے معلوم ہو جائے۔“
 ”نہیں تحلیل بھائی! آسہ ہوش میں آجائے تب بھی اس سے کوئی سوال نہیں کیجیے گا۔“

عدیل نے آخر میں قصداً "متفکر کھڑی میمونہ بھی مجھ کو مخاطب کیا تو وہ بس سر ہلا کر رہ گئیں۔"

خلیل بھائی؟“

* ☆ *

عدل کے پیش نظر صرف دو باتیں تھیں۔ شاہ سکندر کے ساتھ واقعی حادثہ یا پھر آسیہ کے سنا کیے اور گوکہ مذاق انتہا سنگین تھا کہ ان کی بہن کی جان پر بتا گیا تھا پھر بھی تمام راستہ وہ کسی دعا کے خدا کرے یہ مذاق ہی ہوا اور شاہ سکندر خیریت سے ہو۔ اس کے علاوہ ان کے ذہن میں کوئی تیرا تھا اس لیے جب وہ حولی کے سامنے اترے تو فوری طور پر ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اندر کیسے؟

تعارف میں کیا کہیں۔ جبکہ چوکیدار منتظر کھڑا تھا۔
 ”شاہ سکندر یا شاہ جامنگیہ صاحب سے کہو۔ کراچی سے عدیل نے درے تاخیر سے
 ”شاہ“ کو کچھ کر کہا تو وہ فوراً ”پٹ کر اندر چلا گیا، کچھ دیر بعد واپس آکر بولا۔
 ”بار کو کچھ کر کہا تو وہ فوراً ”پٹ کر اندر چلا گیا، کچھ دیر بعد واپس آکر بولا۔
 ”شاہ“ کو کچھ کر کہا تو وہ فوراً ”پٹ کر اندر چلا گیا، کچھ دیر بعد واپس آکر بولا۔

ہو صاحب اس طرف سے آجائے۔
 وہ صاحب سے اس کے ساتھ چل پڑے۔ دوسرے سمت سے چکر کاٹ کر گیسٹ ہاؤس اندر داخل ہوتے ہی ان
 کو وہاں کھڑی شاہ سکندر کی گاڑی پر پڑی تو انہوں نے جو کیدار سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن وہ ان سے کافی
 نظر بچ گئے اور تیز چل رہا تھا اور جب تک وہ اس کے قریب پہنچتے اس نے ایک دروازے کے سامنے رک کر
 لمبے لمبے اشارے کا اشارہ کیا اور فوراً انہوں نے آگے بڑھ گیا جیسے اسے یہی حکم ملا ہو۔ عدیل نے حیران ہو کر اسے جاتے
 ہی اندر جانے کا اشارہ کیا اور فوراً انہوں نے آگے بڑھ گیا جیسے اسے یہی حکم ملا ہو۔ عدیل نے حیران ہو کر اسے جاتے
 ہی اندر جانے کا اشارہ کیا اور فوراً انہوں نے آگے بڑھ گیا جیسے اسے یہی حکم ملا ہو۔ عدیل نے حیران ہو کر اسے جاتے

ماتھے پر ہاتھ رکھ کر میں داس ہو کر دوڑا کرتے چلاں، بل کرتے۔
 سامنے آرام، صوفے پر شاہانہ وقار کے ساتھ بابا جان بیٹھے تھے ان کے رکنے پر کہنے لگے۔

”رک کیوں گئے، یہاں آکر بیٹھو۔“

”خیر۔ آپ؟“ عدیل ان کے دائیں طرف صوفے پر بیٹھے اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

ہم سندر نے غمے باباجان ہیں اور تم غالباً اس کے دوست۔ باباجان نے اپنے تعارف کے ساتھ ان کا مرحلہ طے کر لیا۔

جی میں کراچی سے آ رہا ہوں، شاہ سکندر ملیں گے؟“ اس میں شاہ سکندر کے بارے میں جاننے کی جلدی

ہاں ملے گا کیوں نہیں، لیکن تمہیں تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔" بابا جان نے ایک نظریں جان لیا تھا کہ شکار باکرہ کیا ہے۔

نہیں تکتے ہوئے ہیں شاہِ سکندر؟“

غلامِ پروتا ہے آج کل ’تجائے گا ایک دودن میں تم آرام سے رہو، تمہارا اپنا گھر ہے۔‘ باباجان عموماً ”جیسے

مندر کے دوستوں سے بات کرتے تھے ان سے بھی اسی طرح ہوئے۔

ملک و دو زبان تو نہ ہنر، تو راہ، سکندر کے وہ سر۔ تو سال ۱۱۱۱ء میں رہتے ہیں۔ پچھلے مہینے آصف شاہ آزاد

یہاں کوئی شخص نہیں رہتا۔ یہاں تو ایک عجیب سا مکان ہے۔ یہاں تو ایک عجیب سا مکان ہے۔

”نہاں“ کافی دن سکندر کراچی میں رہ آیا ہے۔ ”بابا جان بہت سرسری انداز میں ان کی تائید کرتے ہوئے کہنے لگے: ”سکندر کو کراچی شہر بندے اور مٹانے بھی سوجھا تھا“ اُسے وہیں سیٹ کروں گا لیکن وہاں وہ کسی برے چلک

”بھئی کیلئے اس نے اسے واپس بلوایا ہے۔“

”ہاں! میں کوئی طوائف زادی، سنا ہے سکندر کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہنے لگی تھی۔“ بابا جان نے گاہ

تھوڑوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھی بھجھ گئی تھیں۔

!!جان بٹنے تھے کہ ان کے سامنے اس لڑکی کا بھائی ہے، جس کی چیخ ابھی بھی ان کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

اور اس کی عزت کے بعد اب اس کے بھائی کی غیرت کی دھجیاں اڑا کر وہ اس قصے کو ہمیشہ کے لیے میسر میں اس لیے عدیل کی کیفیت دیکھتے ہوئے وہ خود کو مزید انجان ظاہر کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

”تم تو دوست ہو سکندر کے اور دوستوں کے درمیان رازداری نہیں ہوتی۔ یقیناً اس لڑکی کو جانے گزشتہ ایک سال سے سکندر نے رکھ لیا رکھا ہوا ہے۔ اگر نہیں جانتے تو ہم تمہیں اس کا بار دیتے ہیں، کچھ دے دلا کر فارغ کرو اسے۔ اس کی وجہ سے سکندر کی گھریلو زندگی متاثر ہو رہی ہے۔ بچے کو زیادہ وقت نہیں دیتا۔“

”میرے خدا! لوگ اسی لیے بیٹیوں کی پیدائش پر خوش نہیں ہوتے کہ اگر جوان کی قسمت میں لکھی ہو تو جوان بھائی بے موت مرجاتے ہیں۔“

کاش سامنے بیٹھا اونچے شملے والا شخص عمر میں ان کے باپ کے برابر نہ ہوتا تو وہ اس کا خون کر دیتا۔ خود کو بھائی پر لٹکانا ان کے لیے بہت آسان ہوتا۔

”لاحول ولا۔ اپنی باتوں میں ہم تم سے جانے پانی کا پوچھنا تو بھول ہی گئے۔ اوئے غلام علی! بابا سمار، مدارت کرو۔ کراچی سے آئے ہیں اپنے سکندر کے دوست ہیں۔“ بابا جان نے اونچی آواز میں ملازم کو کہہ کر عدیل کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ ساری توانائیاں صرف کر کے بھی وہ اپنے حواس یکجا نہیں کر پا رہے۔ لگ رہا تھا جیسے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔ قالین پر جی نظریں تک ساکت تھیں البتہ ماؤف ذہن من سے کوئی مبہم سا خیال لہراتا تھا۔

کتنی دیر گزر گئی۔ ملازم اوزانات سے بھری ٹرائی ان کے سامنے رکھ کر جانے لگا تو بابا جان اسے روک کر ہوئے بولے۔

”تم مہمان کے پاس رہو غلام علی! ہم ابھی آتے ہیں۔“ بابا جان کمرے سے جانے لگے تب عدیل کے تعاقب میں دھیرے دھیرے ابھی تھیں اور ان کے جاتے ہی انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا لیا۔ وہ مروت سے آہستہ کی طرح جھجکتے تھے نہ رو سکتے تھے اور شدت ضبط سے پورا وجود انگارہ بن گیا تھا۔

”سائیں! چائے بناؤں؟“ غلام علی پوچھ رہا تھا۔ انہوں نے ہاتھ نیچے کر کر اور رنگ آنکھوں سے اسے دیکھا اور کچھ کے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے تھے کاش شاہ سکندر واقعی کسی حادثے میں مر گیا ہو تا تو وہ سن کو بہن سے لگا کر اس کے ساتھ آنسو بہ جانے اس کا سامنا کیسے کر پائیں گے۔ ایک لحظہ کو رک کر وسیع رتبے پر پھیلی پر شکوہ عمارت کو اندر سے دیکھا پھر اسپڈ سے گاڑی پکی سڑک پر اتاری تو مٹی دھول کے غبار اٹھنے لگے تھے اور اس غبار میں مریضہ نظری نہیں آئی جسے بروقت شاہ سکندر حیات نے سڑک سے نیچے اتار کر انتہائی غصے سے گاڑی کو دیکھا تو کچھ ٹھٹھک گیا تھا۔

* ☆ * ☆ *

آسیہ کو ہوش تو آگیا تھا لیکن بالکل گم صم حالت میں تھی۔ کچھ دیر کو آنکھیں کھولتی اور اپنے اطراف چروں کو دیکھ کر پھر پلکیں موندتی۔ اماں جی مسلسل آیات قرآنی کا ورد کر کے اس پر دم کر رہی تھیں۔ گھن چکر بنی ہوئی تھیں۔ ادھر بچہ دیکھتیں ”ادھر بچوں کی پکار پر دوڑتیں پھر آسیہ کے پاس۔ اور شدت کی واپسی کے منظر خلیل بھائی برآمد ہوئے ہی میں ڈرہ جمائے بیٹھے تھے۔

مغرب کی آذان ہو رہی تھی۔ اباجی مسجد چلے گئے، اماں جی نے وہیں آسیہ کے کمرے میں جا نماز، میمونہ بھابی وضو کرنے جاری تھیں کہ فون کی بیل پر خلیل کو بھانے دیکھ کر وہ بھی ان کے پیچھے چلی آئی۔ ”کون؟“ شاہ سکندر ریا رکھاں ہو تم؟“ خلیل کی آواز میں نہیں جیسے سارے جسم میں زندگی دوڑنا قریب کھڑی میمونہ نے بے اختیار ان کا بازو تھام لیا۔

”ہاں۔ یہاں سب ٹھیک ہے۔ آسیہ غالباً نماز پڑھ رہی ہے۔“ انہوں نے مصطفیٰ ”جھوٹ بولا۔“

”اور عدیل بھائی کہاں ہیں؟“ شاہ سکندر نے ایک ہی بات جاننے کے لیے فون کیا تھا۔ ”عدیل تپا نہیں۔ میں تو ابھی آفس سے آرہا ہوں، خیر تم بتاؤ کب آ رہے ہو؟“ انہوں نے ایک بار پھر مبالغے کا نام لے کر پوچھا اور اس کا جواب سننے کے بعد ادوایا کلمات کہہ کر فون بند کر دیا پھر میمونہ کو دیکھ کر بولے۔

”دھمکے کوئی بری خبر نہیں ہے۔ شاہ سکندر خیریت سے ہے۔“ میمونہ کتنی ہوئی بھاگیں پھر ایک دم رک کر پوچھنے لگیں۔

”میں آسیہ کو بتاؤں شاید اس کے ساتھ کسی نے۔“ میمونہ کتنی ہوئی بھاگیں پھر ایک دم رک کر پوچھنے لگیں۔ ”اور وہ عدیل اس کی شاہ سکندر سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

”عدیل شاہ پور گیا ہے اور سکندر اسلام آباد میں ہے اور تم ابھی آسیہ سے کچھ مت کہو جب تک وہ خود کوئی نہ کرے۔“ خلیل دھیرے جے کہتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

میمونہ بھابی نے نماز سے فارغ ہو کر رآمدے میں تخت پر دسترخوان بچھا دیا اور اباجی کے آتے ہی کھانا لگا کر اپنی اماں جی کو بھی لے آئیں۔ پھر کھانے کے دوران خلیل بھائی نے والدین کی پریشانی دور کرنے کی غرض سے بی بی ہوشی کا سبب جو انہوں نے خود سے فرض کر لیا تھا بتا کر شاہ سکندر کی خیریت کی نوید بھی سنا دی۔

”یہاں جان لیوا مذاق کون کر سکتا ہے؟“ اباجی ساری بات سن کر بولے تھے۔ ”یہ تو آسیہ ہی بتائے گی۔“ میمونہ بھابی نے کہا۔

”ہاں! لیکن اباجی اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے اسے کھلا دیا اور عدیل جو دو امیں لے کر آیا تھا ی ضرور دینا۔“ خلیل بھائی نے میمونہ کو تنبیہ ضروری سمجھی۔

”اب مجھے احمق اور غیر ذمہ دار کیوں سمجھتے ہیں؟“ میمونہ برا مان گئیں۔ ”ہو نہیں کیا؟“ خلیل کا انداز چھیڑنے والا نہیں تھا جب ہی میمونہ سے پہلے اباجی بول پڑے۔

”نہیں میمونہ! میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔ سارے گھر کو چلا رہی ہے اور بہت احسن طریقے سے۔“ ”بس رہنے دیں اباجی۔“ خلیل دسترخوان سے ہاتھ صاف کرتے اٹھنے لگے کہ اباجی انہیں روک کر پوچھنے

”تمہیں کیا شکایت ہے اس سے؟ کھانا وقت پر نہیں دیتی، تمہیں کپڑے دھلے ہوئے نہیں ملتے یا تمہارے پاکی تربیت میں کوتاہی کر رہی ہے۔“

خلیل کا جواب ہو کر رہ گئے۔ ”کی نہیں بلکہ یہ تمہارے ماں باپ کی خدمت بھی کر رہی ہے جس کے لیے تمہیں اس کا شکر گزار ہونا ہے۔“ اماں جی نے بھی ہو کی طرف داری کی تو خلیل میمونہ کو کھورتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔

نہیں یہاں سے فارغ ہو کر میمونہ بھابی آسیہ کے لیے دودھ کا گلاس لے کر اس کے کمرے میں آئیں تو اسے نہ نظر نہ ہٹا دیکھ کر دھیرے سے پکار کر بولیں۔

آسیہ اباجی طبیعت ہے تمہاری؟“ اس کی آنکھیں یکبارگی پانیوں سے بھر گئیں۔

”میں تمہیں روئے سے منع نہیں کروں گی لیکن پہلے یہ دودھ پی لو کیونکہ رونے کے لیے بھی توانائی چاہیے جو باکل نہیں ہے۔“

اس کے قریب بیٹھ کر لپٹا ہر ہلکے پھلکے انداز میں بولیں تو ان کی طرف نظروں کا رخ موڑتے ہوئے اس کی

ایک کائی کناروں سے چھلک گیا۔

”نعمو شاہ! اس میں اوولین سے زیادہ میری محبت شامل ہے اور تم جانتی ہو ناں میری محبت۔“

”کی۔“ گلاس ٹیبل پر رکھا پھر اس کے سر کے نیچے ہاتھ ڈال کر ذرا سا اونچا کر کے بٹھایا دودھ معصومیت سے

”کیا ہوا ہے مجھے؟“

”کمزوری۔ غالباً“ کمزوری کے باعث تمہیں چکر آگیا تھا۔ اودودھ پو۔“ انہوں نے فوراً ”گلاس“ اٹھا ہونٹوں سے لگا دیا۔

”میرا سر بہت بھاری ہو رہا ہے۔“ اس نے ذرا سادودھ پی کر سر بیک پر نکا دیا۔ ”یوں لگ رہا ہے جی جکڑا ہوا ہو۔ اماں جی کہاں ہیں؟“

”میں ملاتی ہوں انہیں۔ تم پہلے یہ دودھ ختم کرو۔“ میمونہ بھابھی نے زبردستی اسے دودھ پلایا پھر دوا جا کر اماں جی کو پکارا تو وہ فوراً ”آئی تھیں۔“

”آپ آسیہ کے پاس بیٹھیں اماں جی! میں بچوں کو دیکھ لوں۔“ میمونہ بھابھی کمرے سے نکل گئی جیسے ہی اس کے پاس آکر بیٹھیں اس نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا اور ہاتھ تھام کر گال سے لگائی ہوئی: ”آپ مجھے جھوڑ کر تو نہیں جائیں اماں جی!“

”میں تمہارے پاس ہوں بیٹا!“ اماں جی کو وہ بالکل چھوٹی پکی کی طرح لگی۔ جبکہ کراس کی پیٹیا دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پیچھرنے لگیں تو بہت پرسکون ہو کر اس نے پلکیں موند لیں۔ ”میں آپ کو بہت تنگ کرتی ہوں ناں؟“

”کہاں تنگ کرتی ہو۔ اللہ نے مجھے بہت نیک اور سعادت مند اولاد دی ہے۔ مجھے کبھی کسی نے کیا۔“ فرط محبت سے اماں جی کی آواز بھرائی تھی۔

”میں تو پریشان کرتی ہوں آپ کو۔“ وہ بچوں کی طرح بول رہی تھی۔

”جان بوجھ کر تو نہیں کرتیں اور اب تو کوئی پریشانی نہیں ہے۔ تم ذہن پر بوجھ مت ڈالو سوجاؤ۔“ آہستہ سے ہنسنے لگیں۔

جب میمونہ بھابھی بچوں کو ہوم ورک کروا کر سنانے کے بعد دوبارہ آسیہ کے کمرے میں آئیں تو ان پر بہت رحم آیا جو بیٹھے بیٹھے اونگھ رہی تھیں جبکہ ان کی گود میں سر رکھے آسیہ بے خبر سو رہی تھی۔ میمونہ آرام سے اس کا سر تکیے پر رکھا پھر سارا دے کر اماں جی کو اٹھاتے ہوئے دھیمی آواز میں بولیں۔

”اب یہ آرام سے سوئے گی، پلکیں آپ بھی سوجائیں۔“

”مجھے ابھی عشاء بردھنی ہے، پھر میں بیس سوؤں گی آسیہ کے پاس، یہاں ایک چارپائی ڈال دو۔“

پھر خیال آنے پر پوچھنے لگیں۔

”عدیل کچھ تار نہیں گیا۔ کہاں گیا ہے؟“

”ابھی آتا ہو گا، پوچھ لیجیے گا۔“ میمونہ بھابھی دامن بچائی، نیبل اور کرسی ہٹا کر چارپائی بچھانے بنانے لگیں۔

اماں جی نماز پڑھنے کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

میمونہ نے شوہر کو بلا کر ان کی مدد سے چارپائی رکھوائی پھر اس پر بستہ لگا کر اماں جی کے آنے تک صبر کر رہی تھیں کہ عدیل کی گاڑی کی آواز سن کر ہٹا کر باہر آئیں لیکن برآمدے میں خلیل کو کھڑا رکھ لیں۔

”خیریت؟ کہاں رک گئے تھے؟“ عدیل کے قریب آتے ہی خلیل نے ان سے پوچھا۔

”بس وہ راستے میں گاڑی خراب ہو گئی تھی۔“ عدیل بے حد مضطرب دکھائی دے رہے تھے۔

”ہے؟“

”ہاں ابھی کچھ دیر پہلے سوئی ہے۔“ میمونہ بھابھی آگے آکر بولیں۔ ”تم ہو آئے شاہ پورے،“

ہو؟۔“

”جی۔ راستہ خراب تھا۔“ عدیل بھائی بھادج کے چہروں پر اطمینان دیکھ کر اُلجھ گئے۔

”تم نے جانے میں جلدی کی۔ میرا خیال ہے ابھی تم شاہ پور پہنچے بھی نہیں ہو گئے کہ سکندر کا فون آگیا تھا۔ ہم سب کو اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا البتہ آسیہ ابھی تک پوری طرح ہوش میں نہیں آئی ہے۔ شاید بھرپور نیند کے بعد متاثر ہوئے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ خیر پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم آرام کرو۔“ خلیل بھائی نے ان کی تحن کے خیال سے بات مختصر کر دی۔

”کھانا کھاؤ گے یا چائے؟“ میمونہ بھابھی نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ عدیل منع کر کے فوراً ”اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔

”آس! آس!“

ایک پکار بھی جو اونچے برتنوں سے نکلا کر بازگشت کی صورت نیچے پاتال تک گونج رہی تھی۔ بہت خوفناک نظر تھا۔ کمری نیند میں اس کے دل کا یہ عالم تھا کہ جیسے سینہ چر کر باہر نکل آئے گا اور پھر ایک دم اس کی آنکھ کھل گئی۔

”میرے خدا!“ بے تحاشا دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر اس نے اماں جی کو دیکھا جن کے خراٹوں کی آواز خاموشی میں زبردست پیدا کر رہی تھی۔ پہلے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ ذہن خوفناک خواب کی گرفت میں تھا دراصل اس میں ابھی بھی اس کے نام کی پکار گونج رہی تھی۔ اور اتنی شدتوں سے پکارنے والا وہی ایک شخص تھا جو اس کے دل میں اس مقام پر قابض تھا جہاں اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد کوئی اور ہو سکتا تھا۔

”شاہ سکندر!“ زبان کی ذرا سی جنبش کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں پانیوں سے لبریز ہو گئیں اور یکبارگی ذہن کے مارے درپٹے ایک ساتھ وا ہو گئے تھے۔

”ہم سکندر حیات کی صرف ایک بیوی کو جانتے اور مانتے ہیں جسے سکندر پوری شان و شوکت سے بیاہ کر لایا تھا وہ ہے مہر النساء۔“

”نہیں!“ اس نے سختی سے جھٹلانے کی کوشش کی تھی کہ ذہن کہیں پیچھے ہٹک گیا۔

”مہر النساء!“ اسے یاد آیا، پہلی بار یہ نام اس نے شاہ سکندر ہی سے سنا تھا اور پھر مری میں اس کے دوست، محسن لیوی نے اسے اسی نام سے پکارا تھا۔

”اوسو! تم میرے ساتھ آجاؤ۔“ گویا وہ جانتی تھی کہ سکندر کی بیوی کا نام مہر النساء ہے اس لیے اتنے یقین سے اس نام سے پکارا تھا اور وہ کس کس کو جھٹلانے کی کوشش کرتی۔ بہت مایوس ہو کر وہ مہر النساء کے ساتھ اپنا زندہ کرنے جاری تھی کہ بابا جان کی سفاکی یاد آئی۔

”شاہ سکندر نے اگر تمہیں اپنی رکھیل بنا کر رکھا تو اس کا معاوضہ بھی دیا ہو گا۔“

”نہیں۔“ شاہ سکندر میرے ساتھ ایسا گھناؤنا کھیل نہیں کھیل سکتے۔ غلط کہتے ہیں اس کے بابا جان وہ انہیں ڈرایا ہے بلکہ سب کو۔ اور جاگیریں بھی ٹھکرا آیا ہے صرف میری خاطر۔ اور بابا جان کا اس پر بس نہیں چلا تو نیاس سے متفرق ناچا ہے ہیں اور ایسا ہو نہیں سکتا، کبھی نہیں۔“

”بڑے یقین سے بابا جان کو جھٹلا رہی تھی، لیکن جانے کیوں دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا اور آنکھوں کے نازوں سے جھٹلنے آنسو چپ تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔

”اپنا خیال رکھ کر اس لیے سوچ کر کہ میری سانسوں کی دُور تمہارے ساتھ بندھی ہے۔“ محبتوں کی شدتیں سے بٹا رہی تھیں۔

”سکندر!“ اس نے سر کے نیچے سے تکیے سمجھ کر منہ پر رکھ لیا اور سسک سسک کر رونے لگی تھی۔

اذان کی آواز پر اماں جی اٹھ کر بیٹھ گئیں اور حسب عادت مؤذن کے ساتھ ساتھ اذان کے الفاظ زیر لب

”مجھے کوئی کام نہیں ہے۔“ صورت حال سے بے خبر میمونہ بھابی محض عدیل کو چھیڑنے کی غرض سے چارپائی پر بیٹھ گئی۔
 ”عدیل ان کے بیٹھنے کا نوٹس نہ لیتے ہوئے سابقہ انداز میں آسیہ سے مخاطب ہوئے۔ ”کیا تمہیں پہلے سے معلوم تھا کہ شاہ سکندر شادی شدہ اور بچے کا باپ ہے؟“

”ہاں! میمونہ بھابی اچھل پڑیں۔
 ”نہیں۔ بخدا نہیں۔ مجھے یہ سب معلوم نہیں تھا اور یہ معلوم کرنا آپ کا کام تھا۔“ وہ ہاتھوں میں چراچھا کر پھوٹ کر رونے لگی۔ ”کی جی اس کا نام نوٹ کیا تھا۔
 عدیل بھابی کے ہاتھوں کی گرفت اس کے کندھوں پر کمزور پڑنے لگی اور پھر ایک دم انہوں نے اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر سینے میں چھپایا۔

”رو! نہیں میری بہن! تمہاری قسم تمہارے ایک ایک آنسو کا حساب لوں گا۔“
 میمونہ بھابی شدید کھڑی تھیں۔
 ”اماں! بھابی! آسیہ کے رونے کی آواز سن کر خلیل کو پکارتے ہوئے آئے تھے۔
 ”کیا ہوا ہے؟“ خلیل نیند میں سے اٹھ کر آئے تھے۔ ایک ایک کی شکل دیکھنے لگے پھر گرم صم کھڑی بیوی کا کندھا ہلا کر وہ چونکنے کے ساتھ ہی عدیل پر بگڑنے لگیں۔

”عدیل! تم نے صبح صبح کو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ چلو اٹھو یہاں سے۔“
 ”ہاں! عدیل کے ہونٹوں سے گہری سانس خارج ہوئی پھر آسیہ کو چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”خلیل بھائی! کیا تم آپ بھی آئے۔“
 عدیل کی بات سن کر اماں جی بھی روتی ہوئی بیٹی کو چھوڑ کر ان تینوں کے ساتھ کمرے سے نکل گئی تھیں۔

* ☆ * ☆ *

شاہ سکندر کی تمام رات سوتے جاگتے گزری تھی گو کہ کل خلیل بھابی کی باتوں سے کہیں بھی ظاہر نہیں ہوا تھا کہ عدیل شاہ پور آئے ہیں اور تیز رفتاری کے باعث خود اس نے بھی انہیں نہیں دیکھا تھا۔ لیکن ان کی گاڑی وہ پہچانتا تھا اور اس وقت سے اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ کئی بار جھٹلانے کی کوشش کی کہ اسے دھوکا ہوا ہے۔ عدیل بال کیوں آئیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں شاہ پور چھوڑ چکا ہوں اور ابھی بھی میری یہاں موجودگی کا کسی کو پتا نہیں! بل تک کہ آسیہ بھی نہیں جانتی پھر ان کا یہاں آنا؟
 ”نہیں۔ وہ عدیل بھابی نہیں ہو سکتے۔“ وہ بار بار جھٹلاتا اور ہر بار دھول اڑاتی گاڑی اس کی نظروں کے سامنے آجاتی تھی۔

پھر صبح ناشتے کے بعد اس نے اچانک واپسی کا سوچ لیا۔ کہیں کوئی گڑبڑ ہوئی تھی یا ہونے والی تھی جو اس کی فحش الارام بجانے لگی تھی۔ وہ بہت غلجٹ میں تیار ہو کر سب سے پہلے بابا جان کو اپنے جانے کا بتانے کی نیت سے ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ شاہ جہانگیر سے کہہ رہے تھے۔
 ”جس کام سے تمہیں کراچی جانا تھا وہ یہیں ہو گیا۔ اب تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“
 ”اسلام علیکم بابا جان!“ اس نے سلام کیا تو شاہ جہانگیر کچھ بوکھلا کر اٹھ کھڑے ہوئے جبکہ بابا جان نے چونک کر ”تو تو ابھی میرے بل مسکر کر ہوئے۔“

”اس نے میرے ہی ہم تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔ آؤ یہاں ہمارے پاس بیٹھو۔“
 ”ابنئے بیٹے ہوئے یونہی شاہ جہانگیر کو دیکھا تھا۔
 ”یو آفس فارم سے؟“ بابا جان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

وہ رات لگیں۔ آخر میں قدرے اونچی آواز میں کلمہ پڑھ کر دونوں ہاتھ منہ پر پھیرے، پھر چارپائی سے اتر آسیہ کو دیکھا تو زیرو پاور کی مدد ہم روشنی میں وہ انہیں سوئی ہوئی نظر آئی۔ اس کی خرابی طبع کے باعث اسے نماز کے لیے نہیں اٹھایا بلکہ جلنے میں بھی احتیاط کی کہ کہیں اس کی آنکھ نہ کھل جائے۔ کمرے پر آمد سے آئیں تو عدیل کو غصیلے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔
 ”تم اتنی جلدی اٹھ گئے؟“

عدیل چونک کر رے بھر بڑھ کر لاسٹ آن کر دی۔
 ”رات کہاں چلے گئے تھے؟“ اماں جی نے پوچھا۔
 ”آسیہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ وہ ان کا سوال نظر انداز کر گئے۔
 ”بہتر ہے۔ رات بھر آرام سے سوئی رہی۔“

”چلیں۔ آپ نماز پڑھ لیں، میں ذرا آسیہ کو دیکھ لوں۔“ عدیل کہتے ہوئے آسیہ کے کمرے میں آئے۔
 میں انہیں بھی وہ سوئی ہوئی لگی لیکن جب قریب گئے تو سسکنے کے باعث اس کا وجود جھٹکنے لگا ہوا تھا۔
 عدیل کے دل پر ایک اور قیامت بیت گئی۔ ان کی نازوں بلی بہن کی زندگی میں یہ کونسا مقام آگیا تھا۔
 ”آسیہ! دھیرے سے پکارتے ہوئے انہوں نے اس کے منہ پر سے تکیہ کھینچ لیا تو بے حد پریشان ہوا ہاتھ چہرے پر رکھنا چاہتی تھی کہ وہ فوراً اس کی کلاٹیاں تھام کر لوٹے۔
 ”رونا اور منہ چھپانا اس وقت جب ہم میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہ رہے۔“

”عدیل بھائی! وہ تپ کر اٹھ بیٹھی۔“ اللہ کرے میری زندگی بھی آپ کو لگ جائے۔“
 ”سب کو اپنی زندگی آپ جینا ہے۔ سمجھ رہی ہوں؟“ عدیل کالجہ اچانک گہمیر ہو گیا تھا۔
 وہ چونک کر دیکھنے لگی۔ ان کی بڑی بڑی ذہین آنکھیں سرخ انگارہ بنی ہوئی تھیں۔ گھنے بال بے زہر پیشانی پر جھول رہے تھے اور چہرے پر کسی قیامت کے گزرنے کے واضح اثرات تھے۔
 ”کیا ہوا ہے عدیل بھائی آپ کو؟“ وہ اپنا دکھ بھول گئی۔

عدیل بھائی نظریں چرا گئے۔
 ”بتائیے ناں عدیل بھائی! آپ کو میری قسم۔“ اور وہ جن کی تمام شب خود کو سنبھالنے اور یہ یاد رکھنا پڑا تھا کہ انہیں جوش کے بجائے ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے کیونکہ یہ ان کی بہن کا حال اس وقت بھی وہ ضبط کرتے کرتے اچانک ٹوٹ گئے تھے۔
 ”ہماری عزت و غیرت کوئی کھلونا نہیں ہے آسیہ! جسے کوئی امیر زادہ اپنی دل بستی کے لیے خرید سکے یہاں سوالیہ بین کر آیا تھا۔ جانتی ہوں ناں پھر اس کے باپ نے تمہیں اور ہم سب کو گالی کیوں دی؟“

آسیہ کا پورا وجود سن ہو گیا تھا۔
 ”میں اگر اسے زندہ چھوڑ کر واپس آیا ہوں تو صرف یہ جاننے کے لیے کہ کہیں تم نے قصداً ”نوز“ کھایا۔ شاہ سکندر کی شان و شوکت سے مرعوب ہو کر۔ مجھے بتاؤ آسیہ! ورنہ میں خود کو کوئی مار لوں گا۔“
 ”اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔“

”خدا کے لیے عدیل بھائی!“ وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر سسک پڑی۔ ”مجھے گولی مار دیں لیکن کوئی الزام نہ لگائیں۔“
 ”کیا ہوا ہے؟“ سچن میں جاتے ہوئے آواز سن کر میمونہ بھابی اس طرف آئی تھیں۔ آسیہ کو پریشان ہو گئیں۔
 ”کچھ نہیں! آپ جائیں اپنا کام کریں۔“ عدیل بھائی کو ان کی مداخلت سخت ناگوار گزری۔

”جی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بلکہ وہ پرانی بات بھی نہیں تھی۔ ایک دم اجازت دیران لگتا ہے آپ! اراضی سے دلچسپی نہیں رہی؟“ اس نے اپنے تئیں بابا جان کو احساس دلانا چاہا کہ عدم توجہی کے باوجود زمین ناکارہ ہو رہی ہے۔

”وہ زمین تمہاری ہے سکندر! اور تم ہی اسے آباد کرو گے۔“ بابا جان نے کہا اور پھر فوراً ”موضوع بدلا اچانک یاد آنے کا تاثر دیتے ہوئے بولے تھے ”اور ہاں کل تمہارا کوئی دوست آیا تھا۔“

”کون؟“ وہ پوری جان سے متوجہ ہو گیا۔

”وہ کیا بھلا سا نام بتایا تھا اس نے۔“ بابا جان ذہن پر زور ڈالنے لگے۔

”عدیل۔“ وہ اتنا صبر نہیں کر سکا۔

”ہاں شاید یہی نام تھا۔ ہم نے اسے رکنے پر مست اصرار کیا کہ ایک دو روز میں تم آجاؤ گے لیکن جلدی تھی۔ پتا نہیں کس کام سے آیا تھا۔ وہ بھی نہیں بتایا۔“

بابا جان اپنی کئے جا رہے تھے جبکہ وہ عدیل بھائی کی آمد کی تصدیق ہونے پر بے حد پریشان ہو کر شاہ دیکھنے لگا تھا۔

”کیا کیا کہہ رہا تھا؟“ شاہ جہانگیر نے اس سے نظر سچا کر بابا جان سے پوچھا۔

”ہم سے تو کوئی خاص بات نہیں کی اس نے۔ بس سکندر کا پوچھ کر چلا گیا۔“ بابا جان اب بہت سر میں بول رہے تھے۔

”میرے بارے میں آپ نے کیا بتایا؟“

”یہی کہ تم فارم پر گئے ہوئے ہو۔ ایک دو روز میں آجاؤ گے۔ اگر ہمیں معلوم ہو ماکہ تم اسی وقت آہو تو ہم اسے ہرگز نہ جانے دیتے۔“ بابا جان بڑے آرام سے اس کے اندیشوں کو ہوا دے رہے تھے۔ وہ سخت مضطرب سا اٹھ کھڑا ہوا اور شاہ جہانگیر کو چلنے کا اشارہ کرتا ہوا بابا جان کے کمرے سے نکل آیا۔ شاہ جہانگیر کافی دیر بعد اس کے پاس آئے تھے۔ اس وقت تک اس کے اعصاب شل ہو چکے تھے پھر دیکھ کر وہ چیخ مڑا۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے جہانگیر بھائی؟“

”دیرین سے۔ دیرین سے۔“ شاہ جہانگیر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بٹھاتے ہوئے بولے۔

”یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟“

”یہ تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”شاید انہیں تمہارے بارے میں انکو اڑی کرنے کا خیال اب آیا ہو۔“ شاہ جہانگیر نے پرسوج انداز میں کہا۔

”کیا مطلب؟ کیسی انکو اڑی؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”کہ تم واقعی شاہ پور کے زمیندار ہو یا۔“

”نہیں۔“ اس نے شاہ جہانگیر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی مسترد کر دی۔ ”انہوں نے اپنی ہر میری یہاں کی حیثیت کو سوچ کر نہیں کی تھی جو اب انکو اڑی کرنے آئیں گے۔“

”پھر اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟“

”میں آئیہ سے معلوم کرتا ہوں۔“ وہ ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا اور جلدی جلدی نمبر ڈائل کرنے لگا۔ شاہ جہانگیر خود کو کئی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرنے میں لگ گئے جبکہ ان کی

تھے۔

”کون میمونہ بھائی! السلام علیکم!“

”پلیز زرا آئیہ کو۔“

”سوری، رنگ نمبر“ کھٹناک سے فون بند ہو گیا تھا۔

شاہ سکندر کتنی دیر بے یقینی کی حالت میں کھڑا رہا پھر ریسور رکھ کر شاہ جہانگیر کی طرف پلٹا تو انتہائی دکھ اور غصے بولا۔

”اب میرے بھائی نہیں ہو سکتے۔“ اس کے ساتھ ہی سیڑھیاں پھلا لگتا اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔

دند بھائی کا فون بند کر دینا اسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا کہ سبب صرف اس کا شاہ پور آنا نہیں ہو سکتا بلکہ یقیناً ”بابا“ نے عدیل بھائی سے اور بھی بہت کچھ کہا ہوگا، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عدیل بھائی یہاں کس سلسلے آئے تھے کیا انہیں اس پر کوئی شبہ ہوا تھا یا کوئی اور بات۔ اور بات کوئی بھی ہو، اس کے لیے اب صورت کو نبھانا مشکل ہو گیا تھا۔

یہ کہ بارے میں سوچنے لگا کہ اس کے پہلے سے شادی شدہ ہونے کا سن کر اس پر کیا بیت رہی ہوگی۔ وہ جو اس نے آپ سے بڑھ کر اعتبار کرتی تھی، کس بری طرح ٹوٹی ہوگی۔ اور جانے اب وہ دوبارہ اس کا اعتبار حاصل کرے گی یا نہیں۔ معاہدے بابا جان کی بات یاد آئی، خود ابھی کچھ دیر پہلے شاہ جہانگیر سے کہہ رہے تھے۔

”نہیں جس کام سے کراچی جانا تھا وہ نہیں ہو گیا اب تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

اس کا مطلب ہے بابا جان اور جہانگیر بھائی نے پوری حکمت عملی سے میرے لیے جال بنا ہے اور میں ایک بار۔۔۔ وہ بری طرح چٹرا گیا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

بندرے میں جانے کیا باتیں ہوئی تھیں کہ ناشتے کے بعد اب کھانے کی بھی کسی کو پروا نہیں تھی۔ میمونہ کی ایک ایک کمرے میں جھانکتی پھر رہی تھیں۔

رہنہ کر لیتے بڑے تھے۔

مٹی تنجے کے دانے گن رہی تھیں۔

وہ جسے جو گھنٹوں کے گرد بازو پیٹے بیٹھی تھی تو اب تک اسی حالت میں تھی۔ ذہن میں شاہ سکندر کے سنگ ارا ایک ایک پل اپنی تمام تر جزئیات سمیت ایک تسلسل سے ابھر ابھر کر مٹ رہا تھا اور وہ کہیں گرفت نہیں رہی تھی۔ اس لیے کہ وہ خود سے نہیں سوچ رہی تھی، بس اپنے آپ فلم سی چلنے لگی تھی جس کا دورانیہ بہت لمبا بھی نہیں تھا۔ اس کی زندگی کا ایک سال جو اس کی زندگی ہی بدل گیا تھا۔ اپنی محبتیں، اتنی چاہتیں جن میں ہر کیس کھوت نہیں تھی اور وہ گمان بھی نہیں کر سکتی تھی کہ جن محبتوں پر وہ صرف اور صرف اپنا حق سمجھتی ہے شاہ سکندر پہلے ہی کسی کو زان کر آیا ہے۔ اس کے بعد بھی اتنا زعم۔

میں تمہارے دل میں اس مقام پر فائز ہو چکا ہوں، جہاں مجھ سے پہلے کوئی تھا نہ میرے بعد کوئی ہو سکتا ہے۔ یہ وقت اپنی جگہ مسلم تھی لیکن اس کے دل اور زندگی سے کھیلنے کا حق اسے کس نے دیا تھا۔ وہ اتنی نادان اتنی۔۔۔

نفس تو کبھی نہیں تھی پھر اتنی آسانی سے اس کے جال میں کسے پھنس گئی۔

”اسے! میمونہ بھائی! دیر سے اس کا کندھا ہلکا کر بولیں“ سارے گھر میں ایسی خاموشی چھائی ہے کہ اب غدار لگتا ہے خدا کے لیے تم ہی کچھ بولو۔“

نفسوں پر سے ٹھوڑی اٹھا کر خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”میں نے تم کو دیکھو۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ میمونہ بھائی! اس کے سامنے ٹھٹھے ہوئے بولیں“ کچھ بولو اور یہی شاہ سکندر کو گالیاں ہی دو۔ کم از کم تمہارا جہود تو تو نے اور یہ بہت ضروری ہے ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔“

”کیا تمہیں ذرا سی سمٹی نہیں جیسے کہہ رہی ہو اور کیا نقصان۔۔۔“

”دیکھو۔ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ صبح اماں جی کے کمرے میں ان سب کے درمیان کیا طے پایا ہے۔ خلیل

آفس جاتے جاتے مجھے صرف اتنا بتا گئے ہیں کہ شام کی فلائٹ سے ٹکیل بھائی اسلام آباد سے آ رہے ہیں۔ مطلب ہے، انہیں اباجی نے فوری بلوایا ہو گا اور میں چاہتی ہوں ان کے آنے سے پہلے پہلے تم اپنے آپ کو لوٹا کہ تمہارے اور شاہ سکندر کے بارے میں جو بھی باتیں ہوں۔ تم ان میں شریک ہو سکو۔ میری بات سمجھو۔ ”میمونہ بھابی نے بہت سنجیدگی سے اسے آنے والی صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ ”اب کیا باتیں ہوں گی۔“ اس کے لہجے میں دکھ اور تاسف تھا۔

”شاہ سکندر کے شادی شدہ ہونے کا سن کر اس سے تمہارا ناتا ٹوٹ تو نہیں گیا میری جان! ابھی تو تم امتحان اور بھی ہیں۔“

”میری عزت نفس داؤ پر لگی ہے بھابی! میں سر اٹھا کر بات نہیں کر سکتی۔“ وہ رو پڑی۔

”اور آپ چاہتی ہیں میں بھائیوں کے درمیان بیٹھ کر اس شخص کی حمایت کروں جس نے انہیں یہ گالی دی اگر وہ سامنے ہوتا تو خون خرابائی تھی۔“

”کیا اس نے خود۔۔۔ میرا مطلب ہے کیا کہا ہے اس نے؟“ ”میمونہ بھابی نے پوری توجہ سے اسے دیکھا۔

”پہلے یہ بتائیں عدیل بھائی کو سکندر کے شادی شدہ ہونے کا کیسے پتا چلا؟“ وہ ہتھیاروں سے آنکھیں

سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”عدیل کل شاہ پور گیا تھا۔ اصل میں تمہاری بے ہوشی سے ہم یہی سمجھے کہ خدا نخواستہ شاہ سکندر کوئی حادثہ وغیرہ ہو گیا ہے اس لیے عدیل فوراً اس کی خبر لینے روانہ ہو گیا تھا اور شاید وہیں سے معلوم ہوا یہ سب کچھ عجیب سا نہیں لگ رہا بلکہ مجھے تو یقین بھی نہیں آ رہا۔“ ”میمونہ بھابی نے اس کی بات کا جواب کے ساتھ کہا۔

”میں بھی خود کو فریب دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ شاید سکندر کے بابا جان نے مجھے اس سے متفرک لیے ایسی باتیں کیں لیکن۔۔۔“

”تمہاری اس کہے بابا جان سے کہاں بات ہوئی؟“ ”میمونہ بھابی درمیان میں بول پڑیں۔

”میں نے شاہ پور فون کیا تھا بی بی جان سے بات کرنے کے لیے۔“ اس نے اپنے فون کرنے کا بتا کر بابا جان ہونے والی گفتگو بھی کہہ سنائی تو میمونہ بھابی بھی چکر اگئی تھیں۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔ اور مجھے لگتا ہے عدیل سے بھی انہوں نے ایسی ہی باتیں کی ہوں گی جب ہی تو وہ اتنا ہو رہا ہے پتا ہے رات جب وہ آیا تھا تو میں اسے دیکھ کر رڑ گئی تھی۔“ ”عجب وحشی سا لگ رہا تھا۔“

”میمونہ بھابی تاسف کے اظہار کے ساتھ بولیں تو وہ سہم کر پھر رونے لگی۔

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے بھابی! میری وجہ سے میرے بھائی خدا نخواستہ اگر کسی کو کچھ ہو گیا تو میں کب معاف نہیں کروں گی بلکہ میں نہیں چھوڑ سکوں گا کہ مر جاؤں گی۔“ وہ روتی ہوئی بے ربط بول رہی تھی۔

”میمونہ بھابی ایک دم پریشان ہو گئیں۔“ ”بشکل اسے چپ کرایا پھر زبردستی اٹھا کر واش روم میں لے گئیں۔ منہ ہاتھ دھو کر اپنی آئی تو اس کے لیے کھانا لے آئیں اور خاصے رعب سے کہنے لگیں۔

”دیکھو، کھانے سے انکار مت کرنا۔ مجھے پتا ہے اس وقت تمہاری کیا حالت ہو رہی ہو گی۔ ان فونوں بھوک زیادہ لگتی ہے۔ چلو کھاؤ شاباش۔ میں جب تک چائے لے کر آتی ہوں۔“ اس نے خاموشی سے

جاتے ہوئے دیکھا پھر بڑے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”شام تک گھر میں ایسی ہی خاموشی اور کشیدگی تھی۔ جانے کیوں اماں جی اور اباجی بھی اس کے کمرے ٹ

آئے تھے اور وہ خود بھی ان کا سامنا کرنے سے گھبرا رہی تھی گو کہ اس سارے قصے میں اس کا کوئی قصور نہ

وہ مجرم ہی بنی ہوئی تھی۔ شاید اس کا جرم محبت تھا جس نے اسے رسوا کر کے اس کی ہستی کا غور جھین لیا تھا۔ وقت کی بات ہے، کبھی اسی محبت نے اسے اتنا اعتماد بخشا تھا کہ وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھنے لگی جس کی اب تک کی زندگی میں کہیں کسی دکھ، کسی محرومی کی پرچھائیں تک نہیں بھی پھرا جائے کسی کی

ٹی بھی کہ وہ اندر ہی اندر نوٹی جا رہی تھی اور کوئی سارا دینے والا نہیں تھا۔

قلیل بھائی کی آمد پر خاموشی میں قدرے پلچ بچ گئی۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہوتے ہی میمونہ بھابی نے کھانا

ایک دم کھا جاتی تھیں کہ جہاں اس واقعے کو چھیڑا گیا، کھانا رہ جائے گا۔ اس لیے کھانے کے دوران بھی وہ ٹکیل

اسے سہا بھابی کی خیریت اور ان کی دیگر مصروفیات کے بارے میں پوچھ کر ایک طرح سے سب کا دھیان

ارہیں۔ آخر میں کہنے لگیں۔

”میں اور بچوں کو بھی لے آتے تو کچھ رونق ہو جاتی۔“

”باقاعدہ پروگرام کے تحت آتا تب اسے لے کر آتا“ ٹکیل بھائی کہنے لگے۔ ”وہ تو صبح اباجی نے فون کر کے بس

”آئے گا کہہ کر مجھے پریشان کر دیا۔ اباجی ایسی کیا بات تھی۔ اس طرح کیوں بلایا مجھے؟“

”بس وہ تم سے کچھ مشورہ کرنا تھا۔ خیر پہلے تم کھانا کھاؤ۔ آرام سے پھر بات کریں گے۔“ اباجی اس وقت سے

طرح کر رہے تھے۔

”بھائی نے باری باری سب کو دیکھا۔ کسی کے چہرے پر وہ پہلے جیسا اطمینان نظر نہیں آتا۔ اور ٹھنک تو وہ اسی

کھاتے تھے جب اباجی نے فون پر انہیں فوراً ”آئے کو کھانا اور کچھ بتایا بھی نہیں تھا۔ وہ اگر کبھی بھی وقت فارغ

تو کچھ نہ کچھ ضرور قیاس کرتے لیکن سارا دن آفس میں اس قدر مصروفیت رہی کہ اس طرف دھیان ہی

آتا تھا، ہر حال اب ان سے مزید صبر نہیں ہو سکا۔ دسترخوان سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے۔

”کیا بات ہے کیا مشورہ کرنا ہے اباجی! اب پتا بھی دیتے ہیں۔“

”نے غلط اور عدیل کے بعد اماں جی کو دیکھا تو وہ ایک دم رو پڑیں۔

”بنا! ہم نے آج ہی شادی میں بڑا دھوکا کھایا۔ وہ سکندر پہلے سے بال بچوں والا ہے۔“

”جی نے بہت واضح انکشاف کیا تھا پھر بھی ٹکیل بھائی یوں دیکھ رہے تھے جیسے کچھ نہ پائے ہوں۔ کتنی دیر بعد

بولے۔

”پھر میرا مطلب ہے، کیسے معلوم ہوا آپ کو؟“

”لیکن باتیں چھپی نہیں رہتیں کبھی نہ کبھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔“ اباجی بہت مضبوط سے گویا ہوئے۔

”وہ ٹھنک ہے لیکن شاہ سکندر کیا کہتا ہے؟ کیا جواز بتاتا ہے اپنی دوسری شادی کا؟ پگلی بیوی مر چکی ہے یا اس

اتنے جلد کے قابل نہیں۔“

”خوار کوئی بھی ہو، ٹکیل بھائی! ہمارے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔“ عدیل کے اندر پکٹا لاوا پھٹنے لگا تھا کہ ابا

”بائیں لوگ یا۔“

”مخاموش رہو عدیل! جذباتیت کا مظاہرہ ہمارے اپنے حق میں بہتر نہیں ہو گا“ اس لیے کہ ہم بیٹی والے

”میں ہماری عزت ناموس گروی نہیں رکھی۔“ عدیل دبے لہجے میں چیخ پڑے۔

”بڑا ٹھنک کر رہا ہے۔“ ٹکیل بھائی ان کی تائید کرتے ہوئے بولے۔ ”بیٹی والے ہونے کا یہ مطلب نہیں

”سب سے بہتر عزت و قیمت کو گہری نیند سلا کر کھ پکلی بن کر رہ جائیں۔ آپ ٹکیل بھائی کو صاف صاف بتائیں کہ

”میں نے سنا ہے۔“

”میں نے سنا ہے جارا ہوں۔ تم مجھے بات تو کرنے دو۔“

”اسے ناہنہ نہ کرنا کہ وہ ٹکیل کو دیکھا پھر قدرے رک کر ساری بات کہہ سنائی جس کے بعد طویل خاموشی تھی۔“

اماں جی چپکے چپکے اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔
 میمونہ بھابی بیٹیوں بھائیوں کے چہرے دیکھ کر اندر ہی اندر سہمی جا رہی تھیں۔
 اور اباجی کی بوڑھی آنکھوں میں التجا تھی۔ (کوئی ایسا صلہ سوچو کہ تمہاری غیرت کے ساتھ میری بیٹی کا سلامت رہے۔)

”آسیہ کہاں ہے؟“ کتنی دیر بعد ٹھیل بھائی کی سوچوں میں ڈوبی آواز نے خاموشی کا سینہ چاک کیا۔
 ”اپنے کمرے میں۔“ میمونہ بھابی کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ بمشکل سنائی دی۔
 ”آئیے میرے ساتھ۔“ ٹھیل بھائی کسی ایک کو مخاطب کیے بغیر کہتے ہوئے اٹھ کر آسیہ کے کمرے کی چل پڑے تو ان کے پیچھے غلیل اور عدیل نے فوراً تقلید کی جب کہ اباجی، میمونہ بھابی اور اماں جی کو بیڑا اشارہ کرتے ہوئے اٹھ آئے تھے۔

”آسیہ!“ ٹھیل بھائی نے دروازے میں رک کر گم صم بیٹھی آسیہ کو پکارا تو وہ کوشش کے باوجود اپنی باڑا اٹھ نہیں سکی۔
 ”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے بیٹا! خدا نخواستہ کوئی۔“ ٹھیل بھائی نے آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو آنکھوں کے پانی نے لہریز ہو گئے جس پر وہ فوراً ”نو کہتے ہوئے بولے۔“
 ”خبردارو نا تمہیں؟ تم بہت ہمار لڑکی ہو اور مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو۔ کیا تم شاہ سکندر کے ساتھ گالی بن کر رہ سکتی ہو؟“ ان کی زبان رکھیں کہنے سے قاصر تھی۔
 آسیہ کے لہریز پانی نے پھلک گئے۔

”مگر از کم ہم بھابیوں کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی آسیہ! اثبات میں سر ہلانے سے پہلے ہم سب کوڑھ دیتا۔“ عدیل کسی طرح خود پر قابو نہیں رکھ پارہے تھے۔
 ”نہیں۔“ وہ ٹھیل بھائی کے بازو سے پیشانی ٹکا کر سسک پڑی
 ”خدا کی قسم نہیں۔ میں زندہ رہوں گی تو اپنے ازل و قار کے ساتھ۔“
 ”یہی تمہارا حق ہے بیٹا۔“ ٹھیل بھائی نے بیٹھ کر اس کا سراپے سینے سے لگایا پھر اباجی کو بیٹھنے کا اشارہ ہوئے کہنے لگے۔

”اباجی! گو کہ شاہ سکندر نے ہمیں دھوکا دیا ہے پھر بھی اگر وہ آسیہ کے ساتھ فہو ہے تو اس کے کھوپڑیاں لٹکا جاسکتے ہیں لیکن اس کے لیے ہماری شرط یہ ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کو لے کر آئے۔“
 ”ہاں جب تک شاہ حیات محمد خود آکر آسیہ کو اپنی بہو تسلیم کر کے لے جانے کی بات نہیں کریں گے یہاں سے نہیں جائے گی۔“ غلیل بھائی نے بھی فوراً ”تائید کر کے فیصلہ سنایا۔“
 اور عدیل کے اندر جلتے لالہ پر جیسے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے پڑنے لگے تھے۔ اباجی نے پر سوچ انداز میں ہارڈی تینوں بیٹوں کو دیکھا پھر اسی انداز میں اثبات میں سر ہلایا تب ٹھیل بھائی آسیہ کو خود سے الگ کرتے ہوئے لگے۔

”بیٹا! تم بڑھی لکھی سمجھدار لڑکی ہو۔ تمہیں حوصلے سے کام لینا چاہیے۔ رونے دھونے سے مسئلہ حل ہوتے۔ شکر کرو ابھی حقیقت سامنے آگئی ہے، بہر حال مجھے یقین ہے شاہ سکندر آج کل میں ضرور تمہے کرے گا اور تمہیں اس کے سامنے کمزور نہیں پڑنا۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟“
 اس نے دھیر سے سر جھکا لیا تھا۔



”بی بی جان! میں کچھ دنوں کے لیے کراچی جانا چاہتا ہوں۔“ شاہ سکندر نے بہت سوچ کر ”کچھ دنوں کے

تھانہ کو تک۔ اب حالات اسے سب کشتیاں چلانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔
 ”کیوں؟“ بی بی جان کے نروٹھے انداز پر وہ چیخ کر بولا۔
 ”بپ جانتی تو ہیں وہاں میرا گھر ہے بیوی ہے۔“
 ”جانتی ہوں لیکن باجی نہیں ہوں۔ باجی میں صرف مہر النساء کو ہوں اور بار بار اسے چھوڑ کر جانا تمہارے حق ٹھیک نہیں ہے۔“

”مجھے تو اب کچھ بھی ٹھیک نہیں لگ رہا، یہاں وہاں دونوں طرف لگتا ہے زندگی میرے لیے تنگ ہو گئی۔ بے اور نے کبھی اپنی ٹھن برباشت نہیں کی۔ آپ جانتی ہیں پھر آپ سب ایسے حالات پیدا کر کے میری موت کا نیکوں کر رہے ہیں؟ کیا واقعی میری زندگی سے کسی کو کوئی دلچسپی نہیں اگر ایسی بات ہے تو میں خود اپنے آپ کو لیتا ہوں۔“

”بکیرہ خاطر ہو کر اتنے ٹھوس لہجے میں بولا کہ بی بی جان ایک دم خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔
 میں چاہتا تو آپ کو بتائے بغیر بھی جاسکتا تھا لیکن میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ آپ بے شک آسیہ کو اپنے کریں لیکن مجھے اس کے پاس جانے سے روکیں بھی نہیں۔ مجھے اس کے وجود سے زندگی کا احساس ملتا۔ اتنے دن اس کے بغیر میں پتہ نہیں کیسے رہا ہوں۔ مجھے جانے دیں۔“ وہ روٹھے اور ضدی لہجے میں بول رہا تھا۔
 ”بی بی جان سے پوچھ لیا ہے؟“ بی بی جان کو اس پر رحم آیا بھی تو ظاہر نہیں ہونے دیا۔
 ”میں آپ بتا دیتے گا۔“

اور تو کے کب؟“ بی بی جان نے اسے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔
 ”آج ہوں گا۔“ اس نے ڈپلومیسی اختیار کی۔ ”میں اسے چھوڑ سکتا ہوں نہ آپ کو، اور آپ کی خاطر میں ماء کے حقوق بھی تسلیم کر رہا ہوں۔ اس کے باوجود کہ آپ نے میرے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا۔ ماں ہو کر میں۔ بہر حال مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ میں آپ کی تجبوری سمجھتا ہوں، یہاں سیاہ و سفید کی مالک ہو کر باجان کے سامنے بالکل بے اختیار ہیں آپ؟“
 ”ہاں کچھ نہیں بولیں خاموشی سے دیکھتی رہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔ میرے لیے دعا کیجئے گا۔“ وہ ان کی طرف جھک کر بولا اور جب تک بی بی جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ کھڑا نہیں ہوا تھا۔ پھر جلد آنے کا کہہ کر ان کے کمرے سے نکلا تو اس کے قدموں میں تیزی مل رہی تھی۔ ان کے اختتام پر اچانک مہر النساء نے سامنے آکر اس کا راستہ روک لیا تو وہ کسی طرح اپنی ناگواری میں سکا۔
 ”یاد ہے؟“

”تی تیزی میں کہاں جا رہے ہیں؟“ تنفر سے بھری مہر النساء نے اس سے زیادہ ناگواری کا اظہار پیشانی پر بے نیس ڈال کر کیا۔
 ”میں اس سے کیا میں کہیں بھی جاؤں۔“ وہ دانت پیس کر بولا۔
 ”بی بی جان! آپ کی پونچھنے کا حق رکھتی ہوں۔ کہاں سے آرہے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں اور۔۔۔“
 ”آسیہ! تم لکھا کر چنا۔“ ”ہو سامنے سے۔“

”اس کا راستہ سے ہٹا میں گے شاہ! میں تو ہر راستے پر ملوں گی۔ بتاؤ نا اس حرامزادی کو بھی۔ مہر النساء کوئی عورت نہیں ہے۔“ زہر خند سے بولی۔
 ”وہ انتہائی طیش میں آکر اس پر جھپٹنا چاہتا تھا لیکن وہ پھرتی سے پیچھے ہٹ گئی اور اسے دیکھ کر ”بیٹا! پانچ ہو گئی ہو؟“ وہ نفرت سے کہہ کر بہت تیزی سے باہر نکلا تھا۔

جب اس نے اپنے لپارٹمنٹ میں قدم رکھا اس وقت شام گہری ہو رہی تھی۔ تمام لائینیں آن کر کے لیے ساری کھڑکیاں کھول کر اس نے پردے سمیٹ دیے۔ اتنے دن بند رہنے کے باعث کمروں میں محض کچھ ناگوار سی محک میں سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ بالکونی میں نکل کر ٹھنکنے لگا۔ ساتھ ساتھ گہری گند تھا جب اس کے خیال میں آسیہ نماز سے فارغ ہو چکی ہوگی تب اندر آکر اس کے نمبر ڈائل کرتے ہوئے اندر بہت خائف ہو رہا تھا۔

دوسری طرف بیل جا رہی تھی اور اس سے پہلے کہ کوئی ریسپونڈ اٹھا تا اس نے فون رکھ دیا۔ شاید راگن جو حوصلہ نہیں تھا۔ کئی دیر خود کو سمجھانے کے بعد دوبارہ نمبر ڈائل کیے تو دھڑلے سے جواب ملا۔

”اس نے مجھ کو انداز میں سلام کیا تھا۔“
”وعلیکم“ جواب مختصر سی اس کے لیے یہی بہت تھا کہ فون بند نہیں ہوا تھا۔



”کیسی ہیں آپ؟“ شاہ سکندر نے بہت چاہا کہ اپنے اسی پرلے انداز میں بات کر سکے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سنو کہاں ہوتے ہو آج کل؟“ میمونہ بھابی کا مقصد اس وقت کچھ جانا تھا بلکہ وہ اپنے مخصوص انداز میں اور اپنی دھن میں بول رہی تھیں۔
”میں ہوں۔ آپ کے ٹھہرے میں، میرا مطلب ہے بس ابھی پہنچا ہوں۔“ آسیہ کہاں ہے؟ میمونہ؟ اچھے موڈ سے حوصلہ پا کر اس نے فوراً آسیہ کا پوچھا۔

”آسیہ۔ اپنے کمرے میں ہے۔ بلاؤں؟“
”جی، بڑی مہربانی ہوگی“ وہ بے تابی سے بولا اور پھر اسی بے تابی سے انتظار کرنے لگا۔ گھڑی کی گھم کے ساتھ اس کی دھڑکنیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں۔ جانے کتنے بیل۔ بیت گئے۔ وہ اس کی آواز چاہتا تھا لیکن اس کے برعکس دوبارہ میمونہ بھابی کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو۔ شاہ سکندر!“
”جی!“ وہ کھڑا ہو گیا۔
”وہ آسیہ نہیں آ رہی؟“ میمونہ بھابی نے کچھ ہتکلی کر کہا۔

”کیوں؟“ کیوں نہیں آ رہی۔ کیا کر رہی ہے؟“
”کچھ نہیں اور بہتر ہے کہ ابھی آپ اسے نہ جھجھیں۔“ میمونہ بھابی نے کہہ کر فون بند کر دیا۔
وہ کچھ دیر ریسپونڈ کو دیکھتا رہا پھر کیدل پریچ کر دھر سے ادھر ٹھنکنے لگا تو دھیرے دھیرے اندر کا زنگ بھرا ہو کر تمام خدشات پر حاوی ہونے لگا تھا۔

”کوئی گناہ کیا ہے میں نے جو منہ چھپاتا پھروں۔ اگر اُسے میری پہلی شادی کا معلوم ہو گیا ہے تو ہونا چاہیے کہ کن حالات میں ہوئی۔ اور اُسے میری ہر بات کا یقین کرنا پڑے گا۔ میں نے اس کے مانے نہیں کی نہ دھوکا دیا ہے۔ اس کی ناراضگی بھائی میں اسے منانے کا حق رکھتا ہوں۔“
اس نے ٹک کر ریسٹ واپس پر نظر ڈالی۔ پھر ایک پل میں فیصلہ کر کے گاڑی کی چابی اٹھالی۔
میں شاہراہ پر گاڑی دوڑاتے ہوئے وہ صرف یہ سوچ رہا تھا کہ واپسی میں آسیہ بھی اس کے ساتھ پھر اسی احساس میں گھر کر آئے گی اس نے گھر کے سامنے گاڑی روکی اور بیل کا منہ دیا تھا۔
کیٹ کھولنے آجاتی آئے تھے اور اُسے دیکھ کر فوری طور پر ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ خوش آمدید

رویں۔ علیکم السلام علیکم! اس نے اپنے بیٹے والے انداز میں سلام کیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اندر چلا آیا تو تاجی جوش میں آکر بولے تھے۔

”آؤ۔ ادھر آ جاؤ۔“
”جی!“ اس نے ٹک کر دیکھا پھر ان کی تقلید میں ڈرائنگ روم میں آتے ہی پوچھا۔

”آسیہ کیا کام ہے؟“ تاجی کے بھنبے ہوئے چاٹ بچے پر وہ نظریں پڑا گیا۔
”میں لینے آ رہی ہوں اُسے۔ بہت دن رہ گیا اس نے آپ کے گھر طبیعت کیسی ہے اُس کی؟“

”اب تو اللہ کا شکر ہے۔ بہت بہتر ہے۔ تم بھٹو کیا ہو گئے۔ چائے یا؟“
”جی شہ۔“ بس آپ جلدی سے آسیہ کو بلا دیں بلکہ میں خود لاؤ وہ اُس کے پاس جانے کے لیے آگے بڑھا۔
”تاجی ایک دم سامنے آکر بولے۔“

”آسیہ میں آ رہی ہے۔“
”جی۔“ وہ جیل سا ہو کر فوراً بیل کر صوفے پر بیٹھ گیا اور تاجی کے کمرے سے نکلنے کے بعد دروازے کی دھڑکنے لگا جہاں سے کچھ دیر بعد جیسے ہی آسیہ اندر داخل ہوئی وہ اٹھتے ہوئے بے تابی سے بولا۔

”آسیہ۔ کیسی ہو؟“
”آپ کیسے ہیں؟“ وہ اس کی بے تابی کیسر نظر انداز کر گئی۔
”یہ گھر چل کر تباہی لگا۔ جلوجلدی سے تیار ہو جاؤ۔ بلکہ تیاری کیا کرنی ہے بس کہہ آؤ اماں جی اور تاجی

”آؤ اپنے گھر جا رہی ہو؟“ وہ یوں بولا جیسے وہ سچ سچ اسی انتظار میں گھڑی ہو۔
”وہ بہت خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔“

”دیکھو، جو بھی بات ہے۔ ہم گھر چل کر کریں گے۔ میں تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ سب کچھ سچ بتاؤں گا۔ اس کے بعد تم خود فیصلہ کرنا“ وہ ایک طرح سے ہتھیار ڈال گیا۔
”فیصلہ ہو چکا“ آسیہ کے بے تاثر بچے پر وہ ٹھنک گیا۔

”کیا مطلب؟“
”مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سنئی۔ جھوٹ نہ سچ۔ اس کے باوجود میں آپ کے گھر جانے کو تیار ہوں لیکن

”میں نہیں چھوڑے گی“ آسیہ نے باجان اور بی بی جان سے زور سے اجازت لی تھی۔ بلکہ وہی اگر مجھے یہاں سے ہٹا سکتے ہیں تو اس کا جتنی لہجہ اس قدر مضبوط تھا کہ کچھ دیر تک وہ اسے دیکھتا رہ گیا پھر قدرے جھجھکا کر بولا۔
”ابھی اگر نا ہوتا تو پہلے آئے اور میں نے تمہیں اسی وقت بتا دیا تھا کہ وہ میری تم سے شادی پر قطعی رضی نہیں۔ اسی لیے میں سب کر چھوڑا تھا“

”اور ساتھ میں یہ عہد بھی کیا تھا کہ جب تک وہ مجھے تسلیم نہیں کریں گے آپ وہاں نہیں جائیں گے۔“ وہ بڑبڑاتی تھی۔

”تو تم میرے وہاں جانے سے خفا ہو؟“
”نہیں۔ میں ایسی کسی بات پر خفا نہیں ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں۔ آپ خوشی سے وہاں نہیں گئے ہوں گے

”وہ میری ہی آپ کو لے گئی ہوگی اور میری مجبوری یہ ہے کہ میں اپنے ماں باپ اور بھائیوں کے سر پر کھڑی ہوں اور اپنی عزت و وقار کھو سکتی ہوں۔ میری اناؤ خود داری مجھے اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ میں سب کچھ داؤ پر لگا دوں۔“ وہ بہت مضبوط سے منہ پر ہنسنے لگی۔

”کیونکہ میں نہیں ہوں کہ میں محبت میں شرکت کو اکر رہی ہوں۔ مجھے مہر النساء کی سوکن بننا منظور ہے لیکن

”اب تو شاہ سکندر! اگر آپ کچھ بھی دے دیں گے کہ زندگی بھر شاہ پور اور اُس کے مکینوں سے آپ کو ملا سکتے ہیں تب بھی میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ مجھے لے جانا ہے تو بابا جان کو لے کر

آئیں۔ میرا مقصد انہیں اپنے یا اپنے گھر والوں کے سامنے جھکانا ہرگز نہیں ہے۔ میں تو بس بقیہ زندگی جیسے کا حق اور مان جا رہی ہوں۔ اگر آپ انہیں لاکھیں تو ٹھیک ہے ورنہ سمجھ لیں آسہ مرگئی یا وہ جھپاک سے کمرے سے نکل گئی تو وہ جو۔ سناٹے میں گھبراتا تھا ایک دم جیسے موٹوں میں آکر لپکتا تھا لیکن وہ اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر چکی تھی۔

آسہ! آسہ! میری بات سنو! وہ اس کے دروازے پر دستک دینے لگا۔ اور لمحہ بے لمحہ اُس پر دھواں طاری ہو رہا تھا۔ اگر اپنے گھر میں ہوتا تو دروازہ توڑ ڈالتا۔

آسہ نے جیسے اپنے کان بند کر لیے تھے۔

”تم غلطی کر رہی ہو آس! بابا جان نے اگر تمہارے لیے نازیبا الفاظ استعمال کیے ہیں تو اس کی مرمت دو۔ تم میرے اور میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔ ہم مل کر کچھ سوچ سکتے ہیں۔ میری باز رہی ہوتاں؟“ وہ اسے جانے کیا باور کرانا چاہ رہا تھا۔

”وہ آپ کی بات نہیں سننے لگی شاہ سکندر!“ عتب سے عدیل بھائی نے اُسے مخاطب کیا تو وہ اُن کی طرف پلٹ کر بولا۔

”کیوں نہیں سننے لگی؟“

”اس لیے کہ وہ فیصلہ کر چکی ہے اور اس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں۔ عدیل بھائی جو اوّل سے بہت اہمیت دیتے آئے تھے۔ آج انہی بنے کھڑے تھے۔“

وہ کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا پھر قدرے طنز سے پوچھنے لگا۔

”یہ صرف اُس کا فیصلہ ہے یا؟“

”ہم سب کا۔ عدیل بھائی کوئی رعایت برتنے کو تیار نہیں تھے۔“

”پھر کون مجھے کہنا پڑے گا کہ آپ لوگ اپنی بہن کے ساتھ ظلم کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ سب ہے کہ والدین یہاں نہیں آئیں گے۔“ اُس کا زعم غودو کر آیا۔

”اور آپ کب تک بہن کو اپنے پاس بٹھائے رکھیں گے۔ سال دو سال۔ دل بھر جلنے تو میرے د پر چھوڑ جائیے گا کہ میں اس پر اپنے دروازے بند نہیں کر رہا۔“

عدیل بھائی کی پیشانی پر شگفتوں کا جال بچھ گیا ادا بھی کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن وہ جیتر قدموں سے باہر

”میں نے عدیل کو منع کیا تھا شاہ سکندر کے سامنے نہیں جلنے لیکن اُس نے میری بات نہیں مانا۔ بتاؤ معاملہ اور بگڑ گیا کہ نہیں؟“ آبا جی بہت فکر مندی سے اُمّاں جی سے کہہ رہے تھے۔ ”وہ صاف ہے کہ اُس کے ماں باپ یہاں نہیں آئیں گے اور ایسا اُس نے صرف عدیل کی ضد میں کہا ہے۔“

”کیا کرے عدیل، اُس سے برداشت نہیں ہوتا۔ جو ان خون ہے۔“

”برداشت تو میں کرنا پڑے گا۔ ہم میں سے کسی کی مداخلت شاہ سکندر کو ضد دلا سکتی ہے بڑا میاں بیوی کا معاملہ نہیں ہے۔ پھر بھی ابھی حرف آسہ کو بات کرنے دو۔ وہی اُسے غصے سے بچا۔“

”طرح سمجھا سکتی ہے اور وہ عدیل کہاں ہے۔ عدیل!“ آبا جی نے اُمّاں جی کو سمجھاتے ہوئے کہا پھر عدیل کو بلکا اُٹھا۔

”جی آبا جی!“ عدیل اُن کی پہلی ہیکار برآئے تھے۔

”تم نے اچھا نہیں کیا بیٹا! انہیں شاہ سکندر سے معافی مانگنی ہوگی۔“ آبا جی نے چھوٹے ہی کہا تو وہ کمر بولے۔

”کس بات کی؟“

”اپنے رویے کی۔“

میں نے ایسا کوئی بد اخلاقی کا مظاہرہ نہیں کیا آبا جی۔ پھر بھی میں معافی مانگ لوں گا لیکن اُس وقت وہ اپنے ماں باپ سے آسہ کی حیثیت تسلیم کر دیا کہ اُسے ساتھ لے جلنے کا۔ اس سے پہلے معافی مانگنے کا وہ اپنے اُمّاں جی کو اپنی شرط واپس لے لی جو کہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ صرف ان دونوں میاں بیوی کا ہے۔ عدیل بھائی بہت رसान سے بولے گویا انہوں نے جو کیا ٹھیک کیا۔ اور ابھی وہ کچھ غلط نہیں ہے۔ تھے جیسی آبا جی نے ان سے اختلاف نہیں کیا لیکن اُن کی تشریحات اپنی جگہ تھی۔

”میرے بھائی! میں بہت سنبھل کر چلنا ہے۔ ضد میں تو معاملہ مزید بگڑتا جائے گا۔“

”میرے بھائی! میں بہت سنبھل کر چلنا ہے۔ ضد میں تو معاملہ مزید بگڑتا جائے گا۔“

”یہ ہماری ضد نہیں ہے آبا جی اور اگر شاہ سکندر نے اسے۔“ آسہ کے آنے سے انہوں نے بات وین

دی اور سوائے نظروں سے دیکھنے کے تو وہ اُمّاں جی کو مخاطب کر کے بولی۔

”اُمّاں جی! کھانا لگ گیا ہے۔“

”ہاں ملو۔“ پہلے کھانا لگائیں۔“ آبا جی فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مقصد اُس پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہاں کسی رشتے پر بات نہیں ہو رہی۔

”میرے کھانے کے دوران عدیل بھائی نے میوز بھائی کے ساتھ مذاق شروع کر کے ماحول کو خوشگوار بنایا تھا لیکن اُمّاں جی اُن تک ماحول کا رنگ بدل گیا۔“

”تم بہت اترانے لگے ہو۔ اُمّاں جی اب اس کی جلدی سے شادی کر دیں۔ ناملکی اتنی انتظار میں ہوں گی کہ وہ ہم گئے نہیں۔“ میوز بھائی نے۔

”عدیل کو چھوڑتے ہوئے اُمّاں جی کو یاد دلایا تو وہ بگڑ

اُترتی رہیں انتظار، یہیں اب نہیں جانا اُن کے ہاں۔“

”کیوں اُمّاں جی؟“ آسہ نے بے اختیار پوچھا تھا۔

”انہوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔ جانے کس جھوٹا بدلہ۔ بیٹی رکتے ہوئے بھی انہیں خیال نہیں آتا کہ۔“

”یہی کوئی اُمّاں جی؟“ آسہ نے پریشان ہو کر کہیں ڈکا پھر کہنے لگی۔ ”میرا نہیں خیال کہ انہیں شاہ سکندر بدلے میں زیادہ کچھ معلوم ہو گیا کہ اُن کے گھر سے بھی کوئی شاہ پور نہیں گیا۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو نہیں ہی پکڑوں گی کیونکہ وہی سکندر کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔“ اُمّاں جی غٹ شامی تھیں۔

”ہم کسی کو الزام نہیں دے سکتے عدیل کی ماں! یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ تم بے شک عدیل کی دواں سے ختم کر دو لیکن یہ جواز مت رکھنا۔“ آبا جی نے رسان سے سمجھاتے ہوئے کہا تو عدیل بھائی اُن کی رکتے ہوئے بولے۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں آبا جی! ہم اپنا بدلہ اُن سے کیوں لیں جن کی شاہ سکندر سے کوئی رشتہ داری نہیں۔ پھر جتنا نہیں سکندر نے انہیں کیا کہا فی سانی ہے۔ اور اُمّاں جی آپ خود سے تو کوئی بات نہ کریں۔“

”ہم سنا سنے والے وقت میں ہیں یہ ساری باتیں چھپائی پڑیں کیونکہ سکندر بہر حال اُن کا داماد ہے اور داماد کیسا بھی خود دُنیا کے سامنے اُس کی تعریف ہی کی جاتی ہے۔“

”آسہ کو اپنے دل کی بات میں پہلے سنائے گا شدت سے احساس ہوا۔ بہت خاموشی سے اُٹھ کھڑے ہوئے کہیں فی اُمّاں جی غٹ شامی سے بولیں۔

”یہ کیا باتیں ہے مجھے بوم لوگ۔ ختم کرو۔ میری بیٹی پریشان ہو جاتی ہے۔“

”پریشان تو ہوئی لیکن اُسے یہ سب کچھ خود فیس کر ملے۔ اس لیے کوئی بات اُس سے چھپائی نہیں جا سکتی۔“

”جی جی! کہتے ہوئے اُٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد اُمّاں جی اور اُن کے چچے آبا جی اُٹھ کر چلے گئے تو میوز بھائی برتن

”بہت بڑبڑ ہوئی۔“ یعنی اب جب تک آسہ کا معاملہ سیٹ نہیں ہوگا گھبراہٹ بات آگے نہیں بڑھے گی۔

وہیے اگر تمہیں جلدی ہو تو میں تمہارے لیے کوئی اور لڑکی دیکھوں۔
 ”کوئی نام نہ نہیں۔“ عدیل بھائی اُن کی شریر مسکراہٹ سے قدرے جھینپ کر بولے۔

”کیوں؟“

”اس لیے کہ شادی میں آسہ کی سینک کے بعد ہی کروں گا۔“ انہوں نے کہا تو میمونہ بھالیہ دیکھتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”جی بات ہے۔“

”جناب۔“

”میرزا ندہ ہی ٹھیک ہے۔ میمونہ بھائی ان کے دل کی بات کہہ کر اُن کا غم مٹا دیا۔ پھر ماسٹرہا کر پوچھنے لگیں۔ ”تمہاری بھی نام نہ سے بات ہوئی ہے؟“

”کیوں؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”نہیں ہوئی تو فون کر لیا کرو۔“ انڈرا سینڈنگ ہو جانے لگی۔ میمونہ بھائی نے اُن کا کیوں نوا مشورہ دیا تو وہ ہنس پڑے۔

”خلیل بھائی سے آپ کی اسی طرح انڈرا سینڈنگ ہوئی تھی؟“

”تو برو کرو۔“ میرا تو مگنی کے بعد سے شادی ہونے تک سارا وقت اسی انتظار میں گزارا کہ میمونہ بھائی کی فون کر دیں لیکن یہ تو جیسے قسم کھا کر بیٹھ جاتے کہ شادی ہونے پر ہی بات کریں گے۔ میمونہ بڑا سامنے بنا کر بولیں اور اُن کے مزید کہنے پر چرچا لگیں۔

”سارے بھائی ایک جیسے ہوتے۔“

شاہ سکندر بالکل عام مردوں کی طرح سوچ رہا تھا کہ اُس کی بیوی نوا ان سے جو بھائیوں میں آگئی ہے (حالانکہ اُس کی ذہانت کا وہ ہمیشہ سے معترف رہتا تھا) اور یہی مردوں کا شیوہ ہے۔ بے یزدر کے بہات کا اعتبار کرتی رہے تو یہ اس کا اپنا عمل، جہاں کسی بات پر گرفت کی سارا اہرام والوں پر آتا ہے۔ وہ بھی یہی سوچ رہا تھا کہ آسہ کی طرح بھی اُس سے متفرق نہیں ہو سکتی۔ اگر اُس کی دل بھٹی یا دل آزاری کیسے تو وہ اُس کے سامنے افسوس کا اظہار کرتی لڑتی جھکوتی اور مزید زیادہ آئندہ اُسے شاہ پور جانے سے روک دیتی لیکن بابا جان کے آنے کی شرط وہ بھی نہیں رکھتی۔ اُس کے خیال میں کسی مقام پر آسہ جھکا نا یا بے بس کرنا اُس لڑکی کے اعتبار ہی میں نہیں ہے اور اب اس کے سامنے وہ مجبور ہو گئی ہے لیکن زیادہ دل نہ یہ مجبوری کی ذمہ داری نہیں بہن کے لیے۔ کیونکہ وہ مضبوط اور زور آور اُس کی محبت ہے جس کے کھینچنے سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اور اُس پر ہر مرد و سا غلط نہیں تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اور بھی غم ہیں زمین سے محبت کے سوا۔ بہر حال اُس نے مشکل خود پر جبر کیا۔ اس کے بعد دل تو جا ہا خود جا کر آئے سب کے درمیان میں نے لے آئے لیکن عدیل بھائی کو وہ جو جواب دے کر آیا تھا اُس کے بعد دوبارہ جانے کے خیال نے اپنی چٹک محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے مجبوراً فون کا سہارا لینا پڑا۔ اور پھر سارا دن وقفہ وقفہ نمبر ڈائل کرتا رہا۔ اُدھر سے ایک ہی جواب ملتا۔ ”وہ بات نہیں کرنا چاہتی۔“ جس سے پہلے وہ مجھو طاری ہوئی۔ آخر میں انتہائی غصے میں آکر اُس نے فون سیٹ اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ اس کے ایک منٹ بعد سوچیں آسہ کسی انتہائی اقدام پر کسائی رہیں۔

”کیا حیثیت ہے عدیل خلیل کی میرے سامنے۔“ ابھی تین حرف کہہ کر بیچ دوں تو سزا کا کھینچے۔

”میرا یہ ہے ان کے اندر دفن ہو جانے کی۔“ منہ چھپاتے پھر اُس کے لوگوں سے۔

معاذ و ریل کی آواز نے جہاں اُس کی سوچوں کو منتشر کیا وہاں پہلا خیال آسہ کا آیا تھا۔ وہ گھر میں سے کوئی جو اپنے دوست پر نام ہو کر آیا ہو۔ اس خیال نے اُس کے ہونٹوں پر فاختہ

بھری اور پھر قصد اُس نے اٹھنے اور دروازہ کھولنے میں دیر لگائی لیکن جب سامنے احمد حسن کو دیکھا تو بے چارے میں جھنجھ سا ہو کر رہ گیا تھا۔

”کجاں ہو! رات میں تو اب تمہارے بارے میں اخبار میں اشتہار دینے والا تھا۔“ احمد حسن اُس کے گلے لگے۔

”نہیں ہیں۔“ میرا مطلب ہے وہ سیکے گئی ہوئی ہیں۔“ آؤ میمونہ! وہ اسے لے کر لاؤں میں آگیا۔

”تم نہیں گئے بھائی کے ساتھ؟“ احمد حسن نے پوچھا۔ ”جیسی وہ بھی جواب گول کر گیا۔“

”اور ساؤ گھر میں سب خیریت ہے۔“ اُنہی سناتے۔

”ہاں اللہ شکر ہے۔“ نہیں بتایا ہوگا بھائی نے کہ وہ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ آئی عقیق ہمارے ہاں۔

”لکے لیے؟“ احمد حسن نے اُن کی آمد کا مقصد بھی بتا یا تو وہ قدرے پرسوج انداز میں بولا۔

”ہوں۔“ ڈر کر اُٹھا آسہ نے مجھ سے۔ پھر کیلے پایا؟“

”آئی جلدی کیلے پائے گا۔“ ابھی تو بات شروع ہوئی ہے۔ پھر مجھے تم سے بھی مشورہ کرنا تھا۔ کیسے بدل صاحب اور سب لوگ؟“ احمد حسن نے اُن کے لیے غلط وقت پر اہم موضوع چھیڑ دیا تھا۔ وہ متفرق بیٹھا

”جو بھی کہہ سکتا تھا لیکن جانے کیسے دامن بچا گیا۔“

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا احمد حسن۔“ مجھے درمیان میں مت لاؤ۔ تم اور اُنہی جو مناسب سمجھیں کریں۔“

”اس کا مطلب ہے تم نام لکھو بہن نہیں سمجھتے۔“ احمد حسن نے اُس کے جواب سے مایوس ہو کر کہا۔

”اس کیوں کہا تم نے؟“ وہ بگڑ گیا۔ ”وہ میری بہن ہے اسی لیے میں خود کو اس معاملے سے الگ رکھ رہا۔“

”یہ خدا خواست زندگی میں کہیں اوج نہ پہنچے ہو جہاں سے تم نے یہ کہو کہ سسرال کی طرف لڑائی میں نہیں لے سکتے ہیں کا ل نہیں کیا تھا؟“

”ہی نہیں، تم اس معاملے سے الگ نہیں ہو سکتے۔“ اُمی کا بھی یہی کہنا ہے کہ تم سے مشورہ کرنے کے بعد

”اب جواب دیا جائے گا۔“ کیونکہ تم زیادہ جانتے ہو۔“ احمد حسن نے اُس کے غم کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

”اور میں تو تعریف ہی کر دوں گا۔“ اچھے لوگ ہیں۔ شریف، عزت دار اور عزت مند۔“ وہ قصداً مسکرایا۔ اور

”سنا چاہتے ہو؟“

”اور بتا دو کہ بھائی کب آئیں گی؟“ اُن کے بغیر تم کچھ خبیلی لگ رہے ہو۔“ احمد حسن شریر مسکراہٹ

ساتھ بولا تو وہ نظریں چرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

دیکھنے لگی۔

”پھوپھو! اشعار و رسمیت آئے ہیں!“

”سیما بھائی! عدیل بھائی کی گاڑی سے سیما بھائی کو اترتے دیکھ کر وہ بے خیالی میں عمر کا ہونے کے استقبال کو بڑھ گئی تھی۔“

سونیا کی آواز پر سیما بھائی نے اٹال جی کمرے سے نکل آئی تھیں۔ اور پھر سارے گھر میں ایک قورق مچ گئی۔

”میں نے اسلام آباد سے چلتے ہوئے عدیل کو فون کر دیا تھا کہ یہاں ہیں ریسلو کمرے اور یہ یاد رہا ورنہ مجھے خاصی پریشانی ہوتی۔“ سیما بھائی نے اٹال جی کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

”خیر عدیل بھائی کی یادداشت اتنی کمزور تو نہیں ہے جو انہیں آپ کو ریسلو کمرے لایا ورنہ نے بھائی کی طرف لاری میں کہا تو سیما بھائی فوراً بولیں۔“

”کیوں ایک بلڈ میس بازار میں نہیں معمول کیا تھا۔“

”جناب معمولاً نہیں تھا بلکہ جان بوجھ کر چھوڑ آیا تھا۔ کیونکہ آپ لوگوں کی شاپنگ ختم ہوئے رہی تھی۔ عدیل بھائی اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے غلط ہو کر بولے تھے۔“

یو جی بکلی پھٹکی باتوں میں چلنے کا دھڑلا۔ پھر کھانا۔ اس کے بعد وہ سو نیا اور میوہ کرا کر کمرے میں آگئی۔ کیونکہ سیما بھائی، اٹال جی کے ساتھ اسی کے مسئلے پر بات کرنے کی تھیں اور وہ ہر شے ہوتی تھی حالانکہ کسی نے اس پر جتا یا نہیں تھا کہ شاہ سکندر اس کی پسند تھا۔ بس اپنے کہ ہوتا تھا کہ اس نے اگر غلطی نہیں کی تب بھی سب کو مشکل میں ڈالنے کی سزا وار ضرور ہے۔

”آسیہ! میمون بھائی نے اس کے کمرے میں جھانک کر پوچھا۔ چائے پیو گی؟“

”نہیں بھائی۔ ایسے ہی بہت کھیل بیٹھ ہوئی ہے۔“

”چلو چھٹی ہوئی“ میمون بھائی اندر آ گئیں اور کرسی کی پیچ کر آرام دہ انداز میں بیٹھتے ہوئے بولیں۔

چڑھیں تمہارا سر کھڑا رہی ہیں؟

وہ ہائے بھائی! یہ تو میری شہزادیاں ہیں! اس نے دائیں بائیں سونیا اور سمیتہ کو اپنے بازوؤں اور باری باری دونوں کے گال چومنے لگی تو میمون بھائی چھیر کر کہنے لگیں۔

”بس کچھ وقت ہے۔ جب تمہارا اپنا آجائے گا تو انہیں پوچھو گی بھی نہیں؟“

”جی نہیں۔ یہ تو میری جان ہیں۔“

”کون کس کی جان ہے؟ سیما بھائی سنتی ہوئی آ گئیں۔“

”آئیے بھائی! آپ ہمیں بھی اپنا حال احوال سنائیں! وہ اپنے قریب ان کے لیے گدہ بناتے ہوئے ہیں تمہارا احوال سننے آئی ہوں۔ کہاں ہیں آج کل شاہ سکندر؟ سیما بھائی نے بیٹھتے ہوئے بڑے بہت سنبل کر بولی۔

”صبح ان کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے شاہ پر دربار ہوں۔“

”اپنے اٹال آتا کو لینے؟“

”جی۔ مجھے تو یہی کہاہے۔ وہ اپنے ناخنوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”چلو آئے تو اچھا ہے۔ ویسے تمہارے بھائی جان بہت مایوس تھے۔ کہہ رہے تھے اگر شاہ والدین آج بھی گئے تب بھی آسیہ کا سوکن کے ساتھ گزرا مشکل ہوگا۔ سیما بھائی نے کہا۔

”یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔ وہ باری ہوئی سی لگ رہی تھی۔

”نہیں آسیہ! یہ ساری باتیں بھی ابھی سوچ لو تو اچھا ہے۔ ورنہ بعد میں تو تمہارے پاس سونے کے اور کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ میمون بھائی نے ناصحانہ انداز میں کہا تو سیما بھائی ان کی تائید کرتے کہنے لگیں۔

”میونہ شیک کہہ رہی ہیں۔ تمہارے بھائی جان نے مجھے اسی مقصد سے بھیجا ہے کہ آسیہ کو مجھا دینا تمام لوگوں پر غور کرنے کے بعد شاہ سکندر کے ساتھ جانے کی بات کرے۔ اور یہ کہ آیا آئندہ زندگی میں تم اس کے ساتھ خوش رہ سکتی ہو کہ نہیں۔ انہوں نے سمجھوتہ کرنے سے منع کیا ہے۔ کیونکہ یہ چند دنوں کا نہیں ساری زندگی کا معاملہ ہے۔“

”میرے بھائی! میں نے ساری باتیں سنی ہیں۔ میرا خیال ہے یہ ساری باتیں خود بھی سمجھ سکتی ہو شاہ سکندر کی پہلی بیوی جتا نہیں لکھی عورت ہے۔ نہیں کہنے دے گی یا نہیں؟“

”ہاں۔ میں نے ان کی عورتوں کے بارے میں بڑی باتیں سنی ہیں۔ جادوؤں کے ذریعے سونوں کو دروا

زی ہیں۔ اللہ تو بڑا میمونہ بھائی جیسے جی لے کر ان کو ہاتھ لگائے لگیں۔

وہ سر جھانکے سنتی رہی تھی۔ ذرا سی پھلیں اٹھا کر میمونہ بھائی کو دیکھنے لگی۔

”یہ ان باتوں میں اگر صداقت ہو جب بھی ہم یقین نہیں کرتے۔ میں سکندر کی بیوی کے مزاج کی بات

یہی تھی اور یہ کہ سکندر کو آسیہ کے خلاف بہکا بھی سکتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ سارا خاندان ہوگا اور یہ

ملنے سیما بھائی نے اپنا رٹ میمونہ بھائی کی طرف موڑا تو دونوں جھاد جیں آپس میں بات کرتے ہوئے

دیر گزاس کی موجودگی فراموش کر گئیں۔

”پھر تازہ شکل ہوگی۔ اب جاہل عورتوں کے ساتھ یہ کہاں متاثر کر سکتی ہے؟“

”اسی لیے ٹھیک نے کہا ہے۔ ہر پہلو سے غور کرنے کے بعد سکندر کے ساتھ جانے کا سوچے۔“

”وہ بھائی! کتنا دھوکا دیا ہے سکندر نے۔ دیکھنے میں کیسا لگتا ہے۔ ایمان سے میرا تو دل چاہتا ہے وہ

انے لے اور میں شوٹ کر دوں اسے۔ میمونہ بھائی ایکدم جذباتی ہو گئیں پھر چانگ آس پر غور پڑی تو

”نہ ہو کر بولیں۔ سوری۔ سوری آسیہ۔ تم مائد نہیں کرنا۔ ویسے میں یہ سب تمہاری محبت میں کہہ رہی ہوں۔“

”اور کیا۔ میں نے تو جس دن سے سنا ہے بقول رہی ہوں۔ بھلا کیا کیا تھی آسیہ میں ایک سے ایک

بار ستمہ موجود تھا؟ سیما بھائی نے کہا تو وہ اندر ہی اندر جڑ بڑ ہو کر بولی۔

”خیر میری قسمت میں تھا تو وہی ملا۔ اور جائے آگے قسمت میں کیا لکھا ہے؟“

”بس جہاں آدمی مات کھاتا ہے اسے قسمت کا لکھا کہہ کر خود کو بھلائے پر مجبور کر تا ہے۔ سیما بھائی نے

منہ سے کہا تو وہ اچانک۔ سر اٹھا کر بولی تھی۔

”میں مجبور نہیں ہوں بھائی۔ اور ابھی تو تبدیل ہے۔ کچھ انتظار کرو اس کے بعد فیصلہ ہوگا کہ مات کسے

پڑی۔“

وہ بڑی دیر سے انتظار کر رہا تھا کہ بابا جان کے مہمان رخصت ہوں تو وہ ان کے پاس جا کر بیٹھے اور انہیں

پرکھتی میں ہوا کرنے کی کوشش کرے لیکن مہمان جلنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ ٹھہلتا ہوا کبھی

”میں ماں کبھی نہیں پرا حذر ہوتا۔ اور ابھی تک اس کے ذہن میں باقاعدہ کوئی پلان نہیں تھا کہ بابا جان

نفاذ کرنے کے لیے اسے کیا طریقہ اختیار کرنا ہے۔ یہ نہیں تھا کہ اس نے سوچنے کی کوشش نہیں کی۔

”بت موچنے کے بعد بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔“

”بھلائیے باب کے پاس۔ وہ یونہی ٹھہلتا ہوا کمرے میں آیا تھا کہ مہالسا نے ایکدم بچہ اس کے بازوؤں

پر سے دبا اور فوراً پلٹ کر وارڈ روم میں چلنے کیا تلاش کرنے لگی تھی۔

”شاہ سکندر کا ذہن پہلے ہی اٹھتا ہوا تھا۔ مہالسا کی بدتمیزی پر اس سے اچھ کر وہ مزید اپنا دماغ خراب

کر رہا تھا۔ اس لیے نا موٹھی سے بچنے کو لیے ہوئے۔ بدتمیزی پر نمر دراز ہوگا اور غامی بے دھیانی

بچنے کو دیکھنے لگا جس کی حرکتیں اور شرارتیں بڑی معصوم سی تھیں۔ اس کے ایسے ہر چرچہ کر بیٹھ جاتا اور وہیں

بیٹھ کر بعد غور و فکر، غاف کرانے لگتا تو بے دھیانی میں بھی اس کا ہاتھ اسے اختیار اسے تمام لیتا جس

نہ وہ کھانے پر ہنستا۔ ا۔ کھانہ بہت میں زندگی تھی۔ قوس و قزح کے رنگوں سے بھی کھشاک کی مانند

”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“ آبا جی نے جواب دینے سے پہلے سوال اٹھایا۔
 ”کہہ رہے تھے ان کے بابا جان کل آئیں گے اور اس وقت ان کا مجھ سے ملنا ضروری ہے۔“
 شاہ سکندر کی بات دہرا دی۔
 ”کوئی مضائقہ نہیں بھلی جاؤ۔“

آبا جی نے اجازت دے دی تو وہ جلدی سے اپنے کمرے میں آکر کھڑے نکالنے لگی۔
 دونوں بھجوا جس دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی شاپنگ کے لیے حیدری چلی گئی۔
 بڑے تینوں بچے بھی ابھی کے ساتھ تھے صرف چھوٹا عمر آماں جی کے پاس سو رہا تھا، اس لیے
 سے تیار ہو گئی اور پھر صبح ہی شاہ سکندر کی گاڑی کا مارن سٹائی دیا وہ کھڑے کھڑے آماں جی سے
 باہر نکل آئی۔

”السلام علیکم“ اس کی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے شاہ سکندر مبہم سا مسکرایا تھا۔
 ”وعلیکم السلام،“ جو آبا امیر کی مسکراہٹ کھلی ہوئی تھی۔
 ”تھینکس گاڈ،“ تہا نے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو آئی۔
 ”اُس نے تشکر کا اظہار کیا پھر اسپید سے گاڑی رہائشی ایریا سے نکال کر مین شاہ رو پر آبا
 کہنے لگا۔

”میرا خیال تھا تم نے میرا اعتبار نہیں کیا ہو گا اس لیے میرے ساتھ چلنے پر آمادہ نہیں ہوگا
 زبردستی کرنا پڑے گی۔“

”کس بات کا اعتبار؟“ اس نے پوچھا تو وہ ہر میں اُسے دیکھ کر بولا۔
 ”وہی جو میں نے کہا کہ میں کل بابا جان کو ملے گا۔“
 ”یہ جھوٹ ہے یا سچ اس کی بابت میں بعد میں پوچھوں گی پہلے یہ بتائیں آپ کو یہ خیال کیوں
 میں آپ کا اعتبار نہیں کروں گی۔“

”کیا میں تمہارا اعتبار کھو نہیں چکا؟“ وہ اُنٹا اُس سے پوچھنے لگا۔
 ”جیتا نہیں ابھی تک تو میں نے کچھ بھی نہیں سوچا میں نے کیا کھویا، کیا پایا ساکے سو دو زیاں
 میں اپنے گھر کی چھت تلے آپ کے ساتھ بیٹھ کر کروں گی اور اس وقت میں آپ سے بہت لڑوں
 لڑوں گی سکندر۔“ وہ اچانک ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

”آس۔۔۔ آس پلیز۔“ وہ پریشان ہو گیا۔
 ”رووگی تو میں گاڑی کسی ٹرک سے جسے ماروں گا۔“
 ”اُس نے بھیلیوں سے اُنھیں روک کر ہاتھ نیچے کر لیے۔
 ”اب گزرتے کل اور آنے والے کل کی کوئی بات نہیں ہوگی۔ بس آج کے دن کو ہم یاد گا دینا
 اس کے لیے ضروری ہے کہ تم کھلکا کر بنو۔ ایسی مہنتی جس کی جلتی رنگ زندگی کی آخری سانسوں تک
 سماعتوں میں گونجتی رہے۔“

شاہ سکندر نے نظام ہر یکے چکلے انداز میں کہا تھا۔
 ”سکندر وہ ٹرپ کر بولی
 ”ایسی باتیں کریں گے تو میں جیتی گاڑی سے کوڈ جاؤں گی۔“
 ”اور میں تمہیں کوڈ دے دوں گا۔“ شاہ سکندر نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تمام لیا پھر پوچھنے
 ”آس کریم کھاؤ گی؟“
 ”نہیں۔“ وہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔
 ”چلو تو پھر یہ کھانا سنو، اس نے ٹیپ کا بٹن آن کر دیا۔

جب کوئی پیار سے بلانے لگا۔
 ”تم تو ایک شخص یاد آئے گا۔“
 ”اسیہ نے فوراً بٹن دبا کر ٹیپ بند کر دیا۔
 ”ارے بند کیوں کر دیا؟“ وہ وہ ڈانڈا سکرن سے آگے کہیں بہت دور دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
 ”مجھے نہیں سننا،“ وہ دھڑکتے ہوئے بولی۔
 ”سننا نہیں، کہنا نہیں کچھ نہیں پھر کیا کرنا ہے؟“
 ”آپ وہ باتیں نہیں جن کے لیے آپ مجھے کرا رہے ہیں۔“ وہ اصل موضوع کی طرف آگئی۔
 ”آپ وہ باتیں نہیں جن کے لیے آپ مجھے کرا رہے ہیں۔“ وہ آسے آس کے حال پر چھوڑ کر شیشے
 لیکن وہ ان سی کر کے ٹنگلنے لگا۔ پتا نہیں کس موڈ میں تھا۔ وہ آسے آس کے حال پر چھوڑ کر شیشے
 سے باہر دیکھنے لگی۔ ساحل سے آتی تم ہوا سرگوشیوں میں جانے کیا کہہ رہی تھی۔ پھر لہروں کا شور سنانا
 دینے لگا تو وہ اسے دیکھ کر بولی۔

”میں پانی میں نہیں جاؤں گی۔“
 ”کیوں؟“ وہ ایک سوالیہ نظر دیکھ کر گاڑی پارک کرنے لگا۔
 ”بس نہیں دل چاہ رہا نہیں جاؤں گی۔“
 ”گاڑی سے اترو گی یا یہ بھی نہیں؟“ شاہ سکندر نے اس کی ہر بات میں نہیں کو جتایا تو وہ جلدی سے اپنی
 طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئی۔

”آؤ۔“ وہ گاڑی لاک کر کے اس کے قریب آیا تو اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بے خیالی میں بولا تھا۔
 ”یہ لہرس نہیں ساتھ دیکھ کر خوشی سے چلتی ہوئی ہماری طرف آتی ہیں۔ آج آخری بار ادا نہیں چلنے دو
 پھر تو یہ بھی تم سے میرا احوال دھڑکتے ہوئے تھا پتا پوچھیں گی۔“

آسیہ نے چونک کر دیکھا تھا۔
 ”چلو اُدھر ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔“ جب شام اترنے لگی تب لہروں کا تعاقب کریں گے۔ وہ اُس کی پوری
 کھلی آنکھوں میں دیکھ کر ذرا سا سسٹرایا پھر اس کا کندھا دبا کر چلنے کا اشارہ کیا تو وہ کسی معمول کی طرح چلنے لگی تھی۔
 ”آپ۔“ آپ نیچے پریشان کر رہے ہیں۔ ”وہ اُس بات میں الجھی تھی۔ بیٹھے ہی کہنے لگی۔ ”جو بھی بات ہے
 صاف صاف کہہ دیں۔ میں ہر بات سننے کے لیے تیار ہوں۔ یہ بھی کہ بابا جان نے اُسے انکار
 کر دیا ہے۔“

”فرق کرو ایسا ہو تو تم کیا کرو گی؟“ شاہ سکندر نے اُس کے چہرے پر نظر میں جما کر پوچھا تو وہ ایک دم خاموش
 ہو گئی جبکہ دل انجانے اندیشوں سے کانپنے لگا تھا۔
 ”ارے!“ شاہ سکندر ذرا سا ہنسنا۔ ”ابھی تو کہہ رہی تھیں ہر بات کے لیے تیار ہو۔ چلو جانے دو اب کوئی
 مذاق نہیں ہوگا۔“ موڈ ٹھیک کر دیا۔ ”میں ڈرنکس لے کر آتا ہوں۔“

وہ اسی خاموشی سے اُسے جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔
 شاہ سکندر اپنی مرد آب کے تحت رُٹے اٹھا کر اُس میں ڈرنکس کے ساتھ لوازمات بھرنے لگا۔ پھر کچھ دیر
 کاؤنٹر پر رک کر اُس کے پاس آیا تو بیٹھے ہی کہنے لگا۔

”بتاے،“ پچھلے دو دن میں بہت معروف رہا ہوں۔ اتنا کھانے کا وقت بھی نہیں نکال پایا۔“
 ”اُس کی کیا معرفت تھی؟“ وہ بھیلی پر غور کر کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
 ”میں نہیں گفت دینا چاہتا تھا۔“ وہ کوٹ کی اندر دھکیں سے ایک بھاری لفافہ نکال کر اُس کے سامنے
 رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ تمہارے لیے ہے۔ جس پارٹنٹ میں ہم رہ رہے ہیں وہ میں نے تمہارے نام سے
 فرمایا ہے۔ اس میں اس کے کاغذات ہیں۔ اور تمہارے کلینک کے لیے ایک پلاٹ کے کاغذات بھی ہیں۔“
 ”آپ نے سب۔“ وہ قدرے الجھی تھی۔
 ”کیا میں نے تم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ جب سب ٹھیک ہو جانے کا جب میں تمہارے کام میں رکاوٹ

نہیں بنوں گا بلکہ تمہارا ساتھ دوں گا۔ چلو یہ لغاف بیگ میں ڈالو اور کھانے میں میرا ساتھ دو۔ میں بہتر ہوں نہ وہ ہلکے پھلکے انداز میں آخر میں بیٹ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔
 ”اس کا مطلب ہے کل بابا جان آ رہے ہیں نہ وہ اچانک اندیشوں سے نکل کر مسکرائی پھر لغاف ہاتھ پر کہنے لگی۔ میں اسے کہاں رکھوں۔ آپ اپنے پاس رہتے دیتے جب میں گھر آؤں گی جب۔“
 ”اوں ہوں نہ وہ تو کم کر لولا۔“ اچھی بابا جان کو لینے جانے۔ کہیں ادھر ادھر رکھ کر معمول جانوں گی۔
 ”یہ اب تمہاری چیز ہے صرف تمہاری۔“
 ”تھینک یو۔“ اس نے لغاف پر اس میں ڈال لیا پھر چلو چنے لگی۔ ”صرف بابا جان آئیں گے۔“
 ”کیا چاہتی ہو تم۔“ پوری بات لے کر آؤں۔
 وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ بڑی خوبصورت ہنسی تھی۔ آنکھوں میں ننھے ننھے دیپ چلنے لگے تھے۔
 گھونٹ گھونٹ پیسی حلق سے آتے ہوئے بہت احتیاط سے اسے دیکھ رہا تھا۔
 پھر وہاں سے نکل کر سیدھا گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ وہ اس کا بازو حجام کر لولی۔
 ”سکندر! اس میں کیا رہی ہیں۔“ وہ کہہ کر گاڑی کا لاک کھولنے لگا پھر بیٹھ کر اس کی بازو۔
 ”اُن سے کہو جانے والوں کو نہیں پکارا کرتے۔“ وہ کہہ کر گاڑی کا لاک کھولنے لگا پھر بیٹھ کر اس کی بازو۔
 دروازہ کھول دیا۔
 ”آسیہ خوش اور ممکن سی تھی۔“ اس کے لہجے پر غور ہی نہیں کیا اور نہ یہ محسوس کیا کہ وہ ایسی کا تمام راز بولتی آئی ہے۔ ادھر سے بس ہوں ہاں میں جواب تھا۔ جب گھر کے سامنے گاڑی رکی تب وہ اسے دیکھ کر۔
 ”اینا خیال رکھنا۔“
 ”کشتا؟“ وہ غمراہ سے ہنسی۔
 ”اتنا کہ ہمارے درمیان جو ایک رات کا فاصلہ ہے تو اگر اس رات کی سحر ہونے میں صدیاں بیت۔“

تب بھی تم۔“
 ”سکندر! وہ بے اختیار اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ گئی۔
 ”وقت بڑا غلام ہے اس۔“ محبت کرنے والوں کی آزمائش مطلوب ہو تو بھڑک جاتا ہے۔ جاؤ خدا جاننا۔
 کا ہاتھ جو کم کر بولا۔
 ”خدا حافظ! وہ دھیرے سے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر گاڑی سے اتری تھی کہ شاہ سکندر سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ حیران ہو کر دیکھتی رہی پھر سر جھٹک کر اُٹھ کر آگئی۔
 ”تو پاس مل کر آئی ہے۔“ میوز بھائی اسے دیکھتے ہی گنگناٹے لگیں۔
 ”آپ کو بس موقع چاہیے۔“ وہ قدرے چھینپ گئی۔
 ”کیا ہوا سکندر اندر نہیں گیا۔“ یہاں بھائی نے گیت کی طرف دیکھتے ہوئے تعجب سے کہا۔
 ”کل آئیں گے اپنے بابا جان کے ساتھ۔“ وہ بنا کر محض میوز بھائی کے شروع ہونے سے بچنے کی خاطر اپنے کمرے میں آگئی۔ پرس اور دوپٹا اتار کر بیٹھ کر ڈالا پھر الماری میں سے کمرے سے نکال کر واش کیا۔ منہ ہاتھ دھوئے اور صبح کرنے سے بعد دوبارہ کمرے میں آئی تو پرس اٹھا کر الماری میں رکھتے ہوئے خیال آئے پر اس نے شاہ سکندر کا دیا ہوا لغاف اس میں سے نکال لیا اور بیڈ پر بیٹھ کر کاغذات نکال کر عدیل بھائی دروازے میں آکر کہنے لگے۔
 ”آسیہ! نہیں! بابا جان بلا رہے ہیں۔“
 ”جی۔“ وہ کچھ کاغذات جو ہاتھ میں آگئے تھے۔ وہ اور لغاف وہیں رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”یہ کاغذات کیسے ہیں؟“ عدیل بھائی نے دو قدم آگے آکر پوچھا۔
 ”آپ دیکھیں میں آبا جان کی بات سن کر آئی ہوں۔“ وہ عجلت میں کہتی کمرے سے نکل آئی۔

آبا جان اور اماں جی دونوں یہ بننے کے لیے بے چین تھے کہ شاہ سکندر سے اپنے بابا جان کے ساتھ آئے کیا ملے گا۔ آبا جان کی طرف سے کوئی شرائط تو نہیں ہیں اور یہ کہ وہ آسیہ کو نہیں گراچی میں رکھے گا اپنے ساتھ شاہ پور لے جانے کا۔ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے وہ ماں باپ تھے۔ جہاں بیٹی کا گھر آباد رکھنا چاہیے تھے وہاں سکون کا خوف بھی تھا۔
 ”نہیں! بابا جان کی طرف سے کسی قسم کی شرط نہیں ہے۔“ وہ آرام سے بیٹھ کر ماں باپ کو اطمینان دلانے لگی۔ ”نہ ہی شاہ سکندر نے مجھ سے شاہ پور چلنے کی بات کی ہے۔ بلکہ انہوں نے تو یہاں جو پارٹمنٹ دیا ہے۔ وہ میرے نام سے خرید لیا ہے اس کا مطلب ہے کہ ہم۔“ نہیں۔ ہیں گے۔ باقی کل وہ انہیں گے تو آپ خود بات کر لیجئے گا۔“
 ”کون۔“ اس سے بات کرنے کو کہہ۔ ”جی ہو؟“ عدیل بھائی جہانے کب کمرے میں داخل ہوئے تھے۔
 ”شاہ سکندر سے۔“ وہ اسی روان میں بولی تھی۔
 ”شاہ سکندر اپنے باپ کا بیٹا ہے۔“ بھائی بیچ اور گھٹیا کہ اپنے باپ کی دی ہوئی گالی کو بھانے غلط ثابت کرنے کے اس پر پھر مثبت کر کے تیار ہے اور ہم سب کے منہ پر مار گیا ہے۔“
 ”تو کیا سنا اور غصے کی انتہائی کیفیت میں عدیل بھائی نے وہ سارے کاغذات اس کی طرف اچھال دیئے تھے۔
 ”وہ بھی بیٹی آنکھوں سے اپنے اظرف اڑتے کاغذات کو دیکھنے لگی جبکہ ذہن پر اچانک بابا جان کے الفاظ بھڑکے ہوئے برسرِ منہ لگے تھے۔
 ”شاہ سکندر نے اگر تمہیں اپنی رکھل مار رکھا تو اس کا معاوضہ بھی دیا ہو گا۔“



”تو کیا یہ سب۔“ آسیہ نے اپنی ساری ہمتیں یکجا کر کے ادھر ادھر بکھرے کاغذات میں شلٹا شروع کیے تو اسے اچھے اس کی عزت و وقار نا خودداری بھرے بازار میں بیٹھا ہو گئی ہو۔ بہت ضبط کرتے کرتے بھی اس کے آنسو رخسار پر چھٹک گئے جنہیں فوراً ہی اس نے دوپٹے کے پلوں میں جذب کر لیا اور ایک آخری کاغذ جو اباجی کے ہونٹوں کے پاس پڑ پڑا رہا تھا اسے اٹھا کر کھن ہوئی تو کہنے لگی۔
 ”بابا جان۔“ میں نے کوئی کتنا نہیں کیا تھا جس پر شرمندہ ہوں۔ اور اپنی زندگی میں میں نے کسی کے ساتھ برائی کی۔ کی برائی سوچی جو میں سمجھوں کہ مجھے اسی کی سزا ملی ہے۔ اس کے برعکس آزمائش ہو سکتی ہے۔ اور آپ ہی دیکھا کرتے ہیں کہ آزمائشوں سے گھر کر قیمت کو کتنا التزام بنا صرف بڑی ہی نہیں ایمان کی کمزوری کی علامت تھی۔ اور مجھے اپنے قسمت سے کوئی لگ نہیں۔ میں اگر آنسو بہاؤں گی تو اس خیال سے کہ میں آپ سب کے لیے کچھ کا باعث بن۔“ آخر میں اس کی آواز بھرا گئی تھی۔
 ”ابا جان! جو پہلے عدیل بھائی کے غصے کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی تھیں۔ وہ اب اس کی باتوں سے الجھ رہی تھیں۔
 ”نہ کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ انہیں شاہ سکندر کی طرف سے اطمینان دلا رہی تھی پھر اب کیا ہو گیا۔“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”ننھے بھی تو بتاؤ کیا ہوا ہے؟ کیوں تم مین بیٹی کے پیچھے بڑے ہو عدیل؟“
 ”ابا جان! نے اپنی سمجھ کے مطابق عدیل بھائی کو ٹوکا تو اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے وہ کمرے سے نکل آئی اور کمرے میں آئے ہی اس نے تمام کاغذات لغاف میں ڈال کر الماری میں رکھے پھر واش روم میں بند ہو گئی۔
 ”ننھے پہلی طرح غم و اندوہ کی تصویر بن رہے سب کو اپنے لیے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ کہاں ممکن

تھا۔ وہ تو خود پر بے حسی کا خول چڑھانے میں بھی ناکام ہو گئی تھی۔ اپنی چیخوں کا گلا گھونٹ لیا مگر آنسو سارے ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔

کتنی دیر تک وہ دروازے کے ساتھ بیٹھانی نکا کر روتی رہی۔ اسے دکھ صرف اس بات کا تھا کہ وہ بچہ بچہ قیمت لگا گیا تھا۔ گویا سب کچھ پہلے سے طے تھا اور وہ اس کی جھوٹی محبت کے فریب میں آکر اپنا سب کچھ ہار چکی تھی۔

”آسیہ! میمونہ بھابی شاید کمرے میں آکر پکار رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے واٹس مین کا ٹل کھول کر پانی کے چھینے مارے پھر پوچھے سے چہرہ چھپتپاتی ہوئی نگلی تو میمونہ بھابی اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر افسوس بولیں۔

”تم اس شخص کے لیے رورہی ہو جو باقاعدہ پلان کے تحت تمہاری زندگی سے کھیل گیا اور صرف تمہارا نہیں اور بھی جانے کتنی اس کے فریب میں آئی ہوں گی۔“

”دروں کام میں کچھ نہیں کہہ سکتی مگر اپنے بارے میں مجھے یقین تھا کہ میں انمول ہوں۔“ اس کے لہجے میمونہ بھابی کو تڑپا گیا۔

”تم ابھی بھی انمول ہو۔ اور تمہیں اپنے ہر عمل سے ثابت کرنا ہے کہ شاہ سکندر جیسا لیر اپنے مقدر کا میاں ہو کر بھی تمہارا کچھ نہیں لگاؤ سکا۔“

اس کے ہونٹوں پر دکھ بھری مسکراہٹ نے ذرا دیر کو چھب دکھائی تھی جس سے میمونہ بھابی نظریں پھا بولیں۔

”خیر دفع کرو میں یہ کہنے آئی تھی کہ تم سیماء کے ساتھ اسلام آباد جا رہی ہو۔ صبح آٹھ بجے کی فلائیٹ ہے یا کر رہ گئی۔“

”یہ اچانک میرے جانے کا۔“ وہ کچھ الجھ کر دیکھنے لگی۔

”ہاجی نے کہا ہے اور میرا خیال ہے، یہی ٹھیک ہے۔ ایک تو تمہاری آب و ہوا تبدیل ہو جائے گی۔ یہاں کے حالات پر قابو پانے میں بھی کچھ آسانی ہوگی۔“ میمونہ بھابی نے کماؤ وہ قدرے تشویش سے پوچھے

”یہاں کے حالات سے کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”عدیل اور خلیل۔ تم جانتی ہو خصوصاً عدیل کو، جنہیں روتے ہوئے دیکھے گا تو جانے جوش جذبات ڈالے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم ابھی سیماء کے ساتھ چلی جاؤ کیونکہ اپنے اس دکھ کے ساتھ سمجھو اگر جنہیں بھی کچھ وقت لگے گا۔ تم اپنے آنسو چھاسکتی ہو لیکن تمہاری آنکھوں میں جو وحشت اتر آئی ہے کہ عدیل کسی طرح بھی شاہ سکندر سے بدلے لینے سے خود کو نہیں روک سکے گا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو میمونہ بھابی نے اسے کم صدمہ دیکھ کر پوچھا۔

وہ سب سن رہی تھی لیکن حرکت کرنے سے قاصر تھی۔ کوشش کے باوجود راسا اثبات میں سر نہیں میمونہ بھابی اس کا سر ہاتھ ہاتھوں میں لے کر کہنے لگیں۔

”سنو۔ اپنے آپ کو سنبھالو، ہم سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اور اتنے پیار کرنے والوں کے ذرا کبھی تنہا نہیں ہوگی۔ یہ میں تمہیں یقین دلائی ہوں۔“

اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہو کر قطرہ قطرہ میمونہ بھابی کے ہاتھوں پر گرنے لگا تھا۔

شاہ سکندر جب حویلی میں داخل ہوا تو تقریباً نصف شب بیت چکی تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے کمرے میں سو رہے تھے یا جاگ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر لاؤنج میں کھڑا رہا اور دیوار کو خود پر ہتھارت کھتا رہا پھر پوچھ بچھ نہ کر کے اپنے کمرے میں آیا تو مرنساء کو بچے کے ساتھ بے خبری کی نیند سوتے دیکھ کر اچانک بھڑک چٹھا۔

”مہر النساء!“

ہند میں بڑا کرانٹھ بیٹھی اور اپنے زور زور سے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر اسے دیکھنے لگی۔

”نہیں تو تم بھی نہیں نکل جاؤ یہاں سے اسی وقت۔“ شاہ سکندر کا اب شاید اس پر بس چل سکتا تھا۔

”کہاں جاؤں؟“ وہ سوئے ہوئے بچے پر نظر ڈال کر پوچھنے لگی۔

”جنم میں۔“ وہ دھڑا پھرواش روم کا رخ کرتے ہوئے بولا۔ ”دو منٹ میں میرا کمرہ خالی کر دو اور خبردار آئندہ

ی اجازت کے بغیر یہاں آنے کی جرأت نہ کرنا۔“

”جلی جلی جلی! تیرا باپ تو لگتا ہے پاگل ہو گیا ہے۔“ مہر النساء اس کے واٹس مین میں بند ہوتے ہی فوراً ”جلی جلی جلی“ بچے کی فڈر تھرا اس اور دوسری چیزیں سمیٹ کر باسکٹ میں ڈالیں پھر ایک بازو میں بچے کو اٹھا کر رے سے نکل گئی۔ حالانکہ وہ اس سے خائف ہونے والی نہیں تھی کیونکہ اسے سب کی حمایت حاصل تھی۔

اس وقت شاہ سکندر کی آنکھوں میں جانے کیسی وحشت تھی جس نے حقیقتاً ”اے سہادیا تھا اور اسے لگا کہ

اس کی بات سے ذرا بھی اختلاف کیا تو وہ پیچھے اس کا خون کر دے گا۔

کچھ دیر بعد شاہ سکندر واٹس روم سے نکلا تو پہلے اوہر اوہر دیکھ کر مہر النساء کے چلے جانے کا یقین کیا۔ پھر رومہ کر رے کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کے پاس سوچنے کو کچھ نہیں تھا کیونکہ وہ اپنی ساری تدبیروں میں ناکام ہو گیا تھا۔

جہاں سے چلا تھا وہیں اسی مقام پر آکر اس کے اندر غم، غصہ اور نفرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اب زندگی اسے گزارے گی کیونکہ ساری امنگیں، آرزوئیں اور زندہ رہنے کی خواہش تو وہ آسیہ کے ساتھ پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اب آگے کی زندگی اس کی نہیں ہوگی۔

”مگر ٹسٹ لگا کر بالٹونی میں نکل آیا۔ تاریک رات میں دو در در تک کہیں کوئی روشنی نہیں تھی نہ کوئی آواز“

ہوا بھی ساکت تھی اور اس کے اندر ہولناک سناٹا۔ اسے لگا جیسے اس کا دل بھی ٹھہر گیا ہو۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر اس نے دھڑکنوں کو محسوس کرنا چاہا تھا کہ اچانک اندر شور مچ گیا۔ جس سے گھبرا کر وہ کمرے میں آیا اور ٹکیوں میں منہ مچھا کر گرتا لیکن مختلف آوازیں تمام رات اسے مسلسل جھجھوٹی رہی تھیں۔

جب سارے گھر میں زندگی بیدار ہو گئی تب وہ بہت بڑھا ہوا ہو کر سویا تھا اور بس دھنسنے اس کے بعد بابا جان نے خواص کے کمرے میں آکر اسے اٹھا دیا تھا۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بہت ناراض ہوتا اور ناراض تو ابھی بھی تھا لیکن اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے خاموشی سے دیکھنے لگا۔

”رات تم کس وقت آئے؟“ بابا جان نے بیڑ پر بیٹھے ہوئے پوچھا تو اس نے فوراً ”اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں لیکن جواب قدرے تاخیر سے دیا۔

”خالیا! بارہ بجے کے بعد۔“

”پھر تو تم نے نہیں ناحق اٹھا دیا۔ تمہاری نیند بھی پوری نہیں ہوئی ہوگی۔ سو ناچا ہوتا۔“

”میں اب تو اٹھ گیا ہوں۔ آپ کہیں کوئی کام ہے؟“ وہ قصداً ”سادگی سے پوچھا کر ان کا چہرہ دیکھنے لگا جس پر

”کام تو کوئی نہیں ہے۔ بس ابھی مہر النساء نے بتایا۔ رات تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو ہم تمہیں دیکھنے چلے آئے۔“ بابا جان نے کہا تو اسے ایک دم یاد آیا کہ رات اس نے مہر النساء کو کمرے سے نکال دیا تھا۔

”مہر النساء نے غلط کہا آپ سے۔ میں رات ٹھیک ٹھاک آیا تھا۔ بس کچھ سفر کی تھکان تھی۔“

”وہ تو ابھی بھی نظر آ رہی ہے، کتنے دنوں میں اترے گی؟“ بابا جان نے اس کی سرخی مائل آنکھوں میں دیکھ کر

”نہیں نہ! کماؤ تو ابھی سمجھ کر بولا۔

”اس زندگی میں تو ممکن نہیں ہے بابا جان! کیونکہ سفر کتنے نہیں تھا اس کے برعکس بے حد و لفریب۔ جس کا

ایک مہینہ زندگی کی ضمانت ہے۔“

”ہوں۔“ بابا جان بنکارا بھر کر ادھر ادھر دیکھنے لگے جیسے اس بات کو طول نہ دینا چاہتے ہوں۔
 کرکھڑکی کے قریب گیا اور پردے سمیٹتے ہوئے کہنے لگا۔
 ”سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہو گیا۔ میں آسیر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ آیا ہوں اور میرا
 اب کبھی آپ اس کے بارے میں نہیں سوچیں گے۔ میرا مطلب ہے اسے اور اس کے گھر والوں
 پہنچانے کا خیال تک نہیں آتا چاہیے۔“
 ”ہمارے پاس ایسی فضول باتیں سوچنے کا وقت نہیں ہے سکندر حیات۔“ بابا جان ناگواری
 کھڑے ہوئے پھر جاتے جاتے بولے تھے۔

”تم ناشتے وغیرہ سے فابریغ ہو کر ہمارے پاس آنا۔ چوبداری کرم الٹی کے ڈرے پر جانا ہے تم سارے
 اس نے پردہ چھوڑ کر انہیں جاتے ہوئے دیکھا پھر سر ہٹک کر اوش روم کا رخ کیا۔ شاور لے کر
 قصداً اپنے کمرے میں رہا اس کے بعد نیچے آیا تو پہلے بی بی جان کے پاس حاضری دی پھر ان ہی کے
 نیبل پر آکر بیٹھا اور ابھی ناشتے کے لوازمات پر نظر ڈال رہا تھا کہ مہر النساء بچے کو لے کر آگئی اور آؤ
 کر سی بیچ کر بیٹھے ہوئے بولی۔

”شاہ! بابا جان کا حکم ہے کہ میرا ناشتا کھانا سب آپ کے ساتھ ہو گا۔“ وہ جو اس کی آمد سے بیٹھے
 اسے دیکھنے لگا تھا اس کی بات سن کر یوں بن گیا۔ جیسے کچھ شناسی نہیں اور اپنے سامنے پلیٹ میں ملا
 کر کھانے لگا۔

”آپ روزانہ اسی وقت اٹھو گے تو میرا کیا ہو گا۔ میں تو اتنی دیر تک بھوکی نہیں رہ سکتی۔“ مہر النساء
 نہ دینے کے باوجود بولے جا رہی تھی۔

”مجھے تو صبح اٹھنے کے ساتھ ہی کچھ کھانے کو ملنا چاہیے ورنہ مجھے چکر آنے لگتے ہیں۔ اور ہاں آپ
 میں میری کچھ چیزیں رہ گئی ہیں اگر اجازت ہو تو لے لوں۔“
 اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو قدرے توقف سے پھر گیا ہوئی۔

”مجھے آپ کی سمجھ نہیں آتی شاہ! کبھی اتنا چیختے ہو، کبھی ایک دم خاموش ہو جاتے ہو۔ اس شہر
 بھی ایسے ہی گرتے ہو یا اس کے ساتھ۔“ مہر النساء نے فوراً ”نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ کیونکہ
 کر سی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”اس شہر والی کے ساتھ اپنا موازنہ کبھی مت کرنا مہر النساء! کیونکہ تم میں اور اس میں زمین آسمان
 تم نے اپنی جگہ اس گھر میں بنائی اور اس نے میرے دل میں گھر کیا۔ اور جو دل میں گھر کر جائیں وہ فو
 نکل جائیں ان کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ یہ باتیں تمہاری سمجھ میں شاید ہی آئیں۔“ وہ تنفر سے
 گیا۔ اور مہر النساء اس کے پیچھے دیکھتی رہ گئی تھی۔

--*

سیما بھابی کے ساتھ اسلام آباد آجانے سے اسے تو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ کیونکہ وہ تو دی
 گہرائیوں میں اتر کر اس کی دنیا دیر ان کر گیا تھا۔ پھر یہ ظاہری تبدیلیاں کیا منفی رکھتی تھیں۔ اس پر
 کہیں بھی کھڑی ہو جائے اس کے اندر کا موسم نہیں بدل سکتا تھا۔ اور نہ سوچوں کے دھارے کا
 سکتے تھے۔ پھر یہاں تو اس کی سوچیں اور بے لگام ہو گئی تھیں۔ کیونکہ وہ ”فوق“ اپنی شخصیت کا
 دھیان بنانے والی میونہ بھابی یہاں نہیں تھیں اور سیما بھابی ان کی طرح نہیں تھیں۔ مگر کہ انہا
 اس کے حال پر نہیں چھوڑ دیا تھا مگر ہر وقت اس کے ساتھ لگ کر بھی نہیں بیٹھتی تھیں بلکہ جب
 ہوتیں تو کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں اور آخر میں چند جملے اسے سمجھانے اور صاف
 ہوتے۔

قلیل بھائی ان دنوں بے حد مصروف تھے۔ صبح کے گئے رات کو لوٹے اور انہوں نے ابھی تک اس کے
 بہتے کے سامنے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ جس سے اسے گمان ہوتا کہ جیسے ان کے علم میں ہی نہیں ہے۔
 اس کی ٹھیک لگ رہا تھا کہ ہر وقت اس کے سامنے اس ذکر کو چھین کر یہ احساس نہیں دلایا جاتا کہ اس کے
 لیے اس کے ساتھ ہوا ہے۔ اور جیسا کہ اس کا دل چاہتا تھا کہ کچھ وقت کے لیے اسے تنہا چھوڑ دیا جائے تو یہاں اپنے
 بھائی میرا آئی تھی۔

قلیل بھائی آفس جاتے ہوئے دونوں بچوں اشعر اور سمیہ کو ساتھ لے کر نکلتے اس کے بعد سیما بھابی بھی
 ن پندرہ منٹ اس کے پاس بیٹھتی پھر چودہ ملازمہ کے ساتھ گھر کے کاموں میں لگتی تھیں تو ذرا پہلے تک انہیں اس
 لے رہے تھے۔ کیونکہ اس دوران کبھی ان کی کوئی ملنے والی آجاتی یا اگر انہیں
 کے پاس جانا ہوتا تو آتی تھیں۔

پندرہ منٹ اشعر اور سمیہ کے آنے سے کچھ دیر کو بالکل چمچ جاتی۔ لیکن کھانے کے بعد پھر وہی خاموشی کہ سیما
 کے ساتھ بچے بھی سو جاتے تھے۔ اور اس کا سونا جانا بلکہ شاید ہونا نہ ہونا بھی برابر تھا۔ کیونکہ وہ بہت کم صم
 رہ گئی تھی۔ اس کے پورے وجود میں بس ایک ذہن تھا جہاں مسلسل درپچوں کے کھلنے اور بند ہونے کی
 زب کو بج رہی تھی۔ سارا دن اور کبھی ساری رات ان کھلتے بند ہوتے درپچوں پر نظریں جمائے جمائے اس
 انہیں تھک جاتیں پھر بھی وہ ان میں دیکھتے رہنے سے باز نہیں رہتی تھی۔ کیسی دلچسپ حقیقتیں تھیں جن پر
 کاغذ ہونے لگا تھا۔

”نچے یقین دلاؤ آس! کہ تم میری ہو چکی ہو اور اگر یہ خواب ہے تو مجھے ہمیشہ کی نیند سلا دو۔“ وہ اسے پا کر بیچ
 ہل میں نہیں رہا تھا۔

”بائیں کہیں اپنی خوبصورتی نہیں تھی اور آج مجھے ہر شے حسین لگ رہی ہے۔ اس لیے کہ کبھی بھی سمت
 نے پہلے نظر تھما رہے چرے پر پڑتی ہے۔“ اس کے لہجے کی شدتوں نے اس وقت بھی پلمپس نم کی تھیں۔
 ”تمہاری آنکھوں کی گہرائیوں میں اتر کر میں نے جانا کہ سمندر میں کتنے سیپ چھپے ہیں۔“

”سکندر حیات۔“ اس نے اپنی جگہ ہوتی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔
 ”میں جانا ہی تھا تو اتنی مختصراً بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ کچھ ایسا کرتے کہ میں تمہارے محرمے آزاد
 باتیں اب دل کو کیسے سمجھاؤں کہ وہ سب فریب تھا۔ تم نے کبھی محبت کی ہی نہیں تھی۔ جب ہی تو میرے دل کی
 باجاؤ کر۔“

”آس! قلیل بھائی کی آواز پر اس نے چونک کر آنکھوں سے ہاتھ ہٹائے اور اٹھنے لگی تھی کہ وہ کمرے کے
 راتے ہوئے پہلے پھلے انداز میں بولے۔
 ”کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ دزدیدہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی جو جانے کسی چیز کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے
 تھا۔ یوں ہی پھر پھر اس کے سامنے آرام سے بیٹھے ہوئے بولے۔
 ”تمہارے ساتھ چائے پینے کا موڈ ہو رہا تھا۔“

”میں ابھی لاتی ہوں۔“ وہ اٹھنے لگی کہ روک کر بولے۔
 ”میں نہیں۔ تم آرام سے بیٹھو۔ میں سیما سے کہہ کر آیا ہوں۔ وہ لا رہی ہیں۔“ وہ سر جھکا کر اپنے ناخن دیکھنے
 نے سارا مینہ بہت مصروفیت میں گزرا۔ ”قدرے توقف سے قلیل بھائی اسے مخاطب کیے بغیر اپنے آپ
 ”تمہارے تمہارا حال احوال پوچھنے کا وقت بھی نہیں ملا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک رہتی ہے نا؟“

”جی۔“

”بیٹا! خوش رہا کرو۔ زندگی میں کرانسیس آتے ہیں۔ ان پر رونے کڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ سمجھتا کہ تمہیں کچھ سمجھانے کی ضرورت ہے کیونکہ تم خود بہت ذہین ہو۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، بھول جانا ممکن نہیں ہے، لیکن یہ تو کر سکتی ہو کہ اسے خود پر طاری مت کرو اور یہ سوچ لو کہ اس میں تمہارے ہونے کی کیا وجہ تھی؟“

”کھلیں بھائی نے بہت نرمی سے بات شروع کی تھی کہ سیمابھائی چائے لے کر آئیں۔“

”بھٹو سیمابھائی! تم بھی بھٹو میں آئیے۔ بات کر رہا ہوں۔“ انہوں نے ٹرے میں سے چائے کا کپ اٹھا کر کہا پھر کچھ دیر خاموشی سے چائے پینے کے بعد کہنے لگے۔

”جو کچھ ہو گیا، میں اس پر بات نہیں کروں گا کیونکہ مجھے پلٹ کر دیکھنے کی عادت نہیں ہے۔ اتنا تو تمہیں آئیے! آخر میری بہن ہو۔“

اس نے چائے کی پیالی میں سے اٹھتی بھاپ سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا اور بس ذرا سا مسکرائی تھی۔ ”اور میں تمہارے گزرے کل کے بارے میں بھی سوچنا نہیں چاہتا۔ البتہ آنے والے کل کو ضرور اور تمہیں بھی اسی کی فکر کرنی ہے۔ کیا عمر ہے تمہاری۔ بائیس تیس سال، اور آگے پہاڑی زندگی ہے؟“

”ایک سال بھی میں تمہیں شاہ سکندر کے نام پر گنواؤں کی اجازت نہیں دوں گا۔ یہ اتنے سارے دن قصداً تمہیں نہیں چھیڑا کہ اپنے لیے یہ تم جتنا رو سکتی ہو رو لو۔ آج کے بعد تمہاری آنکھوں میں ایک اس شخص کے نام کا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ مرا نہیں ہے۔“ شلیل بھائی کے کھمرے ہوئے لہجے میں تبصرہ تھا۔

اس کے ساتھ سیمابھائی بھی کانپ گئی تھیں۔

”تمہیں میں نے اسی لیے اپنے پاس بلا لیا ہے کہ وہاں اماں جی ہر وقت رونا دھونا مچا کر یہ احساس ہوتا ہے کہ تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہوا، قسمت خراب ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے یہ سب باتیں پسند نہیں ہیں۔ اس پر اس سے جانے کا سوچنا بھی نہیں۔ چاہو تو ہمیں کسی ہاسپتال میں جا کر لو لگے ابھی کچھ عرصہ آرام کرو۔ اچانک خیال آیا تھا جو آرام کا کہہ کر غالباً اس کی ڈیوری تک ٹال دیا۔ تو سیمابھائی اسے دیکھ کر بولیں۔“

”ہاں ابھی تو یہ خود مریض لگ رہی ہے۔“

”پھر بھی تم اس کا خیال نہیں کر رہیں۔ کتنے دن ہو گئے اسے یہاں آئے ہوئے، ایک بار بھی ڈاکٹر نہیں لے گئیں۔ صبح پہلا کام یہی کرنا۔ ڈاکٹر جہاں آرا کا کلینک قریب ہی ہے۔“ انہوں نے بیوی کو ٹوک کر کہا۔

”جناب میں کئی بار اس سے کہہ چکی ہوں۔ یہ صاف منع کر دیتی ہے۔“

”اب منع نہیں کرے گی۔“ کھلیل بھائی کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے پھر گھڑی دیکھ کر بولے۔

”صبح میں چھٹی کروں گا۔ مجھے جلدی مت اٹھانا۔“

”خیریت؟“ سیمابھائی نے خالی کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے پوچھا لیکن وہ ان سنی کرتے کرتے گئے۔

”آپ بھی سوئے جا رہی ہیں؟“ اس نے سیمابھائی سے یونہی پوچھ لیا۔

”کو تو نہیں سوتی۔“

”نہیں نہیں، آپ سوئیں۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔“ وہ کہتی ہوئی اٹھ کر بیڈ کی چادر ٹھیک کر کے بھابھی جاتے جاتے رک کر بولیں۔

”مسو، تمہارے بھائی جان نے جو کہا۔ ٹھیک کہا تمہیں ان کی باتوں پر عمل کرنا ہے۔ اور ہاں ایک بار سیمابھائی کو جانے کیا یاد آیا، ہاتھوں میں پکڑی ٹرے دوبارہ ٹھیل پر رکھ کر اس کے قریب چلی آئیں اور

بڑا کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہنے لگیں۔

”کچھ نہیں جویات کہنے جا رہی ہوں، وہ ہو سکتا ہے تمہیں ناگوار گزرے، لیکن میرے خلوص پہ شبہ نہیں کرنا۔“

”نیکوئی تمہاری بہتری سوچ کر کہہ رہی ہوں کہ شاہ سکندر کی اس نشانی کو مٹا ڈالو۔“

”بھابھی۔“ اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر انتہائی تاسف سے انہیں دیکھا تو وہ اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بھانے ہوئے کہنے لگیں۔

”میرا یہی مشورہ ہے۔ آگے تمہاری مرضی، لیکن سوچنا ضرور کہ آئندہ زندگی میں اس آنے والے بچے کا کیا کردار ہوگا۔ ٹھیل کا حال تم نے دیکھا ہے۔ ماں باپ یا دونوں میں سے کسی ایک کے نہ ہونے سے بھی بچہ بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ خصوصاً ماں باپ کی علیحدگی سے۔ پھر تم اپنے بارے میں سوچو، ابھی تم کہہ سکتی ہو کہ

نہاری زندگی میں اب کوئی موڑ نہیں آئے گا لیکن دو تین سال گزرنے دو۔ تم خود اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکو گی اور اس وقت یہی بچہ تمہارے لیے سب سے بڑی پر اہم ہوگا۔ تمہارے دروازے پر خوشیاں دستک دیں گی اور تم بچے کو دیکھو گی۔ تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم ابھی۔۔۔“ اپنے ہاتھوں پر اس کے آئو گرتے دیکھ کر سیمابھائی خاموش ہو گئیں پھر گہری سانس کھینچ کر اٹھتے ہوئے بولیں۔

”یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب تو نہیں تھا۔ لیکن آنے والے وجود سے کیونکہ اسی وقت چھٹکارا ممکن ہے۔“

یہ لے کر مجھے تمہارے سامنے کچھ حقائق رکھنے پڑے اور ان سے نظریں چرانے کی حماقت مت کرنا، پھر شاہ سکندر کی جب تمہارے ساتھ لیٹو نہیں تھا تو اس کی نشانی کو گلے لگا کر کیا کر سکتی؟“ سیمابھائی نے رک کر اسے دیکھا

دراپنی بات کا کوئی رد عمل ظاہر نہ ہونے پر شبہ بھیر کھتی ہوئی ٹرے اٹھا کر چلی گئیں۔

اس کی آنکھوں سے جھری لگ گئی تھی۔ کتنی دیر وہ اسی جگہ بیٹھی اپنی ہتھیلیاں تر کرتی رہی جبکہ اس کا ذہن کسی ایک بات کو بھی قبول نہیں کر رہا تھا۔

اور اگلے روز ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے سیمابھائی نے راستے میں اس سے پوچھ لیا تھا کہ اس نے بچے کے بارے میں کیا سوچا ہے تو وہ رمان سے بولی تھی۔

”میں اس بچے کا خون نہیں کر سکتی بھابھی! جس کا خیال ہی مجھے زندہ رہنے پر آسکتا ہے۔ میری زندگی اسی کی ہون منت ہے۔ اگر میں نے اپنے وجود کے اندر اسے محسوس نہ کیا ہو تو خود اس کی قسم اسی روز مرگئی ہوتی جس روز سکندر کے کپانے کا لہو میری عزت و وقار کی بو جھپاں اڑائی تھیں۔“

اور آپ تو خود ہاں میں بھابھی! آپ نے ایسی بات کیوں کی۔ یہ کیوں نہیں کہا کہ میری تاریک راہوں میں یہی ایک کرن ہے جس کے لیے مجھے سارے دکھ بھلا کر نئی زندگی جینا ہے۔“

”تو بے گویا، تمہیں نئی زندگی جینا ہے۔“ سیمابھائی نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

”ہاں اور اس نئی زندگی میں میرے ساتھ میرا بچہ ہوگا۔ میں نے کھلیل بھائی کی بات مان لی ہے۔ میں اب کبھی پلٹ کر نہیں دیکھوں گی۔ خود روؤں گی نہ اپنے ساتھ کسی اور کو لاؤں گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔“ وہ بڑے نرم سے بول رہی تھی۔ سیمابھائی کچھ حیران ہو کر اسے دیکھ گئیں۔ ایک ہی رات میں وہ کتنی بدل گئی تھی۔

سیمابھائی کے ساتھ گھر کے کام کاج میں حصہ لینے لگی تھی اور اشعر سمیہ کے لیے بھی وہ ان کی پہلے والی پوچھ بچھ مانتی تھی۔ انہیں ہوم ورک کروانی پھر پھوٹے موٹے گیمز اور رات میں سمیہ کو اپنے ساتھ سلا کر اسے بڑوں کی کہانیاں سناتی۔ یوں بہت حد تک اس کا دھیان بٹ گیا تھا۔ اور جو وقت تھائی کا ہو تو اس میں وہ اپنے آنے والے کل کے بارے میں سوچتی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ گزرے کل سے اس کا بالکل ناٹوٹ گیا تھا۔ وہ تو اس کی زندگی کی ایسی چٹائی تھی جس کا اس کے خیال میں گزرتا وقت بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ بس وہ خود ہی پلٹ کر

دیکھنے سے گھبراتی تھی کہ کہیں پتھر کی نہ ہو جائے۔

بہر حال اسے اسلام آباد آئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ اس دوران کراچی سے جب بھی فون آیا۔ ٹھیکر بھائی سہما بھائی نے اس کے کہنے پر بھی اسے کسی سے بات نہیں کرنے دی تھی۔ خود ہی اس کی خبر پتہ بتانے کے لیے اس کی طرف سے پورا اطمینان دلا دیتے تھے۔ یہ احتیاط انہوں نے صرف اس لیے کی تھی کہ کہیں اماں جی انڈیا میں اس کے زخموں کو نہ چھیڑ جائیں۔ جنہیں بھرنے میں وقت سے زیادہ ان کی کوششوں کا دخل تھا۔ اسی کی خاطر دونوں میاں بیوی نے اپنی وہ تمام سرگرمیاں ترک کر دی تھیں جن میں وہ شامل نہیں ہو سکتی تھی اور زیادہ اس کے ساتھ یوں گزارتے کہ اسے یہ احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ کوئی اپنا کام چھوڑ کر اس کے پاس آ بیٹھا۔ اس کے باوجود اب اسے اماں جی اور اباجی کی یاد آنے لگی تھی۔ جن سے وہ بھی اتنے دن دور نہیں رہی مگر وہ ٹھیکر بھائی کے پاس بیٹھ کر بہت عاجزی سے بولی تھی۔

”بھائی! میں اماں جی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔ وہ مجھے بہت سی یاد آ رہی ہیں اور اباجی بھی۔“

”یاد آ رہے ہیں بیٹا تو فون کر لو جانا ضروری ہے کیا؟“ انہوں نے بڑے آرام سے مشورہ دے کر پوچھا۔ ”مگر آپ ضروری نہیں سمجھتے تو ٹھیک ہے، فون کر لیتی ہوں۔“ اس نے کچھ اتنی مایوسی سے کہا کہ ٹھیکر بھائی اس پر رحم آ گیا۔

”فون منع نہیں کر رہا بیٹا! اصل میں میرا ارادہ اماں جی اور اباجی کو کچھ دنوں کے لیے یہاں بلانے کا ہے۔ تو جاؤ گی تو پھر وہ آنے کے لیے مشکل ہی سے تیار ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے پھر میں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔“ اس نے فوراً کہا تو ٹھیکر بھائی اسے دیکھ کر سنجیدگی سے پوچھنے لگے۔

”تم اپنے جانے کی بات کیوں کرتی ہو۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف ہے؟“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”پھر پھر کیوں جانا چاہتی ہو؟“ وہ جانے کیا جانا چاہتے تھے۔

”آپ کیوں چاہتے ہیں کہ میں آپ کے پاس رہوں؟“ اس نے بہت ہمت کر کے ان سے سبب پوچھا تو وہ در خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ انداز ایسا تھا جیسے اس کے ذہن تک رسائی حاصل کر رہے ہوں پھر مدد مطمئن ہو کر بولے۔

”اس کی کئی وجوہات ہیں۔ جو میں ابھی بتانا نہیں چاہتا۔ بس اتنا سن لو کہ تمہاری بہتری اسی میں ہے۔ اماں اور اباجی آجائیں تو میں ان سے بھی یہی کہوں گا کہ تمہیں یہیں رہنے دیں۔ اور بیٹیا یہ بھی تمہارا اپنا گھر ہے۔ خلیل بھائی اور عدیل ہیں تو یہاں میں ہوں یا تمہیں ان بھائیوں سے زیادہ محبت ہے؟“ آخر میں ان کے ہچکے انداز پر وہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔

پھر تیسرے دن ہی اماں جی اور اباجی آگئے تو ایک تو وہ پہلے ہی کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ ان کے سامنے خود کو مطمئن اور پرسکون ظاہر کیا۔ اس کے باوجود اماں جی اسے دیکھتے ہی رونے لگی تھیں۔ جس پر ٹھیکر بھائی خاصے انجان بن کر اس سے پوچھنے لگے۔

”آسیہ! یہ اماں جی کو کیا ہوا ہے، کیوں رو رہی ہیں؟“

”پتا نہیں بھائی۔“ وہ سٹپٹا گئی۔ ”میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی۔“

”اماں جی! آسیہ بہت خوش ہے۔ آپ اس طرح نہیں کریں ورنہ میں اسے یہاں سے بھی دور بڑے بھائی پاس بھیج دوں گا۔“ ٹھیکر بھائی نے قدرے خشکی سے کہا تو اماں جی اپنے آنسو دھپے میں جذب کرتے ہو بولیں۔

”کہیں نہیں جائے گی یہ، میں اسے اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔“

ٹھیکر بھائی نے اس وقت کوئی تکرار نہیں کی اور اٹھ کر چلے گئے۔ تب وہ اماں جی کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے

بولے۔ ”آپ روئیں نہیں اماں جی! میں آپ کے ساتھ چلوں گی لیکن ابھی آپ ٹھیکر بھائی کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں کریں، وہ ناراض ہوتے ہیں اور ٹھیک ہی ناراض ہوتے ہیں، جب اللہ نے آپ کو ان جیسے لائق و فرمانبردار بیٹوں سے نوازا ہے تو پھر آپ کو روئے اور فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ انہیں یہی بات تکلیف دیتی ہوگی کہ ان کے ہوتے ہوئے آپ پریشان ہوتی ہیں۔“

”آسیہ ٹھیک کہہ رہی ہے اماں جی۔“ سہما بھائی اس کی تائید کرتے ہوئے بولیں۔

”روئے وہ ہیں جنہیں آگے اندھیرا نظر آتا ہے۔ آپ کو اللہ نے ماشاء اللہ بہت نوازا ہوا ہے۔ آپ کو آسیہ کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بھائی کبھی اس سے غافل نہیں ہوں گے۔“

”میں جانتی ہوں، بھائی اس کا بہت خیال رکھنے والے ہیں لیکن۔“ اماں جی جانے کیا کہنے جاری تھیں کہ اسے کچھ کر ایک دم خاموش ہو گئیں اور اس نے اپنے آپ سوچ لیا تھا۔

”لیکن وہ ان نہیں دے سکتے جو ایک عورت کو اپنے گھر پر شوہر ہوتا ہے۔“

یوں کہتے بہت سارے دن گزر گئے۔ اباجی کچھ دن بعد ہی واپس چلے گئے تھے اور اماں جی اس کے لیے وہیں رک گئیں کیونکہ ٹھیکر بھائی کسی طرح اسے کراچی بھیجنے پر تیار نہیں ہوئے تھے۔ پتا نہیں انہوں نے اس کے لیے کیا سوچ لیا تھا اور جانے اماں جی سے کیا کہا کہ اب وہ بھی کبھی کہتی تھیں کہ اسے یہیں رہنا چاہیے۔ اور اس نے ابھی تک کسی سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا۔ سب سن کر خاموش رہتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

وہ اپنے بارے میں بہت کچھ سوچتی رہتی تھی اور خاموش یوں تھی کہ ابھی اپنی کسی سوچ پر عمل کرنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ کیونکہ اس کی ڈیوڑھی قریب تھی۔ اور ان دنوں وہ اپنے آپ کو چھپائے پھرتی تھی۔ خصوصاً ٹھیکر بھائی کے سامنے جانے سے بہت کڑائی اس لیے ان کے ساتھ بیٹھ کر بات کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ورنہ اس کے اندر خاصی بے چینی تھی۔ یعنی جانا چاہتی تھی کہ وہ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں جو اس کے کراچی جانے کا تہی تیغی سے منع کر دیتے ہیں۔ کئی بار اس نے اماں جی سے پوچھا لیکن ان کے جواب اسے مطمئن نہیں کر سکتے تھے۔ جس سے وہ سمجھ گئی کہ انہیں بھی اصل بات معلوم نہیں ہے۔ بہر حال اب زیادہ دن نہیں تھے اس نے سوچ لیا ڈیوڑھی کے بعد وہ خود ٹھیکر بھائی سے بات کرے گی۔

~~*

شاہ سکندر نے جس زندگی سے فرار کی خاطر گھر بار چھوڑا تھا۔ شاید وہی اس کا مقدر تھی۔ اور اس بات سے سمجھتا کرتے ہوئے اگر اسے کچھ تھا تو صرف اس بات کا کہ وہ اس لڑکی کو اجاڑ آیا تھا۔ جس نے اپنے دل کی بستی کی عمرانی اور تمناؤں سے سوچنی تھی۔ اس کے لیے وہ خواب و خیال نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی کیونکہ اس کی سنگت میں لڑکا ایک لمحہ اس کے دل پر رہ گیا تھا۔ اور اس نے اپنے جینے کے لیے یہی سزا تجویز کی تھی کہ باقی ماندہ حیات انہی لمحات کے سارے تمام کرے گا، لیکن یہاں مر النساء تھی۔ جس روز اسے معلوم ہوا کہ وہ دوسری عورت شاہ کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکال دی گئی ہے تو نہ صرف وہ مطمئن ہو گئی بلکہ اس خیال سے کہ اب شاہ صرف اس کا ہے۔ اس کا رویہ بھی بدل گیا تھا۔

پہلے وہ اس کی رہبات پر تھلا کر جھٹک دوسری عورت کا طعنہ دیتی اور کسی طرح اپنے تنفر کو چھپا نہیں سکتی تھی۔ لیکن اب وہ بہت محتاط ہو گئی تھی۔ شروع کے دو مہینے اس نے شاہ سکندر کو بظاہر اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا لیکن اس کے اندر وہ شب سے غافل نہیں رہی تھی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ وہ شکست خوردہ ہے اور کسی بھی وقت نوٹ کر

اس کی بانہوں میں اُگرے گا۔ اس وقت اسے سہارا دے کر وہ اگر اسے اپنا نہتا سکی تب بھی اس کی توہن ہو گی۔ یعنی اس کی وہی سوچ تھی۔ جیتوں تو تجھ پاؤں ہاروں تو پتا تیری۔

پھر ہڑی بھا بھی نے اسے سمجھایا تھا کہ مرد زیادہ عرصہ عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا، اس لیے بھی وہ زیادہ ہو گئی تھی کہ کہیں وہ کسی اور راستے پر نہ چل نکلے۔ کہ ایک عورت کے چنگل سے نکلنا تو بابا جان کے لیے ہو سکتا تھا لیکن غلط راستے پر نکلے ہوئے قدموں میں وہ بھی زخمی نہیں ڈال سکتے تھے۔ جب ہی شاہ سکندر کے حال پر چھوڑنے کے باوجود وہ اس کے روز و شب پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھی۔

گو کہ شاہ سکندر نے آتے ہی اسے اپنے کمرے سے یہ دخل کر دیا تھا پھر بھی رات میں جب تک وہ سو کسی نہ کسی بہانے اس کے کمرے کے چکر لگاتی رہتی تھی۔ کبھی اس کے پریش کیے ہوئے ٹکڑے لٹا کر رکھنے کے بہانے، کبھی بیڈ کی چادر تبدیل کرنا۔ کسی وقت بچے کو اس کے دروازے پر چھوڑ کر پھر اسے اٹھا بہانے آجاتا اور آخر میں دودھ کا گلاس رکھنا تو بہت ضروری تھا۔

اس وقت وہ بچے کو اس کے پاس بھیج کر خود شہر بانو کے پاس آ بیٹھی تھی۔ جس کی دواہ کی پچی جانے کس کا باعث درد کر بیان ہو رہی تھی۔

”اُناؤ مجھے دو۔“ اس نے شہر بانو کی گود سے پچی اپنی گود میں لے لی اور ادھر ادھر سے چیک کرنے کے بعد

”اسے ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ جیراں سے کھو، جلدی سے تیل گرم کر کے لائے۔“

شہر بانو فوراً ”ٹھ کر جلی گئی اور جیراں سے کہہ کر فوراً“ واپس بھی آئی تو وہ اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”میشر کہاں گیا اس کمرے کا؟ اتنی سردی میں تم نے پچی کو بغیر ہٹ کر سلا یا ہوا ہے۔“

”خراب ہو گیا تھا۔ میں نے غلام علی سے کہا بھی کہ آج ہی آج ٹھیک کر لے آتا لیکن۔“ شہر بانو دواہ

جگہ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”غلام علی تو بس۔“ مہر النساء نے سر جھٹکا پھر جیراں کے آنے پر پچی اس کی گود میں دے کر بولی۔ ”اس کے

پر اچھی طرح مالش کر کے لیٹ دو۔ ٹھنڈ لگ گئی ہے اسے۔“

شہر بانو کچھ دیر جیراں کو بچی کی مالش کرتے ہوئے دیکھتی رہی پھر اس کی طرف متوجہ ہو کر پوچھنے لگی۔

”تمہارا آغا کہاں ہے؟“

”اپنے باپ کے پاس۔“ مہر النساء اپنے اوپر لحاف کھینچتے ہوئے بولی۔ ”اب تو شاہ خود بھی اسے بلانے

پہن۔“

”اور تمہیں؟“ شہر بانو نے شوخ و معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا تو وہ آہ بھر کر بولی۔

”میری ایسی قسمت کہاں، مجھے تو دیکھتے ہی منہ موڑ لیتے ہیں۔“

”ارے ایسے ہی تمہیں ستانے کو کرتے ہوں گے ورنہ تم سے منہ موڑا جاسکتا ہے بھلا۔ تمہاری صورت ہی تو انہیں کھینچ لاتی ہے۔“ شہر بانو نے اس کی ٹھوڑی پھوڑ کر کہا۔

”اچھا۔“ وہ ذرا سانس ہی پھرنی کو دیکھ کر کہنے لگی۔

”تمہاری بیٹی اب سکون سے سو گئی ہے۔ اسے کبیل کے اوپر لحاف بھی اوڑھا دیتا۔ میں صبح غلام علی کے

گئی۔ کوئی کام کر کے نہیں دیتا۔“

”حالانکہ میں نے اسے بہت تاکید کی تھی لیکن شاید وہ بابا جان کے کسی کام سے چلا گیا تھا۔“

”یہ کام زیادہ ضروری تھا۔ وہ خود نہیں جاسکتا تھا تو کسی اور سے کہہ دیتا۔“ مہر النساء کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چھامیں چلتی ہوں“ آغا کو دیکھوں سو یا کہ نہیں۔ بہت شرارتی ہو گیا ہے۔“

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”میں اس کا ہے۔“ شہر بانو نے کہا تو وہ گردن اکڑا کر بولی۔

دیکھنے کے بجائے پلکیں موند لیں۔ مبادا وہ اس کی آنکھوں میں گئے دنوں کا کوئی عکس دیکھ لیں۔
 ”آسیہ! سیما بھابی نے اس کا چروا غنی طرف موڑا۔
 ”تم ٹھیک تو ہونا؟“ وہ کوشش سے مسکراتی تھی۔

”مگر ہے سب نارمل ہو گیا۔ بہت مبارک ہو۔ ماشاء اللہ گڑیا جیسی بیٹیاں ہیں۔ میں اماں جی کو بتاتی ہوں۔
 پریشان بیٹھی ہیں۔“ سیما بھابی اس کا گال تھپتی لیبر روم سے نکل گئیں تو وہ پھر بچیوں کو دیکھنے لگی جنہیں
 نسلانے کے ساتھ جانے کون سی زبان میں کیا کیا بولے جا رہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں رہی تھی پھر بھی اس کے
 پر مسکراہٹ پھیلنے چلی گئی۔

”آج کا زمانہ میں بے بی اچھا ہے۔“ سسڑا سے اپنی طرف دیکھتے پتا کر کے گئی۔
 ”بہت سکھ دیتا ہے اور بابا لوگ خالی پریشان کرتا ہے۔ ساری زندگی مدراس کے لیے دکھ جھیلتا رہا اس
 نہیں ہوتا۔ بے بی لوگ بہت احساس کرتا اور پیار بھی بہت کرتا۔ تو تمہارا بے بیز تیار ہو گیا۔ ان کا
 ہے؟“ آخر میں سوال غیر متوقع تو نہیں تھا لیکن اچانک تھا۔ جب ہی اسے جواب دینے میں کچھ دفت لگا
 ”وہاں ہر ہوتے ہیں۔“

”پھر تمہارا انعام گیا۔ اتنا بار انون بے بیز کا خوشخبری سنا کہ ہم تمہارے پسند سے بہت انعام لیتا۔“
 ”وہ تم مجھ سے لے لیتا، سہتے مجھے کرے میں تو پچھاؤ۔“ اس نے کہا تب ہی سیما بھابی آگئیں ان کے
 جہاں آرائشیں اور ان کے کپڑے سسڑا سے اسٹریچر پر ڈال کر کرے میں لے آئی۔
 وہ بیڈ پر لیٹی تب اماں جی کو دیکھنے لگی جو کونے میں جا کر نماز پڑھتی تھیں اور جب فارغ ہو گئیں تب
 کہیں آئیں اور دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر پہلے پھونک ماری پھر کہنے لگیں۔

”تمہاری پیدائش پر میں بہت خوش ہوئی تھی اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھی کہ اللہ میری بیٹی کو بہت
 سعادت مند بناتا۔ تم واقعی نیک اور سعادت مند ہو۔ مجھے کبھی تم سے کوئی شکایت نہیں ہوئی نہ تمہارے
 سے کبھی میرا دل دکھا بلکہ تمہاری ذات سے میں نے بہت سکھ پائے ہیں اس کے باوجود میں تمہاری
 لیے ایسی دعا نہیں مانگوں گی کیونکہ نیکی اور سعادت مندی میں صرف تمہارے لیے سکھ ہے انہیں کیا۔
 اسے اپنے وجود پر بھی نعمتی چیزیں مل رہی محسوس ہونے لگی تھیں۔ جانے اماں جی کیا کہنے جا رہی
 ”دعائیں بھی رانجیگاں نہیں جانتیں۔ ضرور قبول ہوئی ہیں۔“ قدرے توقف سے اماں جی پھر گویا ہو
 ”کل تک میں اپنی دعاؤں کی قبولیت پر بہت خوش ہوئی تھی کہ تمہارے لیے میں نے جو مانگا ہوا
 اب احساس ہو رہا ہے کہ پورا تو بے شک ہوا لیکن اس میں تمہارے لیے کیا تھا۔ سارے سکھ تو میرے
 آگئے۔ تم تو۔“ اماں جی کی آواز حلق میں کہیں انک گئی۔

”اماں جی۔“ سیما بھابی جانے کب ان کے پیچھے آکھڑی ہوئی تھیں۔ ویرے سے ان کے کندھوں
 کر بولیں۔
 ”آسیہ کو آرام کرنے دیں۔“
 ”تمہاری بیٹیوں کے لیے پتا ہے میں نے کیا مانگا ہے؟“ اماں جی سیما بھابی کو روکنے کا اشارہ
 لگیں۔

”اللہ ان کے نیک نصیب کرے۔ ساری زندگی خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولیں۔“
 ”آمین۔“ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی تھی۔
 ”بے بیز آگئیں۔“ سسڑوں بانڈوں میں بچیاں دبائے اندر آتے ہوئے بولی۔
 ”ان کا دادی کہاں ہے؟ ہم بے بیز اس کو دے گا اور اپنا انعام لے گا۔“

”یہ ان کی ثانی اماں ہیں۔“ سیما بھابی فوراً ”اماں جی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولیں۔
 ”بے بیز ان کی گود میں دو اور انعام مجھ سے لو۔“

”ہم اللہ۔“ اماں جی فوراً دوسرے بیڈ پر جا بیٹھیں اور دونوں بیٹیوں کو گود میں بھر کر بہت شوق سے باری باری
 بن کر دیکھنے لگی تھیں۔
 ”کوئی فرق نہیں ہے اماں جی! بالکل ایک شکل ہے۔ سیما بھابی! سسڑ کو فارغ کرنے کے بعد اماں جی کے پاس
 بیٹے ہوئے کئے لگیں۔

”دوسرا رنگ میں ہی فرق ہوتا وہ بھی نہیں ہے۔ آسیہ تک پہچاننے میں غلطی کرے گی۔ ہے ناں۔“
 ”ہاں ابھی تو ایک جیسی لگ رہی ہیں بڑی ہوں گی تو شاید ایک ایک پر اور دوسری۔“ اماں جی ایک دم خاموش
 رہیں تو سیما بھابی بات بدلتے ہوئے کہنے لگیں۔
 ”آسیہ کو بھوک بھی لگ رہی ہوگی۔ میں نے ٹھیک کو فون کر دیا ہے، وہ اشعر اور سمیدہ کو اسکول سے لیتے ہوئے
 وری آ رہے ہیں۔ ان سے میں نے سوپ اور بسکٹ وغیرہ لانے کو کہا ہے باقی پھر میں ابھی ان کے ساتھ کھڑا ہوں
 اپنا نظام کروں گی۔“

”کتنے دن رہے گی آسیہ یہاں؟“ اماں جی نے پوچھا۔
 ”اکڑ دن دن کہہ رہی ہیں، خیر کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ گھر قریب ہے، میں پیدل آ جا سکتی ہوں۔ میرا
 نا ہے بچے آگئے۔“ سیما بھابی کو ریڈر میں اشعر کی جھلک دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں پھر دروازے تک جا کر اشعر
 کا رونا سنا ”ہی اشعر اور سمیدہ آگئے ہوئے آگئے۔“

”آرام سے آرام سے، شور بالکل نہیں۔“ سیما بھابی نے پلٹ کر انہیں تنبیہ کی پھر شوہر کے ساتھ اندر آئی
 ٹھیک بھائی نے بیٹھے ہی پہلے اس کا حال احوال پوچھا پھر بچیوں کو دیکھتے ہوئے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ
 پائی گی۔ خاصے محفوظ انداز میں گویا ہوئے۔
 ”مجھے تو کل کی بات لگتی ہے۔ آسیہ اتنی سی تھی۔“

”تب تو ایسے کہہ رہے ہیں بھائی! جیسے مجھ سے بہت بڑے ہوں۔“ کتنی دیر بعد اس کی خاموشی ٹوٹی تھی۔
 ”بڑا تو ہوں ناں اور مجھے یاد ہے، میں تمہیں ایسے ہی دیکھ رہا تھا جیسے اب میرا بیٹا دیکھ رہا ہے۔“ انہوں نے نحی
 ڈپا پٹکے اشعر کا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! اسے ہم گھر لے جائیں گے۔“ سمیدہ کی خوشی دینی تھی۔
 ”ہاں بیٹا! دونوں کو لے جائیں گے ایک آپ کے لیے۔“
 ایک مری۔ ”اشعر بول پڑا تو سیما بھابی ہنسنے ہوئے کہنے لگیں۔

”تو پھر کھانا فائدہ تو ابھی سامنے آگیا، ورنہ اشعر اور سمیدہ میں ابھی لڑائی شروع ہو جاتی۔“
 ”پھر خاموشی سی ہو کر ایک ایک کا چرو دیکھنے لگی تھی۔ سب خوش تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنے بچتے
 بچوں کی پیدائش پر خوش ہوتی تھی۔ پھر بھی اسے اپنے اندر گہری خاموشیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ دل چاہا ہر
 نرسے آنکھیں اور کان بند کر لے۔ نہ شوق کھلکھلاتی ہنسی کی آواز سنائی دے، نہ کھلتے چرے نظر کے سامنے

”تیرے! سیما بھابی اچانک اسے پکار کر بولیں۔
 ”تمہیں بی بی کا نام تم نے تجویز کیا تھا، تمہاری ایک بیٹی کا نام میں تجویز کروں؟“
 ”نہ نہ! بات میں سر ہلا دیا تو سیما بھابی نے پہلے اپنے پالوں سے پن نکال کر سمیدہ کی آنکھوں سے ذرا سا

کا جل چرایا اور اس سے ایک بچی کے گال پر ہونوں کے قریب مل رہا تھا ہونی بولیں۔

”اس کا نام صاحت ہے۔“
 ”صاحت“، ٹھیک بھائی نے دہرایا پھر آسہ کو دیکھ کر بولے۔
 ”دوسرا نام تم بتاؤ۔“

”مدحیہ۔“ وہ بے اختیار بولی تھی اور یکنخت ہی اندر کی خاموشیوں میں محسوس ہوا تھا کہ اس نے گہرا پرانور رکھ لیا۔

”چلو بھئی۔“ آسہ کو سونے دو، اماں جی! میں بچوں کو کھانا کھلا کر پھر آپ کے لیے لے آؤں گی جب بسکٹ وغیرہ لیں۔ چلیں ٹھیک۔“ سیما بھائی بھی یہی سمجھیں وہ سونا چاہتی ہے جب ہی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور ان سب کے جاتے ہی ایک دم خاموشی چھا گئی تھی، لیکن اب اس کے اندر ہلکا شور تھا۔ اماں جی! اسے بسکٹ کھلا کر سوپ پلایا اس کے بعد سونے کا کہہ کر اس نے کبل سر تک کھینچ لیا۔ اور پلکار مارے، بندھادیئے تھے۔

”میری کوئی بہن نہیں ہے، شاید اس لیے مجھے بیٹی کی خواہش ہے اور پھر مجھے بیٹیاں اچھی بہت لگتی تھیں۔“
 ”اس کی دلی آرزو پوری ہوئی تھی، لیکن اس پر جیسے خوشی کے اظہار کے رائے تھے۔“

اپنی بچیوں کو دیکھ کر وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اس کی زندگی میں اجالوں کی نوید لے کر آیا، کون کیا سمجھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی دماغی حالت پر شبہ کیا جائے۔ وہ خود ترسی کا شکار ہو رہی تھی اور جتنے دن وہ کلینک میں رہی اس کی یہی کیفیت تھی البتہ جس روز کلینک سے ڈسچارج ہو کر گھر آئی پہلی بار اس نے دونوں بچیوں کو بانڈوں میں بھر کر سینے سے لگایا تو اسے لگا جیسے وہ ابھی ماں بنی ہے احساس تھا، سرشاری تھی اور جیسے وہ دنیا کی مضبوط ترین عورت بن گئی تھی کہ اب شاہ سکندر اور اس ہزاروں لاکھوں مل کر بھی اسے اس کے مقام سے ہلا نہیں سکتے تھے۔ نہ ساری دنیا کی دولت کے ٹو مرتبے کو خرید اجا سکتا تھا۔

”آسہ!“ سیما بھائی نے کمرے میں آکر اسے پکارا لیکن وہ بچیوں کو سینے میں چسپائے اپنی سوز تھی کہ آواز پر چونکی بھی نہیں، اس کے برعکس سیما بھائی چونک گئیں اور بغور اس کا چہرہ دیکھنے لگیں عرصے میں پہلی بار اس کے ہونٹوں پر بڑی نرم مسکراہٹ پھیلی تھی اور آنکھوں میں کسی عزم کی جگہ اب ہر طرف ان کا مقابلہ وہ تنہا کر کے تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ سیما بھائی نے آگے آکر اس کا کندھا چھوا تب وہ ذرا سا چونک کر انہیں دیکھ کر کوئی خوبصورت سوچ تھی، اگر نہ بتانا چاہو تو کوئی بات نہیں۔ میں اصرار نہیں کروں گی۔“ سیما ہوئے بولیں۔

”اس لیے کہ آپ جانتی ہیں، میری سوچوں کو کنارہ مل گیا ہے۔ جب ہی اصرار نہیں کریں گی۔“
 کے نرم کبل پر ٹھوڑی دھکا کر کہا پھر فوراً ”بات بدلنے کی غرض سے پوچھا۔“

”اماں جی کہاں ہیں؟“
 ”ٹھیک کے پاس بیٹھی ہیں اور ہاں ٹھیک یہ کہہ رہے ہیں کہ تم دونوں بچیوں کو کیسے دیکھو گی۔“
 اپنے پاس لے جاؤں؟ سیما بھائی غالباً ”یہ بات کہنے آئی تھیں۔“

”آپ کہاں پریشان ہوں گی بھائی! میں دیکھ لوں گی تو پر اہم۔ بس آپ اماں جی کے سونے کا انتظام میں کریں۔“ اس نے کہا۔

”اماں جی بھی یہی کہہ رہی ہیں۔ چلو میں یہاں پلنگ ڈال دیتی ہوں۔ اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟“
 بی بی اٹھتے ہوئے پوچھا۔
 ”وہ ٹیبل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔“
 ”سب کچھ موجود ہے۔“ وہ ٹیبل پر رکھی چیزوں کا جائزہ لے کر بولی تھی۔

بی بی نہیں تھی جو دو بچیوں کی دیکھ بھال مسئلہ بنتی۔ پھر اماں جی کی تو ہوس صرف بچے پیدا کرنے کی سزاوار اس کے بعد انہیں اماں جی کے حوالے کر کے خود اطمینان سے ہو جاتی تھیں اور وہ تو بیٹی تھی۔ اس کے باطن و اماں جی رات میں بھی اٹھ جاتی تھیں اور اسے پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ کب انہوں نے بچیوں کو فیڈر کب کھینچ کھینچ کی۔ اور سارا دن بھی اماں جی انہی کے ساتھ کھڑی رہتی تھیں۔
 اتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اباجی اور عدیل بھائی کا دو تین بار فون آچکا تھا۔ وہ اماں جی کی واپسی پر رہے تھے جس سے اس رات وہ لچھ کر اماں جی سے پوچھنے لگی۔

”اماں جی! اماں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی؟“
 ”رے ساتھ چلو گی؟ ٹھیک اور سیما تو کہہ رہے ہیں۔ تم ابھی میس رہو گی۔“ اماں جی نے سادگی سے کہا۔
 ”بس بہت رہ لیا میں نے یہاں اب آپ کے ساتھ جاؤں گی۔ آپ کہہ دیجئے ٹھیک بھائی سے کہ مجھے نہ اور عدیل ہمارے جانے کا انتظام کر دیں۔“ وہ جیسے جانے کا تہیہ کر کے بولی تھی۔
 ”تکتے دن سے کہہ رہی ہوں ٹھیک سے، روز کل پہ ملتا ہے۔ صبح کہہ رہا تھا۔ تمہارے اباجی اگر لے گئے“ اب کچھ وہ کب آتے ہیں۔“

بی بی کو باقی تکلیف دے رہے ہیں، ہم خود جاسکتے ہیں۔ خیر صبح میں خود بات کروں گی بھائی سے۔“ وہ اپنے واناغی ہونے لگی تھی۔ غالباً ”اس خیال سے کہ اس کی رائے لیے بغیر ٹھیک بھائی اور سیما بھائی نے مدد کا وہ نہیں رہے گی۔ گو کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی لیکن اسے بری طرح محسوس ہو رہی تھی کہ وہ اہم ہو کر رہ گئی ہے کہ اس سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی۔ اور اماں جی کے سونے کے بعد وہ کتنی اسی کیفیت میں رہی تھی۔

خاتے اٹھنے میں دیر ہو گئی۔ ٹھیک بھائی آفس جا چکے تھے۔ جس پر وہ ابھی خود کو شام تک صبر کرنے کی رہی تھی کہ اباجی کی آمد سے اس کی ساری ناراضگی اور غصہ دور ہو گیا۔ قدرے ہچکچا کر ان کے سینے سے بولی۔

”تی میں آپ کو یاد کر رہی تھی اباجی۔“
 ”عروس ہوا تھا اور اگر اس وقت کوئی فلائٹ ہوتی تو میں اس وقت آجاتا، خیر تم سناؤ ٹھیک تو ہو، بچے کہاں اباجی اس کے سر کو جو م کر بولے تھے۔“

”اماں جی کہاں؟“ آپ چلیں، میں ناشتہ لے کر آتی ہوں۔“
 ”ناکھڑا ہوں بس چائے۔“ اباجی آگے بڑھ گئے۔ سیما بھائی بھی اماں جی کے پاس تھیں۔ اس لیے وہ بچن لگی۔

”یہ بعد چائے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں آئی تو سیما بھائی حیران ہو کر بولیں۔“
 ”اے اچھے بھئی لے آئیں، میں تو سمجھ رہی تھی۔ تم واش روم میں ہو اور تم نے ناشتہ بھی کیا۔۔۔“
 ”کیا ہوٹ ہوں آپ یہ چائے بتائیں۔“ وہ ٹرے سیما بھائی کے سامنے رکھ کر کمرے سے نکل آئی۔ پھر ہڈا پس چولے کے پاس کھڑے ہو کر ناشتا کرتے ہوئے اس نے سوچا کہ رات میں جب اباجی، ٹھیک اور اماں جی کا پرورام بتائیں گے اس وقت وہ اپنے جانے کی بات کرے گی۔ اس کے خیال میں اباجی دو تین دن رہیں گے اور پھر ابھی تو وہ آئے تھے اس لیے فہم ”ان سے واپسی کی بات کرنا اسے مناسب نہیں

لگ رہا تھا۔ البتہ دن میں اماں جی سے وہ وقفے وقفے سے کہتی رہی کہ اسے بھی جانا ہے اور ہاں بس ”چھا“ کر کے رہ جاتیں۔

شام میں سردی کی شدت میں اضافے کے باعث لاؤنج میں بیٹھنا محال تھا۔ ٹکیل بھائی آتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ سیما بھابی نے اس کے کمرے میں بیٹھ کر اشعر اور سمیہ کو لالچ میں بٹھادیا اور اسے بھی کمرے سے نکلنے سے سختی سے منع کیا۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی وہ ان کے پیچھے اور ان کے ٹوکنے سے پہلے کہنے لگی۔

”مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا کہ ہم سب خانوں میں بیٹھیں اور آپ کھانا پکائیں۔ ہنس رہی ہوں۔“

”اب میں تم سے کیا کہوں۔“ سیما بھابی سمجھ گئیں۔ وہ ایک نہیں سنے گی اس لیے چلے گئیں۔

”مجھ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے“ البتہ ٹکیل بھائی سے کہیں کہ آپ کو خانا مال روکا اچھی پوسٹ پر ہیں۔“ وہ روٹی پلٹتے ہوئے بولی۔

”جنا! وہ کہتے ہیں تم کرتی کیا ہو سارا دن“ ایک صرف کھانا ہی تو پکاتی ہو۔ حالانکہ چھٹی کے کہ کس طرح کام کرنے والی کے ساتھ لگی رہتی ہوں۔ بس ان مردوں کو عادت ہوتی ہے۔ بڑا رہتے ہیں۔“

”یہ تو ہے“ ادھر خلیل بھائی بھی ایسے ہی ہیں۔ حالانکہ میونہ بھابی سارا دن مصروف رہتی ہیں کچھ نہیں کرتیں۔“ وہ بڑی فراخ دلی سے بھائیوں کے مقابلے میں بھادو جوں کی طرف داری کر پکانے سے فارغ ہو کر کسی اور کام کے لیے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ سیما بھابی کہنے لگیں۔

”بس اب اور کچھ نہیں کرنا سب تیار ہے۔ تم ٹکیل سے پوچھ کر آؤ کھانا کہاں کھاؤ گے اماں جی اور بچوں کے لیے کھانا نکال دوں۔“

”نہیں بھئی اماں جی کے ساتھ کھاؤں گی۔“ وہ کہتے ہوئے کبھی سے نکل آئی اور ٹکیل بھائی کھولنے لگی تھی کہ اپنا نام سن کر رک گئی۔ ٹکیل بھائی کہہ رہے تھے۔

”آسیہ کے لیے میں نے سوچ لیا ہے۔ وہ یہیں رہے گی۔ آپ اس کی طرف سے بالکل بے ساری بات طے ہوتے ہی آپ کو اطلاع دوں گا۔ اور اس کی بیٹیوں کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے چھوڑ دیں۔ ایک آپ اپنے ساتھ لے جائیں۔ وہاں خلیل بھائی کے بچوں میں مل جائے گی۔“

”میرے خدا۔“ وہ اگرچہ ساری بات سمجھی نہیں تھی تب بھی چکر اگئی تھی۔



بڑی مشکل سے اس نے خود کو سارا دے کر اندر جانے سے روکا اور پورے دھیان سے خاموشی کے بعد اباجی کی آواز آئی تھی۔

”تمہارا مطلب ہے۔ تم نے اس کی بیٹیوں کا بتایا ہی نہیں۔“

”بتایا ہے اباجی، ہر بات بتائی ہے۔ کچھ نہیں چھپایا۔ آپ جانتے ہیں میں بہت کھرا بندہ ہوں نہ دھوکا دینے والے کو پسند کرنا ہوں۔ اور میں آپ کو بتاؤں اگر شاہ سکندر، آسیہ کو نہ چھوڑ کے چنگل سے نکال لیتا۔ یہ میں نے اسی روز سوچ لیا تھا جس موز مجھے کراچی بلا کر آپ نے“

دانت مٹھ آپ کی خاطر میں نے ایک تیسرا راستہ نکال لیا تھا۔ بہر حال یہ اچھا ہوا کہ جلد ہی اس کی موت ہوئی اور وہ خود چلا گیا اور نہ مجھے اشیہ لیتا بڑنا۔“

بات کر رہا تھا آسیہ کی۔ اس کے لیے اصفہان علی بے حد مناسب ہیں۔ میں کل رات کے کھانے پر آیا ہوں۔ آپ بھی مل لیں اس کے بعد میں چاہوں گا کہ دو مہینے کے اندر آسیہ اپنے گھر کی ہو جائے۔

آسیہ سموت سے بول رہے تھے۔

اب انھوں کے سامنے دھند چھا گئی تھی۔

”ایک بے بیٹا لیکن پہلے آسیہ سے بھی تو پوچھ لو۔“ اباجی کا انداز سوچتا ہوا تھا۔

”ہے پوچھنا نہیں سمجھتا ہے اسے اور میرا خیال ہے وہ خاصی حقیقت پسند لڑکی ہے جلد سمجھ جائے گی۔“

”ناہائے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ ایک دم دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئی اور بے حد سانسف سے لڑکھنے لگی تو وہ سمجھ گئے کہ وہ ان کی باتیں سن چکی ہے اس پر بھی بڑے آرام سے بولے۔

”نہیں میں تمہارے متعلق ہی بات کر رہا ہوں۔“

ٹکیل بھائی! جتنا کہ بچے اس سے آگے ایک لفظ نہیں کہے گا۔ کیونکہ آپ کے سامنے آپ کی بہن اور صحبت کی ماں کھڑی ہے۔“ وہ ساری ہمتیں یکجا کر کے شاید زندگی میں پہلی بار بڑے بھائی کے

”کہہ رہی ہو گئی تھی۔“

آپ خود کہہ رہے تھے کہ میں بہت حقیقت پسند ہوں۔ ہاں یہی سچ ہے اور میری زندگی کی سب سے بڑی بری بیٹیاں ہیں۔ میرے بارے میں کچھ بھی سوچنے سے پہلے آپ اور اباجی آپ بھی سن لیں کہ میں اپنے غم سے غمے نہیں ہونے دوں گی۔ ایسی کوئی بھی کوشش میری موت ہوگی۔“

تخم کرتے ہی وہ تیزی سے کمرے سے نکل آئی اور اماں کے پاس آکر بھوٹ بھوٹ کر رونے لگی۔

”یہ نہیں کیا ہوا؟“ اماں جی پریشان ہو گئیں۔ ”ارے ابھی تو ابھی بھی گئی تھی۔ بھائی نے کچھ کمایا نہ تھا تو؟“

”بے کچھ نہیں کمایا اگر کہیں گے بھی تو انہیں حق ہے۔“ وہ اسی طرح روتے ہوئے بولی۔

”بھائی! نہ اندر آتے ہوئے اس کی بات سنی تھی اور بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔“

”نہیں رلائے کا تو ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔“

”یہ ہے۔“

ٹکیل بھائی ذرا سا مسکرائے پھر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”آئی ایم ساری“ میں نے شاید انا غلط استعمال کر لیا یا شاید وقت سے پہلے تم پلیز آنسو پونچھ لو ورنہ اباجی مجھے بچوں کے سامنے بہت

بیویوں سے آنکھیں رگڑ کر سیدھی ہو بیٹھی تو ٹکیل بھائی اسے ایک بازو کے حلقے میں لے کر اماں جی کو

انہوں سے گلے لیا تو وہ چونک کر بولی۔

”بس ٹھیک بھائی نے نہیں آنے دیا۔ ابھی بھی روک رہے تھے۔“

”کیوں؟“ میمونہ بھابی نے کھوجی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”بناؤں گی کسی وقت اطمینان سے۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چلیں اماں جی کے پاس، بچے تنگ کر رہے ہیں۔“

”تم چلو۔“ میں سالن چڑھا کر آتی ہوں۔ ”میمونہ بھابی نے کمرے سے نکلتے ہی کچن کا رخ کیا اور وہ پاس چلی گئی۔

→ → → →

شاہ سکندر پہلے کی طرح اپنے کسی کام سے کراچی آیا تھا۔ اور گو کہ آسہ کی زندگی سے نکلتے ہی اس

یہ عہد کیا تھا کہ وہ اب کبھی اس سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گا نہ اس کے بارے میں جاننے کی سو

گرتے ہوئے اس کے پیش نظر اپنے نہیں آسہ کا مغا تھا کہ وہ اسے خواب سمجھ کر بھول جائے اور ا

راہیں تلاش کر لے اور اس کے خیال میں یہ اسی وقت ممکن تھا کہ وہ اس کی فضاؤں تک سے ناٹا تو ا

ثابت کر دے۔ ورنہ اپنی ہر سانس کے ساتھ وہ اسے محسوس کرتی رہے گی۔ پتا نہیں اسے یہ یقین ک

کبھی اس سے نفرت نہیں کر سکے گی اور اس یقین میں جانے اس کا وہی زعم تھا یا اس لڑکی کے دل کی ت

گہرائی سے چھو آیا تھا۔ کچھ بھی تھا یہاں بہر حال وہ خود غرض نہیں ہوا تھا کہ وہ ساری زندگی اس ک

سارے گزارے اس کے برعکس جیسے وہ خود مرنساء کے ساتھ کچھ دما تر کر کے زندگی کی گاڑی

اس کے لیے بھی ایسا ہی چاہتا تھا۔

اس لیے اپنے آپ کو کبھی اس نے خاصا پابند کر لیا تھا۔ گو کہ اس تمام عرصے میں تڑپتے چلتے دل کو

قرار نہیں آیا تھا اور کسی کسی وقت تو دل چاہتا کہ ساری ہند میں توڑ کر بس اس کی ایک جھلک دیکھ

راستوں سے ہی اس کا احوال پوچھ آئے جن پر کبھی وہ اس کے ساتھ تھی لیکن خوب جبر کر کے اب

عہد پر قائم تھا۔ اور شاہ پور سے چلتے ہوئے اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ اپنا کام مٹا کر فوراً واپسی کی راہ

کراچی کی حدود میں داخل ہوتے ہی وہ سب بھول گیا۔ یہ بھی کہ کس کام سے آیا ہے۔ بس مختلف م

دواں تار ہے۔ یہ اس کے اندر کا اضطراب تھا جو اسے کیس رکھنے نہیں دے رہا تھا۔

یہاں میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اور پہلی نظر میں ہی وہ دل میں اترتی تھی۔

یہاں وہ میری گاڑی سے ٹکرا کر بے ہوش ہوئی تھی۔

یہاں میں اسے پہلی بار لے کر آیا تھا اور اسی وقت اسے دل کا احوال سنا کر میں نے اسے یہ یقین

اس کے مقصد کی راہ میں جاہل ہونے کی بجائے ہمیشہ اس کے ساتھ چلوں گا۔

وہ ایک ایک راستے پر رک کر ان لمحات کو آواز دے رہا تھا جن کے بارے میں اس نے گمان بھی نہ

وہ اتنی جلدی ایسی یادوں گر رہے تھے کہ جو ہمیشہ اسے تڑپاتی رہے گی۔ عجیب بے قراری کے ساتھ

اور ایسی حالت میں اس نے کائنات کا رخ کیا تھا کہ راستے میں احمد حسن کا آفس دیکھ کر گاڑی وہیں

تمام عرصے میں اس نے کسی سے کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا جب ہی احمد حسن نے اسے دیکھتے ہی سخت

اظہار کیا۔

”خبردار مجھ سے کلام نہیں کرنا میں تمہاری دوستی پر فاتحہ پڑھ چکا ہوں۔“

شاہ سکندر یہی سمجھا کہ وہ اس کے انتہائی اقدام سے واقف ہو کر ایسا کہہ رہا ہے۔ جب ہی اس کے

سر جھکا کر بیٹھ گیا جیسے اپنے جرم کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہر سزا کے لیے تیار ہو۔

”آخر کن چکروں میں الجھے ہو۔ کیس ملتے ہی نہیں۔ تمہارے گھون کر کے تھک چکا ہوں۔“

آسہ بھابی کو لے کر نہیں آئے۔ ”احمد حسن کی آخری بات پر وہ سراوچا کر کے اسے دیکھنے لگا۔“

”کیا بات ہے؟“ احمد حسن ٹھٹھک گیا۔ ”آسہ بھابی تو ٹھیک ہیں ماں اور تم تو غالباً بابا جان کو منانے گئے

تھا ابھی تک اسی کوشش میں لگے ہو۔؟“

”نہیں راجی تم نہیں جانتے؟“ اس نے غیر یقینی سے پوچھا۔

”کیا جانتا؟“ احمد حسن جلد جانے کو بے چین ہو گیا۔

”جی ہاں زندگی کا وہ سفر جو میں نے آسہ کے ساتھ شروع کیا تھا وہ ختم ہو گیا۔ حالانکہ میں کمزور نہیں تھا۔ مڑ

تا تھا۔ لیکن اس لڑائی میں بابا جان نے آسہ کو گھیت کر کھینچ لیا۔ دو دنوں ہاتھ کاٹتے تھے اور اگر میں

بند نہ دیتا تو آسہ کے ساتھ اس کے گھر والے بھی بابا جان کے ظلم سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔“ وہ بہت دل

رنگ رہا تھا۔

احمد حسن سنانے میں آگیا تھا۔

”میرے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ میں آسہ کو لے کر کہیں بہت دور نکل جاتا۔ جہاں تک بابا جان کی رسائی

نہ ہوئی نہیں سکتی تھی۔ لیکن اس کے گھر والے بے موت مارے جاتے اور یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ آسہ تو اس

دوسے ہی مرجانی پھرتاؤ کیا رہ جاتا۔“

وہ اپنی نظروں کے سامنے پیسے وٹ کو گھماتا ہوا بول رہا تھا۔

”راؤ باب بھی کچھ نہیں، لیکن کچھ نہ ہونے میں کم از کم یہ اطمینان تو ہے کہ وہ اپنی زندگی میں آج نہیں توکل

میں ایڈجسٹ ہو جائے گی کیونکہ وہ جذباتی لڑکی نہیں ہے جو یادوں کے سارے عمر بتا دے بلکہ شاید وہ تورو

بنے میں بھی وقت ضائع نہیں کرے گی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے دکھ نہیں ہوگا۔ یہ دکھ وہ اسی طرح

حال کر لے گی جیسے خوشیاں۔ اور اپنے لیے جس راستے کا انتخاب کرے گی وہ انہیں ساتھ لے کر چلے گی لیکن

ہر آدمی جاہل نہیں ہونے دے گی۔“

”انتا جانے ہوا ہے؟“ احمد حسن سنانے میں ہی بولا تھا۔

”شاید اس سے بھی زیادہ۔“ اس کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ چلی تھی۔

”تو در خواش جھان رہی۔ جب احمد حسن سنانے سے نکلتا بھی کچھ نہیں بولا۔ چاہنے کے باوجود اس

ت بھی نہیں کر سکا کیونکہ وہ بہت فوٹا ہوا لگ رہا تھا۔

”تم۔“ شاہ سکندر یکدم خیال آنے پر کچھ سوچتے ہوئے انداز میں اسے مخاطب کر کے پوچھنے لگا۔ ”تمہیں احمد

ن ان ساری باتوں کی خبر کیوں نہیں ہے؟ کیا ان کی طرف سے کسی نے نہیں بتایا؟“

”ملاقات ہی نہیں ہوئی کسی سے۔“ احمد حسن نے سمجھ کر بھی سرسری انداز میں کہا۔

”کیا مطلب ہے جو ناکہ کا سلسلہ شروع ہوا تھا؟“

”جی اسی وجہ سے تو میں بھی فون وغیرہ کرنے سے رہ گیا۔ ورنہ تمہارے بارے میں معلوم کرنے کے لیے میں

برہانگی یا عدل صاحب کو فون کر سکتا تھا۔ کئی بار سوچا پھر اس خیال سے رہا نا کہ کہیں وہ نہ سمجھیں کہ اس

نے میں ناکہ کے سلسلے کو آگے بڑھنا چاہتا ہوں اور ادھر سے بھی دوبارہ کوئی نہیں آیا جس کا مطلب صاف ظاہر

ہے۔“ احمد حسن احساس ہونے پر کندھے اچکا کر رہ گیا۔

”میں کہہ جسے ناں۔ لیکن احمد حسن اس میں تم سب کا کیا دلوش؟“

”تمہارا پرہیزگار لے کر تو ہم ہی گئے تھے۔“ احمد حسن نے بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں کہا اور ہنسا بھی جس سے

پتہ چلے کہ خاص طور پر ہوئی۔ جیسے ہمیشہ سے محکوم رہا ہو۔

”میں ان بار ناکہ کے لیے کوئی کی نہیں ہے۔ تم بھی جانتے ہو۔“ احمد حسن اسے جزیرہ تو دیکھ کر بولا تھا۔

”پتہ چلے گی تو واقعی نہیں ہے لیکن۔“ خبر پر پتاؤ کیسی ہے نا کہ اور آئی؟“ وہ صبا بھل گیا۔

”تمہارا خود ہی دیکھ لو۔“ احمد حسن فوراً ”کہہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔“

”سنا رہا اس وقت میں ان کا سامنا نہیں کر سکتا بلکہ شاید کبھی جی نہ کر سکوں۔“

”کس کس کا سامنا نہیں کرو گے؟“ احمد حسن بے اختیار کہہ گیا پھر فوراً اپنی بات سنبھالنے کی کوشش کی۔
 ”تمہارا جرم واقعی بہت بڑا ہے سکندر! لیکن قابل معافی یوں ہے کہ اس میں تمہارا بھی اتنا ہی قصور ہے۔
 آئیہ بھابھی کا۔ میں نے اسی کو تمہارے حالات بتا دیئے تھے اور وہ خفا ہوئی تھیں تو اس بات پر کہ تمہاری
 انہیں کیوں نہیں بتایا تھا۔ مجھے بھی تم سے یہی لگہ ہے۔ سخت غلطی کی تمہارے نے ہو سکتا تھا کہ ہم اس
 راستہ نکال لیتے لیکن تم نے غیرت برت کر خود پر ظلم کیا۔ بہر حال اب تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ تمہاری فکر
 ”میں قسمت کو دوش نہیں دیتا۔“ اس نے ٹوک دیا۔
 ”چلو باقی باتیں گھر چل کر کریں گے۔“ احمد حسن اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود وہ
 بھی اٹھالے گیا تھا۔

* * *

احمد حسن کے گھر آکر اس تمام عرصے میں پہلی بار اسے اپنے دل کا بوجھ بھاری کرنے کا موقع ملا تھا۔ جس
 احساس ہوا کہ اتنا عرصہ اس نے اتنے اچھے دوست سے کوئی تعلق نہ رکھ کر ایک اور غلطی کی ہے۔
 کئی ایک فرد ایسا نہیں تھا جسے اس سے ہمدردی ہوتی۔ جب ہی وہ ایک دم سے تنہا ہو گیا تھا۔ اگرچہ
 دکھاوے کو ہی اس سے لگاؤ کا مظاہرہ کرتے جیسے پہلے کرتے آ رہے تھے تو ان سے بھی کس نہ کہ
 اس کے دل کا غبار نکل سکتا تھا لیکن وہ بھی اس مقام پر اسے اکیلا چھوڑ گئے تھے۔ شاید اس لیے کہ ان
 چور تھا۔ بہر حال احمد حسن کے گھر آکر اسے بہت سکون ملا تھا۔ بس کچھ دیر آگئی نے خفگی کا اظہار کیا اور
 نئے سرے سے اسی کی زبانی اس کی رام کہانی سن کر کتنی دیر تک افسوس کا اظہار کرتی رہیں۔
 ”تمہارے ماں باپ کو اتنی انتہا پسندی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ خود بیٹوں والے ہیں اور وہ
 کا ذرا احساس نہیں کیا۔ بے شک اسے شاہ پور نہ ملتا۔ یہیں بسنے دیتے اور انہوں نے تو تمہارا بھی
 کیا۔ بہر حال بہت افسوس ہوا۔ گھر نہیں اجڑنا چاہیے تھا۔ آئیہ اپنے ماں باپ کی ایک ہی بیٹی ہے۔
 ہو گا انہیں۔“

”مجھے تو آئیہ باجی کا خیال آ رہا ہے۔ وہ تو بہت اچھی ہیں۔ اتنی محبت کرنے والی۔“ نائلہ بچ چڑھ کر
 شاہ سکندر اسے ایک نظر دیکھ کر رہ گیا۔
 ”نائلہ! یہ کیا حقاقت کر رہی ہو۔“ احمد حسن نے اسے ٹوک دیا۔ ”سکندر پہلے ہی پریشان ہے تم تو
 ”یہ ہمیشہ پریشان رہیں گے۔ لکھ لیجئے آپ کہیں سکون نہیں ملے گا انہیں۔“ نائلہ کسی طرح خود
 پاسکی۔ چچ کر کتنی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

”سواری یا راند۔“ احمد حسن نام ہو کر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ روک کر بولا۔
 ”نہیں۔ مجھے برا نہیں لگا۔ یہ باتیں سننے کے لیے تو مجھے بہت پہلے یہاں آنا چاہیے تھا۔“
 ”میں چائے لاتی ہوں۔“ اتنی اٹھ کھڑی ہوئیں پھر اس سے پوچھنے لگیں۔ ”تم آج ہی شاہ پور جاؤ
 ”جانا تو آج ہی تھا لیکن میرا کام رہ گیا ہے۔ اب کل جاؤں گا۔“ وہ بتا کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔
 ”ٹھیک ہے پھر یہیں رک جانا۔ ہو مل وغیرہ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اتنی کہہ کر چلی گئیں
 کو دیکھ کر بولا۔

”رہنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے یا راند! آئیہ نے خواہ مخواہ۔“
 ”کوئی خواہ مخواہ نہیں۔ بس آرام سے بیٹھو اور ہاں وہ اپارٹمنٹ تو چھوڑ دیا ہو گا تم نے؟“ احمد حسن
 خیال آنے پر پوچھا۔
 ”ہاں۔ میں نے چھوڑنے سے پہلے آئیہ کے نام سے خرید کر اسے گفٹ کر دیا تھا۔“ جواب دینے پر
 نظروں میں اس شام کا منظر تھا جب اس نے آئیہ کو لغافہ تھمایا تھا۔
 ”یہ تم نے اچھا کیا۔ لیکن میرا خیال ہے وہاں کوئی ہے نہیں کیونکہ اس تمام عرصے میں میں دیکھ

یا اور کسی نے ریویو نہیں کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے پر بھی نہیں دیا گیا۔“
 ”ہوں۔“ اس نے غائب دماغی سے سر ہلایا تھا۔

پھر اس رات کھانے کے بعد وہ کتنی دیر تک احمد حسن کے ساتھ آئیہ کی باتیں کرتا رہا۔ ماضی سے زیادہ اس کا
 خفا موضوع تھا۔ جس پر احمد حسن نے اسے ٹوک دیا کہ اسے اب اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس کا
 دل اپنا نہیں رہا۔
 ”نائلہ! ماں بے احمد حسن! وہ میرے بچے کی ماں ہے۔“ اس نے جتا کر کہا تو احمد حسن اپنی جگہ اچھل پڑا۔
 ”واقعی۔ تم نے پہلے نہیں بتایا، عجیب آدمی ہو یا راند۔ سوچ سوچ کر انکشاف کر رہے ہو۔ ارے اس بچے کے
 جے تو ان سے مل بھی سکتے ہو۔“

”ہاں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ کیونکہ اس کی زندگی میں میری کسی بھی قسم کی مداخلت اسے دکھ دے گی اور
 یہ وہ دے گا تو میں نے پہلے بھی کبھی نہیں سوچا تھا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مقام پر بچہ اس کے لیے برا ہو
 یا اپنی خوشی سے اسے مجھے سونپ دے۔ میں خود سے کوئی مطالبہ نہیں کروں گا۔ اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ بچے کی
 اور اپنی زندگی تباہ کر دے۔ پتا نہیں احمد حسن میں اس کے بارے میں کیا کیا سوچتا رہتا ہوں۔“ وہ اپنے جذبول
 واپ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔
 ”ابن کرو یا راند! مجھے تو اب تمہاری فکر ہو رہی ہے کہ کسی دن کپڑے پھاڑتے ہوئے ویرانوں میں نہ نکل جاؤ۔“
 ”نہیں پکارا اگر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔“

”جواب بخیر!“ اس نے بیک پر سر نکال دیا اور یوں ہی بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔
 ”مجھے احمد حسن کے ساتھ ہی گھر سے نکلا تھا۔ اسے ایک تو پورٹ جانا تھا۔ دوسرے کھادی ایجنسی میں مینجر سے
 ہوا تھا اور کیونکہ مینجر کا لیکارہ بچے سے پہلے ملنا متوقع نہیں تھا اس لیے وہ پہلے پورٹ چلا گیا۔ جہاں سے اس کی
 اپنی لیکارہ بچے کے قریب ہی ہوئی تھی۔ پھر مینجر سے وہ دس منٹ بات کر کے فارغ ہو گیا تو دوسرے کھانے تک
 گھر پہنچے کاموتے ہوئے گاڑی میں بیٹھا تھا۔ اس شہر کی رونقیں دیکھی تھیں۔ مناسب اسپڈ سے گاڑی دوڑاتے
 ہوئے پھر ایک ایک بات یاد آنے لگی تو نڈاسکرین پر بس اس کی نظریں جمی رہ گئی تھیں۔ ذہن کے پردوں پر
 اپنی فلم نے شہر کی رونقوں کو دھندلا دیا تھا۔ اور وہ اپنے راستے سے بھی ہٹ گیا تھا۔ کبھی اس سڑک کبھی اس
 سڑک اور اسے احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔ اتنی دیر میں تو شاید وہ شاہ پور پہنچ جاتا جبکہ ابھی شہر سے بھی نہیں نکلا
 تھا اور جانے کب تک اسی طرح بھٹکتا رہتا اگر جو قریب سے گزرتے دو بیکل ٹرک کے زوردار ہارن سے اس کے
 ذہن کو جھٹکانے لگتا۔ وہ بری طرح چونکا تھا اور عین وقت پر کہ سامنے روڈ کراس کرتی لڑکی جس طرح ملن ہو کر چل
 رہی تھی وہ اگر بوقت پر یک نہ لگا تا تو اکسیڈنٹ یقینی تھا۔“

”لو گاڑی! دولوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا کر اس نے سر کو زور سے جھونک پھر تھکے ہوئے اعصاب کو
 سکون کرنے کی خاطر وہ گاڑی بچ سڑک سے نکال کر کنارے لے آیا اور سیٹ کی بیک سے سر نکالیا تھا کہ نظروں
 کے عین سامنے سڑکیوں کی چمکتی ہوئی دھوپ میں کھڑی آئیہ پر پہلے تو اسے دھم کا کمان ہوا لیکن دوسرے بل نعین
 ہوتی دے بے اختیار گاڑی سے اتر کر اس کے پاس گیا اور اسی بے اختیار سے پکارنا چاہتا تھا کہ وہ بول پڑی۔
 ”تمہارا رشتہ سے پہلے لڑکیوں کو گاڑی سے ہراساں کر کے بے ہوش کرنا پھر اٹھا کر ہسپتال لے جانا۔ آپ تو
 ہائے ملائی ہیں پھر وہ لڑکی بچ کیسے گئی؟“ اس کا طنز آمیز لہجہ سیدھا دل میں تازہ ہو گیا تھا وہ اپنی جگہ یوں جم گیا
 جیسے پتھر ہو گیا ہو۔

”شاہ سکندر حیات! آپ کے گاؤں میں بھی تو لڑکیاں ہوتی ہوں گی پھر کھیل کا انتخاب آپ شرعاً کریں کرتے
 نہ ہو۔ مجھے محبت کا فریب دے کر۔ ہونہ بظاہر اعلیٰ شخصیت کے اندر کتنا گھناؤنا انسان چھپا ہے۔ کاش میں جج
 یا راند دیکھتا تو کتنا سکتی۔“ اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور بچے میں حد درجہ شہر
 سزا آتا تھا۔

”نہیں اماں جی اذان کے وقت ہی اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ پتا نہیں رات میں ان کے بغیر سوتی کیسے ہو
لگتا ہے اسی انتظار میں جاتی رہتی ہیں کہ جلدی صبح ہو اور بچیوں کو اپنے پاس لے جائیں۔“

”جناب ہم نے بھی صرف بچے پیدا کیے ہیں۔“
”مجھے پتا ہے۔ میں کوئی باہر سے نہیں آئی۔“ وہ مڑے اتار کر اس میں کپ رکھتے ہوئے بولی۔

میمونہ بھاگتی ہے دو سرا چولہا جلا کر اس پہ تو رکھ دیا اور یونی باتوں میں ناشتیاں رو گیا۔ اور جب
بھابھی نے سب کو ناشتا پہنچایا اس نے پانی ایاں کر تھراں میں ڈالا اور فیڈر زوہو کر اماں جی کے کمرے میں
سو کر انہیں بچیوں کے بارے میں کچھ کہنے سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ وہ بھی جانتی تھی اس
جب گھر سے نکلنے لگی تو بدایات دینے سے باز نہیں آئی۔ ٹھنڈا دودھ نہیں پلانا۔ جب تک دھوپ نہ
سے نہیں نکالنا فیڈر گر مپانی سے دھوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

میمونہ بھابھی زور زور سے شنے لگیں تب وہ جلدی سے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل کر آئی تو اسے ہلا
کہ بہت ساری اور بہت محبت کرنے والی ہستیوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ تنہا ہوئی ہے۔ جانے دو
باقی تمام عمر پر بھاری کیسے ہو گیا تھا کہ اسے اپنا آپنہ صرف خالی بلکہ غیر محفوظ بھی لگنے لگا تھا۔ پھر لڑیہ
اس خیال کی نفی کرنے میں لگی رہی تھی۔

”ڈاکٹر آسیہ شاہ“ ڈاکٹر عبدالوہاب نے بقیہ اسٹاف سے اس کے تعارف میں ابھی اس قدر کہا تھا کہ
پڑی۔

”اصلاح الدین۔ آسیہ اصلاح الدین۔“
”ہوں۔“ ڈاکٹر وہاب نے کچھ چونک کر دیکھا پھر کہنے لگے۔ ”یہ میری اسٹوڈنٹ بھی رہی ہیں۔ اور
اسٹوڈنٹ تھیں مجھے یقین ہے اس سے اچھی ڈاکٹر ہوں گی۔“

”تھینک یو سرا! آپ کے یقین کو ج ثابت کرنے کے لیے میں پوری ایمانداری سے اپنی صلاحیتوں
کروں گی۔“ اس نے کہا۔

”ڈاکٹر وہاب آپ ڈاکٹر حارث سے چارج لے کر انہی کے ساتھ سینڈ فلور پر چلی جائیں وہاں ڈاکٹر
کے ساتھ ہوں گی۔“ ڈاکٹر وہاب نے ڈاکٹر حارث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ ایک بار پھر
کر کے ڈاکٹر حارث کے ساتھ چل پڑی۔

اور پھر دن بھر کی مصروفیت نے اسے تھکا کر نہیں تھا بلکہ کسی نامعلوم شے سے نکل کر کتنے عرصے
نے ہاتھ پاؤں پھیلائے تھے تو بس کچھ دیر کی تکلیف تھی اس کے بعد آرام ہی آرام تھا۔ اور اس آ
اسے اسی طرح مصروف رہنا تھا۔ ورنہ وہی تکلیف نہ شے سے گرفت میں رہنے کے لیے اس ہسپتال
جگہ موجود تھا کہ جب شاہ سکندر کا ایکسپنڈنٹ ہوا تھا تو وہ اسی ہسپتال میں بھی رہا اور یہیں اس
بھی دیکھا تھا یہ خیال اسے پہلے مرحلے پر ہی آیا تھا۔ اور بس وہی کچھ دیر کی تکلیف تھی اس کے بعد
کچھ سوچنے کی ہمت ہی نہیں دی تھی۔

”سنو بٹم کیسے جاؤ گی؟“ ڈوہلی آف ہوئے پر ڈاکٹر یاسمین نے اس سے پوچھا تو وہ گھڑی دیکھتی ہوئی
”میرا خیال ہے میرے بھائی آئیں گے۔“

”اگر ان کا آنا مفہوم نہیں ہے تو میرے ساتھ چلو، میں تمہیں ڈراپ کروں گی۔ بلکہ ایسا کرو تو
منع کروں گی کیونکہ تمہارا گھر میرے راستے میں پڑتا ہے۔ صبح آتے ہوئے بھی میں تمہیں پک کر لیا کروں
یا سمین کی پیشکش پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”کیا تمہارے گھر والوں کو اعتراض ہو گا میرے ساتھ آنے جانے پر؟“ ڈاکٹر یاسمین نے اسے
پوچھا۔

”نہیں انہیں تو اعتراض نہیں ہو گا البتہ تمہیں زحمت ہوگی۔“
”زحمت کیسی۔ میرا راستہ ہی وہی ہے اور تمہارا وزن بھی کوئی منوں کے حساب سے نہیں ہے۔“

”جینے کا اندیشہ ہوا۔“ ڈاکٹر یاسمین نے کہا تو وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔
”جینے کا اندیشہ ہے۔ میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“

”جینے کا اندیشہ ہے۔ میں آج بھائی کو منع کروں گی۔ پھر نکل سے تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“
”صرف جاؤں گی نہیں۔“ بچے پوئے نوبے تم مجھے اپنے گیت پر کھڑی ملانا۔ اوکے خدا حافظ۔“

”ڈاکٹر یاسمین ہاتھ ہلائی چلی گئی تو اس نے عدیل بھائی کو دیکھنے کے لیے پہلے کوریڈور میں جا کر نیچے جھانکا پھر اپنا
بازو بچوں وغیرہ کو اٹھا کر بیڑیوں کی طرف بڑھ رہی تھی کہ لفٹ کے قریب کھڑے ڈاکٹر وہاب نے اشارے سے
سے بلایا۔

”یہی سر! وہ تیرے قدموں سے ان کے پاس آگئی۔“ ڈاکٹر وہاب لفٹ میں داخل ہو گئے تو اس نے بھی تھریڈ فلور پر
”ہم اور تو نہیں گئی ہوگی چلو تمہیں۔“ ڈاکٹر وہاب لفٹ میں داخل ہو گئے تو اس نے بھی تھریڈ فلور پر
اس نے دیکھا چار سے بارہ سال تک کے بچے جو پیدائشی معذور نہیں تھے بلکہ معمولی بیماریوں میں مبتلا ہوتے
تھے اسے اس حال کو پہنچ گئے تھے۔ ڈاکٹر وہاب اسے ایک ایک بچے کے بارے میں بتا رہے تھے۔ اس کیل وارڈ
نکل کر آگے لاٹن سے چار کمرے تھے۔ اور پہلے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلتی
پڑتی تھی۔

”نیل!“
ڈاکٹر وہاب رک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ لپک کر نیل کے پاس پہنچی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی

”نیل!“
ڈاکٹر وہاب رک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ لپک کر نیل کے پاس پہنچی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی

ڈاکٹر وہاب رک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ لپک کر نیل کے پاس پہنچی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی

”نیل!“
ڈاکٹر وہاب رک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ لپک کر نیل کے پاس پہنچی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی

”نیل!“
ڈاکٹر وہاب رک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ لپک کر نیل کے پاس پہنچی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی

”نیل!“
ڈاکٹر وہاب رک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ لپک کر نیل کے پاس پہنچی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی

”نیل!“
ڈاکٹر وہاب رک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ لپک کر نیل کے پاس پہنچی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی

”نیل!“
ڈاکٹر وہاب رک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ لپک کر نیل کے پاس پہنچی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی

”نیل!“
ڈاکٹر وہاب رک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ لپک کر نیل کے پاس پہنچی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی

”نیل!“
ڈاکٹر وہاب رک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ لپک کر نیل کے پاس پہنچی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی

”نیل!“
ڈاکٹر وہاب رک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ لپک کر نیل کے پاس پہنچی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی

”نیل!“
ڈاکٹر وہاب رک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ لپک کر نیل کے پاس پہنچی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی

”نیل!“
ڈاکٹر وہاب رک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ لپک کر نیل کے پاس پہنچی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی

”نیل!“
ڈاکٹر وہاب رک کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ لپک کر نیل کے پاس پہنچی اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چومنے لگی

غالباً! ابھی وہی دو تین ماہ کا تھا۔

”بیٹا! عمر سے چھوٹی دو لڑکیاں اور ہیں۔ آپ جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ پھر وہ دونوں ہم آپ کو دے دیں گے۔“

ہیں ہی آپ کی۔“ عدیل بھائی نے اسے اشتیاق دلاتے ہوئے کہا۔

”جچھو پھو!“ وہ شروع سے ہر بات کی تصدیق اسی سے کرواتا تھا۔

”ہاں بیٹا اور اب آپ آرام کرو۔ گھبراتا بالکل نہیں، ہم روزانہ آپ کے پاس آئیں گے۔ اور میں تو بچہ

شام تک یہیں رہوں گی ٹھیک ہے اب ہم جائیں؟“

بچوں کے ذکر پر وہ کچھ بے چین سی ہو گئی تھی جب سی نبیل کو تسلی دے کر عدیل بھائی کو اشارہ کرتی ہوئی

سے نکل آئی۔

راستے میں عدیل بھائی اور اس نے یہ طے کیا تھا کہ فی الحال گھر میں نبیل کا نہیں بتائیں گے کیونکہ شہ

پوتا ہونے کے ناتے وہ اماں جی کو سب بچوں میں زیادہ پیارا تھا۔ اور یہ بتا کر وہ باہیٹل میں ہے اماں جی کو

پاس جانے سے روکا نہیں جاسکتا تھا۔ اور اسے دیکھ کر اماں جی کی جو حالت ہوئی تھی اس کے پیش نظریہ

یہ طے کیا تھا۔

”آج پہلے دن ہی ایمر جنسی لگ گئی تھی کیا؟“ میمونہ بھابھی نے اس کی دیر سے آمد پر کہا تو اس سے پلے

بھائی بول پڑے۔

”نہیں۔ ہم لوگ ذرا گھومنے پھرنے نکل گئے تھے۔ برا مزہ آیا۔ آپ نہیں تھیں ناں اس لیے۔“

آسیہ بے ساختہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دو باتی اماں جی کے کمرے میں آئی۔ ایک بچی ان کی گود میں

دوسری اس نے بازوؤں میں بھر کر سینے میں چھپالی۔ برا خوبصورت احساس تھا جو زندگی کی ساری تلخیوں

چھپچھپھیل دیتا تھا۔



شاہ سکندر ایک بار پھر احمد حسن کے سامنے بیٹھا تھا اور اس بار اس کے لیے اور انداز میں وہ بے اعتبار

تھی۔ پہلے کے برعکس بہت سنبھل کر بول رہا تھا۔

”میں آسہ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن بچے کے لیے اپنے جذبات پر قابو پانا اب میرے لیے بڑا

ہو گیا ہے۔ آخر وہ میرا خون ہے۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ سینے سے لگانا چاہتا ہوں۔ بتاؤ کیا کروں؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ احمد حسن اس کی اتنی جلدی بات سے پھر جانے پر حیران تھا۔ ”ویسے میرا

تمہیں اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ تمہارا پہلا بچہ تو نہیں ہے۔“

”پہلا اور دوسرا کیا۔ ہر بچے کی اپنی محبت ہوتی ہے۔“

”مجھے ابھی تجرہ نہیں ہے بہر حال تم اگر اتنی ہی اسے دیکھنے اور سینے سے لگانے کو بے چین ہو تو

سیدھا سادا راستہ اختیار کر دینی آسہ، بلکہ نہیں ان کے والد کو فون کر کے کہو کہ تمہاری پدرانہ شفقت جا

ہے اور تم بچے کو دیکھنا چاہتے ہو۔“ احمد حسن نے بظاہر بہت سنجیدگی سے کہا تھا۔

”اور اگر انہوں نے منع کر دیا تو؟“ وہ احمد حسن کا معقول مشورہ رد نہیں کر سکا تو جرح پر اتر آیا۔

”یہ تم پہلے سے کیوں فرض کر رہے ہو۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی اعتراض نہ کریں۔“ احمد حسن نے رمان

وہ اندر ہی اندر جڑ بڑھ کر بولا۔

”تم نہیں جانتے“ انہوں نے مجھے آسہ سے بھی نہیں ملنے دیا تھا۔ اگر اس وقت وہ اپنے روئے میں

پیدا کر لیتے تو یہ سب نہ ہوتا۔ میرا کیا گیا اپنی بیٹی کا کھانا اجازت انہوں نے۔“ وہ اب سارا الزام انہیں

”تجائے اسے سمجھانے کے مزید داغ خراب کر دیا تھا اس کا۔ ورنہ وہ ایسی نہیں تھی۔ کبھی مجھ سے

ہو سکتی تھی۔ انہوں نے برکایا اسے“ ابھی بھی برکایا میں گئے۔ اور میں اس معاملے میں کوئی رعایت

گا۔“

”دھیرج سے سکندر! میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس معاملے کو ابھائیں گے۔ تم خود پر قابو رکھو اور یہ لو

۴۰ احمد حسن نے ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

ان کے منہ کی بات کروں گا، میری تو آواز سنتے ہی ادھر سے فون بند ہو جائے گا۔“ وہ ناراضگی سے گویا ہوا۔

”میں کامیاب ہو۔“ پہلے کو شش کر چکے ہو۔“

۴۱ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۴۲ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۴۳ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۴۴ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۴۵ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۴۶ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۴۷ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۴۸ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۴۹ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۰ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۱ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۲ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۳ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۴ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۵ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۶ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۷ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۸ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۵۹ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۰ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۱ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۲ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۳ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۴ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۵ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۶ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۷ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۸ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۶۹ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۰ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۱ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۲ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۳ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۴ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۵ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

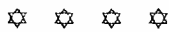
۷۶ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۷ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۸ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۷۹ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے

۸۰ پہلے میں نہیں۔ اس سے پہلے جب میں آسہ سے بات کرنا چاہتا تھا تو ایسا ہی ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھے



نہیں! زندگی کے شہ باب کو مدھیہ اور صباحت کے نام انتساب کیا تھا اور اس سے اگلے روز ہی اس نے

ان کے ساتھ نیل کا نام بھی لکھ دیا تھا کہ اس بچے کی اس حالت کا ذمہ دار وہ صرف اس کی ماں کو نہیں تھی۔ کچھ قصور ان سب کا بھی تھا اور خصوصاً اس کا کہ جب وہ شروع ہی سے اس سے اتنا مانوس تھا کہ خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اپنی حد درجہ غفلت پر اب وہ اپنے آپ کو معاف نہیں کر پاری تھی۔ جب سے ہی اس نے ڈاکٹر وہاب سے کہہ کر اپنی ڈیوٹی تھوڑی تھوڑی کر لی تھی۔ جہاں سب بچوں کے احساسات و جذبات ایک جیسے تھے۔ بس جب فارغ ہوئی تب نیل کے پاس جا بیٹھتی اور اس کی اپنے بہت پر اس کا دل بھر آتا۔

ایک ہفتہ ہو گیا تھا اسے ہسپتال جوائن کیے ہوئے اور اس دوران نیل سے ملنے اس کی ماما اور باپ کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ کئی بار اس نے نیل سے پوچھا تو جواب میں اس نے بس ”چتا نہیں“ کہا۔ اور سے پوچھتے ہوئے اب اسے خود عجیب سا لگ رہا تھا۔ کہ بات صرف نیل کی ماں کی غیر ذمہ داری پر ختم اس کے باپ کا نام بھی آئے گا، اور وہ خود تسلیم کر رہی تھی لیکن وہی بات کوئی دوسرا کے تو جانے کی محسوس ہوتا ہے۔ بہر حال اس وقت وہ نیل کے پاس آکر بیٹھی تو ہلکی پھلکی باتوں کے دوران پوچھنے لگی۔

”یہ بتاؤ بیٹا! آپ کو یہاں ہسپتال میں کون چھوڑ کر گیا ہے؟“

”ڈیڈی۔“ نیل نے کہا تو وہ سمجھ گئی وہ اپنے نانا کو ڈیڈی کہہ رہا ہے۔

”اور آپ کی ماما کہاں ہیں؟“

”ماما جلی گئیں ڈیڈی نے انہیں پایا کے پاس بھیج دیا ہے۔“

نیل کا جواب بظاہر سیدھا سا تھا لیکن اسے سوچ میں مبتلا کر گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی سمجھ میں آیا دوسری شادی کر چکی ہیں۔ اور اس سے اسے کوئی مطلب نہیں تھا اس لیے وہ موضوع بدل کر مامی پڑی۔ نیل کو ایک سرساز کروانے آئی تب وہ کمرے سے نکل کر نئی اور اسی وقت نیل کے بیگم کے کمرے میں ملا۔ ”کمرے میں صاحب یا بیگم صاحبہ جو بھی موجود ہیں انہیں بلاؤ۔“ کو ہسپتال سے فون ہے۔“ اور اسے آواز سن کر اس نے کہا تھا۔

”ہیلو۔“ کچھ دیر بعد مروانہ آواز نیل کے نانا کی تھی۔

”جی السلام علیکم امیں ڈاکٹر آسہ بول رہی ہوں اور اس وقت میں ڈاکٹر کی حیثیت سے نہیں بلکہ نانا کی حیثیت سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ پورے اعتماد سے بول رہی تھی۔

”جی فرمائیے۔“

”آپ لوگوں کے پاس آکر نیل کے لیے وقت نہیں تھا تو اسے شروع ہی میں ہمارے پاس کیوں نہ یا جب ہسپتال میں لا داریوں کی طرح ڈال گئے تھے تب ہمیں اطلاع کر دیتے تو کم از کم بچے کی یہ حالت آپ کو پتا ہے بیمار سے زیادہ اس پر جسمانی اثر انداز ہوئی ہے۔ بچہ نوٹ کر رہ گیا ہے۔“

”تو اب جوڑنے والے مل تو گئے ہیں اسے۔“ خاصے نسخے کے کما گیا جس پر وہ سگ کر بولی۔

”جی ہاں۔ یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے میں نے کہ آپ کو تو اس کی فکر خیر پہلے بھی نہیں ہوئی۔“

دوسری کسی ذمہ داری سے بھی میں آپ کو آواز کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ یہ اطمینان بھی دے رہی۔

”جی میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے ریسپورنڈ کیا اور ان کی بے بسی پر کڑھ رہی تھی کہ معا” اسے اپنی بچیوں

اس کے ساتھ ہی سیمابھائی کی باتیں ذہن پر دستک دینے لگیں۔

”ڈرا سوچو۔ آئندہ زندگی میں اس آنے والے بچے کا کیا کردار ہوگا۔ نیل کا حال تم نے دیکھا ہے

دونوں میں سے کسی ایک کے نہ ہونے سے بھی بچہ بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ خصوصاً ماں باپ کی طرف

”نہیں۔“ اس نے سر دوڑوں باتوں میں ختم لیا اور اسی وقت سے خود کو باور کرانے لگی تھی کہ

صرف ماں ہی نہیں باپ بھی ہے۔ انہیں زندگی میں وہ بھی کسی محرومی کا احساس نہیں ہونے دے

ان کی قسمت میں لکھی گئی ہے اس کا بھی نہیں۔
ت میں بچوں کو سنانے اور ان کے تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے بستر میں گھٹنوں کے گرد بانو

ہی تھی جب ابائی نے اس کے دروازے میں آکر پوچھا۔

”سو تو میں پریشان بیٹا۔“

”وہ چونک کر بولی تھی۔

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”یہ دروازہ بند کر لیا کرو۔“ وہ آتی ہوگی۔“

”ابائی! آئیے۔“ وہ چونک کر بولی تھی۔

”ہاں بچہ اسے معلوم ہی نہیں کہ بیٹا نہیں دو بیٹیاں ہیں، آسیہ کی خود کلامی سن کر اباجی بھی اپنے آپ سے تھے اور اپنے پیچھے اس کے کمرے کا دروازہ بند کر گئے تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کلاٹ کے پاس کھڑی ہو گئی اور دو کبل سرکار ایک ساتھ دو معصوم بچوں کو دیکھنے لگی، جبکہ اس کا ذہن پوری طرح ہیرا ہو کر اس نے مسئلہ کو سوچنے لگا تھا۔

”ہمارے ہاں بیٹیاں خاندان سے باہر نہیں دی جاتیں۔“ شاہ سکندر کی اس بات سے وہ اب بھی خائف تھی کہ کوئی کچھ کر دہ اپنی بات سچ ثابت کرنے کے لیے اس سے بیٹیاں چھین نہ لے جائے۔
”نہیں!“ اس نے بے حد ریشاں ہو کر بچوں پر دوبارہ کبل یوں ڈالا جیسے انہیں ساری دنیا سے چھاپا لپٹا رہا۔ اسی عالم میں ادھر سے ادھر ٹپکنے لگی۔

سڑیوں کی خاموش رات کا سفر ست روی سے جاری تھا اور اس کی صبح بہت دور تھی جب وہ کسی نتیجے پر تھی۔
صبح وہ معمول کے مطابق اٹھ گئی۔ نماز کے بعد روزانہ کی طرح میسونہ بھابھی کے ساتھ مل کر ناشتا بنایا پھر لپٹا پہلے اماں جی کے کمرے میں آکر کھنے لگی۔

”اماں جی! صباحت کو تیار کرویں۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ کیونکہ رات اس کی طبیعت ٹھیک ہاسپنل میں اس کا چیک اپ کروالوں گی۔“
”پھر سارا دن کیا کرو گی؟“ اسے سنبھالو گی؟“

”کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ بس آپ تیار کر دیں۔“ اس نے بہت عجلت میں کہا اور اباجی کو اپنی طرف دیکھنے اشارا کرتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

اباجی فوراً ”ہی اس کے پیچھے آگئے تھے۔“
”کیا ملے کیا ہے تم نے؟“

”بس سکندر کا فون آئے تو اس سے کہہ دیجئے گا کہ ہاسپنل آکر بچے کو دیکھ لے اور آج ہی کیونکہ میں روز ساتھ نہیں لے جاسکتی۔“ وہ بہت نارمل انداز میں بول رہی تھی۔

”اور دیکھ؟“ اباجی کچھ حیران تھے۔
”نہیں اباجی! اسے مدیحہ کا معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ کبھی نہیں۔“ وہ ایک دم اباجی کے سینے سے لگ گئی

کا پتے وجود کو دھیرے دھیرے چھٹکنے ہوئے اباجی سمجھ گئے کہ وہ اندر سے کتنی خوفزدہ ہے اور اسی خوف کے باعث ہمیشہ کے لیے شاہ سکندر سے چھپا رہی ہے۔

”ڈرومت بیٹا! تم سے ہمارے بچے کوئی نہیں لے سکتا۔ چلو تیاری کرو۔ وہ تمہاری ڈاکٹر یا سمین آنے والا جی نے اسے وقت کا احساس دلایا تو وہ ان سے الگ ہو کر اماں کی طرف بڑھ گئی۔

پھر صباحت کا فایز اور دودھ وغیرہ بیگ میں رکھنے تک یا سمین کی گاڑی کا ہارن بجنے لگا تھا۔ ادھر اماں جی ملنا رہی تھیں انہیں شاید بچی کو ہاسپنل لے جانا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جب وہ خود ڈاکٹر ہے اسے چیک کرتی لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ان کی ساری باتوں پر بس ہوں، ہوں کرتی رہی اور پھر صباحت کو ان کی گود سے نکل آئی۔

”ارے ایہ بچہ کس کا ہے؟“ اس کے میٹھی سی یا سمین نے اشتیاق سے پوچھا۔
”میری بیٹی ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا تو یا سمین اچھل پڑی۔

”ہائیں! اہم میڈیو! مکمل ہے۔ میں اب تک تمہیں۔“ موڈ کاٹنے کے لیے مخالف سمت دیکھتے ہوئے یا سمین ادھر کی رہ گئی۔

”وہ ہاسپنل میں میرا بیٹیجہ ہے ناں، نیل وہ بہت ضد کر رہا تھا کہ میں اسے لے کر آؤں، وہ کھیلے گا اس سے فوری بچی کو ساتھ لے جانے کا جواز سوجھ گیا تھا۔

”تمہارے بیٹیجے کے ساتھ بڑی ٹرینڈی ہوئی ہے۔ مجھے اس کی ماں پر غصہ آتا ہے۔ کیسی ظالم عورت ہے۔“

”اے سنی قربانیاں دیتی ہیں۔“ یا سمین تاسف سے کہہ رہی تھی ”اس بات سے بے خبر کہ اس کی باتوں سے اس ماں کے

بے نیابت رہی ہے۔“
پھر سارا وقت وہ بہت بے کل رہی تھی۔ ہر آہٹ پر اس کی دھڑکنیں کبھی بہت تیز ہو جاتیں اور کبھی رکنے لگتیں۔ وقفے وقفے سے نیل کے کمرے میں جا کر صباحت کو دیکھتی اور اس کی موجودگی کا اطمینان کرنے کے بعد بھی مطمئن نہیں ہو رہی تھی۔ وہ یہاں سے بہت دور جاسکتی۔ جہاں تک شاہ سکندر کی سوچ کی بھی رسائی ممکن نہ ہوتی۔ جانے وہ شخص اسے

زہرے پر کونست کیوں تھا۔ وہ تو سبیل ہی بہت ٹوٹ چکی تھی۔
”شاہ سکندر حیات! تم اگر مجھے اپنے سامنے گڑ گڑانا ہوا دیکھنا چاہتے ہو تو میں تمہارے سامنے صرف ہاتھ ہی نہیں دیں گی، تمہارے قدموں پر سر رکھ دوں گی، بس تم ہماری زندگی سے نکل جاؤ۔ میں اپنی انا خودداری اور اپنی ہستی کا غرور تمہارے سامنے منازاؤں گی بس ایک وعدے پر کہ تم میری متا کو زک نہیں پہنچاؤ گے۔

میں جانتی ہوں، تم احساس برتری کا شکار ہو اور اس روز میرے تلخ رویے نے شاید تمہارے اس احساس کو چیلنج کیا ہے تم مجھ سے جینے کا ہانا بھی چھین لینا چاہتے ہو۔ میں تمہیں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں سکندر حیات! لیکن تم مجھے نہیں مجھے۔“

”ماں! نون کی نیل سے اس کی سوچیں منتشر ہو گئیں۔ گہری سانس کے ساتھ اس نے ریپور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری

نہ اباجی تھے اس کی آواز سننے ہی کھٹکے۔
”بیٹا! شاہ سکندر تمہارے پاس آ رہا ہے۔“

”جی! وہ اسی قدر کہہ سکی۔“
”پھریشان تو نہیں ہو بیٹا؟“

”نہیں نہیں اباجی! میں پریشان نہیں ہوں۔ فیس کر سکتی ہوں اسے، آپ فکر نہیں کریں۔“ وہ فوراً ”بولی تھی۔“

”مجھے بات ہے۔“ اباجی نے فون بند کر دیا تو وہ اٹھ کر نیل کے کمرے میں آ گئی۔
نیل سو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑکی کے پاس رک کر سڑک پر آئی جانی گاڑیوں کو دیکھتی رہی پھر صباحت کو اٹھا کر دوبارہ اپنے

رے میں آ گئی۔ جو کچھ اسے وہ پہلے ہی کہہ آئی تھی کہ کوئی اس کا پوچھے تو اس کے کمرے میں بھیج دے۔ زیادہ دیر نہیں بڑی تھی کہ شاہ سکندر کا وجہ سرپا دروازے میں نمودار ہوا تھا۔

”سے آئی کم ان ڈاکٹر!“ شاہ سکندر نے انگلی موڑ کر دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا تو دھیرے سے سر اٹھا کر دیکھتے

”اے! ہندو عاٹسے کو ساکت ہو گئی تھی۔“
”اسلام علیکم!“ شاہ سکندر چند قدم آگے آگیا، اور وہ جو بہت کچھ سوچ کر بیٹھی تھی۔ کوئی ایک بات نہیں کہہ سکی۔

”اے! ہندو عاٹسے کو ساکت ہو گئی تھی۔“
”اے! ہندو عاٹسے کو ساکت ہو گئی تھی۔“

”اے! ہندو عاٹسے کو ساکت ہو گئی تھی۔“
”اے! ہندو عاٹسے کو ساکت ہو گئی تھی۔“

”اے! ہندو عاٹسے کو ساکت ہو گئی تھی۔“
”اے! ہندو عاٹسے کو ساکت ہو گئی تھی۔“

”اے! ہندو عاٹسے کو ساکت ہو گئی تھی۔“
”اے! ہندو عاٹسے کو ساکت ہو گئی تھی۔“

جانے کیوں سلامت ہے اور اسی کے بھروسے پر میں آپ سے التجا کر رہی ہوں۔“
اس نے بہت دھیرے دھیرے شاہ سکندر کی طرف رخ موڑا تو اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی اور بندھے بازو ساکت ہو گیا تھا۔

”مجھے بار بار ٹوٹنے سے بچالیں شاہ سکندر راہِ بچی مجھے بخش کر ہمارے لیے اجنبی ہو جائیں۔ شاید اس طرح میرا
ورنہ آپ کی بار بار آمد مجھے۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”میں بچی لینے تو نہیں آیا۔ میں تو صرف۔“
شاہ سکندر کے اندر دیکھنے والا پر جیسے قطرہ قطرہ خشم پکھنے لگی تھی کہ اس روز سر راہ اس کے غور کو یہ دیکھ کر
جانے والی اس وقت ہاتھ جوڑے اپنی کم ہانگی، کم ہمتی کا اعتراف کر رہی تھی۔

”میں تمہارا مان نہیں توڑوں گا آسیہ! وہ رفاقتیں جو خواب ہو گئیں ان کی ایک زندہ حقیقت یہ بچی تمہارا
بہشت والی برکت چال سے اس کے قریب آیا اور بچی اس کے بازوؤں میں تھما کر کہنے لگا۔ ”اس کے لیے تو
چاہو لے سکتی ہو۔ اسی وقت۔“

”بس ایک وعدہ۔“ وہ ہنسی کی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔
”میں تمہارے کئے بنا وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد اگر تمہارے راستے میں رکنے اور تمہیں پکارنے کا ہر لحاظ
کو تمہارے سامنے ٹوٹ کر لوں گا۔ ہاں اگر تمہیں کبھی اس بچی کے لیے میری ضرورت پڑے تو پکار لینا۔“

لیے پلٹا پھر ایک خیال کے تحت اچانک رک کر کہنے لگا۔ ”یہ وعدہ تو تمہارے لیے ہے اور بچی۔“
”بچی کی بستی اسی میں ہے والدین کے درمیان کش مکش بچوں کو تو ڈر رکھ دیتی ہے اور میں نہیں چاہتا
بچہ۔“ اس نے فوراً ”نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا پھر قدرے توقف سے کہنے لگی۔ ”آپ یقیناً ”میری بات“

کے میں اسے مکمل دیکھنا چاہتی ہوں۔“
شاہ سکندر نے اثبات میں سر ملاتے ہوئے گہری نظروں سے اسے دیکھا پھر خدا حافظ کہہ کر ہار نکل گیا تو اپنی
پر جہاں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی وہاں اندر ڈھیروں اطمینان اتر آیا تھا۔

”میری بچی، میری گزیا!“ اس نے صباحت کو اپنے سینے میں پیچھ لیا تھا۔
* ☆ * ☆ *

”بس میمونہ بھابھی! اب مجھے کوئی فکر نہیں۔ شاہ سکندر اب کبھی میرے راستے میں آئے گا نہ بچوں کے یا
کرنے کی کوشش کرے گا۔“ رات میں وہ میمونہ بھابھی کو اپنا کارنامہ بتا کر کہنے لگی۔ ”میں سمجھ گئی تھی کہ وہاں
تو جن کا بدلہ لینے کے لیے مجھے اپنے سامنے جھکانا چاہتا ہے اور میں نے پہلے ہی مقام پر اس کے سامنے ہاتھ
کو تسکین پہنچا دی۔“

”ہاتھ جوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟“ ”میمونہ بھابھی کو بہت برا لگا۔
”ضرورت تھی بھابھی! اور نہ وہ ساری زندگی ہمارے درمیان موجود رہتا۔ گو کہ وہ کس کر کے بھی ہار جاتا تھا
ملنے رہنے کا حق حاصل کر سکتا تھا اور اور ظاہر ہے ہمیں کورٹ کا فیصلہ ماننا پڑتا پھر میرے لیے یہ مسلسل زندگی
ہنپتے وہ بچوں سے ملنے آ رہا ہے اس لیے میں نے بہت سوچ کر اس کے سامنے خود کو بہت مجبور اور بے بس لگا
چاہتا تھا جب ہی رہنے آرام سے وعدہ کر گیا ہے کہ آئندہ کبھی میرے راستے میں نہیں آئے گا۔“

اس نے کہا تو میمونہ بھابھی نے یوں سر جھکا جیسے انہیں شاہ سکندر کے ذکر سے کوئی دلچسپی نہ ہو پھر موضوع
”اچھا سنو وہ عدیل کی شادی کا کیا پروگرام ہے؟ امان جی نالہ کے لیے تو نہیں مان رہیں۔“

”میں بھی نہیں مان رہی۔ میرا مطلب ہے میں بھی نہیں چاہتی کہ عدیل بھائی کی شادی وہاں ہو۔ ہم کو
لیتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”تو کیوں کی کمی نہیں ہے لیکن۔“
”لیکن لیکن کچھ نہیں بھابھی! ہم بس کوئی اور لڑکی دیکھیں گے۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہی کہ مجھے

اوپر سے کوئی بغض ہے بلکہ صرف اس لیے کہ شاہ سکندر کا وہاں بہت آنا جانا ہے وہ نالہ کی شادی میں بھی ضرور آئے
رہو سکتا ہے۔ اس کے بعد بھی میل جول رکھتی جو کہ عدیل بھائی بھی پسند نہیں کریں گے اور خواہ مخواہ کی بد مزگی ہوگی
نہیں۔“ جھگڑا رہے گا۔“

”خلاف توقع میمونہ بھابھی نے فوراً اتفاق کر دیا پھر پوچھنے لگیں۔ ”اور کوئی لڑکی؟“
”جو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ خلاف توقع میمونہ بھابھی نے فوراً اتفاق کر دیا پھر پوچھنے لگیں۔ ”اور کوئی لڑکی؟“
فغان میں تو کوئی ہے نہیں اور آس بڑوس کا مجھے نہیں پتا۔ ایک تو میرے بھائی سارے بس ایسے ہی ہیں ساری
کہاں بہن کی نظر سے دیکھتے ہیں۔“ اس کی بات پر میمونہ بھابھی اچھل پڑیں۔

”کہاں بہن کی خوش فہمی۔ اتنے شریف نہیں ہیں تمہارے بھائی سب کا پتا ہے مجھے۔“
”انہرے بہن کی خوش فہمی۔ اتنے شریف نہیں ہیں تمہارے بھائی سب کا پتا ہے مجھے۔“
”اچھا! وہ میمونہ بھابھی کے اچھلنے پر بے ساختہ ہنسی بھی۔ ”کیا پتا ہے؟“

”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“
”دیکھتی ہی نہیں۔“ اس نے فوراً ”ان کی بات اچھل کی۔“
”دیکھتی ہی نہیں۔“ میمونہ بھابھی نقل اتار کر بولیں۔ ”بھگتے ہو جاتے ہیں۔“

”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“
”دیکھتی ہی نہیں۔“ میمونہ بھابھی نقل اتار کر بولیں۔ ”بھگتے ہو جاتے ہیں۔“
”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“

”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“
”دیکھتی ہی نہیں۔“ میمونہ بھابھی نقل اتار کر بولیں۔ ”بھگتے ہو جاتے ہیں۔“
”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“

”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“
”دیکھتی ہی نہیں۔“ میمونہ بھابھی نقل اتار کر بولیں۔ ”بھگتے ہو جاتے ہیں۔“
”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“

”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“
”دیکھتی ہی نہیں۔“ میمونہ بھابھی نقل اتار کر بولیں۔ ”بھگتے ہو جاتے ہیں۔“
”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“

”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“
”دیکھتی ہی نہیں۔“ میمونہ بھابھی نقل اتار کر بولیں۔ ”بھگتے ہو جاتے ہیں۔“
”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“

”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“
”دیکھتی ہی نہیں۔“ میمونہ بھابھی نقل اتار کر بولیں۔ ”بھگتے ہو جاتے ہیں۔“
”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“

”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“
”دیکھتی ہی نہیں۔“ میمونہ بھابھی نقل اتار کر بولیں۔ ”بھگتے ہو جاتے ہیں۔“
”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“

”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“
”دیکھتی ہی نہیں۔“ میمونہ بھابھی نقل اتار کر بولیں۔ ”بھگتے ہو جاتے ہیں۔“
”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“

”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“
”دیکھتی ہی نہیں۔“ میمونہ بھابھی نقل اتار کر بولیں۔ ”بھگتے ہو جاتے ہیں۔“
”جی کہ اس میں سے ایک کو ماں کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کو بہن کی اور باقی اٹھ کو۔“

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو گھر پر آرام کرتیں۔ کیوں چلی آئیں؟"

"میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ بس رات میں بچپوں کی وجہ سے نیند پوری نہیں ہوئی اس لیے کچھ ہوں۔" اس نے اندر ہی اندر خود کو سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

"چائے منگواؤں یا ایسا کرو اپنے نتیجے کے کمرے میں جا کر ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے سو جاؤ۔" یاسمین اس نے سہولت سے رد کر دیا۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے چائے پینے سے میں فریش ہو سکتی ہوں۔"

یاسمین نے دروازے تک جا کر ماسی سے چائے کا کما پھرواپس اپنی جگہ آکر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"کتنے بچے ہیں تمہارے؟"

"دو بیٹیاں ہیں۔"

"جہاں تم رہتی ہو وہ غالباً تمہارا میکہ ہے اور تمہارے میاں کہاں ہوتے ہیں؟"

یاسمین کے انداز میں کوئی تجسس نہیں تھا۔ بلکہ وہی عام سی باتیں عام سا انداز۔

"مجھے طلاق ہو چکی ہے اس لیے اب میں اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں جانتی کہ وہ کہاں ہوتا ہے کے بارے میں کوئی اور بات کرنا چاہتی ہوں پلیز۔"

اس نے سچ بول کر یاسمین کو مزید سوال جواب سے روک دیا تو وہ جو طلاق کا سن کر حیران ہو رہی تھی قدر گئی۔

"افسوس کا اظہار تو کرنے دو یا وہ بھی نہیں۔"

"نہیں۔" اس نے کمری کی پشت پر سر رکھ کر پلکیں موند لیں تو کتنے لمحے چپ چاپ سرک گئے پھر ایسا چا تب اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور فوراً "چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔"

"مجھے تم بہت ڈسٹرب لگ رہی ہو۔" یاسمین سے رہا نہیں گیا۔ "کیا اسی سلسلے میں کوئی بات ہوئی ہے شخص کی طرف سے؟" اس نے نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

"پھر کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں ہے یا راسب ٹھیک ہے۔" وہ خالی کپ ٹرے میں رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں نیل۔"

ہوں ڈاکٹر شوباب پوچھیں تو بتا دیتا۔"

"اور ڈاکٹر احسان پوچھیں تو کیا کہوں۔" یاسمین کے معنی خیز انداز پر وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ انہیں تمہاری بہت فکر رہتی ہے۔ ہر آدھے گھنٹے بعد آکر پوچھتے ہیں کہ تم کہاں ہو گیا و غیرہ۔" یاسمین کا انداز ہنوز تھا جس سے اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں اور کچھ دیر سوچنے کے "اگر تم سچ کہہ رہی ہو تو اب ان کے پوچھنے پر تیار رہنا کہ میں اپنے بچے کے پاس ہوں۔"

"یعنی؟" سوالیہ انداز میں یاسمین کی ابروؤں نے جنبش کی تھی۔

"نیل میرا بیٹا ہے۔" وہ کہہ کر کمرے سے نکل آئی تھی۔

نیل کو سسرال کے سسرال کو راز رہی تھی۔ وہ ایک طرف کھڑی ہو کر توجہ سے دیکھنے لگی۔ وہ اب پہلے کی طرح نہیں رہا تھا۔ اس کی صحت اچھی ہو رہی تھی اور سسرال کے کھڑا بھی ہو جاتا تھا لیکن چل نہیں سکتا تھا۔ شاید گرنے کا خوف تھا۔ جو قدم اٹھانے سے ڈرتا تھا ابھی بھی وہ یہی دیکھ رہی تھی کہ سسرال اس کا پیرا تھا۔

کا پنے لگتا۔

"بیٹا! بہت سے کام لو۔ آپ تو بہت بہادر ہو۔ آؤ میرے پاس آؤ۔" وہ اس کے سامنے چند قدم کے

ہوئی۔

"نہیں بھوپو! میں نہیں چل سکتا۔" نیل نے بہت بے بسی سے کہا تو اس نے بروہہ کرا سے کندھوں سے

"بہت ساتھ چلو! میں آپ کو گرنے نہیں دوں گی۔"

"نیل! اپنے دونوں بازو اس کی کمر میں ڈال کر اس سے چپک گیا۔" میری ٹانگوں میں درد ہو رہا ہے مجھے بید پر لٹا۔

چدی کریں پچھو! میں گر رہا ہوں۔"

"اے بیٹا! اوک۔" اس نے سسرال کی دستانے سے بید پر لٹا یا پھر سسرال کو جانے کا کہہ کر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے ہوئی۔

میں تو آپ اماں جی کے پاس نہیں جا سکتی۔" وہ آپ کو کتنا یاد کرتی ہیں۔"

میں جی میرے پاس کیوں نہیں آتیں؟" نیل نے پوچھا۔

"میں جی۔" اس نے مختصر جواب دے کر موضوع بدلا اور پھر ادھر ادھر کی باتوں میں اس کا اور شاید اپنا بھی دھیان لگاتی تھی۔

* ☆ * ☆ *

بہت دن اس نے صبح ہی میمونہ بھائی سے کہا تھا کہ آج وہ اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ چلیں۔ وہ اپنا سوت لانا چاہتی تے اور انہوں نے منع تو نہیں کیا تھا لیکن گھر کے کاموں سے نکل ہی نہیں پاری تھیں۔ موگھر ہوں تو می بیٹھتے جاتے ہیں۔ دپہر کے کھانے کے بعد بھی خلیل بھائی ان کے سر پر سوار تھے۔ تب اباجی سے اجازت لے کر وہ بھائی سے ان کی گاڑی لے کر نکلی۔ احمد اور سونیا کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔

انے کتنے دنوں بلکہ مہینوں بعد وہ اس گھر میں داخل ہوئی تھی جسے کبھی وہ اس زمین پر اپنی جھوٹی سی جنت کہا کرتی تھی۔ اپنی جگہ اسی طرح موجود تھی جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ ایک ایک قدم پر کرک رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے خواب ل رہی ہو جبکہ اس کے اندر سناٹوں کا راج تھا۔

بھوپو! یہ دروازہ کھول دیں۔" احمد کے پکارنے پر اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا پھر بید روم میں آئی تو وہ میز پر کوہ چین کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے کے کنڈی کرانے کے ساتھ تنیدہم کی۔

خبردار گرل کے اوپر چڑھ کر بیٹھے نہیں جھانکنا اور شور بھی نہیں کرنا۔"

سونیا کو منع کریں۔ یہ بہت شور کرتی ہے۔"

میں دونوں سے کہہ رہی ہوں اور اگر تم دونوں آرام سے بیٹھو گے تو میں واپسی میں تمہیں بہت اچھی آکس کریم لگائی۔" اس نے آکس کریم کا لالچ دے کر دونوں کو خوش کر دیا۔ پھر اندر آکر پہلے اپنا سوٹ کیس اتارا اور اس میں مارت بھر لے کر پڑے نکال کر الماری میں ڈالے اور وہاں سے سادے سوٹ نکال نکال کر سوٹ کیس میں رکھنے لگی۔

میں اسے غصہ بھر لگ گیا اور اتنی دیر میں احمد اور سونیا میز سے اٹھا کر کہہ رہی تھیں اپنے مطلب کی چیزیں تلاش میں لگ گئے تھے اور اس نے انہیں ادھر ادھر بھاگتے ہوئے دیکھا ضرور لیکن ٹوکا نہیں نہ ہی کسی چیز کو پھینٹنے سے بازو نہ لگے ساری باتیں وہاں ہوتی ہیں جہاں کسی کے سامنے وہی کا خدشہ ہو اور وہ ایک تو ان خدشات سے بوجھ کر تھی دوسرے برائے اس کی نظروں میں اپنی پہلے والی اہمیت کھو چکی تھی پھر وہ کیوں منع کرتی۔ پورے دھیان سے کام میں مصروف رہی۔ کپڑوں کے بعد سینڈل بھی نکال کر رکھیں پھر در در پری چیزیں سوچ رہی تھی کہ سونیا آکر

بھوپو! یہ دروازہ کھول دیں۔" احمد کے پکارنے پر اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا پھر بید روم میں آئی تو وہ میز پر کوہ چین کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے کے کنڈی کرانے کے ساتھ تنیدہم کی۔

خبردار گرل کے اوپر چڑھ کر بیٹھے نہیں جھانکنا اور شور بھی نہیں کرنا۔"

سونیا کو منع کریں۔ یہ بہت شور کرتی ہے۔"

سونیا نے آکس کریم کا لالچ دے کر دونوں کو خوش کر دیا۔ پھر اندر آکر پہلے اپنا سوٹ کیس اتارا اور اس میں مارت بھر لے کر پڑے نکال کر الماری میں ڈالے اور وہاں سے سادے سوٹ نکال نکال کر سوٹ کیس میں رکھنے لگی۔

میں اسے غصہ بھر لگ گیا اور اتنی دیر میں احمد اور سونیا میز سے اٹھا کر کہہ رہی تھیں اپنے مطلب کی چیزیں تلاش میں لگ گئے تھے اور اس نے انہیں ادھر ادھر بھاگتے ہوئے دیکھا ضرور لیکن ٹوکا نہیں نہ ہی کسی چیز کو پھینٹنے سے بازو نہ لگے ساری باتیں وہاں ہوتی ہیں جہاں کسی کے سامنے وہی کا خدشہ ہو اور وہ ایک تو ان خدشات سے بوجھ کر تھی دوسرے برائے اس کی نظروں میں اپنی پہلے والی اہمیت کھو چکی تھی پھر وہ کیوں منع کرتی۔ پورے دھیان سے کام میں مصروف رہی۔ کپڑوں کے بعد سینڈل بھی نکال کر رکھیں پھر در در پری چیزیں سوچ رہی تھی کہ سونیا آکر

بھوپو! یہ دروازہ کھول دیں۔" احمد کے پکارنے پر اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا پھر بید روم میں آئی تو وہ میز پر کوہ چین کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے کے کنڈی کرانے کے ساتھ تنیدہم کی۔

خبردار گرل کے اوپر چڑھ کر بیٹھے نہیں جھانکنا اور شور بھی نہیں کرنا۔"

سونیا کو منع کریں۔ یہ بہت شور کرتی ہے۔"

اس نے اگلے سوال سے بچنے کی خاطر فوراً اس کی توجہ احمد کی طرف مبذول کرائی پھر گرمی سانس کھینچ کر
 ”اس چالا کو کوسا رہی باتیں یاد رہتی ہیں۔“
 ”پھوپھو! احمد بھائی ٹیپ کے مٹن خراب کر رہے ہیں۔“ سونیانے لاؤنج سے چلا کر اسے اطلاع دی تو اہوا
 آواز میں بولا۔
 ”خراب نہیں کر رہا پھوپھو! کیسٹ لگا رہا ہوں۔“
 ”افوہ! وہ قدرے جھنجھلا کر کمرے سے نکلنے لگی تھی کہ کیسٹ سے ابھرتی آواز نے دروازے میں ہی اس
 دیے۔

جب کوئی پیار شخص سے بلائے گا
 تم کو ایک شخص یاد آئے گا
 وہ بس ایک بل کو رکھتی تھی۔ دوسرے بل تیزی سے ٹیپ ریکارڈ کا پلگ ہی کھینچ لیا اور غصے سے بولی۔
 ”سخت غلطی کی ہے میں سے تم دونوں کو لا کر۔ چلو واپس۔“
 ”پھوپھو! میں نے تو کچھ نہیں کیا۔“ سونیا بسور کر بولی۔
 ”بس اب رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو اپنے اپنے شوز پہنو۔ میں جا رہی ہوں۔“
 اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ کمرے میں جا کر پہلے میسر کی طرف کھٹنے والا دروازہ بند کیا پھر سوٹ کیس
 دونوں کو خاموشی سے شوز پہننے دیکھ کر اسے ان پر پیار آگیا پھر بھی قدرے رعب سے بولی۔
 ”چلو ابھی تم دونوں کو آؤں کریم بھی کھلائی ہے اور میں سوچ رہی تھی تم دونوں کو نیمل کے پاس بھی لے
 اب صرف آؤں کریم۔“
 ”آؤں کریم! ہم نیمل بھائی کے پاس جائیں گے۔“ سونیانے آؤں کریم پر نیمل کو ترجیح دے
 کر دیا تھا۔ وہ آگے آکر اس کا گال تھپکتی ہوئی بولی۔
 ”اب دیر ہو گئی ہے۔ نیمل کے پاس اگلے اتوار کو لے چلوں گی۔ ٹھیک۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ دونوں خوش ہو گئے۔
 ”چلو یہ سوٹ کیس باہر نکالو۔ میں کمرے بند کر لوں۔“ اس نے سوٹ کیس ان دونوں کے حوالے کر دیا
 دروازے لاک کر کے چلی تو جانے کیا خیال آیا۔ ٹیپ ریکارڈ میں سے کیسٹ نکال کر برس میں رکھ لی تھی۔
 ”ہاں بھئی کون سی آؤں کریم کھاؤ گے؟“ راتے میں اس نے ایک کولڈ کارنر دیکھ کر گاڑی روکتے ہوئے
 ہی کہنے لگی۔ جاؤ اپنی اپنی پسند سے لے آؤ۔“
 احمد اور سونیا فوراً ”اتر کر دوکان میں داخل ہو گئے تو اس نے شیشہ مگر اگر دکاندار کو انہیں آؤں کریم دینے
 پرس کھول کر پیسے نکال رہی تھی کہ قریب گاڑی رکنے کے ساتھ اسے مخاطب کیا گیا۔
 ”ایکسکیوز می۔“
 اس نے سراو نچا کر کے آواز کی سمت گردن موڑی اور احمد حسن کو دیکھ کر بغیر کسی تاثر کے بولی۔
 ”السلام علیکم۔“
 ”و علیکم سلام۔ ایا ہے کہ میں آپ کو دیکھ کر نظر انداز نہیں کر سکا۔ کیسی ہیں آپ؟“ احمد حسن نے
 کے خیال سے تمسید باندھی جسے وہ بیکسر نظر انداز کر گئی۔
 ”میں ٹھیک ہوں“ آپ کیسے ہیں بلکہ یہ پوچھنا چاہیے کہ ابھی تک اکیلے کیوں نظر آ رہے ہیں؟“
 ”اکیلی تو آپ۔“ وہ کہنے جا رہا تھا کہ اکیلی تو آپ ہو گئی ہیں لیکن فوراً احساس ہوئے پر خاموش ہو گیا اور
 بولی۔
 ”میں اکیلی نہیں ہوں۔“
 ”اتنی ایم سوری۔ میرا مقصد کچھ جتنا نہیں تھا بلکہ میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ سے افسوس کا اظہار کر
 احمد حسن نے معذرت کے ساتھ کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے قصداً سرسری انداز اختیار کیا اور دونوں بچوں کو دیکھنے لگی۔
 ”پھر بھی کچھ اچھا نہیں ہوا۔ میں اور میری والدہ بھی آپ سے بہت شرمندہ ہیں۔ یقین کریں شاہ سکندر نے ہمیں بتایا
 ہی نہیں تھا کہ۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا اور قدرے رکھائی سے بولی۔
 ”میں کسی کو الزام نہیں دیتی۔“
 ”آپ کی برائی ہے ورنہ۔“ احمد حسن پتا نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ وہ احمد اور سونیا کی طرف متوجہ ہو گئی تھی اور ان کے
 بچنے کے بعد ہاتھ بدھا کر دروازہ لاک کیا پھر ایک نظر اسے دیکھ کر بولی۔
 ”و کے خدا حافظ۔“ اس کے ساتھ ہی گاڑی آگے بدھا دی تھی۔

* ☆ * ☆ *

شاہ سکندر کو اپنے بیٹے آغا کے ایڈمیشن کے سلسلے میں مری جانا تھا۔ جہاں اس کے دوسرے بھتیجے بھتیجیاں پڑھتے تھے
 یکن مرثساء اسے جانے نہیں دے رہی تھی۔ کیونکہ ان ہی دنوں اس کی ڈیوری متوقع تھی۔ اور وہ چاہتی تھی شاہ اس
 کے ساتھ رہے۔ جس پر وہ بے حد جھنجھلا رہا تھا۔
 ”دھرم ایڈمیشن کی ڈیٹ نکل گئی تو پھر ایک سال ضائع ہو جائے گا۔ تم سمجھتی کیوں نہیں۔ یہاں تم اکیلی تو نہیں ہو۔
 بابا جان بھائی جان ہیں آخر پہلے بھی تو یہی خواتین تمہارے ساتھ تھیں۔“
 ”سلیکے بات نہیں کریں۔ اس وقت آپ میرے نہیں تھے پھر بھی مجھے آپ کا بہت انتظار رہا تھا“ اتنا کہ میں بچنے کی
 ڈنڈی بھی نہیں مناسکتی تھی۔ ”وہ منہ پھلائے کہہ رہی تھی۔“
 ”پھر ہمارا ایڈمیشن کیا کریں۔ مجھے آغا کو اسی سال اسکول داخل کرنا ہے ورنہ وہ اپنی عمر کے بچوں سے پیچھے رہ جائے گا اور یہ میں
 نہیں چاہتا۔ تم بھی سن لو پڑھائی کے معاملے میں میں کسی قسم کی رعایت نہیں دوں گا۔ تم اگر ٹھیک ہو تیں تو تمہیں بھی
 ہاتھ لے چلا اب مجبوری ہے۔ میں بس دو دن میں واپس آ جاؤں گا۔“ اس نے قدرے نرم پڑ کر کماتو مرثساء نے کچھ بے
 غج سے پوچھا۔
 ”کیا بات ہے؟“
 ”ہاں مجھے اور کوئی کام نہیں ہے وہاں بس آغا کا ایڈمیشن کروا کے واپس آ جاؤں گا۔“ اس نے یقین دلایا پھر اسے دیکھ کر
 کہنے لگا۔ ”تم بھی اس کی پیکنگ کرو دو تو میں صبح ہی نکل جاؤں گا پھر برسوں شام میں میری واپسی بھی ہو جائے گی۔“
 ”رسوں شام ٹھیک ہے۔“ وہ پیکنگ کے خیال سے کھڑی ہوئی پھر ایک دم رک کر بولی۔ ”شاہ! میں آغا کے بغیر کیسے
 رہوں گی؟“
 ”مجھے یوں بھائی اور جانیگر بھائی کی بیگمات رہتی ہیں۔ بچوں کی بہتری کے لیے یہ عارضی دوری سہی پڑتی ہے مرثساء
 اور ابھی تو یہ بیس مری جا رہا ہے جبکہ مجھے اسے باہر بھی بھیجنا ہے جہاں سے اعلیٰ تعلیم کے بعد جب یہ لوٹے گا تو نظر لگ
 جانے کے خیال سے تم اسے دیکھنے سے گریز کرو گی۔“
 ”مائی سن آغا! کون سی دل رین فرام امریکہ ہی دل زیل ایجوکیشنڈ ذیل مینڈو اینڈ ویل پر سنالٹی لائیک می۔“ اس نے
 مرثساء کو روشن گل کی جھلک دکھا کر خوش کروایا تھا۔
 ”اے لکناؤ! ادھر آؤ۔“ اس نے آغا کو متوجہ کر کے اپنے پاس بلایا تو وہ لا پرواہی سے بولا۔
 ”میں کھیل رہا ہوں۔“
 ”سارے کھیل بند۔ اب صرف پڑھائی ہو گی۔“ اس نے خود ہی اٹھ کر اسے گود میں اٹھالیا جس پر وہ احتجاج میں ہاتھ
 پک پکاتے ہوئے۔

◆◆◆◆◆ ♡ ◆◆◆◆◆

”بوتھن نہیں۔“ اس نے ٹوکا تھا کہ مرثساء فوراً ”بول پڑی۔“
 ”پتہ۔“ اسے کیا پتا بد تمیزی کیا ہوتی ہے۔“
 ”بوتھن کہتے کہتے رہ گیا اس خیال سے کہ بچے کو کون سا یہاں رہنا ہے۔ کل تو چلے جانا ہے پھر مرثساء سے الجھنے کا کاغذ۔“

جو بالکل جاہل عورت تو نہیں تھی لیکن ضد میں اس کی ہر بات کا الٹ ضرور کرتی تھی۔ اور وہ کافی حد تک اس لیے خُص اُپنا موڈ خراب ہونے کے خیال سے خاموشی اختیار کر لیتا تھا۔

پھر صبح ناشتا کرتے ہی وہ آٹا کو لے کر کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔ جہاں سے وہ بچے اسے اسلام آباد لے گیا۔ اس سے پہلے وہ جمالیہ بھائی کی چھوٹی بیٹی کے ایڈمیشن کے سلسلے میں ان کے ساتھ گیا تھا۔ تو تمام راستے رہا تھا کہ اتنی سی بچی کو آپ ہاسٹل میں چھوڑ دیں گے۔ اور اب اپنے بچے کو چھوڑتے ہوئے بھی اس کی بیٹی مرلہ سے تو کہہ دیتا تھا کہ بچوں کی سہری کے لیے ان کی عارضی دوری سہی پڑتی ہے۔ لیکن خود کو یہ بات اسے کچھ وقت لگا تھا کہ وہ بوس بھائی اور جمالیہ بھائی کے بچے بھی وہیں تھے اور بڑے والے تو انھیں غاسے کر رہے تھے پھر بھی واپسی کا تمام راستہ وہ بہت بے کل رہا تھا۔ جیسے چھوٹے سے بچے کو کہیں تنہا چھوڑ آیا ہو۔ یہ اس کی تھی جو اسے بے چین کرتی رہی تھی۔ اور اتفاق سے کوئی ساتھ بھی نہیں تھا جس کے ساتھ باتوں میں مددگار ہو سکتا۔ جب کراچی ایرپورٹ سے باہر نکلا تو ڈرائیور کو اپنا منتظر دیکھ کر کافی متعجب ہوا کیونکہ مرلہ سے اسے دن واپسی کا طے ضرور کیا تھا لیکن خود اسے بھی یقین نہیں تھا کہ وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق آسکے گا۔ اس نے اسے ڈرائیور کو بھی تاکید نہیں کی تھی کہ وہ اسے لینے پہنچ جائے۔ جب ہی حیران تھا اور ہلکا ہلکا ہوا پوچھنے لگا۔

”کس نے بھیجا ہے تمہیں؟“

”بڑی بیگم صیب نے۔ وہ ادھر اسپتال میں ہیں۔“ ڈرائیور نے بتایا تو وہ متوحش ہو گیا۔

”خیت تو ہے ناں؟“

”جی صیب۔“ ڈرائیور نے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس قدر کہا تو اس نے ہنسنے لگا۔

”اور کون ہے ان کے ساتھ؟“

”جی آپ کی بیگم صیب۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ چلو ادھر ہی چلو۔“ وہ سارا معاملہ سمجھ کر اطمینان سے ہو گیا اور بیٹھتی ہی اخبار اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس وقت جب ڈرائیور نے ہاسپٹل کے سامنے گاڑی روک کر اسے مطلع کیا تو اخبار دیکھتے دیکھتے لگا جبکہ ذہنی رو ہٹ گئی تھی۔

”سکندر راہ مرلہ سے تھی میں نے اسے دیکھا تھا۔ شاید ڈیوڑی کے لیے آئی تھی اس کی گود میں بچہ بھی تھا۔“ شٹ اپ آئیہ۔ اس وقت اس نے چلا کر اسے خاموش کر دیا تھا اور اب اس کا سامنا ہونے کا خیال اسے گھبراہٹ دے رہا تھا۔ اس کی بیوی اور بچے کے بارے میں وہ جان چکی تھی پھر بھی یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی اسے ہوگا، کتنی دیر بعد وہ گاڑی سے اتر کر اندر آیا اور بہت محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کاؤنٹر پر کھڑا مرلہ سے پوچھا تو وہ ہنس دیکھ کر تارتا لگی۔

”مرلہ سے۔ ابھی دو گھنٹے پہلے ایڈمٹ ہوئی ہیں۔ ان کا پہلا کس بھی نارمل نہیں تھا اور ابھی بچہ آپریشن آپریشن کے بارے میں آپ ڈاکٹر فرزانہ حسین سے معلوم کریں۔“

”ڈاکٹر فرزانہ حسین؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس کے عقب میں اشارہ کر کے بولی۔

”ادھر رائٹ ہینڈ روم نمبر فور میں ملیں گی۔“

”تھینک یو۔“ وہ جاتے جاتے پلٹا تھا۔ ”اور مرلہ کماں ہیں اس وقت؟“

”روم نمبر ایون۔“

”تھینکس اگین۔“ وہ بے آواز مگر تیز قدموں سے پہلے روم نمبر ایون میں آیا تو وہاں صرف بی بی جان اسے دیکھتی ہی کھنکھائی۔

”اچھا ہوا تم آگئے ڈاکٹروں کی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بتائیں کیا کیا بولتی ہیں۔“

”آپ کو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیس گھر پر بھی ہو سکتا تھا۔“ وہ خفا ہوئے لگا۔

”منع کر دیا تھا ڈاکٹر نے کل اتنی تھی مرلہ سے کوئی کہہ رہی تھی گھر پر نہیں ہو سکتا۔ آپریشن ہو گا۔“

”خود ہیں یہاں لے کر آئی تھی۔ آٹا نہیں ہوا ہے۔ اچھا اسپتال ہے میں نے سوچا۔“

”وہ ان کی تفصیل سے آگاہ کر دیں۔“

”ابھی نرس لے کر گئی ہے۔ پتا نہیں کیا کرنا ہے بی بی جان سوچنے میں لگ گئیں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”جھنجھک ہے۔ میں ڈاکٹر سے معلوم کر آؤں۔“

”وہ... نبیل کے گھر سے کوئی آنے والا تھا۔ اس کے نانائیاں یا شاید اس کی مہی۔“
 ”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ ڈاکٹر یاسمین نے کہا۔
 ”نہیں تو، میں پریشان کیوں ہوں گی! البتہ نبیل پریشان ہو جاتا ہے انہیں دیکھ کر اوکے۔ میں ذرا وارڈ کا چکر لگا کر
 اسے یاسمین سے اپنی کیفیت چھپانا مشکل ہو رہا تھا جب ہی سامنے سے چلی آئی۔
 اپنی وارڈ میں کل بیٹھ بیٹھے۔ اس نے ایک ایک بچے کے پاس رک کر چیک کرنے کے ساتھ اس کا حال
 پوچھا اور وہی روزانہ والی باتیں دہرائیں جو وہ بچوں کے اندر حوصلہ پیدا کرنے کے لیے کرتی تھی۔ پھر نبیل کے کمر
 آکر اسے اپنے جانے کا بتایا کیونکہ باج بچنے والے تھے۔

”چھو پھو! اگلے پھر صباحت کو لے کر آئے گا۔“ نبیل نے شوق سے کہا تھا۔
 ”بیٹا! ابھی وہ بہت چھوٹی ہے۔ بس اب کچھ دنوں کی بات ہے پھر میں آپ کو گھر لے جاؤں گی۔“ وہ کہتی ہوئی کو
 قریب آئی اور ذرا سا پردہ ہٹا کر نیچے دیکھنے لگی غیٹ کے سامنے تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں اور کیونکہ اس نے شاہ
 گاڑی سے اترتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لیے کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ موجود ہے یا جا چکا ہے۔

”شاید چلا گیا اور اگر نہیں بھی گیا تو...“ اس نے قدرے الجھ کر سر جھٹکا پھر نبیل کو خدا حافظ کہہ کر اپنا پرس
 اپنے کمرے میں آئی تو یاسمین موجود نہیں تھی۔
 ”سسر! ڈاکٹر یاسمین کہاں ہیں؟“ اس نے کمرے سے نکلنے ہی نرس سے پوچھا۔
 ”جی انہیں ڈاکٹر وہاب نے بلایا ہے، کمرہ دہی تھیں۔ آپ نیچے چلیں وہ ابھی آتی ہیں۔“ سسر کا جواب سن
 کی طرف بڑھ گئی۔

اس کے اندر غالباً ابھی بھی خوف موجو تھا جب ہی یاسمین کے انتظار میں کہیں رکنے کے بجائے وہ فوراً
 جانا چاہتی تھی تاکہ جانے پہچانے لوگوں کے سامنے کوئی بد مزگی نہ ہو۔ اس لیے لفٹ سے نکلنے ہی تیز قدموں
 عبور کر رہی تھی کہ عقب سے بھگتے قدموں کی آواز کے ساتھ ایک پکار بھی۔
 ”آس! آس!“

”میرے خدا!“ اس کے قدم اپنے آپ رک گئے۔ بے تحاشا دھڑکنے والے پر ہاتھ رکھ کر وہ ہلٹی تھی کہ اسی بل
 ہی بچی اس کی ناگوں سے لپٹ گئی اور اس کے پیچھے آتا شخص رک کر بولا۔
 ”سوری، یہ بچی بہت شرارتی ہے۔“

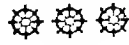
”کوئی بات نہیں۔“ اس نے دھیرے سے بچی کا ہال چھو کر کہا۔
 ”آس! چلو بیٹا! آپ بھی سوری کرو۔“ اس نے بچی کو بازوؤں میں اٹھا کر کہا تو وہ گہری سانس کے ساتھ ذرا سا
 ”آپ کی بیٹی ماشاء اللہ بہت پیاری ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟“
 ”آصفہ!“

”گڈ! گڈ نیم۔ اوکے ناں! گرل ہی ہو۔“ اس نے بچی کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو تھام کر ذرا سا ہلایا پھر جانے
 پر دعائے تھے کہ کچھ فاصلے پر شاہ سکندر کو ٹھٹھٹے دیکھ کر وہ پھر اسی حالت میں آگئی۔
 شاہ سکندر ٹھٹھٹا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ اور اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کافی دیر سے اس شغل
 ہے، نظر بہت بے نیاز سا اسے دیکھا بھی یوں جیسے پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو، لیکن ہونٹوں میں دلی مبہم مسکراہٹ
 کی غماز تھی کہ کچھ دیر پہلے کی صورت حال سے وہ اس کی کیفیات جان کر ایک انتہائی خوش محسوس کر رہا ہے۔
 آصفہ کا دل چاہا اسے روک کر پوچھے کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ اتنی جلدی اپنا وعدہ کیوں بھول گیا۔ لیکن
 سے وہ اس کے قریب سے گزر گیا۔ اس سے وہ بس اندر ہی اندر سلگ کر رہ گئی اور اس سے پہلے کہ وہ لپٹ
 قدموں سے باہر نکل آئی اور یاسمین کی گاڑی سے ٹیک لگا کر سوچنے لگی کہ آخر اس کا مقصد کیا ہے۔

”سوری۔ تمہیں کافی انتظار کرنا پڑا۔“ یاسمین کی آواز نے ہی اسے سوچوں کے بھنور سے نکالا تھا۔
 ”کیا کہہ رہے تھے ڈاکٹر وہاب؟“ اس نے گاڑی میں بیٹھتی ہی پوچھا۔

”وہ... نبیل کے گھر سے کوئی آنے والا تھا۔ اس کے نانائیاں یا شاید اس کی مہی۔“
 ”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ ڈاکٹر یاسمین نے کہا۔
 ”نہیں تو، میں پریشان کیوں ہوں گی! البتہ نبیل پریشان ہو جاتا ہے انہیں دیکھ کر اوکے۔ میں ذرا وارڈ کا چکر لگا کر
 اسے یاسمین سے اپنی کیفیت چھپانا مشکل ہو رہا تھا جب ہی سامنے سے چلی آئی۔
 اپنی وارڈ میں کل بیٹھ بیٹھے۔ اس نے ایک ایک بچے کے پاس رک کر چیک کرنے کے ساتھ اس کا حال
 پوچھا اور وہی روزانہ والی باتیں دہرائیں جو وہ بچوں کے اندر حوصلہ پیدا کرنے کے لیے کرتی تھی۔ پھر نبیل کے کمر
 آکر اسے اپنے جانے کا بتایا کیونکہ باج بچنے والے تھے۔

اس کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوگی، تب فائل بند کر کے بیک پر سر رکھتے ہوئے اس نے پگلیں موند کر خود کو
کے جھوم میں چھوڑ دیا تھا۔



گہرا تھا کہ وہ ہر معاملے میں مہر النساء سے مات کھائی ہے۔
سب کو بصورتی میں۔

رست میں بھی۔
ایک ساری بات ہی قسمت کی تھی جو وہ جیت کر بھی باری تھی اور مہر النساء ہار کر بھی جیت رہی تھی۔ اور گو کہ
ہر کاشا سکندر سے کوئی تانا کوئی تعلق نہیں تھا پھر بھی اس پر حق رکھنے والی اس عورت سے وہ فطری رقابت
نکالنے لگی تھی، مگر دیر تک وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی پھر اس کا دل چاہا وہ اسے قریب سے دیکھے کہ
کے کوئی حسن میں کیا اسرار ہے جو شاہ سکندر کبھی مکمل طور پر اس کی گرفت میں چلا جاتا ہے اور کبھی اس
نظر سے اس کا شاید گہرا اثر اور پھر جھلکتا پھرتا ہے۔
اس نے اس وقت سے نہیں دیکھی تھی۔ دوبارہ یا سمین نے آکر اسے اس بھنور سے نکالا تھا۔ ”مسئلہ کشمیر
لے میں لگی ہو یا۔۔۔؟“

ہم لوگ اپنے مسائل حل کر لیں، یہی بڑی بات ہے۔ ”وہ اسٹیٹس کوپ لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔“ ”چھا
میں ذرا نیچے جا رہی ہوں، ڈاکٹر فرزانہ حسین کے پاس۔“

نہایت؟
ہاں وہ میری بھابھی کے ساتھ کچھ پرالیم ہے۔ تیسرے بچے کے بعد انہوں نے پانچ سال کا گپ لیا تھا

۔۔۔
ہر میری انداز میں بولتی ہوئی کمرے سے نکل کر سیدھی لفٹ میں داخل ہو گئی تھی۔ لیکن نیچے آکر وہ الجھ کر
دور نظر کرنے لگی کہ وہ کیوں مہر النساء کے بارے میں جانتا چاہتی ہے۔ اس کے حسن میں اسرار ہو یا جاو
کیا۔۔۔ لیکن وہی بات کہ انسان جس سے مات کھا جائے اسے کسی بھی طرح مات دینے بغیر چین سے نہیں
۔ اور گو کہ اس کے پاس مہر النساء جیسا کوئی مہو نہیں تھا۔ پھر بھی اس کے مقابل جانے سے خود کو روک نہیں
۔ اور پہلے ڈاکٹر فرزانہ حسین کے کمرے میں آئی اور ابتدائی رسمی جملوں کے بعد بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے

پہلے آپ ریشن کیس تھا؟۔
”ہاں، خاصا سیر لیں۔ اس لڑکی کا پہلا کیس بھی ایسا ہی تھا، اصل میں یہ دیہاتی لوگ آخر وقت تک اپنے ٹوکے
دل کرتے ہیں۔ میں ابھی اسے ہی دیکھنے جا رہی ہوں چلو گی۔“

ڈاکٹر فرزانہ سمین نے جیسے اس کی مشکل حل کر دی۔
”نہ، وہ اپنا جنس جیسا کر ان کے ساتھ چل پڑی۔ اور راداری کے آخری سرے پر روم نمبر لیون میں داخل
تھا اس نے سب سے پہلے مہر النساء کو دیکھا جو دو دوھیہ یا زو آنکھوں پر رکھے شاید سو رہی تھی۔
یہ بھاری سہ پہلے کھایا بھی ہے؟“ ڈاکٹر فرزانہ کی آواز پر وہ مہر النساء سے نظریں ہٹا کر کچھ بے خیالی میں ان
پہلے دیکھنے لگی۔

فرزانہ سمین نے پھر وہ نرس دوا بھی دے گئی تھی۔ لیکن اس کے ٹانگوں میں بہت تکلیف ہے۔ ابھی رو
نہایت جان بڑے دوسری طرف آکر بتانے لگی تھیں۔

”یہاں بھی میں تیرے میرے گھر کا کام کر کے گزارہ کرتی ہوں۔ اس طرح کسی ایک گھر کی ہو رہوں گی لیکن میرا
جد اگر تم کو کہہ دے گا کہ اب تمہاری ضرورت نہیں ہے تب میں کہاں جاؤں گی، یہ ٹھکانا بھی اپنا نہیں ہے۔ میرا
مالک مکان نے ترس کھا کر ایک کمرہ دے دیا۔ پھر کہاں ملے گا۔“

اس نے جلد بازی اور جذباتی پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگی۔
”میں آپ کو جانے کے لیے نہیں کہوں گی، اگر آپ کو کبھی میرے گھر والوں کی طرف سے کوئی شکایت ہوئی
چھہ ذکر جانا چاہیں تب بھی یہ میری ذمہ داری ہوگی کہ میں پہلے آپ کے لیے رہائش کا انتظام کروں، اس سے زیادہ
نہیں کہوں گی۔ آپ سوچ لیں۔ ہم کل اس وقت پھر آئیں گے۔ کیوں یا سمین؟“

”ہاں ہوا! بس سوچنا کیا ہے۔ تیاری کر رہیں۔ ہم کل آپ کو لے جائیں گے۔“ یا سمین اسے اشارہ کرتے ہوئے
کھڑی ہوئی۔

”مجھے ایسی ہی خاتون چاہیے تھی۔ صاف ستھری ہیں اور بات بھی سلیقے سے کرتی ہیں۔“ جب وہ اپنے گھر
اترے لگی تب اس نے رک کر یا سمین سے کہا تو اس نے اطمینان دلایا تھا۔
”فکر نہیں کرو۔ کل انہیں لے آئیں گے۔“

وہ راؤنڈ کے بعد کمرے میں آئی تھی۔ اسٹیٹس کوپ گردن سے نکال کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بڑے سے مٹائی
ڈبے پر اس کی نظر پڑی تو بے اختیار اس میں سے اپنی پسندیدہ مٹائی گلاب جامن اٹھا کر پوچھنے لگی۔
”یہ مٹائی کس خوشی میں؟“

”بیٹا ہوا ہے۔“ یا سمین کا منہ مٹائی سے بھرا ہوا تھا اسی میں بولی۔
”کس کا؟“ اس نے یا سمین کی طرف گردن موڑ کر پوچھا تو وہ خاصی لا پرواہی سے بولی۔

”کسی شاہ کا۔“
”شاہ؟“ اس کے ہونٹ کھلے رہ گئے اور نظروں میں کل شام کا منظر آن سہا جب وہ راہداری میں ٹھل رہا تھا

کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان پھنسی گلاب جامن پھسل کر واپس ڈبے میں جا گری تھی۔
”بڑا دل والا ہے۔ بھئی۔ نیچے سے اور تک تمام اشاف کو مٹائی بھجوائی ہے اور یہ ششمنس کو الگ۔“ یا سمین
رہی تھی۔ ”سسر بھاری تھی، نوکروں کے نوکرے منگوائے ہیں اس نے۔ لگتا ہے پہلا بیٹا ہے۔ چلو چل کر مبارک
آتے ہیں۔ اے تم کہاں ہو؟“

”ہیں۔“ اس نے کھوئے کھوئے انداز میں دیکھا تھا۔
”ہاں۔ تم تو واقعی یہاں نہیں ہو۔ خیریت تو ہے۔ کہاں کھوئی ہو؟“

یا سمین نے اس کا کندھا ہلایا تو روکتے روکتے بھی اس کے ہونٹوں سے گہری سانس خارج ہوئی پھر خود کو چیخ
بولی۔

”چتا نہیں۔ کیا کہہ رہی ہو تم۔“
”میں کہہ رہی ہوں۔ چلو مبارکباد دے آتے ہیں۔“ یا سمین نے کہا۔

”ہمیں کیا ضرورت ہے۔“ وہ ناگوار سی سے بولی۔
”ارے۔ اس نے مٹائی بھجوائی ہے۔ کم از کم اس کا شکریہ ادا کر آئیں۔“ یا سمین ہرگز بھی سنجیدہ نہیں
پہلی بار غور کیا پھر اس کے انداز میں بولی۔

”ہاں، تم چلی جاؤ۔ میری طرف سے بھی شکریہ کہہ دینا۔ اور اس کے بچے کے ہاتھ پر سوچ پاس روپے بھی
ہماری یہی حیثیت ہے۔“
یا سمین کھی کھی مٹنے لگی۔ تب ہی کاریڈور میں بھاری جوتوں کی آواز پر وہ اسے ٹوکے ہوئے بولی۔
”ہش۔ لگتا ہے ڈاکٹر وہاب آ رہے ہیں۔“
”اومانی گاؤ۔ میں جا رہی ہوں۔“ یا سمین اپنا اسٹیٹس کوپ اٹھاتی کمرے سے نکل گئی تو اس نے
مٹائی کا ڈبہ بند کر کے ایک طرف رکھا پھر ٹیبل کی فائل اٹھا کر دیکھنے لگی لیکن بہت جلد اسے احساس ہوا

خود اپنی ذات کو فراموش کر کے اس نے ان تین بچوں کی تیماری کی تھی۔
 بغیر کسی سہارے اور کسی کی مدد کے۔ یہ نہیں تھا کہ کوئی اس کا رِسانِ حال نہیں تھا، سب تھے مالِ باہ

251

نیل کو اس بر فوقیت دے جاتی تھی۔ اور ہمیشہ جائز بات پر ہی ایسا ہوتا تھا لیکن مدیحہ اپنی ناجائز کوبہ کھاتے میں ڈالتی تھی اور دوسرے کی جائز کو ناجائز کے۔

اگر عموں میں زیادہ فرق نہ ہوتا تو اس کی نیل کے ساتھ باقاعدہ ٹھنی رہتی۔ ابھی بھی ڈائریکٹر ڈائریکٹ کبھی بھی ان کی تبدیلی اور دل آزاری کر جاتی تھی۔ جس پر سوائے ان کے باقی تمام کنزرویٹو تھے۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اور اسی کی جڑواں بہن صبا تھی۔ رنگ روپ، ناک، نوا میں بالکل مدیحہ اگر ذرا سا فرق تھا تو اس تل کا جسے پہچان کے لیے سب سے پہلے سہا بھائی نے اس کی دائیں طرف لگا تھا۔ پھر ایک عرصہ تک میونہ بھائی اور اماں جی اسی پر نشان لگاتی رہی تھیں اور مدیحہ گئیں تو قدرت کی طرف سے اپنے آپ میں مل نکل آیا تھا۔ جو اس کے شفاف چہرے کی دلکشی میں باعث تھا۔ اور کیونکہ پہلی نظری پر پڑتی تھی اس لیے دونوں کی پہچان میں مشکل نہیں ہوتی تھی۔ مدیحہ عمر سے نیکلتی ہی مدیحہ نے جانے اپنے چہرے کی دلکشی میں انسانی فی خاطر یا سب کو مشکل میں ڈالنے ہی مل بنانا شروع کر دیا تھا۔

جس سے صرف ایک شخص دھوکا نہیں کھاتا تھا اور وہ نیل تھے۔ انہوں نے کبھی اس تل کے دھوکے صاحت نہیں پکارا تھا۔ جبکہ باقی سب دھوکا کھاتا جاتے یہاں تک کہ آسیہ بھی۔ بہر حال شکل و صورت لیکن عادات میں صبا تھی۔ حد درجہ نرم خو، جیسے مدیحہ کے رویوں کی عکاسی تھی۔ سب سے زیادہ اسے اپنے نیل بھائی کی فکر رہتی تھی۔ کہ باقی سب تو پھر بھی مدیحہ سے کہہ سکتے لیکن وہ بے چارے بالکل خاموش ہو جاتے، بھی ایسا بھی ہوتا کہ مدیحہ نیل کی دل آزاری کرتی تو صبا تھی خود کو ان کے سامنے مدیحہ ظاہر کر کے معافی مانگتی اور اس وقت انہیں اس پر بے طرح ہار آتے نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی بات رکھنے کی خاطر بعد میں اسے بتاتے کہ مدیحہ نے اپنے رویے کی معافی اور وہ اپنی تدبیر پر خوش ہو جاتی تھی۔

بہر حال آسیہ نے ان تینوں کو ایک سی محبت، ایک سی توجہ دی تھی اس کے باوجود ان کے مزاجوں میں نہیں مل سکتی تھی کیونکہ ہر بچہ اپنی فطرت کے پرکیر ہوتا ہے جسے جب تک وہ خود نہ بدلنا چاہے کئی سکھانے ہر بچہ اپنے ماں باپ کی خواہشوں کا پرتو ہوتا۔

آسیہ ابھی کلینک سے لوٹی تھی۔ روزانہ کی طرح کچھ دیر اماں جی اور اباجی کے پاس بیٹھ کر ان کا حال پھر اوپر آئی تو وہ جیسے انتظار میں بیٹھی تھیں فوراً "کھتی ہوئی بولیں۔"

"جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آ جاؤ۔ مدیحہ بہت دیر سے بھوک بھوک کر رہی ہے۔"

"تو آپ نے کھانا لگا دیا تھا ہاں! میرے انتظار میں کیوں بیٹھائے رکھا اسے۔" اس نے کہا۔

"وہ میں نے تو کتنی بار کہا اس سے لیکن اس کی اپنی ضد تھی کہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔"

"اچھا۔ چلیں آپ کھانا لگا گئیں اور ان تینوں کو بھی بلائیں۔ میں بس پانچ منٹ میں آتی ہوں۔"

اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد آسیہ ڈائننگ روم میں داخل ہوئی تو تینوں نے ایک ساتھ اسے سلام کیا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام، بیٹھو۔ کھڑے کیوں ہو۔" وہ اپنی کرسی کھینچتی ہوئی بولی۔

"آج آپ نے بہت دیر کر دی ماما،" مدیحہ نے بیٹھتے ہی کہا تو اس نے کھڑی پر نظر ڈالنے کے بعد تعجب دیکھا۔

"ساڑھے آٹھ ہو رہے ہیں اور میں روزانہ اسی وقت آتی ہوں۔"

"آپ تو اپنے وقت پر آتی ہیں ماما۔ لیکن مدیحہ کو بھوک وقت سے پہلے لگ گئی تھی۔ اس لیے"

"صبا تھی نے سانس کا ڈونگا اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"صبا تھی نے بتایا ہے مجھے۔ اور تمہیں بھوک لگی تھی بیٹا! تو کھانا کھا لینا تھا۔ آئندہ اس طرح میرے انتظار میں بیٹھی بیٹھا۔ اور شروع کرو۔"

"اس نے مدیحہ کی پلیٹ میں سانس ڈالا پھر ڈونگا نیل کو تھما کر پوچھنے لگی۔

"نیل بھوک رہے کے لیے ایلانی کیا تھا۔ کوئی جواب آیا؟"

"نیل بھوک رہی تھی۔ تو نہیں آیا۔"

"نیل نے کہا تھا کہ مدیحہ فوراً بولی۔

"نیل بھوک نہیں۔"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

"یوں؟"

"آسیہ نے نیل کی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ سٹپا کر بولی۔

”مدحیہ مجھے بے وقوف لگتی ہے۔“

”آپ شاید مذاق کر رہی ہیں یا پھر میرے سامنے آپ۔“

”نہیں میں مذاق نہیں کر رہی، وہ واقعی بے وقوف ہے، تمہاری طرح۔“

”جناب! میں ابھی بھی بے وقوف نہیں تھی۔“ آسیہ نے ہوں سر جھکا کر دیکھا۔ انہوں نے کوئی ہاتھ ہاں بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا تم نے۔ بچوں کو بہانا بنا کر ایک دھوکے باز ہر جالی کے ہاتھوں اور نہ! مہمونہ بھابھی بخوت سے بولیں۔

”اب یہ میری قسمت کہ اس جیسا پھر کوئی اور ملا ہی نہیں۔“

وہ بظاہر ہنس کر اٹھی۔

مہمونہ بھابھی بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”مدحیہ! اور صبا کو بھیج دیں اور آپ کو جو گیدیاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان دونوں کی۔“ وہ ان کے ساتھ کمرے سے نکل کر آئی پھر کھلی چھت پر ٹھٹھنے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد مدحیہ اور تودہ رک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”کیا بات ہے ماما۔ آپ سو نہیں رہیں۔“ مدحیہ نے پوچھا۔

”تم دونوں کو صبح کان جانا ہے کہ نہیں ہے؟“ وہ مدحیہ کی بات سے کسر نظر انداز کر گئی۔

”جانا ہے ماما۔“

”تو اب تک نیچے کیا کر رہی ہو۔ جاؤ جا کر سوؤ۔“ آسیہ قدرے رعب سے بولی۔

”ابھی تو دس بجتی ہیں۔ میں نے صحت کو کتنی مارتے ہوئے کہا کہ وہ بھی کچھ بولے۔“

”کھینچتی ہوئی کمرے میں لے گئی۔ آسیہ نے ایک بار پھر ٹھٹھانا شروع کر دیا تھا۔

→ → → →

کالج سے آکر کھانے وغیرہ فارغ ہونے کے بعد نبیل کے کمرے کی بھانڈو پچھ کی غرض۔ ان کے کمرے کا رخ کیا۔ یہ اس کا روزانہ کام معمول تھا۔ گوکہ نبیل چیزیں نہیں پھیلاتے تھے لیکن پینڈ کرنا ہمیشہ بھول جاتے۔ جہاں سے دھوپ گردان کے کمرے اور خصوصاً ”رائٹنگ ٹیبل“ پر ہوتی تھی۔ اور جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا ان کے کمرے کی صفائی اپنے ذمے لے لی تھی۔

چیزیں ادھر کر دیتی تھیں جس سے نبیل کو خاصی پریشانی ہوتی تھی۔ بروقت کام کی چیزیں ہی نہیں انہوں نے بودا کا اپنے کمرے میں داخلہ بند کر دیا تھا۔ اور شروع میں تو انہوں نے اسے بھی منع کیا مانی اور دھیرے دھیرے اپنا معمول ہی بنالیا تھا۔ اس وقت اس نے پہلے بند کی چادر بھاڑ کر دوبارہ صوفوں کی گرد بھاڑی اس کے بعد رائٹنگ ٹیبل کے پاس آئی تھی کہ نبیل کی اسٹک کی آواز سن کر سے برہہ کر دروازہ کھولا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ نبیل نے اندر آتے ہوئے پوچھا تو وہ دوبارہ ٹیبل کے پاس جا کر بولی۔

”صفائی!“

”اگر تمہیں صفائی کا اتنا ہی شوق ہے تو شام میں کر لیا کرو، کتنی بار کہو چکا ہوں میں تمہیں اس سے تنگ ہوئی آتی ہو آرام کیا کرو۔“

”کوئی ایسا جان جو کھوں کا کام تو نہیں ہے نبیل بھائی! منٹوں میں ہو جاتا ہے۔ مجھے نہیں اچھا لگتا کہ کمرہ گند اڑا رہے۔“ وہ جلدی جلدی ٹیبل صاف کرتی ہوئی بولی۔

”اچھا دیکھو۔ دراز میں نیلے رنگ کی ڈائری ہوگی۔ وہ مجھے دے دو۔“

انہوں نے بیڈر آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا تو اس نے دراز کھول کر ڈائری نکالی اور انہیں تھما کر پوچھا۔

”آپ نے کھانا کھا لیا؟“

”ہاں! میں نیچے اباجی کے پاس تھا۔ ان ہی کے ساتھ کھایا ہے۔ اب براہ مہربانی تم جاؤ یہاں سے۔ مجھے کچھ کام رہا ہے۔“

انہوں نے ٹھٹھنے پر رکھ کر ڈائری کھول لی۔ تب ہی ادھر مدحیہ نے حسب عادت زور سے الماری بند کی تھی جس پر آواز دھونکی تھی۔ اور نبیل غالباً عادی ہو چکے تھے۔ جب ہی ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا جبکہ وہ نہایت توجہ سے مدحیہ کی بات سن رہے تھے۔

”نبیل بھائی آپ اسے ڈانٹتے کیوں نہیں۔“

”نبیل! کیا ہے اس نے؟“ انہوں نے تجاہل عارفانہ سے دیکھا۔

”ہاں! ابھی آپ کا پورا کمرہ بل گیا اور آپ کو پتا ہی نہیں چلا۔“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں تب ذرا سا مسکرائے۔

”نبیل! خیر پتا تو چلا ہے کہ مدحیہ اس وقت کسی بات پر تلملانی ہوئی ہے۔ جاؤ دیکھو کہیں غصے میں تمہاری چیزیں ڈال کر نہ پھینک دے۔“

”اب غصے میں اسے میری ہی چیزیں ملتی ہیں۔“

وہ بھال کر اپنے کمرے میں آئی اور سارے میں نظریں دوڑانے کے بعد مدحیہ کو دیکھا۔ وہ آرام سے لیٹی تھی۔

”کیا کچھ رہی ہو؟“ مدحیہ نے ٹوکا۔

”نبیل! خیال تھا۔ تم سوچتی ہو۔“ اس نے کہا تو مدحیہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

”تو پتا! سوچتی تھی لیکن نبیل بھائی کی ٹنگ ٹنگ نے ساری غیند اچاٹ کر دی ان سے کہو! اپنی اسٹک کے پرے پر رکھ لو!۔ اس کی آواز مجھے زہر لگتی ہے۔“

”پوچھو! کا خوف کرو! مدحیہ! نبیل بھائی شوق سے اسٹک لے کر نہیں چلتے۔“

اس نے تلافی سے ٹوکا تو وہ مزید چڑھ گئی۔

”مجھے پتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ دوسروں کی نیندیں خراب کریں۔ اچھی بھلی سو گئی تھی۔“

”نبیل! کبھی کبھی۔“ ماما کو بھی بس شوق سے پیچھا لگنے کا۔

”الہ!“ صاحت نے دہل کر اسے دیکھا۔ ”کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اللہ نہ کرے جو کوئی یتیم ہو۔ اللہ سلامت رکھے بڑے ناموں کو اور۔“

”نبیل! کو! اور ہمارے باپ کو۔“ اس کے خاموش ہونے پر مدحیہ نے جیچ کر کہا تھا۔

”تم بہت بد تمیز ہو گئی ہو مدحیہ۔ ماما نے اگر سن لیا تاں تو بہت ماریں گی تمہیں۔ یہ خیال بھی نہیں کریں گی کہ تم بڑی ہو گئی ہو۔“ وہ ناراضگی سے بولی۔

”نبیل! ماریں گی۔ باپ گالی تو نہیں ہے۔ گالی ہوتے تو میرے اور تمہارے ناموں کے ساتھ ان کا نام نہ لگا ہوتا۔“ مدحیہ تیز سے میں بول رہی تھی۔ اچانک آواز دبا کر کہنے لگی۔ ”سنو! کسی دن ماما سے سکندر حیات کے بارے میں پوچھیں گے ان کا اتنا بل گیا تو مل بھی آئیں گے۔“

”نبیل! کہہ رہی ہو تم۔“ صاحت کچھ پریشان ہو گئی۔

”نبیل! کہہ رہی ہوں۔ آخر وہ ہمارا باپ ہے۔“

”باب! کو! کبھی خیال نہیں آیا ہم سے ملنے کا۔ پھر ہم کیوں ملیں۔ ویسے بھی وہ یہاں نہیں رہتے۔ ایک بار میں پوچھا تھا ماما ہی سے۔“ صاحت نے کہا۔

”باب! کو! کیا پتا۔ ان کی دنیا تو بس اسی چار دیواری کے اندر ہے۔ البتہ ماما کو ضرور پتا ہوگا لیکن وہ بتائیں گی۔“

”نبیل! ذرا اور بڑا ہونے دو پھر دیکھنا کیسے معلوم کرتی ہوں۔“ مدحیہ بڑے آرام سے بول رہی تھی جیسے کوئی مسئلہ نہ ہو۔

”نبیل! جو! نبوت ماما کو پسند نہیں۔ وہ ہمیں سوچتی بھی نہیں چاہیے۔“

صبا نے خاصے ناصحانہ انداز میں کہا۔ تب ہی دستک کے بعد ذرا سادروازہ کھول کر عمر اندر جھانک کر
 ”سنو پھو پھو سو رہی ہیں کیا؟“
 ”ہاں۔ کیوں؟“ ”مدیہ جواب کے ساتھ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ اندر آتا ہوا بولا۔
 ”اباجی بلا رہے ہیں انہیں لیکن انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر سو رہی ہوں تو مت اٹھانا۔“
 ”نہیں اٹھائے۔“ ”مدیہ نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔
 ”شاباش۔ اب ذرا ایک گلاس پانی پلا دو۔“ ”عمر کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگا تو مدیہ نے فوراً ”ٹوکا۔“
 ”بیٹھنا مت۔“

”کیوں؟“ ”عمر کرسی ہلا کر دیکھنے لگا۔
 ”کرسی مضبوط ہے۔ اسے چھوڑو اور میاں سے نکل کر بائیں ہاتھ چند قدم چلو پھر دائیں ہاتھ مڑنا۔
 بائیں ہاتھ پر رکھیں۔ وہاں فریج رکھا ہو گا۔ اسے کھولو ایک ٹھنڈی بوتل نکالو پھر گلاس اٹھا کر خود بھی
 لے لیتی ہے تو۔“

مدیہ نے بڑے آرام سے اسے پانی کا راستہ بتا کر تکیے کے ساتھ ٹیک لگایا۔ تو وہ بیٹھتے ہوئے ملامت
 ”چہ چہ؟“ ”تنی دیر میں تمہاری لے آئیں“ ”خیر چھوڑو۔ مجھے کوئی ایسی بیاس نہیں لگی۔“
 ”توبہ۔ کتنے کاہل ہو تم لوگ۔ پانی نہیں لی سکتے۔“ ”صباحات اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”چار بج گئے ہیں۔ پوا اسے چائے کا بھی کہہ دینا۔“ ”مدیہ نے جھٹ دو سر کام بھی کہہ دیا۔
 صباحات اس کی کاہلی پر تاسف سے سر جھٹکتی کمرے سے نکل گئی۔

♥ ♥ ♥ ♥
 عدیل بھائی کی آمد کی اطلاع نے سارے میں ہلچل مچادی تھی۔ اماں جی اور اباجی خوشی میں بوکھا
 تھے۔ روزانہ ایک ایک گولہ کراس کے سپرد کوئی نہ کوئی کام کرتے اس کے بعد خود بھی سر پر جا کھڑے ہو
 ”اباجی! وہ کچھ جھنڈیاں وغیرہ بھی لے آؤں۔ لال پٹیلی؟“
 عمر بظاہر سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا لیکن اس کی بھونڑا آنکھوں میں چمکتی شرارت دیکھ کر صباحات
 ساختہ نہیں۔ جبکہ مدیہ اس کے ساتھ مل گئی۔
 ”ہاں اباجی! پورے گھر کو جھنڈیوں سے سجائیں گے۔ شاندار استقبال ہونا چاہیے عدیل ہاں
 جیسے کوئی برائم منسٹر آ رہا ہو۔“ ”حصر نے ٹکڑا لگا دیا۔
 ”کون آ رہا ہے۔“ ”اماں جی سمجھیں نہیں۔

”وزیراعظم اماں جی! وزیراعظم“ ”عمر زور دے کر بولا۔
 ”ہائیں! وزیراعظم اپنے گھر آ رہے کیوں؟“ ”اماں جی ایک ایک کی شکل دیکھنے لگیں۔
 ”کیا اصول بائیں لے کر کھڑے ہو گئے ہو تم لوگ۔ جاؤ فائنٹ کا نام معلوم کرو۔“ ”اباجی نے توبہ۔
 ”اباجی! میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔“ ”مدیہ نے کہا تو امرا لالی کی طرف جاتے جاتے پلٹ
 ”جی نہیں۔ خواتین سب گھر پر رہیں گی۔ صرف مرد حضرات جائیں گے۔“
 ”میں آپ سے تو بات نہیں کر رہی۔“ ”مدیہ کو اس کی مداخلت سخت پر ہی لگی۔
 ”میں بھی اباجی سے کہہ رہا ہوں۔ اباجی! خواتین کو لے کی جانے کی غلطی نہیں کیجئے گا کیونکہ
 سے نکلنے میں دیر لگے گی اور اتنی دیر یہ لوگ وہاں کیا کریں گی۔“
 ”حصر نے مدیہ کے پیچے ہوئے چہرے سے نظریں ہٹا کر اباجی سے کہا۔
 ”کہہ تو تم تھک رہے ہو لیکن بچیوں کو شوق ہے۔“ ”اباجی مدیہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے
 ”کرو سب چلیں گے۔“
 ”تھینک یو اباجی! وہاں کو چڑاتی۔“ ”وئی یہ حیاں چڑھ گئی۔

مقررہ وقت پر سب ایر پورٹ پہنچے تو آگے بڑے بھیا اپنے بال بچوں سمیت موجود تھے۔ جنہیں دیکھ کر اماں جی کو
 نیل بھائی کی کئی محسوس ہونے لگی تھی کہ دو بیٹے پاس کھڑے تھے۔ تیسرا آنے والا تھا جب ہی ان کا دھیان ٹھیک
 بائی کی طرف چلا گیا تھا۔

”آپ کیاسوئے لکیں اماں جی! ادھر دیکھیں عدیل بھائی آ رہے ہیں۔“ ”آسیہ نے ایک ہاتھ ان کے کندھے پر
 رکھ کر اشارے سے بتایا پھر ہاتھ ہلانے لگی۔
 ”اے! اٹھو اور روبی کتنی بڑی ہو گئی ہیں۔“ ”میمونہ بھابھی عدیل کی میٹھوں کو دیکھ رہی تھیں۔
 پھر ایمین تو میٹھوں کے ساتھ جلد ہی ان تک آن پہنچی جبکہ عدیل بھائی کو کچھ دیر لگی تھی۔ اور سب سے ملنے
 آئے جب مدیہ اور صباحات کے پاس رکے تو خاصے مظلوظ انداز میں باری باری دونوں کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔
 ”آپ دونوں میں مدیہ کون ہے اور صباحات کون۔“

”آپ بتائیں۔“ ”مدیہ فوراً بولی۔
 ”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ایک بچی کے چہرے پر قتل تھا لیکن یہاں تو دونوں کے چہروں پر نظر آ رہا ہے۔“
 ”نیل بھائی نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔ پھر پلٹ کر ایمین سے بولے۔ ”تم پہچان سکتی ہو؟“
 ”نہیں۔“ ”ایمین دیکھیں یہ دونوں کو دیکھ رہی تھی۔
 ”کوئی نہیں پہچان سکتا چاچو، سوائے نیل بھائی کے۔“ ”عمر نے کہا تو عدیل بھائی کچھ حیران ہو کر نیل سے
 الب ہوئے۔

”وائی۔ تم پہچان لو گے نیل؟“
 نیل سب کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر گھبرا گئے تھے جب ہی نفی میں سر ہلا دیا۔
 ”کوئی سوال کریں بھائی! مدیہ پہلے جواب دے گی۔“ ”عقب سے آسیہ نے سرگوشی میں کہا جسے سن کر عدیل
 اُلی پوچھنے لگے۔
 ”کون کی کلاس میں پڑھتی ہو؟“

”انرا! مدیہ نے بتایا تو انہوں نے فوراً اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور مسکرا کر بولے۔
 ”میں نے دیکھتے ہی آپ کو پہچان لیا تھا۔ آپ مدیہ ہو۔“
 ”آپ کو نیل بھائی نے بتایا ہے۔ گویا وہ بھی جانتی تھی کہ اسے نیل ہی پہچان سکتے ہیں۔
 نیل نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥
 جب تک عدیل بھائی بزنس اور گھر کی سینیٹنگ نہ کر لیتے انہیں یہیں سب کے ساتھ رہنا تھا۔ اور اب کیونکہ
 پتہ بڑے ہو گئے تھے اس لیے جگہ کم لگ رہی تھی۔ لیکن کسی نے جگہ کی تنگی پر کوئی آواز نہیں اٹھائی تھی اس کے
 دو دو آریہ کو اپنے آپ احساس ہونے لگا کہ اس کی وجہ سے سب پریشان ہو رہے ہیں۔ وہ اگر یہاں نہ ہوئی تو عدیل
 نائی آرام سے رہ سکتے تھے۔

”میں کس حساب سے یہاں قید جمائے بیٹھی ہوں۔ اماں جی اور اباجی کی خواہش ہو گی کہ عدیل طویل عرصہ
 پر رہنے والا بنے اب ان کے پاس رہے۔ اور ہو سکتا ہے۔ عدیل بھائی بھی یہی چاہتے ہوں۔ میری وجہ سے وہ
 ناخوش ہوں گے لیکن مجھے خیال کرنا چاہیے۔“
 ”آسیہ کھانے کے بعد یونہی حتمی ہوئی تھیں پر اگر بیٹھی تھی کہ ان سوچوں میں گھر کر اٹھنا ہی بھول گئی تھی۔
 ”چھو پھو! نیل نے پکارا تب وہ چونکی جبکہ اس سے پہلے ان کی اسٹک کی آواز بھی ہست و صاحت تھی۔
 ”آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟“

”نیل! کوئی۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟“ ”آسیہ نے گہری سانس کے ساتھ پوچھا۔
 ”نیوٹی نے بلایا تھا۔ شام میں ان کی طرف چلا گیا۔“ ”نیل نے آگے آکر اس کے سامنے کرسی سنبھال لی تو اس

نے بونہی پوچھ لیا۔

”کوئی کام تھا بڑے بھیا کو؟“

”جی کہہ رہے تھے۔ سمیر کو بڑھادیا کروں اس کے انگیزام قریب ہیں۔“

نیل کے جواب پر اس نے کچھ بے دھیانی میں سر ہلایا پھر لابی میں نظر ڈال کر بولی۔

”ان دونوں کی آواز نہیں آرہی۔ سو گئیں کیا؟“

”نہیں نیچے ہیں۔ اتنے عرصے بعد چاچو آئے ہیں اس لیے کچھ دن تو ہلا گلا رہے گا۔“ نیل نے اس پر

کہا کہ کہیں وہ مدیحہ اور صاحت کو بلا کر ان پر پابندی نہ لگا دے۔

”ہاں بہت عرصے بعد آئے ہیں عدیل بھائی اور میں سوچ رہی ہوں اب انہیں یہیں رہنا چاہیے۔“

انداز میں بولی۔

”تو کیا وہ تھوڑے دنوں کے لیے آئے ہیں؟“ نیل نے پوچھا۔

”نہیں۔ آئے تو مستقل ہیں۔ یہیں رہنے سے میرا مطلب ہے اس گھر میں امان جی اور اباجی کے

ہماری وجہ سے شاید یہاں نہ رہ سکیں۔ اور میں سوچ رہی ہوں ان کے بجائے ہمیں اسے لیے الگ گھر

کرنا چاہیے۔ ہم انور ڈی بھی کر سکتے ہیں اور میرا خیال ہے مجھے اب کسی بات کی کوئی فکر نہیں ہوگی کیونکہ

ماشاء اللہ جوان ہو گیا ہے۔“

آخر میں نیل کو دیکھتے ہوئے آسیہ نے مسکرا کر سر اٹھایا تھا۔

”سوچ تو آپ ٹھیک رہی ہیں پھوپھو! لیکن پتا نہیں اباجی مائیں گے کہ نہیں اور شاید عدیل چاچو بھی نہ

نیل نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھ ہی اباجی سے بات کروں گی اگر انہوں نے مجھ سے اتفاق کر لیا تو پھر عدیل بھائی کو وہ خود ہی

کو کہہ دیں گے۔ ویسے بھی بیٹا! ہمارے لیے گھر کو کوئی مسئلہ نہیں ہے اپنا پارٹمنٹ ہے اسے فوری

ہم وہاں شفٹ ہو سکتے ہیں۔ میرا کلینک بھی وہاں سے قریب پڑے گا اور مدھو صبا کو بھی زیادہ پر اہم

دونوں ابھی تک نیچے ہیں؟“

آسیہ کو ان کا نام بتاتے ہی خیال آگیا تھا۔ ”میں دیکھ رہی ہوں۔ پڑھائی سے دونوں بھاگنے لگی ہیں۔

ڈانٹتے کیوں نہیں ہو۔ بڑے بھائی ہو رعب میں رکھا کرو۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے پھوپھو! پڑھنے میں دونوں اچھی ہیں۔“ نیل نے ان کی طرف داری کی۔

”خاک اچھی ہیں۔ میٹرک میں کسی ایک نے پوزیشن نہیں لی۔“ آسیہ کو واقعی اس بات کا افسوس

کے معاملے میں ایک بھی اس پر نہیں گئی تھی۔ اور ابھی وہ مزید انہیں تالافت اور لا پرا وجیسے خطاب سے

زینے سے ان کے ہنسنے اور بھاگنے کی آواز آنے لگی جس پر وہ قدرے غصے سے بولی۔

”دیکھو یہ حال ہے ان کا۔“

”پھوپھو! آجی عمر بننے کھنسنے کی ہے پلیز ڈانٹنے گا نہیں۔“ نیل نے پہلے سے ان کی سفارش کر دی۔

”میں نہیں ڈانٹوں گی اگر جو یہ امتحانوں میں مل ہو میں تو۔“ آسیہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

”نہیں ہوں گی۔“ نیل نے یقین سے کہا اور جیسے ہی وہ دونوں سامنے آئیں۔ قدرے رعب

بولے۔

”کیوں فصول باتوں میں وقت گنوا رہی ہو، کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اب اگر میں پڑھنے کے لیے

آئے گی گئی تھیں۔“

”مجھے پہلے سے آرہی ہے۔“ مدیحہ نے فوراً لمبی جمالی لی۔

”اور تمہیں؟“ نیل نے صاحت کو دیکھا تو وہ سنسنائی۔

”بارہنچہ چکے ہیں نیل بھائی اور صبح کالج بھی جانا ہے پھر بھی اگر آپ کہتے ہیں تو ہم ایک دو گھنٹے

ہم نہیں صرف تم۔“ مدیحہ فوراً ٹوک کر بولی۔ ”میں تو دو منٹ کھڑی نہیں رہ سکتی۔ سخت نیند آرہی ہے۔

”نیل بھائی۔“

”پہلے سن لو کہ کل سے تم دونوں کو ٹھیک نو بجے میرے کمرے میں موجود ہونا ہے کتابوں سمیت۔

”جانی سخت تنبیہ پر دونوں نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تھا۔

بڑا شینڈ۔“ ان کی سخت

♥ ♥ ♥ ♥

آسیہ نے اباجی کے سامنے اپنے پارٹمنٹ میں شفٹ ہونے کی تجویز رکھی تو نہ صرف انہوں نے بلکہ عدیل

نے بھی مسترد کر دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ آسیہ کو ہم نے ایک بار اس گھر سے رخصت کیا تھا اگر دوبارہ گھر

نے پر تانا ہوئی تو ہر پھر اسی طرح رخصت کر سکتے تھے لیکن اس طرح اس گھر سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں

ہو سکتا اور آسیہ میں یوں بھی من مانی کی عادت نہیں تھی۔ اس نے شروع سے اپنے حق میں والدین اور بھائیوں

نے فعلی کو تسلیم کیا تھا۔ اگر خود سے کوئی فیصلہ کیا بھی تو اس میں والدین کی رضامندی شامل تھی۔ اس لیے بھی

نے اس سے ناراض نہیں ہوا۔ سب خوش تھے۔ اور سب کی خوشی میں وہ پتا نہیں خوش تھی کہ نہیں لیکن یہ

مذہب تھا کہ اس کے دل پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ بہر حال جب یہ طے ہو گیا کہ اسے یہیں رہنا ہے تب اس نے اپنے

ازدحام میں ایک بیکر رکھا اگر وہ عدیل بھائی کی دونوں بیٹیوں نمرو اور روبی کے حوالے کر دیا تھا۔

مدیحہ ان دونوں کے پاس بیٹھی ادھر ادھر کی بات کر رہی تھی کہ نیل بھائی دروازے میں آکر پکار کر

مدیحہ اب ہم کیا ہوا ہے؟“

مدیحہ نے وال کا اک کی تلاش میں سرگھا گھا کر چاروں اور نظر دوڑائی پھر اپنی خالی کلائی

نے کر کے بولی۔ ”سوری نیل بھائی میرے پاس کھڑی نہیں ہے۔ ایسا کریں لابی میں سامنے کا گاہے وہاں

ہے۔“

مدیحہ چکا ہوں۔ چلو اٹھو۔ کتابیں لے کر میرے کمرے میں جاؤ۔“ وہ اس کے انجان بننے کو یکسر نظر انداز کر

انہوں میں تو بھول ہی گئی تھی۔ آپ چلیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔ بس دو منٹ ٹھہرے۔“

”تو کہیں نہیں جا رہی۔ تم اس سے دو منٹ نہیں دو گھنٹے باتیں کرنا کیوں پڑھنے کے بعد۔ چلو اٹھو۔“ وہ ذرہ

رعایت بننے کو تیار نہیں ہوئے تو وہ اٹھتی ہوئی ٹھہرے بولی۔

”میت ظالم ہیں۔ ان سے کبھی دوستی نہیں کرنا۔“

نیل خاموش کھڑے رہے اور جب وہ بڑبڑاتی ہوئی ان کے قریب سے نکل گئی تب وہ ٹھہرے اور روبی کو دیکھ کر

راستے

تھیں آپ کو بھی پڑھاؤں گا لیکن جب آپ کا یڈیشن ہو جائے گا تب۔“

”تو کہیں نہیں ہوں گے نیل بھائی۔“ روبی نے کہا۔

”تو کہیں ہی نہیں آؤں گی۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔ اوکے۔“

”تو کہیں ہی نہیں آؤں گی۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔ اوکے۔“

”تو کہیں ہی نہیں آؤں گی۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔ اوکے۔“

”تو کہیں ہی نہیں آؤں گی۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔ اوکے۔“

”تو کہیں ہی نہیں آؤں گی۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔ اوکے۔“

”تو کہیں ہی نہیں آؤں گی۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔ اوکے۔“

”تو کہیں ہی نہیں آؤں گی۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔ اوکے۔“

”تو کہیں ہی نہیں آؤں گی۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔ اوکے۔“

”تو کہیں ہی نہیں آؤں گی۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔ اوکے۔“

”تو کہیں ہی نہیں آؤں گی۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔ اوکے۔“

”تو کہیں ہی نہیں آؤں گی۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔ اوکے۔“

”تو کہیں ہی نہیں آؤں گی۔ میں وہیں آ جاؤں گا۔ اوکے۔“

عمر نے اچھے بھلے شعر کی آخر میں ریڑھ لگا دی۔ جس پر سب بے ساختہ ہنسے لیکن صبا کو بالکل اچھا نہیں لگا۔
 ”عمر! یہ ایسے نہیں کرو۔ ٹھیک سے سنو۔“
 ”ٹھیک ہے اچھا۔ ٹھیک سے سنو۔“
 اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دے
 بنانے کس کھلی میں کتوں سے باللا پڑا جائے
 ”بس کریں“ صباحت جی چڑی۔ جس سے اس کی شاعری سے وابستگی ظاہر ہو رہی تھی۔
 نبیل نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا پھر مسکرائے تھے۔

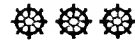


فکیل بھائی کی اسلام آباد سے آمد کا مقصد ایک نو عمر لڑکے سے ملاقات دوسرے اپنے سینے اشعر کے لیے سونیا کو
 لانا تھا۔ کوکہ ابھی اشعر اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا تھا لیکن ادھر سونیا گریجویشن کر چکی تھی اور کیونکہ فکیل بھائی
 رہیسا بھائی کا پہلے سے ارادہ تھا اسے سونیا سے ملاقات کا اس لیے انہوں نے ابھی بات کر لینی مناسب سمجھی تاکہ اور کوئی
 بول ہو تو اسے صاف منہ کر دیا جائے۔ یوں بھی پہلا حق قریبی رشتوں کا ہی ہوتا ہے۔ جب فکیل بھائی نے اپنی
 انہی کا اظہار کیا تو خصوصاً اماں جی اور بابا جی بہت خوش ہوئے۔ کیونکہ ماں باپ کی یہ دلی آرزو ہوتی ہے کہ ان
 باولاد آپس میں ایک دوسرے کا خیال رکھنے اور محبت کرنے والی ہو۔ بہر حال طے یہ پایا کہ ابھی منگنی کر دی جائے
 رہا۔ دو سال بعد جب اشعر اپنے پیروں پر کھڑا ہو تب شادی ہوگی۔
 منگنی کی باقاعدہ تقریب کی کوئی ایسی ضرورت نہیں تھی کیونکہ گھر کی بات تھی لیکن اتنے عرصے بعد بابا جی کی
 ادنیٰ اولاد آپس اکٹھی ہونی تھی تو انہوں نے باقاعدہ تقریب کا کہہ کر سب میں پہلچل مچا دی تھی۔ کیونکہ وقت کم
 آ رہا تھا۔ فکیل بھائی کو واپس جانا تھا۔ اور ایک دن میں سارا انتظام۔ لڑکے باہر کے کاموں میں اور لڑکیاں گھر
 رہائی پھر رہی تھیں۔ شام سے پہلے سب کام ہو گئے اس کے بعد سب کو اپنی اپنی تیاری کی فکر۔
 ”صبا! تمہارے پاس ایسا اوپنڈ ہے۔“ ”تو یہ پریل کلر کا سوٹ لیے صباحت کے پاس آ کر پوچھنے لگی تو وہ جو اپنے
 پرے سے پریل کر رہی تھی۔ چھوڑ کر سوپنے کھڑی ہوئی۔
 ”ایسا اوپنڈ۔ ہاں مدحو کے پاس ہو گا۔ اس سے لے لو۔“
 ”کمال ہے مدحو؟“
 ”ابھی تو نہیں تھی۔ اچھا ٹھہرو، میں دیتی ہوں۔“ اس نے جلدی جلدی اپنے کپڑوں پر استری پھیری پھر پلگ
 ال کر ٹوپ سے سوٹ لے کر الماری میں اس کا ہم رنگ اوپنڈ تلاش کرنے لگی۔
 ”صبا! میرے پرے استری ہو گئے۔“ ”مدحہ غالباً“ بیڑھیاں پھلانگتی ہوئی آئی تھی۔ سانس پھول رہی تھی۔
 ”ہاں! اس نے الماری کے اندر سے جواب دیا۔“ ”وہاں رکھے ہیں لے لو۔“
 ”کم کیا تلاش کر رہی ہو؟“ ”مدحہ نے پوچھا۔
 ”تو وہ اوپنڈ نکال کر پٹی پھر ٹوپ سے پوچھنے لگی۔“ ”استری کر دوں؟“
 ”میں میں کر لوں گی، شکریہ۔“ ”تو یہ اس کے ہاتھ سے اوپنڈ اور کپڑے لے کر چلی گئی۔ تو اس نے مدحہ کو دیکھا
 اچانک جانے کس بات پر ہنسنے لگی تھی۔
 ”کم کیل بس رہی ہو؟“ ”اس نے پوچھا۔
 ”وہ امر بھائی کے پاس کیا رہے ہیں؟“ ”مدحہ نے اس کی منگنی بھی ہونی چاہی ہے۔
 ”تو یہ سناں جی سے اچھا رہے ہیں۔“ ”مدحہ نے اسی طرح ہنسنے ہونے بتایا۔
 ”واضح ہوئے کہ تو ٹھیک رہے ہیں۔ جب اشعر بھائی کی ہو رہی ہے تو ان کی بھی ہونی چاہی ہے۔“ ”صباحت نے
 ”تو کچھ شکر و حیرت کے بعد سنجیدگی سے کہا۔
 ”تو کچھ شکر و حیرت کے بعد سنجیدگی سے کہا۔
 ”مدحہ نے یوں سر جھکا جیسے احمق ہو۔

رہانے کا تھا لیکن اس سے پہلے ہی احمر سونیا، عمر اور ثوبیہ نے آکر ان کے کمرے پر دھاوا بول دیا۔ سونیا نے
 کچھ دیر تم لوگ تمہارا روٹی کیسا بیٹھو لیکن عمر کران دونوں کو بھی ادھر ہی لے آیا تھا۔
 ”آپ لوگ ذرا پہلے آ جاتے۔“ ”مدحہ جلدی جلدی کتابیں سمیٹتی ہوئی بولی۔
 ”ہمیں کیا پتا تھا کہ یہاں تم پر ظلم ہو رہا ہے پھر بھی دعا میں دو ہمیں کہ جلدی چھٹی ہو گئی۔“ ”احمر نے
 برابر بیٹھتا ہوا بولا۔
 ”اصل میں نبیل بھائی اصح چھٹی ہے نا۔ اور ہاں فکیل پچا آرہے ہیں کل فیملی کے ساتھ۔ ابھی
 آیا تھا۔“ ”عمر نے بتایا تو مدحہ کچھ افسوس سے بولی۔
 ”کل کیوں آرہے ہیں۔ ہمارے امتحانوں کے بعد آتے تب میں فارغ ہوتی تو ان کے ساتھ اسلام
 ایمان سے مجھے بہت شوق ہے۔ اسلام آباد، عمری سوات وغیرہ جانے گا۔“
 ”لاؤ ہاتھ دکھاؤ، اسلام آباد جانے کی لکیر ہے کہ نہیں۔“ ”عمر نے اس کی کلائی جھپٹتے ہوئے کہا تو سب
 ہنسے۔
 ”آپ کو ہاتھ دیکھنا آتا ہے عمر بھائی؟“ ”روٹی نے بہت شوق سے پوچھا۔
 ”سارے کام آتے ہیں اسے۔“ ”عمر سے پہلے مدحہ اس کی تعریف میں شروع ہو گئی۔“ ”لیکن آج تک
 ایک کام بھی نہیں کر سکتا۔ ایک تو بے چارے کو بھولنے کی عادت ہے، دوسرے گھر سے نکلتے ہی اس کی
 جاتی ہے۔ کبھی اس کے ساتھ کہیں جانے کی غلطی مت کرنا۔ تمہیں راستے ہی میں کہیں چھوڑ آئے گا۔“
 ”یہ۔ یہ۔ سراسر بے ایمانی ہے مدحو۔“ ”عمر نے احتجاج کیا۔“ ”روٹی! اس کا یقین نہیں کرنا یہ
 ہے۔“
 ”ہاں یہ بھی جھوٹ ہے کہ۔“ ”مدحہ کوئی واقعہ سنانے جاری تھی کہ وہ چیخ پڑا۔
 ”بس چپ ہو جاؤ۔“
 ”اوں ہوں!“ ”نبیل نے ٹوکا۔“ ”چلاؤ نہیں عمر! اور مدحہ یہ کیا حرکت ہے؟“
 ”میں کوئی جھوٹ ٹھوڑی بول رہی ہوں اور آہستہ آہستہ تمہارا روٹی بھی جان جائیں گی، مدحہ عمر کو
 تو اس نے یوں منہ پر ہاتھ پھیرا جیسے چھوڑوں گا نہیں تمہیں۔
 ”ایک بات بتاؤ۔“ ”تمہارے مدحہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔“ ”تمہیں اور صبا کو ایک جیسی شکل کی بد
 پر ابلم بھی ہوتی ہے۔“
 ”ہمیں کیوں ہوگی پر ابلم؟ دو سروں کو ہوتی ہے۔“ ”صباحت نے فوراً کہا تو مدحہ اسے دیکھ کر بولی۔
 ”کیوں ہمیں نہیں ہوتی کیا۔“ ”پھر تمہارے کہنے لگی۔“ ”پہلے اسکول میں اور اب کالج میں بھی لڑکیاں
 ہیں۔ روک روک کر پوچھتی ہیں۔ سنو تم مدحہ ہو کہ صباحت۔ خواہ مخواہ میں ہی نہ کوئی لڑکی اور بات کرنا
 کوئی کام ہوتا ہے بس یہی پوچھیں گی۔“
 ”تمہاری غلطی سے ناں۔ تم اگر صباحت جیسا قتل بنانا چھوڑ دو تو کوئی بھی نہیں پوچھے گا۔“ ”سونیا۔
 انگوٹھے سے اپنا قتل مٹاتی ہوئی بولی۔
 ”میں ہمیشہ تو نہیں لگتی۔“
 ”یہ کیا اصول باتیں لے بیٹھی ہو تم لوگ۔“ ”احمر ٹوکتے ہوئے بولا۔“ ”نبیل بھائی بھی ہو رہے ہیں۔
 ”میں ابھی بوریت دور کرتا ہوں۔ نبیل بھائی ایک شعر منجیے۔“ ”عمر فوراً ”موڈ میں آ گیا۔“ ”اجازت
 ”ارشاد! ارشاد!“ ”لڑکیوں نے کورس میں کہا۔
 ”وہ کیا ہے کہ ہاں۔“

انہی راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
 مجھے روک روک پوچھا ابے کدھر جا رہا ہے

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“
 ”مگر تم ٹھیک کہہ رہی ہو تو پھر نیل بھائی کیوں خاموش ہیں۔ احتجاج تو انہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ بڑے ہیں۔ پہلے ان کی ہونی چاہیے لیکن ان سے شادی کون کرے گا وہ تو لنگ۔“
 صباحت نے فوراً ”مدیجہ کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ کیونکہ وہ آسیہ کے ساتھ نیل کو اندر آتے ہوتے تھے۔
 نیل کا چہرہ یکبارگی سیاہ پڑ گیا تھا۔ اور آسیہ نے انتہائی غصے میں مدیجہ کی طرف قدم بڑھائے تھے۔
 ”اوں اول۔“ مدیجہ نے جھٹک کر صباحت کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے ہٹایا اور جیسے ہی پٹلی آسیہ کوڑھ گئی۔
 ”دیکھا کہہ رہی تھیں تم؟“ آسیہ کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے اور غالباً اسے مارنے کا ارادہ تھا کہ عقب سے نیل نے اس کی کلائی تھام لی۔
 ”نہیں پھوپھو!“



”چھوڑو نیل! میں اس کی زبان کاٹ دوں گی۔“ آسیہ اپنی کلائی چترانے کی سعی کرتے ہوئے بولا۔
 ”پھوپھو پلیر! آپ کو میری قسم۔“ نیل نے فوراً اپنی قسم دی جس سے آسیہ کے کھولنے والے ہونٹوں پر تھیں۔
 ”آئیے چلیں! اپنے کمرے میں چلیں۔“
 آسیہ مدیجہ کو گھورتی ہوئی فوراً ”کمرے سے نکل گئی تو صباحت کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ نیل کوڑھ سے معذرت کرے یا پہلے مدیجہ کو دیکھے جو آسیہ کے جاتے ہی بیڈ پر اوندھی گر گئی تھی۔ خود کو انتہائی محسوس کرتے ہوئے اس نے بے بسی سے نیل کو دیکھا تو انہوں نے مسکرا کر مدیجہ کی طرف اشارہ کیا ہوا تھا مگر چلے گئے۔
 ”مسنومدو! اگر تم اپنی غلطی پر ناوم ہو کر رو رہی ہو تب تو ٹھیک ہے؟“
 اس نے مدیجہ کو مخاطب کر کے اسی قدر کہا تھا کہ وہ جھٹکتے سے سیدھی ہو کر بولی۔
 ”کوئی سی غلطی کی ہے میں نے جس پر ناوم ہو کر روئی گی۔“
 ”ایک تو تم اپنی غلطی بھی تسلیم نہیں کر سکتی، خیر چھوڑو۔ اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑتے۔“
 سے تیار ہو جاؤ۔ پھر نیچے چلتے ہیں۔“ اس نے موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کہا۔
 ”میں کوئی تار نہیں ہو رہی اور نہ نیچے جاؤں گی۔“ مدیجہ ضدی لہجے میں کہتی دوبارہ اوندھی ہو گئی۔
 ”دیکھو! ختمی کا موقع ہے۔ اس طرح مت کرو۔ بہت بری بات ہے۔ چلو اٹھو۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑا۔
 اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ کچھ لمبی جلی آوازوں نے اس کی توجہ مبذول کرائی۔
 ”سب لوگ یہاں آ رہے ہیں کیا؟“ وہ مدیجہ کو چھوڑ کر کمرے سے نکل کر آئی تو دیکھا۔ میونہ کے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں اور ان سے پہلے پتا نہیں کون کون اندر گیا تھا۔
 ”ہاں جی! آس نے بے ساختہ پکارا۔ اور میونہ بھابھی کے پلٹ کر دیکھنے پر پوچھا۔ ”کون آیا ہے؟“
 ”کوئی نہیں۔“ میونہ بھابھی نے کہا اور آسیہ کے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا تو اسے لگا۔ کچھ دیر وہیں کھڑی اپنے آپ قیاس کرتی رہی پھر نیل سے پوچھنے کے ارادے سے ان کے کمرے کے دروازے پر پہنچے ہی کھٹکے۔
 ”نہیں معذرت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں مدیجہ کی نادانیوں کا برا نہیں مانتا۔“

”بہن جی کو آپ نادانی کہہ رہے ہیں نیل بھائی! خیر اس وقت میں اس کی طرف سے معذرت کرنے نہیں آئی۔“
 ”پوچھنے آئی ہوں کہ ماما کے کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔“
 ”ابا! ہو رہا ہے؟“ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں نیل نے الناس سے پوچھا۔
 ”پوچھنے نہیں پتا۔ میں نے ابھی ماما جی کو جاتے ہوئے دیکھا ہے اور بھی پتا نہیں کون کون ہے اور انہوں نے ابھی بند کر لیا ہے۔“
 ”جو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ ہوگی کوئی ایسی بات جو بچوں کے سامنے کرنے کی نہیں ہوگی۔“
 ”نیل! چھٹک انداز میں کہہ کر گویا اسے تسلی دی۔
 ”نیل! چھٹک انداز میں! مجھے تو کوئی گنہگار مسئلہ لگتا ہے۔ آپ جا کر معلوم کریں ناں۔“ اس نے بے صبری کا مظاہرہ نہیں کیا۔
 ”جی ہاں! اور دروازے تک آکر نیل سے بولیں۔“
 ”نیل! ام کو آسیہ بی بی بلارہی ہیں۔“
 ”نیل! بولا! اپنے کمرے میں؟“ اس نے فوراً ”بوا سے پوچھا تو نیل ٹوک کر بولے۔
 ”جا! اسہیں کیا ہو رہا ہے۔ جاؤ نیچے سو نیا دغیرہ کے پاس جاؤ۔“
 پورا ساتھ لیے ہوئے کمرے سے نکلے اور آسیہ کے دروازے پر رک کر اسے آگے جانے کا اشارہ کیا تو وہ زہرہ کو دروازے سے روک کر دیکھا تو غور سے اسے دیکھنے لگا تو عقب سے عمر شرارت سے بولا۔
 ”تم! آہ! آہ! میں ٹھٹکا ہوا! احمر رک کر غور سے اسے دیکھنے لگا تو عقب سے عمر شرارت سے بولا۔
 ”بڑے بھائی! پہلے تصدیق کر لیجئے۔“
 ”وہی کر رہا ہوں۔“ احمر پہلے بے دھیانی میں بولا۔ پھر ایک دم سٹپٹا گیا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں کیا پچانتا ہوں۔“
 ”نیل! صبا! صبا میری پیاری بہن۔“
 ”پیاری بہن! تمہاری پیاری بہن کہاں ہے؟“ عمر نے اس کے قریب آ کر مدیجہ کے بارے میں پوچھا تو وہ جو ان دونوں کی باتوں پر حیران ہو رہی تھی اسی عالم میں بولی۔
 ”وہ دروہی ہے۔“
 ”ہاں! میں روئے کا کون سا وقت ہے، مطابعا موقع ہے۔ کچھ دیر پہلے تو یہاں ٹھیک ٹھاک کھڑی تھی۔ پھر کیا ہوا؟“
 ”مگر پوچھ اس سے رہا تھا اور دیکھ احمر کو رہا تھا نیچے مدیجہ کے رونے کا سبب وہی ہو۔“
 ”کیں وہ! ماما نے زرا سا ڈانٹ دیا تو وہ رونے لگی اور یہ آپ دونوں اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہیں۔“ وہ باری باری دونوں کو دیکھنے لگی۔
 ”میں نہیں صرف احمر بھائی۔ بے چارے بڑے صبر آزمایا حالت سے گزر رہے ہیں اس لیے کچھ بوکھلا گئے ہیں۔“ عمر نے لکنا تو اسے ایک دم مدیجہ کی بات یاد آئی۔ جتنے ہوئے بولی۔
 ”نیل! مدد! خیر! یہی تھی کہ آپ بھی متکلیف کرنا چاہتے ہیں۔“
 ”لیکن اس نے یہ نہیں بتایا ہو گا کہ یہ اسی سے کرنا چاہتے ہیں۔“ عمر نے فوراً ”کہا تو خوشگوار حیرت کے باعث اس کا پورا منہ چل گیا۔
 ”مسنومدو! ہمیں چل جائے گی! اور جلدی سے بتاؤ کیا طے پایا؟“ عمر نے ٹوک کر پوچھا۔
 ”تو کیا ماما کے کمرے میں ہی طے پاتا ہے۔ مجھے نہیں پتا۔ میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔“
 ”تو تیزی سے پٹلی اور دو دو سیڑھیاں پھلا عقی ہوئی اور آئی تو آسیہ کے کمرے کے بند دروازے پر بس ایک لحظہ کو رہا۔ اپنے کمرے میں آئی اور اوندھی بڑی مدیجہ کے برابر کرتے ہوئے بولی۔
 ”مسنومدو! بھائی! اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ یعنی اشعر بھائی کے ساتھ ان کی متکلیف کا پروگرام بھی سنبھال رہا ہے۔“

”میں کیا کروں؟“ مدیحہ کا غصہ اور ناراضگی ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔
 ”ہاں تمہیں کیا کرنا ہے۔ تم تو بڑے آرام سے وطن بن کر بیٹھ جاؤ گی۔“ اس نے کہا تو مدیحہ اکیدہ کر کے اسے دیکھنے لگی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“
 ”مطلب یہ کہ ماما کے کمرے میں سب جمع ہیں اور نیچے احمر بھائی بے چارے بڑی بے صبری سے انتظار ہیں کہ ماما کی فیصلہ کرتی ہیں۔“
 اس نے شرر مسکراہٹ کے ساتھ بتایا تو مدیحہ کے چہرے پر نہ صرف رنگ اترے بلکہ وہ گھبرا بھی کیونکہ ابھی وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہوئی تھی جہاں پہلی دستک ہر حال میں اثر دکھائی ہے۔ اور دستک بڑی زوردار تھی۔ پتا نہیں احمر کب سے اس کے بارے میں اس انداز سے سوچنے لگا تھا۔ اس پر تو نہیں کیا تھا یا ہو سکتا ہے وہ نہ سمجھی ہو۔

”سنو۔ کبھی احمر بھائی نے تم سے۔۔۔ بات ابھی صباحت کے ہونٹوں میں تھی کہ وہ فوراً نفی فرمادی۔

”نہیں۔ مجھ سے کبھی کچھ نہیں کہا انہوں نے۔“
 ”پھر تو بڑے جیسے رسم ہیں۔ ممکن ہی ہو جائے پھر پوچھوں گی ان سے۔ ارے یہ تو ماما جی کی آواز ہے سب لوگ نیچے جا رہے ہیں۔ چلو تم جلدی سے اٹھ جاؤ کیونکہ ماما اب ادھر ہی آئیں گی۔“
 صباحت آوازوں پر کان لگا کر جلدی جلدی بولنے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تو مدیحہ بھی فوراً اٹھ کر اوڑھ بند ہو گئی۔
 کچھ دیر بعد آسیہ ان کے کمرے میں آئی اور ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس سے پوچھنے لگی۔

”مدحو کہاں ہے؟“
 ”واش روم میں۔“ اس نے بتایا اور بے اختیار ہنسنے لگی۔ ”ماما! شادی کر رہی ہیں؟“
 ”شادی نہیں اچھا۔ صحت احمر کے ساتھ۔ مدحو کو بتا دو اور اسے تیار کر کے نیچے سونیا کے پاس لے جا کرو۔ سمیہ کو بلا لو وہ اسے تیار کر دے گی۔ تم اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔ اس وقت سے کیا کر رہی تھیں۔“
 ”اے تو کا تو وہ کچھ سٹانگٹی۔“

”وہ ماما۔ میں مدحو کا موڈ ٹھیک کر رہی تھی۔ اس وقت آپ نے ڈانٹا تھا تو وہ رو رہی تھی۔“
 ”اچھا ٹھیک ہے۔ میں سمیہ کو بھیجتی ہوں۔“ آسیہ چلی گئی تو اس نے پہلے واش روم کا دروازہ بجایا جلدی نہانے کا ماما پھر الماری کھول کر اس کے لیے دوسرے کپڑوں کا انتخاب کرنے لگی۔

~~*

رات بہت دیر تک خاصا بے نگاہ رہا تھا۔ تین بجے کے قریب سب اپنے اپنے کمروں میں گئے تھے۔ آگے کے آغاز پر بے حد خاموشی تھی۔ آسیہ نے خود ہی اپنے لیے چائے بنائی اور گلیے ہوئے بیٹیوں کے آگے۔

وہ دونوں بے خبر سو رہی تھیں اور آسیہ کا انہیں اٹھانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بس دیکھنے چلی آئی رات مدیحہ کی منتہی کر کے جہاں وہ خوش تھی وہاں اس کے اندر عجیب سی بے چینی سمائی تھی۔ شاید زندگی کی ناکامی نے اسے خائف کر دیا تھا۔ حالانکہ احمر اس کے سامنے پروان چڑھا تھا۔ بہت مختصر کا دار لڑکا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ بہت ترقی کرے گا۔ پھر کوئی غیر بھی نہیں تھا۔ یعنی موزوں اس کے باوجود اگر وہ مکمل اطمینان سے نہیں ہو رہی تھی تو یہ یقیناً اس کے اپنے اندر کا خود برسا برسی کی گرد بھی دھندلانے میں ناکام رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ بیٹیوں کی ماں تھی۔

میں چائے ختم ہونے تک وہ وہیں کھڑی چپ چاپ۔ دونوں کو دیکھتی رہی پھر اسی خاموشی سے ان کے کمرے میں آئی۔ نیل کو جاتے دیکھ کر آہستہ آواز میں پکارا۔ سر پوچھنے لگی۔

”ہاں جا رہے ہو؟“
 ”آپ کو ہی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں میں پوچھ رہی تھی۔ سمجھا نیچے گئی ہیں۔ اب کوئی دیکھنے جا رہا تھا۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔
 ”نیل! دو اور صابو دیکھ رہی تھی۔ ابھی تو نہیں۔“ نیل نے واپس پلٹتے ہوئے کہا۔

”جی۔ آپ سب خوش رہو۔ بہت رونق ہوگی۔“ عمر نے اپنے تئیں سمیٹھ کو مشکل سے نکالا لیکن جی اے کرے گی تو اس سر پرست رونق ہوگی۔“

”آئیے بیٹے! بچوں کی دلچسپیاں ہوں گی۔ ہم کیا کریں گے۔“
 ”جناب صرف چھوٹے بچوں کے لیے نہیں اسی سال تک کے بچوں کے لیے تفریح ہی تفریح ہے بھائی؟“ عمر نے تصدیق کے لیے نیل کو دیکھا تو انہوں نے مسکرا کر یوں کندھے اچکائے جیسے کہتے۔

”آپ بھی نیل بھائی! بس ایسے ہی ہیں۔ ہاں کہہ دینے میں کیا حرج تھا۔“ عمر ناراضگی سے کہہ جا بیٹھا۔
 ”اے یہ تو بالکل بچوں کی طرح روٹھ کر بیٹھ گیا ہے۔“ سمیٹھ اسے دیکھ کر ہنسی۔

”بچہ ہی ہے۔“ نیل کے لیے ابھی یہ وہ چھوٹا سا عمر تھا۔
 ”نا عمر تم نے نیل بھائی تمہیں بچہ کہہ رہے ہیں۔“ صباحت نے اسے متوجہ کر کے کہا تو وہ: ”انہیں اپنے سامنے سب بچے لگتے ہیں۔ کبھی اباجی کے ساتھ بیٹھ دیکھا ہے انہیں ان سے شفقت سے پیش آرہے ہوتے ہیں۔“

سب کی بے ساختہ ہنسی میں نیل جھینپ کر رہ گئے تھے۔ یوں ہنسی مذاق میں وہیں بیٹھ اتنی دیر اور جانے سے نیل نے منع کر دیا اور سیدھا گھر کی راہ لی۔
 میمونہ بھابھی، سیما بھابھی اور یاسمین کھانا تیار کر چکی تھیں اور اماں جی، اباجی کے ساتھ۔ کو بھی کھلا چکی تھیں۔ البتہ خود ان سب کے انتظار میں تھیں۔ آسیہ کلینک سے لوٹی تو وہ بھی وہیں برآمدہ میں بیٹھ گئی تھی۔
 ”آسیہ! اچھے افسوس ہو رہا ہے کہ میرا ایک اور بیٹا نہیں ہے۔“ سیما بھابھی نے اچانک آسیہ کو اس نے کچھ تعجب سے دیکھا۔
 ”کیوں؟“

”تم سے صباحت مانگتی۔“ سیما بھابھی کے لہجے میں صباحت کے لیے بڑا پیار تھا۔
 ”اچھا! وہ ذرا سانس لی۔ پھر کہنے لگی۔ ”آپ نے اور یاسمین نے بھی بس دو بچوں پر اکتفا کر تمہیں بیٹے کی خواہش نہیں تھی جو تمہیں مزید بچے پیدا کرنے پر اکساتی۔“
 ”مجھے تو بھی لیکن شاید عدیل کو نہیں تھی۔ خیر البتہ کا شکر ہے۔ بیٹیاں بھی بڑی نعمت ہیں۔“ یاسمین نے کہا تو سب تائید میں سر ہلانے لگی تھیں۔
 تب ہی باہر گاڑی رکنے کے ساتھ سب کی آوازیں آنے لگیں اور کچھ دیر بعد ساری روٹی، پورے آٹن میں ہنسی قہقہے گونجنے لگے۔ میمونہ بھابھی نے بمشکل اٹھتے ہوئے سب کو خاموشی ”جلدی سب ہاتھ منہ دھو کر آؤ۔ میں کھانا لگا رہی ہوں۔ تم لوگوں کے انتظار میں ہم۔“
 ”آسیہ! تم بھی بیٹیں رکنا۔“

”تمہیں بھابھی! ابو کھانا بنا چکی ہوں گی۔“ آسیہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”چلو نیل! دو صبا اور جی ماما! چلیں۔“ مدیہ اور صباحت فوراً ”سیڑھیاں پھلانگ گئیں۔“ آسیہ نیل کے ساتھ ا ”کہاں کہاں گئے تم لوگ؟“ ”کھانے کی نیل پر آسیہ نے باری باری متوں کو دیکھ کر پوچھا۔
 ”بس ساحل پر۔ اس کے بعد سمیٹھ کی خواہش تھی کہیں اور جانے کی، لیکن دیر ہو چکی تھی! آگئے۔“ صباحت نے بتایا۔

”پریشان تو نہیں کیا تھا نیل! ان دونوں نے تمہیں؟“ آسیہ نے نیل سے پوچھا تو مدیہ فو ”قہما! آپ کو ہمیشہ یہ خیال کیوں آتا ہے کہ ہم نیل بھائی کو پریشان کرتے ہوں گے۔“

”جی۔ تم پریشان کرتی ہو اور نیل نے کبھی مجھے خود سے نہیں بتایا۔ میں پوچھوں گی جب بھی منع کر دے لی کہ تم دونوں کے ساتھ محبت ہے۔ جو تمہاری بد تمیزیوں میں نہ صرف خود انکسور کر رہا ہے بلکہ مجھ سے بھی نیکی تم دونوں کے ساتھ۔“

”میں مصروف رہ کر سرسری انداز میں بول رہی تھی۔ یعنی اس وقت کسی تنبیہ یا لیکچر دینے کا کوئی حوالہ اس کے سرسری انداز نے ہی مدیہ کو مزید کچھ کہنے سے باز رکھا تھا۔“

~~*

بھائی اپنے اہل و عیال کے ساتھ اسام آباد چلے گئے تو گھر کی رونق میں کچھ کمی ہوئی تھی اور زیادہ کی اس صباحت نے بھائی الگ گھر لے کر وہاں شفٹ ہو گئے۔ گو کہ ان کا گھر زیادہ دور نہیں تھا پھر بھی یہ گھر بہر حال نئے لگتا تھا۔ حالانکہ وہ تین چار مہینے ہی یہاں رہے تھے۔ لیکن ان کا جانباب کو ہی محسوس ہو رہا تھا۔
 ”نیل حسب معمول مدیہ اور صباحت کو پڑھانے بیٹھے تو دونوں کے چروں پر بے زاری دیکھ کر پوچھنے

بات ہے پوچھ بھونے کسی بات پر ڈانٹا ہے تم دونوں کو؟۔“

”ہاں تو۔“ دونوں ایک ساتھ بولی تھیں۔

”یہ دہلی شکلیں بنا کر کیوں بیٹھی ہو؟۔“

نیل بھائی، ”نمو اور روٹی چلی گئی ہیں ناں۔ ان کے بغیر سارا دن ہم بہت بور ہوئے۔ ایمان سے بالکل اچھا۔“
 ”اب پڑھنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا۔“ صباحت نے سب بتا کر اپنے سامنے کتاب بھی بند کر دی۔
 ”کچھ خاموشی محسوس ہو رہی ہے ان کے جانے سے۔ خیر کچھ دن کی بات ہے پھر پہلے کی طرح لگنے لگے۔
 ”نیل نے خاموشی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”جی جی پہلے کی طرح لگنے لگا تو تب پڑھیں گے۔“ صباحت نے صرف کتاب بند کی تھی مدیہ فوراً ”کتابیں! کراٹھ کھڑی ہوئی۔“ ”نیلک ہے ناں نیل بھائی! ابھی کچھ سمجھ میں بھی نہیں آئے گا پھر آپ کیوں اپنی

”جی جی آرام سے۔“ نیل ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”جتا ہے امتحان کب سے ہیں۔ فیل ہو جاؤ گی تو تم سے پوچھو میری کلاس لیس گی۔“

”جی جی آرام سے۔“ نیل ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”جتا ہے امتحان کب سے ہیں۔ فیل ہو جاؤ گی تو تم سے پوچھو میری کلاس لیس گی۔“

”جی جی آرام سے۔“ نیل ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”جتا ہے امتحان کب سے ہیں۔ فیل ہو جاؤ گی تو تم سے پوچھو میری کلاس لیس گی۔“

”جی جی آرام سے۔“ نیل ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”جتا ہے امتحان کب سے ہیں۔ فیل ہو جاؤ گی تو تم سے پوچھو میری کلاس لیس گی۔“

”جی جی آرام سے۔“ نیل ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”جتا ہے امتحان کب سے ہیں۔ فیل ہو جاؤ گی تو تم سے پوچھو میری کلاس لیس گی۔“

”جی جی آرام سے۔“ نیل ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”جتا ہے امتحان کب سے ہیں۔ فیل ہو جاؤ گی تو تم سے پوچھو میری کلاس لیس گی۔“

”جی جی آرام سے۔“ نیل ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”جتا ہے امتحان کب سے ہیں۔ فیل ہو جاؤ گی تو تم سے پوچھو میری کلاس لیس گی۔“

”جی جی آرام سے۔“ نیل ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”جتا ہے امتحان کب سے ہیں۔ فیل ہو جاؤ گی تو تم سے پوچھو میری کلاس لیس گی۔“

”جی جی آرام سے۔“ نیل ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”جتا ہے امتحان کب سے ہیں۔ فیل ہو جاؤ گی تو تم سے پوچھو میری کلاس لیس گی۔“

”جی جی آرام سے۔“ نیل ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”جتا ہے امتحان کب سے ہیں۔ فیل ہو جاؤ گی تو تم سے پوچھو میری کلاس لیس گی۔“

”جی جی آرام سے۔“ نیل ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”جتا ہے امتحان کب سے ہیں۔ فیل ہو جاؤ گی تو تم سے پوچھو میری کلاس لیس گی۔“

”جی جی آرام سے۔“ نیل ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”جتا ہے امتحان کب سے ہیں۔ فیل ہو جاؤ گی تو تم سے پوچھو میری کلاس لیس گی۔“

”جی جی آرام سے۔“ نیل ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”جتا ہے امتحان کب سے ہیں۔ فیل ہو جاؤ گی تو تم سے پوچھو میری کلاس لیس گی۔“

”جی جی آرام سے۔“ نیل ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ”جتا ہے امتحان کب سے ہیں۔ فیل ہو جاؤ گی تو تم سے پوچھو میری کلاس لیس گی۔“

”کیا ہوا ہے اسے؟“
”نکتے ظالم ہیں آپ لوگ۔ سب جانتے ہیں اور ہم دونوں سے چھپاتے ہیں۔“ مدحیہ پھٹ پڑی۔
”کیوں چھپایا ہم سے؟“

”کیا۔ کیا کہہ رہی تھیں کیا چھپایا تم سے۔“ نیل کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔
”یہی کہہ ہم دونوں تسلیم ہو چکی ہیں۔ ہمارا باپ۔۔۔“

”شٹ اپ مدحو! یہ فضول کو اس کس نے تم سے؟“ وہ تدریے سختی سے ٹوک کر بولے۔
”آپ۔۔۔ ابھی آپ ہی نے تو کہا ہے کہ آپ ان کے مزار پر کبھی نہیں گئے۔ دیکھیے نیل بھائی ہم نے
نہیں چھپائے ورنہ میں ابھی جا کر ماما سے پوچھوں گی۔“ مدحیہ ان کے سخت لہجے سے خائف ہوئے بغیر
بولنے لگی تھی۔ نیل نے کچھ دیر غور کیا پھر ساری بات سمجھ کر کہنے لگے۔

”بہت نکمھی ہو تم دونوں۔ پتا نہیں دھیان کہاں رہتا ہے۔ میں شاہ بھائی کی بات کر رہا تھا ورنہ
حیات کو درمیان میں کہاں سے لے آئیں۔“
”تو کیا شاہ سکندر زندہ ہیں؟“ مدحیہ نے خوش ہو کر کہا تو صباحت بھی جلدی سے آنسو پونچھ کر
بیٹھی۔

”میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ انہوں نے کہہ کر فوراً ”موضوع بدل دیا۔
”چلو آج تم دونوں کا واقعی دھن کا موڈ نہیں ہے۔ اٹھاؤ کتابیں اور کل سے پوری تیاری کے ساتھ بیو
”بالکل نہیں۔ جب تک آپ میری بات کا جواب نہیں دیں گے میں کل تو کیا بھی نہیں پڑھوں گی۔
ضدی لہجے میں بولی۔

”تو ن سی بات کا جواب چاہتی ہو؟“ انہوں نے مدحیہ سے پوچھنے کے ساتھ ایک نظر صباحت
اشارے سے اسے منع کر رہی تھی لیکن وہ باز نہیں آئی۔

”میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ نے شاہ سکندر کو دیکھا ہے یعنی ہمارے پاپا کو؟“
”ہاں۔ لیکن مجھے وہ ٹھیک طرح سے یاد نہیں ہیں یعنی اگر اب بھی سامنا ہو جائے تو شاید میں انہیں
سکوں گا یا ہو سکتا ہے پہچان بھی لوں۔“ نیل نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا پھر باری باری دونوں
پوچھا۔ ”بس یا کچھ اور۔“

”اور اگر آپ کو ان کا نام پتا معلوم ہو تو وہ بتا دیں۔“ مدحیہ نے کہا تو وہ کچھ ٹھنک سے گئے۔
”نہیں۔ مجھے نہیں معلوم اور شاید یہاں کسی کو بھی معلوم نہیں ہو گا۔ کیونکہ جس اپارٹمنٹ میں ان
تھی وہ انہوں نے پھوپھو کے نام کر دیا تھا۔ اس کے بعد جب تعلق ختم ہو گیا تو پھر ظاہر سے کسی کو ان کا
کرنے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔“ نیل نے بہت سنبھل کر دونوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔
”انہیں تو معلوم ہے ناں کہ ہم یہاں رہتے ہیں پھر انہوں نے ہم سے ملنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔
سوال مدحیہ اٹھا رہی تھی۔ جبکہ صباحت بالکل خاموش تھی لیکن چروہ بتا رہا تھا کہ اندر سے وہ بھی اتنی
ہے۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ جب انہیں کبھی تمہارا خیال نہیں آتا تو تم بھی ان
میں مت سوچو۔ اگر وہ فیئر ہوتے تو پھوپھو خود تمہیں ان کے بارے میں بتاتیں اور اب تمہیں پھوپھو
چاہیے۔ تمہارے لیے سب کچھ وہی ہیں، خود میرے لیے بھی وہ میرے ماں باپ سے بڑھ کر ہیں۔ بہت
محبت سے انہوں نے ہم تینوں کی آبیاری کی ہے۔ ہمیں ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیے جس سے انہ
ہو۔ سمجھ رہی ہوں ناں؟“

بہت نرمی سے سمجھاتے ہوئے انہوں نے دونوں کو تنبیہ بھی کی اور ان کے سر جھکانے پر اٹھے وہ
”چلو جاؤ اب سونے کی تیاری کرو۔ صبح کالج بھی جانا ہو گا اور سن لو کھل سے پڑھنے کے اوقات میں دماغ

”نہ۔ اپنی کتابیں سنبھالیں اور انہیں شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آگئیں۔
”بے نیل بھائی! لاٹ آف کر کے بیڈ پر لیٹتے ہی مدحیہ نے نیل کو جھٹانا شروع کر دیا۔ ”انہیں بیبا
نے میں صاف مکر گئے۔“

”شب بخیر۔ نیل بھائی جھوٹے نہیں ہیں، بلکہ تمہارا دماغ خراب ہے جو ان سے ہمیشہ شکاں رہتی ہو۔“
”نیل! بہت برا لگا تھا۔ انتہائی ناگوار سی بولی۔
”جھٹکا تو صبا! تمہارا بھجہ سے زیادہ قریبی رشتہ ہے یا نیل بھائی سے؟“ مدحیہ سلگ کر اٹھ بیٹھی۔

”نیل سے ایک سا ہے۔ تم بہن اور وہ بھائی۔“
”نیل نہیں ہیں وہ بلکہ ان سے خونی رشتہ تو بنتا ہی نہیں ہے تمہارا پھر بھی تم ماما کی طرح انہیں مجھ پر فوقیت
کہیں؟“

”نیل کو کسی پر فوقیت نہیں دیتی۔ تم کچا ہتی ہو کہ تمہاری غلط بات پر بھی میں تمہاری ہاں میں ہاں ملاتی جاؤں
میں کر سکتی اور یہ تم رشتوں میں سکے سو تیلے کا فرق کیا لے بیٹھی ہو۔ میں کسی خونی رشتے کو نہیں پہچانتی۔
نیل بھائی کی ذات ہمارے لیے سناٹا جیسی ہے۔ جنہوں نے بھائی کی کمی تو پوری کی ہی اس کے ساتھ وہ
بھی دیتے ہیں جو مجھے اپنی زندگی میں کسی خلا کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ تم خدا کے لیے ان سے شاکا ہوتا
اور آئندہ میرے سامنے انہیں کچھ مت کہنا۔ میں جتنی محبت تم سے کرتی ہوں اتنی ان سے۔“
”تو بولتے ہوئے جذباتی ہو گئی تھی۔ اس لیے آخر میں اس کی آواز بھرا گئی اور بس اس کا خیال کر کے مدحیہ
بہک کر کٹے کا رازہ ترک کر دیا اور اس کی طرف سے کمرٹ بھی بدل گئی تھی۔

~~*

”بہن! بڑھاپے کچھ بے دھیانی میں آسیہ کی گاڑی گیٹ سے نکلے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جب آسیہ کی نظر
اپنی تباہی سے چونک کر ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہہ دیا۔ ”آسیہ نے شیفٹ مسٹرکرا ہٹ کے ساتھ ہاتھ ہلایا پھر
انے بڑھادی گاڑی کے نظروں سے اوچھل ہوئے ہی مدحیہ نے جھک کر نیچے دیکھا جہاں احرام سے متوجہ
کے لیے دونوں بازو اوپر اٹھا کر لہرا رہا تھا۔ وہ بے ساختہ ہنس۔

”بات ہے؟“
”پتے کو۔“ امر کی آواز دھیمی تھی۔ لیکن ہاتھ کا اشارہ واضح جسے سمجھنے کے باوجود انجان بن کر اونچی آوازیں

”باکس رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“
”بے نیل! کراؤ اور دیکھا پھر فوراً“ اندر چلا گیا تو وہ اس کی بو کھلا ہٹ پر ہنسی ہوئی وہیں بیٹھ گئی۔ چند لمحوں
”اتراس کے سامنے آ گیا۔
”یا ترات تھی؟“

”نہی؟“ وہ ابھی بھی ہنس رہی تھی۔
”نیل! بلانا تھا تو اشارے سے بلائیں۔ چلانے کی کیا ضرورت تھی۔“ امر نے اس کی شرارت سمجھ کر

”باس! ڈال دی۔
”نیل! اول تو میں نے آپ کو بلایا نہیں اور اگر بلانا ہو گا تو چلا کر ہی بلاؤں گی۔ کیونکہ مجھے اشارے کرنے
”اور نہ میں اشاروں کی زبان سمجھتی ہوں۔“ وہ خاصی بے نیازی سے گویا ہوئی۔
”نیل! وہاں؟“ امر نے جھنجھاک کر کہا۔

”نیل! وہاں؟“ امر نے جھنجھاک کر کہا۔
”نیل! وہاں؟“ امر نے جھنجھاک کر کہا۔
”نیل! وہاں؟“ امر نے جھنجھاک کر کہا۔

ساہوکر صحبت کو پکارنے لگا تو وہ ہنسی روک کر بولی۔

”صبا نیچے ہی ہے۔ ابھی ماما کے ساتھ تو اتری تھی۔“

”اور نیل بھائی کہاں ہیں؟“ احمر نے گردن موڑ کر نیل کے طرف کی کھلی کھڑکی سے اندر کرتے ہوئے پوچھا۔

”وہ غالباً“ بڑے ماموں کی طرف گئے ہیں۔ آپ چائے پیئیں گے؟“ اس نے جواب کے ساتھ ”ضرور پیوں گا۔ تم بناؤ گی؟“

”نہیں بوا!“ اس کے ساتھ ہی اس نے بوا کو پکار کر چائے کا کہا پھر اسے دیکھ کر بولی۔ ”وہ بتا رہی تھیں کہ آپ ایم اے کے لیے باہر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

”ہاں۔ دعا کرو۔ اس کا کرشپ مل جائے۔“ احمر نے سامنے نیل پر ٹانگیں سیدھی کرتے ہوئے بولی۔

”میری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔“

”دل سے مانگو گی تو ضرور قبول ہوں گی۔ اب یہ مت کہہ دینا کہ تمہارے پاس دل ہی نہیں اچانک اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ کچھ نروس سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔“

”میں چائے لاتی ہوں۔“

”بوائے آئیں گی، تم بیٹھو۔“ احمر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھایا تھا کہ اسی وقت بوا چائے نے فوراً نیل پر سے ٹانگیں ہٹالیں اور بوا کے ہاتھ سے ٹرے لے کر نیل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”کب کس کے لیے ہے۔ بوا! آپ بھی پیئیں گی؟“

”نہیں۔ میں تو صبا کے لیے لاتی تھی۔“ بوائے صحبت کی تلاش میں اوہراوہر دیکھتے ہوئے کہ ”صبا نیچے ہے اماں جی کے پاس۔ چلیں آپ پی لیں۔ اس کے آنے تک تو ٹھنڈی ہو جائے ایک کپ اٹھا کر بوا کو بٹھایا اور ان کے جانے کے بعد پناکپ اٹھاتے ہوئے بولی۔

”ایک بات پوچھوں احمر! سچ بتا میں گے؟“

”ہوں۔“ احمر چائے کا سب لے کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

”آپ نے صبا کا انتخاب کیوں نہیں کیا۔ میرا مطلب ہے سب لوگ اسے زیادہ پسند کرتے سونیا جی تبھی اسی کے سگن گاتی ہیں۔ حالانکہ ہماری شکلیں ایک جیسی ہیں لیکن اسے زیادہ پارک نے اس کے بجائے۔“ اس نے غالباً شروع سے یہ بات کھٹک رہی تھی اور اب پوچھتے ہوئے بچھا

”تمہاری بات ٹھیک ہے۔“ احمر اس کا مطلب سمجھ کر خاصے محفوظ انداز میں گویا ہوا۔

”سب صبا سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو اس کی عادات ہیں۔ صلح جو، فربانہ وار اور لحاظ کرنے والی۔ دوسری بڑی وجہ اس کا ہر ایک پر جان چھڑکنا ہے۔ بالکل نیل بھائی کی طرح کے لیے اس کا انتخاب میں تو کیا اس خاندان کا کوئی لڑکا بھی نہیں کر سکتا۔“

”کیوں؟“ اس کے چہرے پر قدرے الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔

”اس لیے کہ اس کے اندر ہم سب کے لیے محبت کا ایک ہی رنگ ہے۔ کچھ شفیق سا، بچہ جی لگتی ہے اور کبھی ہماری آپا جان بن جاتی ہے۔ تو بدلے میں ہمارے دلوں میں اس کے لیے ایہ اس سے ہٹ کر اس کے بارے میں کچھ اور نہیں سوچا جاسکتا۔ کم از کم میں اور عمر بھی نہیں لیے وہ بالکل ثوبیہ کی طرح ہے۔“

احمر نے پوری ایمان داری سے وضاحت کر کے اسے دیکھا تو اس نے گہری سانس کے ساتھ اکتفا کیا پھر اٹھ کر کرل کے پاس جا کھڑی ہوئی اور نیچے جھانکنے لگی۔

”سنو“ نیل بھائی کب تک آئیں گے؟“ احمر نے اسے متوجہ کر کے پوچھا۔

نہیں۔ صبا سے پوچھ لیں، شاید اسے بتا کر گئے ہوں۔“ اس نے کہا پھر آگے آکر ٹرے اٹھاتے ہوئے بولی۔

”وازا آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے بچپن میں بوا سے بات کر رہی ہے۔ میں بھیجتی ہوں اسے۔“

”میں بھی چل رہا ہوں۔“ احمر اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑا۔

”بچپن کے دروازے میں کھڑی تھی۔ مدیہ کے ساتھ احمر کو دیکھ کر پہلے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ پھر عربے پوچھنے لگی۔

”نیل بھائی کیا کر رہے ہیں؟“

”میرے یہاں آنے پر پابندی ہے یا مدحو سے بات کرنے پر۔“ احمر نے اس کی چوٹی کھینچتے ہوئے کہا۔

”نیل خبر پابندی تو کسی بات پر نہیں ہے۔ البتہ نیچے بتا کر آیا کر س کہ کہاں جارہے ہیں۔ ماما جی اس وقت سسل ایک ہی جملہ بول رہی ہیں کہ احمر کو ابھی تو میں نے یہیں دیکھا تھا کہاں گیا۔“ صحبت نے کہا تو وہ سر

نبوئے بولا۔

”ابھی بس۔ ان کے سامنے تو میں بیڑھیاں چڑھا تھا۔ خیر یہ بتاؤ نیل بھائی کب آئیں گے؟“

”وہ تو بچے آنے کا کہہ گئے تھے لیکن میں ابھی فون کر رہی ہوں انہیں کہ جلدی آئیں آپ کو بھی کوئی کام ہے۔“ صحبت کی بات سن کر مدیہ اس سے پوچھنے لگی۔

”نہیں کیا کام ہے؟“

”ہاں تو میں بس۔“ صحبت نے اسی قدر کہا تھا کہ احمر غلت میں بولا۔

”ٹھیک ہے ماما انہیں فون کرو تو کہنا۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“

”جی بات ہے۔“ صحبت جانے کس بات پر خوش ہو رہی تھی۔ احمر کو جاتے ہوئے دیکھا پھر لابی میں آکر پہلے کے کینک کے نمبر ڈائل کیے تو دوسری طرف سسٹر نے ریسپور اٹھایا تھا۔

”سسر! میں صبا ہوں۔ ماما سے کہیں۔ دو منٹ میری بات سن لیں۔“ چند لمحوں بعد آسیہ کی آواز آئی تھی۔

”ہاں صبا! بات ہے یا؟“

”لڈنڈو ماما! وہ خوشی سے کھٹکتی آواز میں بولی۔“ ابھی نیل بھائی کا اپنا نمٹ لٹر آیا ہے اتفاق سے میں نے جو بات سنا اور ابھی کسی کو نہیں بتایا۔ میں نیل بھائی کو سربراہ بنانا چاہتی ہوں۔ سب کے سامنے اور سلیویشن مانتا۔ لیکن ماما بوا کہہ رہی ہیں ان کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں ٹیک وغیرہ کہاں سے منگواؤں۔“

”تو تمہیں پیسے چاہئیں؟“ آسیہ نے اس کی ساری بات سن کر پوچھا۔

”جی۔“

ہوئے کہا۔
 ”نئی جلدی میں تو یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ خیر پھر کسی دن ان کے لیے بھی کوئی پروگرام رکھ لیں گے“ مہاجر
 نمکو کی پلیٹ درمیان میں رکھتے ہوئے کہا۔
 ”اس پروگرام میں ایک نئی خوش خبری ہونی چاہیے، یعنی نیل بھائی نے ایک عدد لڑکی پسند کر لیا۔“
 شرارت سے نیل کو دیکھا لیکن انہوں نے سنجیدگی سے ڈانٹ دیا۔
 ”فضول بکواس نہیں کرو۔“
 ”یہ فضول بکواس نہیں ہے نیل بھائی! عمر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پتا ہے ماں جی ہر وقت کیا دعا کرتی ہے
 صباحت عمر کی تائید میں بولنے لگی تھی کہ وہ ٹوک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔
 ”بس میں نے سب سن لیا ہے۔ اب تم لوگ چاہو تو محفل جمائے رکھو۔ میں سونے جا رہا ہوں کیونکہ مجھ
 اٹھنا ہے۔“
 ”آپ کے بغیر محفل کیا جے گی۔ ہم بھی چلتے ہیں۔“ حمزہ بھی اٹھ گیا تو باقی سب نے اس کی تقلید کی۔

♥-♥-♥

مدیجہ اور صباحت امتحانوں سے فارغ ہوئیں تو دونوں کپاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ صباحت تو گھر کے
 میں وچپی لیتی تھی۔ اسے کچھ مطالعے کا شوق بھی تھا۔ کبھی نیل بھائی کوئی کتاب لا دیتے تھے۔
 منکوا لیتی۔ اس لیے وہ زیادہ بور بھی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن مدیجہ کو ایسا کوئی شوق نہیں تھا۔ گھر کے کام کافی
 ہی نہیں چاہتی تھی۔ یہاں تک کہ اسے کمرے کی صفائی بھی اس سے نہیں ہوتی تھی، البتہ کپاس جانے
 ہوتی تو وہ سب سے پہلے تیار ہوتی تھی، لیکن ان دنوں کپاس جانے کا بھی کوئی پروگرام نہیں بن سکا تھا کیونکہ
 احمد دونوں کے امتحان قریب تھے وہ نیچے جا کر بھی بور ہوتی تھی۔ اس روز ناشتے کی میبل پر وہ آئیہ سے کہنے
 ”مما! آپ مجھے کچھ دنوں کے لیے ٹھیک ماموں کے پاس اسلام آباد بھیج دیں۔“
 ”کیوں؟“ آئیہ نے ناشتے سے ہاتھ روک کر اسے یوں دیکھا جیسے اس کا یہ اچانک پروگرام اس کی بے

آیا ہو۔

”چھٹیاں ہیں ممما! اور مجھے اسلام آباد دیکھنے کا شوق ہے۔“ اس نے کہہ کر صباحت کو دیکھا کہ شاید
 ہاں میں ہاں ملائے گی لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔
 ”چھٹیاں ہیں تو کچھ گھواری سیکھو اور جہاں تک شوق کی بات ہے تو سمیجہ کی شادی پر لے چلوں گی۔“
 لینا اسلام آباد۔

آئیہ نے اس کی بات مانی نہیں تو مدیجہ بھی نہیں کی اور اس کی اس حکمت عملی پر وہ برا سامنے بنا کر بولی۔
 ”سمیجہ جی کی شادی پتا نہیں کب ہوگی اور اس وقت ممما! ہماری چھٹیاں بھی نہیں ہوں گی۔ آپ
 ہمیں واپس لے آئیں گی۔“

”تو تم کتنے دن رہنا چاہتی ہو وہاں؟“ آئیہ نے پیشانی میکر کر اسے دیکھا۔
 ”کم از کم دو دن۔“ وہ آئیہ کی پیشانی کا بل نہیں دیکھ رہی تھی، جب ہی بڑے آرام سے بولی۔
 صباحت نے بو کھلا کر آئیہ کو دیکھا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
 ”تم بھی جانا چاہتی ہو؟“

”جی ممما! ہم دونوں جائیں گے۔“ صباحت سے پہلے مدیجہ بول پڑی۔
 ”تم خاموش رہو۔ میں صبا سے پوچھ رہی ہوں۔ کیوں صبا؟“ آئیہ نے مدیجہ کو ٹوک کر اسے دیکھا
 سے بولی۔

”نہیں ممما۔ میں آپ کے ساتھ سمیجہ جی کی شادی میں جاؤں گی۔“
 ”ہاں یہی مناسب ہے۔ ہم سب سمیجہ کی شادی میں چلیں گے۔“ آئیہ حتی انداز میں ایک طرح

بر کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور جیسے ہی کمرے سے نکلی۔ مدیجہ صباحت پر بگڑ گئی۔
 ”انہیں میری بات سے اختلاف کرنا ضروری تھا۔ جانے کی باہی بھرتیں تو کیا ہو جاتا۔ آرام سے اسلام آباد

موم آئے۔“
 ”ہاں۔ میرے کہنے سے تو مجھے بھیج دیتیں نہیں۔“
 ”اگلے ہیج دیتیں۔“ انہوں نے تم سے پوچھا ہی اس لیے تھا۔ میری بات تو وہ کبھی مانتی ہی نہیں۔ تمساری مانتی
 ”نیل بھائی کی۔“ ممدون ان کی سگی اولادیں ہوتاں، میں تو بس۔“
 ”نیل بھائی میں جو نہ میں آیا کہے جا رہی تھی کہ نیل ٹوک کر بولے۔“

مدیجہ نے اسے کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ پچھو پھونے کہنا تو ہے سمیجہ کی شادی میں لے چلیں گی۔“
 ”مدیجہ! یہ کیا فضول باتیں کر رہی ہیں، میں تو ہرگز نہیں جاؤں گی۔“ وہ خامسے جا رہا تھا انداز میں کرسی و ہسکیلیٹ کھڑی
 ”تب ہی جائے گا شادی میں، میں تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“

”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“

”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“

”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“

”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“

”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“

”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“

”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“
 ”نیل اور کمرے سے نکل گئی۔ تو صباحت برتن سمیجہ جی ہوتی ہوں۔“

”یار! تمہارے پاس کوئی اور کیسٹ نہیں ہے۔ صبح سے اسی کو ریو اینڈ کر کے سن رہے ہو۔“

پک گئے ہیں۔“

عازم نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے ہوئے کہا تو علی نے چونک کر اسے دیکھا پھر کیسٹ نکال کر ”سوری“ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تم بھی یہاں موجود ہو۔“

”ایسا اس وقت ہوتا ہے ڈیڑھ گھنٹہ قبل خیال میں کوئی اور ہو۔ کون ہے؟“ آخر میں عازم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چمکی تھی۔

”ایک تو یہ بڑی مشکل ہے۔ اور کوئی بات منہ سے نکلی اور تم نے جھٹ فسانہ بنایا۔“ اس کا ایک تھا دوسرے نظر سے بھی چرا گیا۔

”میرے افسانے۔ بہت جلد حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یہ تم بھی جانتے ہو عازم خاکر گشت۔“

زندگی میں ایسے بھی لوگ ملتے ہیں دیکھتے ہی آنکھوں کو اچھے لگتے ہیں

”اب تمہیں کیا ہوا؟“ اس نے فوراً ”ٹوکا۔“

میں تمہارے افسانے کی حقیقت جاننے کی کوشش کر رہا ہوں اور کسی حد تک جان بھی چکا ہوں۔“

میں ایس ڈی ایم کا عمدہ سنبھالا والا شاہ علی جانا گیسر کسی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے اور۔“

”یاس“ اس سے آگے ایک لفظ نہیں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر عازم کو مزید بولنے سے روکا تو اس نے کرسی چھینچ کر بیٹھتا ہوا بولا۔

”بولنے دو یار! ابھی تو آغاز کیا ہے۔ انجام کی پتہ نہ گئی بھی ابھی کروں گا۔“

”اے بھائی۔ میرے آغاز، انجام کو چھوڑ دو، اپنی فکر کرو۔ بابا جان نے تمہیں جس کام کے لیے بھجایا

شام سے پہلے نمناؤ پھر سکندر چاچا آجائیں گے تو ہو سکتا ہے، تمہیں ان کے ساتھ شاہ پور جانا پڑے۔“

کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا تھا۔

”اے خوب یاد دلایا۔ سکندر چاچا کو لینے بھی جانا ہے۔ کتنے بجے ہاں کی فلائیٹ۔“ عازم ایک دھچکے لگا۔

”چھ بجے۔“ اس نے بتایا تو عازم کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

”میرا خیال ہے۔ سکندر چاچا فوراً شاہ پور نہیں جائیں گے۔ حلف کی تقریب تک انہیں یہیں رکھنا

احتیاطاً ان کے لیے کمرہ سیٹ کروادو اور بابا جان کے لیے بھی کیونکہ حلف کی تقریب میں وہ بھی ضرور آئیں گے۔“

آخر سکندر چاچا منسٹر بننے والے ہیں۔“

”ہوں۔“ وہ پر سوچ انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”یہ سب میں کر لوں گا۔ تم اپنے کام نمناؤ۔ میری گان

چاہے ناں تمہیں۔“

”فوتو“ میرے پاس اپنی بجیر رو ہے۔“ عازم اپنی نئی بجیر رو پر اترا یا در نہ دو مہینے پہلے تک گاڑی کے

خوشامد کرتا تھا۔

”اے“ تمہاری بجیر رو کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔“ وہ ہنسا۔

”تمہارا قصور نہیں ہے۔ جب آنکھوں کو کوئی اچھا لگنے لگے تو تندرہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔“

اسی موضوع کی طرف آیا تو وہ فوراً ”اٹھ کھڑا ہوا۔“

”میں سوئے جا رہا ہوں، تم جہاں کہیں بھی جاؤ سپانچ بچے لوٹ آنا پھر یہیں سے ساتھ اریو رٹ ملے گا۔“

”چھی بات ہے اور ہاں سنو۔“ عازم بول بولا جیسے اسے کوئی بہت اہم بات یاد آئی ہو۔

علی جانا گیسر کی طرح متوجہ ہو گیا تھا۔

”وہ جو کوئی نہیں ہے اے میرا سلام کہنا۔“ عازم شرارت سے کہہ کر بھاگتا ہوا باہر نکل گیا تو اس نے

سراہٹ پھیلی تھی۔

”بہن دوں گا۔“

”یہ بتایا اور کچھ دیر سوئے کی غرض سے بیدار میں آیا تو بے تحاشا آنسو بہاتی ہوئی لڑکی کا تصور سامنے

پڑا۔ لڑکی کی طرح نیند آنے تک وہ اسے سوچتا رہا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

”اب تمہیں جارہے ہو کیا؟“ صبا نے سیر پھیاں اترتے ہوئے عمر کو غجٹ میں جاتے دیکھ کر وہیں سے پکار

کر رہی تھی۔

”ایک تو یہ بڑی مشکل ہے۔ اور کوئی بات منہ سے نکلی اور تم نے جھٹ فسانہ بنایا۔“ اس کا ایک

تھا دوسرے نظر سے بھی چرا گیا۔

”میرے افسانے۔ بہت جلد حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یہ تم بھی جانتے ہو عازم خاکر گشت۔“

زندگی میں ایسے بھی لوگ ملتے ہیں دیکھتے ہی آنکھوں کو اچھے لگتے ہیں

”اب تمہیں کیا ہوا؟“ اس نے فوراً ”ٹوکا۔“

میں تمہارے افسانے کی حقیقت جاننے کی کوشش کر رہا ہوں اور کسی حد تک جان بھی چکا ہوں۔“

میں ایس ڈی ایم کا عمدہ سنبھالا والا شاہ علی جانا گیسر کسی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے اور۔“

”یاس“ اس سے آگے ایک لفظ نہیں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر عازم کو مزید بولنے سے روکا تو اس نے کرسی

چھینچ کر بیٹھتا ہوا بولا۔

”بولنے دو یار! ابھی تو آغاز کیا ہے۔ انجام کی پتہ نہ گئی بھی ابھی کروں گا۔“

”اے بھائی۔ میرے آغاز، انجام کو چھوڑ دو، اپنی فکر کرو۔ بابا جان نے تمہیں جس کام کے لیے بھجایا

شام سے پہلے نمناؤ پھر سکندر چاچا آجائیں گے تو ہو سکتا ہے، تمہیں ان کے ساتھ شاہ پور جانا پڑے۔“

کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا تھا۔

”اے خوب یاد دلایا۔ سکندر چاچا کو لینے بھی جانا ہے۔ کتنے بجے ہاں کی فلائیٹ۔“ عازم ایک دھچکے لگا۔

”چھ بجے۔“ اس نے بتایا تو عازم کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

”میرا خیال ہے۔ سکندر چاچا فوراً شاہ پور نہیں جائیں گے۔ حلف کی تقریب تک انہیں یہیں رکھنا

احتیاطاً ان کے لیے کمرہ سیٹ کروادو اور بابا جان کے لیے بھی کیونکہ حلف کی تقریب میں وہ بھی ضرور آئیں گے۔“

آخر سکندر چاچا منسٹر بننے والے ہیں۔“

”ہوں۔“ وہ پر سوچ انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”یہ سب میں کر لوں گا۔ تم اپنے کام نمناؤ۔ میری گان

چاہے ناں تمہیں۔“

”فوتو“ میرے پاس اپنی بجیر رو ہے۔“ عازم اپنی نئی بجیر رو پر اترا یا در نہ دو مہینے پہلے تک گاڑی کے

خوشامد کرتا تھا۔

”اے“ تمہاری بجیر رو کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔“ وہ ہنسا۔

”تمہارا قصور نہیں ہے۔ جب آنکھوں کو کوئی اچھا لگنے لگے تو تندرہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔“

اسی موضوع کی طرف آیا تو وہ فوراً ”اٹھ کھڑا ہوا۔“

”میں سوئے جا رہا ہوں، تم جہاں کہیں بھی جاؤ سپانچ بچے لوٹ آنا پھر یہیں سے ساتھ اریو رٹ ملے گا۔“

”چھی بات ہے اور ہاں سنو۔“ عازم بول بولا جیسے اسے کوئی بہت اہم بات یاد آئی ہو۔

علی جانا گیسر کی طرح متوجہ ہو گیا تھا۔

”وہ جو کوئی نہیں ہے اے میرا سلام کہنا۔“ عازم شرارت سے کہہ کر بھاگتا ہوا باہر نکل گیا تو اس نے

Under the Neem tree

”اب تمہیں جارہے ہو کیا؟“ صبا نے سیر پھیاں اترتے ہوئے عمر کو غجٹ میں جاتے دیکھ کر وہیں سے پکار

کر رہی تھی۔

”ایک تو یہ بڑی مشکل ہے۔ اور کوئی بات منہ سے نکلی اور تم نے جھٹ فسانہ بنایا۔“ اس کا ایک

تھا دوسرے نظر سے بھی چرا گیا۔

”میرے افسانے۔ بہت جلد حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یہ تم بھی جانتے ہو عازم خاکر گشت۔“

زندگی میں ایسے بھی لوگ ملتے ہیں دیکھتے ہی آنکھوں کو اچھے لگتے ہیں

”اب تمہیں کیا ہوا؟“ اس نے فوراً ”ٹوکا۔“

میں تمہارے افسانے کی حقیقت جاننے کی کوشش کر رہا ہوں اور کسی حد تک جان بھی چکا ہوں۔“

میں ایس ڈی ایم کا عمدہ سنبھالا والا شاہ علی جانا گیسر کسی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے اور۔“

”یاس“ اس سے آگے ایک لفظ نہیں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر عازم کو مزید بولنے سے روکا تو اس نے کرسی

چھینچ کر بیٹھتا ہوا بولا۔

”بولنے دو یار! ابھی تو آغاز کیا ہے۔ انجام کی پتہ نہ گئی بھی ابھی کروں گا۔“

”اے بھائی۔ میرے آغاز، انجام کو چھوڑ دو، اپنی فکر کرو۔ بابا جان نے تمہیں جس کام کے لیے بھجایا

شام سے پہلے نمناؤ پھر سکندر چاچا آجائیں گے تو ہو سکتا ہے، تمہیں ان کے ساتھ شاہ پور جانا پڑے۔“

کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولا تھا۔

”اے خوب یاد دلایا۔ سکندر چاچا کو لینے بھی جانا ہے۔ کتنے بجے ہاں کی فلائیٹ۔“ عازم ایک دھچکے لگا۔

”چھ بجے۔“ اس نے بتایا تو عازم کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

”میرا خیال ہے۔ سکندر چاچا فوراً شاہ پور نہیں جائیں گے۔ حلف کی تقریب تک انہیں یہیں رکھنا

احتیاطاً ان کے لیے کمرہ سیٹ کروادو اور بابا جان کے لیے بھی کیونکہ حلف کی تقریب میں وہ بھی ضرور آئیں گے۔“

آخر سکندر چاچا منسٹر بننے والے ہیں۔“

”ہوں۔“ وہ پر سوچ انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”یہ سب میں کر لوں گا۔ تم اپنے کام نمناؤ۔ میری گان

چاہے ناں تمہیں۔“

”فوتو“ میرے پاس اپنی بجیر رو ہے۔“ عازم اپنی نئی بجیر رو پر اترا یا در نہ دو مہینے پہلے تک گاڑی کے

خوشامد کرتا تھا۔

”اے“ تمہاری بجیر رو کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔“ وہ ہنسا۔

”تمہارا قصور نہیں ہے۔ جب آنکھوں کو کوئی اچھا لگنے لگے تو تندرہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔“

اسی موضوع کی طرف آیا تو وہ فوراً ”اٹھ کھڑا ہوا۔“

”میں سوئے جا رہا ہوں، تم جہاں کہیں بھی جاؤ سپانچ بچے لوٹ آنا پھر یہیں سے ساتھ اریو رٹ ملے گا۔“

”چھی بات ہے اور ہاں سنو۔“ عازم بول بولا جیسے اسے کوئی بہت اہم بات یاد آئی ہو۔

علی جانا گیسر کی طرح متوجہ ہو گیا تھا۔

”وہ جو کوئی نہیں ہے اے میرا سلام کہنا۔“ عازم شرارت سے کہہ کر بھاگتا ہوا باہر نکل گیا تو اس نے

واپس کرو۔ میں نیل بھائی سے منگوالوں گی۔“ وہ اسے مزید چڑاتا ہوا بھاگ گیا تو وہ بڑبڑاتی ہوئی کہ: ”نیا ہوا عمر تمہیں لے کر نہیں گیا؟“ نیل نے اس کے تپے ہوئے چہرے کو دیکھ کر پوچھا: ”بولی۔“

”کہاں؟“

”ہاں ہری جانے کی بات کر رہی تھیں تم۔“ انہوں نے کہا تو وہ چونک کر بولی۔

”ہاں وہ عمر ابھی اپنے کسی کام سے جا رہا تھا۔ کہنے لگا کل لے جاؤں گا۔ کوئی بات نہیں۔ کل پڑھنا کے ان کی ٹیبل صاف کرنے لگی۔

”مگر کہاں ہے؟“ مہوڈھک ہوا اس کا کہ نہیں؟“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد نیل نے پوچھا: ”جی اب تو ٹھیک ہے۔ کل اباس جی سے ممائی شکایتیں کر کے دل کی بھڑاس نکال چکی ہے۔“

”جی ہاں جھاڑ کر ان کے پاس آئی تھی۔“

”چتا ہے کیا کہہ رہی تھی کہ مماس سے بالکل ہمار نہیں کرتیں۔ اس کی کوئی بات نہیں ہاتھ آپ کی ہر بات مان لیتی ہیں۔ میں نے کہا ہم اس کی طرح ایسی کوئی بات کرتے ہی نہیں ہیں جو نہ لے لے اے ایسا لگتا ہے کہ مماس ہماری بات مان رہی ہیں۔ اس پر اس نے مجھے بے نقط سنا لیا لیکن میں خاموش رہی۔“

”اچھا کیا وہ بے وقوف ہے۔“ نیل نے کہا۔

”نیل نیل بھائی! مجھے لگتا ہے۔ وہ جان بوجھ کر ایسی باتیں کرتی ہے جن سے اختلاف اختلاف ہوتا ہے تو ابھی ہے پھر اپنے آپ شاک ہو جاتی ہے۔ اس روز تو یہ بتا رہی تھی کہ وہ جیہ کی عادات پر تشویش کا اظہار کر رہی تھی۔

”کس بات پر؟“ نیل نے اس کی تشویش محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس نے نیا شوشہ چھوڑ دیا کہ آنرز کرے گی۔ اس پر اصرار بھائی نے کہا کہ اسے ان ہی سبب کرنا چاہیے بس اس بات پر دونوں میں کافی دیر ٹکرا رہی تھی کہ وہ کہتی ہوئی آئی کہ اس کی طرف آپ بتائیے یہ کوئی اچھی بات ہے۔ مماسیں گی تو وہ بھی ناراض ہوں گی پھر یہ کہے کی کہا کرتیں۔“

”ہوں۔“ نیل نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا پھر قدرے توقف سے کہنے لگے: ”آنرز کر نہیں ہے۔ اگر وہ خود کو کاپی شوق ہے تو آخر کو اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔“

”نیل آپ بھی اس کی سائڈ لے رہے ہیں۔“ وہ اچھل کر بولی۔

”اس لیے کہ یہ کوئی ناجائز ضد نہیں ہے اگر اسے پھوپھو کی طرح ڈاکٹر بننے کا شوق ہو تو کیا جاتا۔ نہیں ناں تو اس پر بھی نہیں ہونا چاہیے۔ میں خوب بات کروں گا پھوپھو سے اور اصرار انہوں نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ خاموش ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

”کچھ غلط کہا میں نے؟“ نیل نے اس کے خاموشی سے دیکھنے پر پوچھا تو اس نے یوں ہی ٹی بی سونیا اسے پکارتی ہوئی آگئی۔

”صبا۔! مارکیٹ تک چل رہی ہو۔“

”کون کون جا رہا ہے؟“ اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”بس میں اور تم چلیں گے۔ لے جاؤں نیل بھائی اسے؟“ سونیا نے اسے جواب دے ا اثبات میں سر ہلایا کر بولی۔

”ہاں کیوں نہیں۔ عمر تو لے نہیں گیا۔ تم لے جاؤ۔“

”چلو چلیج کرو گی تو کرو۔“ سونیا نے غلٹ کا مظاہرہ کیا۔

”اس نے اپنے حیلے پر نظر ڈال کر کہا۔ پھر نیل سے پوچھنے لگی: ”آپ کو کچھ منگوانا ہے۔“

”نیل نے اپنے اور مدحو کے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

”نیل نے اپنے اور مدحو کے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

”نیل نے اپنے اور مدحو کے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

”نیل نے اپنے اور مدحو کے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

”نیل نے اپنے اور مدحو کے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

”نیل نے اپنے اور مدحو کے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

”نیل نے اپنے اور مدحو کے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

”نیل نے اپنے اور مدحو کے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

”نیل نے اپنے اور مدحو کے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

”نیل نے اپنے اور مدحو کے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

”نیل نے اپنے اور مدحو کے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

”نیل نے اپنے اور مدحو کے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

”نیل نے اپنے اور مدحو کے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

”نیل نے اپنے اور مدحو کے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

”نیل نے اپنے اور مدحو کے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

”نیل نے اپنے اور مدحو کے لیے کچھ لینا چاہا تو لے لیتا۔“ نیل نے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر دیا۔

گلدان۔ کیا قیمت تھی اس کی؟

”بہت زیادہ نہ بہت کم۔ یاد رکھیے گا آج ہی کے دن۔“

وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کتا دوکان سے نکل کر جانے کس سمت غائب ہو گیا۔ وہ اس گئی۔

”جی بی بی! آپ نے انہیں قیمت ادا کر دی؟“ دوکاندار نے دوبارہ اس کی طرف آکر پوچھا تو وہ بڑا ارادہ اثبات میں سر ہلایا۔

”پھر یہ دوسرا پیس آپ کا ہوا۔“ دوکاندار نے جلدی سے ایک گلدان بیک کر کے اس کے سر اٹھاتے ہوئے اچانک خیال آنے پر اس نے پوچھا۔

”کیا پر اس بھی ان کی؟“

”بارہ سو انہوں نے آپ سے۔“

”اے جی، یہ لیے ہیں۔“ وہ جلدی سے کبر کردوکان سے نکل آئی اور سونیا کی تلاش میں گردن گھم طرف دیکھنے لگی۔ ایک جگہ وہ پرس خریدتی نظر آئی تو وہ تیز قدموں سے اس کے پاس پہنچ کر بولی۔

”مجھے کہاں چھوڑ دیا آپ نے؟“

”میں نے کہاں چھوڑا۔ تم ہی غائب ہو گئیں۔ یہ پرس دیکھو، اچھا ہے نا۔“ سونیا کا دھیان تھا۔

”جی اور کیا خریدتا ہے۔“ وہ جیسے اب یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

”بس اور کچھ نہیں۔ سونیا نے پرس کی قیمت ادا کی پھر اسے دیکھ کر بولی۔ ”تم شاید تھک گئی ہو؟“

”نہیں بس اب چلیں۔“ اس نے منع کیا لیکن سونیا نے جیسے سنا ہی نہیں زبردستی اسے آٹس کر رکشہ میں لے کر آئی تھی۔



گھر آتے ہی اس نے سب سے پہلے علی جمائیکر کا دیا ہوا کارڈ الماری میں اپنے کپڑوں کی تولی اس کے بعد اپنی جج شدہ رقم نکال کر گنتی توکل چار سو تھے۔ وہ واقعی پریشان ہو گئی کہ پائی آٹھ سو کہ

آسیہ یا نبیل سے لینے کا مطلب تھا انہیں ساری بات بتانی پڑی اور جانے کیوں وہ اس شخص کے بار ہوئے ڈر رہی تھی۔ شاید اس کے اندر خوف تھا کہ کہیں اس واقعے کے ساتھ وہ پہلا واقعہ بھی ما

جب وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تھی۔ گو کہ اس کے دل میں کوئی جو نہیں تھا لیکن کچھ ملامت اتنی سخت کہہ سکتی کہ مجبوری بھی تسلیم نہیں کرتی تھی (یہ اس کا فطری رد عمل تھا) اس لیے اس پہلے

اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کلینک کیسے پہنچی۔ بہر حال اب یہ نئی مصیبت گلے بڑھ گئی تھی۔ کیا چاہا کہ وہ کون سا پیسے لینے یہاں تک آجائے گا لیکن ہمارا اسے وہ اپنے دروازے پر دستک دیتا محسوس

کمری شام سیاہ آچکل اوڑھ رہی تھی اور اسے اپنی پریشانی میں لاسٹ جلانے کا خیال ہی اندھیرے میں کچھ بھی تھی۔ جب نبیل نے دروازے میں آکر پکارا۔

”صبا!“

”جی!“ وہ چونکنے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں! لاسٹ کیوں نہیں جلائی۔“ انہوں نے کہا اور برہہ کر ٹوب لاسٹ کاٹن آن کر دیا تو اس آنکھوں پر رکھ لیے۔

”وہ۔“ نبیل بھائی! سر میں درد ہو رہا تھا۔“

”تو مجھ سے کہا ہوتا یا بوا سے“ وہ چائے پی بنا دیتیں۔ مدحو کہاں ہے؟“ انہوں نے قریب آکر

نبیل نے کہا۔ ”کیا قیمت تھی اس کی؟“ اس نے اندر ہی اندر خود کو سرزنش کرتے ہوئے

نبیل نے کہا۔ ”جی بی بی! آپ نے انہیں قیمت ادا کر دی؟“ دوکاندار نے دوبارہ اس کی طرف آکر پوچھا تو وہ بڑا ارادہ اثبات میں سر ہلایا۔

”پھر یہ دوسرا پیس آپ کا ہوا۔“ دوکاندار نے جلدی سے ایک گلدان بیک کر کے اس کے سر اٹھاتے ہوئے اچانک خیال آنے پر اس نے پوچھا۔

”کیا پر اس بھی ان کی؟“

”بارہ سو انہوں نے آپ سے۔“

”اے جی، یہ لیے ہیں۔“ وہ جلدی سے کبر کردوکان سے نکل آئی اور سونیا کی تلاش میں گردن گھم طرف دیکھنے لگی۔ ایک جگہ وہ پرس خریدتی نظر آئی تو وہ تیز قدموں سے اس کے پاس پہنچ کر بولی۔

”مجھے کہاں چھوڑ دیا آپ نے؟“

”میں نے کہاں چھوڑا۔ تم ہی غائب ہو گئیں۔ یہ پرس دیکھو، اچھا ہے نا۔“ سونیا کا دھیان تھا۔

”جی اور کیا خریدتا ہے۔“ وہ جیسے اب یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

”بس اور کچھ نہیں۔ سونیا نے پرس کی قیمت ادا کی پھر اسے دیکھ کر بولی۔ ”تم شاید تھک گئی ہو؟“

”نہیں بس اب چلیں۔“ اس نے منع کیا لیکن سونیا نے جیسے سنا ہی نہیں زبردستی اسے آٹس کر رکشہ میں لے کر آئی تھی۔

گھر آتے ہی اس نے سب سے پہلے علی جمائیکر کا دیا ہوا کارڈ الماری میں اپنے کپڑوں کی تولی اس کے بعد اپنی جج شدہ رقم نکال کر گنتی توکل چار سو تھے۔ وہ واقعی پریشان ہو گئی کہ پائی آٹھ سو کہ

آسیہ یا نبیل سے لینے کا مطلب تھا انہیں ساری بات بتانی پڑی اور جانے کیوں وہ اس شخص کے بار ہوئے ڈر رہی تھی۔ شاید اس کے اندر خوف تھا کہ کہیں اس واقعے کے ساتھ وہ پہلا واقعہ بھی ما

جب وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تھی۔ گو کہ اس کے دل میں کوئی جو نہیں تھا لیکن کچھ ملامت اتنی سخت کہہ سکتی کہ مجبوری بھی تسلیم نہیں کرتی تھی (یہ اس کا فطری رد عمل تھا) اس لیے اس پہلے

اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کلینک کیسے پہنچی۔ بہر حال اب یہ نئی مصیبت گلے بڑھ گئی تھی۔ کیا چاہا کہ وہ کون سا پیسے لینے یہاں تک آجائے گا لیکن ہمارا اسے وہ اپنے دروازے پر دستک دیتا محسوس

کمری شام سیاہ آچکل اوڑھ رہی تھی اور اسے اپنی پریشانی میں لاسٹ جلانے کا خیال ہی اندھیرے میں کچھ بھی تھی۔ جب نبیل نے دروازے میں آکر پکارا۔

”صبا!“

”جی!“ وہ چونکنے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں! لاسٹ کیوں نہیں جلائی۔“ انہوں نے کہا اور برہہ کر ٹوب لاسٹ کاٹن آن کر دیا تو اس آنکھوں پر رکھ لیے۔

”وہ۔“ نبیل بھائی! سر میں درد ہو رہا تھا۔“

”تو مجھ سے کہا ہوتا یا بوا سے“ وہ چائے پی بنا دیتیں۔ مدحو کہاں ہے؟“ انہوں نے قریب آکر

ماں رہتی ہیں۔“ آخر میں ان کے سوال پر وہ گڑبڑا گئی۔

”جی۔“ وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہوئی تو مدحیہ نے ایک دم خیال آنے پر پوچھا۔

”سنو تم نے بھی کچھ خریداری کی؟“

”ہاں، نیبل بھائی نے پیسے دیئے تھے میں نے دو سوٹ لے لیے۔ ایک تمہارا، ایک اپنا، کھانا تمہارے بیڈ پر رکھے ہیں۔“ وہ ٹیبلر کربول رہی تھی لیکن انداز سے تجلّت عیاں تھی۔

”تم کہاں بیچے جا رہی ہو؟“

”نہیں۔“ اس بار وہ انحصار سے کام لے کر فوراً وہاں سے نکلی اور اپنے کمرے میں آکر مٹھ فرما رکھنے کی خاطر کتابوں کا شصت صاف کرنے لگی۔

”کچھ دیر بعد مدحیہ آئی اور شارپ میں سے دونوں سوٹ نکال کر پوچھنے لگی۔

”میرا کون سا ہے؟“

”جو تمہیں پسند آئے، وہی لے لو۔“ وہ اپنے کام میں مصروف ہوئی۔

”اور اگر مجھے دونوں پسند آئیں۔“

”دونوں لے لو۔“ اسے اس وقت کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”اوتے ہوئے۔“ اتنی فراخ دل۔“ مدحیہ نے بڑے محفوظ انداز میں نعوں لگا یا تب ہی نیبل نے دروازے پر اصرار کیا۔

”مدحو! چائے بناؤ گی۔“

”میں۔“ جیسے کوئی بہت برا کام کہا گیا ہو۔ ”بوا سے کہہ دیں ناں۔“

”جو اکو ماں جی نے بلایا ہے۔ ویسے بھی میں چائے کے لیے ان سے نہیں کہتا۔ چلو دو منٹ کے کا گھنٹے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہری اس۔“

نیبل قدرے رعب سے کہتے وہیں سے پلٹ گئے۔ تو وہ بیڑا لے گئی۔ جس پر صباحت نے اپنا کام ”فضل کو اس بند کرو“ میں جا رہی ہوں۔“

”چائے بناؤ۔“ مدحیہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

صباحت نے تاسف سے اسے دیکھا پھر سر جھٹک کر کمرے سے نکل کر کچن کا رخ کیا۔ اور منٹوں کر نیبل کے کمرے میں آئی تو وہ اسے دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے انہیں بتا تھا چائے وہی لائے گی۔

”آپ نیبل بھائی! یا تو مدحو سے کام لےنا ہی نہیں کریں یا پھر زبردستی اس سے کروایا کریں کیونکہ؟ کرنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔“ وہ ان کے سامنے نیبل پر کپ رہتی ہوئی بولی۔

”اس نے منع تو نہیں کیا تھا۔ خیر، تم اگر کوئی کام نہیں کر رہیں تو یہاں میرے پاس بیٹھو۔“ نیبل کپ اٹھاتے ہوئے کہا تو ان کے پاس بیٹھنے کے بجائے وہ کارپٹ پر گھٹنے ٹیکتی ہوئی بولی۔

”نیبل بھائی! میں آپ کے پوچھنے سے پہلے ہی بتا دیتی ہوں کہ میں بہت پریشان ہوں۔ مجھ سے اب ہو گیا ہے۔ جسے پورا کرنے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔“

نیبل نے کتنا بھی قیاس کیا، یہ نہیں سوچا تھا جو وہ کہہ رہی تھی۔

”میں سوینا جی کے ساتھ بازار گئی تھی ناں وہاں ڈیکوریٹن بیس دیکھتے ہوئے ایک قیمتی گلدان ہم گر کر ٹوٹ گیا۔ بارہ سو روپے کا تھا اور جو خاتون خرید چکی تھیں انہوں نے مجھ سے اتنی رقم کا مطالبہ میرے پاس ایک پیسہ نہیں تھا اور ابھی بھی صرف چار سو، میں باقی آٹھ سو۔ آپ پلیر ماکو میں بتائے اس نے صرف صنف میں جھوٹ سے کام لیا۔ باقی ساری حقیقت بتا دی تو نیبل کچھ دیر غما

دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔

”تمہیں آتے ہی بتانا چاہیے تھا۔ خواہ مخواہ اپنے آپ پریشان ہوتی رہیں۔ اس طرح مسئلے حل خیر اس وقت تو میرے پاس بھی اتنے پیسے نہیں ہیں۔ کل شام تک انتظام کروں گا۔ کب دینے؟“

میرا مطلب ہے، وہ اسی دوکان پر آئیں گی۔ کل آپ انتظام کر دیں گے تو پرسوں صبح میں ٹوبہ کے ساتھ جا رہے ہوں گی۔“

وہ اس خدشے کے تحت کہ کہیں نیبل ساتھ چلنے کا نہ کہہ دیں نہ صرف ٹوبہ کا نام لے دیا بلکہ ایسا وقت بچا ہوتے تھے۔

پچھلی بات ہے اب تم ریلیکس ہو جاؤ اور جا کر کھانا کھاؤ۔“ انہوں نے کہا تو وہ فوراً ”کھڑی ہو گئی لیکن پھر رک

نا۔

پہلے تو نہیں کہیں گے ناں۔“

بے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

”ایک پوچھتیکو نیو نیبل بھائی!“ وہ واقعی بہت ہلکی پھلکی ہو کر ان کے کمرے سے نکلی تھی کہ مدحیہ کی بے چارہ آواز سارے میں گونج گئی۔

باجلدی آکر دیکھو، شاہ سکندر حیات ہیاتھ منٹر کا حلف اٹھا رہے ہیں۔“

حیات نے بے اختیار ڈرائنگ روم کی طرف قدم بڑھایا تھا لیکن دو سرا قدم اٹھنے سے پہلے ہی آسیہ کی سخت لٹ تھی۔

روکنا۔

حیات نہ صرف رک گئی بلکہ سسم بھی گئی تھی۔

”میں اپنے کمرے میں جاؤ۔“ آسیہ اس کے قریب سے گزر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی تو اس نے بے حد ہو کر اپنے پیچھے دیکھا۔

”میں بھی بھینٹا“ مدحیہ کی آواز پر نکلے تھے اور آسیہ کے توروں سے وہ بھی پریشان کھڑے تھے۔

نیبل بھائی! ”صباحت کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔“ مدحو کو دیکھیں۔“

”میں نے ہنٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تب ہی آسیہ کی آواز آئی۔ وہ مدحیہ پر خفا ہو رہی

ہو کر بولی۔ شاہ سکندر حیات ہیاتھ منٹر کا حلف اٹھائے یا رائم منٹری کا، تمہارا کیا تعلق۔“

”میں نے میرا باپ ہے۔“ پہلی بار خائف ہونے کے بجائے مدحیہ غالباً ”اپنے باپ کی حیثیت کے زعم کے مقابل کھڑی ہو گئی تھی۔“ ”بھی آپ نے ہمیں ان کے بارے میں نہیں بتایا جس سے میں یہ سمجھتی ہو کہ کوئی آوارہ اوباش شخص ہو گا لیکن وہ تو شاہ پور کے رئیس ہیں اور اب منٹر بھی میں ان کے بارے میں

بتا سکتی ہوں اور بتاؤں گی کہ میں منٹر شاہ سکندر حیات کی بیٹی ہوں۔“

”نشا اب آسیہ کی آواز کے ساتھ پھنٹر کی گونج پر صباحت نے دہل کر نیبل کو دیکھا اور ان کا رکنے کا اشارہ اڑ کر بھاگ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی۔

”میں ملیر، آپ مدحو کو معاف کر دیں۔“ صباحت عقب سے آسیہ کو دونوں بازوؤں کے حلقے میں لے کر

نرواس سے۔ آئندہ اس کی زبان پر شاہ سکندر کا نام آیا تو۔“ آسیہ نے ایک جھٹکے سے اپنا آپ چھڑا کر

یہ نہیں آئے گا مگر ابھی نہیں آئے گا۔ میں سمجھا دوں گی اسے۔ آپ پلیر ریلیکس ہو جائیں۔“

نشا نے اس بے اختیار جھٹک رہے تھے اور وہ بے حد سہمی ہوئی ہاتھ جوڑ کر کہہ رہی تھی۔

آسیہ بس اس کا خیال کر کے شعلہ بار نظروں سے مدحہ کو گھورتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تو اس نے آسمان
آنکھوں سے مدحہ کو دیکھا جو آسیہ کے مقبض سے خاموش تو ہو گئی تھی لیکن اس کے ہر انداز سے غفلت نہ
رہی تھی۔

”اب تم میرے سامنے گر لڑاؤ گی کہ میں اپنے باپ کا نام نہ لوں۔ کیوں نہ لوں بتاؤ۔“ اس کے کھمبے
پہلے ہی مدحہ اس پر چڑھ دوڑی۔ ”اگر ماما کو اتنا ہی ناگوار گزرتا ہے تو اپنے کان بند کر لیا کریں ماما
اختیار یوں بر بند نہیں باندھوں گی۔“
”ایسا نہیں کہو مدحہ خدا کے لیے۔ تم اس شخص کے لیے ماما کو دکھ دے رہی ہو جس نے کبھی ماما کی
لی۔“ صاحت نے عاجزی سے کہا۔

”یہ میں اسی شخص سے پوچھوں گی کہ اس نے ہماری خبر کیوں نہیں لی۔“
مدحہ پھر چپختی ہوئی کمرے سے نکل گئی تو اس کے آنسو اور روانی سے بننے لگے مدحہ کے پیچھے جا رہی
ہی نہیں ہوئی۔ وہیں گھنٹوں میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔ ”وہ شروع ہی سے کچھ بزدل سی تھی۔ ذرا کوئی لگتی
بات کرنا ڈر جاتی جب ہی اپنی طرف سے سب کے درمیان صلح کے جھنڈے گاڑی رہتی تھی اور اب وہ
بے بس محسوس کر کے رو رہی تھی۔

”صبا!“ نیل نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر یار اتو وہ اور شدت سے رونے لگی تھی۔
”بیوقوف!“ تم کیوں رو رہی ہو؟“ نیل اس کی اس بیٹھ گئی۔
”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے نیل بھائی۔ مدحہ کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ اس طرح کیوں کرنے لگی ہے۔“ ماما
کے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی ہوئی بولی۔ ”اسے کسی کی پروا نہیں ہے۔ ماما کبھی نہیں۔“
”ہو جائے گی سب کی پروا ہو جائے گی۔ ابھی نا سمجھ ہے۔“ نیل نے بظاہر سرسری انداز سے کہا
حقیقتاً اس صورت حال سے وہ بھی پریشان تھے۔

”نہیں وہ نا سمجھ نہیں ہے۔ میں نے اس روز بھی آپ سے کہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرے گا
کو پریشان کرتی ہے۔ اب یہی دیکھ لیں اس نے اگر شاہ سکندر کو دیکھ لیا تھا تو اسے چلانے کی کیا ضرورت
خاموشی سے بھی تو مجھے بتا سکتی تھی۔ محض ماما کو جاننے کے لیے اس نے اتنا شور مچایا اور ماما کے ٹوٹنے
نہیں آئی۔“

وہ مسلسل آنسو پونچھتی ہوئی دکھ سے بول رہی تھی۔ ”اس روز آپ نے شاہ سکندر کی تصویر یہ کہہ کر
دکھانے سے منع کیا تھا ان کی وہ اس شخص کو سارے شرمیں ڈھونڈتی پھرے گی کیونکہ اس میں عجیب سی مذ
پھر آپ اسے نا سمجھ بھی کہہ دیتے ہیں۔ کیوں۔“
”کیونکہ ایسی باتیں نا سمجھی ہی میں ہوتی ہیں وہ اگر سمجھ دار ہوتی تو تمہاری طرح سوچتی۔“ نیل اس کا
ذرا سا سکرا لے۔

”آپ کو کیا تمہیں کہا سوچتی ہوں۔“ وہ روٹنے لہجے میں بولی۔
”میں نے تمہیں پالنے میں کھلایا ہے سچی۔ چلو اب رونا بند کرو۔ تمہارے آنسو مجھے بہت تکلیف
ہیں اور دیکھو اس وقت مدحہ کو بالکل نہیں چھینڑنا۔ اٹھو شاباش۔“ نیل نے اٹھتے ہوئے اسے بھی اپنے
گایا تھا۔

”وہ نیل بھائی ماما! نہیں مدحہ کی باتوں سے دکھ ہوا ہو گا۔“ اسے اب آسیہ کی فکر ستانے لگی۔
”ضرور ہوا ہو گا اور تمہیں اس وقت ان کے پاس بھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیدھی اپنے کمر
جاؤ اور چپ چاپ سو جاؤ۔“ نیل نے سمجھانے کے انداز میں ملکی سی تنبیہ کی تھی۔
سترہ سال پہلے اپنی بچیوں کی خاطر اس نے شاہ سکندر حیات کی انا کو تسکین پہنچانے کی خاطر اس کے
انا خود داری اور اپنی ہستی کا نور مٹا کر اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے نکل جا

حکمت عملی کے بعد وہ یوں مطمئن ہو گئی تھی کہ اس کے اندر کوئی خدشہ رہا ہی نہیں تھا اگر کبھی
بچے خیال آیا بھی تو اس نے یقین سے سوچا تھا کہ جب بچیاں ہی اسے قبول نہیں کریں گی تو وہ اپنا حق کیسے

بچے مان بھی نہیں کہ تھا کہ کوئی موڑا یا بھی آئے گا جب اس کی ساری تیاریاں یوں دھری رہ جائے گی کہ
بچے مان سے مقابلہ آن لکھ دی ہوں گی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ بے خبر تھی۔ وہ نونوں بیٹیوں کے مزاج اور عادات کو
خاموشی سے سمجھتی تھی۔ شروع ہی میں اس نے مدحہ کے اندر اس کے باپ جیسی ”میں“ کو محسوس کر لیا تھا
نہیں خائف نہیں ہوئی تھی کیونکہ اسے اپنی تربیت پر بھروسہ تھا۔ پھر شاید فطری طور اسے یہ خیال بھی
نہیں جسے بری ہوں گی انہیں صرف اس کا احساس ہو گا کہ ان کی ماں نے تنہا ان کی یوں پرورش کی
بچے مان کی نہیں ہونے دی اور ایسے میں بھی انہیں باپ کا خیال آیا بھی تو وہ سخت سے سر جھٹکیں گی۔
نہ اس سے کہیں کو تباہی ہوئی بھی یا خون نے جوش مارا تھا جو سترہ سال پہلے اس نے جس بچی کو شاہ سکندر
سے بیکے کے لیے چھپانے کی خاطر اس کے کس تک سے محروم رکھا تھا وہی اس کی طرف لپک رہی تھی۔
میں سے ماما وہ میرا باپ ہے۔“ مدحہ کی آواز مسلسل اس کی سماعتوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ ”میں
کیا جانتی ہوں اور بتاؤں گی کہ میں مہر شاہ سکندر حیات کی بیٹی ہوں۔“

یہ بات سن کر وہ اپنے زمنوں پر جی کھینچ کر خوابے ناخنوں سے نوپنے لگی تھی اور وہ ساری رات اس کی خود
نہیں میں گزرتی۔

بچے مان کے پر کیف لمحات۔
نیل کی ہستی میں ہر روز اس کے نام کا اک پھول کھلاتا۔

میری بچیوں کا پر فریب جال۔
میری شگت میں ستاروں کی کمکشاول میں قدم رکھنے لگی تھی۔

نہا چاک جیسے اس کی آنکھ کھل گئی تھی یا اس کی روح میں شترچھو کر اٹھایا گیا تھا۔
مہر شاہ حیات نے تمہیں اپنی رھیل بنایا ہے تو اس کا معاوضہ بھی دیا ہو گا۔“

اس کی روح پر گھبراہٹ تھا جسے بیٹیوں کے سامنے بے نقاب کرنے کا خیال ہی جان لیوا تھا اور اسے لگ رہا تھا
کھلے اس کے باپ کا خیال نکالنے کے لیے اسے یونہی جاں سے گزرتا ہو گا۔

میں یہ بھی کر گزروں گی اس نے بہت بڑھال ہو کر تکیے پر سر رکھا تھا اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔
”میں نے اس کے مطابق پوچھا تھا نیل پر لگا کر سب سے پہلے آسیہ کو مطلع کرنے اس کے کمرے میں آئیں اور
میں اسے سوتے دیکھ کر پہلے کچھ حیران ہو کر اسے پکارا پھر تشویش سے۔ اور کوئی جواب نہ ملنے پر آگے
اس کا زور پڑا ہاتھ رکھا تو وہ گرم آگ ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ پڑی جاکر نیل کو بلا لائیں۔

”نیل نے آسیہ کا چہرہ دیکھا تو اس نے اسے پکارا پھر تشویش سے۔ اور کوئی جواب نہ ملنے پر آگے
اس کا زور پڑا ہاتھ رکھا تو وہ گرم آگ ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ پڑی جاکر نیل کو بلا لائیں۔

”نیل نے آسیہ کا چہرہ دیکھا تو اس نے اسے پکارا پھر تشویش سے۔ اور کوئی جواب نہ ملنے پر آگے
اس کا زور پڑا ہاتھ رکھا تو وہ گرم آگ ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ پڑی جاکر نیل کو بلا لائیں۔

”نیل نے آسیہ کا چہرہ دیکھا تو اس نے اسے پکارا پھر تشویش سے۔ اور کوئی جواب نہ ملنے پر آگے
اس کا زور پڑا ہاتھ رکھا تو وہ گرم آگ ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ پڑی جاکر نیل کو بلا لائیں۔

”نیل نے آسیہ کا چہرہ دیکھا تو اس نے اسے پکارا پھر تشویش سے۔ اور کوئی جواب نہ ملنے پر آگے
اس کا زور پڑا ہاتھ رکھا تو وہ گرم آگ ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ پڑی جاکر نیل کو بلا لائیں۔

”نیل نے آسیہ کا چہرہ دیکھا تو اس نے اسے پکارا پھر تشویش سے۔ اور کوئی جواب نہ ملنے پر آگے
اس کا زور پڑا ہاتھ رکھا تو وہ گرم آگ ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ پڑی جاکر نیل کو بلا لائیں۔

”نیل نے آسیہ کا چہرہ دیکھا تو اس نے اسے پکارا پھر تشویش سے۔ اور کوئی جواب نہ ملنے پر آگے
اس کا زور پڑا ہاتھ رکھا تو وہ گرم آگ ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ پڑی جاکر نیل کو بلا لائیں۔

میں رک کر پہلے یا سمین کو فون کیا پھر آسیہ کے کمرے میں آئی تھی۔

تقریباً "میں منٹ بعد یا سمین آئی تو اس کے ساتھ میونہ بھا بھی اور اباجی بھی اوپر آگئے تھے۔ رات جب کلینک سے آئی اس وقت تو ٹھیک ٹھاک تھی پھر ایک دم سے اٹنا بخار کیسے ہو گیا۔ نظروں سے نیل کو دیکھنے لگے۔

"چائیں اباجی! میں نے تو خود ابھی دیکھا ہے۔" نیل نظرس چرا گئے۔

"بہت تیز بخار ہے۔ صابینا! جلدی سے برف کا پانی اور کپڑے لے کر آؤ اور یہ میڈسن نیل دے باکس میں ہوں تو رو نہ فوراً "منکو آؤ۔" یا سمین پرچہ نیل کو تھما کر انجکشن تیار کرنے لگی۔ پھر جہاں بازو میں گئی وہ کراہ کر بڑبڑانے لگی۔

"مدحو کو رو کو اسے مت جانے دو۔"

"کہاں ہے مدحو؟" میونہ بھا بھی نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد نیل سے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں چچی یہ میڈسن تو نہیں ہیں۔ میں لے کر آتا ہوں۔"

نیل اگلے کسی سوال سے بچنے کی خاطر میڈسن کے بہانے فوراً "چل پڑے۔ پھر اچانک کی دنیا مدحہ کے کمرے میں جھانک کر بولے۔

"مدحہ! چلو پھو پھو کپاس جا کر بیٹھو اور انہیں یقین دلاؤ کہ تم کہیں نہیں جا رہی۔"

مدحہ کچھ کچھ بھی نہیں اور نہ ہی سمجھنے کے لیے کوئی سوال اٹھایا چپ چاپ ان کے قریب سے گزر کرے میں داخل ہو گئی تھی۔

دوپہر تک آسیہ بے ہوشی کے عالم میں جانے کیا کیا بولتی رہی تھی جو صرف وہ تینوں ہی سمجھ رہے سب سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے۔ کبھی صحبت کو دیکھتے تو آسیہ کے سرانے کے پاس سے ہٹتی اور کبھی مدحہ کو جو مسلسل آسیہ کے پیروانے میں لگی ہوئی تھی اور کسی کسی وقت سب کی نظر بھاگرا سے پھیلنے لگتی تھی۔

پھر دوپہر میں کچھ بخار کا زور ٹوٹا تو یا سمین نے خصوصاً "اماں جی اور اباجی کو اطمینان دلا کر نیچے بھلا صحبت کو زبردستی وہاں سے اٹھا کر اپنے ساتھ کھانا کھلایا پھر انہیں تسلی دیتی ہوئی بولی۔

"اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ شام تک آسیہ سکون سے سوئے گی۔ تمہاری اس کے پاس مہ نہیں ہے۔ اسے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ شام میں دیکھنا وہ بالکل ٹھیک ہوگی اور یہ تم دونوں کو اٹھا کیا اس سے پہلے اس گھر میں کبھی کوئی بیمار نہیں ہوا۔ بیٹا! جہاں تندرستی ہے وہاں بیماری بھی نہ کمرے میں جاؤ۔ آسیہ کے پاس میں ہوں۔"

"آپ بھی تو ٹھیک گئی ہوں گی ماما جی۔ آپ آرام کریں۔" صحبت نے یا سمین کا احساس کر کے گال تھک کر بولی۔

"میں آسیہ کے پاس آرام ہی کروں گی، چلو جاؤ شاباش۔" یا سمین دونوں کو ان کے کمرے میں بٹھ کرے میں لگتی تھی۔



شام میں آسیہ کا بخار تقریباً "اتر چکا تھا۔ لیکن جس ذہنی اذیت سے وہ گزری تھی اس کے اثرات اٹھ کر بیٹھ توئی لیکن بہت کم قسم تھی۔ یا سمین نے زبردستی اسے دلیہ کھلایا اور اس کے اندر مٹا اس کے ساتھ مسلسل اس کی دلجوئی بھی کر رہی تھی پھر میونہ بھا بھی بھی آگئیں لیکن ان کی گفت بات نہیں بہلا پارہی تھیں۔

جب عدیل یا سمین کو لینے آئے تو وہ اباجی اور خلیل بھائی کو ساتھ لے کر آسیہ کے کمرے میں جنہیں ایک ساتھ دیکھتے ہی اس کا ذہن پھر کہیں پیچھے جھٹک گیا تھا۔

دنت جب ان سب نے آکر اس سے پوچھا تھا کہ کیا تم شاہ سکندر کے نام کے ساتھ گالی بن کر رہ سکتی ہو۔ عدیل نے جہاں سے؟ عدیل نے پوچھا تو اس نے چونک کر انہیں دیکھا پھر ذرا سا اثبات میں سر ہلایا۔ جی ہاں ایسا! بیٹھیں۔" میونہ بھا بھی نے کھڑے ہو کر اپنی جگہ پر اباجی کو بٹھایا اور خلیل کے لیے کرسی کے قریب کی۔ عدیل خود ہی یا سمین کے پاس بیٹھ گئے تھے۔

نیل نے کھینچے ہوئے دیکھا پھر سر جھکا لیا تھا۔ جس پر اباجی بغیر کسی تمہید کے کہنے لگے۔

نیل سمجھتا بیٹا! کہ اب تمہیں کسی بات سے خائف ہونے کی ضرورت ہے۔ تمہاری بچیاں ماشاء اللہ بچھو دار ہو گئی ہیں پھر تمہیں کس بات کی فکر ہے؟

نیل آنکھوں میں یکبارگی پانی جمع ہو کر قطرہ قطرہ پلوں سے ٹوٹ کر اس کے اپنے ہاتھوں پر گرنے لگا۔

اباجی! میں نے غلط تو نہیں کہا۔ یہ شاہ سکندر کی منشری سے خوفزدہ ہو گئی ہے۔ عدیل نے اسے روتے انہی بات کی تصدیق ہونے پر فوراً "اباجی سے کہا۔

نیل اور میونہ بھا بھی نے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھوں آنکھوں میں یوں اشارا کیا جیسے کیا معاملہ ہے۔

ی وہیں پوچھ رہا ہوں کہ اسے خوفزدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" اباجی نے زور دے کر کہا تو وہ بھیلیوں نہ صاف کرنے کے بعد کہنے لگی۔

یہ شاہ سکندر یا اس کی منشری سے خوفزدہ نہیں ہوں بلکہ اس کے سامنے آنے سے پریشان ہو گئی ہوں جیسے لڑکی پر دیکھ کر مدحو اور جہاں سے خوشی سے بے قابو ہو کر ایک دوسرے کو بتایا تھا کہ وہ ان کا باپ ہے۔ اس نے کس غفلت کے تحت مدحہ کے ساتھ صحبت کو بھی شامل کر لیا۔

نیل کہے پتا چلا کہ وہ ان کا باپ ہے۔ کیا اس ساری دنیا میں شاہ سکندر حیات نام کا ایک ہی شخص ہے۔" جہاں نے ناگوار رہی سے کہا تو وہ جزیرہ ہو کر بولی۔

نیل نے غلطی ہوئی جو خود پر قابو نہیں رکھ سکی اور ان دونوں کو ڈانٹ دیا۔ اگر ہوش میں رہ کر بات کرتی تو آرام ملا سکتی تھی کہ وہ ان کا باپ نہیں ہے اور میرے ڈانٹنے سے اپنے آپ تصدیق ہو گئی۔ اب بتائیے میں کیا باب تک میں بھی آپ کی طرح سوچتی رہی ہوں کہ میری بیٹیاں بڑی اور سمجھ دار ہو گئی ہیں۔ مجھے اب کوئی بات رات سارا اطمینان چھین لیا ان دونوں نے۔"

نیل کہہ رہی تھیں۔" میونہ بھا بھی نے پوچھا۔

نیل نے نہیں لیکن تجسس ضرور ہو گئی ہیں اور اب جب ہر روز اس کے بارے میں ٹی وی پر یا اخبار میں کوئی خبر ملے گی تو ان کے اندر مزید جاننے کی خواہش ہوگی۔" اس نے کہا تو عدیل پر سوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے

یہ تو ظنی کی بات ہے۔"

ان بات نے مجھے پریشان کیا ہے۔ میں شاہ سکندر تو کیا اس کے پورے خاندان سے لا سکتی ہوں لیکن بیٹیوں کو اس کی منشری جذبہ کو نکال پھینکنا مجھے اپنے اختیار میں نہیں لگ رہا۔ کتنی سختی کروں۔"

نیل نے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" اباجی ٹوک کر کہنے لگے۔ اس طرح تو ان کے اندر ضد بھی سما جائے۔ یہ تو یہ ہو گا کہ تم انہیں ان کے باپ کی اصلیت بتا دو۔"

نیل دلیہ بھی اب وہ سمجھ دار ہو گئی ہیں۔ انہیں اصلیت معلوم ہونی چاہیے۔ ورنہ باپ کی ظاہری شان و شوکت ہو کر کہیں ایسا نہ ہو وہ تمہیں قصور وار سمجھنے لگیں۔" خلیل بھائی نے اباجی کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ انہیں ان کے باپ کی اصلیت بتا دو۔"

نیل نے بھی کہیں ان کے بارے میں نہیں بتایا جس سے میں یہ سمجھتی رہی کہ وہ کوئی آوارہ اوپاش شخص ہو گا۔ وہ تو بڑے گھر میں ہیں اور اب منشر بھی۔"

نیل نے کہیں۔ اگر تم نہیں بتا سکتیں تو میونہ بھا بھی بتا دیں گی۔" عدیل نے اسے متوجہ کر کے کہا تو وہ گہری

سانس سینے کے اندر روک کر نہی بھی۔ ”نہیں میں بتا دوں گی۔“



علی جمالیگر، بابا جان اور شاہ سکندر حیات کو رخصت کر کے عازم کے ساتھ واپس اندر آیا تو بڑا بھاگ کر اس نے ریسیور اٹھایا تھا لیکن پھر بہت عجلت میں بات کر کے بے دلی سے ریسیور بجاتو عازم پر گراتا ہوا کہنے لگا۔

”یار! میں دو دن سے دیکھ رہا ہوں۔ تم ہریٹل پر بھاگ کر ریسیور اٹھاتے ہو پھر مایوس ہو کر کٹہرے مطلب ہے، تمہیں کسی خاص فون کا انتظار ہے۔ ایم آئی رائٹ؟“

”رائٹ۔“ اسے جیسے اب کسی ساتھی کی ضرورت تھی تب ہی ہتھیار ڈال دیے۔

”کہیں وہی تو نہیں۔“ عازم فوراً سیدھا ہوا بیٹھا۔

”وہی ہے۔“ وہ اعتراف کر کے مسکرایا تو عازم یکدم انجان بن گیا۔

”وہی کون، میرا مطلب ہے اس کا پورا یا سوڈا پتاؤ۔“

”بائوڈا نامعلوم ہوتا تو میں یوں انتظار میں بیٹھا ہوتا خود نہ رنگ کرتا۔“ وہ اپنی بے بسی پر گراؤ

”چہ چہ۔ تمہیں معلوم نہیں ہے اور اسے معلوم ہے“ عازم نے افسوس کے ساتھ اس کا ہاتھ

سلگ کر بولا۔

”اے ابھی معلوم نہیں ہے۔ بس صرف میرا کارڈ ہے اس کے پاس جو پرسوں اتفاقاً“ سر رولہا تو

اسے ہتھ مارا تھا۔

”اور یہ اتفاقاً“ سر رولہا کون سی ملاقات تھی۔“ عازم نے نظا ہر سنجیدگی سے پوچھا۔

”دوسری۔ کیوں؟“ وہ بتا کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تو عازم کندھے اچکا کر بولا۔

”یونی اپنی معلومات میں اضافے کے لیے پوچھ لیا۔ کوئی گناہ کیا۔“

”جبکہ موت یہ بتاؤ اس نے فون کیوں نہیں کیا۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”یہ تمہی اس سے تیسری سر رولہا ملاقات میں پوچھنا۔“ عازم اسے مزید چڑا کر زور سے ہنسا اور اس

ہونٹ جھپٹتے ہوئے فوراً ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”مذاق نہیں مذاق کر رہا تھا۔ اب سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔ ہاں تو کیا کہہ رہے تھے تم اس نے فون کیا

کیونکہ تم نے حفاقت کی۔ اپنا کارڈ اسے تھمانے کے بجائے اس کا نمبر وغیرہ لینا چاہیے تھا تمہیں۔“

”چونکہ میں ہی کچھ ایسی تھی۔“ علی جمالیگر نے کہا پھر اپنے آپ اس سے دونوں ملاقاتوں کی پوری

دی۔ جیسے سن کر عازم پر سوچ انداز میں کہنے لگا۔

ابھی تو یہ بھی طے نہیں ہے کہ آیا وہ لڑکی تم سے متاثر ہوئی بھی ہے کہ نہیں اور اگر ہوئی بھی

نہیں کہ فوراً تم سے رابطہ کرے۔ اس کے ساتھ کوئی براہم بھی ہو سکتی ہے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

ہو۔ لہذا صبر سے انتظار کرو۔ اگر وہ مقررہ دن آگئی تو یہ ساری باتیں اسی سے پوچھ لیتا۔“

”صبر سے انتظار کروں پانچ دن۔“ علی جمالیگر نے یوں کہا جیسے پانچ صدیاں۔

”اس چکر میں ایسا ہی ہوتا ہے بھائی۔ ویسے میری بات تو اس چکر کو میں ختم کر دو۔ ایسا نہ ہو سکتا

تمہیں بھی کوئی روک لگ جائے۔“ یہ عازم نے کہا تو اس نے بے نیازی سے جھکا۔

”میں چاہا چاہا میں کی طرح بزدل نہیں ہوں۔“

”بزدل تو جرح چاہا چاہا میں بھی نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ یقیناً“ بابا جان نے سیاست چلی ہوگی۔

ہیں بابا جان اور اب دیکھنا سکندر چاہا سے کسی سیاست کروائیں گے۔ ان کا تو بس نام ہو گا سار

جان کے چلیں گے۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں ان کے ہاتھوں کچھ پتلی نہیں بنوں گا۔ مجھے اپنی زندگی جینا۔“

بت پہلے طے کر لیا تھا۔ اس لیے اب اکی خواہش اور اصرار کے باوجود میں ان کے ساتھ زمینداری کے کاموں میں

نہیں لگتا۔ مجھے سمات اڑیکٹ ضرور کرتے ہیں لیکن میں مستقل وہاں رہ نہیں سکتا گو کہ شاہ پور میں کم و بیش تمام

میں سولیات موجود ہیں پھر بھی وہ شہر نہیں لگتا اس لیے کہ وہاں بسنے والے اپنی سوچ نہیں بدلتے۔ اپنے ہاں کی

بیتوں کو دیکھو۔ ہمارے ساتھ کانوینٹ میں بڑھی ہیں۔ پھر یہاں سے اچھے کا بجز سے گریجویشن کیا لیکن ان کی

بیوی جاکر دارائیوں جیسی ہے۔ اپنے سے کمتر کو انسان ہی نہیں سمجھتیں۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس سے انہیں

بیوقوف نہیں۔ بس ان کے پاس سب کچھ ہے وہ خوش ہیں مکن ہیں۔“

وہ اپنے ماحول پر بہت تاسف کا اظہار کر رہا تھا۔

”تو اور کیا کریں۔“ عازم اس کی طویل گفتگو سے اکتا کر بولا۔

”کرنا چاہیں تو بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ لیکن کچھ کرنے کو وہ اپنی توہین سمجھتی ہیں۔ جبکہ میں زندگی کو متحرک دیکھنا

چاہتا ہوں۔ میرا اپنا ایک آئیڈیل ہے۔ صبح جب میں اٹھوں تو آفس جاتے تک میرے ہر کام میں میرے ساتھ

ہوتی ہوئی ہو اور شام میں گھر آنے پر بھی اپنے استقبال میں اسے ہی دیکھنا چاہتا ہوں نہ کہ ملازم بھاگ کر میرا

ہیٹ میں قہارے پھر میرے کپڑے نکالے اور وہ ٹیڈی ریوٹ سے اسے چلائی رہے۔ نہیں۔“

اس کی آنکھوں میں اپنی آئیڈیل زندگی کا عکس جھلما رہا تھا۔

”یہ ساری باتیں پہلے سے اسے بتا دیتا۔“ عازم پھر شونجی سے باز نہیں آیا۔

”کے؟“ اس نے اپنے خیال سے چونک کر پوچھا۔

”ہی گلداں والی کو، پیسے یا رقم نے اس سے پیسے مانگ کر اچھا نہیں کیا۔ کہہ دیتے، ٹوٹنے والی چیز تھی ٹوٹ گئی

ہے وہ نہ متاثر ہونے والی بھی متاثر ہو جاتی۔“

تو میں کون سا اس سے پیسے لے لوں گا۔ مجھے اگلی ملاقات کا بہانا چاہیے تھا اور فوری طور پر یہی ذہن میں آیا کہ

طرح کو دیکھ کر آئے گی تو اس سے بہت ساری باتیں کر لوں گا۔“ اس نے گما۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گی۔“ عازم نے پوچھا تو وہ پر یقین انداز میں اثبات میں سر ہلاتا ہوا اٹھ کھڑا

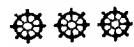
”ضرور آئے گی اور اب میں سونے جا رہا ہوں کیونکہ صبح ڈیوٹی جوائن کرنی ہے۔“

”لوں! اب اس ڈی ایم صاحب کو پہلے ہی دن لیٹ نہیں ہونا چاہیے اور سنو، تم تو پھر شام میں ہی آؤ گے اور میں

رنگ نکل جاؤں گا۔ کوئی کام ہو تو ابھی بتا دو، میرا مطلب ہے شاہ پور میں کسی کے لیے کوئی پیغام وغیرہ۔“ آخر

عازم کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ چلی تھی جس سے وہ سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ اس کی طرف ہے اور اس

سے ہی اس کی پیشانی پر ناگوار کی لکیں برسمٹ آئی تھیں۔



کئی کے لیے کوئی پیغام نہیں ہے۔ ناؤ گڈ نائٹ۔“ وہ فوراً اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔

اس کا ہاتھ ملامتو خراب ہو گیا تھا۔ اس لیے صبح عازم کے اٹھنے سے پہلے ہی آفس روانہ ہو گیا۔ اور شام میں

بائیں خیال سے خوش تھا کہ عازم چاکا ہو گا اور وہ تو واقعی چاکا تھا۔ لیکن اس کے لیے جو لطف چھوڑ گیا تھا اس

میں بجز اسے دھجکا کا تھا۔

”تو تو تمہارا انتظار ختم ہوا۔ سر رولہا ملاقات والی نے جانے کس کے ہاتھ یہ بارہ سو روپے بھجوائے ہیں۔

بائیں شاد سے شغل فرما رہا تھا ورنہ آنے والے سے یہ ضرور پوچھتا کہ بھائی تم کون ہو۔ اس کے کیا لگتے ہو

بائیں آئے ہو، ہر حال وہ جو کوئی بھی تھا کرم دین کو یہ لطف تھا کہ چلا گیا۔“ کن لو پورے بارہ سو روپے۔“

”اگن۔“ اس نے لطف نیل پر پیچیدہ کر کر مہین کو پکارا تھا۔

میرزا بیچو جاری ہوں، کیونکہ مجھے ابھی غنیمت نہیں آ رہی۔“
 نہیں آ رہی بیچو انوں کو تو آ رہی ہوگی۔ ان کی غنیمت کیوں خراب کرتی ہو۔“ صباحت نے ٹوکا لیکن وہ ان
 کو روکنا نہیں چاہتا تھا۔ صباحت نے سرجھکا اور اپنے کمرے کے دروازے تک آئی تھی کہ نیل کی اسٹک کی
 پٹ کر دیکھا۔

”اب میں چائے کا پلے آرہے تھے۔
 چائے چائے آپ نے خود بنائی ہے؟“ اس نے حیرت سے کہا تو نیل ذرا سا مسکرائے۔
 ”کوئی ایسا مشکل کام تو نہیں ہے۔“
 ”تو کچھ سے کہنا چاہئے تھا۔“ وہ ان کے ساتھ چلتی ہوئی ان کے کمرے میں آگئی۔
 ”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔“

”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔“

”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔“

”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔“

”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔
 ”نیل نے اس کی بات ان کی کر کے پوچھا۔“

مدیہ اور صباحت سر جھکائے بیٹھی تھیں۔
 ”آسیہ نے اپنی زندگی کا وہ باب جو میل کر دیا تھا، اسے احتیاط سے کھول کر ان کے سامنے حرف بہ حرف
 تھا۔ اس کے بعد بغور ان کے چہروں کو دیکھ رہی تھیں۔“

صباحت کے چہرے پر دکھ کا تاثر بہت واضح تھا۔ اور مدیہ کے چہرے پر محسوس کیا جانے والا تنفر
 کتنی دیر کی خاموشی کے بعد آسہ بھرا اپنے آپ بولنے لگی تھی۔
 ”یہ مت سمجھنا کہ میں نے محض ضد میں تمہیں تمہارے باپ سے دور رکھا۔ بلکہ میں تم دونوں کو میرے
 بے وقعت نہیں ہونے دینا چاہتی۔ تم اس کے سامنے جاؤ اور وہ تمہیں اپنی اولاد ماننے سے انکار کر دے تو
 اپنی نظروں میں تمہاری کیا وقعت رہ جائے گی۔ بس اسی خیال سے میں تمہیں روکتی ہوں۔ اور یہ غلط نہیں
 جب شاہ سکندر کے باپ نے مجھے اس کی بیوی تسلیم نہیں کیا تھا تو تمہیں بھی اپنے خاندان کا نام نہیں دے
 میری بیٹیاں ہو صرف میری۔ میں تمہیں ہر اس راستے پر جانے سے روکوں گی، جہاں شاہ سکندر کی پرچھاؤ
 کا شائبہ ہو گا اور اگر تم نے میری مرضی کے خلاف چلنے کی کوشش کی تو۔“

آسیہ نے ہنسنے لگی تھی لیکن اس کا بھرا ہوا سر دلچسپ انداز میں رگوں میں لہو بخند کر گیا تھا۔
 ”تمہارا رزلٹ کب آ رہا ہے؟“ قدرے توقف سے آسیہ نے موضوع بدل دیا۔
 ”جانتی نہیں! شاید اگلے ہفتے،“ کنفرم نہیں ہے۔“ صباحت کو بولنے میں ساری توانائیاں صرف کرنا
 تھیں۔

”ہوں۔ دو مہینے تم لوگوں نے بیکار وقت ضائع کیا۔ کوئی کورس ہی کر لیتیں۔“ آسیہ کو اب افسوس ہوا کہ
 اسے پہلے کیوں نہیں آیا۔ ”خیر رزلٹ آجائے تو اپنی پردہائی پر توجہ دو۔ گریجویشن کے بعد پھر کپیوٹر
 کر لیتا۔ فخر کی نماز ضرور پڑھا کرو۔ اس کی برکت سے باقی نمازیں بھی وقت پر ادا ہو جاتی ہیں۔“ چلو اب
 دو۔“

”مما! آپ کی طبیعت تو ٹھیک سے ناں۔؟“ صباحت نے اٹھتے ہوئے مدیہ کو کھنی ماری تھی۔
 ”ہاں بہت بہتر ہوں۔ کل سے کلینک جاؤں گی۔“ آسیہ نے کن انہیوں سے مدیہ کو دیکھا جو قدرے
 سی ہو گئی تھی۔ پھر ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

”مما! آپ کی یہ حالت میری وجہ سے ہوئی ہے ناں۔ آئی ایم سوری ممما۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں پھر
 سکندر کا نام نہیں لوں گی۔ میں آپ کی بیٹی ہوں، آپ کے نام کے ساتھ سرائیگا کر چوں گی۔“
 آسیہ نے ان کا سراپے سینے سے لگایا تو اس کے ساتھ صباحت کی پلکیں بھی نم ہو گئی تھیں۔
 ”مما! آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں۔؟“ مدیہ اس کے سینے میں منہ چھپائے پوچھ رہی تھی۔

”نہیں بیٹا! میں کبھی تم سے ناراض نہیں ہو سکتی۔ تم صبا اور نیل میری کل کائنات ہو۔“ آسیہ نے
 ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی چومی پھر ایک بازو پھیرا کہ صباحت کو دیکھا تو وہ بھی اس کی آنکھوں میں ساگی
 ”میری جان، سوئم میری زندگی میرا غرور میرا مان اور تم میرا مان بھی نہیں توڑنا۔“ آسیہ دونوں کو ہانڈ
 بھیج کر بولی پھر ان کے سر جوڑ کر انہیں خود سے غلغلہ کیا تو مدیہ اٹھتی ہوئی بولی۔

”مما! ابھی آپ کچھ دن آرام کریں۔ کلینک جائیں گی تو۔“
 ”بس بیٹا بہت آرام کر لیا۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ آسیہ نے مسکرا کر انہیں اپنی طرف سے اطمینان
 پھر اپنے پیچھے تکیہ سیدھا کرنے لگی تو صباحت احساس کر کے بولی۔
 ”چلو خود اب ممما کو سونے دو۔“

”گڈ نائٹ ممما!“ مدیہ نے زیر و چور کا بلبل جلا کر ٹیوب لائٹ آف کر دی اور صباحت کے پیچھے کمرے
 کر آئی تو آہستہ آواز میں بولی۔

”پتا نہیں لوگ دوسروں کی زندگیوں سے کھیل کر پھر خود اطمینان و سکون سے کیسے رہتے ہیں۔ شاید کبھی خیال بھی نہیں آتا ہو گا کہ ان کی دل لگی سے ایک عورت کس طرح اپنی زندگی کے غبارِ تنہا زری رہی ہوگی۔“

”نظا ہر گز ہنسنگ بھنڈ سم اینڈ ویل ایجو کیٹڈ ہو نہ اپنی شخصیت پر جانے کتنے خول چھوڑ انہوں نے۔ اللہ بھی جانے کیوں ایسے لوگوں کی رسی دراز کیے جاتا ہے۔“ اس کے اندر شاید کچھ خلاف تصرف دھستا جا رہا تھا۔

* ☆ *

”صبا! ہم سب عدیل ماموں کے ہاں جا رہے ہیں۔ چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ مدحہ اندم دم کرے میں داخل ہوئی تھی اور آگے اتنا بھیلوا دیا کہ گرج پڑی۔

”یہ تم کیا کر رہی ہو؟“

”صفائی۔“ وہ الماری میں سے کپڑے نکال کر بیڈ پر پھیلتی ہوئی آرام سے بولی۔

”ایک تو تمہیں بھی جین نہیں ہے۔ زبردستی اپنے کام بڑھا لیتی ہو۔ چلو چھوڑو یہ سب دواہل مدحہ کپڑوں کے دھیر میں سے اپنا ایک سوٹ نکالتی ہوئی بولی۔

”مائے نہیں۔ میں یہ سب اس طرح چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ تم جلدی نہیں کرو، میں الماری برا چلیں گے۔“ وہ بیڈ پر بیٹھ کر کپڑے تہہ کرنے لگی۔

”جناب جتنی دیر میں تمہاری الماری سیٹ ہوگی، ہم عدیل ماموں کو کیا بڑے ماموں کے گھرے گے۔“ مدحہ نے اپنے کپڑوں پر جلدی جلدی استری پھیرتے ہوئے کہا۔

”بڑے ماموں کے گھر بھی جاتا ہے۔“ اس نے اپنی مصروفیت ترک کیے بغیر پوچھا۔

”تم ٹھوگی تب تو؟“ مدحہ استری کا پلگ نکال کر بیڈ پر اٹھاتی دھڑ دھڑ چلی گئی۔ لیکن اس کا ہاتھ اپنے دل آلودہ نہیں ہوا۔ کچھ دیر بعد مدحہ دواش روم سے نکلی تو اسے اطمینان سے بیٹھو دیکھ کر؟

”اس کام طلب ہے، تم نہیں جا رہی؟“

”سوری، تم لوگ اگر پہلے پروگرام بناتے تو میں یہ سب نہ کرتی۔ اب اس طرح چھوڑ کر جانا جا رہا ہے؟“

”مائی جی اور اماں جی کے علاوہ سب میں نے ماما کو فون کر کے بتا دیا ہے۔“ مدحہ بالوں میں لگا بولی۔

”اور آؤ گے کب؟“ اس نے یونہی پوچھ لیا۔

”پتا نہیں۔ جانا اپنے اختیار میں ہو ماما ہے اور آنا دوسرے کے۔“ مدحہ برش پھینک کر اس کے دیکھو میں ٹھیک لگ رہی ہوں؟“

”ایک دم فرسٹ کلاس۔“ وہ اس کے سر پرے پر نظر ڈال کر ہنسی۔ پھر اٹھتی ہوئی بولی۔ ”میرا اور روٹی کو۔“

”ناؤ رہا تو؟“ مدحہ لا پرواہی سے کہتی کمرے سے نکل گئی تو وہ الماری کھول کر اس میں تہہ کے رکھنے لگی۔ پھر جو بیڈ پر گرتی تھی، انہیں استری کے لیے الگ کر رہی تھی کہ جاکیر کا کاڑھا تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر تکیے کے نیچے ڈال کر دوبارہ سے مصروف ہو گئی۔

”تقریباً دو گھنٹے بعد وہ کمرہ ٹھیک ٹھاک کر کے فارغ ہوئی تو پہلے شاور لے کر خود کو تازہ دم کیا پھر کینے لابی میں آئی تھی۔ اتفاق سے اس وقت نیپل بھی موجود نہیں تھے۔ بس ایک بوا تھیں جو تھیں اس لیے بغیر کسی دھڑکے کے اس نے نمبر ڈال لیا۔ یوں بھی اسے زیادہ بات نہیں کرنی تھی کہ اسے اس کے پیسے مل گئے۔

”ممنوعہ بل پر ریسیور اٹھنے کے ساتھ اس کی آواز سنائی دی۔ جسے پہچاننے کے باوجود وہ قصداً ”انجان بن کر بولی۔“

”جی جی، علی جی! بات کرنی ہے۔“

”اب صبحت ہیں ناں۔“ اس نے ہونٹوں سے اپنا نام سن کر جڑبڑو کر بولی۔

”جی جی، علی جی ہوں۔ آپ نے واقعی نہیں پہچانا یا پہچاننا نہیں چاہتیں؟“ وہ شاید شکوہ کر رہا تھا۔

”بس صرف پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ کو آپ کے پیسے مل گئے؟“ وہ اس کی بات نظر انداز کر گئی۔

”آئی جی نہیں تو۔“ علی جی نے اسی قدر کہا تھا کہ وہ فوراً بول پڑی۔

”جی نہیں آئی لیکن میں نے پیسے بھجوا دیے تھے۔“ آپ کو ملے یا نہیں؟“

”ہاں۔“ وہ صاف مگر گیا جس سے وہ خاموش ہو کر سوچ میں پڑ گئی تو چند لمحوں کے توقف سے وہ پکار کر کہنے لگا۔

”بس صبحت تو برا نام۔ آپ نے بھجوا دیے تھے بس ٹھیک ہے۔“

”لیکن آپ کو تو نہیں ملے ناں۔ پتا نہیں اگر بھائی کہاں دے آئے میں نے انہیں آپ کا ایڈریس لکھ کر دیا۔“ آپ نے ملازم سے پوچھیں۔ اگر بھائی ملے نہیں کر سکتے۔“ وہ اپنے آپ میں الجھتی ہوئی روائی میں جانے لگا۔

”میرا ملازم تو اس وقت موجود نہیں ہے۔ آئے گا تو پوچھ لوں گا۔“ علی جی جاکیر نے فوراً آئندہ رابطے کی راہ نکلی۔

”کب آئے گا؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آپ ایسا کریں۔ اپنا نمبر لکھوائیں۔ وہ جب بھی آئے گا۔ میں اس سے پوچھ کر آپ کو جانے گا۔“ علی جی جاکیر کا لہجہ بظاہر سرسری تھا اس کے باوجود وہ کچھ ٹھٹھک گئی۔

”سوری، میرا کوئی نمبر نہیں ہے۔ آئی مین میں پی سی او سے بات کر رہی ہوں۔“

”پھر آپ کو یہ دوبارہ زحمت کرنی پڑے گی۔“ وہ خاصا مایوس ہوا۔

”نہایت ہے، میں کل پھر۔“

”ایک منٹ۔“ وہ ٹوک کر بولا۔ ”فرض کریں۔ میرے ملازم نے بھی پیسے وصول نہیں کیے پھر آپ کیا کریں؟“

”ماما ہے دوبارہ بھجواؤں گی۔“ اس کے اتنے آرام سے کہنے پر وہ چڑ گیا۔

”جی نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”میں ضرورت نہیں ہے۔ کبھی راستے میں آپ نے مجھے روک کر پیسوں کا مطالبہ کر دیا اور اس وقت میرے پاس تو بے تہہ؟“ اس نے نیپل کے کہنے پر اسے فون کیا یا اسی خدشے کے تحت تھا۔

”جی نہیں۔ میں ایسا کوئی مطالبہ نہیں کروں گا۔ اطمینان رکھیں اور بس اتنا بتا دیں کہ آپ کن راستوں پر ملیں گے؟“ اس کے کہنے سے اچانک کسی جذبے کا اظہار ہو گیا تھا۔

”جانتے نے گھبرا کر ریسیور کو دیکھا پھر چند لمحوں کے توقف سے دھیرے دھیرے دوبارہ کان سے لگایا تو وہ کہہ رہا تھا۔

”بس صبحت! میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ سن رہی ہیں ناں؟“

”جی جی، ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی آواز کو دیا تھا۔ پھر ریسیور رکھ کر دل پر ہاتھ رکھا تو وہ یوں خاموش تھا جیسے اب وہ جڑبڑو کر رہی تھی۔

”جی جی، میں نے آپ کو کسی نامعلوم شخص سے میں محسوس کرتی رہی۔ جس سے نکلنے کے لیے میں نے آپ کو بلایا تھا۔“

”جی جی، میں نے آپ کے پاس آئی تھی۔“

”ماما جی، میں سب کے ساتھ۔“ اس نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”ماما جی، میں سب کے ساتھ۔“ اس نے پھولی سانسوں کے درمیان بتایا پھر اماں جی کی گود میں سر رکھ کر

رزٹ کے بعد مدیجہ نے بہت خاموشی سے صباحت کے ساتھ دوبارہ کالج جانا شروع کر دیا۔ یونیورسٹی جانے کے شوق میں آنرز کا شوشہ چھوڑا تھا۔ اس پر قائم رہنے کے لیے اسے اسیر سے آ کر تب بھی کچھ ریش تینی تھی۔ اور اب شاید وہ اسے کچھ دیر کے لیے بھی ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آنرز کا خیال چھوڑ کر سابقہ بیجیکٹ سے ہی سمجھوٹا کر لیا تھا۔ جس سے گھر کی فضا تو نشیدہ ہونے لگی تھی لیکن وہ خوش نہیں تھی۔ کیونکہ یہ بات اس کے مزاج میں ہی نہیں تھی کہ خود پر جبر کر کے جائے۔ اس کے برعکس خلاف مزاج بات پر وہ شروع ہی سے احتجاج کرتی تھی۔ لیکن اب مجبوراً نے ابھی کچھ دن پہلے اپنے زخموں کو بے نقاب کیا تھا جس سے اٹھنے والی میسین وہ محسوس کر رہی تھی۔ میں مزید اپنی طرف سے اضافہ کرنا فی الحال ممکن نہیں تھا۔ فی الحال یوں کہ وہ زیادہ عرصہ تک کی طاری نہیں رکھتی تھی۔ اور ایسا اس لیے تھا کہ اس کے نزدیک سب سے اہم اس کی اپنی ذات تھی۔ اور یہ طے ہے کہ صرف اپنی ذات کو اہمیت دینے والے کبھی خوش نہیں رہتے نہ کبھی مطمئن رہے۔ ایک سے شاکا بھی رہتے ہیں۔ بہر حال مدیجہ کے کالج جانے پر جہاں صباحت اور نیل حیران تھے وہاں طور پر یہ سمجھ کر خوش تھا کہ مدیجہ نے اپنی مرضی کرنے کے بجائے اس کی بات مان لی ہے۔ اور اس روز وہ اپنے کسی دوست سے بانیک لے آیا اور اسے اجازت لینے کے بعد اس کے پاس آکر کھائے۔

”سنوین آج بڑے موڈ میں ہوں۔ چلو تمہیں کبھی سیر کراؤں۔“
”صرف مجھے؟“ مدیجہ اپنی طرف اشارہ کرتی ہوئی استنہاسیہ تھی۔ ”مما سے پوچھا ہے؟“
”کیوں وہ منع کریں گی؟“ ”احمر نے قصداً انجان بن کر پوچھا کہ وہ کندھے اچکا کر بولی۔
”شاید۔۔۔“

”جی نہیں۔۔۔ وہ میری پھوپھو ہیں۔ انہیں مجھ پر پورا بھروسہ ہے اور انہوں نے بخوشی اجازت دے کر فنانٹ تیار ہو جاؤ۔“ ”احمر نے اترا کر کہا کہ وہ جیسے تھیں کبھی رہی تھی اور نہیں بھی۔ الماری کی طرز رک کر اسے دیکھنے لگی۔
”تم آج بار میں مذاق نہیں کر رہا۔ اچھا جاؤ خود پھوپھو سے پوچھ آؤ۔ جلدی جاؤ۔ وہ نیچے اتر گئی۔ میں سیدھی نکل جائیں گی۔“ ”اور احمر نے اس کی بے یقینی محسوس کر کے کہا۔
”میں نہیں جا رہی۔“ اس نے قدرے جھنجھلا کر الماری کھول لی۔
”کیا مطلب؟“ میرے ساتھ نہیں جا رہیں۔“

”مما سے پوچھنے نہیں جا رہی۔ آپ نے پوچھ تو لیا ہے۔“ وہ نیگرا تار کر اسکی طرف پلٹی تھی تب آگئی۔ اور اسے دیکھ کر معنی خیز شریر مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔
”تو آپ دونوں باہر جا رہے ہیں۔؟“

”جناب۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“ ”احمر نے فوراً اس کی طرف گھوم کر کہا۔
”جی نہیں۔ میں کیوں اعتراض کروں گی جب ممائے اجازت دے دی۔“ صباحت کی بات سن کر واش روم کا رخ کیا اور پکڑے تبدیل کر کے نکلی تو جلدی جلدی بالوں میں برش پھیر کر بولی۔
”میں تیار ہوں۔“

”ویری گڈ۔ اوکے صبا۔ تمہارے لیے آکس کریم لیتا آؤں گا۔“ احمر نے مدیجہ کے جلدی تیار ہونے پر صباحت کو ہاتھ ہلاتا کمرے سے نکل گیا تو مدیجہ جھاک کر اس سے پہلے میڑھیاں اترتی ہوئی بیٹھ کر اسے باہر آئی تھی۔
”تمہارا بھانجنا میری سمجھ میں نہیں آیا۔؟“

خبر آتی ہی اس سے کہا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ عمراور توبیہ کی شوخ نظروں سے بچنے کی خاطر اس میں سمجھنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ ”وہ لا پرواہی سے کہہ کر بانیک کی طرف متوجہ کر لیا۔“

”بانیک کس کی ہے؟“
”اس نے بانیک اشارت کرتے ہوئے کہا پھر اسے اشارہ کیا تو اس نے لایا ہوں۔ صرف تمہارے لیے۔“ ”احمر نے بانیک اشارت کرتے ہوئے کہا پھر اسے اشارہ کیا تو اس نے لایا ہوں۔ صرف تمہارے لیے۔“ ”احمر نے بانیک اشارت کرتے ہوئے کہا پھر اسے اشارہ کیا تو اس نے لایا ہوں۔ صرف تمہارے لیے۔“
”میں روڈ پر آکر احمر نے پوچھا۔
”اس میں اور ہر جگہ۔“ ”وہ موڈ میں آکر بولی۔
”مطلب؟“ ”احمر سمجھا نہیں۔“

”مطلب سارے شہر میں گھمادیں بغیر کہیں رکے۔ کیونکہ میں بانیک پر پہلی بار میٹھی ہوں اور مجھے بہت اچھا ہے۔“ ”وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی۔
”اچھا۔ میں تو سمجھ رہا تھا۔ تم بانیک دیکھ کر چیخ پڑو گی اور اس پر بیٹھنے سے منع کر دو گی۔“ ”احمر کو واقعی یہ خدشہ

”ہوئے آج آپ اتنے موڈ میں کیسے آگئے۔؟“ ”وہ اس کی بات ان سنی کر گئی۔
”تم نے میری بات جو مان لی۔“ ”احمر نے کہا تو قدرے حیران ہوئی۔

”کیوں؟“
”بات کے ساتھ گریجویشن کرنے کی۔ سچ مدحو اگر تم اپنی مرضی کرتیں تو میں سمجھتا، تمہیں میری بالکل پروا نہیں۔ اور پتا ہے اتنے دنوں سے میں یہ سوچ سوچ کر پریشان تھا کہ کیسے تم اپنی مرضی کر کے میری محبت کا مذاق نہ اڑاؤ۔“ ”احمر صاف گوئی سے اپنے خدشے کا اظہار کر رہا تھا۔

”بانیک دم چپ سی ہو گئی تھی۔
”مجھے اپنے بہن بھائیوں کے سامنے بھی شرمندہ ہونا پڑتا۔ گو کہ کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن مجھے اپنے آپ کا مذاق نہیں سب سے دیکھنا چاہیے ہوں کہ آیا تم میری بات مانتی ہو کہ نہیں۔“
”اور میں نے آپ کی بات مان لی۔“ ”وہ اپنے کچے میں استہرا اچھا نہیں سکی لیکن ٹریفک کے شور نے لاج رکھ لی۔
”اگلے نوٹھی میں پہلے آکس کریم۔“ ”احمر نے بانیک روکتے ہوئے کہا۔ ”تم یہیں روکو میں لے کر آتا ہوں۔ کون

”بانیک اشارہ کر کے لے لی۔“ ”اس نے صباحت کا یوں کہا کہ وہ اس سے کہہ کر آیا تھا۔
”مما کے لیے اچھی کیوں۔ اچھی ہمیں پورا شہر گھومنا ہے۔ واپسی میں گھر کے قریب سے سب کے لیے لے لیں۔“ ”احمر ہنسا ہوا آگے بڑھ گیا اور فوراً اپنی دو آکس کریم لے کر آیا تو وہ اس کے ہاتھ سے اپنی چاکلیٹ لیتی ہوئی

”تمہارا شہر نہیں گھومنا۔“
”میں تم سے نہیں کیا۔؟“

”نہیں۔ ٹریفک کے شور نے دماغ ہلا دیا ہے۔ انتہائی وایات سواری ہے یہ۔ آئندہ کبھی اس پر نہیں آؤں گا۔“ ”بانیک خریدنے کا خیال ہو تو فوراً دل سے نکال دیں۔“ ”وہ ایک ہاتھ سے اپنی پٹنی دبائی ہوئی

”تمہارا شہر نہیں گھومنا۔“ ”احمر نے بانیک اشارت کی۔ پھر اس کے بیٹھنے پر کہنے لگا۔
”مما کے لیے اچھی کیوں۔ اچھی ہمیں پورا شہر گھومنا ہے۔ واپسی میں گھر کے قریب سے سب کے لیے لے لیں۔“ ”احمر ہنسا ہوا آگے بڑھ گیا اور فوراً اپنی دو آکس کریم لے کر آیا تو وہ اس کے ہاتھ سے اپنی چاکلیٹ لیتی ہوئی

”مجبوری۔ نہیں میں مجبوری سے بھی کھپو و ماز نہیں کروں گی۔ آپ کی ایک بات مان لی ہے میں یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر بات مان لوں گی۔“ اس نے ذرا بھی مروت نہیں برلی۔

”پھر تو مجھے ہر صورت باہر جانا پڑے گا۔“ اصرار نے اس کی صاف گولی کا بارمانے بغیر کہا۔ پھر ٹینک سے اٹھ کر کلفٹن روڈ پر آیا تو ریڈ سگنل دیکھ کر جھنجھلا گیا۔

”الحوالہ۔ میں سوچ رہا تھا یہاں سے اسپڈ سے بھگاؤں گا۔“

”آپ ابھی بھی بھگا سکتے ہیں۔ کوئی دیکھ تھوڑی رہا ہے۔“ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئی بڑے آرام سے

”اللہ دیکھ رہا ہے۔“ اصرار نے جس بے ساختگی سے کہا ویسے ہی اس کی ہنسی بھی بے ساختہ نکلی تھی۔

لینڈ کروزر بائیک کے قریب آن رکھی مدیہ نے پونہی ہشتے ہوئے سرسری نظر سے دیکھا تھا اور فوراً گرا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی کے اس موڑ پر بھی جہاں اگر بائیک پر بیٹھ کر فوٹو تب بھی لینڈ کروزر اور اس میں موجود علی جمالی کی جگہ لے کر رہا تھا تو اسے متاثر نہیں کر سکتا۔

لیسے اس کی زندگی میں آچکے تھے اس کے بعد علی جمالی کی گہری نظروں پر اس کا رد عمل فطری تھا۔

سگنل آن ہوتے ہی اصرار نے اسپڈ سے بائیک بھگائی اور پیچھے علی جمالی کو دیکھا کہ ایک بار تو وہ دیکھے گی لیکن اسے سخت مایوسی ہوئی تھی۔

* ☆ * ☆ *

علی جمالی اپنی تخبیر کر لینے والی پر سنالشی سے بخوبی آگاہ تھا لیکن اس کے اندر اپنے چاشماہ سکندر اپنی وجاہتوں کا زعم نہیں تھا۔ اور نہ ہی اس کی سوچ ان جیسی تھی کہ جو چیزیں آجائے اسے ہر قسم سے جب ہی اس نے اول روز بھی صباحت نے جہاں کہا وہیں اسے ڈراپ کر دیا تھا اور دوسری بار آپ منوانے کے بجائے ایک طرح سے اختیار اسے دے آیا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ کچھ پٹا کرے گی لیکن اب مدیہ نے جس طرح اس کے دیکھنے پر ناگوار ی سے منہ موڑا تھا۔ اس سے حقیقت دھوکا لگا تھا۔ اس کے باوجود وہ کسی زعم میں اس کے تعاقب میں نہیں گیا۔ سوچا بھی نہیں بلکہ وہیں مخالف سمت موڑ لی تھی۔ لیکن اس کا دل جانے کیوں اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ منہ موڑ سکتی ہے۔

”ایک لحظہ کو بھی اس کے چہرے پر شناسائی کا تاثر نہیں لہرایا۔“ وہ مسلسل الجھ رہا تھا۔

”ہو سکتا ہے اس کے ساتھ کوئی پراہم ہو یا وہ کیسے انجیج ہو۔“ معاذم کی بات یاد آنے کے اس نوجوان کا خیال آیا جس کی طرف اس تمام عربے میں ایک بار بھی اس کا دھیان نہیں گیا تھا حال ہی سوچنا چاہیے تھا کہ وہ بائیک پر جس کے ساتھ بیٹھی تھی وہی اس کی طرف سے منہ موڑنے کا سبب بہر حال اب سبب سمجھ میں آیا تھا تو اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا المیہ لگ رہا تھا کہ وہ لڑکی جو اوا تک ایک لمحہ کو بھی اس کے ذہن سے محو نہیں ہوئی تھی وہ اس آنے سے پہلے ہی بہت دور تھی۔

نے بس تھوڑی سی کوشش کی بھی اس لڑکی کے خیال کو جھٹکنے کی اور کامیابی سے پہلے ہی یہ کوشش کیونکہ اس کا تصور ایسا نرم جھوٹا تھا جو ترستی آنکھوں میں جہاں پر سکون نیند لاتا وہاں آگے ایک لے جاتا تھا۔ جس میں رنگ خوشبو باہل ہو جانے لگتی خوبصورتیاں تھیں۔

کبھی کبھی از ان حقائق کی تلبیوں کو خیل کی شیرمنوں میں بھلانے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ کوئی نوعمر لڑکا نہیں تھا اور نہ ہی اس کی زندگی میں آنے والی وہ کوئی پہلی لڑکی تھی۔ لیکن جسے دیکھ جانے کو ہل چاہے وہ صرف وہی بھی اور وہ بار پھر تھا۔ یوں کہ اس کے بعد لگتا تھا زندگی بس یونہی گزرتی تبدیلیاں آئیں اس کے اندر کی دنیا نہیں بدلے گی۔

اس بیک اینڈ پر وہ آس سے اٹھا تو ایک دم سے شاہ پور جانے کا پروگرام بنالیا۔ گزشتہ دو مینو اس کی وجہ سے اپنا جاناملو کی کر رہا تھا کہ کہیں اس کی غیر موجودگی میں اس کا فون آئے یا وہ خود اس

دی تھی اس لیے گھر آکر اس نے بہت غلٹ میں شاور لیا اور کرم دین کو اپنے جانے کا تیار کر دیا۔ رات کے کھانے تک شاہ پور پہنچ جائے۔ لیکن کراچی کی ٹریفک الامان۔ ایک گھنٹہ تو اسے صدر گھاٹس کے بعد بھی راستہ صاف نہیں تھا۔ مجبوراً اس نے دوسرا روٹ اختیار کیا۔ جو خاصا طویل۔ ٹریفک میں پھنس کر جو وقت ضائع ہوتا تھا اس کی نسبت یہ طویل راستہ بہتر تھا۔ تاہم آباد سے رچھڑاؤ سب کے راؤنڈاؤٹ سے اس نے ٹرن لیا تھا کہ اچانک نظروں کے سامنے وہ آگئی۔

اس کا خیال جھٹکنے کی اس نے بس تھوڑی سی سعی کی تھی اور وہی ہی تھوڑی سی کوشش اس نے اپنی اسے نظر انداز کر کے آگے نکل آئی۔ لیکن اگلے راؤنڈاؤٹ سے اس نے گاڑی واپس اسی سٹاپ اور چند منٹوں بعد ہی گاڑی سے اتر کر لائبریری میں داخل ہوا تو پہلی نظر میں وہ اسے آخری الماری کے قریب کھڑی نظر آئی۔ اس کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا جب ہی وہ بڑے آرام سے اس بولا۔

نے چونک کر دیکھا اور بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اس کے ہونٹ ذرا سے نیم وا ہو کر ایک غم ہو گئے تھے۔

گاڑی۔ آپ نے بچا نا تو۔“ وہ ذرا سا مسکرایا تو وہ اس پر سے نظریں ہٹا کر الماری میں دیکھتی ہوئی بولی۔

داشت اتنی کمزور نہیں ہے۔“

سا اور تیر بھی کہ بھی کبھی انسان کو مصلحتاً انجان بننا پڑتا ہے اس نے اپنے تئیں اس روز کی اس کی رد کیا تھی۔ خاموشی سے اپنی مطلوبہ کتابیں تلاش کرنے میں لگی رہی۔

نے اس روز کے بعد پھر فون نہیں کیا۔“ علی جمالی نے اس کی نظروں کے سامنے سے کتاب کھینچنے

میں بارزائی کر چکی ہوں لیکن آپ کے ہاں سے کسی نے ریسو نہیں کیا۔“ اس نے کہا تو وہ حیران ہو کر

”مجھ وہی ہیں۔“

”وہ کسے کہہ سولہ نظروں سے دیکھنے لگی تو فوراً پچھنی خاطر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر اس پر تنکریں پڑیں تو دل مزید رپا پر پھٹنے لگا۔

”طلب ہے آپ کو نہیں ملے۔“ وہ اس کی خاموشی سے خود ہی نتیجہ اخذ کر کے بولی۔ ”ٹھیک ہے میں لگی۔“

”وہ فوراً بولا۔“ میں آپ سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

نہ ہو لیکن مجھے ہے کیونکہ میں کسی کا قرض نہیں رکھتی۔“ وہ بھی فوراً بولی تھی۔

پاسے قرض سمجھتی ہیں تو پھر آپ کو خود آکر مجھے لوٹانے ہوں گے۔ دوسری صورت میں میں واپس لے لے بنا اراہہ ہی اس کے آنے کی شرط رکھ دی تو وہ کچھ پریشان ہو گئی۔

میں کیسے آسکتی ہوں۔“

پاؤں آتی ہیں۔“

”میرا بھائی مین چھوڑ کر گیا ہے اور لینے بھی آئے گا۔ میں اکیلی تو سو رہی۔“ اس نے الجھ کر

”مہ مسئلہ ہے کہ آپ کیسے آتی جاتی ہیں۔“ وہ قدرے لاہروائی سے کندھے اڑکا کر کہنے لگا۔ ”اور میرا

نہیں ہوں، تمہیں اگر بہت ضروری چاہیں تو خود جا کر میرا ریک کھگا لے۔“ وہ ٹیس کی طرف جاتی ہوئی۔
 ”ریک تو میں تمہارا کھگا لے لوں گی یہ بتاؤ تمہیں ہوا لیا ہے اور وہ مدحو کہاں ہے؟“ ثویبہ نے مزید
 اس کے پیچھے آتے ہوئے پوچھا تو اس نے آخری بات کا جواب دیا۔
 ”مدحو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ماما سے آرام کرنے کا کہہ گئی ہیں، لہذا وہ آرام فرما رہی ہیں۔“
 ”ابو، تباہ کنو۔ تمہیں اس کا آرام فرمانا بھل رہا ہے۔“ ثویبہ ہنستے ہوئے بولی۔
 ”نہیں، اس وقت وہ کوئی مہمان نہیں کر رہی۔ واقعی میں طبیعت خراب ہے اس کی جاکر دیکھ لو۔“
 ہوئے پائیک کی آواز پر نیچے دیکھا پھر ثویبہ کا بازو ہلا کر پوچھنے لگی۔
 ”یہ سونیا آئی کہاں گئی تھیں؟“
 ”کسی دوست کے ہاں،“ ثویبہ جواب دے کر مدحیہ کو دیکھنے اس کے کمرے میں چلی گئی تو اس نے زحرف
 پونہی پوچھ لیا۔

”کہاں جا رہے ہیں۔“
 ”چلو گی؟“ آخر نے کہا تو وہ سمجھی اسے مدد یہ سمجھ کر رہا رہا ہے جب ہی ہنستی ہوئی بولی۔
 ”مدد کو طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ کہیں نہیں جاسکتی۔“
 ”میں تم سے کہہ رہا ہوں۔“ آخر نے گھور کر کہا تو اس نے اپنی طرف اشارہ کیا پھر اچانک کسی خیال
 اسے رکنے کا کہہ کر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور الماری کھول کر پانپرس چھینچ لیا۔
 ”ڈوٹی میں ذرا اجیر بھائی کے ساتھ جا رہی ہوں۔ میرے آنے تک تم مدد کو کے پاس بیٹھنا۔ میں بس ایک
 دیر میں واپس آ جاؤں گی۔“ وہ بہت عجلت میں کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔
 * ☆ * ☆ *

وہ آفس سے لوٹا تو آگے نماز کے ساتھ بابا جان موجود تھے۔
 ”السلام علیکم بابا جان“ اس نے سلام کے ساتھ فوراً ”بڑھ کر بابا جان کے پیر چھوئے تو انہوں نے
 کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ بٹھالیا۔
 ”خوش رہو۔ مصروف زیادہ ہو گئے ہو یا شاہ پور کا راستہ بھول گئے ہو۔“ بابا جان نے وعادینے کے لئے
 اتنے مینٹن کی غیر حاضری کو بتایا تو وہ سر ہٹھکاتے ہوئے بولا۔
 ”گھر کا راستہ کون بھولتا ہے بابا جان! بس نئی کوری ہے، سوچتا ہوں اچھی طرح جم جاؤں پھر تو گھر کی
 ویسے فون تو میں ہر دوسرے دن کرتا ہوں۔“
 ”ہاں بتا چلتا ہے ہمیں۔“ بابا جان نے آہستہ سے اس کا کندھا تھپکا پھر نماز سے مخاطب ہوئے۔
 ”ہو عازم! اجاؤ بابا، چیمہ صاحب اسی وقت ملیں گے۔“
 ”جی بابا جان جا رہا ہوں۔“ عازم اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”اور کچھ سات بجے سے پہلے آجائے۔“ بابا جان نے تاکید کی۔

”جی۔“ عازم اسے آنکھوں آنکھوں میں جانے کیا اشارا کرتا ہوا نکل گیا اور وہ ابھی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بابا جان نے اسے مخاطب کر لیا۔

”تمہیں اکیسے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔“

”جی نہیں بہت آرام سے ہوں۔ اور اپنی جانب سے مطمئن۔ گھر میں اور آفس میں بھی کد۔“

”اے اس نے اپنی طرف سے پورا اطمینان دلایا۔“

”لیکن ہم تمہارے اکیسے رہنے سے مطمئن نہیں ہیں اس لیے ہم نے سوچا ہے کہ جلد تمہاری شادی ویسے بھی اب ماشاء اللہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے ہو اور شاہی کی عمر بھی یہی ہے۔“ بابا جان جیسے کہ

رہے تھے وہ اسی قدر بے چین ہو رہا تھا۔

”وہ۔۔۔“ پھر نروس ہو گئی۔ سمجھ میں نہیں آیا کیا جواب دے اور بابا جان اپنے طور پر سمجھ کر اٹھ بولے۔

”اوہو نہیں تیرے۔“

صباح کے دل کو دھچکا سا لگا۔ فوراً بول پڑی تھی۔

”جی نہیں میرے والد بہت بڑے آدمی ہیں۔ آپ نے ان کا نام ضرور سنا ہو گا۔ شاہ سکندر حیات فرہیاتہ فشر۔“

بابا جان کی آنکھوں میں اچانک بے پناہ تحیر سمٹ آیا تھا اور ساتھ میں کچھ یقین اور کچھ غیر یقینی کی لہر تھی۔ پھر اسی عالم میں بولے۔

”تم شاہ سکندر حیات کی بیٹی ہو۔“

”جی۔ لیکن میں ان کے ساتھ نہیں رہتی۔ میں اپنی ماما کے ساتھ رہتی ہوں۔ میری ماما ڈاکٹر ہیں۔ اور انجانے میں ان پر بڑے انکشاف کر رہی تھی۔“

”ہوں۔“ بابا جان نے پر سوچ انداز میں ذرا سا سر ہلایا پھر پوچھنے لگے۔ ”صلی کے ساتھ کب سے رہتی ہے جی نہیں۔ میری کوئی دوستی نہیں ہے۔ میں تو انہیں پیسے دینے آئی ہوں۔ آپ انہیں بلا لیں۔“

وہ بولنے کے ساتھ اپنا پر س نکالنے لگی تھی۔ تب ہی وہ خود ڈرائی دھکیلا ہوا آیا تو بابا جان اسے دیکھ لگے۔

”صلی! یہ جی تمہیں کس بات کے پیسے دینے آئی ہے؟“

”وہ انہوں نے میرا گھداں تو ڈوبا تھا بابا جان!“ وہ سمجھ گیا کہ وہ بابا جان کو اپنی آمد کا مقصد بتا چکی ہے۔ چونکہ بغیر کہنے لگا۔ ”اسی کے پیسے دینے آئی ہوں گی۔ ایک بار پہلے بھی بھجوا چکی ہیں جو کرم دین نے دے تھے۔“

”ہائیں!“ وہ اچھل پڑی۔ ”یہ کرم دین کون ہے؟“

”میرا ملازم اور میں نے آپ کو اس لیے بلایا تھا کہ آپ کی امانت واپس کر سکوں نہ کہ مزید پیسے لینے۔“ صلی جہاں گئے اس کا پہلے سے بھجوا ہوا الفافہ جیب سے نکال کر اس کی طرف برھائیے کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”معاف کیجئے گا، آپ بہت۔“ وہ ایک دم ہونٹ بھیج گئی پھر خامسے جا رہا نہ انداز میں سامنے سے ہوئی تیز قدموں سے باہر نکلتی چلی گئی تھی۔

صلی جہاں گئے نہ کچھ بوکھلا کر بابا جان کو دیکھا پھر اس کے پیچھے آیا تھا لیکن برآمدے ہی میں رک گیا کیونکہ وہ بائیک پر بیٹھی نظر آئی تھی اور پھر فوراً ہی بائیک نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

”مائی گاڈ!“ صلی جہاں گئے اس صورت حال سے خاصا بد دل سا ہو کر مزید آگے بابا جان کا سامنا کرنے پریشان ہو گیا۔ دل چاہا میں۔۔۔ کہیں باہر نکلا۔ اے اور پھر بابا جان کے جانے کے بعد ہی واپس لوٹے کے غصے سے اچھی طرح واقف تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ ایسے معاملات میں وہ کس طرح حد اخلت کر کے فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ اپنے تایا شاہ یونس حیات کے بیٹے کی آنا ”فانا“ شادی وہ بھولا نہیں تھا اور ابھی جا آنے سے پہلے اس کے بارے میں بھی تو کچھ کہہ رہے تھے۔ پھر پھو شہرانا کی بیٹی یا پھر۔

”اوہ نوا!“ اس نے فوراً ”سر جیہ کا پھر بہت ہمت کر کے اندر آیا۔ بابا جان کسی گہری سوچ میں تھے۔ ابھی نہیں دیکھا۔“

”آپ کے لیے جائے بناؤں بابا جان؟“ اس نے بیٹھنے کے ساتھ کچھ ڈرتے ڈرتے انہیں مخاطب کر کے ساتھ انہوں نے گہری سانس فینچی پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”کچھ کہا تم نے؟“

”جی چائے۔“

”ہاں ناؤ، میری بی بی لیے ہیں۔ وہ بچی تو ناراض ہو کر چلی گئی۔“ بابا جان نے کہا تو وہ نظریں چرا کر بولا۔

”ہاں وہ میری غلطی ہے۔ مجھے اس سے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا۔“

”جی سے جانتے ہو اسے؟“ بابا جان کے ہلکے پھٹکے انداز سے وہ ٹھٹھک گیا۔

”میں میں زیادہ نہیں جانتا بابا جان! بس ایک دو باری ملاقات ہوئی ہے۔“

”مجھ لڑکی ہے تمہیں پسند ہے؟“ بابا جان نے اس کے جواب کو یکسر نظر انداز کر کے پوچھا۔

”جی! اس کا جی نہ سمجھنے والا تھا جس پر بابا جان براہ راست اسے دیکھ کر بولے۔“

”مگر نہیں پسند تو پسند کر لو کیونکہ ہم اسے تمہارے لیے پسند کر چکے ہیں۔“

”جی! اس کا تحیر انتہا کو چھو گیا تھا۔“

”کیا جی کی نگاہ ہے ہو ہماری باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آرہیں۔ وہ لڑکی صبح شاہ اسے ہم جلد سے جلد اس کے گھر لانا چاہتے ہیں کیونکہ ہمیں تمہارا اکیلا رونا پسند نہیں۔“

بابا جان نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کما تب بھی اسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں کیا۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”تمہاری اور صبح کی شادی کیا تمہیں اس پر اعتراض ہے؟“



”نہیں لیکن میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔“ صلی جہاں گئے نے ایک طرح سے اس کے اتنے پتے سے اعلیٰ کا اظہار کیا تھا۔

”ہم جانتے ہیں اور جتنا جانتے ہیں۔ اس سے زیادہ جاننے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔“ بابا جان نے کہا تو وہ مزید جہاں ہوا۔

”آپ کیسے جانتے ہیں؟“

”ہمارا خون ہے وہ ہمارے سکندر کی بیٹی، سکندر نے تو ہمیں نہیں بتایا لیکن دیکھ لو قدرت نے کیسے ہمارے خون کو ہم سے ملا دیا۔“ بابا جان کی آنکھیں جانے کس خیال سے چمکنے لگی تھیں پھر ایک دم جیسے اپنے اس خیال سے کل کر گئے تھے، یہ بات ابھی تم کسی سے نہیں کہو گے۔ خاص طور سے اس لڑکی پر اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا یعنی اسے یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تمہارا تعلق شاہ پور سے ہے۔ سمجھئے۔“

”میں کچھ کہیں سمجھ رہا۔“ وہ واقعی الجھ گیا تھا۔

بابا جان کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔

”یہ بات تو ضرور تمہارے علم میں ہو گی کہ سکندر نے یہاں شہر میں بھی شادی کی تھی۔ یہ لڑکی صبح اس کی بیٹی ہے۔ ابھی اس نے ہمیں اپنے باپ کا نام شاہ سکندر حیات بتایا ہے اور یہ کہ وہ ہیاتہ فشر ہیں اس کے بعد کسی ٹھنڈے کی گھاٹش نہیں رہ جاتی۔ پتا نہیں سکندر کو اپنی اس بیٹی کے بارے میں علم ہے کہ نہیں، یہ ہم نہیں جانتے کیونکہ اس نے ہمیں یہ تو بتایا تھا کہ یہاں اس کی بیوی ماں بننے والی ہے۔ اس کے بعد کبھی کوئی ذکر نہیں کیا ہو سکتا ہے اس عورت نے چالاکی کی ہو اور سکندر سے بیٹی چھپا کر ہو ایسی صورت میں وہ اپنی بیٹی کسی صورت میں اس کے لیے اور ہم ہر قیمت پر اسے حاصل کریں گے۔ تم ہماری بات سمجھ رہے ہو نا۔“

”وہ تو غور سن رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا۔ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔“

”بس تو جب تک صاحت اس گھر میں نہیں آجاتی تب تک اس پر اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا پتا۔
 گے کہ اس کی ہاں تک کیسے پہنچا جائے۔“ بابا جان نے کہا تو کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ پوچھنے لگا۔
 ”اور بچا جان، میرا مطلب ہے، انہیں آپ بتائیں گے یا بے خبر رہیں گے۔“
 ”ابھی، تم کچھ نہیں کہہ سکتے اور یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔ تم بس شادی کی تیاری کرو۔“
 بابا جان نے اس کا کندھا تھپکا تو وہ سر جھکا کر کسی خیال سے ہنس رہا تھا۔

صاحت واپس آئی تو برآمدے میں بیٹھے نبیل اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگے۔
 ”تم کہاں گئی تھیں؟“

”احمر بھائی کے ساتھ گلدان والی خاتون کے گھر۔“ وہ کرسی ان کے قریب کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔
 ”میہ دے دیے؟“

”نہیں، میرا مطلب ہے میں پیسے دینے ہی گئی تھی لیکن آگے انہوں نے بتایا کہ پہلے میں نے جو
 وہ انہیں مل گئے ہیں۔ اصل میں ان کے ملازم نے وصول کیے تھے اور شاید انہیں دینا بھول گیا تھا۔
 معذرت کر رہی تھیں۔“ وہ اس صورت حال کے لیے پہلے سے تیار بھی بغیر جھپکے بول گئی۔
 ”چلو تمہاری بچت ہو گئی اور سنو، آئندہ اگر ایسی کوئی بات ہو تو مجھے فوراً بتانا۔“ نبیل کی تاکید پر
 اثبات میں سر ہلایا پھر ایک دم ہار آئے پر پوچھنے لگی۔

”مدھو کی طبیعت کیسی ہے؟ تو یہ ہے اس کے پاس یا چلی گئی۔“
 ”کیا وہ مدھو کو؟“ نبیل نے چونک کر دیکھا۔

”دوسرے میں گلے میں تکلیف کی شکایت کر رہی تھی پھر سو کر انہی تو بخار بھی تھا۔ ممدادو اسے گئی؟
 نے گرم پانی سے غرارے کرنے کو بھی کہا تھا جو شاید مجھے کرنے پڑیں گے۔“ وہ بولتی ہوئی اٹھ کھڑی ہو
 ”کرتے نہیں کروانے۔“ نبیل کے اٹھ کھڑے ہونے پر مدھو نے ہنسی میں آئی تھی۔
 مدھو اور ثویہ لٹو کھیلنے میں مصروف تھیں۔ اس نے فوراً ”ٹوکنے کے بجائے پہلے اپنا پرس المار
 کھڑکی سے برودے میں پھینکے ہوئے لئے لگی۔

”مغرب کا وقت ہو رہا ہے، کچھ دیر کے لیے کھیل بند کرو۔“

”آگئی بڑی بی۔“ مدھو نے اپنی گوت چلتی ہوئی بڑی دانی تو ثویہ بے ساختہ ہنسی جس پر وہ اسے دیکھ کر پوچھ
 ”تم نے اپنے ٹوٹس تلاش کر لیے؟“

”نہیں یہ گیم ختم ہو جائے پھر کروں گی بلکہ تم دیکھ لو۔“ ثویہ نے کہا۔ تو اس بار مدھو زور سے ہنس
 ”کیا ہوا۔“ ثویہ کو اس کی ہنسی سمجھ میں نہیں آئی جبکہ وہ سمجھ گئی اور کچھ کہنا چاہتی تھی کہ عمر کے
 کا دھیان ادھر منتقل ہو گیا وہ برآمدے میں نبیل بھائی سے پتا نہیں کیا کہ رہا تھا۔
 مدھو اور ثویہ بھی لٹو چھوڑ کر سننے کی کوشش کرنے لگی تھیں پھر مدھو اسے دیکھ کر بولی۔
 ”دیکھو تو صبا! کون آیا ہے؟“

”عمر ہے پتا نہیں کیا کہہ رہا ہے۔“ اس نے کہا پھر جانے لگی تھی کہ عمرو ہیں آگیا۔

”احمر بھائی نہیں ہیں یہاں کہاں گئے؟“ عمر نے کمرے میں نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ دوست کی بائیک واپس کرنے گئے ہیں۔ خیریت کیا ہوا۔“ اس نے جواب کے ساتھ پوچھا۔

”ان کا رزلٹ آیا ہے فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لی ہے انہوں نے۔“ عمر نے خامے پر جوڑ

تو تینوں خوشی سے چیخ پڑیں۔

”وائی کہاں رہ گئے احمر بھائی، ہم ان سے ٹریٹ لیں گے۔“

”ڈبل ٹریٹ کیونکہ اس کا لڑشپ پر ان کا امریکہ جانے کا خواب بھی سمجھو پورا ہو گیا۔“

”کہا تو اس بار خوشی کے اظہار میں مدھو شریک نہیں تھی۔ خاموشی سے صاحت اور ثویہ کو دیکھنے لگی پھر
 نے عمر اس کے پاس آ بیٹھا اور جھک کر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے شرارت سے بولا۔

”پتلی ابھی فوراً تو نہیں جا رہے جو آپ اداس ہو گئیں۔“

”کیوں اداس ہوں گی۔“ مدھو نے اسے گھور کر دیکھا تب ہی احمر اندر آتے ہوئے بولا۔

”جینوں کی طبیعت ناساز ہے۔“

”اب نہیں ہے۔“ صاحت نے کہا تو عمر فوراً بولا۔

”صرف اداسی ہے۔ ایک منٹ کے لیے سب خاموش ہو جائیں۔ ذرا مدھو کو گانے دیں ہاں مدھو کیا گاؤ

بانے والے رے شہو ذرا رک جاؤ۔“

لہذا قاعدہ گانا شروع کیا تو مدھو نے تکیہ اٹھا کر اس کے منہ پر کھینچ مارا۔

”رے رے یہ کیا ہو رہا ہے۔“ احمر نے عمر کی جوانی کا رولائی سے کیلے ہی اس کا بازو پکڑ کر وہاں سے اٹھا دیا۔ پھر

اسب کو دیکھ کر بولا۔ ”نہیں تم لوگوں کو خوش خبری سنائے آیا تھا لیکن اب ہمیں بتاؤں گا۔“

”ہائیں، ہم پھر بھی ٹریٹ ضرور میں گے۔“ ثویہ نے کہا تو احمر نے چونک کر اسے دیکھا پھر کرسی کھینچ کر بیٹھتے

”ایک خبر پہنچ گئی۔“

”بہت مبارک ہو اور اب جلدی سے بتائیں، ٹریٹ کب دے رہے ہیں۔“ صاحت نے

نے ساتھ فوراً ”ٹریٹ کا مطالبہ کیا۔

”جی میں دوں۔“ احمر نے بول دیکھا جیسے اس نے الٹی بات کہہ دی ہو۔

”نہیں تو کیا، ہم دس گے۔ جی نہیں، آپ کو دینی ہوگی اور زبردست قسم کی، ابھی پروگرام بنائیں۔“ صاحت

نے شور مچا دیا تھا۔

”اور سن کر کمرے میں آئے اور دونوں کو خاموش کرانے کے بعد پوچھنے لگے۔

”حاصل ہے؟“

”جی ہاں، ہونے کی خوشی منائی جا رہی ہے۔“ احمر نے کہا تو صاحت پھر چیخ پڑی۔

”میں ہم قاعدہ خوشی منانے کی بات کر رہے ہیں۔“

”جیب خرچ پر۔“ احمر نے غلڑا لگایا تو نبیل بے ساختہ مسکرائے پھر آگے آکر مدھو کے بیڈ پر بیٹھتے

”وائی زیادتی ہے۔“

”کیوں نبیل بھائی۔ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لی ہے احمر بھائی نے تو کیا اس خوشی میں ہمیں ٹریٹ

”بس۔“ صاحت نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تو نبیل نے اس کی بھی تائید کر دی۔

”اچھا ہے۔“ پھر مدھو کی خاموشی محسوس کر کے اسے ٹوکا۔ ”کیوں مدھو! تم کیوں خاموش ہو کیا تمہیں احمر

”پتلی نہیں ہوئی۔“

”پتلی کس کو تو بہت خوش ہوئی تھی۔“ مدھو سے پہلے عمرو بول پڑا۔ ”لیکن جب احمر بھائی کے باہر جانے کا

”بڑا غم۔“

”سو چونک کر مدھو کو دیکھا تھا جو عمر کی بات سن کر انجان بننے کی کوشش کرنے لگی تھی اور جب کامیابی

”پتلی بڑی ہو گئی۔“

”پتلی بڑی ہو گئی اور تمہاری آنکھیں بھی کمزور ہیں۔“

”منا سے نہیں دیکھ رہا میں۔ دل سے محسوس کر رہا ہوں تمہاری اداسی، اور میرا دل بالکل ٹھیک کام کرتا

ہے کہیں تم اسے بھی کمزور بنا دو۔“ عمر نے لڑنے کے انداز میں کہا۔
 ”بس، اب لڑنا مت شروع کرو۔ نیل بھائی منع کریں انہیں۔“ صاحت نے بد مزگی کے ذرا
 مداخلت کی تو نیل نے تنبیہ کرنے میں دیر نہیں کی۔
 ”ہاں، یہی لڑنے کا موقع نہیں ہے، آرام سے بات کرو۔“
 ”میں آرام سے ہی بات کر رہا تھا اور کوئی غلط بات بھی نہیں کی آپ خود دیکھ لیں مدحو کے چہرے
 ”باس۔“ نیل نے ہاتھ اٹھا کر عمر کو بولنے سے روک دیا پھر کہنے لگے۔
 ”بات ہو رہی تھی باقاعدہ خوشی منانے کی اور وہ بھی احمر کے خرچ پر۔ اب احمر سے پوچھنا یہ نہ
 کرنے پر اعتراض کیوں ہے۔“
 ”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے نیل بھائی! آپ جب چاہیں مجھ سے ٹیٹ لے لیں۔“ احمر نے
 باری باری سب کو دیکھ کر بولے۔
 ”لو احمر تو تیار ہے۔ اب تم لوگ پروگرام سیٹ کر لو۔ لیکن کوئی لمبا چوڑا پروگرام مت بنالیا!
 پارٹی ٹھیک رہے گی۔ کیوں مدحو؟“ آخر میں انہوں نے بلا ارادہ مدحہ کو مخاطب کیا تھا اور وہ کندہ
 سے بولی۔

”مجھے کیا پتا۔“
 ”مدحو کو نہیں چھیڑیں نیل بھائی! آپ کو پتا تو ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ صاحبزادہ
 کہ کوئی محسوس نہ کرے فوراً بات بناتے ہوئے بولی ”ورنہ یہ ہو سکتا ہے کہ مدحو کسی پروگرام میں
 نہیں چلو مدحو! تم آرام کرو اور ہاں تم نے دوائی کہ نہیں۔“
 مدحہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔
 ”پہلے اسے کچھ کھلا دو پھر دیتا۔“ نیل اٹھتے ہوئے بولے تو ان کی تھلید میں احمر بھی کھڑا ہو
 بچا کر مدحہ کو جانے کیا اشارہ کیا کہ اس نے مسکرا کر سر جھکا لیا تھا۔

* * *

رات کے کھانے کے بعد شاہ سکندر اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ ان کی بیٹی الماس
 کے بولی۔

”ہاما! آپ کو بابا جان یاد کر رہے تھے۔“

”جی! آپ؟“ انہوں نے رک کر پوچھا۔

”جی کہہ رہے تھے کھانے کے بعد آپ ان سے مل لیں۔“ الماس نے کہا تو انہوں نے خواہ
 جان کے کمرے کا رخ کیا کیونکہ اس وقت وہ سیاسی حالات پر باتیں کرنے اور سننے کے موڈ میں
 جان کے پاس جب سے وہ فشر بنے تھے یہی ایک موضوع تھا۔
 ”السلام علیکم بابا جان!“ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلام کرنے کے ساتھ پوچھا

ہے؟“

”اب تو ہم تمہیں یاد ہی کرتے ہیں۔ ملاقات تو کبھی کبھار ہوتی ہے۔“ اوٹھو۔“ بابا جان کا
 تھا۔

شاہ سکندر خاموشی سے ان کے پاس بیٹھ گئے تو بابا جان نے پہلے وہی سیاست کا موضوع چھیڑ
 لگے۔

”ہر دوسرے دن کی آمد و رفت سے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم کراچی ہی میں رہائش اختیار کر
 وہیں لے جاؤ۔“

”نہیں بابا جان! اول تو یہ آمد و رفت کوئی مسئلہ نہیں ہے دوسرے مہر النساء بھی کراچی؟

”شاہ سکندر نے کہا تو بابا جان قصداً ”عجب کے اظہار کے ساتھ بولے۔
 ”میں مہر النساء آمادہ کیوں نہیں ہوگی۔ کیا اسے ابھی بھی کوئی خدشہ ہے۔؟“

”نہیں خدشہ۔؟“ شاہ سکندر فوراً ”سمجھ نہیں پاتے۔“

”دو جنم نے ایک غلطی کی تھی۔ ہمارا مطلب بے شادی۔“ بظاہر بابا جان کا انداز سراسری سا تھا۔

”وہ جو تم نے ایک ہیج کر دوسری سمت دیکھنے لگے، وہ بھولے نہیں تھے، لیکن اتنے برسوں بعد بابا جان نے ذکر

شاہ سکندر ہونٹ پہنچ کر دوسری سمت دیکھنے لگے، وہ بھولے نہیں تھے، لیکن اتنے برسوں بعد بابا جان نے ذکر

آج انہیں اذیت سے دو چار کر دیا تھا۔

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”اب تو مہر النساء کی اولاد جوان ہو گئی ہے۔ اب اسے خدشہ نہیں ہونا چاہیے۔“ کچھ دیر رک کر بابا جان نے

”یاد ہے ہمیں، بھولے نہیں ہیں۔ ہمیں اس عورت سے کوئی سروکار نہیں، ہم صرف تمہاری اولاد کی سوچ رہے ہیں۔ ہمیں بھی سوچنی چاہیے۔ اگر بیٹی ہے تو اس کے لیے اسی جوتلی میں رشتے موجود ہیں۔ جہاں گھیر کے بیٹوں میں سے تم جس کے ساتھ کوٹے گئے، ہم اس کی شادی کروں گے۔ اس طرح تمہاری بیٹی کی شادی قریب رہے گی لیکن مسئلہ وہی ہے کہ وہ عورت آسیہ نہیں مانے گی۔“ بابا جان نے دھیر سے بات کرتے ہوئے آخر میں کچھ تنفر سے کہا تھا۔

شاہ سکندر پر سوچ انداز میں انہیں دیکھے گئے بولے کچھ نہیں۔

”اور ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم شاہوں کی بیٹیاں غیروں میں نہیں بیاہی جاتیں، ہم آسیہ کے ساتھ کوئی کرنے نہیں جا رہے۔ آخر کہیں نہ کہیں تو اسے بیٹی بیاہنی ہوگی۔ ساری زندگی اپنے پاس تو نہیں بٹھائے گی۔ پھر کیوں نہ اس بیٹی کو اس کا اصل گھر اصل مقام مل جائے۔ ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں ناں۔؟“

بابا جان نے اپنی بات کی تصدیق کے لیے شاہ سکندر کو سوچوں کے بھنور سے نکالا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولے۔

”کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں لیکن۔“

”تم صرف ہائی بھرو۔“ بابا جان فوراً بول پڑے۔ ”باقی سارے کام ہمارے اور ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ آسیہ سے بیٹی چھین کر نہیں لائیں گے بلکہ اسی کے گھر سے شاہ علی جہانگیر کے ساتھ بیاہ کر لائیں گے۔“ شاہ سکندر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد ان بات میں سر ہلایا پھر محض اپنی بات رکھنے کی خاطر کہنے لگے۔

”اب بتائیں بابا جان، آسیہ کے پاس بیٹی ہے یا بیٹا۔“

”ہم معلوم کر لیں گے۔ بیٹا ہوا تب بھی ہم اس کے لیے بہت کچھ کریں گے۔“ بابا جان نے اندر ہی اندر منہ ہمو کر کہا تھا۔

”اچھی بات ہے، اب آپ آرام کریں۔“ شاہ سکندر اٹھ کھڑے ہوئے اور شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکلے ان کے ذہن پر اپنی بی بی بات دستک دینے لگی تھی۔

”تیسرے آسیہ آئیں نے کیا سوچا ہے اگر ہماری بیٹی ہوئی تو ہم اس کی شادی علی جہانگیر کے ساتھ کریں گے۔“ علی جہانگیر کے لیے یہ انکشاف بڑا خوش کن تھا کہ صحبت اس کی عمر زاد ہے اس کے بعد بابا جان نے اس کے ساتھ اس کی شادی کا طے کر کے تو گویا اسے پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی زبردستی ہو۔ کیونکہ اس کے پیش نظر صرف اپنی خوشی نہیں تھی۔ وہ اس سے بھی اس کی فز معلوم کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ وہ اس پر اپنا آپ ظاہر کرے۔ وہ اپنے اسی پرانے سے خود کو اس کے سامنے کھڑا کر سکتا تھا۔ یوں جیسے اتفاقاً سامنا ہوا ہو جیسے پہلے کی بیاہ ہوا تھا اور اس کے شام لاہوری جانے لگا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس روز یہاں سے وہ جو کتابیں لے گئی تھی۔ وہ واپس کرنے آئے گی اور وہ انہی بھی تو آپ کی نہیں تھی اس کے ساتھ دوسری لڑکی کو دیکھ کر وہ خاصا جڑ بڑھا پھر نظر اتر جان۔ سارا دھیان اس پر رکھ کر انتظار کرنے لگا کہ کہیں تو وہ دوسری لڑکی اوھر اوھر ہوگی۔

وہ دونوں کتابیں دیکھتی ہوئی اس کی پشت پر الماری کے پاس آکھڑی ہو میں تو اس کا دل چاہا ساری دامن چھوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لے اور بغیر کسی تمہید کے بوجھے کہ وہ اسے کیسا لگتا ہے اور ابھی وہ اپنے ذہن سے جرات کر گزرنے سے باز نہ کھینے کی سعی کر رہا تھا کہ اس کے ساتھ کھڑی دوسری لڑکی آگے بڑھتی نظر آئی۔ فوراً ”کری دھکیل کر اٹھا اور اس کے برابر کھڑا ہوا کہ ساہتہ انداز میں اسے متوجہ کیا۔

”ہیلو۔“

صحبت نے چونک کر اسے دیکھا پھر فوراً ”نظر انداز کر کے ٹوبہ کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگی تو وہ اچانک انگوٹھے سے اشارہ کرتا ہوا بولا۔

”آپ کی دوست اوھر جارہی ہیں، جانے دیں یا اگر پکارنا چاہیں تو بے شک پکاریں کیونکہ مجھے جو کہنا ہے۔“

نے بھی کہہ سکتا ہوں۔

”یہاں آئیے آپ کو۔؟“ صحبت کچھ گھبرا کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

رجوت کچھ سے لیکن اس وقت صرف اتنا کہوں گا کہ میں آپ کو پسند کرتا ہوں اور آپ کی طرف سے یہ باتوں کے آپ مجھے ناپسند نہیں کرتیں۔“ وہ اسے نظروں کی گرفت میں لے کر سوالیہ نشان بن گیا۔

ت کا دل بیکارگی بہت زور سے دھڑکا تھا بہت مشکل خود پر قابو پا کر بولی۔

راہ میں یہ سین نہ دوں تو۔؟“

”مجھوں کا آپ کے دل کی بہتی میں پہلے ہی کوئی اپنے نام کے پھول کھلا چکا ہے جس کی محبت میں آپ نے گل چکی ہیں کہ۔“

”نہیں۔“ وہ بے اختیار اس کی بات کاٹ گئی۔ پھر احساس ہونے پر نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ”آپ کو بارے میں کچھ قیاس کرنے اور مجھے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

”نہیں، مجھے یہ حق میری محبت نے دیا ہے جس کا میں پوری ایمانداری سے اعتراف کرتے ہوئے آپ کو ی کر رہا ہوں اور جب تک آپ جواب نہیں دیں گی، میں یونہی قیاس کرتا رہوں گا اور ہر دوسرے موڑ پر ہلوں گا بھی ضرور۔“ وہ بے حد مضبوط لہجے میں بولا تھا۔

نت نے ذرا سی پللیں اٹھا کر اسے دیکھا پھر نظروں کا زاویہ بدل کر ٹوبہ کو دیکھنے لگی جو شیشے کی الماریوں میں با آخری سرے تک چلی گئی تھی۔

”کیس کی نہیں آپ۔؟“ اس نے نوکاتو صحبت نے ٹوبہ کی طرف سے دھیان ہٹا کر پھر اسے دیکھا اور نفی دیا تو وہ یوں کا سوال اٹھانے کے بجائے پوچھنے لگا۔

”میں گنجیج ہیں۔“ صحبت نے دوبارہ نفی میں سر ہلایا تو وہ بہت مطمئن سا ہو کر بولا۔

”ایک آخری بات میں آپ کو کیسا لگتا ہوں۔؟“

نالی فصول۔“ وہ کہہ کر آگے بڑھ گئی تو اس کے لیے کو دیکھتے ہوئے علی جہانگیر دھیرے سے مسکرایا تھا اس کے چہرے پر اتنے رنگوں کی قوس قزح دھچک چکا تھا۔

”یوں کہاں چلی گئی تھیں۔؟“ وہ ٹوبہ کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تھی کہ مدحیہ نے چلا کر پوچھا۔

”ٹوبہ، یہ مختصر جواب دے کر وہیں برآمدے میں بیٹھ گئی تھی۔

”میں جاسکتی تھیں۔؟“ مدحیہ نے اس کی طرف سے نمونہ انداز ہنوز تھا جو اسے سخت ناگوار گزرا پھر بھی ڈسے بولی۔

”میں نے پوچھ لیا تھا اور تم سو رہی تھیں ورنہ جاتے ہوئے تمہیں بھی ضرور بتا کر جاتی گو کہ یہ کوئی ایسا نہیں ہے۔“

”ٹھیک کہا۔“ عمر سنتا ہوا آگیا اور اس کی تائید کرنے کے بعد مدحیہ کو دیکھ کر بولا۔ ”تم کیا اس کی دادی ہو جو پر غیب جاتی ہو۔“

”مدحیہ نے اسے نوکاتو لڑنے کے انداز میں کہنے لگا۔

”صرف تمہارا نہیں ہے سب کا ہے، کیا میرا غریب سب جاسکتے ہیں وہاں کوئی ٹیکس نہیں لگتا۔“

”مدحیہ نے نخوت سے سر جھکا کر کہا۔

”تمہاری فصول باتوں پر فصول لوگ ہی بنتے ہیں۔“

”مطلب ہے ایک تمہیں چھوڑ کر باقی سب یہاں فصول ہیں بابا جان۔“ عمر خاصے بے دھتکے انداز میں ہنسا یہ مزہ سنگ کرچہ کہنا چاہتی تھی کہ صحبت فوراً بول پڑی۔

”ایسا توئی مطلب نہیں ہے عمر! یہ صرف تمہیں اور مجھے فضل سمجھتی ہے اور میرا خیال ہے غلط بھی ہے۔“

ۛ ار ملک، جہکیں پھر دوبارہ اس طرف دیکھا تو ہی آنکھیں تھیں۔

آخری بات کہ میں آپ کو کیا لگتا ہوں۔“

نیل کی اسٹک کی آواز نے ایک تخت اس کے ذہن کو
وہ سن بھل کر یوں بیٹھ گئی جیسے ان کی آمد سے بے خبر ہو۔
فاموشی میں تک تک کی آواز سرت واضح تھی۔ وہ

اس نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا پھر اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر پوچھنے لگی۔

”بھئی بات ان کے ہونٹوں میں تھی کہ وہ بول پڑی۔“

میں ٹوبہ کے ساتھ لائبریری کی بھی گئی۔
 بی بی جاتے ہوئے بتایا تھا میں نے اور اب مدحو کہاں گئی ہے۔؟ انہوں نے بیٹھے ہوئے

’خبرگاہ‘ نے قدرے لائبروائی سے کہا۔

”خیر نہیں آئی۔ قریباً“ آٹھ گھنٹہ میں اماں جی کے پاس بیٹھا ہوں۔ اس کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ ”میل

[illegible]

میں نے کہا: ”نیل بھائی، ہو گی سو نیا آپ کے کمرے میں، ابھی جب ماما کے آنے کا وقت ہو گا تو یہ بھی گالاں لے لیا کرتے تھے۔“

”بھائی! بس ہوں کر کے رہے تو قدرے توقف دہ انہیں متوجہ کر کے کہنے لگی۔

نیل نے کہا: ”میرا تو خیال تھا آپ وہیں گئے ہوں گے۔“

نہیں۔ میں کافی دنوں سے وہاں نہیں گیا۔ جاؤں گا ایک دو دن میں، فوراً تو نہیں بلایا یا پائے؟“ نیل نے نیلی سے ہاتھ کو جھٹکا۔

میں میرا مطلب ہے فون بوانے سنا تھا اگر انہیں کوئی کام ہو گا تو وہ پھر فون کر لیں گے یا آپ ”عمر کے آنے

اسلام، یکم نیل بھائی! عمر خاصے تھکے ہوئے انداز میں سلام کر کے نیل کے قریب کرسی گھسٹ کر بیٹھا۔

اسلام کی تعلیم یہیں بھائی: "مگر خالص سے ہوئے انداز میں سلام کرے میں سے قریب کر لی گئی ہے۔"

اس نے بے اختیار پوچھا۔

پتوڑی کی بھانج بننے کی تمھاری بہن ندیہ بیگم اسے پردیس جانے والے کے لیے کوئی تحفہ خریدنا تھا۔ اس نے جیل شہر کے سارے بازاروں کی خاک چھاننے کے بعد آخر اس نے تحفہ خریدا ابھی تو ایک ریڑھی والے

”میرے جلے کے انداز میں بتایا۔
”آئیے، اس کی بے ساختہ ہنسی میں بے یقینی شامل تھی۔

یہ اس کی بے ساختہ ہسی میں بے یقینی شامل تھی۔
 "عمر اس کے منہ سے مزید پ گیا۔
 "نہیں،" نے فوراً "نہیں،"

میں نے تمہارا یقین کر رہی ہوں۔ یہ بتاؤ، اس نے احمر بھائی کے لیے تحفہ کیا لیا۔ ”اس نے فوراً“ ہنسی

شہزادہ کیلئے بھیج دیا تھا اور جب میں واپس آیا تو وہ اطمینان سے بولی ”میرا کام

بسترِ جنو بہر میں تمام راستہ پوچھتا رہا کہ کیا خریدائیں گے اس نے بتا کے نہیں دیا۔ عمر کو غالباً "اسی بات کا غصہ

نیا بلوچستانی نہیں چاہیے تھا۔“ فیمل جو بہت خاموشی سے دونوں کی باتیں سن رہے تھے لوک دیا۔

”کیوں نبیل بھائی، اس میں اتنی رازداری برتنے کی کیا بات ہے۔“

”ہے یا نہیں، یہ بتاؤ احمر کے ویزے کا کیا ہوا۔“ نیل نے فضول بحث چھوڑ کر کام کی بات پوچھ کر ایک تخت بدل گیا۔

”مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں ہے نیل بھائی! ان ہی سے معلوم کیجئے گا۔“
 ”اچھا آئے تو بھیجنا اسے میرے پاس۔“ نیل کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے پھر اپنے کمرے کی طرف
 ہوئے رُک کر بولے۔

”صبا! پھوپھو آنے والی ہوں گی کھانا لگا دو۔“
 ”جی اچھا۔“ وہ انہیں جواب دے کر عمر کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ”سنو کھانا ہمارے ساتھ کیا تمہارے پسندیدہ کوہنے بنائے ہیں۔“
 ”ساتھ میں کیا ہے روٹی یا چاول۔؟“

”دونوں چلو اٹھو مہاراجہ! اس نے رینگتے آسے کی گاڑی دیکھ کر کما پھر بھاگ کر کچن گارڈ بابا جان نے شاہ جہانگیر کو اپنے کمرے میں بلایا تھا اور ایک طویل عرصے بعد ان کے انداز میں وہی راز جیسی شاہ سکندر کو آسے کے حصار سے نکالنے میں انہوں نے بری تھی۔ جسے شاہ جہانگیر نے ان کے داخل ہوتے ہی محسوس کر لیا تھا لیکن ظاہر نہیں ہوئے دیا اور بہت امتحان بن کر بیٹھے ہی اپنی مصروفیات جو محل سے سننے کے بعد بابا جان بولے تھے۔

”تم نے ہمیں اتنا بے خبر کیسے سمجھ لیا جہانگیر! ہم صرف اپنی اولاد ہی کی نہیں اولاد کی کی بھی بڑ جو تم نہیں رکھتے۔“

”یہ آپ کیسے کہتے ہیں بابا جان! ہم از کم میں اپنی اولاد سے بے خبر نہیں ہوں۔“ شاہ جہانگیر نے کہا۔

”علیٰ علیٰ“ نے شہر میں سے نہیں بابا جان! آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہوگی۔“

”ہمیں کسی نے اطلاع نہیں دی، جاغیر! خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے ہیں اس لڑکی کو اور اس میں جانے کے بعد یہ فیصلہ بھی کر چکے ہیں کہ علی کی شادی اسی کے ساتھ ہوگی۔“

باباجان نے حتمی انداز میں اپنا فیصلہ سن کر شاہ جاگیر سے اختلاف کا حق ہی چھین لیا البتہ ان کے سوال اٹھ رہے تھے جنہیں سونے کے بعد وہ کہنے لگے۔

”میں نہیں سمجھتا یا جان اگر آپ نے یہ فیصلہ علی کی محبت میں کیا ہو گا کیونکہ محبت کو آپ نے نہیں بنے دیا۔ اگر ایسا ہو تا تو آج سکندری دو سری یوں یہاں موجود ہوتی۔ آپ اسے طلاق نہ دلائے ”میں۔“ بابا جان نے ان کی بات سکون سے سن کر ہنسا اور ابھرا پھر کہنے لگے۔
”نہیک سمجھتے ہو تم، ہمارے فیصلوں میں محبت کی کمزوری شامل نہیں ہوتی اور ابھی بھی ہم نے علی؟ نہیں سوچا بلکہ وہ لڑکی جسے علی پسند کرتا ہے اسے اس حویلی میں لانا مقصد ہے۔ کیونکہ وہ ہمارا خون سکندری کی بیٹی۔“

”آپ کا مطلب ہے۔“ شاہ جہانگیر اس انکشاف پر بس اسی قدر کہہ سکے۔
 ”ہاں اسی شہزادہ کی اولاد جس کے بارے میں سکندر کو کبھی معلوم نہیں تھا، ہم نے بتایا ہے
 بھی کہ اس کی بیٹی کو ہم علی کے ساتھ بیاہ کر لے آئیں گے۔“ بابا جان اسی سکون سے بول رہے تھے

”ٹھیک ہے بابا جان لیکن آسیہ، وہ اپنی بیٹی ہمیں دینے پر کیونکر آمادہ ہوگی۔“ شاہ جہانگیر نے بھی اس حدشے سے باز نہ آئے تھے۔

ہم نے اس سے پہلے ہی کہ اس سے بیٹی کس طرح حاصل کی جائے سکندر سے ہم وعدہ کر چکے ہیں کہ آسیہ سے بیاہن کر نہیں لائیں گے بلکہ اسی کے گھر سے شاہ علی جمائیکر کے ساتھ بیاہ کر لائیں گے اور ہم اپنے وعدہ کو نبھاتے رہتے۔ تم کوئی ایسی تدبیر کرو کہ آسیہ اس رشتے پر راضی ہو جائے۔“ بابا جان نے کہا تو ان کی آخری بات جاننے والی میں سر ہلاتے ہوئے بولے

”لیکن کچھ ناممکن نہیں ہے جاگیر! ہمیں ہر قیمت پر اس لڑکی کو حاصل کرنا ہے، اور سکندر سے کیے وعدے کا تقاضا ہے۔“ بلہاجان نے ان کے ناممکن کہنے پر ناکواری کے اظہار کے ساتھ کہا تھا۔

”جاگیر خاموش ہو کر سوچنے میں لگ گئے۔ پھر اچانک کسی خیال کے تحت پوچھنے لگے۔

”اگر لڑکی جانتی ہے کہ علی سے اس کا کیا رشتہ ہے؟“

نہیں اور ہم نے غلی کو سختی سے منع کر دیا ہے کہ ابھی وہ اس پر اپنا آپ ظاہر نہ کرے اور نہ اس کے سامنے اپنی شاہ پور کا ذکر کرے۔ بابا جان نے کہا تو شاہ جاگیر فوراً "بولے تھے۔ میرا مطلب ہے خاندان کا کوئی اور فرد کیونکہ آسیہ اور اس کے گھر والے سکندر کو جانتے ہیں یا پھر انہوں نے مجھے دیکھا

”ہوں۔“ بلجا جان کتنی دیر سوچ انداز میں سر ہلانے کے بعد کہنے لگے۔ ”تم اپنی بیگم اور بیٹی کو علی کے پاس لاؤ اور انہیں سارا معاملہ سمجھا کر بیگم سے کہو کہ وہ آسیہ سے راہ و رسم بڑھا کر اس سے بیٹی مانگے، ہمیں یقین ملے گا کہ بیٹی کو بلا کر لے کر آئے گا۔“

”اُن کے لیے سب سے زیادہ تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی، سمجھتے تہ“ بابا جان کے لہجے میں تنبیہ بالکل سمجھ گیا بابا جان اور اب مجھے عارفہ (بیگم) کو سمجھانا ہے۔“ شاہ جہانگیر جیسے نئی مہم کے لیے تیار ہو کر بیٹھے۔

میرے کی غیر معمولی طویل خاموشی ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پچھلے ڈیڑھ دو گھنٹے سے احرا اپنی ساری باتوں میں نا کام ہو کر آخر میں جھنجھلا گیا تھا۔
 "خدا کے لیے دعا کرو! کچھ بولو، ورنہ میں سمندر میں کود جاؤں گا اور یہ صرف میری دھمکی نہیں ہے میں جو کہتا ہوں، عمل کرتا ہوں۔"

میرا بوسہ سوچ سے نظریں ہٹا کر اسے یوں دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو کیا پولوں اور وہ سمجھ کر کہنے لگا۔
 ”یہ کیا مسئلہ؟“ یہ کہ تم میرے جانے سے اداس ہو اور یہ کہ باہر جا کر میں تمہیں بھول نہ جاؤں۔ روزانہ خط
 لکھوں گا۔“

”وہ بے اختیار بول پڑی۔ ”میں کوئی روزانہ ووزانہ نہیں لکھوں گی۔“
 بختیاری نے ایک ”آخرے اس کی خاموشی ٹوٹنے پر دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے کہا۔
 ”جیسے ایک خط لکھنے میں پورا ایک ہفتہ لگتا ہے اس کے بعد پوسٹ کروانے میں آج کل، آج کل
 پہنچتے تھے، دن نکل جاتے ہیں۔ اس حساب سے آپ کے پندرہ خطوں کے جواب میں میرا ایک خط آپ
 مدحیہ نے بغیر کسی عذر کے کہا۔“

”کیسی لڑکی، میرا دل رکھنے کی خاطر ہی کہہ دیتیں کہ روزانہ خط لکھو گی۔“ امر کے لیے میں ہلکا سا ہنسی
 ”چلیں اب کہہ دیجیے ہوں روزانہ لکھوں گی۔“ اس کے نروٹھے سے انداز پر وہ گہری سانس کھینچ کر بولی
 ”تمہیں تو دل رکھنا بھی نہیں آتا۔“

”زبردستی رکھو آئیں گے تو ایسے ہی رکھوں گی ناں۔“ وہ خفگی سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی تو احمر اس کا
 ساختہ ہنسا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔
 ”کیا چاہتی ہو تم؟ سارا وقت تمہاری خوشامد کرتا رہوں۔ پہلے دو گھنٹے تم نے خاموشی میں گزار دی
 ناراض ہو رہی ہو۔ اگر اسی طرح کرنا تھا تو آئی کیوں نہیں میرے ساتھ۔“

”یہ آئی تو آپ ناراض ہوتے۔“ وہ اسی طرح منہ پھلا کر بولی تھی۔
 ”اگر میری ناراضگی کی پروا ہے تو فوراً اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ ورنہ میں جانے کے وقت تک تم سے کوئی
 کروں گا۔“ امر کے دھمکی آمیز لہجے پر وہ کچھ خائف سی ہو کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”آپ بہت خراب ہیں ایک تو مجھے جھوڑ کر جا رہے ہیں۔“
 ”ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہا۔“ وہ فوراً ”بولنا تھا“ اور پھر ہمارے لیے ہی جا رہا ہوں، تمہیں بائیک
 ہے۔“

”آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے وہاں سے گاڑیاں لے کر آئیں گے۔“
 ”خریدنے کے قابل تو بن کر آؤں گا ناں اور پھر تم جس گاڑی پر ہاتھ رکھو گی وہی تمہاری بس تم میر
 کرتی رہنا۔“ کوئی ناں۔“ امر نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس نے فوراً ”اپنا چروہو مری“
 لیکن اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی وہ کچھ چکا تھا۔

”تم آنا مدحو! اگر اس طرح کرو گی تو میں اپنا جانا کینسل کر دوں گا۔“ وہ وقف لڑکی! دو سال کی تو بڑ
 یوں گزر جائیں گے۔“ امر نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجاتی تو وہ مزید سر جھکا کر پیکوں تک نکل
 پر سمیٹنے لگی۔

”چلو اب یہاں بیٹھنا خطرناک ہے۔ لوگ مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔“ احمر ان کا دھیا
 خاطر اٹھ کھڑا ہوا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔ ”پانی میں چلو گی؟“
 وہ نفی میں سر ہلا کر اپنا دوپٹہ سنبھالنے لگی جسے تیز ہوا اڑانے کے لیے جاری تھی بس ایک سر اس
 تھا۔

احمر نے برہہ کر دوپٹے کا دوسرا سر اٹھام لیا اور اس کی گردن میں لپیٹ کر آگے بڑھ گیا تو وہ قدرے س
 اس کے پیچھے چلنے لگی۔

”آؤں گے گمہ یا کچھ اور۔“ بائیک کے قریب رک کر احمر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ تو اس
 دل رکھنے کی خاطر قصداً ”مسکرا کر بولی۔

”کچھ اور۔“ لیکن میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ یعنی جو آپ کا دل چاہے۔“
 ”اچھی بات ہے چلو۔“ احمر نے بائیک اشارت کر کے اسے اشارہ کیا کہ اس کے بیٹھے ہی اسپینڈ
 دی تو وہ چیخ پڑی۔

”آہستہ میں گس جاؤں گی۔“
 احمر پر اس کے پیچھے کا کچھ اثر نہیں ہوا بلکہ وہ محظوظ ہو رہا تھا جب ہی بائیک کو دائیں بائیں لہلہ
 اپنے فیورٹ ریٹورنٹ کے سامنے رکا تو وہ فوراً ”اچھل کر اس سے دور جا کھڑی ہوئی اور خوشوا
 گھورتے ہوئے بولی۔
 ”بس میں آج آخری بار آپ کے ساتھ آئی تھی۔ آئندہ کبھی کہیں نہیں جاؤں گی اور مجھے کچھ
 ہے میں جاری ہوں۔“

”حرمائیک بند کر کے اس کے قریب آیا۔“ کہاں جا رہی ہو؟“
 ”وہ چیخ کر بولی۔

”یہاں رہی ہو، چلو کھڑی چلتے ہیں۔“
 ”نہیں۔“ مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔ آپ جائیں اپنی بائیک پر میں پہنچ جاؤں گی کسی نہ کسی طرح۔“ وہ
 ہنسی تیز قدموں سے ایک طرف چل پڑی تو احمر بوکھلا کر چند قدم اس کے پیچھے چلا پھر خیال آنے پر واپس
 ایک اشارت کر کے اس کے قریب لے گیا۔

”لیا کی بن سے مدحو! چلو بیٹھو۔“
 ”نے کہا ناں آپ کے ساتھ نہیں جانا تو نہیں جانا۔“ اس نے ایک طرف رک کر حتی انداز میں کہا پھر

”آجی بات نہیں ہے مدحو! ذرا سی بات پر غصے میں آجاتی ہو۔ چلو اب میں بہت آرام سے چلاؤں گا۔“
 ”زی سے نوکتے ہوئے کہا لیکن اس نے کوئی دھیان نہیں دیا۔

”انہیں تم نے میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اکیلی جاؤ گی تو پھوپھو کو کیا جواب دو گی۔ آج چھٹی کا دن ہے۔ وہ گھر پر ہی
 اصرار ہے اسے اسے غصے سے خائف کرنا چاہا تو یہ ایک دم رک کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”اچا مجھے جان سے مار دیں۔ میں اکیلی ہی جاؤں گی۔“
 ”بے جاؤ اور۔“ احمر نے وارننگ کے انداز میں انگلی اٹھائی تھی پھر ایک دم ہونٹ بھیج گیا تو وہ سر جھٹک کر

”دی اور جیسے ہی خالی رکشہ نظر آیا اس میں بیٹھ گئی۔
 پچھ در وہیں رک کر جاتے ہوئے رکشہ کو دیکھتا رہا پھر اپنی بائیک اس کے پیچھے لگادی اور تمام راستہ اپنے
 منہا مارا کہ وہ کیوں اسے آسے کے عتاب سے بچانا چاہتا ہے۔

”کے سامنے مدحو جیسے ہی رکشہ سے اتری احمرائیک اس کے قریب لے آیا اور جیب سے والٹ نکالتا ہوا

”اندراجاؤ۔“ وہ چند قدم پیچھے ہٹ گئی لیکن اندر نہیں گئی تو احمر نے پہلے رکشہ فارغ کیا پھر اسے دیکھ کر
 ”طرے بولا۔

”بڑیوں رہی ہو، جا کر تار پھوپھو کو اپنا کارنامہ بہت طرم خان بنتی ہوناں، کسی دن میرے ہی ہاتھوں سے
 دیاؤ گی۔ بخدا پھوپھو کا خیال کرتا ہوں ورنہ۔“ وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے گیٹ دھکیلتی ہوئی اندر

”رہدی اور جانے کے لیے تیزی سے صحن عبور کر کے برآمدے تک آئی تھی کہ عمر راستے میں آگیا۔
 ”رے یہ آندھی طوفان کی طرح کہاں جا رہی ہو۔ میں یہاں کب سے تمہارے انتظار میں آ نکھیں

”بڑے لگائے بیٹھا ہوں اور وہ پرس آف میز کہاں ہیں۔“
 ”کی آف میز پکڑنا تنکے کی بائیک واپس کریں گے پھر آئیں گے۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہہ کر سر جھٹکا۔

”اٹھاتے ہوئے بھائی نے تمہاری موجودگی میں کسی اور کو لفٹ کرا دی ہے جب ہی تمہارا موڈ۔“
 ”ہمت۔“ وہ عمر کو دھکا دے کر میز پر بھٹا نفی اور آئی تو سامنے آسے کو کچھ کر قدرے جھجک گئی۔ گو کہ اس

”نت سے ہی احمر اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا پھر بھی وہ اپنے آپ میں سمٹ سی گئی اور آسے نے محسوس
 ”شام تھا“ اس کی طرف سے دھیان ہٹایا تھا کہ وہ فوراً ”اپنے کمرے میں داخل ہو گئی اور بیڈ پر گر گئی ہوئی

”بے سے بولی۔
 ”میں آئیں گے ماما سے پوچھ لیتے ہیں۔“
 ”پوچھ لیتے ہیں۔“ ”صاحت نے اس کی خود کلامی سن کر پوچھا تو اس نے چونک کر آواز کی سمت گردن موڑی
 ”نہاں اتری کرستے دیکھ کر بولی۔
 ”میں تم سے تو کچھ نہیں کہا۔“

”میرے علاوہ اور کون ہے یہاں“ اچھا سمجھ گئی اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو۔“

صباحت شرارت سے ہنسی اور اس کے خاموش رہنے پر استری کا پلگ نکالتے ہوئے بولی۔ ”مورڈر
مداخلت نہیں کروں گی۔ تم اپنا شغل جاری رکھو، میں جارہی ہوں۔“
”سنو!“ اس نے اچانک کسی خیال کے تحت صباحت کو پکار لیا۔ ”کیا واقعی احرامی ہفتے جارہے ہیں؟“
”ہاں کیوں؟“ صباحت سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”بس پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے جیسے۔“ وہ اپنے ہی خیال میں گم رہ کر جانے کیا کہتے ہوئے خاموش
کچھ دیر رک کر صباحت اس کے پاس آئی تھی اور دھیرے سے اس کا کندھا ہلا کر بولی۔
”تم کچھ زیادہ محسوس کر رہی ہو مدحو، کوئی بہت لمبے عرصے کے لیے تو نہیں جارہے احمر بھائی جلدی
گے۔“

”آں ہاں۔“ اس نے چونک کر خود کو سنبھالا پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ ”چلو ماما اکیلی پتا نہیں ہمارے بارہ
سوچ رہی ہوں گی۔“
”یہی کہ تم مجھے احمر بھائی کی شہادت میں گزرے لمحات کی روداد سنارہی ہوگی۔ ویسے کہاں لے گئے
تمہیں۔؟“

”مداخل پر لیکن پتا نہیں کیوں آج مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگا اور میں نے احمر کو ناراض بھی کر دیا۔ لیکن
میرا کوئی قصور نہیں ہے وہ بایک اتنی اسپڈ سے چلا رہے تھے کہ مجھے غصہ آگیا اور واپسی میں میں۔“
پکارنے سے اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔

پھر چند دن بڑی افرا تفری میں گزرے، جس شام احمر کو جانا تھا اس روز صبح ہی سے گھر میں چل پل شروع
تھی۔ یاسمین، ثمرہ اور روبی کے ساتھ آگئی اور بڑے بھیا بھی آفس جاتے ہوئے اپنے بال بچوں کو احمر کو
تھے اور کسی کام میں ہاتھ بٹانے کے بجائے سب کزنز احمر اور مدحیہ کو پیچھے نہیں لگے ہوئے تھے۔ جس
جتنا محفوظ ہو رہا تھا مدحیہ اتنی ہی بوکھلائی جارہی تھی۔ کیونکہ بہت کوشش کے باوجود وہ ہمیشہ کی طرح کسی کو
جواب نہیں دے پا رہی تھی اور جب عمر حد سے بڑھنے لگا تب وہ سب کے درمیان سے نکل کر اور آگئی تھی
سب کے بلانے پر بھی نہیں لگی۔ احمر جانتا تھا کہ وہ مذاق میں کسی بات کو بھی ضد نہ بنا لیتی ہے۔ اس لیے وقت
وہ خود ہی اس کے پاس آگیا تھا۔

”میں جانتا ہوں، تم یہاں کیوں آگئیں۔ اس لیے ناں کہ۔“ شریر مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے احمر
کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا تو وہ گھبرا کر بولی۔
”اف“ ماما آ رہی ہیں۔“

”تو جلدی سے مسکرا کر خدا حافظ کہہ دو ورنہ جب تک کوئی بلانے نہیں آئے گا میں اسی طرح کھڑا
گا۔“ احمر نے کہا تو مسکرانے کی کوشش میں اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا جسے چھپانے کے لیے اس نے
چاہا تھا کہ وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔

”خدا حافظ۔“ پھر آہستہ سے اسے چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا تو وہ گم صم کھڑی رہی پھر ایسے ہی عالم غم
دھیرے چلتی ہوئی میسر پر آکر بیٹھنے لگی۔ سب بڑے ہی احمر کو چھوڑنے جارہے تھے باقی کزنز کیسے
تھے سب سے مل کر جب وہ گاڑی میں بیٹھنے لگا تب سراوچا کر کے اسے دیکھ کر مسکرایا تو ذرا سا ہاتھ
ساتھ اس کے ہونٹوں نے بے آواز جیش کی تھی۔

”خدا حافظ۔“
چند لمحوں میں آگے پیچھے تینوں گاڑیاں روانہ ہو گئیں تو اس کی آنکھوں کے سامنے وہند چھا گئی تھی۔
کچھ دیر پہلے کا شور، ہنگامہ اور ساری افرا تفری ختم ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے کمرے میں آکر
کردی۔ پھر کھڑکی سے پردے سمیت رہی تھی کہ صباحت کے ساتھ ثمرہ اور روبی آگئیں۔ جنہیں دیکھ

سراوچا پھر صباحت کو مخاطب کر کے پوچھنے لگی۔

”سہما ایمرورٹ گئی ہیں یا ٹیکنک۔“
”ایمرورٹ پھر کمرے میں بیٹھیں وہیں سے کھینک چلی جائیں گی۔“ صباحت جواب دے کر واش روم میں چلی گئی۔
”میں نہیں گئیں احمر بھائی کو کسی آف کرنے نہیں تو ساتھ جانے سے کوئی منع نہ کرتا۔“ منو نے پوچھا تو
اسے کندھے اچکا کر بولی۔

”جی ہاں۔“
”جی ہاں نے بھی اصرار نہیں کیا۔؟“ روبی کو جانے کیوں حیرت ہو رہی تھی۔
”جی ہاں نہیں جب دیکھا کہ لڑکیوں میں سے کوئی بھی نہیں جارہا تب انہوں نے مجھ پر چھوڑ دیا اور ظاہر ہے میں
جی ہاں لے جانے پر اصرار نہیں کیا۔“ وہ سرسری انداز میں کہہ کر مسکرائی تب ہی صباحت واش روم سے
ہوئے بولی۔

”میرا خیال ہے چائے کے لیے پوا سے کسے کی زحمت بھی کسی نے نہیں کی ہوگی۔“
”ذرا ہی زحمت تم کرو۔“ باقی پینے کی زحمت ہم کر لیں گے۔“ مدحیہ نے فوراً ”تکیے سے کمر ہٹا کر ٹانگیں
پھینکیں تو محو ہستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔
”ارے نہیں تم بیٹھو، میں جارہی ہوں۔“ صباحت ثمرہ کو بٹھا کر کمرے سے نکلی تھی کہ فون کی بیل پر وہیں سے
پکار کر جانے کا کہا پھر بڑھ کر ریسیور اٹھالیا تھا۔

”صباحت شاو کیسی ہیں آپ۔؟“ اوھر سے مست دلکش لہجے میں پوچھا گیا۔
”فون، علی جاگیر۔“ اس نے بے حد گھبرا کر اپنے پیچھے دیکھا پھر آواز دبا کر بولی۔ ”آپ کو میرا نمبر کہاں سے
؟“

”میں ایک عزیز سے جو اتفاق سے آپ کی ماما پشٹ ہے۔“ علی جاگیر کی آواز تارہی تھی جیسے اسے غصے
بال کر وہ محفوظ ہو رہا ہے۔
”ماما پشٹ لیکن ماما۔“

”پشٹس کو نہیں دیتیں، یہی ناں۔“ وہ فوراً بولا تھا۔
”مجھے نہیں پتا۔“ وہ اس بحث سے وامن بچا کر قدرے منت سے بولی۔ ”آپ پلیز آئندہ یہاں فون نہیں کیجئے
؟“

”بڑا کہاں کروں۔؟“ وہ غالباً ”موڈ میں تھا۔“
”یاد طلب ہے آپ کا۔؟“ وہ بدشکل اپنی آواز پر قابو پا کر ناگواری سے بولی۔ جسے محسوس کر کے وہ ایک دم شرمیلہ
ہوئی۔

”میں کچھ غلط کہہ گیا۔ آپ خفا تو نہیں ہیں۔؟“
”فون بند کریں۔“ پھر کسی وقت میں خود آپ کو رنگ کروں گی۔“ ثمرہ کے پکارنے پر وہ جلدی سے بولی تو اس
کی فوراً پوچھا۔
”بڑا نمبر ہے ناں آپ کے پاس۔؟“

”کیسے نہیں انتظار کروں گا۔“ اوھر سے سلسلہ منقطع ہوا تو اس نے بے تحاشا دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ کر گہری
”جی پھر ریسیور رکھ کر کمرے کا رخ کیا تھا۔“



بیت ہے کیا پھر بدحو اور عمر میں کوئی تکرار شروع ہو گئی ہے۔
 میں بچے چلو۔ شکیل پچا آئے ہیں۔ سمیعہ آپ کی شادی ہے۔“ تو یہ نے خوش ہو کر بتایا تو وہ بھی خوش ہو

بے شادی؟
 پچھلے توتا جے گاں۔ میں تو صرف شادی کا سن کر بھاگی آئی ہوں۔“ تو یہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔
 ہاں ہوں ایک منٹ روکو میں دوپٹہ چینیج کر لوں یہ کچھ میلا ہو رہا ہے۔“ وہ کہتی ہوئی ہاتھ پھڑا کر اپنے
 میں بھاگ گئی اور چند لمحوں میں دوپٹہ بدل کر تو یہ کے ساتھ نیچے آئی تو شکیل مدحیہ سے اس کا پوچھ رہا ہے

اے بی بی! سلام علیکم۔“ وہ مسکراتی ہوئی ان کے قریب جا کر جھک گئی تو وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر

نہر السلام کیسی ہو بی بی؟
 کلی ٹھیک آپ اکیلے آئے ہیں مای جی نہیں آئیں؟“ اس نے اماں جی کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
 میں بی بی! نہیں کام بہت تھ۔ بس اب آپ سب وہیں چل کر ان سے مل لیتا۔“
 کیا ہے جواب دے کر اماں جی کی طرف متوجہ ہو گئے۔“ اماں جی آپ اور اماں جی تو میرے ساتھ ہی چلیں گے
 دیکھ لیتا ہوں باقی سب اپنی سہولت دیکھ کر آجائیں گے۔“

اب اماں جی نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا تھا کہ مدحیہ بول پڑی۔
 مای جی آپ کے ساتھ چلوں گی اماں جی۔“
 ہاں تم اتنا تھکا کر کیا کرو گی؟“ عمر کے نوکنے پر وہ چڑ کر بولی۔
 میں کیا۔“

اب پہلے تم دونوں لڑو پھر کوئی بات ہوگی۔“ اماں جی نے کہا تو شکیل تعجب سے پوچھنے لگے۔
 مای جی لڑتے ہیں۔“

صرف یہ دونوں پچا جان! اور کوئی نہیں۔“ تو یہ فوراً بولی تھی۔
 بلکہ اس کی طرف سے ہوتی ہے ماموں جی! یہ ہر بات میں اپنی ٹانگ اڑانا ضروری سمجھتا ہے۔ ابھی دیکھ لیں
 ٹاس سے تو کچھ نہیں کہا تھا۔“ مدحیہ نے بھی فوراً اپنی صفائی پیش کر کے الزام عمر کے سر رکھ دیا۔
 بھائیں ٹھیک ہے۔ اب تم سب جاؤ۔ اپنے کام کرو۔ ہمیں بات کرنے دو۔“ اماں جی نے کہا تو صباحت
 انکار کرتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

نہا کی اہقانہ باتیں کیوں کرتی ہو۔“ اوپر آتے ہی صباحت مدحیہ کو ٹوکتے ہوئے کہنے لگی۔ جب ماموں جی
 بے تحاشہ کہ وہ اماں جی اور اماں جی کی فکٹیں لیتے ہوئے آئے ہیں پھر تم نے اپنے ساتھ جانے کی بات کیوں

میں کیا میری فکٹ ان کے ساتھ نہیں ہو سکتی؟“ مدحیہ نے تنک کر کہا۔
 بات فکٹ کی نہیں ہے مدحیہ تمہیں پہلے ماما سے پوچھنا چاہیے۔ پتا نہیں وہ کیا پروگرام بناتی ہیں۔“ صباحت
 بیٹی سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ہنوز اسی انداز میں بولی۔

نہا پروگرام مجھے پتا ہے۔ صرف تین دن کا ہو گا اور میں اتنے کم دنوں کے لیے نہیں جاؤں گی۔“
 نہاں مرضی۔“ صباحت نے یوں کندھے اچکائے کہ اس سے الجھنا فضول تھا۔
 مدحیہ شاید الجھنے کے موڈ میں تھی اس سے تو نہیں رات میں جیسے ہی آئیہ نے نیل کے سامنے ذکر چھیڑ

ایک منٹ۔“ اس نے نوک کر بیٹھے دیکھا۔ تو یہ کی آواز آ رہی تھی شاید وہ اس کے بارے میں
 تھی۔ تب وہ جلدی سے اسے مخاطب کر کے بولی۔
 سنیں علی! میں پھر بات کروں گی۔“
 ”اوکے“ خدا حافظ۔“ علی جہانگیر نے سمجھ کر کہا تو وہ آہستہ سے ریسیور رکھ کر باہر نکل آئی اور عقبہ
 کندھوں سے تھام کر اپنی طرف گھٹائی ہوئی پوچھنے لگی۔

جب دل بے اختیار ہو جائے تو ساری احتیاطیں دھری رہ جاتی ہیں اور صباحت شاہ جتنی محتاط
 راستے رچنا نہیں چاہتی تھی وہی سامنے نہ کیا تھا۔ پھر بھی اس پر قدم رکھنے سے پہلے اس نے اسے
 کی بہت کوشش کی، لیکن ایسے عالم میں دل کیسے ہر بات کا جواب پہلے سے موجود ہو سکتا ہے اور پھر
 کوری زمین پر چاہت کے قطرے نہکانے والا کوئی عام شخص بھی تو نہیں تھا وہ اگر اب تک اس سے
 تھی تو صرف آئیہ کے خوف سے جو ابھی بھی موجود تھا۔ لیکن علی جہانگیر کی سحر انگیز شخصیت کے ساتھ
 کی عجائباں اس پر حاوی ہو گئی تھیں۔ جب ہی تو دل سارے اندیشوں کے جواز گھڑ رہا تھا۔
 ”ضروری تو نہیں جو کچھ ماما کے ساتھ ہوا میرے ساتھ بھی ہو۔“

”وہ اگر شاہ سکندر کی طرح فراڈ ہوتا تو پہلے ہی مقام پر مجھے پر پوزیوں کرتا۔“
 عجیب موڈ آ گیا تھا جہاں سارے موسم ایک ساتھ اترتے ہیں اور صباحت شاہ نے بار بار اس کا
 رکھتے ہوئے بھی دل کو یہ یاد رکھا تھا کہ اس کے بارے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کا اختیار صرف
 دو صورتوں میں دل کو اس کا فیصلہ ماننا ہو گا۔ اور یہی بات علی جہانگیر سے کہنے کے لیے اس نے اس
 کرتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی تھی۔ ساڑھے پانچ ہو رہے تھے۔

”پتا نہیں وہ گھر پر ہو گا کہ نہیں؟“ اس نے سوچا تھا کہ اوہر دوری تیل پر ریسیور اٹھنے کے ساتھ ان
 سنائی دی۔

”نیل، علی جہانگیر! اسپیکنگ۔“
 ”جی میں ہوں صباحت۔“ اگرچہ اس نے بہت سنبھل کر کہا پھر بھی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔
 ”کیسی ہیں صباحت؟ میں ابھی آپ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“ علی جہانگیر کو جیسے اچانک سے
 مل گئی تھی۔

”کیا کیا سوچ رہے تھے؟“
 ”میری کہ پتا نہیں آپ کتنا انتظار کروائیں گی۔“ علی جہانگیر نے کہا تو اس نے بے اختیار پوچھا تھا۔
 ”آپ کتنا انتظار کر سکتے تھے؟“

”میں نے فضول سا جملہ ہرگز نہیں کہوں گا کہ زندگی کی آخری سانسوں تک۔ پتا نہیں زندگی کتنی ہے۔“
 کل نہیں۔ ویسے آپ کیا سنا چاہتی ہیں؟“
 ”کچھ نہیں میں نے تو بس یوں ہی پوچھ لیا تھا۔“ وہ قدرے سٹپٹ گئی تھی۔
 ”چلیں اور بھی جو کچھ پوچھنا ہے تو نیلی پوچھ لیں۔“ اس کی ذرا سی ہنسی کی آواز سن کر وہ خاموش ہو گئی۔
 توقف سے اس نے کریڈل پر ہاتھ مار کر پکارا۔

”ہیلو صباحت! آپ خاموش کیوں ہو گئیں؟“
 ”وہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ سے کیسے کہوں۔“ اس کے سوچتے ہوئے انداز پر وہ فوراً
 ”کوئی خاص بات ہے یا کوئی پر اہم۔“

”میرے لیے تو خاص بات ہے۔ اب پتا نہیں آپ اس کو اہمیت دیتے ہیں کہ نہیں۔“
 ”صباحت شاہ! وہ بہت سنجیدہ لمحے میں گویا ہوا تھا۔“ آپ کی عام بات بھی میرے لیے خصوصی اہم
 ہوگی۔“ ابھی ایسا گمان بھی نہیں کیجیے گا کہ میں۔“

”ایک منٹ۔“ اس نے نوک کر بیٹھے دیکھا۔ تو یہ کی آواز آ رہی تھی شاید وہ اس کے بارے میں
 تھی۔ تب وہ جلدی سے اسے مخاطب کر کے بولی۔
 ”سنیں علی! میں پھر بات کروں گی۔“

”اوکے“ خدا حافظ۔“ علی جہانگیر نے سمجھ کر کہا تو وہ آہستہ سے ریسیور رکھ کر باہر نکل آئی اور عقبہ
 کندھوں سے تھام کر اپنی طرف گھٹائی ہوئی پوچھنے لگی۔

اسے یوں دیکھا جیسے وہ بھول رہی ہو لیکن جواب میں اس نے آسیدہ کو یاد دلایا۔
 ”یہ تو آپ کو اس وقت سوچنا چاہیے تھا جب میں نے آپ سے چھٹیوں میں کہا تھا۔“
 ”میری سمجھ میں نہیں آتا، تم اسلام آباد میں اتنے دن کیوں رہنا چاہتی ہو۔“ تمہاری سیدہ سے کوئی
 نہیں ہے اور اگر گھونٹے پھرنے کا شوق ہے تو وہ بھی دو دن میں پورا ہو سکتا ہے۔“ آسیدہ اس کی بے کار فر
 آکر بولی تھی۔

”مجھے صرف اسلام آباد نہیں گھومنا مری، سوات اور۔۔۔“
 ”یہاں اور وہاں اسلام آباد میں بھی کوئی اتنا فارغ نہیں ہے جو تمہیں گھما تا پھرنا ہے۔“ آسیدہ نے
 قدرے ناگواری سے کہنے لگی تمہیں یہ فضول بات کہنے سے پہلے سوچنا چاہیے کہ میں نے تمہیں چڑ
 کیوں نہیں بھیجا۔ اس لیے کہ میں پسند نہیں کرتی۔ میں اس شہر میں تمہارے بڑے ماموں اور عہد
 ہیں بھی ان کے ہاں میں نے تمہیں ایک رات رہنے کی اجازت دی ہے؟ تم میرے ساتھ جاؤ گی اور میر
 ہی ہو گی، سمجھیں۔“
 ”جی!“ مدیہ نے بہت جزبز ہو کر سر جھکایا تھا۔

♥-♥-♥
 چھٹی کا دن تھا۔ خلاف معمول آدھا دن علی جمائیکر نے سو کر گزارا۔ جس سے اس کی طبیعت بوج
 تھی۔ شاور لینے کے بعد بھی سربھاری تھا۔ وہ کرم وین سے چائے کا کمرہ کر لاؤنج میں آ بیٹھا اور لیڈی آ
 چیل بدل بدل کر دیکھنے لگا، کسی چیمبل پر کوئی ایسا پروگرام نہیں تھا جسے دیکھ کر ذہن فریش ہوتا جس پر
 اس نے لیڈی بند کر دیا پھر اٹھ کر ریک میں کوئی اچھی کیسٹ تلاش کر رہا تھا کہ شاہ جمائیکر بیوی اور بیٹی
 ساتھ آگے جنہیں دیکھ کر وہ خوش ہونے کے ساتھ حیران بھی ہوا۔ ماں باپ سے ملنے کے بعد راجہ کی طرف
 ہوا تو شرارت سے بولا۔

”شاپنگ کرنے آئی ہو گی ناں۔ تمہارا دل نہیں بھرتا۔“
 ”نہیں اور اب تو روز شاپنگ ہو گی کیونکہ اب ہم نہیں رہیں گے آپ کے ساتھ۔“ راجہ نے کہا تو وہ
 کو دیکھنے لگا۔
 ”ہاں بابا جان نے بھیجا ہے ہمیں تمہاری شادی کے سلسلے میں۔“ عارفہ بیگم تصدیق کرتے ہوئے ہنسا
 بولیں۔ ”وہ جو یہاں تم نے لڑکی پسند کی ہے اس کے ساتھ۔“
 ”او فوہ! یہ باتیں آرام سے بیٹھ کر کرنے کی ہیں۔ تم آتے ہی شروع ہو گئیں۔“ شاہ جمائیکر نے قدرے
 بیوی کو ٹوکا پھر اس سے بولے۔ ”علی بیٹا کوئی چاہے کپانی۔“
 ”جی! آپ آرام سے بیٹھیں بلکہ ادھر بیڈ روم میں چلیں، میں وہیں چائے بھجواتا ہوں۔“ اس
 جمائیکر کو بیڈ روم میں بھیج کر کرم دین کو پکارا اور اس سے انتظار چائے کا کہنے کے بعد عارفہ بیگم کہا
 ہوئے بولا۔

”تو آپ کو بابا جان نے بھیجا ہے۔“
 ”ہاں اور بڑی ٹائیدیں کی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، اس ڈاکٹر نے کہا کہ میں نے گھر میں گئے نہیں
 اس کی بیٹی کے لیے اتنے بے چین ہو رہے ہیں۔ پھر بیٹا بھی میرا ماں۔ میں۔ یوں بھائی۔“ بھی تو لڑکے؟
 میں سے کسی کے ساتھ کیوں نہیں بیاہ لے جاتے اسے۔“ عارفہ بیگم نے سخت سے کہا تو وہ خاصا جزبز ہوا۔
 ”لا حول ولا قوہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ بابا جان کوئی زبردستی تو نہیں کر رہے۔ صباحت پہلے میری
 اس کے بعد بابا جان کو اس کے بارے میں معلوم ہوا تو فوراً اس سے میری شادی پر تیار ہو گئے ورنہ شاید
 چچا سکندر کی طرح ایک جنگ لڑتی رہتی۔“
 ”ہو نہ۔۔۔“ عارفہ بیگم سر جھٹک کر رہ گئیں۔

”ہاں اور بڑی ٹائیدیں کی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، اس ڈاکٹر نے کہا کہ میں نے گھر میں گئے نہیں
 اس کی بیٹی کے لیے اتنے بے چین ہو رہے ہیں۔ پھر بیٹا بھی میرا ماں۔ میں۔ یوں بھائی۔“ بھی تو لڑکے؟
 میں سے کسی کے ساتھ کیوں نہیں بیاہ لے جاتے اسے۔“ عارفہ بیگم نے سخت سے کہا تو وہ خاصا جزبز ہوا۔
 ”لا حول ولا قوہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ بابا جان کوئی زبردستی تو نہیں کر رہے۔ صباحت پہلے میری
 اس کے بعد بابا جان کو اس کے بارے میں معلوم ہوا تو فوراً اس سے میری شادی پر تیار ہو گئے ورنہ شاید
 چچا سکندر کی طرح ایک جنگ لڑتی رہتی۔“
 ”ہو نہ۔۔۔“ عارفہ بیگم سر جھٹک کر رہ گئیں۔

تھا۔

راجہ فوراً اٹھی اور ٹیلی فون سیٹ لا کر اس کے قریب رکھ دیا۔ تو چند لمحے توقف سے اس نے ریسیور راجہ کو تھما دیا پھر نمبر ڈائل کرنے کے بعد پوری توجہ سے اسے دیکھنے لگا تھا۔
”ہیلو السلام علیکم۔“
”صباحت ہے!“

”جی میں اس کی دوست ہوں راجہ۔“ پھر ہاتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر اسے دیکھ کر شریر مسکراہٹ کے ساتھ ”آری ہے۔“

”لاؤ مجھے دو۔“ اس نے فوراً ریسیور جھپٹ کر کان سے لگایا تو دوسرے صبحات پوچھ رہی تھی۔
”ہیلو کون؟“

”میں ہوں علی۔“ اس نے بڑے آرام سے سامنے نیل پر یوں ٹانگیں سیدھی کیں جیسے اب اس۔
”گفتگو ہوگی۔“

”میرے خدا! آپ نے میرا مطلب ہے میرے بھائی سے آپ نے۔“ صبحات گھبراہٹ میں ٹھیک۔
”بھی نہیں پاری تھی۔“

”ریلیکس صبحات! آپ کے بھائی سے میری سسٹر نے بات کی تھی۔“ اس نے سمجھ کر اطمینان دلایا۔
”لگا۔“ اصل میں میری سسٹر بہت دنوں سے کہہ رہی تھی کہ آپ سے ملاقات کرادوں اور میرے مسئلہ کا

اس وقت ناراض ہو گئی تو میں نے سوچا آپ سے بات کرا رہی ہوں۔ اگر آپ خود کو مشکل میں محسوس کر رہے ہیں تو ہند کر دیتا ہوں۔“

”نہیں! ایسی کوئی بات نہیں۔ ویسے میں خود آپ کو رنگ کرنے والی تھی یہ بتانے کے لیے کہ میں اسلام رہی ہوں اپنی کزن کی شادی میں۔“

”چھانٹو میں گی کب؟“ اس نے فوراً پوچھا۔
”میرا خیال ہے تین چار دنوں میں واپسی بھی ہو جائے گی۔“ اس کے جواب پر وہ مطمئن سا ہو کر بولا۔

”اچھی بات ہے اور یہ میری سسٹر سے ذرا ہیلو ہائے کر لیں تاکہ اس کی ناراضگی دور ہو۔“ اس کے ماں نے ریسیور راجہ کو تھما دیا۔

”جی! میرا نام راجہ ہے۔ ابھی دو مہینے پہلے بی اے کا امتحان دیا ہے۔“
”یہاں نہیں وہی میں ہم لوگ عرصہ دراز سے وہیں مقیم تھے۔ بلکہ میرے فادر تو ابھی بھی وہیں ہیں۔ آپ

بھائی نے نہیں بتایا؟“
راجہ سکھایا ہوا سبق اتنی سہولت سے دہرا رہی تھی کہ وہ بھی حیران ہو کر سن رہا تھا۔

♥♥♥

صبحات سوٹ کیس بند کر رہی تھی کہ مدیہ روک کر بولی۔
”ٹیک منٹ پہلے مجھے دیکھنے دو۔ میرے کون کون سے سوٹ رکھے ہیں؟“

”اوہ! اب تم ساری اپنی خراب کرگوئی کوئی ضرورت نہیں اسے کھولنے کی تمہارے وہ سارے سوٹ ہیں جو تم نے کئے تھے۔“ صبحات اس کا ہاتھ جھٹک کر سوٹ کیس لاک کرنے لگی۔ لیکن اس نے پھرتی سے

جھپٹ لی۔
”خدا کے لیے مدحو! صبح سے اسڑی کر کر کے میری کمرانگنی ہے۔“

”تو میں کون سا ایک ایک کپڑا نکال کر دیکھوں گی۔“ مدیہ سوٹ کیس کھولنے ہوئے بولی۔ پھر اس پر جہ اپنے کپڑوں کا جائزہ لے رہی تھی کہ عمار اسے پکارا ہوا آگیا۔
”مدحو! کہاں ہو مدحو؟“

”کیا ہے؟“ اس نے سوٹ کیس میں سے سر نکال کر اسے دیکھا۔

”یہی ہے اچھی سی چائے پلاؤ وہ بھی اپنے ہاتھ کی تباہیوں گا گیا ہے۔“ عمر نے کرسی پر بیٹھ کر سامنے بند پر

”بھلا میں جیسے واقعی اس کے حکم کی تعمیل ہوگی۔“
”تباہیوں کچھ کوئی شوق نہیں ہے سننے کا۔ کیا ہوا ہے کیا نہیں۔“ مدیہ نے حسب عادت کوئی نوٹس نہیں

”نہاڑی مرضی۔“ عمر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جیب سے لفافہ نکال کر لہراتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کوئی بڑی

”بائو نہیں کی بس ایک کپ چائے۔“
”مدیہ نے چلانے کے ساتھ لفافہ جھپٹنے کی کوشش کی لیکن عمر نے پھرتی سے ہاتھ پیچھے کر

”نہیں کیا۔“
”بھلا اگر میرا ہے تو فوراً مجھے دے دو ورنہ۔“ مدیہ کو دھمکی آمیز انداز پر وہ لا پرواہی سے کندھے اچکا کر

”نہاڑی ہے، لیکن ملے گا چائے کے بعد۔“
”بائو کی ایک نہیں دس کپ پہلے خدو۔“

”اے مجھے تمہارا اعتبار نہیں۔ پہلے چائے۔“ عمر کو جانے کب کب کا بدلہ لینے کا موقع مل گیا تھا۔ مزید لفافہ

”رول۔“ ”آؤ کیا خوشو ہے۔ لٹا ہے بڑے بھائی نے سارے جنزوں کو نچوڑ دیا ہے۔“
”نہ کتنے کینے ہو تم۔ میں ماموں جی سے تمہاری شکایت کر دوں گی اور آخر کو بھی لکھوں گی کہ تم مجھے بلیک میل

”ہو۔“
”ب کرگوئی لیکن چائے نہیں بناؤ گی۔ چہ چہ۔ ایک نمبر کی کام چور۔“ عمر نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے

”بڑے بھیک دیا اور جانے لگا کہ وہ پکار کر بولی۔
”نورالاجی بجے چائے بناتی ہیں۔ آکر پی لینا۔“

”ہے کمر میں تو جیسے چائے کا کال پڑا ہے۔“ عمر بری طرح تلملا گیا تھا۔
”سنو عمار! نہیں بتاؤ ہے اس کا۔ چلو تم نیل بھائی کے کمرے میں میں وہیں چائے لے کر آتی ہوں۔“

”تو جو خاموشی سے دونوں کی تکرار دیکھ اور سن رہی تھی، ہمیشہ کی طرح صورت حال کی نزاکت کا احساس کر

”کر لے کر کمرے سے نکل گئی تو مدیہ نے بیڈ پر سے لفافہ اٹھا کر بے اختیار ناک کے ساتھ لگایا اور خودی ہنس

”بہرینہ پر گر کر لفافے میں سے خط نکالا تھا۔
”کس نام سے پکاروں؟ کیا نام ہے تمہارا۔“

”کس نام سے پکارو؟ قصور نہیں، یہاں آکر میں اپنے آپ کو بھی بھول گیا ہوں نہ نہ۔ یہ مت سمجھنا کہ پڑھائی کی

”بے ملکہ حسین نظاروں اور جلووں نے میرے ہوش بھلا دیئے ہیں۔ کہاں کہاں سے اور کس کس کی طرف

”غیر پڑاؤں! اوہرنیلا سمندر ہے اوہرنیلا آنکھیں۔ میں دونوں میں فرق کھوجنے لگا ہوں۔ پھر اوپر دیکھتا

”پڑے آسمان پر صرف ایک اکیلا چاند اس کے آس پاس دور دور لکیریں کوئی ستارہ نہیں۔ شاید سارے

”سائنس پر اترا آئے ہیں۔ جب ہی تو انی جنگ لگا ہٹ ہے۔ مدحو میرا کیا ہو گا۔ اگر میں اپنے مقصد سے ہٹ گیا تو

”طرے واپس آؤں گا۔ دیکھو میرے لیے دعا کرنا۔ کرو گی ناں؟“

”طرے ساتھ اس کا دل ڈوبتا گیا تھا۔ یہ نہیں اصرار ہے کچھ لکھا تھا یا اسے ستانے کو محض مذاق۔ کچھ بھی تھا۔ وہ

”اب جس طرح حرکت پڑی رہی۔ کیونکہ کسی بھی ضدی اور خود سرسی، تھی تو بہر حال لڑکی جس کی آنکھوں

”نہاڑا مذاق نہیں کرتا چاہیے۔“ کتنی دیر بعد اس نے سب مذاق سوچ کر خود کو سہارا دینے کی کوشش کی

”نہاڑا مذاق اس میں کامیاب ہو کر خط دوبارہ لفافے میں بند کیا پھر اسے اپنی الماری میں چھپا کر گھر سے اٹھی

پتہ در سے مایہ جی کے پاس ہوں اور اس سے پہلے لان میں تھی۔ اماں جی نے صبا سے کہا ہو گا۔
 صبا نے کہیں تو ان کا کام ہو چکا ہوتا۔ ”آسیہ نے بیٹھے ہوئے کہا۔
 ”جہنہ ہونے کا مطلب آپ نے سمجھ لیا کہ۔“ وہ منہ پھلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے کیا سمجھ لیا بیٹا! جا کر اماں جی سے پوچھو، وہ بار بار تمہارا نام لے کر کہہ رہی ہیں کہ انہوں نے تم سے
 ہار کا کیا تھا۔ ”آسیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دھیرج سے کہا تو چادر کے ساتھ ہی اسے اماں جی کا کام یاد آ گیا لیکن
 انجان ہی بننا تھا۔

میں مایہ جی سے کہہ کر کمرے سے نکلی تو اپنی بھول پر بجائے شرمندہ
 کے ہنسی ہوئی اماں جی کی چادر تلاش کرنے لگی جسے انہوں نے استری سے سٹھانے کو کہا تھا اور اس نے
 کے مطابق جانے کس کو نے میں ڈال دی تھی۔

”ہاں ہے؟“ شعر نے اسے اپنے کمرے میں آتے ہی متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے پا کر پوچھا تو وہ بے
 ہوش ہوئی۔

”ہاں۔“
 ”بے رنگ کی؟“ شعر نے شرارت سے کہا۔

”ہاں۔“ وہ چونک کر اشعر کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”نہیں اشعر بھائی! اماں جی کی چادر۔ وہ غالباً براؤن کلر کی
 بننے دیکھی ہے۔“

”ہاں بلکہ دو روز سے رنگ پر پھیلی ہوئی دیکھ رہا ہوں۔ ابھی بھی وہیں ہوگی لیکن میرا خیال ہے ابھی تک
 نہیں ہوگی۔“

”کھانے ہی کے لیے اماں جی نے مجھے دی تھی اور میں پتا نہیں کہاں رکھ کے بھول گئی۔ خیر چھوڑیں۔“ وہ
 ہلکا سا چھوڑ کر آرام سے بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں نے سنا ہے آپ بھی باہر جا رہے ہیں۔“

”لوگ سنا ہے۔“
 ”میں میرا مطلب ہے، آپ کو تو یہاں اچھی جا ب مل گئی ہے پھر کیوں جا رہے ہیں۔“

”اچھا جا ب پر جا رہا ہوں آتش کی طرف سے ایک سال کی ٹرننگ کے لیے اس کے علاوہ وہاں کچھ اور کرنے کا
 کارا ہے میں سے اور نہ ہی ٹرننگ کے بعد وہاں مزید قیام کا خیال ہے۔“ اشعر نے بہت سیدھے ساوے انداز
 میں بات کا جواب دیا تھا۔

”تو آپ یہاں بیٹھ کر کہہ رہے ہیں ناں وہاں جاتے ہی آپ کے ارادے بدل جائیں گے۔ ایک سے دو سال
 پہلے کا احقر نے؟“ شعر نے اس کی بات کاٹی تو وہ بھی فوراً بولی تھی۔

”میں کچھ نہیں پتا۔ میں تو بس سنی سنائی کہہ رہی ہوں کہ باہر جا کر لوگ گھر یا کیا اپنے آپ کو بھی بھول جاتے
 ہیں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں لیکن تمہیں احقر پر بھروسہ ہونا چاہیے۔“ اشعر اس کا سر ہلا کر مسکرا دیا تو وہ کچھ
 ہلکی ہو کر اس کے کمرے سے نکل آئی۔

”میں لڑکیاں ڈھونڈ پینے کی تیاری کر رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی ٹوپیہ چلائی۔
 ”اؤناں مدحو۔“

”میں اچھی میں بجا لیتا ہوں۔“ ادھر سے گزرتے عمر نے رُک کر فوراً ”مداخلت کی تو مدحیہ اسے دیکھ کر
 نہ تو کوئی کون میں بیٹھنے کا شوق ہے۔“

”مدحو! تم یہاں بیٹھی ہو بیٹا! اماں جی نے تم سے کوئی کام کہا تھا۔“ آسیہ نے اسے دیکھ کر کہا۔
 ”مجھ سے۔“ اپنی طرف اشارہ کر کے اس نے سوچتے ہوئے انداز میں پوچھا پھر نفی میں سر ہلایا۔

”کیا احقر بھائی نے ہر ایک پل کا احوال لکھ بھیجا ہے۔“ صبا نے اسے دیکھتے ہی چھیڑا تو وہ بس ذرا ہنسنے
 لگی۔

”تم اگر کم مجھے تو بڑھو اور۔ دیکھو تو احقر بھائی نے اپنے جذباتوں کو کس طرح۔“
 ”جکو مت۔“ وہ فوراً ”لوگ کر بولی۔“ احقر کوئی دنیا سے نرالے تو نہیں ہیں جو ان کی تحریریں بھی انوکھی ہیں۔
 وہی باتیں جو سب لکھتے ہیں۔ انہوں نے بھی لکھی ہیں۔“

”سب کیا لکھتے ہیں، مجھے تو یہ بھی نہیں پتا۔“ صبا نے اس کی اندرونی کیفیات سے بے خبر شوخی سے باز نہ
 آئی۔

”تمہیں کیا کروں؟“ وہ چڑ گئی تھی۔ بری طرح جھڑک کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی تو صبا نے جہنہ
 کر اسے دیکھا پھر موضوع بدلنے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔

”اچھا سنو، تم نے سوٹ کیس بند کر دیا تھا یا ایسے ہی کھلا چھوڑ دیا ہے۔“
 ”پتا نہیں جا کر دیکھ لو۔“ اس نے جیسے بادل خواستہ جواب دیا تھا۔ اصل میں اب اس کا کسی بات میں دل نہ
 لگ رہا تھا۔ احقر کے خط نے حقیقتاً اسے دکھ پہنچایا تھا۔ حالانکہ وہ ایسا تو نہیں تھا۔ ایسی دل جانے والی بات

اس نے کبھی مذاق میں بھی نہیں کی تھی۔ پھر اسے کہا ہو گیا تھا۔
 ”کہیں سچ تو وہ۔“ اس کا ذہن ان ہی باتوں میں الجھ رہا تھا۔ جب ہی صبا کی مداخلت ناگوار گزر رہی تھی
 اپنے کمرے میں بند ہونے کا وقت نہیں تھا۔ کیونکہ آسیہ آنے والی تھی اور اس کے آتے ہی سب نے بادل

روانہ ہونا تھا۔
 ایک بار اس نے سوچا کہ وہ کوئی بہانہ کر کے اسلام آباد جانے سے منع کر دے لیکن اس خیال سے کہ یہاں
 پر خواہ مخواہ سب کاموڈ خراب ہو گا۔ اس نے اپنی سوچ جھٹک دی پھر احقر کی طرف سے دھیان ہٹانے کی کوشش

وہ کچھ بھگتی گئی تھی۔ اس کے بعد اسلام آباد جا کر ہی اس کاموڈ ٹھیک ہوا تھا۔ اب پتا نہیں جگہ کی تبدیلی نے
 کا دھیان بنا دیا تھا یا کوئی اور بات جس سے وہ اپنے اصل رنگ میں آ گئی تھی۔

”اللہ مایہ جی! آپ کا گھر کتنا خوب صورت ہے۔“ سارا گھر دیکھنے کے بعد وہ سیما بھائی کے پاس آئی تھی
 ”پتا ہے میں نے چھٹیوں میں ممتا سے کہا تھا کہ مجھے اور صبا کو آپ کے پاس بھیج دیں لیکن ماما ہی نہیں
 وقت آکر میں آتی تو اتنے بہت سارے دن آپ کے گھر رہتی۔ سچ مجھے تو یہاں آکر بہت اچھا لگ رہا ہے۔“

”تم ابھی بھی بہت سارے دن رہنا۔“ سیما بھائی نے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہا تو وہ مایوسی سے بولی۔
 ”اب نہیں رہ سکتی کیونکہ کالج کھلے ہیں اور اگلے مہینے سمسٹر بھی ہونے والے ہیں البتہ آپ ممتا کے

کہ وہ اس بار ہمیں چھٹیوں میں ضرور بھیجیں۔“
 ”پہلے بھی آسیہ کو منع کرنا چاہیے تھا۔ خیر اس بار میں خود تمہیں لینے آؤں گی۔“ سیما بھائی نے

خوش گردیا۔
 ”جی مایہ جی! بس جیسے ہی چھٹیاں ہوں گی میں آپ کو فون کر دوں گی اور آپ لینے آئیں گی تب تو ماما،

نہیں کر سکیں گی۔“
 ”ہوں! اصل میں آسیہ تم دونوں کے بغیر رہ نہیں سکتی۔“

”ہم دونوں نہیں، تینوں، نیل بھائی کو بھی وہ کہیں نہیں جانے دیتیں۔“ اس کے یاد دلانے پر سیما بھائی
 ساختہ مسکرائیں۔

”ہاں تم تینوں۔“
 ”اور پتا ہے مایہ جی میں۔“ آسیہ کے آنے سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

”مدحو! تم یہاں بیٹھی ہو بیٹا! اماں جی نے تم سے کوئی کام کہا تھا۔“ آسیہ نے اسے دیکھ کر کہا۔
 ”مجھ سے۔“ اپنی طرف اشارہ کر کے اس نے سوچتے ہوئے انداز میں پوچھا پھر نفی میں سر ہلایا۔

ہاتھ مارنے کے ساتھ شروع ہو گیا۔

”بہناو بہنا! تیری ڈولی میں سجاؤں گا۔“

لڑکیاں تالیاں پیٹ کر اس کا ساتھ دینے لگیں تو وہ بھی رہ نہیں سکی فوراً ”بیٹھ کر سب کے ساتھ شام کھاتی تھی۔“

♥♥♥

اگلے روز صبح رخصت ہو کر چلی گئی تو کچھ دیر رخصتی کے بعد کی فضا قائم رہی یعنی محسوس کی جانے لگی تھی۔ خواہ کتنے لوگ ہوں پھر بھی پتا چلتا ہے کہ کوئی ایک چلا گیا ہے۔ ایسے ہی ساری افزائش اچانک شام میں کپڑے بدلنے کے لیے جتنا شور اور جوش تھا۔ اب اتنی ہی خاموشی اور کالی۔ بدیہ نے کپڑے لیے لیکن اتارے ہوئے کپڑوں کو تہہ کر کے سوٹ کیس میں رکھنے کا کام صبا کے سر ڈال دیا اور اس احتجاج سے پہلے ہی کمرے سے نکل کر آئی تو آگے سیمابھائی نے چائے کی ٹرے اسے تھمادی۔

”بننا! یہ اپنے ماموں جی کے کمرے میں دے آؤ اور دیکھنا کپڑے تمہارے آکر اور لے جانا۔“

”جی اچھا! وہ ٹرے لیے خشک بھائی کے کمرے میں آگئی اور آئیہ کے سامنے نمیل پر ٹرے رکھ کر پوچھا: ”مما اور کب چائیں؟“

”چائے دو کی سب کو تو پتا چلے گا۔“ آئیہ کہہ کر بڑے بھیا کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پہلے بھائی کی بات رہی تھی۔ پتا نہیں کیا موضوع تھا اور وہ جتنا کام سے بھاگ رہی تھی اتنی پھنس گئی تھی۔ ایک ایک کپ میں ڈال کر باری باری سب کو تھما لی گئی۔ آخر میں نمیل اور اشعرہ گئے اور دھر دھر اس خالی ہو گیا تو وہ اشعرہ کو دلا۔

”آپ تو چائے نہیں پئیں گے نا۔“

”تم نہ پلانا چاہو تو اور بات ہے۔“ اشعرہ نے کہا۔ ساتھ ہی اسے چائے لانے کا اشارہ بھی کیا تو وہ اٹھ کر ہوتی تھما س لے کر کچن میں آگئی۔

”مامی جی! کپ تو کم نہیں ہوئے، چائے کم ہو گئی ہے اور اب آپ کسی اور کے ہاتھ بھجوائیں کیونکہ مجھے بلا رہی ہیں۔ وہ تھما س سیمابھائی کو تھما کر فوراً ”کچن سے نکل کر کمرے میں آگئی۔ جہاں صبا کے کپڑے جوڑے جانے لگا ہائیں کر رہی تھیں۔ دوسری طرف روٹی۔ مریم اور رجا کے ساتھ مصروف تھیں۔ عمر اور وہیں موجود تھے لیکن ان سب کی طرف ان کی پشت تھی اور کھڑی سے باہر جھانکتے ہوئے پتا نہیں کی چیز رہے تھے ادھر نی دی بھی آن تھا اور غالباً ”سب نی دی دیکھ رہے تھے، لیکن درمیان میں خبریں آجائے کہ سب کی توجہ اس سے ہٹ گئی تھی۔“

”اس بے چارے کو نہیں سنتا تو بندی کر دو۔“ وہ کہتی ہوئی نی دی بند کرنے کے ارادے سے اس کی بڑھی تھی کہ روٹی پیڑی۔

”نہیں خود! بند نہیں کرنا۔ ابھی پروگرام کا بقیہ حصہ آئے گا۔“

”کوئی خاص پروگرام آ رہا تھا؟“

اس نے بوجھ لیا لیکن روٹی پھر اپنی باتوں میں مصروف ہو گئی تھی اس لیے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ اسے اچکا کر اپنے پیچھے کے لیے جگہ دیکھنے لگی تھی کہ شاہ سکندر کے نام پر اس کی نظرس فوراً نی دی اسکرین پر کسی سینار کی جھلکیاں تھیں اور اب یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اکثر ہی خبراتے میں نہیں جھلک نظر آ جاتی تھی۔ جسے وہ اور صبا کے اگر اس کی ہو تھیں تو شوق سے دیکھتی تھیں اور سب کی موجودگی انجان بن جاتی تھی۔ اس وقت سب موجود تھے لیکن اتفاق سے کوئی بھی متوجہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ نے دیکھنے بھی لگی تھی۔ پھر جیسے ہی منظر دلا اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے سوچا۔

”شاہ سکندر! یہیں اسلام آباد میں موجود ہیں۔“

”کیا بات ہے، تم ابھی سوئیں نہیں؟“ خشک بھائی کے کمرے سے نکلتے ہوئے آئیہ نے اسے دبا۔

نی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”یہ سنا گیا رہے ہیں ماما اور میں اکیلی تو نہیں جاگ رہی، اندر سب نی دی دیکھ رہے ہیں۔“

”جتنے نہیں ہو تم لوگ۔“ آئیہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ تو وہ بونہی نکلتی ہوئی گلاس والے کے قریب آکھڑی برابر لان میں جلتے جلتے تھے رنگ برنگے قمقموں کو دیکھنے لگی، شادی کا ہنگامہ سر پر ہونے کے ساتھ جانے لگی۔

”ماما! یہاں کیا کر رہی ہو؟“ عقب سے نیل کی آواز پر اس نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا تو وہ ایک لحظہ کو ماما کے ہاتھ پر تھام کر بولی۔

”یہاں کیوں کھڑی ہو اور باقی سب لوگ کیا سو گئے؟“

نیل نی دی پر کوئی پروگرام آ رہا ہے، شاید وہی دیکھ رہے ہیں۔“ وہ جواب دے کر دوبارہ رخ موڑ گئی۔ تو ہدف سے نیل اس کے قریب آکر پوچھنے لگے۔

”ماما! اسے جھگڑا ہوا ہے؟“

”اپنے آپ سے اب خدا را مطلب مت پوچھنے کھڑے ہو جائیے گا۔“ اس کے لمحے میں اچانک تنفر آجائے محسوس کر کے نیل خاموش ہو رہے کیونکہ جانتے تھے کہ وہ بہت جلدی ضبط کا دامن چھوڑ کر جاتی ہے۔

نیل بھائی! ”کچھ دیر بعد اس نے خودی انہیں نکارا۔“ ایک بات مانیں گے۔“

”ہوں۔“ نیل بغور اسے دیکھ رہے تھے۔ سوچتے ہوئے انداز میں ہوں کی آواز نکالی تو وہ ان کی طرف متوجہ ہو کر

”وہ کر سب۔“ ٹالیں گے نہیں۔“

”بل فوراً“ کچھ نہیں کہہ سکے، کیونکہ انہیں حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے کبھی اس طرح ان کے ساتھ راز انداز میں باتیں نہیں کی تھیں نہ کبھی اپنا کوئی مسئلہ انہیں بتایا تھا۔

”یہی جگہ اگر صبا ہوئی تو آپ فوراً اس سے وعدہ کر لیتے۔ میری بات کیوں ماننے لگے آپ؟“ وہ ان کی بات مانوس ہو کر بولی۔

”میں میں تم سے بھی وعدہ کر رہا ہوں۔ بتاؤ کیا بات ہے۔“ نیل نے چونک کر فوراً ”کہا تو اس نے پہلے ادھر بھاگ کر آہستہ آواز میں جلدی جلدی بولنے لگی تھی۔

شاہ سکندر سے ملنا چاہتی ہوں۔ آپ پلیز مجھے ان کے پاس لے چلیں وہ یہیں اسلام آباد میں ہیں۔ میں لندن میں انہیں دیکھا ہے۔“

”اے کچھ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تھا۔“ یہ لڑکی ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی نہ جگہ دیکھتی تھی نہ اس کی وجہ۔ جس وقت جو بات دماغ میں سما جائے اور اسے سمجھنا بھی بہت مشکل تھا۔ وہ حقیقتاً ”انداز سے بیان ہو گئے تھے بہت مشکل خود پر قابو پا کر کہنے لگے۔

”یہ شاہ سکندر کوئی عام شخص نہیں ہیں۔ ان سے ملنے کے لیے پہلے اپنا نمبر لینا پڑے گا اور یہاں اسلام آباد میں مستقل قیام نہیں ہے، کسی تقریب میں آئے ہوں گے اور ضروری نہیں کہ اب تک یہیں موجود رہا ہو۔“

”ماما! میں آپ کی طرح مجھے ٹالیں گے۔“ وہ ناراضگی سے بولی۔

”ماما! مجھے کی کوشش کرو اور میرا یقین کرو، میں نے تم سے وعدہ کیا ہے ناں تو کراچی جا کر میں اپنی سی شکل کروں گا کہ کسی طرح تمہیں ان سے ملوا سکوں۔ بس اس وقت تم اپنے دل سے یہ خیال نکال دو۔“

”مکے مضبوط لمحے پر وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی پھر جیسے احسان کرتے ہوئے بولی۔

”بہن! میں آپ کا یقین کر رہی ہوں لیکن اگر آپ نے کراچی جا کر مجھے چکر دینے کی کوشش کی تو۔“

”توبہ کرو۔ تمہیں کون چکروے سکتا ہے۔“

نبیل نے فوراً ”کان کو ہاتھ لگایا پھر اسے سوئے کی تاکید کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے تو وہ بجائے ان کی بات عمل کرنے کے پھر گلاس وال سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ اصل میں احمد کے خط کا ایک ایک لفظ اس کے دل میں جھونکا تھا اور بہت کوشش کے بعد بس کچھ دیر کو ہی وہ اپنا دھیان ہٹا پانی اس کے بعد پھر اسے ہی سوچنے لگا۔ اس کے اندر تو بہت کچھ احساس انگیزائیاں لیے لگتا اور یہ اس کے اپنے احساسات تھے اپنی سوچ تھی اور شاید انہیں بطور بردہ فرار بھی دھونڈ رہی تھی۔

پھر اگلے روز صبح کے ولیم سے فارغ ہوتے ہی اس نے واپسی کی رٹ لگا دی۔ حالانکہ یہ سماج بھی سکون اصرار پر آسہ مزید دو تین روز قیام پر آمادہ ہو چکی تھی لیکن وہ اپنی ضد سے باز نہیں آئی اور منوا کر رہی تھی۔

♥-♥-♥

اسلام آباد سے آنے کے چوتھے روز صاحت کو فون کرنے کا موقع ملا تھا۔ مدیہ سونیا کے ساتھ ام کی بہن دوست کے ہاں گئی ہوئی تھی اور نبیل ابھی اٹھ تھے۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد وہ آکر علی جمائیکر کے گھر پہنچ گئے۔ دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے بولی۔

”کیسے ہیں آپ؟“

”صاحت!“ وہ خوشگوار سے احساس میں گھر کر بولا۔ ”آپ کیسی ہیں اور یہ آپ نے آئے میں اتنے دن دیکھے۔“

”نہیں، آٹو میں تین چار روز پہلے ہی گئی تھی لیکن خیر چھوڑیں یہ بتائیں آپ کی سسٹر کیسی ہیں؟“ وہ فوراً ہانپ گئی۔

”بالکل ٹھیک اور آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں بتائیں کیا کروں؟ اسے سیدھا آپ کے گھر لے آئے۔“

”اف نہیں۔“ وہ گھبرا کر فوراً بولی تھی۔ ”گھر آنے کی بات نہیں کریں پلیز آپ کی سسٹر اگر میری کال پر ہوتیں تب تو بات بن سکتی تھی۔“

”پھر آئی مین بات کیسے بنے گی۔ میں نے اپنی والدہ اور بہن کو دعائی سے بلایا ہی اسی مقصد کے لیے ہے کہ سلسلہ آگے بڑھے اور میری والدہ تو صبح شام مجھے ٹوکتی ہیں کہ میں کب انہیں آپ کے گھر لے کر جاؤں گا۔“

علی جمائیکر نے سنجیدگی سے کہا تو وہ مزید پریشان ہوئی اور سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے تو قدرے توقف سے کہہ کر پوچھنے لگا۔

”بیکلو صاحت! کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟“

”نہیں مجھے کچھ بتائیں۔“ وہ عاجزی سے بولی۔

”کیا بتائیں؟“

”جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ آپ کی والدہ اور بہن اس طرح کیسے آسکتی ہیں میرا مطلب بغیر کسی چارے کے ممتا تو فوراً مجھ سے پوچھیں گی تب بتائیں میں کیا کہوں گی ان سے۔“ اس نے ابھی اس سچ پر سوچا ہی تھا۔ جب ہی اتنی پریشان ہو گئی تھی۔

”اب اتنا ڈر کیوں رہی ہیں۔ پرنسپل آنا کوئی انہونی بات تو نہیں ہے۔ کوئی بھی آسکتا ہے یا آپ کی حتمی پرپانڈی لگا رکھی ہے۔“ علی جمائیکر نے دھیر سے کہا۔

”جانتا نہیں۔“ وہ جڑبڑی ہو گئی تھی۔ لہجہ بھی روٹھا ہوا تھا۔

”ارے آپ تو برامان نکلیں۔ چلے جانے دیں۔ میں خود ہی کوئی ایسی راہ نکالوں گا جس میں آپ کی بہن سے نہ پوچھیں آوے۔“ علی جمائیکر نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے اطمینان دلایا پھر کہنے لگا۔ اب آپ میری بات مان لیں اگر کوئی مشکل نہ ہو تو کل لاہور کی راہیں۔ ٹھیک سا چمچہ میں وہیں ملوں گا۔“

ٹھیک سا چمچہ کے اگر میں وہاں نہیں پہنچی تو سمجھ لیجیے گا کہ بہت چاہتے اور بہت کوشش کے باوجود نہیں آئے۔ کچھ ترنگ میں کہہ گئی پھر فوراً ”کریڈل پر ہاتھ بھی رکھ دیا۔ اس کے بعد ریسور رکھتے ہوئے وہ مسکرائی تھی۔

♥-♥-♥

روز کالج سے آتے ہی اسے شام کی فکر ہو گئی تھی۔ گو کہ لاہور کی کام پر ٹوبہ فوراً ”ساتھ چلنے کو تیار ہو لیکن اس کی موجودگی میں وہ علی جمائیکر سے بات نہیں کر سکتی تھی جبکہ عمر اسے لاہور کی تک چھوڑ کر چلا جئے پھر بعد لینے پہنچ جاتا تھا اس لیے اس نے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کیا پھر نیچے چلی آئی تاکہ کسی طرح کر سکے۔

سینئر ٹیوشن بڑھانے کس وقت جاتے ہو۔“ اس نے عمر کے میک میں جھانکتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں کہا۔ وہ بھی ایک کائیاں تھا فوراً بولا۔

”نہیں نہیں لے جاؤں گا۔“

”مطلب میں نے کہاں جانے کی بات کی ہے۔“ وہ ریک چھوڑ کر اس کی طرف گھوئی تو وہ نہیں رہا تھا۔

”ب سمجھتا ہوں میں۔ اس وقت سونا چھوڑ کے میرے پاس آنے کا مطلب ہی یہی ہے کہ تمہیں نہیں جانا ہو۔“

”تم نہیں لے جاؤ گے۔“ اس نے اس انداز سے کہا جیسے سوچ لو تمہیں بھی کام پڑیں گے۔

”ہاں کہاں ہے؟“ عمر نے بھی سمجھ کر فوراً ”ہتھیار ڈال دیے کیونکہ ضرورت کے وقت وہی اس کے کام آتی ہے۔“

”لے جاؤ گے یا نہیں۔“

”ہاں ایک تو تم۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”لے جاؤں گا۔“

”اف نہیں۔“ وہ گھبرا کر فوراً بولی تھی۔ ”گھر آنے کی بات نہیں کریں پلیز آپ کی سسٹر اگر میری کال پر ہوتیں تب تو بات بن سکتی تھی۔“

”پھر آئی مین بات کیسے بنے گی۔ میں نے اپنی والدہ اور بہن کو دعائی سے بلایا ہی اسی مقصد کے لیے ہے کہ سلسلہ آگے بڑھے اور میری والدہ تو صبح شام مجھے ٹوکتی ہیں کہ میں کب انہیں آپ کے گھر لے کر جاؤں گا۔“

علی جمائیکر نے سنجیدگی سے کہا تو وہ مزید پریشان ہوئی اور سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے تو قدرے توقف سے کہہ کر پوچھنے لگا۔

”بیکلو صاحت! کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟“

”نہیں مجھے کچھ بتائیں۔“ وہ عاجزی سے بولی۔

”کیا بتائیں؟“

”جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ آپ کی والدہ اور بہن اس طرح کیسے آسکتی ہیں میرا مطلب بغیر کسی چارے کے ممتا تو فوراً مجھ سے پوچھیں گی تب بتائیں میں کیا کہوں گی ان سے۔“ اس نے ابھی اس سچ پر سوچا ہی تھا۔ جب ہی اتنی پریشان ہو گئی تھی۔

”اب اتنا ڈر کیوں رہی ہیں۔ پرنسپل آنا کوئی انہونی بات تو نہیں ہے۔ کوئی بھی آسکتا ہے یا آپ کی حتمی پرپانڈی لگا رکھی ہے۔“ علی جمائیکر نے دھیر سے کہا۔

”جانتا نہیں۔“ وہ جڑبڑی ہو گئی تھی۔ لہجہ بھی روٹھا ہوا تھا۔

”ارے آپ تو برامان نکلیں۔ چلے جانے دیں۔ میں خود ہی کوئی ایسی راہ نکالوں گا جس میں آپ کی بہن سے نہ پوچھیں آوے۔“ علی جمائیکر نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے اطمینان دلایا پھر کہنے لگا۔ اب آپ میری بات مان لیں اگر کوئی مشکل نہ ہو تو کل لاہور کی راہیں۔ ٹھیک سا چمچہ میں وہیں ملوں گا۔“

سمجھ کر راجہ کو ٹوکتے ہوئے بولا۔
”راجہ! میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ یہ اکیلی کہیں نہیں جاتیں۔“
”ہمارے ساتھ اکیلی کہاں ہوں گی، کیوں صباحت۔“ رابعہ نے اسے مخاطب کیا تو وہ اندر ہی اندر بڑبڑاتی ہوئی۔

”آپ سمجھیں نہیں۔ اصل میں مجھے لائبریری کے علاوہ اور کہیں جانے کی اجازت نہیں ہے اور میرا بھی میں بھائی کے ساتھ آتی ہوں۔“
”چلو تم وہاں جا کر بیٹھو۔“ علی جنانگیر نے آتہا کر راجہ کو نیل کی طرف دھکیل دیا پھر اسے دیکھ کر بولا۔
اس کی باتوں کو مانڈ نہیں کیجیے گا۔“
”آپ کو بتانا چاہیے تھا کہ آپ کی سسٹر بھی ساتھ ہوں گی۔“ وہ اس کی بات ان سنی کر کے آگے بڑھتی ہوئی۔

”نکل تک ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ بس ابھی آتے ہوئے سوچا“ اسے آپ سے ملوایں دوں۔ بہت بڑی رہی تھی اگر آپ کو اس کا آنا اچھا نہیں لگا تو۔“
”نہیں یہ بات نہیں ہے۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”بس میں اچانک کسی بات کو فیس نہیں کر سکتی۔“
”چلیں آئندہ خیال رکھوں گا۔“
”تھنک یو۔“ وہ دوسری رو میں مڑ کر ریک دیکھنے لگی اور پھر جس کتاب کی طرف ہاتھ بڑھایا وہ اس ہی علی جنانگیر نے پھینچ لی اور کھول کر اوپر سے نیچے تک پورے صفحے پر نظر ڈالی پھر دھیمی آواز میں پڑھتے ہوئے کے چہرے پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔

کبھی یوں ملیں کوئی مصلحت کوئی خوف دل میں ذرا نہ ہو
مجھے اپنی کوئی خبر نہ ہو۔ مجھے اپنا کوئی پتا نہ ہو
کبھی دھوپ دے کبھی بدلیاں دل و جان سے دونوں قبول ہیں
مگر اس محل میں نہ قید کر جہاں زندگی کی ہوا نہ ہو
تیرے اختیار میں کیا نہیں۔ مجھے اس طرح سے نواز دے
یوں دعائیں میری قبول ہوں میرے لب پہ کوئی دعا نہ ہو

♥--♥--♥

عمر پھر اصرار کا خط لہراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا۔
مدیہ نے دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ پہلے وہ چائے کا مطالبہ کرے گا اس کے بعد بھی بہت عاجز کر کے خطا
گا۔ اس لیے پہلے ہی بول پڑی۔
”سنو، مجھ سے کوئی امید نہ رکھنا۔ میں چائے تو کیا تمہیں پانی بھی نہیں پلاؤں گی۔ بے شک نہ
رکھو۔“

”یعنی تمہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ عمر جھل سا ہو گیا تھا۔
”بالکل نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔
”یہ سراسر زیادتی ہے مدو کہ بڑے بھائی تو تمہیں اتنا مانتے ہیں اور تمہیں کوئی پرواہی نہیں
اجتاج کیا۔“
”تم مجھے بلک میل نہیں کر سکتے، سمجھے۔“ وہ اٹھ کر الماری کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ”خط ریتا۔
یہاں سے کیونکہ میں اس وقت کسی بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔“
”میں کوئی بحث نہیں کر رہا، بس اتنا بتا دو کہ محض چائے پلانے کے ڈر سے تم ایسا کہہ رہی ہو یا دوا

پہلی نہیں؟“ عمر ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔
”جو بھی سمجھ لو۔“ اس نے لاپرواہی سے کہہ کر الماری کھول لی اور خود کو مصروف ظاہر کرنے لگی۔
”میں کیوں سمجھ لوں۔“ مجھنے والے کہیں نہ سمجھے۔ ”عمر خط اس کی طرف پھینک کر کمرے سے نکل گیا تو اس
ڈر الماری بند کر کے اپنے پیروں کے پاس سے لفافہ اٹھایا پھر پھاگ کر عمر کو پیچھے سے پکارا۔
”سنو عمر!“

عمر نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے انداز میں لفافہ لہرا کر ہنسی ہوئی بولی۔
”غیب کیو“

عمر نے ہاتھ پھیرتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا تو اس نے دوبارہ کمرے میں آکر دروازہ بند کر لیا اور لفافے کو انٹ پلٹ
دیکھنے لگی جیسے کھونا بھی چاہتی ہو اور نہیں بھی کیونکہ گزشتہ خط سے وہ ابھی تک تپتی ہوئی تھی اور اب پتا نہیں
نے کیا لکھا تھا۔ تجسس ہونے کے باوجود اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کھول کر پڑھے۔ شاید اس لیے کہ
بہت بڑی شوق خود کو تسلیم کروایا تھا اور اب اپنی ذات کی ذرا سی نفی بھی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ کتنی دیر
ہوئے اور ادھر سے ادھر ٹھٹھنے کے بعد اس نے لفافہ چاک کیا تھا۔

”میں نے تمہارے جواب کا انتظار کیا مدو! لیکن پھر تمہاری بات یاد آئی کہ تمہیں ایک خط لکھنے میں کتنا
دیر لگے گا۔ ویسے میں نے کوئی جواب طلب بات لکھی بھی نہیں تھی۔ بس اپنی کیفیات بیان کر ڈالیں جنہیں
دیکھ کر تمہیں تمہاری کیا کیفیت ہوئی۔ تم نے میرا مذاق اڑایا یا مجھ پر غصہ آیا۔ یہ ضرور لکھنا تاکہ آئندہ میں محتاط
ہوں۔“

اور ہاں ثوبیہ نے مجھے سمیٹ کر شادی کی تصویریں بھیجی ہیں ان میں تمہاری دو تصویریں ہیں۔ دونوں میں صبا اور
ساتھ ساتھ ہو۔ اور میں تم سے یہ کہوں گا مدو کہ تم مصنوعی کے بجائے چاہے صبا کا اصلی مل نوج کر اپنے چہرے
پاؤ پھر بھی صبا نہیں بن سکتیں۔ آئندہ ایسی کوشش نہیں کرنا اور اگر تمہیں صبا بننے کا اتنا ہی شوق ہے تو۔
”ٹائی فٹ۔“ میں کیوں صبا بننے لگی۔ میسنی جی حضور کی کرنے والی۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔“
اس نے بے حد تمل کر خط پھاڑ ڈالا اور نفی دے اپنے آپ کو کھینچتی رہی پھر اس نے آپ نارمل بھی ہو گئی اور خط کے
مدیکھ کر سلیبل جیران پھر نشان سی ہو کر اس میں پوچھنے کی کوشش کرنے لگی تھی کہ دروازے پر دستک کے
صباحت کی آواز آئی۔ وہ تشویش سے پوچھ رہی تھی۔
مدو دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے۔“

اس نے جلدی سے سارے کمرے اکٹھے کر کے لفافے میں ڈالے اور لفافہ الماری میں چھپانے کے بعد
دھکوتے ہوئے بولی۔

”نڈہ ہوں، مری نہیں ہوں۔“

”میں تمہارے دشمن۔“ صباحت اندر آتے ہوئے بولی۔

”جانتی ہو۔ میرے دشمن کون ہیں؟“ اس نے قدرے شوخی سے دیکھا تو صباحت چیخ پڑی۔

”خوار جو اس گھر کے کسی فرد سے نام لیا تو۔“

”اُبلے۔“ وہ ہنستی ہوئی بیڈ پر جا گری۔ پھر کتنی کھڑی کر کے ہتھیلی پر سر نکاتی ہوئی صباحت کو متوجہ کر کے پوچھنے

”سنو، کبھی تم نے یہ خواہش کی ہے کہ تم میرے جیسی ہوتیں۔ یعنی تمہاری سوچیں، تمہاری عادات سب مجھ
جیسی۔“

صباحت نے بے اختیار نفی میں سر ہلایا تو وہ ایک دم پھر کراٹھ بیٹھی۔
”مجھے بھی ایسا کوئی شوق نہیں ہے کہ میں مدیہ کے بجائے صباحت نظر آؤں اور تمہاری طرح ہر ایک کی خوشی
لے کر پھاگ کر پیچوں۔“

”تو تم سے کس نے کہا ہے ایسا کرنے کو۔“ صباحت نے الجھ کر پوچھا۔

”کسی نے نہیں لیکن چاہتے سب یہی ہیں۔ میں جانتی ہوں۔“

”کوئی نہیں۔“ سمجھتے تو بھی کسی نے نہیں کہا۔ تم بتا نہیں کیوں اپنے آپ سب سے شامی ہو جاتی ہو۔

سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ابھی بھی نیچے تمہارا ذکر ہو رہا تھا پتا ہے، ماما جی کیا کہہ رہی تھیں کہ تم بھی وہ تمہارے جیسی لڑکی ڈھونڈیں گی۔“ صباحت کے سیدھے سادے انداز پر وہ مزید چڑھ کر بولی۔

”تم اس میری تعریف سمجھ رہی ہو۔“

”تعریف ہی کر رہی تھیں ماما جی کہ مجھے مدحو جیسی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔“

”ہونہ! اس نے نگوٹ سے سر جھٹکا تو صباحت کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر پوچھنے لگی۔

”ویسے اس وقت تمہیں کس بات کا غصہ ہے۔ نیچے تو تم کہیں نہیں پھر نیل بھائی نے کچھ کہا ہے۔“

”نیل بھائی ہوتے کہاں ہیں آج کل۔“ مجھے تو بس کھانے پر ہی نظر آتے ہیں۔“ اس نے کہا پھر پوچھ کر بولی۔

”ہوں اب سمجھی۔“ مجھ سے کترا رہے ہیں نیل بھائی۔“

”کیوں؟ تم سے کیوں کترا میں گے؟“ صباحت کو اس کا بیل بل بدلتا موڈ سمجھ میں آ رہا تھا نہ اس کی بات پر۔

”بس ہے ایک بات، تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے میں آج نیل بھائی سے نمٹ لوں۔“ وہ پہلے ہاتھ دیکھ کر بولی پھر اپنے آپ جانے کیا بڑبڑانے لگی تھی۔

علی جمالیہ بہت خاموشی سے رابعہ کی باتیں سن رہا تھا جو وہ صباحت کے بارے میں اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔

”تو پتہ چلا کہ کچھ مغرور سی لگتی ہے یا پھر میرے سامنے پوز کر رہی تھی زیادہ بات ہی نہیں کی اور ابھی مجھے ٹوک کر ایک طرف بٹھا دیا تھا ورنہ میں اس سے اس کی ماں کی عادات اور مزاج کا ضرور پتا چلتا۔“

”کیوں اس کی والدہ کے مزاج سے تمہیں کیا لینا دینا۔“ علی جمالیہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا تو رابعہ پہلے عارفہ بیگم بول پڑیں۔

”کیوں نہیں ہے؟ پہلے تو ہمارا اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ بقول بابا جان کے بڑی چالاک عورت ہے۔ تمہارے ابا کا کہنا ہے کہ بس پڑھی لکھی سمجھ دار ہے جیسے شہر کی دوسری عورتیں نظر آتی ہیں اور اس کے بھی عام ہے۔“ عارفہ بیگم کچھ ناگوار سی سے کہہ رہی تھیں کہ فون کی نیل پر خاموش ہو گئیں۔

علی جمالیہ نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف بابا جان تھے۔

”السلام علیکم بابا جان!“

”جی ابا فون آیا تھا؟“ انہوں نے امی کو ساری بات سمجھا دی ہے۔“

”میں بس ابھی لے جا رہا ہوں امی اور رابعہ کو بھی۔“

”جی جی اچھا۔“

”خدا حافظ!“ اس نے ریسیور رکھ کر گھڑی پر نظر ڈالی پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

”جلس امی، ڈاکٹر آسیہ آچلی ہوں گی۔“

عارفہ بیگم اپنی چادر سنہناتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں پھر رابعہ کے ساتھ آگے بڑھی تھیں۔

کچھ دیر بعد علی جمالیہ کی گاڑی مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی آسیہ کے کلینک کے گیٹ پر رکی تھی۔

”تم ہمیں رک کر انتظار کرو گے یا؟“ عارفہ بیگم نے اترتے ہوئے علی جمالیہ سے پوچھا۔

”اب پتا نہیں آپ کو کتنی دیر لگے۔ اگر جلدی فارغ ہو گئیں تب۔“ علی جمالیہ خود نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

کرنا چاہیے۔

”تھک ہے پھر تم ہمیں روکو۔“ عارفہ بیگم خود انتظار کی زحمت سے بچنے کے لیے اسے انتظار میں چھوڑ کر اپنے گھر کے ساتھ گیٹ میں داخل ہوئیں پھر آدے سے آگے راہداری اس کے بعد کا سڑک سے نمبر لے کر اپنے گھر کے سامنے آگئیں اور بہت تیزی سے ہر طرف کا جائزہ لینے لگیں۔ جبکہ

پوچھتی تھی۔ اس کے اندر ایک تجسس سا جاگ اٹھا تھا۔ گلاس وال سے اندر آسیہ کو دیکھ کر فوراً ”عارفہ بیگم“

لا کر سرگوشی میں بولی۔

”وہ دیکھیں ڈاکٹر؟ کیا یہی سکندر چاچا کی؟“

”عارفہ بیگم نے بری طرح اسے گھورا تو وہ بسور کر بولی۔“

”ابن ساس رہی ہیں۔“

”بھی سکتی ہے اور تم اگر چہ نہیں بیٹھ سکتیں تو جاؤ بھائی کے پاس۔“ عارفہ بیگم نے اسے مزید ڈانٹ بھی

نا بردہ خاصی ناراض سی ہو کر آبی باری کا انتظار کرنے لگی، اور کافی دیر بعد ان کی باری آئی تھی۔

عارفہ بیگم اپنے تدریجی بھانڈو جو دگے ساتھ کھڑی ہوئیں اور پھر پہلے رابعہ کو آگے کر کے اس کے پیچھے آسیہ کے

پیش داخل ہوئی تھیں۔

پہلے اپنے پیشہ ورانہ انداز میں دونوں ماں بیٹی کو دیکھتے ہوئے رابعہ کے سلام کا جواب سر کے اشارے سے

ڈھکی ڈھکی سے دینے کا اشارہ بھی کیا تو رابعہ اس کے قریب بیٹھ کر عارفہ بیگم کو یوں دیکھنے لگی جیسے اس کی

کمرے میں وہی بات کہیں گی۔

”اُسی آسیہ بھی عارفہ بیگم کی طرف متوجہ ہو گئی۔

پھر بیٹی سے کچھ کھانی پیتی نہیں ہے۔ دیکھیں، کتنی کمزور ہو رہی ہے۔“

عارفہ بیگم نے تشویش کے ساتھ کہا تو آسیہ رابعہ کو دیکھ کر ذرا سا مسکراتی پھر اس کی کھائی تمام کر اپنے

ہاتھوں میں لے کر کھانا نہیں کھاتی۔

”اب کیسے روئیں گیوں سے۔ پڑھتی نہیں ہو۔“

”بھہ لیا اس نے بی اے کا امتحان دیا ہے اور اب تو اس کی شادی کریں گے۔“ رابعہ کے بجائے عارفہ بیگم نے

جواب دیا تو آسیہ ان کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

”نوپاؤں! اسے کسی دوا کی ضرورت نہیں ہے۔ بچے جہاں پڑھائی ختم ہوئی اپنی روئیں خراب کر لیتے ہیں۔

اسے دیر تک سونے سے باز رہیں پھر یہ خود ہی سب کھائے پھینکیں اور بیٹا! آپ خود سمجھ دار ہو، آپ کو اپنی

پڑشائیں نہیں کرنا چاہیے۔“ آسیہ نے آخر میں رابعہ کو دیکھا تو وہ اٹھتی ہوئی بولی۔

”اُنی تو کس پو بھی پریشان ہو جاتی ہیں۔“

لیا کو بی ماں جو ہوں۔“ عارفہ بیگم اٹھ کر رابعہ کی جگہ پر آ بیٹھیں اور اپنی تکلیف بتانے لگیں۔

میری ٹانگوں میں بہت درد رہتا ہے۔ خاص طور سے ایڑیوں میں۔“ آسیہ نے پوری توجہ سے ان کی تکالیف

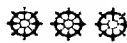
سنیں اور اٹھ کر میڈیٹیشن لکھنے سے پہلے پوچھا۔

”ہاں۔“

بیگم عارفہ جمالیہ۔“ عارفہ بیگم کے لیے میں جانے کیسا نفا خرشت آیا تھا۔

بیگم عارفہ جمالیہ۔“ آسیہ کے ذہن میں اچانک جھماکا ہوا تھا۔ چلتا ہوا قلم رک گیا اور بے اختیار انہیں دیکھ کر

نہیں نہاد پور سے آئی ہیں؟“



لیو پور کی کمال میں کراچی میں ہے؟“ عارفہ بیگم نے انتہائی معصوم بن کر پوچھا۔

آسیہ فوراً جواب نہیں دے سکی تو قدرے عارفہ بیگم خود ہی کہنے لگیں۔

”ہم تو یہاں کلیننگ روڈ پر رہتے ہیں۔ وہ بھی ابھی دو مہینے ہوئے ہیں یہاں آئے ہوئے اس سے پہلے تھے۔ میرے میاں ابھی بھی وہیں ہیں ان کا اپنا پرنس ہے۔ اب سب لوگوں سے وہاں جے ہوئے ہیں۔ آسکتے تھے۔ میں اپنے بیٹے اور اس بیٹی کی وجہ سے آئی ہوں۔ اس کی مفتی یہاں چچا کے گھر میں کی ہوئی ہے۔ کے لیے کسی اچھی لڑکی کی تلاش میں ہوں۔ مل جائے تو پھر انشاء اللہ دونوں کیساتھ شادی کروں گی۔“

آسیہ بالکل غیر ارادی طور پر ان کی باتیں سننے لگی تھی۔ جب وہ خاموش ہوئیں تو یونہی سر ہلا کر کہنے لگیں۔

”آپ یہ میڈیسن ایک ہفتہ استعمال کریں اس کے بعد میرے پاس آئیے گا۔ اگر ضرورت ہوئی تو دوں گی۔“

”میں نے دینی میں بہت علاج کرایا۔ جب تک وہ استعمال کرتی دردمیں کمی ہوتی اور جہاں وہ اچھوڑ تکلیف“ آخر کہاں تک وہ اکھاؤں تک آگئی ہوں۔“ عارفہ بیگم نے کہا۔

”اب انشاء اللہ ایسا نہیں ہو گا۔“ آسیہ نے کہہ کر نیل کا ہنر پیش کیا تو رابعہ اگلے مریض کی آمد کا اشارہ اٹھ کر بڑی ہوئی اور ماں کو بھی انھیں کا اشارہ کیا۔

”اچھا ڈاکٹر صاحبہ! میں پھر ایک ہفتہ بعد آؤں گی۔“ عارفہ بیگم اٹھتے ہوئے بولیں اور آسیہ کے متوجہ تاک سیکھتی ہوئی رابعہ کے ساتھ باہر آ گئیں۔

علی جمائیکر گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے اطمینان سے کھڑا تھا۔ انہیں آتے دیکھ کر بھی اس نے کب مظاہرہ نہیں کیا تو رابعہ نے خود ہی گاڑی کا دروازہ کھول کر پہلے عارفہ بیگم کو بٹھایا پھر دوسری طرف سے لیے فرخندہ زور کھولتے ہوئے بولی۔

”بھائی! کیا میں ڈیرا ڈالنے کا ارادہ ہے۔“

”نہیں! علی جمائیکر نے چونک کر اسے دیکھا پھر جلدی سے دروازہ کھول کر بیٹھ گیا اور بہت جلدی سے باوجود خود کو فوراً ”کچھ پوچھنے سے باز رکھ کر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی اسپید سے میں روڈ پر لے کر آیا تھا کہ عارفہ بیگم اپنے آپ بولنے لگیں۔

”تو یہ کیسی چالاک عورت ہے۔ بابا جان نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ تو شکر ہے میں پہلے سے تیار تھا۔ معاملہ ختم ہو جاگ ہے، نارابعہ؟“

”ہوں۔“ رابعہ زور زور سے اثبات میں گردن ہلانے لگی۔

”کیا کیا ہوا تھا؟“ علی جمائیکر اب رہ نہیں سکا۔ اسپید آہستہ کر کے سر میں عارفہ بیگم کو دیکھ کر پوچھ لگیں۔

”بہت تیز عورت ہے۔ میں نے جیسے ہی اپنا نام بتایا، پوچھنے لگی شاہ پور سے آئی ہیں۔ بتا دیا۔“

بات تو نہیں ہے سالوں گزر گئے۔ سکندر نے بھی کبھی اس کے سامنے میرا ذکر کیا ہو گا تو نام نہیں لیا ہو گا۔ جمائیکر بھی ایک صرف تمہارے باپ کا نام تو نہیں ہے پھر بھی وہ غصہ ٹھک گئی تھی۔

”اور آپ؟ آپ نے کیا کہا؟“ علی جمائیکر نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

”میں نے آپ کی بات کو کمال کر دیا۔“ رابعہ فوراً بول پڑی۔ خاصا پر جوش انداز تھا۔ ”حالانکہ میں لیکن امی نے اتنے سکون سے جواب دیا کہ ڈاکٹر آسیہ تو کیا اس کا۔“

علی جمائیکر نے تینبھی نظروں سے رابعہ کو دیکھا جس سے وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

”ایک ہفتہ بعد بلایا ہے۔ اب دیکھو، کتنے عرصے میں بات بنتی ہے۔ ادھر بابا جان اتنے بے صبر ہیں۔ جلدی میں معاملہ خراب ہو سکتا ہے۔ یہ بات تم بابا جان کو سمجھا دنا۔“

عارفہ بیگم کہہ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگیں۔

اٹھنے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

”خوشبو“ کھولے بڑے انتہاک سے اس پر جھکی ہوئی تھی۔

انہی رسوائی تیرے نام کا چچا دیکھوں
اک ذرا شعر کہوں اور کیا کیا دیکھوں
خند آجائے تو کیا محفلیں بپا دیکھوں
آنکھ کھل جائے تو کیا تنہائی کا صحرا دیکھوں
تو میرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جان حیات
جانے کیوں تیرے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں
بند کر کے میری آنکھیں وہ شرارت سے ہنسنے
بوچھے جانے کا میں ہر روز تماشا دیکھوں

آدھ خاموشی سے ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اسٹک کی آواز اس کے بعد وہ کرسی کھینچ کر بیٹھے لیکن وہ اتنی اسٹک کی آواز پر چونکی نہ کرسی گھسیٹنے جانے پر، نیل اسے متوجہ کرنے لگے تھے کہ پھر کسی خیال سے بت خاموشی سے اس کے ہنسنے ہوئے سر کو دیکھنے لگے۔ کتنے لمحے یوں سر کے کہ اسے نیل تو کیا شاید ن تھی۔ پھر کھٹے پلٹتے ہوئے سراوٹا کیا تو نہ صرف اچھل پڑی بلکہ بری طرح سٹپٹا بھی گئی تھی۔

”آپ آپ کب آئے؟“

”نہیں میری آمد کا پتا نہیں چلا۔“ نیل بلا ارادہ جتا گئے۔

”یہ ہی اتنی خاموشی سے۔“ اس نے بھی بے ساختہ کہا لیکن فوراً ”احساس بھی ہو گیا۔“ نہیں شاید تھی۔

”مذہبوں سے دیکھ رہا ہوں، اتنی گن ہو کہ اپنے آپ اس کی کچھ خبر ہی نہیں۔ کوئی نئی کتاب ہاتھ آگئی بات کو پرانی کتابوں میں ڈھونڈنے لگی ہو۔“ نیل نے بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں کہا اور مسکرائے

”وہ گھبرا گئی“ میرا مطلب ہے۔ نئی بات کیا ہو سکتی ہے اور کتاب بھی نئی نہیں ہے۔ یہ دیکھیں،

کی تعریف کرو۔“ نیل نے کتاب اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا تو اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں جکے کے بعد معذوری ظاہر کی۔

”مذہب محسوس کر سکتی ہوں۔“

اس کا بظاہر کتاب پر تھیں لیکن سارا دھیان اس کی طرف تھا اس کی بات سن کر کچھ بولے نہیں تو سے وہ انہیں متوجہ کر کے پوچھنے لگی۔

”ہاں جو نے آپ سے کوئی کام کیا تھا؟“

”نیل! جانے یا نہیں تھا یا قصداً انجان بن کر پوچھا تو وہ ذرا سے کندھے اچکا کر بولی۔

”وہ کہہ رہی تھی کہ آپ نے اس کا کام نہیں کیا، جب ہی اس سے کترا رہے ہیں۔“

وہ جو کام اس نے کیا ہے، وہ اتنا آسان نہیں ہے پھر بھی میں کوشش کر رہا ہوں۔“ نیل نے ناراضگی

ا ہے، مجھے بتائیں۔“ اس نے عادت کے مطابق فوراً اپنی خدمات پیش کیں۔

”نیل! کچھ کتے کتے خاموش ہو گئے پھر گہری سانس کھینچ کر بولے۔“ مذہب جلدی بدگماں

ہو جاتی ہے حالانکہ میں اپنی سی پوری کوشش کر رہا ہوں۔“
 ”کس بات کی، مجھے بھی تو بتائیں یا مدحو نے منع کیا ہے آپ کو۔“ اس نے الجھ کر کہا۔
 ”نہیں اس نے تو منع نہیں کیا۔“ نیل نے پرسوج انداز میں کہہ کر اسے دیکھا۔

”پھر آپ کیوں چھڑ رہے ہیں۔“
 ”بے وقوف! چھپا نہیں رہا بس یہ کہ تم بہت جلدی پریشان ہو جاتی ہو، اس لیے فی الحال تمہیں تیار نہ چاہتا۔“

”نہیں، میں پریشان نہیں ہوں گی۔“ وہ فوراً بولی تھی۔ ”جلدی سے بتائیں کیونکہ آپ نے مجھے تجزیہ بتا کر دیا ہے اور جب تک میں جان نہیں لوں گی مجھے چین نہیں آئے گا۔“
 ”کوئی نئی بات نہیں ہے۔ وہی اسے شاہ سکندر کے بارے میں جاننے کا دورہ پڑا ہے۔“ نیل نے بے سرسری انداز میں کہا تو وہ ناگواری سے بولی۔

”اب اور کیا جاننا چاہتی ہے وہ۔“ ممانے سب بتا دیا ہے۔“
 ”ان کا اتنا پتا تو نہیں بتایا اور وہی جاننا چاہتی ہے وہ۔“ نیل کا انداز ہنوز تھا جس پر وہ چیخ گئی۔
 ”یعنی آپ کے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہیں ہے اور مزید کوشش بھی کر رہے ہیں اتنا پتا معلوم کرنے کی اس

بعد کیا ہو گا یہ سوچا ہے آپ نے۔“
 ”نیل خاموشی سے اسے دیکھتے رہے بولے کچھ نہیں۔“
 ”نہیں نیل بھائی! آپ مدحو کا یہ کام نہیں کریں گے، اگر ماما کو معلوم ہو گیا تو انہیں بہت دکھ ہو گا اور با

ہمیشہ آپ مجھے اور مدحو کو سمجھاتے رہے ہیں کہ ہمیں ماما کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہیے پھر کیسے۔“ وہ بہت دکھ اور تاسف سے بول رہی تھی۔
 ”نیل نے ہونٹ بھیچ کر گہری سانس کو باہر آنے سے روکا تھا۔

”کچھ دن سکون سے گزرتے ہیں وہ پھر کوئی شوشہ چھوڑ دیتی ہے۔ شاید اسے سب کو پریشان کر کے موتا۔“
 ”کسین وہ چیخ تو پاگل نہیں ہے۔“ نیل کی خاموشی پر وہ اپنے آپ بولنے لگی تھی۔ ”میں ممانے کو مل کی کسی سائیکالوجسٹ کے پاس لے جائیں اور نیل بھائی آپ اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے کچھ بولنے نہیں۔“

”میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم بہت جلدی پریشان ہو جاتی ہو اور وہی دیکھ رہا ہوں۔“ نیل نے اپنی ذکاوت اڑدے ہوئے کہا۔

”تو کیا یہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔“ وہ روہانی ہو گئی۔
 ”ہاں اب روہا بھی شروع کر دو۔“ نیل کو جانے کیوں غصہ آ گیا۔ ”مدحو جیسے چلی گئی ہے ہاں شاہ سکندر اور اب تم اسے کبھی نہیں دیکھ سکو گی“ اسی بات سے ڈر کر وہ ناٹاں مٹا کر پھوپھو بھی تو ایسا کبھی نہیں ہو گا۔
 ”کی بھی تو زیادہ دن وہاں رک نہیں سکے گی۔ اس لیے کہ وہ کسی ماحول میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر سکتی۔“
 ”برعکس ماحول کو اپنی مرضی کے تابع رکھنا چاہتی ہے اور اس گھر میں تو پھر اس کی مرضی چل جاتی ہے کہ اس سب کو پھوپھو کا خیال رہتا ہے اور شاہ سکندر کے ہاں تو مالک ہی پڑ گیا ہو گا پھر پتا وہ کیسے رہے گی وہاں۔“

”آپ یعنی آپ مدحو کی فہور کر رہے ہیں۔“ وہ واقعی چکرائی تھی۔
 ”نیل نظر سچا آ کر اٹھ کھڑے ہوئے پھر کمرے کی طرف جاتے جاتے انہوں نے بے اختیار اس کے رکھا تھا۔
 ”نیل بھائی!“ اس نے عقب سے پکارا لیکن وہ ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے تو وہ سرا دیکھتی رہ گئی تھی۔

آگے بڑھ گئی اور اماں جی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولی۔

”خواتین حضرات میں آپ کے لیے زبردست خبر لائی ہوں۔ جسے سنتے ہی آپ خوشی سے اچھل پڑیں گے۔“

”مدحوا! آئیے نہ گردن موڑ کر اسے کچھ بینہی نظروں سے دیکھا۔“

”آپ سیشن تو ماما! وہ آئیہ سے کہہ کر باری باری سب کو دیکھنے لگی تو عقب سے عمر اس کے بالوں کو پکڑا۔“

کر بولا۔

”اب بتا بھی دو۔“

”اے کیا بتا دوں۔ پہلے مٹھائی وغیرہ لاؤ اور اباں ڈھولک بھی بجنی چاہیے کیونکہ اخر بھائی وہاں شادی کر رہے ہیں۔“ وہ واقعی کمال ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

آئیہ اور میمونہ بھانجی قدرے سناٹے میں آکر اسے دیکھنے لگیں جبکہ صباحت اور سونیا کے ہونٹوں سے چہرہ

آواز میں گنا گنا تھا اور اماں جی بس ایک لحظہ کو غصہ ٹھیکیں پھر اس پر ہلکے سنکھیں۔

”باؤلی ہو گئی ہو کیا ٹونٹوں میں آتا ہے کب ہوتی ہو۔“

”میں سچ کہہ رہی ہوں اماں جی! اخر بھائی نے ابھی ابھی فون پر بتایا ہے مجھے۔“ اس نے زور دے کر کہا تو میمونہ

بھابھی کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

”کے کیا بتایا ہے اس نے؟“

”میں کہ وہ شادی کر رہے ہیں۔ اچھا ہے ناں، جی اس گھر میں ایک انگریز لڑکی آجائے گی، جس کی آنکھیں

نیلے سمندر جیسی ہوں گی اور۔“

وہ بولتی جا رہی تھی۔ ٹھنکتی ہوئی آواز اور درمیان میں کہیں کہیں کھلکھلاتی ہنسی جس نے سب کو دھت کر دیا تھا۔

عمر نے آہستہ سے اس کا بازو تھاما اور کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔

”کیا کیا بواں ہے۔“

”تمہیں یقین نہیں آ رہا، ابھی کال ملاؤ امریکہ کی اور پوچھ لو اخر بھائی سے۔“ اس نے کہا تو عمر کچھ دیر غور کر

دیکھتا رہا پھر دھیرے سے پوچھنے لگا۔

”اور اور کیا کہا بڑے بھائی نے؟“

”کچھ نہیں، بس یہی بتایا کہ وہ شادی کر رہے ہیں۔“ وہ عمر کی نظروں سے اندر رہی اندر دیکھنے لگی تھی۔

”اور تم اسے خوشخبری کہہ رہی ہو۔“

”کیوں یہ خوشی کی خبر نہیں ہے اور۔۔۔ اب سب۔“

وہ ایک لحظہ کو خاموش ہوئی پھر جیسے اچانک سمجھے کا اظہار کرتی ہوئی کہنے لگی۔

”اچھا اب سمجھی سب کو میری خوشی پر حیرت ہو رہی ہے۔ یہی بات ہے ناں۔ چلو تم میں اس کی شکل

ہوں۔ تم کو تو آنکھوں میں آنسو بھی بھر لوں۔ لیکن یہ ہے بہت مشکل کام اور تم تو جانتے ہو میں کتنی سلی

ہوں۔“

عمر خاموشی سے اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو دیکھتا رہا۔ پیشانی سے ہونٹوں تک کہیں سے توتہ

کوئی قیامت ہوتی ہے لیکن وہ مدحیہ بھی بات ہے بات قیامت برپا کر سکتی تھی تو چھپا بھی سکتی تھی۔ بڑا دل

بول کر عمر کو بول دیکھنے لگی جیسے تمہیں کیا ہوا ہے۔ سبھی صباحت اور سونیا اماں جی کے کمرے سے نکلیں

دونوں کو خاموشی سے کھڑے دیکھ کر سونیا تیزی سے قریب آکر پوچھنے لگی۔

”کیا پھر اخر بھائی کا فون آیا ہے؟“

”نہیں تو کیوں؟“ وہ سونیا کی طرف گھوم کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”جج ہتاؤ مدحوا! تم مذاق تو نہیں کر رہیں یا ہو سکتا ہے اخر بھائی نے تمہارے ساتھ مذاق کیا ہو۔“ سونیا نا

ہے کہنے لگی۔ ”گرچہ جج ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ یہاں امی کو فون کرتے۔“

فک کہا کہ ”نہ“ ”عمر فوراً“ تاکید کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بڑے بھائی کی شرارت ہے ضرور مدحونے

یا کوئی ایسی کوئی بات لکھی ہوگی جس کے جواب میں انہوں نے ایسا مذاق کیا۔“

یہ وہ بہت سنجیدہ تھے۔ ”اس نے لاپرواہی سے کہہ کر صباحت کو دیکھا تو وہ اسے خاموش رہنے کا اشارہ

کے بولے۔“

جج حقیقت ہے، وہ ماموں جی آکر معلوم کر لیں گے۔“

نیک کے لیے ہمیں اجازت دیجئے اللہ حافظ۔“ مدحیہ ہنستی ہوئی بولی پھر صباحت کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ

ہر اتراجات تھے۔ خلیل بھائی کال بک کر دیا کوئی فون پر نظر نہ جمائے بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ اماں جی

ہونہ بھابھی نیل اور آئیہ بھی وہیں موجود تھیں۔ اس کے باوجود کمرے میں گہرا سکوت تھا جسے فون کی تیل

خلیل بھائی نے فوراً ”سیور اٹھایا تھا۔“ ”ہاں! امر کیسے ہو بیٹا؟“

اب ٹھیک ہیں۔ تم ہتاؤ شام میں فون کیا تھا تم نے۔“

کے کیا تھا؟“

بال ٹھیک ہے۔ میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔“

عمر جو کچھ کہہ رہا تھا، خلیل بھائی بظاہر بڑے سکون سے سن رہے تھے۔

رہا ہے؟“ ”اماں جی سے صبر نہیں ہو سکا۔ ان کا بازو ہلا کر پوچھا لیکن وہ متوجہ نہیں ہوئے اور امر سے

نہ نے یہاں کا کیوں نہیں سوچا۔ میں تمہاری پھوپھو کو کیا جواب دوں گا۔ تمہارے کہنے پر ہم نے

بت طے کی تھی۔ کوئی زبردستی نہیں ہوتی تھی تمہارے ساتھ اور تم بالکل غلط کہہ رہے ہو۔ گرین کارڈ

مل نہیں ہوتے ویسے بھی اللہ کا شکر ہے ہمارے ساتھ کوئی ایسے مسائل نہیں ہیں ٹیلو ہیلو۔“ شاید

نہ تھی۔ خلیل بھائی نے پاپوس ہو کر ریسپورنڈ دیا پھر دھک سے بولے تھے۔

”اس سے ایسی امید نہیں تھی۔“

”میمونہ بھابھی اسی قدر کہہ سکیں پھر رونے لگیں۔“

نہ نے کیا کر رہی ہیں۔“ ”آئیہ نے فوراً ٹوک کر ان کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنالیا پھر اپنے تئیں انہیں تسلی

”اگر نادان نہیں ہے ماشاء اللہ بہت سمجھدار ہے۔ کچھ اچھا سوچ کر ہی اس نے یہ قدم اٹھایا ہو گا۔“

ہو چکر اور یہاں منتقلی کیا سوچ کر کی تھی اس نے اس وقت بھی نادان تو نہیں تھا۔ جو اسے اپنی نادانی

نہ بھائی کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے نکل گئے۔

نہ زندہ کیا ہے اس نے ہمیں۔“ ”میمونہ بھابھی نے آئیہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔“

اس کے لیے بھابھی اید سب نہیں کریں۔“ ”آئیہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔“ ”ہم کوئی غیر نہیں ہیں۔ اس گھر

سب کے مکمل ہم نے ساتھ جیسے ہیں۔“

نہ کی کتنی ہے دلہن۔“ ”ابا جی تاکید کرتے ہوئے میمونہ بھابھی سے کہنے لگے۔“ ”تمہیں اس کے سامنے

نہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اخر جیسے تمہارا بیٹا ہے ویسے آئیہ کا۔ اس کے اس اقدام پر تم دونوں کا

بہ ہونا چاہیے۔ کسی نئے رشتے کو درمیان میں لا کر فاصلے مت پیدا کرو۔ پھر یہ سب قسمت کی باتیں

نہ اخر کا جو فتمیں لکھا ہو گا اور شاید اسی میں بہتری ہوگی۔“

”شاید“۔ آسہ نے دکھ سے سوچا۔ پھر موضوع بدلنے کی خاطر خاموش بیٹھے نیل کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔
 ”بنا آج چھٹی کے دن تم کہاں چلے گئے تھے؟“
 ”جی، مجھ سے کچھ کہا۔“ نیل نے چونک کر دیکھا۔
 ”کہاں رہے سارا دن؟“ اس بار ابائی نے پوچھا۔
 ”ڈیڈی کی طرف چلا گیا تھا۔ دوپہر تک وہاں رہا اس کے بعد ڈیفنس ایک دوست کے پاس۔“ نیل بتا رہا
 کھڑے ہوئے۔ چلیں پھوپھو! بوائے کھانا لگا دیا ہو گا۔“
 ”ہاں چلو۔ اور بھابی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلیں انھیں آپ بھی کمانا وغیرہ کھا رہے۔“
 آسہ نے اٹھتے ہوئے میونہ بھابی کو بھی ساتھ کھڑا کپا پھر کرے سے نکل کر نیل کے ساتھ اوپر آئی۔
 بوا کھانا لگا رہی تھیں۔ جبکہ مدحیہ اور صباحت لی دی کے سامنے بیٹھی بڑے اٹھماک سے ڈرامہ دیکھ رہی تھیں۔
 ”مدحیہ! آؤ بیٹا کھانا کھا لو۔“ آسہ نے بالکل غیر ارادی طور پر صرف مدحیہ کو پکارا شاید اس لیے کہ اس کا تین
 مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔
 ”بس دو منٹ ماما! اینڈ دیکھ لوں۔“ مدحیہ نے نی دی پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا تبھی اسکرین ہلک ہو گئی۔ پھر
 بقیہ خبرنامہ کے بعد۔

”لو ہو گیا اینڈ۔“ صباحت اسے چھیٹی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”کتنا بور کرنے لگے ہیں یہ نی دی والے۔ پورے دس منٹ ہیں نو بیچنے میں اور ڈرامہ دیکھنا دو منٹ کا رہ گیا۔“
 ”مدحیہ نے جھنجھلا کر نی دی ہنر کر دیا پھر ہاتھ دھونے کے بعد نیل پر آکر بیٹھی اور آسہ کو دیکھ کر کہنے لگی۔
 ”احمر بھائی سے بات ہو گئی آپ کی؟ میں نے بچ کما تھا ناں۔“
 ”چلو کھانا کھاؤ۔“ آسہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ آیا اسے احساس نہیں ہے یا پوڈ کر رہی ہے۔
 ”واقعی ماما! آپ کی بات ہوئی ہے احمر بھائی سے۔ کیا کہا انہوں نے؟“ صباحت نے پوچھا تو آسہ کو ایک دم غم
 آ گیا۔
 ”کچھ نہیں، کچھ نہیں کہا اس نے تم دونوں کو فضول باتیں کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ کھانے کے وقت گم
 خاموش نہیں رہ سکتیں اور تمہیں اس سے کیا احمر نے شادی کی ہے یا نہیں۔“
 ”ہاں ہمیں کیا۔“ مدحیہ نے لا پرواہی سے کندھے اچکائے پھر صباحت کو ہنسی مار کر اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔
 نیل کچھ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ مدحیہ کی لا پرواہی پر مزید متعجب ہوئے اور پھر کھانے کے دوران بار بار
 دیکھتے رہے۔ اس وقت جب مدحیہ نے نیچے جا کر سب کو خوش خبری سنائی تھی وہ موجود نہیں تھے تب ہی اب حیران
 رہے تھے۔

صباحت اور مدحیہ پہلے کھانا ختم کر کے اٹھ گئیں، تب وہ آسہ کو متوجہ کر کے پوچھنے لگے۔
 ”پھوپھو! کیا مدحیہ کو پہلے سے معلوم تھا۔ وہ احمر کی شادی کا؟“
 ”ہاں، شام میں احمر کا فون آیا تھا۔ اسی نے اینڈ کیا تھا اور بتا نہیں اس نے کس انداز سے اسے بتایا کہ وہ ڈیڈی
 سے بھاگتی ہوئی آئی تھی۔ باقاعدہ سب کو خوشخبری سنائی۔“ آسہ سوچتے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔
 ناواں تو نہیں ہے جو اسے احساس نہ ہو یا پھر کچھ زیادہ سمجھ دار ہو گئی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔“
 نیل کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہیں اس لیے بس سر ہلا کر رہ گئے۔
 ”چلو یہ بھی اچھا ہے کہ اس نے محسوس نہیں کیا۔ گو کہ احمر نے اچھا نہیں کیا مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بلکہ اب
 میں یہ کہوں گی کہ اچھا ہوا اس نے اسی وقت یہ قدم اٹھالیا۔ اگر شادی کے بعد۔“
 آسہ نے اچانک کسی خیال سے جھرجھری لی تھی پھر نیل کی طرف دیکھے بغیر اٹھ کر چلی گئی۔
 نیل کو آسہ کا جانا بہت غیبت لگا اور نہ انہیں اٹھنے کے لیے کوئی تدبیر کرنی پڑی جو کہ اس وقت بہت

میں آؤ درصباحت کو بلا دو۔“

اگر ادھر سے صاحت ہی نے ریسو کیا تب کے بلانا ہے۔“ رابعہ اپنی بات پر خود ہی ہنسی لیکن اس نے ان کے ریسو سے اتھارے تھمایا پھر مہمہ ڈاکل کر کے اسے دیکھنے لگا تھا۔

بولا۔ ”دوسری طرف مدیہ تھی۔“

صاحت، امیں ہوں رابعہ۔“ رابعہ آواز سے دھوکا کھا کر جتنی خوشی ہو کر بولی ادھر سے اتنا ہی تلخ لہجہ تھا۔

میں میں صاحت نہیں ہوں۔“

برائی میں پکیز صاحت کو بلا دیں۔“ رابعہ قدرے بوکھلا گئی تھی۔

میں ریسو کرتے کی آواز آئی تو رابعہ نے ناگواری سے ریسو کر گھوڑا پھر علی جمائیکر کو دیکھ کر بولی۔

میں کون جاگل ہے۔“

اچھے۔۔۔ علی جمائیکر نے اس کے ہاتھ سے ریسو لے کر کان سے لگایا تبھی ادھر سے صاحت نے ریسو لے لیا۔

کیوں؟“

کیا ایسی ہیں آپ۔“

اگل ٹھیک۔“ صاحت کی آواز بہت دھیمی ہو گئی تھی۔ اس نے پہلے رابعہ کو جانے کا اشارا کیا پھر اس سے

بہت دلوں سے آپ نے فون نہیں کیا تو میں نے سوچا میں ہی آپ کی خیریت معلوم کر لوں۔ سب ٹھیک تو ہے

میں۔“ صاحت کے مختصر جواب پر وہ چڑ گیا۔

میں آپ کو اندازہ ہے کہ میں کس شدت سے آپ کے فون کا انتظار کرتا ہوں۔ کیا کرتی رہتی ہیں سارا وقت

انتائیں ہو سکا کہ۔“

علی پکیز اس طرح بات نہیں کریں۔“ اس کے عاجزی سے ٹوکنے پر وہ ہونٹ بھیج گیا۔ پھر چند لمحے توقف سے

اس میں بھیج کر بولا۔

میں ایک ساری ایک تو آپ خیریت ہو ئیں۔ یہ بتائیں لا سیریری کب جاری ہیں۔“

میں ایک کوئی پروگرام نہیں۔“

اور اگر میں کموں کل کاروگرام رکھ لیں۔“

میں اور پکیز اصرار نہیں کیجیے گا۔ کیونکہ آج کل ماما کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کہیں جانے کی اجازت

دیں گی۔“ صاحت نے منع کرنے کے ساتھ سبب بتایا تو وہ جو یہی جانتا چاہتا تھا بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے

میں آپ کی ماما کو؟“

میں سیریری سسر۔“ وہ اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گئی۔

میں سسر بھی ہیں؟“ اس نے کچھ حیران ہو کر پوچھا تو ادھر وہ ہنس پڑی۔

میں کیا میری بہن نہیں ہو سکتی۔“

میں۔“ وہ ابھی بھی حیران تھا۔ جس پر وہ محفوظ ہو کر بولی۔

میں کوئی۔“

میں۔“ وہ ایک دم ہونٹ بھیج گیا۔ غالباً پوچھنے جا رہا تھا کہ آئیہ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ لیکن فوراً

میں نے خاموش ہو گیا اور پھر فوراً بات بھی بتا گیا۔ ”میں شاید آپ کی سسر نے ہی فون ریسو کیا تھا۔“

میں بد مزیزی تو نہیں کی اس نے؟“

”مدیہ!“ کچھ دیر غور سے دیکھنے کے بعد جہاں ان کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی وہاں دل پر چوٹ ماری تھی کہ یہ وہ لڑکی تھی جو چھین لیتا جانتی تھی اور کبھی اپنی اس حرکت پر نادم بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اب کبھی طرح رد رہی تھی۔ شاید اپنی بے بسی پر یا شاید اس کی بے وفائی پر جانے کیا بات تھی جو وہ بیش کی طرف سے احتجاج کرنے کے بجائے بے آواز آنسو بہا رہی تھی جو براہ راست ان کے دل پر گرنے لگے تھے۔ بہت چاہنے کے باوجود وہ اس کے پاس جانے کی ہمت نہیں کر سکے، کیونکہ اس سے کچھ بعد نہیں تھا کہ سامنے دیکھ کر بے قابو ہو سکتی تھی اور رات کے اس پسورد کس کس سے کیا کیا کہتے یہی سوچ کر وہ بہت خستہ ہوئی۔ اپنی جگہ پر آکر لیٹے تو ان کا دل اس کے آنسوؤں کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥

علی جمائیکر، آج جتنی جلدی گھر جانا چاہتا تھا اتنی ہی آفس میں دیر ہو گئی تھی۔ پھر گھر آتے آتے فون گئے تھے آدھے میں قدم رکھتے ہی اس نے رابعہ کو پکارنا شروع کر دیا اور لاؤنچ میں آیا تو وہ کوئی غیر ملکی چینل دیکھنے پر آمین تھی کہ اس کی آواز بتا نہیں سنی نہیں یا جان بوجھ کر دھیمان نہیں دے رہی تھی۔ اس نے ہنٹ کر لی وہی گاڑی ہی تھی جو تباہ تھی۔

”کیا کر رہے ہیں بھائی لگا نہیں ناں۔“

”شٹ اپ!“ اس نے قدرے غصہ دکھا کر اسے خاموش کر دیا پھر صوفے پر بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کو

ہوئے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔ ”امی کہاں ہیں؟“

”بے کمرے میں۔“ رابعہ کی رو بھی ہوئی آواز آئی۔

”خیریت!“ اس نے سر اٹھا کر کے اسے دیکھا۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے ناں ان کی۔ ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں

”اصل میں تو آپ یہی پوچھنا چاہتے ہیں اور میں تفصیل سے اس وقت بتاؤں گی جب آپ دل کی آواز

سمے۔“ رابعہ نے فوراً سمجھ کر کہا تو اس نے پھریشانی پر شک نہیں ڈال لیں۔

”بالکل نہیں۔ ہر وقت دل کی پی ڈی کوئی اور کام نہیں ہے نہیں۔“

”کیوں نہیں آپ کے کام سے گئی تو بھی امی کے ساتھ بیمار نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو بیمار ظاہر کرنا

آئیہ کا کچھ سننا لیکن آج تو وہ خود مریض لگ رہی تھیں۔“ رابعہ نہ بتانے کا کہہ کر بھی بتانے لگی تھی۔

پریشان بھی لگ رہی تھیں۔ امی کی باتوں پر کوئی تو یہی نہیں دی اور فوراً نسخہ لکھ کر ہاتھ میں تھام لیا۔

”اس سے یہ کیسے سمجھ لیا تم نے کہ وہ پریشان تھیں؟“ اس نے بر سوچ انداز میں کہا۔

”ان کے چہرے سے لگ رہا تھا۔ پھر بار بار بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر کو جھکا دے رہی تھیں جیسے کہ

کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یوں رابعہ نے باقاعدہ آئیہ کی طرح کر کے دکھایا تو وہ اندر سے

چین سا ہو گیا اور اسی سوچتے ہوئے انداز میں بڑبڑایا۔

”کیا پریشانی ہو سکتی ہے؟“

”یہ تو ہم نے نہیں پوچھا کیونکہ ابھی اتنی زیادہ جان پہچان تو نہیں ہوئی ان سے۔“ رابعہ نے اس کی

سن کر کہا تو اس نے چونک کر دیکھا پھر اچھے ہوئے بولا۔

”اچھا تم کھانا لگواؤ۔ میں پیچ کر کے آتا ہوں۔“

رابعہ نے اٹھنے کی زحمت نہیں کی وہیں سے کرم دین کو پکار کر کھانا لگانے کو کہہ دیا۔

علی جمائیکر کا ذہن آئیہ کی پریشانی کو سوچتے ہوئے صاحت تک جا پہنچا تھا کہ کہیں اس کے ساتھ

نہیں ہے جس کی وجہ سے آئیہ پریشان ہے۔ پیچ کرتے ہوئے اور پھر کھانے کے دوران کچھ دیر

رہا۔ کتنی باتیں تھیں اور ہر بات کے اختتام پر سوالیہ نشان جس سے اس کی بے چینی سوا ہوئی۔ تب

کھانا ختم کر کے وہ رابعہ کو اشارا کرتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔

کچھ دیر بعد رابعہ اس کے پیچھے آئی تو وہ فوراً ”میں فون سیٹ اپنے قریب سمجھ کر بولا۔“

”بھٹ سے تو بات نہیں ہوئی۔ راجہ بات کر رہی تھی اور میرا خیال ہے اس کے ساتھ بھی کوئی بدتمیزی نہ کیوں کیا ہے بدتمیز ہے۔“ اس نے بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

”نہیں بس سوڈی ہے۔“
”تو اس سوڈی کی وجہ سے آپ کی ماما موڈ آف ہے۔“

”ہاں بس۔“
”نیلین تو جب ان کا موڈ ٹھیک ہو تب آپ خود مجھے رنگ کیجئے گا اور اس میں زیادہ دیر نہیں ہوگی۔“
”اللہ حافظ!“ دھڑ سے سلسلہ منقطع ہو گیا تو وہ ریسور رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور ادھر سے ادھر ٹٹلنے لگا۔

آسیہ واقعی مدیہ کے ہاتھوں سخت پریشان تھی۔ جوانی تلخ کلامی، طنز، جھلپوں اور حرکتوں سے سارے ماحول خراب کرنے پر تل گئی تھی۔ چھوٹے بڑے کا لحاظ تو وہ پہلے بھی نہیں کرتی تھی اور اب تو اور زیادہ تھی۔ غالباً ”احمر کے بے وفائی کا بدلہ وہ اس طرح لے رہی تھی کہ میمونہ بھابی کو بھی نہیں چھوڑتی تھی جاتے۔ کبھی ان پر طنز کرتی اور کبھی اظہارِ ہمدردی کر انہیں مشورہ دیتی کہ سونا آپنی کے لیے کوئی اور شے نہ کیونکہ اشعر بھائی بھی باہر گئے ہوئے ہیں کیا پتا دیں سے میم لے آئیں اور بے چاری میمونہ بھابی پر جاتیں۔ حالانکہ ان کا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ قصور تو کسی کا بھی نہیں تھا۔ پھر بھی سب اس کے سامنے ہوئے تھے۔ اور آسیہ نے زندگی اسی گھریں گزار دی تھی۔ کبھی میمونہ بھابی کے ساتھ تلخ کلامی تو کیا اور بات نہیں کی تھی اور کسی رنجش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ منہ بھانج والا رشتہ تو لگتا ہی نہیں تھا۔ حقیقتاً ”سبکی بہنوں سے بڑھ کر محبت ملی تھی اسے میمونہ بھابی کی طرف سے اور ایسی محبت کرنے خاتون کے ساتھ مدیہ کی بدتمیزیوں پر اس کی پریشانی فطری تھی۔ گو کہ میمونہ بھابی اس سے کہہ سکتی مدیہ کی باتوں کا برا نہیں بانتیں۔ اسے حق ہے یہ سب کہنے کا۔ لیکن آسیہ کے نزدیک یہ اس کا حق نہیں کی طرف سے ناحق زیادتی تھی جو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کی جاسکتی تھی اور آسیہ اس وقت سے کہ اوہر برداشت کی حد ختم ہو گئی تو پھر عمر بھر کی محبتیں مٹی میں مل جائیں گی اور ایسا وہ نہیں چاہتی تھی۔ لیے ضروری تھا کہ مدیہ اپنی حرکتوں سے باز آجائے اور اسے باز رکھنے کے لیے آسیہ نے اپنا ہر حربہ سے ”پیار سے غصے سے یہاں تک کہ خود کو اس کے سامنے بہت عاجز اور مجبور بھی ظاہر کیا لیکن اس پر ہوا اور اس وقت تو آسیہ نے جیسے ہار مان کر اس سے پوچھا تھا۔

”بچھتاؤ، تم کیا چاہتی ہو آخر؟“
”میں کچھ نہیں چاہتی ماماں اگر آپ مجھ سے اتنی تنگ ہیں تو مجھے میرے باپ کے پاس بھیج دیں اتنے آرام سے کہنے پر آسیہ کچھ دیر کو نہانے میں آگئی تھی۔
صباح نے سسم گر نیل کو دیکھا تو انہوں نے آنکھوں سے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔
”اس کی کیا گارنٹی ہے کہ باپ تمہیں اپنے پاس رکھ لے گا۔“ نہانے سے نکل کر آسیہ نے فخر کرتے ہوئے پوچھا۔ تو وہ یقین سے بولی۔
”نکلنا بھی نہیں کریں گے۔“

”یہ شخص تمہارا خیال ہے مدحو! اس شخص کو اگر تم سے ذرا سی بھی محبت ہو تو وہ بہت میل نہ چھین کر لے جاسکتا تھا اور نہ لے جانے کا مطلب یہی ہے کہ اس کے دل میں اور گھر میں بھی نہیں ہے اور تم اتنی نادان نہیں ہو جو سمجھ نہ سکو۔ اپنے دل سے یہ خیال نکال دو ورنہ۔“
آسیہ کا مضطرب جواب دینے لگا تھا جب ہی تنبیہ کرتی ہوئی کمرے سے نکل آئی اور اپنے کمرے میں اندر سے لاک کر کے بیڈ پر ڈھس گئی۔ اور کتنی دیر سیدھی بیٹی چھت کو گھورتی رہی۔ یہاں تک کہ

”کی جیسے لگی تھیں۔ جبکہ ذہن میں جھکڑ چل رہے تھے۔
”دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ نیل نے پکارا۔ دوسری اور پھر تیسری بار تب پہلے اس کی نیل حرکت ہوئی پھر اٹھ کر ست روئی سے جا کر دروازہ کھولا تو نیل نے تشویش سے پوچھا۔
”نیل تھک تو ہیں نا پھو پھو!“

”اس نے ہاں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر سامنے سے ہٹ کر نیل کو اندر آنے کا راستہ دیا۔
”بت پریشان کرنے لگی ہے مدحو آپ کو۔“ نیل نے اندر آتے ہوئے بس یونہی کہہ دیا۔
”نیل پریشان کرے میں اسے شاہ سکندر کے پاس نہیں جانے دوں گی یہ بات تم اسے اچھی طرح سمجھا دو کہ نیل میں ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ تنفر سے کہتی ہوئی نیل سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔
”سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے پھو پھو! وہ خود سمجھتی ہے۔ آپ بس اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔“
”نیل کی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”بیک۔ جب سب مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔“
”بس آپ سے کوئی ناراض نہیں ہو سکتا کیونکہ سب جانتے ہیں کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ احمر نے اس اٹھ جو عین مذاق کیا ہے اس پر اس کا یہی رد عمل ہو سکتا ہے۔“
”برج سے کہتے ہوئے نیل کی نظروں میں اس رات کی مدیہ تھی جو خود کو بہت مضبوط پوز کرتے کرتے شاید کئی گھنٹے سے چھپ کر رات کی تاریکی میں بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔
”نیل جانا احمر کے اس فعل میں یہاں کا کوئی فرد شریک نہیں ہے۔ یہ وہ بھی جانتی ہے پھر کیوں۔“
”بارے وہ۔ احمر سامنے نہیں ہے اس لیے اس کے گھر والے نشاندہ بن رہے ہیں۔ آپ ایسا کریں۔ کچھ دنوں کے لیے شکیل بیچا کے پاس اسلام آباد بھیج دیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ نیل کے مشورے پر وہ کچھ دیر آرامی چھوڑ دھڑے دھڑے اثبات میں سر ہلائی ہوئی کہنے لگی۔

”ٹھیک کہا تم نے۔ لیکن تم کچھ مت کہنا اس سے کیونکہ ہمارے کہنے پر وہ کبھی نہیں جائے گی۔ میں آج نما ٹھیک بھائی کو فون کر کے انہیں ساری بات بتا کر کہوں گی کہ وہ خود آکر اسے لے جائیں۔“
”اُدھو کے لیے بھی یہی بہتر ہے۔ ماحول کے ساتھ آب و ہوا کی تبدیلی اس پر اچھا اثر ڈالے گی۔“ نیل نے بولے۔ ”چلیں اب آپ آرام کریں۔“
”ارام کا وقت نہیں ہے بیٹا! کلینک جانا ہے۔“ آسیہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا پھر نیل کے جاتے ہی وارڈ سے کپڑے نکال کر واش روم کا رخ کیا۔

”نپا!“ آسیہ نے گھٹنے بعد جب وہ تیار ہو کر کلینک جانے کے لیے نکلی تب بھی وہ مضطرب تھی۔ مدیہ کو اب بھیجنا ٹھیک بھی لگ رہا تھا اور اس کی عادات و مزاج کی وجہ سے پریشان بھی تھی۔ کیونکہ شکیل بھائی اس میں ڈسپن کے قائل۔ جبکہ مدیہ کا مزاج ہی الگ تھا۔ اسے ہر عمل میں آزاد کسی قسم کی کوئی اس سے برداشت ہی نہیں ہوئی تھی اور نہ گھر کے کام کاج سے اسے کوئی دلچسپی تھی۔
”ہاں میں مدحو ہاں نکلے دن رہ سکے گی اور کہیں شکیل بھائی اور سیمابھابی کے لیے کوئی پرالمن نہ کھڑی کر

”اب اسپینڈ سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل اپنی سوچوں میں گہرا ہوا تھا۔ راستے پر نظر تو تھی لیکن کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ اپنی سوچوں میں بہت آگے تک نکل گئی۔ جب سگنل پر گاڑی روکی تب ماہوا کے کلینک کو پہنچ رہا تھا۔ اپنی بے خبری پر کڑھتی ہوئی سگنل کھلنے پر گاڑی اسپینڈ سے بھاگ کر اوٹ باؤٹ ہوئی سڑک پر آئی تھی کہ روڈ کراس کرتی ہوئی ایک عورت اچانک سامنے آگئی جسے بچانے کے چکر میں اس کی فسیا پتھر پر چڑھ گئی اور یہ بھی اچھا ہوا کہ وہاں کوئی نہیں تھا پھر بھی اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی اٹھارہ زور سے دھڑکنے لگا جسے ابھی سینے سے باہر نکل آئے گا۔ جبکہ ہاتھ بالکل ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ کتنی

بہا آب کی مای جی آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔" ٹھیک بھائی، مدیہ کے لٹھ مارنے والے انداز میں سلام کا
ہے کر کہنے لگے۔ "کہہ رہی تھیں۔ مدیہ کی چٹھیاں ہو گئی ہوں تو اسے لے آئیے گا۔ چلو گی؟"
بھی چٹھیاں نہیں ہوئیں اور ہوں گی بھی تو مہما نہیں جانے دیں گی۔" مدیہ کا روٹھا ہوا لہجہ سب سے
جی ظاہر کر رہا تھا۔

نہیں نہیں جانے دیں گی بھی، آپ کو تو میں ابھی آپ کو ساتھ لے چلوں آئیہ منع کر کے تو دیکھے۔" انہوں
نے اپنا تھکا ہوا حواس دے کر کہا تو اس سے پہلے صاحت بول پڑی۔
بھی نہیں ماموں جی! امتحانوں کے بعد لے جائیے گا۔"

کچھ بچے اعتراض ابھی سے شروع ہو گیا۔ "مدیہ نے یوں سر جھٹکا جیسے اسے صاحت کی مداخلت سخت
ار گزری ہو۔"

میں کوئی اعتراض، کوئی عذر نہیں سن رہا صبا کا نہ آئیہ کی طرف سے سنوں گا۔ چلو آپ تیار کی کر دیکھ
پلے سے آپ کو میرے ساتھ جانا ہے۔"

جی ماموں جی! آپ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔" مدیہ کی خوشی میں بے یقینی بھی تھی۔ "مما منع
نہیں کرتی۔"

نہیں۔" ان کے یقین دلانے پر اس نے گردن اٹھا کر صاحت کو دیکھا جیسے اب اسے کوئی نہیں روک
سکتی ہوئی اور آئی اور اسی وقت الماری میں سے اپنے کپڑے نکال نکال کر بیڈ پر پھینکنے لگی۔

یہ کیا کر رہی ہو؟" کچھ دیر بعد صاحت کمرے میں داخل ہوئی اور بھٹنے کے باوجود ٹوک گئی۔
تیار کی تم جلدی سے سوئ کیس خالی کر دو۔" وہ اپنے کام میں مصروف رہ کر بولی۔

"وہ تو میں کروں گی لیکن بستر پر پہلے تم ماسے پوچھ لو۔" صاحت نے برہہ کر کھڑکی سے پردے سمیٹتے ہوئے
نہاں جی پوچھیں گے۔ مجھے تو وہ صاف منع کر دیں گی۔"

"ٹھیک منع کریں گی۔" اوہرا امتحانوں میں صرف دو مہینے رہ گئے ہیں، تمہیں خود سوچنا چاہیے۔ ماما تمہارے بھلے
بات کرتی ہیں۔" صاحت نے زمین ج سے اسے سمجھانا شروع کیا تھا کہ وہ کھانا ک سے الماری بند کر کے اس
فریڈ کھاتا تھا جوڑی ہوئی بولی۔

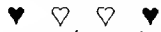
میں رہنے دو بہت ہو گیا میرا بھلا اب کچھ برا ہو جائے دو۔"

"اللہ نہ کرے جو کچھ برا ہو۔ تمہاری ساتھ تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" صاحت بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل
پڑی تو سر جھٹک کر خود ہی سوٹ کیس اتار کر خالی کرنے میں لگ گئی۔

آئیہ اپنے وقت پر کلینک سے لوٹی تو کچھ دیر بیٹھی ہی بیٹھی پھر ٹھیک بھائی کے ساتھ اوپر آئی تھی۔ جس سے
اور اطمینان سے ہو گئی کہ اسے آئیہ سے اپنے جانے کے متعلق بات نہیں کرنی پڑے گی۔ ورنہ ساری

ناک بعد بھی اندر سے خائف تھی۔ اگر اسے معلوم ہو جا کہ آئیہ خود اسے بھیج رہی ہے تو یقیناً "اس کی فہرہ
با خود جانے سے منع کر دیتی اور آئیہ ظاہر ہے اس کی ماں تھی۔ اسے اچھی طرح سمجھتی تھی بھی تو اسے شبہ

نہ ہونے دیتا تھا۔ اس کے سامنے ٹھیک بھائی کے ساتھ کتنی بحث کے بعد اسے بھیجے پر رضامند ہوئی تھی۔



بہرے جانے کے بعد ماحول کی کشیدگی تو کیا کم ہوتی بلکہ اور اسی گھما جی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سب کے
مذہبی ایک رابطہ تھی ہر وقت اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر کبھی اتنے موڈ میں ابھی عمر کے ساتھ تھکا اور ادھر

سہل بات چلتا۔ بس اسی کی آواز کو جاکر جی تھی اور اب ایک دم خاموشی تھی۔
بہت صبح کالج جانے کے لیے نیچے اترتی تو سب کو سلام کرتی ہوئی تھی کہ ساتھ باہر نکل جاتی اور واپسی میں

لڑائی ہوئی اوپر آجاتی۔ حالانکہ وہ شروع سے مدیہ کے رویوں کی تلافی کرتی آئی تھی اور ابھی بھی کرنا چاہتی

در اسے خود پر قابو پانے میں لگی اس کے بعد ایک اور مصیبت کہ گاڑی اشارت ہو کے نہیں دی۔ بلکہ
کے وہ تھک گئی تو نیچے اتر کر کشتی تلاش میں نظریں دوڑانے لگی، کبھی وائٹ بھیس اس کے پاس
رکھی اس نے توجہ نہیں دی۔ لیکن جب اسے مخاطب کیا گیا تب چونک کر دیکھنے لگی۔ چوہہ شہناشا تھا
پر زور دیا تو نام بھی یاد آگیا۔ وہ رابعہ تھی۔ بڑے خلوص سے کہہ رہی تھی۔
"ڈاکٹر صاحب! کہاں جائیں گی آپ، آئیے ہم رباب کر دیں گے۔"

آئیہ نے بلارا راہ ذرا سا جھک کر رابعہ کے ساتھ ڈرائیو نگ پر بیٹھے علی جمائیکر کو دیکھا پھر رابعہ کی طرف
کر بولی۔

"تو تو پاپا اہم بیٹا، بس بیس کلینک جانا ہے۔"

"ہم اسی راستے پر تو جا رہے ہیں۔ آئیہ پلیر۔" رابعہ نے اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولا تو وہ اپنی
طرف اشارا کر کے بولی۔

"اصل میں میری گاڑی۔"

"دو گاڑیاں کسٹڈ ہو اب کیا؟" رابعہ نے فوراً پوچھا۔

"نہیں اللہ کا شکر ہے۔ ہر طرح سے بچت ہو گئی۔ بس اس میں کچھ خرابی ہو گئی ہے۔ کلینک سے دور کشتی
کروں گی وہاں سے کوئی مکنک آجائے گا۔"

"پھر تو آپ کو جلدی کلینک پہنچنا چاہیے۔" رابعہ نے اس انداز سے کہا جیسے اسے جلدی وہی پہنچا سکتی
ساتھ اسے بیٹھنے کا اشارا بھی کیا تو اس نے مزید پس و پیش نہیں کی۔

"یہ میرے بھائی ہیں۔" رابعہ اس کے ساتھ بیٹھتے ہی علی جمائیکر کا تعارف کروانے لگی۔ "فی الحال
ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی ہر موٹ ہو کر ڈی سی کلاں گے۔"

"مشاء اللہ۔" علی جمائیکر پر نظر ڈالتے ہوئے آئیہ کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا تھا۔
"اور جب بڑی سی ہو جائیں گے تب میں اپنی فرزند کی شاندار سی دعوت کروں گی۔ آپ بھی آئیے
گی ناں۔" رابعہ کو حقیقتاً موقع مل گیا تھا۔

"میں تمہاری فرزند نہیں تو شامل نہیں ہو سکتی بیٹا! آئیہ منع نہیں کر سکتی تو باہی بھی نہیں بھری۔
"ان کی بدرز بھی ہوں گی اور ان میں تو آپ شامل ہو سکتی ہیں، میں آپ کو اسپیشلی انوائٹ کروں
آپ نہیں آئیں تو میں بارہی ہی کینسل کروں گی۔"

رابعہ کے پر جوش انداز پر وہ ذرا سا مسکرا کر رہ گئی کیونکہ علی جمائیکر نے اس کے کلینک کے سامنے گا
دی تھی۔

"اوکے بیٹا! تھینک یو۔" وہ رابعہ کے مزید اصرار کرنے سے پہلے شکریہ ادا کر کے اتر آئی اور رے
بند کر لیا تھا۔

پھر اسی رات آئیہ نے ٹھیک بھائی کو فون کر کے انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کرنے کے سا
لے جانے کو کہا تو ٹھیک بھائی نے نہ صرف فوراً ہا ہی بھری بلکہ دو دن بعد ابھی گئے تھے ایک تو انہیں
خیال تھا دوسرے کچھ اپنی غرض بھی تھی کہ سمینا کی شادی اور احمر کے باہر جانے سے خصوصاً "سیا
اکلی ہو گئی تھیں۔ وہ خود سارا دن تو آفس میں ہوتے لیکن شام میں واپسی پر وہ بھی محسوس کرتے تھے
فرصت میں آئیہ تھے شام کا وقت تھا۔

اس وقت آئیہ گھر پر نہیں تھی اور ٹھیک بھائی نے کہاں جی اور اباجی تک سے آئیہ کے فون کا ذکر
کے برعکس جیسے پہلے آفس پر ایک آدھ دن کے لیے آیا کرتے تھے ابھی بھی بی ظاہر کیا تھا۔ وہ اباجی
کے کمرے ہی میں بیٹھے تھے۔ باری باری سب آکر انہیں سلام کر کے چاچکے تھے صاحت کے سا
آئی تھی یوں جیسے زبردستی لائی گئی ہو اور واقعی صاحت اسے زبردستی لائی تھی۔

خواب میں آپ۔ میں اب آپ سے بات نہیں کروں گی۔“ وہ مزید روٹھ کر ان کے کمرے سے نکل تھی
 ٹھک کر رک گئی۔
 بے راجہ آری تھی اور اس کے پیچھے عارفہ بیگم بھی تھیں۔



ماتے جس کے راجہ اسے مخاطب کرتی اس نے اٹے بیوں دو بار نیل کے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ
 اس کا دروازہ زور زور سے دھرنے لگا تھا۔

نیل پرش رکھ کر چلنے والے دروازے کے ساتھ گئے، کیلک کر تشریف لے گئے۔
 ”کچھ نہیں۔“
 ”دراں کہیں بند کر دینا کون آتا ہے؟“

نیل کے کمرے میں کون آ سکتا ہے۔ وہ تو شاید ماما کیس، لیکن میں نہیں جانتی انہیں۔ چتا نہیں
 میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“ بوکھلاہٹ میں وہ پہلے سے اپنی صفائی پیش کرنے لگی ہوئی۔
 نہیں دیکھا۔ کیا کہہ رہی ہو۔ ہونچھے دیکھنے دو۔“ نیل کی کچھ میں کچھ نہیں کیا۔ اپنی اسٹک اٹھا کر اسے
 بٹنے کا اشارہ کیا تو وہ جلدی سے بولی۔

نیل۔ آپ نہیں دیکھیں گے وہ خواتین ہیں۔“
 کا مطلب ہے، تم نے پھر کوئی حماقت کی ہے۔ بلکہ نقصان اب کیا توڑا ہے؟“ نیل کو ایک دم گلہ ان والا
 آیا لیکن وہ سمجھی نہیں۔

”طلب؟“
 طلب ہے تم کسی خاتون کا گلہ ان تو کر پریشان تھیں اور اب ان خواتین کا جانے کیا نقصان کر آئی ہو جو وہ
 نہ بچ گئی ہیں۔ حالانکہ میں نے تم سے اسی وقت کہا تھا کہ آئندہ ایسی کوئی بات ہو تو مجھے فوراً بتا دینا۔“
 سائے طور پر سمجھ کر تنہا شریعہ کر دی تو وہ اندر ہی اندر جربز ہو کر بولی۔
 کوئی بات نہیں ہے نیل بھائی! میں نے کسی کا کوئی نقصان نہیں کیا۔“
 نہ چپ کیوں رہی ہو؟“

نیل چپ رہی ہوں۔ سامنے تو کھڑی ہوں۔“ وہ ان کی جرح سے عاجز آ گئی۔
 مجھے نہیں ان کے سامنے جاؤ۔ تب میں سمجھوں گا کہ تم نے کچھ نہیں کیا یا پھر ابھی بھی وقت ہے۔ مجھے کچھ
 پوچھو کے سامنے میں تمہارا دفاع کر سکوں۔“

نیل نے آپ کو جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں خواہ مخواہ پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ہاں نہیں تو۔“ وہ روٹھے لمبے میں
 تانے کے بیڑ پر بیٹھ گئی۔
 جاتا میں کہاں بیٹھ رہی ہو۔ جاؤ پھوپھو سے پوچھ کر آؤ کہ انہیں کوئی کام تو نہیں ہے پھر میں جاؤں۔“
 بیڑوں کر کہا۔

بیڑوں سے پوچھتے ہوئے چلے جائیں۔“
 نہ لڑی! پھوپھو کے پاس خواتین موجود ہیں۔ میں نہیں جاسکتا چلو اٹھو جلدی کرو۔ مجھے دیر ہو رہی

ماتے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔ تو وہ سمجھ گئی کہ اب اس کی ایک نہیں چلے گی اس لیے مزید پس و پیش
 کے بغیر بولی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی اور کچھ دیر راہداری میں رک کر خود پر قابو پایا پھر ڈرائنگ روم

تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کسی سے کیا کہے، کیونکہ مدحیہ نے کس وقت بھی خاص طور سے اہم
 نام لے کر کسی پر کچھ نہیں بتایا تھا بلکہ سب نے اسے طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ اسی کا بدلہ لے رہی ہے اور اس
 اسے حق بجانب سمجھتے ہوئے اس کے سامنے مجرم بھی بنے ہوئے تھے اور یہ کوئی قابل خیرات نہیں تھی کہ اس نے
 اس کے لیے بغض اوقات انسان سرخرو ہو کر بھی سرنگوں ہی رہتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ مدحیہ
 تو چلی گئی تھی لیکن وہ اندر سے شرمندہ تھی اور کسی کو اپنے سامنے شرمندہ دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے سب
 سے کٹ کر رہ گئی تھی۔

کتنے دن ہو گئے تھے مدحیہ کو گئے ہوئے۔ اس کا کسی بات میں دل بھی نہیں لگ رہا تھا۔ کتنا سوچتی امتحان قریب
 ہیں۔ اسے پڑھنا چاہیے لیکن اس پر بھی عمل نہیں کر پاری تھی اور نہ ہی اس نے علی جمائیکو فون کیا تھا مدحیہ
 اس لیے کہ وہ ملنے پر اصرار کرے گا تو اسے لائبریری جانے کے لیے ٹوپیا یا عمارت سے کنا پڑے گا اور گو کہ اسے تیر
 تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی منع نہیں کرے گا پھر بھی وہ کترا رہی تھی۔

عجیب روٹھے پھیلے سے دن تھے اور چھٹی کا دن تو اور بڑا کر دینے والا تھا۔ ناشتے کے بعد اس نے سوچا کہ آج
 دن اپنے کمرے کی صفائی کرنے میں گزارے گی، لیکن اس کام میں اسے صرف پندرہ منٹ لگے، کیونکہ مدحیہ تو کمرے
 نہیں جو ہر شے یو بھی پھینک دیا کرتی تھی اور اس کا پھیلاوا سمیٹنے میں وقت لگتا تھا۔ وہ تب بھی کڑھتی تھی اور اب
 جلدی فارغ ہونے پر بھی کڑھ رہی تھی پھر نیل کے کمرے میں آئی تو وہ اسے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

”تمہیں چھٹی کے دن بھی چین نہیں ہے۔“ وہ ان سنی کر کے ان کی رائیٹنگ ٹیبل کی گرد احتیاط سے صاف
 کرنے لگی۔ پھر کھڑکی سے باہر دسٹر بھاڑ کر پٹی تو انہیں تیار دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”آپ چھٹی کے دن کہاں جا رہے ہیں۔“
 ”میاں کی طرف جاؤں گا پھر وہاں سے۔“
 ”ڈیفنس۔“ اس نے فوراً کہا تو نیل چونک کر دیکھنے لگے۔

”تمہیں کیسے پتا ہے؟“
 ”آپ ہی سے اکثر سنا ہے کہ پہلے میاں کی طرف گیا تھا پھر وہاں سے ڈیفنس ایک دوست کے پاس۔“ اس
 سیدھے سادے انداز پر نیل مطمئن ہو کر بولی۔

”ہاں دوست کیسے پاس۔“ پھر بات بدلنے کی خاطر پوچھنے لگے۔ ”پھوپھو کیا کر رہی ہیں۔“
 ”پتا نہیں“ اپنے کمرے میں ہیں، مجھے لگتا ہے نیل بھائی، ماما جو کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ دیکھیں
 دن ہو گئے ہیں وہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ امتحانوں کی فہرست بھی نہیں ہے اسے۔ آپ اسے بلانے کی کوئی
 کریں ناں۔“

”وہ ہم میں سے کسی کے کہنے پر نہیں آئے گی۔“ نیل نے کہا۔
 ”تو پھر شکیل ماموں سے کہیں۔ وہی اسے چھوڑ جائیں۔ ورنہ ماما کو آپ جانتے ہیں کسی دن اچانک ان
 ہائی ہو گیا تو اسی وقت روانہ ہو جائیں گی یہاں سے اور مدحیہ کو بالوں سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی لے آئیں گی۔“
 اپنے تئیں نیل کو اس وقت سے خائف کیا لیکن وہ مسکرا کر بولی۔
 ”دو فکر نہیں کرو۔ ایسا نہیں ہو گا کیونکہ پھوپھو نے خود اسے بھیجا ہے۔“

”ماموں جی کے مجبور کرنے پر ناں۔“
 ”نہیں بلکہ شکیل چچا کو پھوپھو نے اسی مقصد سے بلوایا تھا کہ وہ آکر مدحیہ کو لے جائیں۔ یہاں اس کی مدحیہ
 حد سے بڑھتی جا رہی تھیں اس لیے سمجھیں۔“ آخر میں نیل نے اس کا سر بلایا تو وہ سمجھ کر روٹھے جیسے
 ”بات آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی۔ میں خواہ مخواہ پریشان رہی۔“
 ”کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تم ایسے ہی پریشان رہتی ہو خواہ مخواہ۔“ نیل کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

میں داخل ہوتے ہی بولی۔
”مما! وہ نیل بھائی کمرہ رہے ہیں۔ کوئی کام ہو تو بتا دیجیے۔ وہ بڑے ماموں کی طرف جارہے ہیں۔“

”یہ آپ کی بیٹی ہے۔“ آسیہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی عارفہ بیگم نے اس سے پوچھ لیا۔
”جی۔“ آسیہ انہیں جواب دے کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”ہاں بیٹا نیل سے کہو اس وقت ہوئی۔“

نیل البتہ شام میں وہ دروازہ جلدی آجائے تو۔
”جی اچھا“ وہ آسیہ کی بات پوری نے بغیر دیر سے پلٹ آئی اور نیل کو اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑا دیکھ کر آہستہ آواز میں بولی۔
”کوئی کام نہیں ہے، بس شام میں جلدی آجائیے گا۔“

”کچھ نہیں؟“
”مجھے کیا بتا ماما کہہ رہی ہیں۔“ وہ ان کے قریب سے نکل کر کمرے کے اندر آ گئی۔
”کچھی بات ہے۔“ نیل جگے گئے تو اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر گہری سانس کھینچی پھر دروازے سے زرا نکال کر انہیں جانے ہوئے دیکھنے لگی۔

جب وہ بیڑھیاں اتر گئے تب کچھ مطمئن سے ہو کر اس نے ٹیس کی طرف جانے کا سوچا مگر وہاں عارفہ بیگم کی باتیں سن سکے اور ابھی اپنی سوچ پر عمل کرنے کے لیے وہ خود کو تیار کر رہی تھی کہ بوا چائے اٹھائے راہداری میں نمودار ہو میں، جتھیں دیکھتے ہی اس نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا اور آکر اپنے بنا گئی۔

اس کے اندر جتنا تجسس تھا اس سے زیادہ پریشان ہو رہی تھی کہ اگر آسیہ نے ان لوگوں کے بارے سے پوچھ لیا تو وہ کیا جواب دے گی۔ گوکہ علی جمائیر نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ وہ کوئی ایسی راہ نکالے گا آسیہ اس سے کوئی سوال نہ کرے۔ اب پتا نہیں وہ اس میں کامیاب ہوا تھا یا نہیں۔ یہ تو اس کی ہاں اور جانے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا اور اتنی دیر تک وہ مطمئن نہیں ہو سکتی تھی۔ تجسس پریشانی غور ایک احساس کو بھی دبا نہیں پاری تھی کہ مزید اندیشے سر ابھارنے لگے تھے۔ تب ہی دروازہ کھلنے کے آواز بڑھ کر اٹھ بیٹھی۔

”کون ہے بوا؟“
”میں۔“ رابعہ اندر آتے ہوئے بولی۔ ”میرے آنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“
وہ خاموش رہی۔
”اصل میں خواتین کی باتوں سے میں بور ہو گئی تھی اور تھینکس گاؤ کہ تمہاری امی نے محسوس تمہارے پاس بھیج دیا۔ کیا کر رہی تھیں؟“ ”تو وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”کچھ نہیں۔“
”تین کچھ سوچ تو ضرور رہی ہوگی۔“ رابعہ کی معنی خیز مسکراہٹ سے نظریں چرا کر وہ ادھر ادھر اندر دلی ایک مخصوص لے پر دھڑکنے لگا تھا۔ جس سے چہرہ گلابی ہو گیا اور رابعہ ہنستی ہوئی بولی۔
”نہ نہ بتاؤ پھر بھی میں جانتی ہوں۔ ویسے آج ہم اس مقصد سے نہیں آئے بلکہ میں تمہاری امی کو آسیہ اور عارفہ بیگم کے آنے سے رابعہ کی بات ادھوری رہ گئی اور وہ بھی فوراً ”بیڈ سے اتر کر عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔
”مشاء اللہ۔ بہت پیاری بیٹی ہے۔ اسے بھی لے کر آئیے گا۔“

”جی آئی! میں بھی نہیں کہنے والی تھی۔ اسے ضرور ساتھ لائیے گا۔“ رابعہ نے فوراً ”تائید کے کہا۔
”ہوں دیکھو۔“ آسیہ اپنے کسی خیال میں تھی۔

مما! وہ نیل بھائی کمرہ رہے ہیں۔ کوئی کام ہو تو بتا دیجیے۔ وہ بڑے ماموں کی طرف جارہے ہیں۔“
”یہ آپ کی بیٹی ہے۔“ آسیہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی عارفہ بیگم نے اس سے پوچھ لیا۔
”جی۔“ آسیہ انہیں جواب دے کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”ہاں بیٹا نیل سے کہو اس وقت ہوئی۔“

نیل البتہ شام میں وہ دروازہ جلدی آجائے تو۔
”جی اچھا“ وہ آسیہ کی بات پوری نے بغیر دیر سے پلٹ آئی اور نیل کو اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑا دیکھ کر آہستہ آواز میں بولی۔
”کوئی کام نہیں ہے، بس شام میں جلدی آجائیے گا۔“

”کچھ نہیں؟“
”مجھے کیا بتا ماما کہہ رہی ہیں۔“ وہ ان کے قریب سے نکل کر کمرے کے اندر آ گئی۔
”کچھی بات ہے۔“ نیل جگے گئے تو اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر گہری سانس کھینچی پھر دروازے سے زرا نکال کر انہیں جانے ہوئے دیکھنے لگی۔

جب وہ بیڑھیاں اتر گئے تب کچھ مطمئن سے ہو کر اس نے ٹیس کی طرف جانے کا سوچا مگر وہاں عارفہ بیگم کی باتیں سن سکے اور ابھی اپنی سوچ پر عمل کرنے کے لیے وہ خود کو تیار کر رہی تھی کہ بوا چائے اٹھائے راہداری میں نمودار ہو میں، جتھیں دیکھتے ہی اس نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا اور آکر اپنے بنا گئی۔

اس کے اندر جتنا تجسس تھا اس سے زیادہ پریشان ہو رہی تھی کہ اگر آسیہ نے ان لوگوں کے بارے سے پوچھ لیا تو وہ کیا جواب دے گی۔ گوکہ علی جمائیر نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ وہ کوئی ایسی راہ نکالے گا آسیہ اس سے کوئی سوال نہ کرے۔ اب پتا نہیں وہ اس میں کامیاب ہوا تھا یا نہیں۔ یہ تو اس کی ہاں اور جانے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا اور اتنی دیر تک وہ مطمئن نہیں ہو سکتی تھی۔ تجسس پریشانی غور ایک احساس کو بھی دبا نہیں پاری تھی کہ مزید اندیشے سر ابھارنے لگے تھے۔ تب ہی دروازہ کھلنے کے آواز بڑھ کر اٹھ بیٹھی۔
”کون ہے بوا؟“
”میں۔“ رابعہ اندر آتے ہوئے بولی۔ ”میرے آنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“
وہ خاموش رہی۔
”اصل میں خواتین کی باتوں سے میں بور ہو گئی تھی اور تھینکس گاؤ کہ تمہاری امی نے محسوس تمہارے پاس بھیج دیا۔ کیا کر رہی تھیں؟“ ”تو وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”کچھ نہیں۔“
”تین کچھ سوچ تو ضرور رہی ہوگی۔“ رابعہ کی معنی خیز مسکراہٹ سے نظریں چرا کر وہ ادھر ادھر اندر دلی ایک مخصوص لے پر دھڑکنے لگا تھا۔ جس سے چہرہ گلابی ہو گیا اور رابعہ ہنستی ہوئی بولی۔
”نہ نہ بتاؤ پھر بھی میں جانتی ہوں۔ ویسے آج ہم اس مقصد سے نہیں آئے بلکہ میں تمہاری امی کو آسیہ اور عارفہ بیگم کے آنے سے رابعہ کی بات ادھوری رہ گئی اور وہ بھی فوراً ”بیڈ سے اتر کر عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔
”مشاء اللہ۔ بہت پیاری بیٹی ہے۔ اسے بھی لے کر آئیے گا۔“

”جی آئی! میں بھی نہیں کہنے والی تھی۔ اسے ضرور ساتھ لائیے گا۔“ رابعہ نے فوراً ”تائید کے کہا۔
”ہوں دیکھو۔“ آسیہ اپنے کسی خیال میں تھی۔

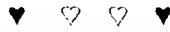
مما! وہ نیل بھائی کمرہ رہے ہیں۔ کوئی کام ہو تو بتا دیجیے۔ وہ بڑے ماموں کی طرف جارہے ہیں۔“
”یہ آپ کی بیٹی ہے۔“ آسیہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی عارفہ بیگم نے اس سے پوچھ لیا۔
”جی۔“ آسیہ انہیں جواب دے کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”ہاں بیٹا نیل سے کہو اس وقت ہوئی۔“
نیل البتہ شام میں وہ دروازہ جلدی آجائے تو۔
”جی اچھا“ وہ آسیہ کی بات پوری نے بغیر دیر سے پلٹ آئی اور نیل کو اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑا دیکھ کر آہستہ آواز میں بولی۔
”کوئی کام نہیں ہے، بس شام میں جلدی آجائیے گا۔“
”کچھ نہیں؟“
”مجھے کیا بتا ماما کہہ رہی ہیں۔“ وہ ان کے قریب سے نکل کر کمرے کے اندر آ گئی۔
”کچھی بات ہے۔“ نیل جگے گئے تو اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر گہری سانس کھینچی پھر دروازے سے زرا نکال کر انہیں جانے ہوئے دیکھنے لگی۔
جب وہ بیڑھیاں اتر گئے تب کچھ مطمئن سے ہو کر اس نے ٹیس کی طرف جانے کا سوچا مگر وہاں عارفہ بیگم کی باتیں سن سکے اور ابھی اپنی سوچ پر عمل کرنے کے لیے وہ خود کو تیار کر رہی تھی کہ بوا چائے اٹھائے راہداری میں نمودار ہو میں، جتھیں دیکھتے ہی اس نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا اور آکر اپنے بنا گئی۔
اس کے اندر جتنا تجسس تھا اس سے زیادہ پریشان ہو رہی تھی کہ اگر آسیہ نے ان لوگوں کے بارے سے پوچھ لیا تو وہ کیا جواب دے گی۔ گوکہ علی جمائیر نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ وہ کوئی ایسی راہ نکالے گا آسیہ اس سے کوئی سوال نہ کرے۔ اب پتا نہیں وہ اس میں کامیاب ہوا تھا یا نہیں۔ یہ تو اس کی ہاں اور جانے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا اور اتنی دیر تک وہ مطمئن نہیں ہو سکتی تھی۔ تجسس پریشانی غور ایک احساس کو بھی دبا نہیں پاری تھی کہ مزید اندیشے سر ابھارنے لگے تھے۔ تب ہی دروازہ کھلنے کے آواز بڑھ کر اٹھ بیٹھی۔
”کون ہے بوا؟“
”میں۔“ رابعہ اندر آتے ہوئے بولی۔ ”میرے آنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“
وہ خاموش رہی۔
”اصل میں خواتین کی باتوں سے میں بور ہو گئی تھی اور تھینکس گاؤ کہ تمہاری امی نے محسوس تمہارے پاس بھیج دیا۔ کیا کر رہی تھیں؟“ ”تو وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔
”کچھ نہیں۔“
”تین کچھ سوچ تو ضرور رہی ہوگی۔“ رابعہ کی معنی خیز مسکراہٹ سے نظریں چرا کر وہ ادھر ادھر اندر دلی ایک مخصوص لے پر دھڑکنے لگا تھا۔ جس سے چہرہ گلابی ہو گیا اور رابعہ ہنستی ہوئی بولی۔
”نہ نہ بتاؤ پھر بھی میں جانتی ہوں۔ ویسے آج ہم اس مقصد سے نہیں آئے بلکہ میں تمہاری امی کو آسیہ اور عارفہ بیگم کے آنے سے رابعہ کی بات ادھوری رہ گئی اور وہ بھی فوراً ”بیڈ سے اتر کر عارفہ بیگم کو سلام بھی کیا تو وہ آگے آکر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے آسیہ سے بولیں۔
”مشاء اللہ۔ بہت پیاری بیٹی ہے۔ اسے بھی لے کر آئیے گا۔“
”جی آئی! میں بھی نہیں کہنے والی تھی۔ اسے ضرور ساتھ لائیے گا۔“ رابعہ نے فوراً ”تائید کے کہا۔
”ہوں دیکھو۔“ آسیہ اپنے کسی خیال میں تھی۔

ابھرنے لگی، جو ایک دن شاہ سکندر کے ساتھ اس کے کانویٹ آئی تھی۔ اس وقت اگر وہ کسی شاعر کا نام لیتی تھی تو اس وقت بھی خوب صورت غزل کے سائے میں ڈھلی تصویر لگ رہی تھی میک اپ سے بے پناہ چہرہ اور سیدھی مانگ کے ساتھ ڈھیلی ڈھالی چوٹی زیورات کے نام پر کانوں میں ٹاپس تھے اور کھانگی میں دواغ علی جٹاگیر کو اس عورت کے بجائے اپنے چچا شاہ سکندر پر رحم آنے لگا تب ہی رابعہ اس کے قریب آ

جائی۔ ”کیا یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ وہاں چلیں ناں ڈاکٹر آسیہ کے پاس“ آخر آپ کو انہیں متاثر کرنا ہے۔
”ہاں ہوں۔ میں شاید انہیں متاثر نہیں کر سکتا۔“ اس نے پر سوچ انداز میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
”جی ہاں کیا ہے آپ میں ماشاء اللہ۔“

”اس نے نوک کر رابعہ کو مہمانوں کے پاس جانے کا اشارہ کیا تو وہ حیران ہو کر بولی۔
”کمال ہے۔ میں تو آپ کی تعریف کر رہی ہوں اور آپ۔“

”نیل باہن نہیں کرو، چلو جاؤ۔“ اس بار اس نے قدرے سختی سے نوا کا اور اسے وہیں بڑھاتے چھوڑ کر اپنے بے کاغذ خیال۔



”ہی ہی! کو کہ میں یہاں بہت بور ہو گئی ہوں پھر بھی واپس آ کر اچھی نہیں جاؤں گی۔“ مدحیہ نے ہنر کے قریب کھینچ کر اس پر کھنٹے نیکتے ہوئے کما تو سیما بھابی ایک نظر اس پر ڈال کر بولیں۔
”ہاں تو بیٹا! کون کہہ رہا ہے ابھی تمہیں واپس جانے کو جب تنگ دل چاہے رہو۔“

”میرا مطلب ہے، میں بیٹیں پر ہنسا ہوتی ہوں اور اس کے بعد جاب بھی نہیں کروں گی۔ آپ ماما سے کہیں ایس کی کالج میں ایڈمیشن کراویں اور ساتھ ہاسٹل میں بھی۔“

”ہاسٹل میں کیوں۔“
”لو کہ میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔“ اپنے تئیں وہ بڑی سمجھ داری سے کام لے رہی تھی۔
”بہا بھابی کو بے ساختہ ہنسی آگئی تھی روکنے کی انہوں نے کوئی کوشش نہیں کی۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہوں ماما جی! مجھے یہاں آئے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا اور زیادہ سے زیادہ آپ مجھے ایک ڈیڑھ روایت کر لیں گی اس کے بعد۔“

”تو فنی کی باتیں مت کرو۔“ اسے جدوجہد سنجیدہ دیکھ کر سیما بھابی کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ ٹوکتے ہوئے لگیں۔
”پتا ہے جب تم پیدا ہوئی تھیں۔ ہم نے اسی وقت آسیہ سے کہا تھا کہ تمہیں ہمارے پاس چھوڑ دے۔ اگر اس وقت وہ ہماری بات مان لیتی تو تم شروع سے بیٹیں ہو تیں تو کیا میں تمہیں بوجھ سمجھتی ایسا کیسے سوچ

رہتی؟“
”آپ سمجھ نہیں رہیں۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔
”تم سب سمجھ رہی ہوں۔ تم یہاں پر ہنسا چاہتی ہو ناں تو ہو جائے گا تمہارا ایڈمیشن اور اس کے لیے ہمیں

بے اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھیں تم۔ لا حول ولا میں تو تمہیں بہت عقل مند سمجھتی تھی ناں تو آسیہ سے بھی زیادہ احق ہو۔“

”ماما! حق نہیں ہیں۔ ڈاکٹر ہیں۔“ وہ ان کی خفگی سے خائف ہو کر بولی۔
”اتفاق کا کوئی خاص شعبہ نہیں ہوتا۔ یہ ہر شعبے میں پائے جاتے ہیں۔ بے شک اپنے سبب عیادت میں ماسٹر ہو

نہ کرے معاملات میں احق ہی رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنی ماکو دیکھو۔ تعلیمی میدان میں اتنی ذہین بیٹو فرسٹ پوزیشن لی لیکن زندگی کے دوسرے معاملات میں اتنی ہی احق ثابت ہوئی۔“

”بہا بھابی! اس کی بات پر مذاق میں شروع ہوئی تھیں۔ لیکن پھر آسیہ کا ذکر کرتے ہوئے سنجیدہ ہو گئیں۔
”ماما جی! آسیہ کو دیکھتی ہوں تو مجھے افسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ یا تو شاہ سکندر کے

جتنے کیف آگئیں تھے۔ اب اتنی ہی بورت تھی۔ رہ رہ کر صباحت پر غصہ آ رہا تھا اور بہت کوشش کے باوجود اس طرف سے دھیان بھی نہیں ہٹا رہا تھا۔ ادھر بات کیا ہوئی وہ جواب کیا دیتا۔ آخر اس کے دوست جینے نہ دیا۔

”کہاں الجھے ہو بار؟ میں اتنی دیر سے نوٹ کر رہا ہوں۔ تم مسلسل ہمیں اگنور کر رہے ہو اور اب انہیں بھی اس کا اشارہ نیل کی طرف تھا۔ وہ سمجھ کر اندر ہی اندر خود کو سرزنش کرتا ہوا نیل کی طرف متوجہ ہو کر پوچھنے لگا۔
”آپ کی کیا مصروفیات ہیں۔؟“

”گورنمنٹ کالج میں لیکچرار ہوں اس کے علاوہ بھی سارا وقت پڑھنے پڑھانے میں گزرتا ہے۔“ نیل نے نہ سے انداز میں بتایا تو ان کے قریب رہی ان کی اسگ کو دیکھتے ہوئے علی جٹاگیر نے بے اختیار بھنوں پکا کر کچے جیسے اسے حیرت ہوئی ہو۔ پھر فوراً ”موضوع بدل گیا۔“

”مجھے لگتا ہے میں نے پہلے بھی آپ کو نہیں دیکھا ہے۔“
”اتفاق سے میں بھی اس وقت سے یہی سوچ رہا ہوں کہ آپ کو کہاں دیکھا ہے۔“ پر سوچ انداز میں کہنے پر

نیل کو اچانک یاد آگیا۔ ”ہاں لا سبریری میں۔ ایک دو بار وہیں دیکھا ہے۔“
”مائی گاڈ! کہیں صباحت کے ساتھ تو نہیں دیکھ لیا۔ اس نے سوچا اور قدرے رک کر بولا۔“ ہو سکتا ہے م

نے بھی وہیں دیکھا ہو۔“
”بھائی! آپ کا فون ہے۔“ عقب سے رابعہ نے پکار کر کہا تو وہ دل ہی دل میں شکر کرتا ہوا ان سے معذرت کے فوراً اٹھ کر لابی میں آگیا۔

”ہیلو علی جٹاگیر اسپیکنگ۔“
”ٹھیک ہے۔“ ادھر سے صباحت کی قدرے ہنسی ہوئی آواز آئی تو اس کی ساری کونٹ پل میں رخت ہو گئی لیکن بظاہر خفگی سے گویا ہو۔

”کس بات کا شکریہ ادا کر رہی ہیں؟“
”خود ہی سمجھ جائیں۔“

”سوری۔ میں نہیں سمجھ سکتا۔“ اس نے صاف انکار کر دیا لیکن ذہن پر زور بھی دینے لگا تھا۔
”بھئی! ماما تک پہنچنے کے لیے آپ نے جو بھی طریقہ اختیار کیا۔ میں وہ سب تو سمجھ جاتی ہوں آپ نے نو

پر کوئی آج نہیں آنے دی اس کے لیے تھینک یو اگین۔“
اس نے وضاحت کے ساتھ دوبارہ شکریہ ادا کیا تو وہ شاکی ہو کر بولا۔

”لگتا ہے آپ کو میرا اعتبار نہیں تھا اور اس لیے آپ آئیں بھی نہیں۔“
”نہیں علی! میرے آنے کا سبب بے اعتباری نہیں بے اعتباری ہے۔“ وہ بڑی سادگی سے اعتراف کر

جس سے اس کی ظاہری خفگی پل میں ہوا ہو گئی بے ساختہ مسکرا کر بولا۔
”وہ اقبال نے کیا کہا ہے کہ اچھا ہے دل کے ساتھ رہنا سب ان عقل۔“

”جی ہاں میں نے اسی پر عمل کیا ہے۔“ وہ ہنسی۔
”گڈ اور اس کے اگلے مصرعے پر عمل کا کب تک ارادہ ہے۔“ اس نے محظوظ ہو کر پوچھا تو وہ بے ساختہ

”اس پر پہلے عمل ہو چکا۔“
علی جٹاگیر کا دلکش قہقہہ بڑا جان دار تھا۔ ادھر وہ شپٹا گئی۔

”میں فون بند کر رہی ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔
”بہو فون!“ وہ ریسیور رکھ کر لابی سے نکلا تو رابعہ سب مہمانوں کو کھانے کے لیے لان میں لے جا رہی تھی۔

وہیں رک کر آسیہ کو دیکھنے لگا وہ سفید ساڑھی میں بڑی باوقار اور سب میں نمایاں لگ رہی تھی۔
علی جٹاگیر بالکل غیر راوی طور پر اسے شاہ سکندر کے ساتھ سوچنے لگا تو اس کے ذہن کے کیڑوں

ساتھ کچر وائز کر لیتی یا پھر۔۔۔
 ”آپ کا مطلب ہے، ماما کو دوسری شادی کر لینی چاہیے تھی۔“ سیما بھابی کے خاموش ہو جانے پر اس نے
 سمجھ کر پوچھا تو وہ نظریں چراتے ہوئے بولیں۔
 ”نہیں، میرا یہ مطلب نہیں ہے۔“
 ”پھر کیا اچھا نہیں کیا ممانے؟“
 ”یہی کہ تمہیں شروع سے میرے پاس نہیں چھوڑا۔“ سیما بھابی بڑی خوب صورتی سے بات بتا گئیں اور پھر
 سے اس کی ٹھوڑی چھو کر کہنے لگیں۔ ”خیر، آپ تم میرے پاس ہو اور میں تمہیں ہرگز واپس نہیں جانے دے گی۔“
 تم یہیں پڑھو گی اور یہیں تمہاری شادی ہوگی ٹھیک۔“
 وہ سر ہچکاکرائے ناخن دیکھنے لگی۔
 ”تم اگر پہلے کہیں تو اب تک تمہارا ایڈیشن ہو بھی چکا ہوتا۔ خیر میں آج ہی ٹھیکیل سے کہوں گی۔“
 ”ان سے پہلے آپ ماما سے پوچھ لیں۔“ وہ مستحالی۔
 ”تم کہتی ہو تو پوچھ لیں گے اس سے بھی۔“ سیما بھابی کو اس وقت وہ چھوٹی سی معصوم بچی لگ رہی تھی اور
 اسی طرح اسے ہلار رہی تھیں۔

♥ ♥ ♥ ♥
 سردیوں کی راتیں ایک تو جلدی شروع ہو جاتی ہیں دوسرے سناٹا بھی چھا جاتا ہے۔ ابھی آٹھ بجے تھے اور گا
 رہا تھا جانے کتنی رات بیت گئی ہو۔ وہ عشاء کی نماز پڑھنے جا رہی تھی جب آئیہ کا فون آیا تھا کہ اسے آنے میں
 ہو جائے گی اس لیے وہ کھانا کھا لے۔
 وہ نماز پڑھ کر فارغ ہو گئی تو بوائے اس سے کھانا لگانے کا پوچھا اور اسے بھوک تو لگ رہی تھی۔ لیکن نیل
 نہیں تھے اس لیے منع کرتے ہوئے بولی۔
 ”آپ کھائیں بوا! میں جب نیل بھالی آئیں گے ان کے ساتھ کھالوں گی۔“
 ”آئیہ تو آنے والی ہو گی ناں۔“
 ”نہیں ماما کا فون آیا تھا۔ وہ دوسرے آئیں گی اور آپ کو ان کے انتظار میں بیٹھے رہنے کی ضرورت نہیں۔
 آپ کھانا کھائیں اور لحاف میں جا لیں۔ ماما کے لیے کھانا میں گرم کر دوں گی اور یہ نیل بھالی پتا نہیں کہاں
 ہیں۔“
 آخر میں وہ بری طاقی ہوئی نیل کو دیکھنے کی غرض سے بالکلونی کا دروازہ کھولنے لگی تھی کہ فون کی تیل پر دروازہ
 کر لالی میں آگئی۔
 ”آپ تو مڑے میں ہو گئے تم سب۔“ دوسری طرف مدیہ تھی اس کا، آواز سننے ہی شروع ہو گئی۔ ”ہمت
 کرنے لگی تھی ناں میں تم سب کو۔ سچ بتاؤ کتنے نفل شکرانے کے بڑھے مہمانے اور تمہارے۔“
 ”بکومت اور فوراً واپس آؤ۔ میں ہمت بور ہو گئی ہوں اور اس بھی۔“ اس نے ٹوک کر کہا۔
 ”میرے بغیر۔“ مدیہ کی حیرت میں ڈوبی آواز آئی۔
 ”اور نہیں تو کیا۔“
 ”اچھا کبھی آجاؤں گی تم سے ملنے۔ فی الحال تو تم میرے ڈاکو مینٹنس بھیج دو کیونکہ میں یہاں کلن میں
 لے رہی ہوں۔“ مدیہ نے اس پر احسان کرتے ہوئے کہا تو وہ چیخ پڑی۔
 ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“
 ”اے سیدھی سادی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ میری انٹرکس شیٹ اور سرٹیفکیٹ
 ہرگز نہیں۔ یہاں امتحان ہونے والے ہیں تم فوراً واپس آؤ۔“
 ”نہیں صا۔ میں اب وہاں نہیں آؤں گی میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ تم ماما کو بھی بتا دینا اور ان سے کہنا۔“

شش نہ کریں اور اگر انہوں نے میرے ساتھ اس سلسلے میں کوئی زبردستی کی تو میں سچ اپنے باپ کے
 ہوں گی۔“
 ”ایک دم سنجیدہ ہو کر اپنی ہمیشہ زانی وار تنگ دوہرائی تو وہ رو پڑی۔
 ”یہی ہو مدھو! تمہیں ذرا احساس نہیں کہ۔“
 ”لوں میں احساس بتاؤ۔ میرے ساتھ جو ہوا اس پر دوسرے کو احساس کیوں نہیں دلایا جاتا۔ میری تقدیر
 لایا جاتا ہے اور تم کس حساب سے میری دادی ابان بننے کی کوشش کرتی ہو۔ بڑی عقل ہے تمہارے
 مدیہ نے تنفر سے فون پٹا تھا۔
 ”مدیہ! اس نے بے قراری سے کریڈل پر ہاتھ مارا پھر بائوس ہو کر ریسپور رکھ دیا اور ہتھیلیوں سے
 زنی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھی تھی کہ نیل کی آواز پر ہاتھ نیچے گرا کر انہیں دیکھنے لگی۔
 انہوں تھا؟“ وہ پوچھ رہے تھے۔
 ”۔۔۔“
 ”برہی تھی؟“
 ”نہیں جی! اس سے پوچھ لیں۔“ اس کی آنکھیں پھر چھلکنے کو ہو رہی تھیں۔ اس لیے جلدی سے کہہ کر
 میں آئی۔
 ”نیل اس کے پیچھے چلے آئے۔“ یہ کیا یوقنی ہے۔ تم جانتی تو ہو مدھو کو پھر اس کی باتوں پہ رونے کا
 مجھے بتاؤ اب کیا کیا ہے اس نے؟“
 ”کہ رہاں نہیں لے گی۔ وہیں پڑھے گی! اپنی بارکس شیٹ وغیرہ منگوائی ہے اس نے کہہ رہی تھی
 زبردستی کی تو وہ سچ شاہ سکندر کے پاس چلی جائے گی۔“ اس نے روتے ہوئے بتایا تو نیل گہری سانس
 لے۔
 ”ہاں کہ مدھو کی تمہو نوں۔“
 ”نہ کیا کیا ہے۔“ وہ فوراً بولی۔
 ”نیل کی لکھی ہو سوائے رونے کے اور اسے دھمکانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔ بس ساری زندگی میں
 رہا ہوں۔“ نیل کو جانے کیوں غصہ آ گیا تھا۔
 ”نیل جلدی اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔
 ”مدھو کے پاس جانے کی وہ ضرور جائے آخر پاپ ہے اس کا۔ تمہیں اگر باپ سے ملنے کا شوق نہیں ہے
 مدھو کو جانے دو۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تمہیں بھی جانا چاہیے۔“
 ”ہاں! میں میں بھی جاؤں گی۔“ لیکن اس طرح نہیں جیسے مدھو بات بے بات دھمکی دیتی ہے میں ماما کی
 سے جاؤں گی۔“ وہ کہہ کر ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی تو نیل بار نیل بجائے اسے چپ کرانے کے
 سے نکل گئے۔
 ”مدھو! اسے احساس ہوا تو ہاتھ نیچے گرا کر بہت حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا پھر ان کے پیچھے جانے کا بس سوچ
 ”نیل ہمت نہیں ہوئی کیونکہ ان کا غصہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس کے رونے پر تھا یا مدیہ پر اور کسی پر
 ”نیل تو وہ کبھی نہیں کرتے تھے کہ اسے روٹا چھوڑ کر چلے جائیں۔
 ”مدیہ! پراگھتی ہوئی ادھر سے ادھر ٹھٹھنے لگی پھر اچانک کھانے کا خیال آیا تو سب بھول کر ان کے
 ”نیل! آپ کے لیے کھانا گرم کروں؟“
 ”نیل! نیل کے پاس کھڑے تھے اس کی سمت ذرا سی گردن موڑ کر پوچھنے لگے۔
 ”نیل! یہاں؟“

اس کی ماں مر گئی ہے کیا۔؟“
 باب مہر النساء۔ ”وہ بے اختیار چلائے پھر فوراً“ ہونٹ بھیج کر خود پر قابو پانے کے بعد کہنے لگے۔
 بابا جان یہاں لانے کی تدبیر کر رہے ہیں وہ میری بیٹی ہے اور مجھ پر اتنا ہی حق رکھتی ہے جتنا الماس۔ لیکن
 سے کیا۔ یہ تو نہیں تھا کہ میرے پاس دینے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اگر وہ محروم
 رہی تمہاری وجہ سے۔ تمہاری وجہ سے مہر النساء! بابا جان نے مجھے مجبور اور بے بس کر کے مجھ سے وہ کچھ
 دینے نہیں چاہتا تھا اور میں تو ابھی بھی اتنا مجبور ہوں کہ خود جا کر اپنی بیٹی کو نہیں لاسکتا۔ اسے لانے کے
 لیے تو تدبیریں کرنی پڑ رہی ہیں۔ خدا معلوم اتنے پیسوں بعد انہیں یہ خیال کیسے آیا کہ میری اور بھی کوئی
 نئی ہے اور یہ کہ اسے اس کا حق ملنا چاہیے۔ کتنی عجیب بات ہے پہلے خود اسے محروم کیا اور اب خود

ازرا سی ہنسی میں استہزا آمیز دیکھ تھا۔
 شاہ بڑے ضبط سے سن رہی تھی۔ اس کے خاموش ہونے پر توجہ کر بولی۔
 بابا جان کو اگر اس کا خیال آئی گیا ہے تو اسے یہاں لانے کی کیا ضرورت ہے۔ جو اس کا حق دینا دلانا
 نیا اور۔۔۔
 بابا جان کو سب سے پہلے مجھے بھجوانا پڑے گا۔“ شاہ سکندر کو جانے کیا سوچ محفوظ کر گئی۔

طلب ہے آپ کا۔“
 ”کہیں نہ سمجھو تو اور بات ہے البتہ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ وہ بچی میرے لیے کسی طرح بھی الماس سے کم
 نہیں ہے شک اس سے کوئی تعلق نہ رکھنا لیکن اسے کوئی رک پچانے کی بھی کوئی شش نہ رہا۔“ شاہ سکندر
 ہوئے لمحے میں سخت تنبیہ تھی۔
 ”مہر النساء نے سخت سے سر جھٹکا۔“ وہ آئے گی تب تو۔“
 ”آئے گی۔“ یقین سے کہتے ہوئے شاہ سکندر جانے کہاں کھو گئے تھے۔



دقت بہت موڑنا کر دھننے بیٹھی تھی کہ عمر نے بہت خاموشی سے آکر اس کے سر پر ہاؤ کی آواز نکالی تو وہ
 ہلچل مچا کر دھک دھک کر کے دل پر ہاتھ رکھ کر تار اٹھکی سے بولی۔
 ”میرا بھائی ہے اگر میرا ہاتھ ٹھیک ہو جاتا تو؟“
 ”عمر نے قہقہہ لگا کر اس کا مذاق اڑایا۔

۔۔۔ سیدھی شرافت سے طے جاؤ یہاں سے ورنہ میں ماما کو پکار کر تمہاری خوب کھجانی کر دوں گی۔“ اس
 نے قہقہے سے بری طرح تپ کر دھکی دی تو وہ بجائے مرعوب ہونے کے اس کے سامنے بیڑ پڑھے گیا اور
 ارمی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”بھائی جان! سیدھی شرافت سے۔ تمہارا تم کون سے طریقے سے جاؤ گی۔“
 ”مال جاؤں گی۔“ میرا کہہ رہی۔

اسے سے نہیں کھڑے جانے کی بات کر رہا ہوں۔ سنا ہے تمہارے لیے کسی نائی گرامی کا پر پوزل آیا
 نامعنی خیزی میں شوخی بھی شامل ہو گئی تھی۔
 ”بس تمہارا؟“ وہ ”نائی گرامی“ پر اچھل پڑی۔

اسے پوچھنے آیا ہوں اور تم مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ سیدھی طرح بتاؤ، کسی اے سی ڈی سی کارشتہ آیا
 بڑے بیٹھے ہوئے رعب سے کہا تو وہ نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے بولی۔
 ”ہاں۔“

”ہوں۔“ چند منٹ بعد بابا جان متوجہ ہوئے اور انہیں متوجہ کرنے کے لیے ہٹا کر بھر کر بولے۔ ”کوئی نام
 ہے؟“
 ”میرا اخبار ہے۔“ انہوں نے اخبار تمہ کر کے واپس دیا پھر بابا جان کو دیکھ کر مسکرا کر بولے۔ ”نہر
 خبریں اخباروں میں نہیں چھپتیں۔“
 ”جواب! بابا جان کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔
 ”آپ سنا میں وہ جو ابھی بیگم گرامی سیٹھ ہوئی ہیں انہوں نے کچھ معاملہ آگے بڑھایا یا نہیں۔“ شاہ
 غالب! اسی مقصد سے آئے تھے جب ہی فوراً اصل موضوع کی طرف آگئے۔
 ”میں بھی ہم علی سے اسی سلسلے میں بات کر رہے تھے۔ اس نے بتایا ہے، آج دہن بیگم باقاعدہ اس کا رشتہ
 لگی تھیں۔“

”پھر کیا جواب دیا آسہ نے؟“ شاہ سکندر بے صبری کا مظاہرہ کر گئے جس پر بابا جان نے بڑی کھوجتی ہوئی نظر
 سے انہیں دیکھا پھر قصداً ”سرسری انداز میں بولے۔
 ”سوچنے کو وقت مانگا ہے اس نے اور پھر اپنے بھائیوں سے مشورہ بھی ضرور کرے گی ان کی دیر پر جو بیٹو
 اب تک۔“

”لیکن وہ کسی رپوچھ تو نہیں ہے۔“ شاہ سکندر بلا ارادہ کہہ گئے۔
 ”یہ تو وہی جانتے ہوں گے، بہر حال ہمیں اس سے کوئی بحث نہیں۔ ہم صرف تمہاری بیٹی کے لیے لگا
 ہیں۔ اگر آسہ بیگم نے اسے اپنے ہی خاندان میں بیاہ دیا تو یہ اس بچی پر بڑا ظلم ہو گا۔ ساری زندگی اسے اپنے
 دادا کے طعنے سننے پڑیں گے۔ غیص اس نے بھی دیکھا ہی نہیں اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ دراصل
 رگوں میں دوڑنا ہمارا خون ہے۔ جس کی وجہ سے ہم ہادیہ اس کے لیے فکر مند ہیں اسی طرح اس کے
 باپ دادا کا طعنہ سنا عذاب ہو گا یہ بالکل فطری بات ہے۔ اس لیے جب تک وہ بچی اسے لوگوں میں نمبر
 ہمیں چین نہیں آئے گا۔ بابا جان نے بڑی خوب صورتی سے اس میں تاریک پہلو سمجھا کر کہا تو وہ اندر ہی
 ہو کر بولے۔

”چتا نہیں بابا جان! اس بچی کے دل میں ہمارے لیے کیا ہے۔ محبت، نفرت یا کچھ بھی نہیں۔“
 ”ہونے والوں نے تو نفرت کا بیج ہی بویا ہو گا۔ خیر، تمہیں اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔
 انشاء اللہ خوش رہی ہوگی اور ہاں تم نے اس کے بارے میں پاسو چاہا۔“
 بابا جان نے محض ان کا دھیان بنانے کی خاطر ان دو ساری بیٹی کا ذکر چھین دیا تو وہ چونک کر کہنے لگے۔
 ”الماس تو بہت چھوٹی ہے بابا جان! ابھی تو میرا شرب کیا ہے اس نے۔ اور میرا ارادہ اسے ڈاکٹر بنانے کا۔
 اللہ دہن ہے آسانی سے میڈیکل میں جاسکتی ہے۔“
 ”دس۔“ بابا جان نے سوچتے ہوئے انداز میں ہوں کی آواز نکالی پھر کافی دیر بعد بولے۔ ”اچھی بات۔
 شاہ سکندر رائٹ کھڑے ہوئے۔

”میں چلتا ہوں بابا جان! آپ آرام کریں۔“
 بابا جان نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تو وہ انہیں شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکل آئے اور جب
 میں داخل ہوئے تو آگے مہر النساء ہنسنے لگی تھی۔ دیکھتے ہی کہنے لگی۔
 ”شاہ! آپ نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھاپی۔“

شاہ سکندر کچھ بولے نہیں لیکن جسم سوالیہ نشان بن گئے تھے۔
 ”کہا ہے سچ ہے کہ شرمیں آپ کی کوئی اولاد ہے جسے بابا جان یہاں لانے کی تدبیر کر رہے ہیں۔
 مہر النساء کے غور میں اضافہ ہی کیا تھا اور اب تو خاصے جارحانہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔
 ”ہاں۔“ شاہ سکندر مختصر جواب دے کر فہمی پر چاہتے تھے تو وہ تملاکر ان کی طرف پٹی۔

راکی لعنت۔ ”وہ خلیفہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر بولا۔
 ہو جاتا ہے۔“ اس نے پھر جانے کے لیے قدم بڑھائے تو عمر ایک ہی جست میں اس سے پہلے
 اٹھا اور وہ لمبی رکی نہیں۔ اس کے پیچھے نکل کر پہلے اسے بھاگتے اور سیڑھیاں اترتے دیکھا پھر
 بے پروا تنک دینے کے بعد اندر بھاگ کر پوچھنے لگی۔

”ہاں؟“
 یہ اونچا کر کے سینے تک کبل اوڑھے لیٹے ہوئے کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔ کتاب پر سے
 حوالہ نظروں سے دیکھنے لگے۔
 ”شرب کرنا تو نہیں چاہتی تھی۔ لیکن۔“ وہ اندر آ کر رک گئی۔
 ”ہاں؟“ نبیل نے نرمی سے کہا پھر بھی وہ کچھ سٹپٹائی۔
 ”تھا تھا کہ آج آپ طارق روڈ گئے تھے؟“

”صاف انکار کے ساتھ نبیل کے کیوں نے اسے مزید بوکھلایا۔ بڑھانے کے انداز میں عمر کو
 تو وہ کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے بولے۔
 ”تمہارے ساتھ یہاں آؤ۔“
 باری ہوں۔“

یہ نے رعب سے بیکار تو بہت دھیرے دھیرے آگے آتی ہوئی بولی۔
 ”ہاں عمر کہہ رہا ہے کہ اس نے آپ کو طارق روڈ پر دیکھا تھا ایک لڑکی کے ساتھ۔ میں نے اس کی
 نام نہیں کیا نبیل بھائی۔“
 جسے تصدیق کرنے آئی ہو۔“ نبیل کے چہرے لہجے نے اس کا پورا وجود سن کر دیا تھا۔



”آئیہ نے بیٹیوں کے مستقبل کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔ اسے شروع سے ان کی فکر تھی اور
 دونوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر کسی قابل بنانے کے بعد ان کی شادیاں کرے۔ لیکن دونوں میں سے کوئی
 اتنی اچھی نہیں تھی۔ بہت محنت کے بعد بس یہ تھا کہ اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتی تھیں اور ظاہر
 لیے ان کا یہ رزلٹ خاصا بائوس کن تھا اور بہت جلد اس نے ان کی اعلیٰ تعلیم کا خواب جھٹک کر یہ
 بات تھا کہ دونوں کو گریجویشن کرا کر ان کی شادی کر دے گی اس کے خیال میں بیکار لڑکیوں کی عمریں
 نہ نہیں تھا۔“

پلے جب مدح کی مستثنیٰ ہوئی تھی تو وہ کیونکہ گھر کی بات تھی اس لیے اسے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ
 حالات طے کرتے ہوئے اسے کن مراحل سے گزرنا ہو گا، اتنا فانا جیسے مدح کی بات طے ہو گئی
 بالآخر صباحت کے لیے بھی جب کوئی اچھا رشتہ آیا، وہ اسی طرح اس کے فرض سے سبکدوش ہو
 اس سے پہلے ہی احمر نے باہر شادی کر کے اس کے دل کو جو دھچکا پہنچایا تھا اس سے رشتوں پر سے
 اس کا تھاقت بھی وہ بہت محتاط ضرور ہو گئی تھی اور یہ جان لیا تھا کہ بیٹیوں کی شادی آسان بات
 بہمات کے لیے جو پر پوزل آیا تھا اس کے بارے میں اس کا خیال تھا مکمل جھان بین کا کام عدیل
 سے لے لیں۔ لیکن اتفاق سے ان دنوں عدیل بھائی اپنے بڑے نور پر جا پان گئے ہوئے تھے اور اسے کوئی
 سن بھی خود اسے بھی اسلام آیا جانا تھا۔

اباں سے واپس آنے کے بعد عدیل بھائی سے بات کرے گی اور کیونکہ یہ طے تھا کہ اس نے
 نبیل کے کرائس لیے عارف بیگم کو بھی اس نے کوئی امید افزا جواب نہیں دیا تھا اس کے باوجود چار
 ہفتے کہ وہ پھر ان موجود ہو۔ اتفاق سے اسی شام چھ بجے اس کی اسلام آباد کی فلائیٹ بھی اور
 ان کا ادھر پر وہ خاصی جز بڑ ہوئی۔ اپنی پکینگ کا کام صباحت کو سونپ کر وہ بڑی جلت میں نیچے آئی اور

”سچ کہو۔ تمہیں پتا نہیں ہے۔“
 ”میں سچ کہہ رہی ہوں۔ کل کوئی مہمان آئے تو تھے۔ لیکن مجھے نہیں پتا، وہ کس لیے آئے تھے۔ مہمان
 نیچے ہی بٹھایا تھا پھر نبیل بھائی کو بھی وہیں بلا لیا۔“ وہ رک رک کر بتا رہی تھی کہ عمر نے ٹوک دیا۔
 ”بس مان لیا نہیں پتا۔“

”بس مان لیا ناں۔ اب جاؤ مجھے پڑھنے دو۔“ اس نے دل ہی دل میں شکر کرتے ہوئے دوبارہ کتاب اٹھائی۔
 ”کیا کرو گی پڑھ کر۔ وہ ڈی سی تم سے نوکری تو نہیں کروائے گا اور اگر کروائی بھی ہوئی تو اپنی سفارش پر
 کہیں تھانے والی لگوائے گا۔“
 ”کیا؟“ اس نے چیخنے کے ساتھ کتاب عمر کے سر پر دے ماری۔ ”بہت ہی کمینے ہو تم تھانیدار اہل تلوانہ“

بیوی کو اور اپنی سالی کو اور۔“
 ”سناں گو۔“ عمر نے فوراً لقمہ دیا۔
 ”ہاں بہت اچھے لگو گے تھانیدار بیویوں میں گھرے ہوئے۔ ادھر سے وہ مارے گی ادھر سے وہ۔“ وہ بولے چارہ
 تھی اور عمر نے جا رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوئی تب بڑی معصوم سی شکل بنا کر بولا۔

”ان ساری باتوں کے لیے ڈی سی ہونا ضروری ہے جو کہ میں نہیں ہوں۔ خیر کوئی بات نہیں تم ان سے نہ
 تمہاری یہ ساری خواہشیں پوری کر دیں گے۔“
 وہ سمجھتی تھی کہ وہ باز آنے والا نہیں ہے اس لیے ایک دم خاموشی اختیار کر لی اور کچھ بے نیازی بھی دکھانے لگی
 ”ارے اصل بات یہ تھی تو میں بھول ہی گیا۔“ قدرے توقف سے عمر نے اچھل کر اپنے تئیں اسے چوڑا

لیکن اس کی بے نیازی میں کوئی فرق نہیں آیا۔
 ”ایمان سے صبا! تم سنو کی تو حیران ہو جاؤ گی بلکہ تمہیں یقین بھی نہیں آئے گا خود میں اپنی آنکھوں سے دیکھ
 بھی یقین نہیں کر رہا۔“ عمر نے مزید جس بیدار کرنے کی کوشش کی اور اس بار کامیاب ہو گیا۔

”کیا کیا پتا ہے۔“ وہ پوری طرح متوجہ ہو گئی۔
 ”وہ اپنے نبیل بھائی۔ آج میں نے انہیں طارق روڈ پر ایک لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا۔“ عمر نے اس کی
 جوبہ کر چینی آہستہ آواز میں بتایا کہ وہ اتنی زور سے چیخی۔
 ”جھوٹ مت بولو۔“

”جو چاہے تمہارے لود۔“
 ”نبیل بھائی لڑکی کے ساتھ۔“ وہ بے یقینی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔
 ”اور لڑکی بھی خاصی ماڈرن، بلکہ جینز پر آف داسٹنٹی شرٹ پہنے ہوئے تھی اور بہت اتر اتر کر چل رہی
 میں نے بہت کوشش کی ان تک پہنچنے کی لیکن براہر ٹریفک کا میرے روڈ کراس کرنے تک وہ دونوں گائٹ
 کر میری نظروں کے سامنے سے نکل گئے۔“

عمر نے جوش سے جاتے ہوئے آخر میں مایوسی کا اظہار کیا۔
 ”میں ابھی پوچھتی ہوں نبیل بھائی سے۔“ وہ اٹھنے لگی تھی کہ اس نے روک دیا۔
 ”ان سے کیا پوچھو گی؟“
 ”یہی کہ ان کے ساتھ لڑکی کون تھی۔“ وہ ساگی سے بولی۔

”جلدی کیا ہے۔ ذرا صبر سے کام لو اور دیکھو کہ وہ خود سے کب بتاتے ہیں۔“
 ”وہ پتا نہیں کب بتائیں گے میں اتنا صبر نہیں کر سکتی۔“ وہ واقعی کھڑی ہو گئی۔
 ”تمہاری مرضی لیکن خبردار جو میرا نام لیا تو میں صاف مکر جاؤں گا کہ میں نے تم سے کچھ نہیں
 سننے کے ساتھ کہنا تو وہ جاتے جاتے رک کر بولی۔
 ”اس کا مطلب ہے تم نے جھوٹ بولا ہے۔“

”مخلوق کو اسے تشویش سے آگے دیکھ رہے تھے۔“

عارفہ بیگم جیسے اپنے آپ سے بولیں۔

ب سگریٹ نہیں پینے دی۔ میں جیسے ہی سگریٹ نکالنے کے لیے جیب پر ہاتھ رکھتا ہوں فوراً ٹوک دیتیں وہ میری ہاتھ نہیں سہکتا۔
 ”کبھی کبھی ایسا۔“
 ”اے! میں نے تو آپ جیسے ہمسفر نہیں ملے۔“ انہوں نے دھوکے کے مرغلوں میں سے اسے دیکھا تھا۔ اتنی دورانی دور، جیسے زندگی روٹھ جائے تو ممانا ناممکن، ان کا دل چاہا اس سے پوچھیں اتنے برس اس نے کیسے بچا۔ بھی ان کے سنگ گزرے لمحات کو یاد کیا۔

”نہیں۔“
 ”نہیں۔“
 ”روٹنے منانے کی ادائیں۔“
 ”جان دے کی باتیں۔“

”دل کی تسکین میں ہر نئے دن کے آغاز پر ان کے نام کا پھول کھلاتی تھی ان کا کیا ہوا؟“
 ”بے سبب نفرتوں کی آندھ جیوں کی نذر ہو گئے۔“

”اے! وقت کا پیسہ الٹا چلنے لگے۔ میں سارے ماہ و سال سمیٹ کر پھر اسی مقام پہ جا کھڑا ہوں جہاں میرے ہاتھ پائی کا ہاتھ تھا۔ اور میں اسی محبت سے اسے پکاروں۔“

”انہوں نے بے اختیار پکار لیا تو وہ جو پہلے ہی ان کی نظروں کی تیش سے نروس سی ہو رہی تھی اپنی ہونٹوں۔“

”نہی۔“ انہیں فوراً ہی احساس بھی ہو گیا۔ ”میں جانے کس وقت میں کھو گیا تھا۔ ہوتا ہے کبھی کبھی ایسا۔“

”بے خدا۔“ اسے اپنے بدن پر منھنی منھنی چوٹیاں ریگتی محسوس ہوئیں تب ہی ہوشش نے چائے کی مائے کی تودہ و کپ اٹھا کر ایک اس کی طرف برسواتے ہوئے بولے۔

”بے چارے۔“

”بے مت خاموشی سے کپ تھام لیا اور ایک سب لے کر شیشے سے باہر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا آسمان نہ زمین، خلا کا بھی بس احساس تھا۔ کئی درودہ محض ان سے بچنے کی خاطر ہنسنے لگی تھی۔“

”صرف شاہ سکندر کو اسے متوجہ کرنے کے لیے پکارنا پڑا۔“

”نکس کیوزی ڈاکٹر آسیر۔“

”ہو گی ہو بھی لیکن ان کی طرف دیکھا نہیں۔“

”میں پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ کی بیٹی کیسی ہے؟“ انہوں نے کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے یاد پر بات غیر متوقع نہیں تھی جب ہی بہت سکون سے بولی۔

”بے چارے؟“ فطری تجسس کے ساتھ ان کے بے ساختہ سوال شروع ہو گئے۔

”بے چارے! اس کے تھوڑے روز کے امتحان ہیں۔“

”بے چارے! آئی مین اس کے آئندہ کے بارے میں کیا سوچا ہے آپ نے؟“

”نا اچھا پوئل سے یا تلاش کرنا پڑے گا۔“ وہ اب براہ راست اسے دیکھنے لگے تھے۔

”اتنے قریب اس ستم گر کی موجودگی سے آسیر کا دل ڈوبنے لگا۔ کیونکہ فرار کی راہ نہیں تھی۔ ہوشکل تہم در قابو پا کر اس نے کچھ غیر محسوس طریقے سے پہلے نظروں کا زاویہ بدلا پھر ایک سے سر ہٹا کر سیدھی ہو بیٹھی۔“
 ”دشاید آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے شاہ سکندر ایک تک اسے دیکھنے جا رہے تھے غالباً یہ ڈر تھا کہ آنکھیں پھٹنے سے سپنا ٹوٹ جائے گا۔“

”آسیر نے ان کی بات کا جواب دیا نہ ہی چہرے پر کوئی تاثر ابھرا بلکہ یوں جیسے وہ اس سے نہیں کسی اور سے مخاطب ہوں۔“

”آسیر پلیر اتنی انجان نہ بنیں، میں آج بھی اس وعدے کا پابند ہوں، خود سے آپ کے راستے میں نہیں آیا۔“

”چند گھنٹوں کی ہم سفری قسمت کی مہربانی ہے یا ستم ظریفی، میرے لیے بہر حال اس کا ایک ایک پل انمول ہے۔ میں آپ کا احساسات ممنون رہوں گا اگر جو آپ تارا ضلکی اور نفرت سے نظرس چرا کر فقط اس سفر میں اور کچھ نہیں دوست ہی سمجھ کر بات کریں مجھ سے۔“ شاہ سکندر کے انداز میں لہجے میں عاجزی تھی۔

”وہ بے اختیار ذرا سی گردن موڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔“ شاہ سکندر کا مقصد کچھ بتانا تھا۔ ”دو اجنبی بھی ساتھ بیٹھے ہوں تو بات کر لیتے ہیں، ہم میں تو پھر کبھی آشنائی تھی۔“ شاہ سکندر کا مقصد کچھ بتانا تھا۔

”یاد دلانا نہیں تھا بس یوں ہی کہہ گئے تھے پھر بھی اس کی پیشانی شکن آلودہ ہو گئی جس پر وہ فوراً معذرت کرتے ہوئے بولے۔“

”اے! ایم سوری، میرا مطلب ہے، ہم بھی اجنبیوں جیسی باتیں تو کر سکتے ہیں جیسے سب سے پہلے مجھے یہ پوچھنا چاہیے کہ آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

”اسلام آباد۔“ اس کے ہونٹوں نے بے اختیار جنبش کی تھی ایسے ہی بے ساختہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”وہ کچھ کنفیوز سی ہو کر نظریں چرائی۔“ شاہ سکندر نے بڑے محفوظ انداز میں فوراً ”اگلا سوال کر دیا تو وہ جیسے ہتھیار ڈال دیا۔“

”اسلام آباد کس کس کے پاس؟“ شاہ سکندر نے بڑے محفوظ انداز میں فوراً ”اگلا سوال کر دیا تو وہ جیسے ہتھیار ڈال دیا۔“

”بھائی کی اس۔“

”دکھنا عرصہ قیام رہے گا وہاں؟“

”میں کوئی چار پانچ دن۔“

”پھر واپس کراچی۔“

”جی۔“

”کراچی میں کیا مصروفیات ہیں آپ کی؟“

”گھر اور کلینک۔“

”تو آپ ڈاکٹر ہیں۔“

”جی۔“

”دیر کی گندویسے مجھے ڈاکٹروں سے ایک شکایت ہے۔“

”وہ کیا؟“

”ابھی میں سگریٹ کا پیکٹ نکالوں گا اور آپ مجھے اس کے نقصانات پر لیکچر دنا شروع کر دیں گی۔“

”نہی میں مسٹر ایٹ کے ساتھ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اسے دیکھا تو وہ سمجھ کر بولی۔“

”جی نہیں آپ شوق سے پیئیں، میں بالکل مائل نہیں ہوں گی۔“

”تھینک یو۔“ انہوں نے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں باہا اور اسے لاسٹرو کھانے کے بعد کھنے

”میں ایک بار امریکا جا رہا تھا ایسے ہی میرے ساتھ ایک خاتون بیٹھی تھیں، اٹھارہ گھنٹے کے سفر میں

”اے بی بی! ہم نے نہیں اس کا ہر انداز ازبر تھا۔“
”تو نے تو اب ہمیں آپ پر پوزل کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ تو نے ایک پوزل اگر میں اس کی طرف سے مطمئن ہو گئی تو انشاء اللہ جلد صبا کی شادی کروں گی پھر۔“ وہ ایک دم ہونٹ بچھڑتی اچانک خیل آیا تھا کہ انہیں صرف ایک بیٹی کی خبر ہے۔

”کون، کون ہے آئی مین وہ لڑکا کیا آپ کی فیملی میں ہے۔؟“ شاہ سکندر پورے دھیان سے اس کی طرف پوچھ رہے تھے۔

”نہیں غیر لوگ ہیں اس کے والد کا دعویٰ میں برنس ہے اور وہ لڑکا یہاں کراچی میں غالباً اسٹنٹ کسٹریڈ شاید ڈیڑھ سال پہلے اس کے بارے میں مکمل چھان بین کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کر سکوں گی۔“ اس نے سہولت سے بتا کر انہیں دیکھا تو فوراً بولے۔

”میں اس سلسلے میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں یعنی اگر آپ کہیں تو اس لڑکے کے بارے میں معلومات دے دو فوراً جواب نہیں دے سکی۔ حالانکہ صرف جی یا نہیں کہنا تھا لیکن وہ سوچنے میں لگ گئی کہ یہ کام اس سے نہ

چاہیے یا نہیں۔

”اے بی بی! میں اس کے معاملے میں تو میں کوئی کوتاہی نہیں کر سکتا۔ اچھا ہی سوچوں گا اچھا ہوں گا۔“ اس بار انہوں نے ”آپ کی بیٹی“ کہنے سے قصداً گریز کرتے ہوئے ایک طرح سے جواب دیا کہ وہ ان کی بیٹی ہے اور اس نے سمجھ کر ذرا سائنات میں سر ہلایا پھر کہنے لگی۔

”نور کے کانام علی ہے۔ علی جہاگیر۔ کراچی میں گھنٹن روڈ پر رہائش ہے۔ اس کے ساتھ اس کی والدہ اور ایک بہن ہے۔ والد کے بارے میں بتا چکی ہوں دعویٰ میں ہوتے ہیں۔ اب اس کے بارے میں جو اب معلوم کر چاہیں، ان کی مین خاندان۔ اس لڑکے کا کافی کیریئر وغیرہ اور اگر آپ کو وہ مناسب لگے تو مجھے بتا دیجیے گا۔ میں اس کے حق میں فیصلہ دے دوں گی۔“

”ہوں۔“ انہوں نے گہری سانس کے درمیان ہوں کی آواز نکالی پھر کوٹ کی اندرونی جیب سے چین اورچہ سی ڈائری نکال کر لڑکے کا نام پتا لکھا پھر اس سے پوچھنے لگے۔

”اور آپ سے میں کہاں کوٹھیٹ کر دوں۔؟“

وہ اپنے گھٹنگ کا نمبر لکھوا کر بولی۔

”شام پانچ سے آٹھ بجے تک مجھ سے اس نمبر پر بات ہو سکتی ہے۔“

”اس کے علاوہ۔؟“ انہوں نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا لیکن وہ ایک دم نرم ہو گئی۔

”کہیں نہیں۔“

”اوکے“ میں بہت جلد علی جہاگیر کے بارے میں ساری معلومات آپ تک پہنچا دوں گا۔“ انہوں نے اور چین واپس اندرونی جیب میں رکھا پھر اسے دیکھ کر ہلکے ہلکے انداز میں مسکرا کر پوچھنے لگی۔

”آپ یہ بتائیے اپنی بیٹی کی شادی میں مجھے انوائٹ کریں گی یا نہیں۔؟“

”نہیں۔“ اس نے بے مروتی کی حد کر لی اور شاہ سکندر نے پہلے بھی کہیں کیوں کا سوال نہیں اٹھایا تو بھی خاموش ہو رہے تو ایک محسوس کی جانے والی دیوار درمیان میں حائل ہو گئی تھی۔ جب بھی نہیں جی بے سفر تمام ہونے کو تھا لیکن اب منزل میں نہیں تھی اور ان دونوں کے اندر کوئی جتن بھی نہیں تھا۔ البتہ یہ تھا کہ انہیں منزل پہلے ملی تھی اور سفر بعد میں۔ جسے زندگی کی آخری سانسوں تک جاری رہا تھا۔ اپنی اپنی جگہ جانے کون سے وقت میں کھو گئے تھے۔ چونکہ اس وقت جب مائیک پر سیٹ پلٹ بات در خواست کی جا رہی تھی۔

شاہ سکندر نے اسے یوں دیکھا جیسے پھر جانے کب ملاقات ہو اور وہ انجان سی بین کر پلٹ باندھنے لگا۔

اس کے بعد اپنا پرس کھول کر اس میں جھانکنے لگی۔ یوں ہی ادھر ادھر ہاتھ مار کر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ پیشانی کا کردہند میں لٹے اسلام آباد کی روخیاں دیکھنے میں لگ گئی۔ ان آخری لمحات میں نے کیا ہو رہا تھا۔ پہلے بھی پلین لینڈ ہوتے وقت اس کا دل نہیں ڈوبا تھا۔ یقیناً کوئی اور بات تھی۔ پلین رن ہو رہا تھا۔ وہ اب رک گیا۔ وہ تب بھی اسی طرح بیٹھی تھی۔

”میرا خیال ہے یہ پرواز ہمیں تک نہیں۔“ شاہ سکندر نے بغیر اسے مخاطب کیے کہا تو وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

”میرا خیال ہے یہ لٹ کھول کر اٹھ کھڑی ہوئی لیکن آگے شاہ سکندر کی ٹانگیں راستہ روکے ہوئی تھیں اور وہ اطمینان سے اپنا بریف کیس بند کرنے میں مصروف تھے۔

”ایک کمبوزی۔“ اس نے متوجہ کیا تو انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور راستہ دینے کے بجائے فوراً ”مے ہو کر اس سے آگے چلنے لگی۔ میرا خیال اترنے تک وہ ان کے پیچھے پیچھے تھی پھر ایک دم قدم ہٹا کر آگے بڑھنے لگی کہ وہ پکار کر بولے۔

”ہیہ! خدا حافظ تمہیں کہیں گی۔؟“

”خدا حافظ۔“ وہ ایک پل میں خود پر قابو پا کر اعتماد سے مسکرائی تھی۔

وہ بہت ڈرتے ڈرتے نیمل کے کمرے میں داخل ہوئی تھی لیکن وہ موجود ہی نہیں تھے۔ جس پر وہ اطمینان کا راس لے کر کمرے کی صفائی میں لگ گئی۔ دو دن ڈسٹنگ نہیں کی تھی تو اتنی گرو جمع ہو گئی تھی۔ بیڈ کی چادر بھی ہلکا رہی تھی۔ ڈسٹنگ کے بعد اس نے الماری میں سے دھکی ہوئی چادر نکال کر بچھائی پھر تیلے کا غلاف بدل کر بانے لیا۔ پرانی ہوئی پلٹی تو دروازے میں نیمل کو کھڑے دیکھ کر گھبرا کر نکلا۔

”ہیں، کمرہ گندہ ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا۔“

نیمل پچھ بولے نہیں۔ دروازے سے ہٹ کر اسے نکل جانے کا اشارہ کیا تو وہ ایک دم روپائی ہو گئی۔

”میرا کیا تصور ہے۔ مجھے تو عمر بے بتایا تھا۔ آپ مجھ سے کیوں خفا ہیں۔؟“

”کوئی خفا نہیں ہوں میں بس جاؤ یہاں سے۔“ وہ آگے آتے ہوئے بولے۔

”کیوں جاؤں میں کہیں نہیں جا رہی۔“ وہ وہیں بیڈ پر ڈھے گئی۔

”مہا! مجھے اس وقت تنگ نہیں کرو۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔“

”پریشان۔“ وہ فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”آپ پریشان ہیں نیمل بھائی کس بات سے۔ مہا نے کچھ کہا ہے لیکن مہا تو یہاں نہیں ہیں پھر کس نے۔“

”اے ایک تو تمہیں کیا چیز ہو۔“ نیمل نے اپنا سر تھما لیا۔

”آپ کچھ بھی کہیں میں جب تک آپ کی پریشانی نہیں جان لوں گی یہاں سے ہلوں گی ہی نہیں۔“ وہ دوبارہ بیڈ پر نیمل سر جھٹک کر واش روم میں چلے گئے۔

وہ انتظار کرنے کے ساتھ اپنے آپ فیاں بھی کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ جیسے ہی ننگے فوراً شرو ع ہو گئی۔

”آپ میری عادت سے اچھی طرح واقف ہیں نیمل بھائی پھر اس طرح کیوں کر رہے ہیں۔ ٹھیک ہے میں آپ کی پریشانی دور نہیں کر سکتی لیکن۔“

”نہیں۔“ نیمل نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا پھر اس کے پاس بیٹھے ہوئے نرمی سے بولے۔ ”میرا

منا کو مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔“

”اچھا تو آپ کہہ رہے تھے۔“

”زبان کچھ غلط پھسل گئی میری بہن! کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔“ سمجھیں یا نہیں۔“ انہوں نے

کمرے کے سر پر ہاتھ جما کر زور سے ہلایا تو وہ بسور نے کے انداز میں پوچھنے لگی۔

”اور آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں۔؟“

”کس بات سے؟“
 ”وہ جو عمر کے کئے میں آکر میں نے آپ سے لڑکی کا پوچھا تھا۔“ وہ ایسی ڈری ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتی تھی جیسے اس بات سے ابھی وہ ہتھ سے اکھڑ جائیں گے لیکن اس کے برعکس وہ ہنستے ہوئے بولے۔
 ”وہ بھی احمق ہے اور تم بھی۔ اور میں احمقوں سے ناراض نہیں ہوں۔“
 ”لیکن آپ عمر سے پوچھیں گے ضرور کہ اس نے ایسی بات کیوں کی؟“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔
 ”پوچھ لوں گا۔ ابھی تو تم مجھے چائے پلاؤ پھر مجھے جانا بھی ہے۔“ انہوں نے کہا تو اس نے جاتے جاتے سر پوچھا۔

”کہاں؟“
 ”کہاں کا کیا مطلب؟ یعنی اب تم میرے جانے آنے پر پابندی لگاؤ گی۔“
 ”میں کیوں پابندی لگاؤں گی۔ میں تو اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ۔۔۔“
 ”جاؤ دیکھو کس کا فون ہے۔“ نیل نے فون کی ٹیل سن کر اسے ٹوک دیا۔
 ”بہر حال کہیں بھی جائیں۔ جلدی واپس آئیے گا۔ مجھے آج آپ سے پڑھنا ہے۔“ وہ کہتی ہوئی بھاگ کر میں آئی۔
 ”ہیلو۔“

”صاحت شاہ سے بات ہو سکتی ہے۔“ ادھر سے علی جہانگیر نے اس کی آواز پہچان کر دلکش انداز میں کہا بھی اتر کر بولی۔
 ”جی نہیں، وہ تو اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔“
 ”کوئی بات نہیں، آپ تو ہیں ناں۔ میں آپ سے بات کر لیتا ہوں۔“ ادھر برا مخطوط لہجہ تھا۔
 ”مجھ سے کیا بات کر سکتے؟“
 ”وہی جو صاحت سے کہتی تھی۔“
 ”یہ تو سراسر فاول ہے۔“ اس نے ہنسنے سے روک کر کہا۔
 ”دیکھا کروں، وہ نہیں تو نہیں اور تو نہیں تو کچھ نہیں۔“ وہ اچانک جذبات کی دھم میں بہہ کر گنگانے لگا۔
 ”تیرے نام سے یہی سچی ہوئی میری زندگی کی کتاب ہے
 تجھے دیکھنا یہی نصیب ہے تیرے بعد سارا سراب ہے
 وہ اس کی دلکش آواز میں کھو گئی تھی۔
 ”صباح! علی جہانگیر نے پہلی بار اس کے نام کو مختصر کیا تو وہ چونک کر بولی۔

”جی۔“
 ”آپ کو دیکھے ہوئے، آپ سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے بلکہ لگتا ہے زمانے بیت گئے۔ کچھ عرصہ
 ”حم کریں۔ ابھی آجائیں۔“ اس کے لہجے کی بے قراری دل میں پھل چلائی۔
 ”بہت مشکل ہے۔“

”نام ممکن تو نہیں ہے ناں، کوشش کریں پلیز۔“ اس کے عاجزانہ اصرار پر وہ سوچ میں پڑ گئی۔
 ”ہیلو صاب! کیا ہوا؟“ کچھ انتظار کے بعد اس نے پکار کر پوچھا۔
 ”کچھ نہیں، آپ کی مین میں کوشش کرتی ہوں اگر کامیاب ہوئی تو گھر سے نکلنے سے پہلے آپ کو فون کروں۔“
 اس نے جلدی سے کہہ کر ریموٹر روک دیا اور وہیں سے کچن کا رخ کیا۔
 کچھ دیر بعد جب چائے لے کر نیل کے کمرے میں آئی تو وہ بڑے آرام سے سو رہے تھے۔ کوئی اور بات
 وہ ہرگز انہیں نہ اٹھائی لیکن اب مجبوری تھی۔ علی جہانگیر کی خواہش کو رد کرنا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔
 چائے کا کپ سائڈ کارنر پر رکھ کر پہلے انہیں پکارا پھر آہستہ سے ان کا کندھا ہلایا تو وہ آنکھیں کھول کر

”آپ کو سونا تھا تو چائے کیوں نہ پلائی؟“
 ”نہیں، مجھے سونا نہیں تھا۔ وہ اچھے بیٹھے لاؤ چائے کہاں ہے۔؟“
 ”اس نے کپ اٹھا کر انہیں تھمایا پھر ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔
 ”آپ کو پس جاتا ہے۔“
 ”ہاں۔“
 ”مجھے بھی لے چلیں۔ میرا مطلب ہے میں لائبریری جاؤں گی۔ آپ مجھے وہاں جھوڑ دیتے ہیں۔“ اس نے بڑی
 ”نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ انہوں نے صاف منع کر دیا۔

”کہوں؟“
 ”کیونکہ مجھے واپس میں دیر ہو سکتی ہے پھر تم کس کے ساتھ آؤ گی۔ ویسے بھی تمہیں ابھی امتحان کی تیاری کرنی
 ”لائبریری کی کتابوں کا کیا کرو گی۔“
 ”نیل کی بات ٹھیک تھی۔ وہ مایوس سی ہو کر ان کے پاس سے چلی آئی اور ان کے کہیں جانے کا انتظار کرنے لگی
 علی جہانگیر کو فون کر کے بتا کہ وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو گئی ہے۔

 تین روزہ سینار کے بعد آسیہ کو اب فراغت ملی تھی تو اس نے سب سے پہلے مدیحہ سے واپس چلنے کی بات کی
 ”اس کی اپنی ضد تھی۔“
 ”مجھے نہیں جانا ماما میں یہیں رہوں گی۔“

”یہاں رہنے کی کیا تک ہے۔ وہاں تمہارے امتحان ہونے والے ہیں۔ صاب تمہارا ایڈمٹ کارڈ بھی لے آئی
 ”بہنوں تاریخ سے پچھ شروع ہیں۔“ آسیہ نے حتی الامکان اپنے بچے پر کنٹرول رکھ کر کہا۔
 ”نہیں کوئی امتحان نہیں دے رہی۔ مجھے یہاں ایڈمیشن لینا ہے اور میں نے صاف فون بھی کیا تھا کہ میری ماموں
 ”بہن بچہ دے، کیوں نہیں سمجھتی اس نے یہاں ایڈمیشن ہو رہے ہیں۔ ڈیٹ نکل گئی تو میرا ایک نہیں دو سال
 ”یہاں رہیں گے۔“ مدیحہ کا انداز سخت تھا۔
 ”فضل باتیں مت کرو۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔“ آسیہ چڑ گئی۔

”نہیں ماما! اگر ماموں جی اور ماما جی بھی یہ کہہ دیں کہ ان کے گھر میں میرے لیے جگہ نہیں ہے تب بھی میں
 ”پکے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ مدیحہ جانے اپنے دل میں کیا نشان چلی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کسی کی پروا
 ”خود دانی بھی نہیں کہ اس کے ساتھ جو ہونا ہے ہو جائے۔“
 ”آسیہ! دیر سناؤں میں آکر اسے دیکھتی رہی پھر بہت سنبھل کر نرمی سے بولی تو اس کے اپنے میں عاجزی در آئی۔

”بہن! تم ایسا کیوں کر رہی ہو، کیوں مجھے دکھ دیتی ہو۔“
 ”نیل دکھ نہیں دے رہی ماما، آپ سمجھیں۔ میرے وہاں ہونے سے آپ زیادہ پریشان نہیں بلکہ سب پریشان
 ”نیل پریشان کر رہی تھیں۔؟“ آسیہ نے زور دے کر کہا۔

”ہاں اور میں اب بھی اگر گئی تو پہلے سے زیادہ کروں گی کیونکہ مجھ سے منافقت نہیں ہوتی۔ جو میرے اندر ہے
 ”نیل ظاہر کروں گی۔ میرے اندر نفرت سے سب کے لیے۔ میں محبت ظاہر نہیں کر سکتی۔ آپ اگر اس گھر میں
 ”نیل! تم جانتی ہیں تو مجھے یہیں رہنے دیں۔ بے شک یہاں باشل میں ڈال دیں اگر یہ خدشہ ہے کہ میں ماما جی کو تنگ
 ”نیل۔۔۔“
 جس طرح آسیہ کی نرمی میں عاجزی در آئی تھی اسی طرح اس کی ہٹ دھرمی میں محسوس کی جانے والی آزدگی

”شما ماش۔“ آسہ اس کا گل تھپک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر اگلے روز اس کے کھٹک جانے سے پہلے عارف بیگم آن موجود ہوئیں اور مسلسل اس کے باہر اصرار کرتی رہیں۔ بڑی مشکل سے وہ انہیں آئندہ پر ٹال سکی اور یہ بھی کہہ دیا کہ اب وہ نووی انہیں قہراً اور اس کے لیے انہیں صبح کے امتحان ختم ہونے تک انتظار کرنا پڑے گا جبکہ خود اسے شاہ سکندر انتظار تھا جو کام اس نے عدلی بھائی کے لیے سوچا تھا وہ شاہ سکندر نے اپنے ذمہ لے لیا تھا تو اس کے خیال اسے اس سلسلے میں کسی تردد کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ شاہ سکندر نے اس کے ساتھ اچھا لیا یا برا؟ چاہے تو اچھا ہی سوچیں گے۔

انسان ہمیشہ سے تقدیر کے سامنے بے بس ہے۔ جو بات ہوتی ہے اس کے لیے پہلے سے ثابت واقعات جیسے ترتیب سے لکھ دیے جاتے ہیں۔ اتنے برسوں سے پہلے تو کہیں شاہ سکندر سے اس طرح ہوا تھا۔ عین اس وقت کیوں جب بی بی کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ اس نے اس اتفاق کو سوچا بھی تو شبہ اور ان ہی پر بھروسہ بھی کر لیا کہ وہ باپ ہیں، انہیں زیادہ حق ہے اور وہ زیادہ بہتر مشورہ دے سکتے ہیں اور مشورے کرنے لے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تیسرے دن جب وہ مریضوں سے فارغ ہو کر آخر وارڈ کے راولڈر نکل رہی تھی کہ شاہ سکندر کا فون آگیا۔

”ہی! ڈاکٹر آسہ امپیکنگ۔“ اس نے دروازے سے واپس پلٹ کر ریسورڈر اٹھایا تھا۔
”کیسی ہیں ڈاکٹر صاحبہ آپ؟“ شاہ سکندر نے بظاہر رسمی انداز میں پوچھا لیکن ان کے لہجے میں تھپی جو پہلے اندر پھیل چلائی تھی اور اب دل ڈوبنے لگتا تھا۔
”جی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ بہت مستحیل کر بولی تو کچھ دیر کے لیے خاموشی جم گئی کیونکہ وہ کر رہے تھے کہ وہ بھی ان کا احوال پوچھ گئی، ”سا“ ہی سہی پھر اس کی طرف سے یاس ہو کر ہی بولے تھے۔
”وہ آپ کا ایک کام تھا میرے ذمہ اور اس سلسلے میں کچھ کہنے سے پہلے مجھے یہ پوچھنے کی اجازت۔ آپ میری فراہم کردہ معلومات پر یقین کر لیں گی۔“
”یقین کرنا میری مجبوری ہے سکندر حیات! کیونکہ دنیا کا کوئی باپ کم از کم اپنی بیٹی کا برا نہیں سوچنے بہت سہولت سے جڑا دیا۔“

”آپ ہمیشہ سے بہت ذہین ہیں آسہ! لیکن افسوس اپنے معاملے میں آپ نے اپنا ذہن استعمال نہ کرنا سیکھ داری سے کام لیتیں تو۔۔۔“

”بلیز۔“ وہ ٹوک کر بولی۔ ”آپ مجھے علی جانگیر کے بارے میں بتائیں۔“
”اچھا لڑکا ہے۔“ وہ فوراً شروع ہو گئے۔ ”خاندان بھی اچھا ہے۔ میں دینی میں اس کے باپ ہوں۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں گی تو میں یہی کہوں گا کہ اپنی بیٹی کے لیے میں جتنا اچھا سوچ سکتا تھا تو سے بھی بھر کر ہے۔ ہی آؤ بڑی اسٹوٹ بوائے۔ آج وہ جس مقام پر ہے اس میں زیادہ اس کا باپ ہے۔ خدا کے بعد خود پر بھروسہ کرنے والے اسی طرح کامیاب ہوتے ہیں۔ وہ انشاء اللہ مزید ترقی آپ کو فورس تو نہیں کر سکتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس سے اچھا پوزل اور ہوی نہیں سکتا۔“

وہ جو پوری توجہ سے سن رہی تھی۔ ان کے خاموش ہونے پر پوچھ کر انداز میں بولی۔
”اس کا مطلب ہے مجھے ہائی بھرنی چاہیے۔“
”بہتر تو یہی ہے آگے آپ کی مرضی۔“
”او کے بہت بہت شکریہ۔“

”دک بات کا۔“ شاہ سکندر نے فوراً ”جو چاہا لیکن اس نے بڑے آرام سے ریسورڈر رکھ دیا اور راولڈر کاٹی حد تک مطمئن ہو گئی تھی۔ بس ایک کھٹک تھی کہ وہ اتنی جلدی صبا کی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ کم وہابی اے کر لیں پھر لیکن عارف بیگم نے اپنی پہلی آمد پر ہی کہہ دیا تھا کہ انہیں فوراً شادی کرنا ہے۔“

جے میاں کے پاس دینی جاننا تے اور انہوں نے مزید اپنی کچھ مجبوریاں بتائی تھیں۔

رات آسہ دیر تک اماں، جی، ابا جی، خلیل بھائی اور میمونہ بھابی کے ساتھ بیٹھی ان سے مشورہ کرتی رہی پھر غصہ فیصلہ کی تھا کہ اگر وہ اس رشتے پر مطمئن ہے تو پھر اسے شادی میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ جہاں تک باپ کے کرنے کی بات ہے تو وہ شادی کے بعد بھی کر سکتی ہے۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یوں اس طرف سے جین ہو کر اس نے صاحت کے امتحانوں تک خاموشی اختیار کر لی اور جس روز وہ آخری پیپر سے فارغ ہوئی، آسہ نے عارف بیگم کو فون کر کے اگلے روز رات کے کھانے کی دعوت دے ڈالی اور علی جانگیر کو بھی ساتھ بلاتا۔

...

جانگیر گاڑی کے ساتھ ٹپک لگائے بہت خاموشی سے وہ سارے لوازمات دیکھ رہا تھا جو عارف بیگم کرم دین گاڑی میں رکھوا رہی تھیں۔ ایک بار اس نے ٹوکا بھی کہ انہوں نے صرف کھانے پر بلایا ہے اور تو کچھ بچہ سب لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جس پر عارف بیگم نے یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا کہ تمہیں بلانے پر یوں ہی نہیں بلایا۔

ڈاکٹر کے مرحلہ تمام ہوا تو اس نے شکر کرتے ہوئے جلدی سے ڈرامیوٹنگ سیٹ سنبھال لی اور رابعہ کو فون سے بیٹھنے کو کہا تو وہ ہنستی ہوئی بولی۔

”کہ بہت جلدی ہے۔“
”کچھ آٹھن کر رہے ہیں۔ تم کیا چاہتی ہو۔ عین کھانے کے وقت پر پینچیں۔“ اس نے ٹار انگسٹی سے کہہ کر کچھ دیکھا اور ان کے بیٹھنے ہی گاڑی اشارت کر دی۔

بھائی خوش تھی۔ تمام راستہ اس سے مذاق کرتی رہی جبکہ عارف بیگم کا کچھ بتا نہیں چل رہا تھا کہ آیا اب وہ نئے خوش ہیں یا باپا جان کی وجہ سے مجبور ہیں اور اگر مجبور تھیں تب بھی آسہ اور اس کے تمام گھر والوں نے انہوں نے نہیں ایسا کوئی تاثر نہیں دیا۔ اس کے برعکس جیسے ان کی دلی مراد بر آئی ہو۔

اسے مہر کا بہت امتحان لے لیا آپ نے۔“ کھانے کے بعد عارف بیگم نے آسہ کے سامنے باقاعدہ اپنا بولایا۔ ”اب تو خوشی ہماری جھولی میں ڈال دیں۔“

اسے نہیں۔ اماں جی اور ابا جی سے نہیں۔“ آسہ نے اپنے بوڑھے ماں باپ کو دیکھتے ہوئے کہنا تو عارف بیگم انہیں خان کی طرف موڑ لیا۔
”بہا لانت ہے۔“

اس قدر کہ کرخاموش ہو گئے کیونکہ انہیں وہ وقت یاد آیا تھا جب انہوں نے یہی الفاظ آسہ کے لیے اس وقت سامنے شاہ جانگیر تھے اور اب انہیں کیا خبر تھی کہ اس جگہ ان کا بیٹا برا جہان ہے۔ سبھی مبارک سوامت کا شور۔ پھر عارف بیگم گاڑی میں سے مٹھائی اور دیگر سامان نکلوا کر لے آئیں تو بچوں کی جج گئی تھی اور جانے وہ کس کو نے میں چھپی تھی جسے دیکھنے کو علی جانگیر کا بے تاب دل بڑی رہا تھا۔

”میں صبا کے پاس جا رہی ہوں، کوئی پیغام؟“ رابعہ نے مٹھائی کی پلیٹ اٹھا کر سرگوشی میں اسے اطلاع دیا تو پوچھا تو وہ اس سے دیکھ کر رہ گیا کیونکہ اس کے ساتھ ہی خلیل بھائی بیٹھے تھے۔
”نونا اور تومیر کے ساتھ اوپر آئی اور مٹھائی کی پلیٹ صبا کے آگے کر لی ہوئی شوخی سے بولی۔
”اب بھی منہ میٹھا کر لیں۔ کیا یاد کر سکیں۔“

”ابھی سے آخر میں مٹھائی ملی۔“ تومیہ نے فوراً ”نکڑا لگا تو رابعہ کچھ خجل سی ہو کر بولی۔
”نونا زانیہ ہے۔ سب سے سہا حق تو ان کا تھا۔“
”سب سے پہلے حق کی تلفی ہو گئی۔ اب اس کا زوالہ کون کرے گا۔“

بھی دخل انداز مت ہونے دو تا ورنہ بہت ڈسٹرب ہو جاؤ گے۔“
 تھیر کے اندر لیکنٹ سناٹا چھا گیا۔ کوئی ایسی بات تو نہیں کی تھی شاہ سکندر نے بلکہ شاید اسے خبردار کیا تھا۔
 اسے بری طرح محسوس ہوئی تھی۔ گویا اب تک اس کی حیثیت صرف کھ پٹی کی سی تھی۔ وہ اپنی محبت
 نے نہیں بلکہ باباجان کی حکمت عملی سے اپنی منزل تک پہنچا تھا۔ یہ بات جب اس لڑکی کو معلوم ہوگی
 جو محبت سے حاصل کیا ہے تو وہ اس کی محبت پر کب یقین کرے گی۔ کبھی نہیں۔ ساری زندگی وہ اس کے
 ستارے گا۔

وہ ریسپوررکھ کر ادھر سے ادھر ٹھٹھلے لگا۔ اس کا ذہن بری طرح منتشر ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا
 معاہدہ کی تیل پر اس کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے لیکن اسے ریسپور اٹھانے کا خیال نہیں آیا۔
 بجے کے بعد فون خاموش ہو گیا۔ تب بھی اسے احساس نہیں ہوا۔ عجیب موڈ تھا۔ جب منزل دو گام رہ گئی
 اگلے شہر راستوں میں الجھ رہا تھا۔

رابعہ نے اس کا دروازہ کھیل کر اسے پکارا تو وہ ایسی ہی الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
 میرا تو خیال تھا آپ خوشی سے جھوم رہے ہوں گے لیکن آپ تو ایسے لگ رہے ہیں جیسے کوئی افسوس
 لیا ہو۔“ رابعہ نے اس کے افسردہ چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بے بھائی کیا ہوا ہے؟“ رابعہ قدرے متوحش ہو گئی۔
 میں کئی احوال تم کا پوچھا ہوں۔ میں سو رہا ہوں۔“ وہ کوٹا تارنا ہوا ڈرننگ روم کی طرف بڑھ گیا۔
 بائیں آپ نے فون کیوں نہیں اٹھایا۔ ادھر باباجان بات کر رہے ہیں۔“ رابعہ نے قدرے اوچی آواز
 نہادان سنی کرتا ہوا ڈرننگ روم میں بند ہو گیا۔

--*

ڈوبہ اور عمار بھی اس کے پاس سے اٹھ کر گئے تھے اور اس نے سکون کا سانس بھی نہیں لیا تھا نہ نیس
 بلکہ انہوں نے ان تینوں کی طرح اسے تنگ نہیں کرنا تھا پھر بھی ان کی آمد سے وہ اندر ہی اندر پریشان
 و فطری شرم تھی جو اس کا سر آپ جھک گیا۔

میں پوچھنے آتا تھا کہ تم نے کھانا کھایا یا نہیں۔“ نیل نے اس کی جھجک سمجھتے ہوئے قصداً ”کچھ بے خبری
 اختیار کیا تاکہ وہ آرام سے بات کر سکے۔

ہوائے زبردستی کھلا دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت مجھے بھوک بھی نہیں تھی۔ آپ نے کھالیا۔؟“ اس نے
 کھانا تو بچھا تو نیل جھٹکتے ہوئے بولے۔

مادر چائے بھی پی لی۔ تمہاری چھٹی ہو گئی۔ اس وقت چائے نہیں بنانی پڑے گی تمہیں۔“
 بتایا کہ رہے ہیں جیسے میں چائے بنانے سے کتراتا ہوں۔“ اس نے شاکی نظروں سے دیکھا تو وہ ہنس

بے خیر کسی کام سے نہیں کتراتا تو۔“
 نہ ہو نا کام بھی نہیں کرتی۔“ وہ فوراً بول پڑی۔

نیل کیسے لڑکی ہے وہ بھی۔ اب دیکھو وہاں جا کر رہ گئی۔ پھوپھو نے بھی اجازت دے دی اسے۔ اگر مجھے
 دیکھیں کبھی اسے جینے کا مشورہ دیتا۔“ نیل کو اب افسوس ہو رہا تھا۔

پسے تو کھانا تو زیادہ غرض کہیں نہیں رہ سکتی۔“ اس نے بے ادبائی۔
 نہیں رہ سکتی۔ ابھی بھی وہ خوشی سے وہاں نہیں رہی ہوگی۔“ نیل نے یقین سے کہا۔

نیل اسے بہت مس کرتی ہوں۔“
 مکمل تو عادت ڈال لینی چاہیے اس کے بغیر رہنے کی۔ کیونکہ تم خود یہاں کچھ وقت کی مسمان ہو۔“ نیل

”علی بھائی۔“ رابعہ فوراً بولی۔ ”ہلاؤں انہیں۔“
 ”اے واہ! آپ تو کچھ زیادہ ہی فری ہو رہی ہیں۔ صرف مٹھائی کھا کر آپ کے علی بھائی میز پر نہیں
 سکتے۔“ سوناب نے کہا۔

”تو پھر انہیں نیچے لے چلتے ہیں۔“
 ادھر ان کی نوک جھونک جاری تھی اور نیچے عارفہ بیگم جلدی شادی پر اصرار کر رہی تھیں اور آسہ اور
 تھی لیکن تیاری کی ہمت ضرور چاہتی تھی جس کے لیے عارفہ بیگم کو دو تین مہینے بھی بہت لگ رہے تھے۔
 ”کیا تیاری کر لی ہے آپ کو؟ زیور، کپڑا، کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کا واسطہ ہے۔“
 مجبوریاں ہیں جو میں اتنی جلدی کر رہی ہوں۔ دینی میں علی کے والد کو کھانے وغیرہ کی پرہیزگاروں میں سرفہ
 شادی کر کے وہاں جاؤں تو یہاں علی اکیلا ہو جائے گا۔ اس لیے میں چاہتی ہوں اس کا گھر بھی بسا کر۔

سے زیادہ مہینے لے لیں آپ۔“
 عارفہ بیگم نے سنے سنے سے اپنی مجبوریاں سنوا کر فٹ سے کہنا تو آسہ شش و پنج میں کبھی لگاؤ
 دیکھتی تھی، کبھی خائیں بھائی اور میمونہ بھانجی کو۔ آخر میں قریب بیٹھے نیل سے سرگوشی میں پوچھنے لگی۔

”تم کیا کہتے ہو بیٹا۔؟“
 ”میں کیا کہوں اباجی سے پوچھیں۔“ نیل یہی کہہ سکتے تھے۔
 آسہ نے اباجی کو دیکھا لیکن وہ متوجہ نہیں تھے جبکہ عارفہ بیگم اس پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں اور
 سننے کے لیے بڑی بے تاب نظر آ رہی تھیں۔ تب وہ مایہ بھری ہوئی بولی۔

”ٹھیک ہے، دو مہینے بعد لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ صبا نے ابھی تھوڑا سا امتحان دیا ہے۔
 آپ اسے لی اے ضرور کرائیے گا، اگر آپ کے ساتھ مجبوری نہ ہو تو میں اس کے لیے اسے کرنے
 کی شادی کر لی۔“ علی اسے بی اے کیا ایم اے بھی کرائے گا۔“ عارفہ بیگم خوش

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ علی اسے بی اے کیا ایم اے بھی کرائے گا۔“ عارفہ بیگم خوش
 وقت تاریخ طے کر کے ہی اٹھی تھیں۔
 پھر گھر آتے ہی علی جہانگیر نے سب سے پہلے شاہ سکندر کے نمبر ڈائل کیے تھے کیونکہ مہمان
 کی بھی کہ آج آسہ کے ساتھ جو بھی معاملہ طے ہو، وہ سب سے پہلے انہیں بتائے۔ یہ تاکید
 بھی تھی لیکن انہوں نے سب سے پہلے کی شرط نہیں رکھی تھی اور اگر رکھتے تب بھی شاید

سے رابطہ کرتا۔
 ”ہیں شاہ سکندر حیات۔“ ان کے انداز میں بے دھیانی تھی۔
 ”السلام علیکم چچا جان۔“ اس نے سلام کیا تو اس بار جیسے وہ پوری جان سے متوجہ ہوئے

دینا بھول گئے اور بے مانی سے پوچھا۔
 ”ہاں، کموینٹا کیا رہا۔؟“
 ”سب طے ہو گیا چچا جان۔ آئی مین ڈاکٹر آسہ نے نہ صرف رشتے پر مایہ بھری ہے بلکہ
 شادی کی تاریخ بھی دے دی ہے۔“ علی جہانگیر نے خوش خبری سنا کر انہیں حیران کر دیا۔

”واقعی۔ کب کب بے شادی۔؟“
 ”اپریل کے پہلے ہفتے میں۔“
 ”ڈیر کی گڈ! باباجان کو بتا دیا تم نے۔؟“
 ”جی نہیں، آپ نے کہا تھا سب سے پہلے آپ کو بتاؤں۔ اب باباجان کو آپ بتاؤ۔“

پوچھا تو شاہ سکندر یہ ذمہ داری اس پر ڈال کر گھٹنے لگے۔
 ”تم، تم، بتانا اور اس سے پہلے میری ایک بات سن لو مینا کہ شادی کے بعد تم اپنے

”بی تمی مدحو۔“
جانے کے سوا اور آتا ہی کیا ہے، ہونم۔! اس نے سگ کر سر جھٹکا۔

”نیک کہہ رہی ہو۔ وہ دونوں سے کہتی ہے۔“
”نہاں کھو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی پھر چائے بنانے کا کہہ کر وہیں سے واپس پلٹ گئی

--*

اپنے جذبات چھپانے میں ہمیشہ سے کمال حاصل تھا لیکن اس وقت جانے انہوں نے کوشش نہیں
ہم ہو گئے تھے جو فون پر عارفہ بیگم سے آسیہ کی رضامندی کے ساتھ شادی کی تاریخ دینے کا سن کر وہ
نے قابو ہو گئے تھے اور بال کرتے میں ہنکراتی ہوئی آواز میں شاہ جہانگیر کو پکارا کہ ان کے ساتھ ادھر
جان بھی گھر آکر اسے کمرے سے نکل آئی تھیں۔

فرزنا بھی۔ پتی کے بعد دوسری بی بی پرانی رکھتی ہی وہیں رہا سگ تمام کر کھڑی ہو گئی تھیں۔
”بوجہ گھر اچھا ہے بیٹی کی بات سنی ہوئی۔“ بابا نے کہا، ”آوازیں غیر معمولی گونج رہی تھیں۔“

”میں مٹھائی تقسیم کر دوں گا۔“ علی کی شادی طے ہوئی۔ ”بی بی شان سے اس کی رات لے کر
دوسرے دن کو رخصت کر آکر پہلے بی بی اسی حویلی میں لے کر آئیں گے۔ بہت چھپا لیا ڈاکڑی نے اسے، ہم
ہماری باری ہے۔“

”راہنساء نے سخت و تنفر سے سر جھٹکا تھا۔

”بی بی سمجھ کر بھی نہیں سمجھ رہی تھیں۔“

”نہاں نے آگے آکر بابا جان کا بازو تھام لیا اور دھیرج سے کہنے لگے۔

”بہن! تمہیں ہے بابا جان! لیکن اس طرح بی بی کی بات بکڑ سکتی ہے۔ عین وقت پر اگر آسیہ نے انکار کر دیا
بہن خاموش ہو گئے۔

”نہاں کی بات سمجھ کر چند لمحوں کے لیے خاموشی اختیار کر لی پھر کھنکھار کر پہلے گا صاف کیا اس کے بعد

”نہاں کے سارے انتظامات یہیں سے ہوں گے اور رات بھی یہاں سے جائے گی پھر ہم علی کے گھر رک کر
نہاں کے جب ادھر نکاح ہو جائے گا تب ہم خود جا کر دلن کو رخصت کرالائیں گے۔“

”نہاں نے بابا جان یہاں سے کسی کو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ علی سے کہہ دیتے ہیں وہ دلن کو
لے آئے گا۔“ شاہ جہانگیر نے بابا کوئی بد مزگی نہیں چاہتے تھے۔

”نہاں جانگیر! ہمارے علی کی شادی ہو اور ہم شریک نہ ہوں یہ تو ممکن ہی نہیں ہے پھر ہم نے سکندر سے
پڑا اس کی بیٹی کو ہم شاہ علی جہانگیر کے ساتھ رخصت کرالائیں گے۔“ بابا جان کے منہ سے جو پہلی
”نہاں! اس سے بے کو تیار نہیں تھے۔

”بی بی مرضی۔“ شاہ جہانگیر نے ان کی ضد سمجھ کر ہتھیار ڈال دیے۔

”محل سے اسے بھی اطلاع کرو۔ اس کی بیٹی کی شادی ہے۔“

”یاد کرو شاہ سکندر کا خیال آیا تھا اور اوپر بی بیوں پر کھڑی مہرا نساء چیخ کر بولی۔

”نہاں! ایک بیٹی ہے الماس اور کوئی نہیں۔“



”نہاں کو مہرا نساء کی بات سے زیادہ اس کا چیخ کر بولنا ناگوار گزرا تھا اور یہ تمہی بھی انہونی۔ بھلا ان کے سامنے
نہاں کوئی آوازیں بات کی تھی۔“

کے سیدھے سادے انداز کے باوجود وہ پل ہی ہو گئی اور ان کے پاس سے اٹھنے کا ہانا سونے لگی۔ مشکل
وہ اس کے کمرے میں بیٹھے تھے اس لیے فوری طور پر کوئی ہانا سمجھ میں نہیں آیا تو بات بدلتی ہوئی کہنے لگی۔
”آج شہر کا فون آیا تھا۔ ٹیلی بھائی وہ کہہ رہی تھیں۔ کچھ وقت نکال کر اسے پڑھا دیا کریں۔“

”ہاں! عدیل چاہو تو بھی لکھا تھا مجھ سے اور میں اب تک اپنے وقت کی سیٹنگ نہیں کر لیا۔“ کو شش
کہ۔ ”فون کی نیل سے ان کی بات ادھوری رہ گئی۔

”اس وقت مدحو ہو گی۔“ وہ کہتی ہوئی بھیگ کر لابی میں آگئی اور ریپور اٹھایا تو دوسری طرف واقعی مدحو
اس کی آواز سنتی ہی کہنے لگی۔

”بہت کمینہ ہو تم۔ بتایا ہی نہیں کہ تمہاری شادی ہو رہی ہے۔“

”میں کیا بتائی۔ مجھے خود ابھی انہی پتا چلا ہے کہ ماما نے میری شادی طے کر دی ہے۔“ اس نے مدحو
ناراغی کے خیال سے خود کو بے خبر ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”کیو مت یہ تو نہیں ہو سکتا۔ ابھی رشتہ آیا اور ابھی شادی طے ہو گئی۔ آخر کچھ سلسلہ تو چاہو گا۔“ مدحو
فورا ”لوک کر جتا تو وہ اندر ہی اندر خائف ہو کر بولی۔

”ہاں! سلسلہ تو کافی دنوں سے چل رہا تھا لیکن مجھے یہ کب معلوم تھا کہ ماما بھی بھریں گی۔“

”تم سے پوچھتے بغیر تو ابھی نہیں بھری ہو گی۔“ مدحو نے شاکی ہوئی۔
”جی نہیں! ماما نے مجھ سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ نہ کسی کے ذریعے سے میری رائے پوچھی

”چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ اب تم کب آ رہی ہو۔“ اس نے اپنی صفائی دینے کے بعد پوچھا تو مدحو لاپرواہی
بولی۔

”نہاں ہے تمہاری شادی پر ہی آؤں گی۔ ماماں جی اور ماما جی کے ساتھ۔“
”ہائے نہیں مدحو! ایسے نہیں کرو۔ ماماں جی اور ماما جی تو عین وقت پر آئیں گے جبکہ میں اس وقت

شدت سے تمہاری کمی محسوس کر رہی ہوں۔ تم جلدی آ جاؤ پلیز۔“
اس کی منت کا مدحو پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

”کیسے آ جاؤں۔ یہاں میری کلاس شروع ہو گئی ہیں اور ہاں تمہارے پیپر کیسے ہوئے۔“

”تمہیں ہوئے ہیں۔“ وہ رو گئے کچھ میں بولی۔
”چلو تمہیں کون سا آگے بڑھنا ہے۔ آرام سے گھر واری کرنا۔ ویسے کرتے کیا ہیں موصوف بلکہ پہلے

”یہ کیسے۔“ مدحو اچانک مشتاق ہو گئی تھی۔
”مجھے نہیں پتا، خود آ کر دیکھ لو۔“ اس کا بھڑکا ہوا تھا۔

”کیا مطلب! کیا تم نے دیکھا بھی نہیں۔“
”نہیں۔“ وہ صاف مگر گئی۔

”پاگل تو نہیں ہو گئیں۔“ بغیر دیکھے شادی کرو گئی اور یہ مہا اتنی دیر تو کسی کب سے ہو سکتی جو تمہارے
تمہیں دکھایا۔ اپنے آپ پہلے لکھ لیا اور تمہارے ہاں جی لیا۔ آخر ایسی کیا مجبوری ہے تمہارے ساتھ۔“ مدحو

کی سعادت مند سے چڑھی تھی۔
”کوئی مجبوری نہیں۔ مجھے ماماں پورا بھروسہ ہے۔“

”پھر تو تمہارا الہی حافظ ہے۔“ مدحو کی استہزاء نے اسے سخت گراں گزری۔
”بہت بد تمیز ہو تم۔ میں خواہ مخواہ تمہیں مس کرتی ہوں حالانکہ تمہارے بغیر یہاں بڑا سکون ہے۔“

نہیں۔ سب بہت خوش ہیں۔ پتا ہے ابھی یہاں۔“ اس کی بات جاری تھی کہ ادھر سے مدحو نے سلسلہ
کر دیا۔

وہ ریپور شیخ کر رہی تھی کہ اس نے اپنے کمرے میں آئی تو نیل ابھی تک وہیں بیٹھے تھے۔ اسے دیکھتے ہی پوچھنے

مرا النساء کی اتنی جرات پر بی بی جان پریشان ہو گئیں۔ شاہ جہانگیر الگ ہو کھلا گئے تھے پھر بھی اس سے بیزار باباجان، مرا النساء کی بدتمیزی پر اسے سخت الفاظ میں کچھ کہتے، وہ بولی بڑے۔
 ”تم اپنے کمرے میں جاؤ مرا النساء! تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔“
 ”یوں نہیں، میں ہر اس معاملے سے تعلق رکھوں گی جس میں شاہ کا نام آئے گا۔“ مرا النساء، باباجان کو بے تیر دیکھنے کے باوجود اپنی جگہ جم کر کھڑی تھی۔
 ”ہمیں طیش مت دلاؤ مرا النساء! ورنہ ہم ابھی اسی وقت تمہارا شاہ سے تعلق توڑ دیں گے اور اس کے ہمیں کچھ زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا۔“ باباجان نے ایک ہی وار میں اس بھری ہوئی عورت کے پیر اٹھا دیے تھے کہ اس بار وہ بولی تو اس کی آوازیں وہ غفر نہیں تھا۔
 ”پھر بھی اس طوائف کی بی بی یہاں نہیں آئے گی۔“ اس کے ساتھ ہی وہ دو سیڑھیاں بھلا نک کرتی رہی اپنے کمرے میں بٹلی گئی۔
 ”اپنے کمرے سے۔۔۔“ شاہ جہانگیر نے اس انداز سے کہا کہ باباجان اس کی باتوں کو کوئی اہمیت نہ دیں۔
 ”مسئلہ تو نہیں بنے گی؟“ باباجان نے پر سوچ انداز میں شاہ جہانگیر کو دیکھا۔
 ”نہیں، آپ چھوڑیں اسے اور بی بی جان کو سارا پروگرام سمجھائیں کیونکہ یہاں کے سارے انتظام تو ان ہی کرتے ہیں۔“ شاہ جہانگیر نے خوبصورتی سے ان کا دھیان ہٹا دیا تھا۔

علی جہانگیر جتنا سوچتا اسی قدر الجھ رہا تھا۔ اسے محبت میں دھاندلی کسی طور مناسب نہیں لگ رہی تھی مسئلہ یہ تھا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ صابحت کو اعتماد میں لے کر اس راہ پر گامزن کر دے اور اس سب پر اس نے سوچا بھی لیکن صابحت کی بزدلی سے خائف تھا کہ وہ بھی اس کے لیے بڑے مسئلے کی۔ اس تمام عرصے میں وہ اسے اتنا تو جان گیا تھا کہ محبت سے دستبرداری میں خواہ اس کی جان کیوں جائے وہ اپنے بھروسے کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتی۔ اس لیے اسے ہم نوائے کا وہ بس سوچ کر رہ گیا اور وہ شے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ وہ کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتا تھا اور اس طرح شادی کر کے اس کی نظموں کا اعتبار ہونا بھی کھل رہا تھا۔ عجیب شش دہچمٹیں تھیں۔ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی پر اسے کچھ کچھ لگ رہا تھا۔ بس خاموشی سے عارفہ بیگم کو فون پر باباجان کی ہدایات سننے اور پھر ان پر عمل کرتے ہوئے کچھ لگ جس پر رابعہ نے غی بارے اسے نوکا کہ وہ اپنی دلی تمنا پوری ہونے پر بجائے خوش ہونے کے پریشان نظر آئے۔ اسے آفیشل پرائیمر سے منسوب کر کے ٹال گیا تھا لیکن وہ شاید مطمئن نہیں ہوئی تھی جب ہی اس وقت ہمارا رہی تھی۔

”غایہ کہہ رہے ہیں آپ، آفس کی پرائیمر سے آپ کبھی اس طرح پریشان نہیں ہوئے۔ ضرور کئی بات ہے اگر آپ انہیں بتائیں گے تو میں صابحت کو پوچھوں گی۔“
 ”اس سے کیا پوچھوں گی؟“ اس نے قہر سے تیز لہجے میں کہا۔
 ”آپ کی پریشانی کا سبب یہ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور جانتی ہوگی یا پھر وہی ہے۔“ رابعہ کے اتے قیاس پر وہ ایک لحظہ کو ٹھٹھکی گیا پھر فوراً سر جھٹک کر بولا۔
 ”ناہل جو تم، وہ خود اس بات سے پریشان ہو گی کہ اتنے دنوں سے میں نے اسے فون نہیں کیا۔“
 ”یوں نہیں آیا۔“

”اس لیے کہ بہن آفس کے معاملات میں الجھا ہوا ہے۔ ادھر سے اطمینان ہو گا تب اس سے بات ورنہ وہ بھی تمہاری طرح اتنے سیدھے قیاس کرنے بیٹھ جائے گی۔“ اس نے خوبصورتی سے بات چلائی۔
 ”تو تھ۔“ رابعہ تاکید کرتے ہوئے بولی۔ ”ویسے وہ آپ کے فون نہ کرنے پر بھی قیاس کر رہی ہے۔“
 ”پہلے کہ بدگمان ہو، آپ اسے اپنی مصروفیات کی داستان سن کر یقین دلائیں کہ اتنے ٹینشن میں بھی

بنا ہے اور ہاں یہ بھی کیسے گا کہ۔“
 ”اب۔۔۔“ وہ اندر ہی اندر جڑ بڑھ رہا تھا جب ہی ٹوک دیا۔ تو رابعہ چڑ کر بولی۔
 ”یہ اتنی ناگہل ہوں، خواہ مخواہ آپ کا خیال کرتی ہوں۔“
 ”بہت خیال کرتی ہو، اس وقت بھی احسان کرو کہ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ وہ اس کے چڑنے کا نوٹس نہ لیتے بلکہ۔
 ”کی مرضی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی پھر جاتے جاتے رک کر کہنے لگی۔ ”ویسے میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ اگر آئندہ صبح کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت لے لی ہے۔“
 ”طلب؟“ وہ ایک دم متوجہ ہوا تھا۔
 ”طلب یہ کہ۔۔۔“ خیر چھوڑیں اس وقت آپ تمہاری چاہتے ہیں لہذا شب بخیر۔“ رابعہ اس پر احسان کرتی ہوئی بولی کہ وہ ایک ہی جست میں دروازے پر آکر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔
 ”یہ بھی طرح بتاؤ۔ کیا بات ہے صابحت کو کہاں لے جانے کی اجازت ملی ہے تم نے۔“
 ”نہ کو کیا، آپ اپنی آفیشل پرائیمر حل کرتے رہیں اور مجھے میرا کام کرنے دیں۔“ رابعہ نے کورا جواب دینے سے ہٹا ہوا بولا۔
 ”تکب سے جاؤ تم۔“

”ہاں۔“ رابعہ نے دروازہ کھول کر اسے یوں دیکھا جیسے وہ اس کی خوشامد کرے گا لیکن وہ بڑے آرام سے بیٹھا بیٹھا کوٹنگ کر جاتا تھا کہ جو بھی بات ہے کے بغیر اسے غنیمت نہیں آئے گی اور واقعی وہ جھنجھلاتی ہوئی پلٹ گئی سر آکھڑی ہوئی۔
 ”خیر خراب ہیں بھائی آپ، ڈراسی مٹیں نہیں کر سکتے۔ آخر میں نے بھی تو آپ کے لیے ڈاکٹر آئیہ کی اتنی باتیں کہیں جا کر انہوں نے ہابی بھری تھی۔“
 ”تکب کی۔“ اس نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔
 ”بات کو ہمارے ساتھ بھیجئے تاکہ ہم شادی کی شاپنگ اس کی پسند سے کر سکیں اور رہا ہے کل کا دن ملے۔“
 ”پروگرام ہاتھ دیتے ہوئے کچھ رجوش ہی ہو گئی تھی۔“ میں چار بجے اسے لیتی ہوئی طارق روڈ پہنچ جاؤں گی پھر وہاں آجائے گا اور ہاں امی تو اس بات کا بالکل پتا نہیں چلنا چاہیے کیونکہ آپ جانتے ہیں وہ ذرا۔“
 ”ہاں اور اگر ڈاکٹر آئیہ نے امی سے پوچھ لیا تب؟“ وہ اس کی بات سمجھ کر بولا۔

”نہی تب دیکھی جائے گی بلکہ آپ ہی سنبھال لے گا۔ میرا کام آپ کو صابحت سے ملوانا ہے کیونکہ اس روز یہاں کہہ رہے تھے کہ شادی سے پہلے آپ ایک بار اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ کما تھاناں آپ نے۔“ آخر میں اس نے دروازے کو اس سے تصدیق چاہی۔

”نہ۔“ اس نے پر سوچ انداز میں سر ہلایا پھر رابعہ کے جانے کے بعد بھی وہ کتنی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا کہ اس کا ذہن ایک بار پھر اس بات میں الجھ گیا تھا کہ اسے اپنا اصل ظاہر کرنا چاہیے یا نہیں۔ ہر دو صورتوں کے لیے خسارہ ہی خسارہ تھا اور پھر جس خسارے کی تلافی ممکن ہو سکتی تھی وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

”بہن اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے رابعہ کو دیکھا تو وہ مسکرا کر بولی۔
 ”خیر خیال ہے، میں تم دونوں کے ساتھ اچھی نہیں لگوں گی۔“
 ”طلب؟“ وہ بالکل نہیں سمجھی۔
 ”نہ پوچھو۔“ رابعہ کے اشارے پر اس نے فوراً گردن موڑی اور علی جہانگیر کو دیکھ کر گھبرا کر رابعہ کا ہاتھ

چاہتا تو نہیں ہوں لیکن اگر چاہوں کہ میری خاطر ساری دنیا کو چھوڑ دو تو چھوڑ دوں گی۔“ وہ اسے پرکھ رہا

تھیں۔ ”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“

”سربراہ، چلو جاؤ۔“ رابعہ نے ہنستے ہوئے اس کی طرف کا دروازہ کھلیا۔ تو وہ آہستہ سے بولی۔

”تم بھی چلو نا۔“

”ارے تم تو ایسے گھبراری ہو جیسے پہلی بار علی بھائی کا سامنا ہوا ہو۔“ رابعہ نے اس کے ٹھنڈے ہاتھ کو ہاتھ

ہوئے کہا۔ تب ہی علی جمنا تگیر قریب آکر بولا۔

”آئیے صاحت اوریاں رابعہ! تم گھر جاؤ۔ انہیں میں۔“

”نہیں پلیز۔“ وہ مزید گھبرا کر فوراً بول پڑی۔

”درو مت، تمہاری ماما سے میں نے پوچھ لیا تھا۔“ رابعہ نے اسے اطمینان دلایا۔ تب وہ اتر کر ایک طرف

کھڑی ہو گئی۔

علی جمنا تگیر رابعہ سے بات کرنے کے بعد دروازے سے کچھ کہہ رہا تھا پھر سیدھا وہاں کی طرف پلٹ کر بولا۔

”آئیے۔“

وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑی۔ گوکہ پہلی بار اس کے ساتھ نہیں تھی لیکن کچھ عرصے بعد جس بندھن

میں بندھنے والی تھی اس کا حجاب تھا جو اس کی نظریں علی جمنا تگیر کے قدموں سے اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں اور اگر

باس کا تو بالکل ہوش نہیں تھا۔ پتا نہیں کس طرف جا رہا تھا وہ۔ اس نے جان کر بھی کیا کرنا تھا اور پھر جہاں وہ رکا

کے قدم نہیں وہیں جم گئے۔

”بیٹھیں۔“ علی جمنا تگیر نے کہا تب اس نے چونک کر سر اٹھایا اور چاروں اور نظروں اٹھی ہوئی بیٹھ گئی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ علی جمنا تگیر نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ بڑا محتاط انداز تھا ہمیشہ سے مختلف۔

لیجے میں شوخی تھی نہ نظروں میں وارفتگی اور براہ راست اسے دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

”ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں؟“ وہ اس کے بدلے انداز محسوس کرتی ہوئی بولی۔

”کیا لگتی گی چائے یا؟“

”کچھ نہیں۔“ اس کے فوراً منع کرنے پر وہ نہ صرف متوجہ ہوا بلکہ اپنے رویے کا احساس بھی ہو گیا۔ جب

مسکرا کر بولا۔

”کیوں میرا ساتھ بھی نہیں دیں گی۔ آئی مین میں چائے بنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور پیئیں میں آپ کو تو منع نہیں کر رہی۔“ وہ ٹیبل کی چمکنی سطح پر انگلی سے آؤی ترچھی لکیریں کھینچتی

بولی۔

”یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں چائے پیوں اور آپ ناراض ناراض سی بیٹھی رہیں۔ اب یہ مت کہہ دیجئے گا

آپ ناراض نہیں ہیں۔“

”نہیں ہوں۔“

”میری طرف دیکھ کر کہیں۔“ علی جمنا تگیر نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ادھر ادھر پھسلتی انگلی کو اپنی دو انگلیوں

درمیان بکڑ لیا تو وہ گھبرا کر بولی۔

”کیا کر رہے ہیں چھوڑیں پلیز۔“

”پہلے میری ایک بات کا جواب دو۔ کتنا پیار کرتی ہو مجھ سے۔“ وہ ایک دم آپ سے تم پر آکر اسے جانے

امتحان میں ڈال گیا۔

”چاہتے ہیں۔“ وہ پریشان ہو گئی۔

”چلو بتا دو میری خاطر کیا کر سکتی ہو۔“

”آپ کیا چاہتے ہیں۔؟“ وہ الجھ کر بس ایک نظر اسے دیکھ سکی۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“

وہ خاموش رہی تو قدرے توقف سے اپنے آپ کہنے لگا۔

”ویسے میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہوگی بلکہ اگر تم لوگ تو میں خود تمہیں ان کی پاس لے جاؤں گا۔“
وہ پھر ان سنی کر کے شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ جانے کیوں اسے انہیں ہونے لگی تھی اور کچھ عجیب سا بھی لگ رہا تھا۔ وہ خود اپنے باپ کے بارے میں خواہ کچھ بھی سوچے یا کہے لیکن تیسرے شخص کے منہ سے ہمہ روی بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی اور وہ اسے روک بھی نہیں سکتی تھی کہ جانے وہ کیا کہے اور وہ اس کے منہ سے مونس نہ ہی سمجھ کر خاموش ہو گیا تھا۔

~~*

اس کی شادی میں بہت کم دن رہ گئے تھے۔ تیاریوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا تھا اور آسیر کو کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی۔ سب ہی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ کپڑوں کی تیاری میں میمونہ بھابھی سونیا اور اماں کی تحویل اور باہر کے کاموں میں نیپیل اور عمر بھی پیش پیش تھا اور یہ صرف اس کی محبت تھی جو اب سب اس کے لیے اسے ضروری کام بھی بھول گئے تھے۔ ہر شام عدیل بھائی بھی یا سمین اور دونوں بیٹیوں کے ساتھ آجاتے تو اور روش ہو جاتی تھی لیکن اسے جس کا انتظار تھا وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ جس سے اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ حالانکہ جانتی تھی کہ ابھی وہ آئے گی تو دل چلائے والی باتیں ہی کرے گی اور شاید وہ اس کی عادی ہو چکی تھی۔ جب ہی صبح شام لون کر کے اس کی منتیں کر رہی تھی اور اس وقت تو رونے بھی لگی تھی۔
”مدد جو! کیا تمہیں ذرا بھی مجھ سے محبت نہیں ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی، یعنی میں آ جاؤں تو محبت اور نہ آؤں تو۔ چہ۔ تم ہمیشہ سے ایسی ہی احمقانہ سوچ رکھتی ہو۔“
مددجہ نے الناس کا مذاق اڑایا۔

”تو تم نہیں آؤ گی۔“
”کیوں نہیں آؤ گی۔ ابھی تو پورا ایک ہفتہ پڑا ہے۔ نکیل ماموں نے دو دن پہلے کی سیٹیں کنفرم کر والی ہیں اور ظاہر ہے میں بھی ان ہی کے ساتھ آؤں گی۔“
”کیا ضرورت ہے تب بھی آنے کی۔“ اس نے چکر کر بیسور شیڈیا اور آنسو پونچھتی ہوئی اپنے کمرے میں آکر نو نیپیل پہلے سے موجود تھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

”اس بار پھو پھو کی ساری آمدنی ٹیلی فون کے بل میں چلی جائے گی۔ اسے تو خیر احساس نہیں ہے، تم ہی کچھ خیال کرو۔“
”میں خیال کروں، ہمیشہ مجھ ہی سے یہ توقع کیوں کی جاتی ہے اور اسے صرف احساس نہیں ہے کہہ کر چوڑبا جاتا ہے۔“ وہ ایک دم پھٹ پڑی۔ ”اس لیے تو وہ اتنی سیر ہو گئی ہے اور وہی صبح ہے۔ ٹھیک ہی مجھے اچھی لگتی ہے میں ہوں اچھی۔“

”صا۔!“ نیپیل نے ہر کراہے سے تھام لیا۔ ”اتنا غصہ۔ میں نے تو یوں ہی ایک بات کی تھی۔“
وہ ہاتھوں میں چروچھا کر رونے لگی۔

نیپیل سمجھ گئے اصل میں اسے مددجہ کا نہ اتنا راز رہا ہے اور وہ کیا کر سکتے تھے۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو اسے بہت پہلے لے آتے۔ اس کے معاملے میں تو وہ بھی بے بس تھے۔

”تمت رو، تم جانتی ہو۔ مجھے کتنا دکھ ہوتا ہے۔ جاؤ منہ دھو کر آؤ۔“ انہوں نے اس کا رخ وادش روم کی طرف موڑ دیا تھا۔

پھر رات میں ڈھولک کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ پہلے نیچے اور جب اباجی اور خلیل بھائی تک آنے لگے تو اب اوپر آگئے تھے وہ نموا اور روٹی کے بہت اصرار پر سب کے ساتھ آکر بیٹھی تھی کہ عرہ بھر کر بولا۔

”جائے صا! تم چلی جاؤ گی تو میرا کیا ہو گا۔ میں بہت روؤں گا ایمان سے۔“

وہ اس کا تو یوں بھی کچھ کل ذرا ذرا سی بات پر دل بھرا آتا تھا۔ اس روانی سے آنسو جھپکے اور ایسی بچکی بندھی کہ جب کراتے کراتے تھک گئے، ساتھ ساتھ عمر کو بھی لانا ڈر رہے تھے کہ اس نے کیوں ایسی بات کی۔

”تم لوگ خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ رہے ہو اور اسے بھی چپ کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جی بھر کر رونے دو، اچھے سارے آنسو نہیں بہائے۔ آگے بہت خوش رہے گی۔“ عمر سب کی سن سن کر آخر یوں پڑا۔

”خوشی تو انشاء اللہ رہے گی لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ۔“ سونیا پھر شروع ہونے لگی تھی کہ وہ ہاتھ جوڑ

”جس خدا کے لیے یہ ڈانٹ پھینکار کا سلسلہ ختم کریں اور ڈھولک سنبھالیں۔“
ایک دم چوہتا نہیں کب آئے گی۔ سب سے اچھی ڈھولک وہی بجاتی ہے۔“ تو یہ نے ڈھولک اپنی طرف

ہٹے ہوئے کہا تو وہ رونے کے درمیان جل کر بولی۔
”نہیں آئے گی وہ۔“

”ابا مطلب مددجہ شادی میں نہیں آئے گی۔“ نمرہ نے حیران ہو کر پوچھا۔
”ہر جھک کر رہے گی تو عمر کے ساتھ روٹی بھی نیپیل کی طرف گھوم کر ان سے پوچھنے لگی۔“

”نیپیل بھائی! مددجہ نہیں آئے گی۔“
”اے کیوں نہیں۔ اس کے بغیر بھلا شادی ہو سکتی ہے۔“ نیپیل نے صباحت کو گھورتے ہوئے کہا۔

”یہ اب تک تو اسے آ جانا چاہیے تھا۔ کوئی سالگرہ تو نہیں ہے۔ جواب نہیں تو ابھی بارہا سنی۔ شادی ہے جو نہیں ایک ہی بار ہوتی ہے۔ کیوں نیپیل بھائی۔“ عمر نے کہہ کر نیپیل سے تصدیق چاہی تو وہ ان سنی کر کے اٹھتے

”یہ خیال ہے۔ سونا چاہیے۔ چلو تم لوگ بھی اٹھو بہت رات ہو گئی ہے۔“
”اے میں نیپیل بھائی! ہم ڈھولک بجائیں گے۔“ روٹی نے لجاجت سے کہا۔

”نکل، نکل بجا دیتا، چلو اٹھو۔“ نیپیل نے سب کو اٹھادیا، آخر میں صباحت کو اس کے کمرے میں چھوڑ کر گئے

”اگلے دن سے وہ سب کے بلانے پر بھی اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ رات گئے تک ڈھولک کے ساتھ ہنسی

کی آواز اس سے سونے نہیں دیتی تھیں اور یہ نہیں تھا کہ اسے کسی بات سے دلچسپی نہیں تھی بلکہ متضاد بات میں کھر کراس کا دل کچھ سہم سا گیا تھا۔ یعنی کبھی یا لے کر خوشی، کبھی اس گھر سے جانے کا غم، کبھی مددجہ پر

اور زیادہ یہ کہ اس کے جانے کے بعد آسیر اکیلی ہو جائے گی۔ ان ساری باتوں کی وجہ سے وہ الگ تھک پڑی

”کیا کچھ سوچتی رہتی اور مددجہ پر تو اسے اتنا غصہ تھا کہ اپنے کہنے کے مطابق جب وہ دو دن پہلے آئی تو اسے

عاس نے منہ موڑ لیا جس پر مددجہ بجائے اسے منانے کے لانا باراض ہو کر بولی۔
اس لیے بارہا رہی تھیں تم مجھے کہ میں تمہارے خُرخے اٹھاؤں، خوشامدیں کروں۔ مجھ سے ایسی توقع مت

”اگلی ہوں میں جو تم سے کوئی توقع رکھوں گی۔ جانتی نہیں ہوں کیا میں تمہیں؟“ اور تم نے کیوں زحمت کی

”نا تمہارے بغیر۔“
”تم نہیں ہو سکتا تھا میرے بغیر۔“ مددجہ فوراً ”لوگ گئی“ تم سے تین بارہاں میں ہی کہلو اؤں گی۔“
”نہ! اس نے سر جھٹک کر منہ موڑا تو مددجہ نے لپک کر اس کی گردن پر ہاتھ رکھ دیا۔
”باہونہ، میرے بغیر کرتیں شادی بتاؤ۔ میں تمہیں ہم سے اڑا دوں گی اور کیا نام ہے اس کا علی جمائیکو بھی“

”سایک تو جو ری اوپر سے سینہ زد ری۔“ وہ اس کے ہاتھ سے اپنی گردن چھڑاتی ہوئی بولی۔

”مجھ سے منہ موڑو گی تو ایسے ہی کروں گی۔“ مدحیہ ہنستی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔
 ”بہت بری ہو تم۔“ اس کا سارا غصہ جھاک بن کر میٹھ گیا۔

”شاہ! مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا۔“ مہر النساء بہت تلملائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔
 شاہ سکندر نے پہلے الماس کو کمرے سے جانے کا اشارہ کیا پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”ہاں! کیا برداشت نہیں ہو رہا۔“
 ”اس لڑکی کے سوا گت کے لیے یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، آپ کچھ نہیں رہے۔ باباجان نے سب کو ای کامیاب رکھا ہے۔ یوں جیسے کہیں کی مہارانی آنے والی ہو۔ حویلی میں چمکی شادی تو نہیں ہے یہ نہ ہی پہلی سو آ رہی ہے اس سے پہلے بولس بھائی کے بیٹے کی شادی ہوئی تو اس کی دہن کے لیے تو اتنے اہتمام نہیں کیے گئے تھے۔“
 ”یہاں معاملہ ذرا دوسرا ہے مہر النساء! اور دل کا بھی، یعنی باباجان کے سب سے جیسے پوتے کی شادی آنے والی صرف بہو ہی نہیں، بیٹی بھی ہے جو اب تک محروم رہی۔ شاید باباجان اسی کی تلافی کر رہے ہیں۔“
 سکندر نے سمجھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔
 ”ہو نہ تلافی! باباجان تلافی کر رہے ہیں اور آپ کیا کریں گے؟۔“ مہر النساء کے لہجے میں تفرکے ساتھ طر

سمٹ آتا تھا۔
 ”دیکھو مہر النساء! میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تم اس بچی کے لیے دل میں بغض مت رکھو۔ اس آنے سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ وہ زیادہ دن یہاں نہیں رہے گی۔ علی اسے اپنے ساتھ لے جا گا۔“
 ”اب بھی کیوں نہیں، یہ سارے انتظام وہیں شہر میں ہوتے۔ یہاں لانے کی ضرورت کیا ہے۔“

”بس باباجان کا شوق ہے۔“
 ”شوق نہیں شاہ! وہ مجھے اذیت دینا چاہتے ہیں۔“
 ”یہ شخص تمہارا خیال ہے۔ باباجان نے ہمیشہ تمہیں اہمیت دی ہے۔ کبھی تمہاری حق تلفی نہیں ہو۔ یہ شخص تمہارا خیال ہے۔ باباجان نے ہمیشہ تمہیں اہمیت دی ہے۔ کبھی تمہاری حق تلفی نہیں ہو۔ یہاں تک کہ تمہاری بد تمیزوں کو بھی برداشت کیا ہے انہوں نے اور تم ان کی اتنی سی خوشی برداشت کر رہا ہو یا در کھو باباجان ایک حد تک ہی ذہیل دیتے ہیں۔“ شاہ سکندر حتی الامکان ضبط کر رہے تھے پھر میں منتہ کر گئے۔

”کیا کریں گے وہ نکال باہر کریں گے مجھے حویلی سے، نہیں شاہ! اب یہ ممکن نہیں ہے، میری اولاد وہ ہے اور اب یہ سن لیں کہ آغا بھی اس لڑکی کے یہاں آنے کے حق میں نہیں ہے۔“ مہر النساء نے جواباً خبردار کیا تو ان کی پیشانی پر بے شمار لکیریں کھینچ گئیں۔
 ”آغا کیا کہتا ہے وہ؟۔“

”میری کہ کسی رکھیل کی اولاد ان کی برابری نہیں کر سکتی۔“ مہر النساء نے اس بار کچھ آرام سے کہہ کر دکھائی تو وہ بری طرح سلگ کر بولے تھے۔

”وہ رکھیل کی اولاد ہے اور آغا، آغا کس کی اولاد ہے۔“
 ”میری۔“ مہر النساء نے گردن اڑائی تھی۔
 ”ہاں صرف تمہاری۔“ ان کا وارکاری تھا۔

”مہر النساء! بڑی، کیا مطلب ہے آپ کا؟۔“
 ”جو چاہے سمجھ لو۔“ شاہ سکندر سر جھٹک کر جانے لگے کہ مہر النساء ان کے سامنے آگئی۔
 ”ایک بات بتائیں شاہ! وہ آکثر اپنا حشر بھول گئی جو بیٹی کو یہاں بھیج رہی ہے۔“
 ”وہ تمہیں بھیج رہی ہم لارہ ہیں۔“ شاہ سکندر بے اختیار کہہ گئے۔

”بات تو ایک ہی ہے۔ وہ بھیجے یا آپ لائیں۔ اس نے اعتبار کیسے کیا یا آپ نے کوئی بھاری ضمانت دی ہے؟“
 ”میں جانیدا دیا اپنا آپ۔“ مہر النساء طنز کے ساتھ مشکوک نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔
 ”میں ان باتوں میں کیوں الجھ رہی ہو مہر النساء! جب میں کہہ چکا ہوں کہ تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا تو میرا یقین زبردست شاہ سکندر نے نرمی سے کہہ کر اسے سامنے سے ہٹایا اور کمرے سے نکل گئے۔



ہے ایک افزا تفری محی تھی۔ حالانکہ سارا دن پڑا تھا لیکن ناشتے کے بعد سے ہی سب کو اپنی اپنی تیاری کی فکر ہوئی تھی۔ مدحیہ کے لیے آبیہ نے بہت چاہ سے مندی کر کا کرتا اور تنگ پا جامہ بنایا تھا۔ جیسے اب وہ ریجیکٹ کی گئی تھی۔

”آخر کیا خرابی ہے اس میں۔“ صبا حث نے اس کے سوٹ کے ساتھ کا جھلما تا دوشہ بیڈ پر پھیلاتے ہوئے پچھا۔
 ”اب اس مجھے نہیں اچھا لگ رہا۔ ماما کو اور کوئی کٹر نہیں ملا تھا اور یہ تنگ پا جامہ تمہیں پتا ہے مجھے کتنا برا لگتا ہے۔“ مدحیہ نے بیڈ پر پھیلا دوشہ بھیج کر اس کا گولہ سا بنا کر اچھا لگایا۔

”لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ اتنی امیر جنسی میں تو کوئی تمہیں تمہاری پسند کے کپڑے ہی کر نہیں دے گا۔ اسی لیے میں تمہیں جلدی بلارہی تھی تاکہ سہولت سے اپنی تیاری کر سکو، لیکن تمہیں تو سب کیا کرایا ملنا چاہیے۔“
 ”بہنو بچی۔“
 ”ہرگز نہیں، یہ تم اپنے جیز میں رکھ دو، چار دن بعد تمہاری مندی ہوگی تو اس میں پس لینا۔“ مدحیہ نے دیکھا کر کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”کی الحال تو تم اسے میری مندی میں پہنو۔ چار دن بعد میں پسینوں گی۔“
 ”جس تم ہی پسینا۔ مجھے کوئی اور انتظام کر کے دو، ورنہ میں نہیں جاؤں گی۔“ مدحیہ کی ہٹ دھرمی پر اس نے اپنا ہونٹ لیا۔

”اللہ کیا چیز ہو تم، اتنے کم وقت میں میں کہاں سے انتظام کر کے دوں، نیچے سب لوگ تیار ہونا شروع ہو گئے۔“
 ”اب اچھا لیا کرو۔ ریڈی میڈ لے آؤ لیکن جاؤ گی کس کے ساتھ۔“ صبا حث مشورہ دے کر خود ہی اچھٹے میں پڑھ کر۔

”میریوں بیٹھی رہی جیسے یہ سیرے سے اس کا مسئلہ ہی نہ ہو۔“
 ”عمر سے کھولے جانے تمہیں، میں حیدر می مارکیٹ سے جیسا سوٹ چاہو گی مل جائے گا۔“ صبا حث مصطحاً اس کے دوشے کو نظر انداز کر رہی تھی۔
 ”ہاں، جیسے تمہارا باپ دے گا۔“

”باب کو بھوڑو۔“ میں دے رہی ہوں اپنی ساری جمع پونجی۔“ صبا حث نے ہنستے ہوئے وارڈروب کھولی تو مدحیہ بولا۔

”چارپانچ سو کا سوٹ میں نہیں لوں گی۔“
 صبا حث کچھ نہیں بولی۔ آرام سے کپڑوں کی تھوں میں سے پیسے نکال کر گنے پھیلٹ کر اس کے ہاتھ پر رکھتی بٹل ہوئی۔

”گورورے ڈھائی ہزار ہیں۔ زبردست سوٹ آئے گا اور دیکھو عمر نہ مانے تو تو یہ کو لے جانا۔“
 ”اور اگر وہ بھی نہ مانی تو میں اس کی چلی جاؤں گی۔“

مدحیہ کبھی ہوئی کمرے سے نکل گئی تو اس نے یوں سر ہلایا جیسے وہ اسے کبھی نہیں سمجھا سکتی پھر اس کے وہ کپڑے جو پینچک کر گئی تھی۔ احتیاط سے تہہ کر کے الماری میں رکھے اس کے بعد نیچے کی افزا تفری دیکھنے کے خیال سے لڑکی کھڑکی کھولی تھی کہ ادھر سے شور کی آواز پر فوراً کھڑکی بند کر کے دروازے میں آئی تو مدحیہ کو سونا اور عمر کے

سہارے آتے دیکھ کر چیخ پڑی۔

”کیا ہوا مدحو؟“

”کچھ نہیں ہوا، ہٹو سامنے سے۔“ عمر نے قدرے تیز ہو کر کہا۔

مدحہ کے منہ سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے بہت تکلیف میں ہو۔

وہ سینے پر ہاتھ رکھے ایک طرف ہٹ کر دیکھنے لگی جب سونیا نے آرام سے مدحہ کو بیڈ پر لٹا دیا تب وہ بول کر اس کے پاس آئی اور قریب بیٹھ کر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے لیا۔

”کیا ہوا مدحو؟“

”سیڑھیوں سے پھسل گئی ہیں محترمہ! پیر میں موج آگئی ہے۔ پھوپھو کہاں ہیں؟“ عمر نے بتا کر پوچھا تو سونیا جلدی سے بولی۔

”پھوپھو پیچھے ہی ہیں، جاؤ بلا لاؤ۔“

عمر چلا گیا تو وہ اٹھ کر مدحہ کا پیڈ دیکھنے لگی پھر آہستہ سے انگلی سے چھوا تو وہ چیخ پڑی۔

”ہاتھ نہیں لگانا۔“

وہ اچھل کر پیچھے ہٹی تو سونیا نے اسے تھام لیا۔

”تم بیٹھو آرام سے، پھوپھو آکر دیکھ لیں گی۔“

”ان کے دیکھنے سے کیا اسے تکلیف نہیں ہوگی اور تمہیں ضرورت کیا تھی سیڑھیاں پھلانگنے کی۔ آرام سے نہیں اتر سکتی تھیں۔“ وہ روپائی ہو کر مدحہ پر بکڑنے لگی۔

”اوفو! میں نے کہا تھا۔ تم ادھر بیٹھو۔“ سونیا اسے پیچھ کر دوسری طرف لے آئی۔

کچھ دیر بعد آسہ آئی تو مدحہ کی موج چیک کرنے سے بیڈ ترق تک اس نے سکون اور تحمل کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد وہ بھی اسے سخت ست کہنے سے باز نہیں رہ سکی تھی۔

مدحہ آنکھوں پر بازو رکھے چپ چاپ سستی رہی۔ آخر صباحت کو اس پر رحم آیا۔

”بس کر بس ماما! آب پجاری جان بوجھ کر تو نہیں کری۔“

آسہ نے ذرا سا سر جھٹکا پھر کھڑی دیکھ کر سونیا کو جلدی تیار ہونے کا قسمی ہوئی کمرے سے نکلی گئی تو مدحہ آنکھوں سے بازو ہٹا کر روئی آوازیں بولی۔

”سونیا جی! میں کیسے جاؤں گی۔“

”تم کہاں جا سکتی ہو، بس آرام کرو اور دیکھو پیر کو زیادہ ہلانا جلاتا نہیں ورنہ شادی کے دن بھی ایسے ہی ہڈا رہو گی۔“ سونیا نے دھینج سے تنبیہ بھی کی تو وہ خفگی سے بولی۔

”اس سے تو اچھا تھا۔ میں آتی ہی نہ۔“

”اے نہیں زیادہ چوٹ نہیں ہے۔ صبح تک انشاء اللہ سو جن اتر جائے گی پھر تم چل سکو گی۔“ سونیا نے تسلی دی پھر صباحت کو اس کا خیال رکھنے کا قسمی ہوئی چلی گئی۔

”چلو میں بور ہونے سے بچ گئی۔“ صباحت نے ہلکے ہلکے انداز میں کہا تاکہ اسے ملال نہ ہو پھر مزید ان دھیان پٹانے کی خاطر ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں تو کچھ دیر میں واقعی وہ ہل گئی تھی۔

پھر اگلے روز مدحہ کے پیر کی سو جن تو اتر گئی لیکن چلتے چلتے اسے کچھ تکلیف ہو رہی تھی جس سے آسہ اسے مزید آرام کرنے کا کہہ دیا تاکہ اگلے دن تک وہ بالکل ٹھیک ہو کر زیارات کا استقبال کر سکے اور اسے بھی لٹا۔

چلتا اچھا نہیں لگ رہا تھا اس لیے اس نے بلا چوں و چرا آسہ کی بات مان لی اور جب صباحت کو مندی کی کمی محسوس کی تو اسے لے جایا گیا تب بھی وہ آرام سے لیٹی رہی۔ نیچے سے گانے اور ڈھول کی آوازیں اور تک آواز چہرے کی کسی وقت وہ کان لگا کر سننے لگتی پھر اچانک ذہن نہیں اور تنگ جاتا۔ صباحت کے جانے کا خیال آیا تو پھر وہ اس سوچنے لگی کہ اب بس وہ یہاں ایک ہی رات کی ممان ہے اس کے بعد وہ اپنی زندگی کے نئے سفر پر روانہ ہو جائے گی۔

نئی عجیب بات ہے۔ میں نے ابھی تک اس کے ہم سفر کو نہیں دیکھا۔ وہ اپنے آپ پر ذرا سا ہنسی تھی کہ بڑے تنگ کی آواز سے چونک کر ادھر دیکھتی ہوئی بولی۔

”آجاؤ۔“

انہوں نے کھانے کے ساتھ نیل اندر آتے ہوئے بولے۔ ”کیسی طبیعت ہے تمہاری۔؟“

پہلی طبیعت خراب کب تھی۔“ اس نے یوں ہی لیٹے لیٹے کہا یعنی ذرا سا سرا و نچا کرنے کی زحمت بھی نہیں بل قدرے جھل سے ہو کر بولے۔

”میرا مطلب ہے تمہارا پیار۔“

”جاننے میں کچھ تکلیف ہو رہی ہے۔“

”یہ نہیں نیچے جھوڑ آؤں۔“ نیل نے اس کا خیال کر کے کہا۔

”نہیں نہیں۔ صبا کے سرال والے تبھی سن گئے اس کے دونوں ہن بھائی لنگ۔“ اس نے اپنی زبان ہاتھ چپکائی تو ایک پل میں ضبط کی جانے کن منزلوں سے گزر کر نیل اس کی تائید کرتے ہوئے ہوئے

نہیں ایسا نہ ہو وہ صبا میں بھی کوئی عیب تلاش کرنے بیٹھ جائیں۔“

نواب پر کچھ حیران ہوئی لیکن بولی کچھ نہیں۔ تو قدرے توقف سے نیل پوچھنے لگے۔

”نہیں مستقل اسلام آباد رہنے کا سوچ لیا ہے۔؟“

”ہاں۔ کج رجحان کے بعد دیکھیں کیا کرتی ہوں۔“ اس نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

”بس پھوپھو کا خیال کرنا چاہیے۔ صبا کے جانے سے وہ اکیلی ہو جائیں گی۔“

”پہلی تو ہیں، آپ کیوں نہیں خیال کر لیتے۔“

”انہوں نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

”اب آپ کا فرض نہیں ہے۔؟“

”نہیں۔“

”مجھے ہیں تو شادی کر کے ماما کو اچھی سی بھولا دیجیے۔“

”ہی!۔“ وہ ذرا سا سننے۔ ”مجھ سے تو کوئی عام سی بھی شادی پر آمادہ نہیں ہوگی۔“

”اے؟“ اس نے پہلے بے دھیانی میں کہا پھر خود ہی چوری بن گئی۔ ”خالی! اپنی کسی بات یاد آگئی تھی اور نیل کے کچرے پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ مسکراتے ہوئے وہیں سے پلٹ گئے۔

بچے آسہ خود صباحت اور مدحہ کو پوٹا پر لپکا چھوڑ آئی تھی۔ اس کے بعد انہیں لانے کی ذمہ داری نیل اور ماما کو سونپ کر وہ اس طرف سے مطمئن ہو گئی تھی۔

مات بچے کے قریب وہ سب کے ساتھ مین پال پہنچ گئی۔ ممانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر بھی خلیل بھائی اور خلیل بھائی کے ساتھ گیٹ پر کھڑی ہوئی تھی پھر اندر چلی آئی اور لڑکیوں کو زیارات

نیل کے لیے گیٹ پر جانے کا کہہ کر اماں جی کے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔

”میرا بیٹا ہو رہی ہے اماں جی۔“

”اے، صبح سے دیکھ رہی ہوں ایک ایک کے ساتھ مغرب ماری کر رہی ہو اور یہ لڑکیاں نہیں آئیں ابھی بلال کی نے اس کے قدرے سے ہوئے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”ناہوں کی بلکہ وہ آ رہی ہیں۔“ وہ مودی کیرے کی تیز روشنی میں صباحت کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے نسیہ ماما بھی اور دوسری طرف مدحہ بھی جو صباحت سے زیادہ اپنا شرارہ سنبھالنے میں لگی ہوئی تھی۔

ان کی خوشی کبھی پوری نہیں ہوگی بھابھی۔“ آسیہ نے روتے ہوئے کہا تب ہی عارفہ بیگم آگئیں اور فاتحانہ
بہنسل مسکراتی ہوئی بولیں۔
”مبارک ہو، کہاں ہے دلہن، باہر لے آئیں اسے۔“
بہنسل خود پر ضبط کرنے کے بعد بولی۔

”بھابھی! تم سو نیا وغیرہ کیسے جاس جاؤ۔ بارات آنے والی ہوگی۔“
”جب آئے گی، چلی جاؤں گی۔“ مدحیہ لاروائی سے کہہ کر آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔
”بھابھی! آپ یہاں بیٹھیں گی یا میمونہ بھابھی کو بھیج دوں۔“ اس نے صباحت کی تھوڑی چھوٹے پر
بھابھی سے پوچھا۔
”میں میں ہوں یہاں، تم البتہ باہر جاؤ۔ میرا خیال ہے بارات آگئی ہے۔ شور مچا رہا ہے۔“
سیما بھابھی نے دروازے کی طرف کان لگاتے ہوئے کہا۔ تو وہ بہت غلٹ میں مدحیہ کو ساتھ آنے کا پتہ
ڈرننگ روم سے نکل کر گیٹ کی طرف آئی تو سب سے پہلے عارفہ بیگم نے بڑی خوبصورتی سے اسے باتوں میں لگا کر اسے ساتھ
دوسری خواتین کی طرف بڑھنا چاہا لیکن عارفہ بیگم نے بڑی خوبصورتی سے اسے باتوں میں لگا کر اسے ساتھ
چلنے پر مجبور کر دیا تھا پھر کچھ دیر وہ ان کے ساتھ بیٹھی جب نکاح کے لیے ٹھیکیل بھائی اور خلیل بھائی گھر
آئی طرف جاتے دیکھا تب عارفہ بیگم سے معذرت کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور پہلے میمونہ بھابھی کے پاس
ان سے اس پیکٹ کی بابت پوچھا جس میں دو لہما کے لیے کھڑی، قلم اور انگوٹھی وغیرہ تھی اور ان کے بتانے پر
کر گاڑی میں سے وہ پیکٹ نکال لانے کو کہا پھر ڈرننگ روم کی طرف آئی تو دروازے ہی میں رک گئی کیونکہ

اندر جگہ کم تھی دوسرے اچانک بدل سہم سا گیا تھا۔ غالباً اس تمام عرصے میں اب یہ خیال آیا تھا کہ وہ
زیادہ اس کی اپنی بھی وہ پرانی ہو رہی ہے اور اس خیال نے اس کی آنکھیں نم کر دی تھیں۔ جس سے اسے
دھندلا گیا تھا اور ابھی یہ دھند چھٹی نہیں تھی کہ سماعتوں میں اتر کر نکاح خواں کی آواز ذہن کے کیند
جا لگی تھی۔
”شاہ علی جاگئے ولد شاہ جاگئے حیات کے ساتھ تمہیں یہ رشتہ منظور ہے؟“
”نہیں۔“ آسیہ نے پورا زور لگا کر چیخا جاتا تھا لیکن اس سے پہلے اسے بڑی زور کا جھک آیا اور سننے
اس کا ہاتھ دروازے پر یوں لگا کہ ٹھیکیل بھائی نے چونک کر دیکھا اور فوراً ”بڑھ کر اسے کندھوں سے تو
ساتھ لگاتے ہوئے آہستہ سے بولے۔
”موصد بننا، جو صلد۔“

وہ ساری توانائیاں صرف کر کے بھی حلق سے کوئی آواز نہیں نکال سکی۔ البتہ آنکھیں بالاب بھر
بہت تلخی انداز میں نفی میں سر ہلایا تو ٹھیکیل بھائی اسے تقریباً ”ھیٹے ہوئے ڈرننگ روم سے باہر۔“
دونوں بازوؤں کے حلقے میں لایا تو اس کا بورا وجود جھٹکتے کھارہا تھا۔
”معا“ سارے میں مبارک سلامت کی آوازیں گونجنے لگیں پھر قریب سے گزرتے خلیل بھائی کی آ
”اچھا نہیں ہوا۔“
”انتہا بڑا دھوکا۔“ سیما بھابھی ”میاں سے کہہ رہی تھیں۔“
”س خاموش رہو۔“ ٹھیکیل بھائی نے انہیں ڈانٹا تب وہ پورا زور لگا کر ان کے بازوؤں سے نکل کر
”میں خاموش نہیں رہوں گی، ہرگز نہیں۔ جا کر کہہ دیں سب سے، جس طرح آئے ہیں؟“
جاگمیں دوڑ نہ میں۔“

”آسیہ! آسیہ! بوش سے کام لو۔“ ٹھیکیل بھائی ٹوک کر بولے۔
”بھئی تو ہوش میں آئی ہوں بھائی۔“ وہ رو پڑی۔
”مما! ممما! کیا ہوا؟“ مدحیہ بھاگ کر اس کے پاس آئی تھی کہ اسی مل فائز کی آواز سے پوری ف
”یہ کیا ہو رہا ہے ماموں جی۔“ مدحیہ نے سہم کر ٹھیکیل کو دیکھا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولے۔
”خوشی کا اظہار ہو رہا ہے۔“
”او گاڈ! میں دیکھوں۔“ مدحیہ بھاگی ہوئی لان میں اتر گئی۔

”ان سے بات نہیں کریں ممالیہ ڈاکو ہیں۔“
”تو بھائی یہی ہے دلہن۔“ عقب سے رابعہ نے اونچی آواز میں کہا۔ تو ان میں سے ایک نے فوراً ”بڑھ کر
بہنسل کا ہاتھ لیا اور اس سے پہلے کہ آسیہ کچھ سمجھتی اس نے جھپٹے سے مدحیہ کو کھینچ کر اس کے منہ پر رومال
تھا اور فوراً ”کندھے پر لاؤ کر گیٹ پار کر گیا۔“
”مڈھول۔“ آسیہ ایک دم حواس باختہ ہو کر چیخی۔ اباجی! بھائی روکیں انہیں۔“
”آسیہ! آسیہ! بوش کرو۔“ عدیل بھائی نے بھاگ کر اسے کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑا تو وہ ان کے بازوؤں میں
نالا کی تھی۔

اتنی افرا تفری میں کوئی نہیں سمجھ پارہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔ ظلیل بھائی اپنے مہمانوں سے معذرت کر کے انہی رخصت کر رہے تھے۔

ظلیل بھائی ابھی بھی مصلحت کا دامن تھامے ہوئے تھے اور اس دھوکا دہی پر بجائے غلی جہانگیر پر ناراض ہونے کے بہت ضبط سے کمر رہے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ اب صاحت آپ کی امانت ہے لیکن اس وقت رخصتی ممکن نہیں ہے اس کے لیے نہ مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑے گا۔“ پھر وہ غلی جہانگیر کے ساتھ اس کی گاڑی تک گئے تھے اور جب اپنی گاڑی سے اترے تو باؤں میں جھوٹی آسیر کو دیکھ کر تشویش سے پوچھنے لگے۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“

”چائیں بھائی! میں تو اس کی چیخ سن کر۔“ ابائی کے آنے سے عدیل کی بات ادھوری رہ گئی۔

”چلو بیٹا! اب جو بھی ملے کرنا ہے گھر چل کر کرو! ابائی نے کہا۔

”جی ابائی! آپ اماں جی اور بیچوں کو لے کر چلیں۔ ہم بھی آ رہے ہیں۔“

ظلیل بھائی کہتے ہوئے غیر محسوس طریقے سے آسیر کے سامنے آکھڑے ہوئے تاکہ ابائی کی اس پر نظر نہ پڑے۔



دستک کی آواز پر اس نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا پھر قریب جا کر آہستہ آواز میں پوچھا۔

”کون؟“

”میں ہوں نیل دروازہ کھولو بیٹا۔“ نیل کی آواز سن کر اس نے کچھ دیر سوچا پھر دروازے کا لاک کھول کر طرف سے پیچھ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ نیل اندر داخل ہوئے اور اسے اکیلے دیکھ کر پوچھا۔

”اور کوئی نہیں ہے یہاں۔“

وہ ایک دم پلٹ کر ان کے بازو سے لگ گئی۔

”نیل بھائی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے مہما کہاں ہیں اور یہ اتنی گولیاں کیوں چل رہی تھیں کیا کوئی؟“

”کچھ نہیں ہوا چلو میرے ساتھ۔“ نیل نے ٹوک کر کہا۔

”کہاں؟“

”یہ سامان تمہارا ہے یہ بھی لے لو۔“ نیل اس کا کہاں نظر انداز کر گئے۔

”لیکن ممانے تو کہا تھا۔ میں ان کے علاوہ کسی کی۔“

”او فو! تم چلو تو۔“ نیل قصداً جھنجھلائے پھر خود ہی پیکٹ اور بیٹی بکس اٹھا کر اسے تھماتے ہوئے بولا۔

الحال کوئی سوال مت کر دیکھو تو کہ میں جواب نہیں دوں گا بس اتنا سن لو کہ ہم گھر جا رہے ہیں۔“

اس کے ہونٹ ذرا سے نیم دا ہوئے لیکن کچھ بول نہیں سکی۔ اس لیے نیل نے منع کیا تھا کہ جھجھکی۔

پھر سر جھکا کر ان کے ساتھ چل پڑی۔

ڈرائیونگ روم سے باہر ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اندر ہی اندر الجھنے لگی لیکن سروانچا کر کے نہیں دیکھا اور اس طرح گاڑی میں بیٹھ گئی جب نیل اس کے برابر بیٹھے تب اس سے مزید صبر نہیں ہو سکا۔

طرف دیکھ کر عاجزی سے بولی۔

”جی جی! میں نیل بھائی! گھر میں سب ٹھیک ہیں ناں۔“

نیل نے ذرا سانات میں سر ہلایا پھر اسے ایک بازو کے حلقے میں لے کر اپنے ساتھ لگایا یوں جیسے چھلنے ہوئی بچی کو سہارا دیا جائے اور وہ پھر بھی مطمئن نہیں ہوئی مزید عروسی جوڑے نے اسے پابند کر دیا تھا۔

داخل ہو کر وہ کسی سے فوراً کوئی سوال نہیں کر سکی اور سیدھی اوپر چلی آئی۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر بند کرنے لگی تھی کہ بھاگتے قدموں کی آواز سن کر رک کر انتظار کرنے لگی۔ چند لمحوں بعد سونیا آئی۔

”میں نے سوچا تمہاری مدد کروں۔“ سونیا نے بظاہر ہلکے پھلکے انداز میں کہا کہ اسے پیچھے دروازہ بند

ہاتھ کئی سوال کر ڈالے۔

نیل! کیا ہوا ہے اتنی خاموشی کیوں ہے مہما اور مدھو کہاں ہے؟

”جی! سب چلو تمہارے کمرے پر تشریف لے کر کے منہ ہاتھ دھو لو۔“ سونیا نے کہا اور ہر کمرے کے دوپٹے میں لٹکانے لگی اس کے بعد زیور اتار کر الماری میں رکھنے کے ساتھ اس کے لیے ایک سوٹ بھی نکال لیا۔

”نیل! کیا ہو گیا؟“ وہ کتنی ہوشیور اور دھوکا دہی میں جلی گئی۔

”نیل! تو سونیا کو موجود نہ پا کر وہ ہانسی ہو گئی دل چاہا چیخ کر سب کو پکارے اور پوچھے کہ اسے اتنا بے خبر کیا ہوا ہے ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو اس سے چھپائی جا رہی ہے۔

”یہ خدا الہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ بہت بے دلی سے اس نے عروسی شرارہ بیڈ پر پھینکا اور خود بھی ڈھسے لگی تو غلی جہانگیر کا خیال آیا۔

”نیل! جہانگیر تو ٹھیک ہیں ناں؟“ وہ فوراً ”اٹھی تھی کہ سونیا ٹرے میں چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ لے کر

نے سوچا، تم جب تک چہنچ کر گوگی میں چائے بنا لوں گی۔“ سونیا نے ٹرے اس کے سامنے رکھ دی پھر بیٹھے لگی۔

”میں جانتی ہوں تم بہت اچھے رہی ہو اور پریشان بھی ہو۔“

”نیل! پلڑے۔“ وہ ٹوک کر بولی ”جو بھی کہنا ہے سیدھے صاف لفظوں میں کہہ دیں میں سب سن لوں گی۔“

”نیل! لیکن خیر اصل بات یہ ہے کہ پھوپھو تمہاری شادی غلی جہانگیر کے ساتھ نہیں کرنا چاہتیں۔“ سونیا بدھتے ہوئے کافی صلہ کر کے یوں کہا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔

”میرا مطلب ہے۔“ اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

”نیل! مطلب سمجھ رہی ہوں۔“ سونیا فوراً بولی۔ ”وہ جو غلی جہانگیر سے ناں وہ شاہ سکندر کا بھتیجا ہے اور یہ مانے پہلے سے نہیں بتائی تھی ورنہ پھوپھو پہلے ہی انکار کر دیتیں، یعنی اپنی اصلیت چھپا کر وہ تمہیں

اپنا رہے تھے دھوکے کے۔“

”کے۔“ اس نے اپنی آواز کس دور سے آتی لگی تھی۔

”نیل! دھوکا نہیں ہے۔“ سونیا چائے کا سپ لیتی ہوئی بولی۔

”نیل! تم صبر کرو۔“

”جی! میں ان کی اصلیت نہ کھلتی تو تم تو پہنچ چکی تھیں شاہ پور۔“ سونیا اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی کمرے میں آ کر بیٹھ گئی۔

”نیل! اللہ جانے تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوتا۔ بہر حال اس وقت تمہیں بہت کام لینا ہے، پھوپھو کے سامنے انہیں یقین دلاؤ کہ تم انہیں چھوڑ کر نہیں جاؤ گی۔ سمجھیں تمہارے یہاں آجانے سے پہلے ہو گئی کیونکہ نکاح ہو چکا ہے اور اس کے بل پر وہ تمہیں لے جانے کی کوشش ضرور کریں گے۔“

”نیل۔“ وہ جانے کس خیال سے سہم کر رونے لگی۔

”نیل!۔“ سونیا نے چائے کا کپ رکھ کر اس کے گرد دونوں بازوؤں کا حلقہ بنا لیا۔ ”یہ کیا حماقت کر رہی ہو پتہ چلتے ہیں۔ بتائیں پھوپھو کو ہوش آیا کہ نہیں۔“

”نیل! تمہیں کچھ کرنا چاہی۔“ مہما کو کہا ہوا ہے؟

”نیل! عدیل چاچو ہم میں سے کسی کو کمرے میں جانے ہی نہیں دے رہے تم چلو شاید تمہیں جانے دے گا تو اس نے فوراً ”اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”نیل! کہاں ہے؟“

”نیل! تو میں نے نہیں دیکھا شاید پھوپھو کے پاس ہوگی۔“

خدا۔ ”وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی اور اگلے پل چاروں اور جھولتی لڑیوں کو بے دردی سے کھینچنے لگی۔
ایسا اس کے وجود سے لپٹ گئی تھیں۔ کچھ بازوؤں میں الجھ گئیں جس سے اس کی جھنجھلاہٹ میں

آگ لگا دوں گی میں سب کو۔“ وہ بری طرح تملدا کر بڑبڑاتی تھی کہ دروازہ کھلنے کے ساتھ علی
بھل ہو کر بولا۔

”پھر کڑیوں سے آزاد کرانے کی سعی بھول کر اسے دیکھنے لگی۔
”کوئی اٹھاڑے کا۔“ علی جہانگیر نے سارے میں بکھرے پھولوں کو دیکھتے ہوئے قدرے محفوظ

نہایت کما تھا کہ وہ تیز ہو کر بولی۔
”آپ؟“

”ہاں پتے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سانس جیسے مجھے نہیں جانتیں۔ وہ لڑیوں سمیت مسہری سے اتر کر اس
نزلوں۔

”آپ ہی کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔“
”بہاؤں مانتا ہوں کہ یہ سب۔۔۔۔۔“

”نہ علی جہانگیر ہیں۔“ وہ ایک دم سمجھ کر خامے تسننہ انداز میں اس کے گرد چکر کاٹ کر پھر اس کے
”پھر مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے کہ آپ اپنے متعصب میں کامیاب نہیں ہو سکے۔“

”بے ہمارا۔“ وہ کچھ ٹھٹھک کر دیکھنے لگا۔
”جہ کہ میں صاحت نہیں ہوں اور نہ ہی اس کی طرح معصوم، مسکین اور بزدل ہوں، سمجھے آپ۔“

”پھر کما تو علی جہانگیر پیشانی پر بے شمار نشانیں ڈال کر اسے یوں دیکھنے لگا جیسے اس کی بات سمجھنے کی
”بابو۔“

”یوں ہی چھوڑ کر ٹھٹھنے کے انداز میں دروازے تک آئی اور اسے پورا کھول کر باہر دیکھنے لگی۔ طویل
”ابو اس سے آگے غالباً“ ٹیرس اور بس یہیں تک روشنی تھی اس کے بعد گھپ اندھیرا تھا۔

”یوں ہی جگہ ہے۔“ اس نے پلٹ کر پوچھا۔
”نہایت کم پلٹا اور اسے دروازے کے پتوں پر کھڑے دیکھ کر خاصا متعجب سا ہو کر اس کی طرف بڑھتے

”نکت سے سب لوگ کیا کہیں گے۔“
”نکت کے کہنے کی کبھی پروا نہیں رہی۔“ وہ بے نیازی سے کہہ کر رہا داری میں نکلی تھی کہ علی جہانگیر

”ت میں اس تک پہنچ کر اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔
”نہ کو۔“

”نہ لگاؤ مجھے میں نے کہا نہیں، میں صبا نہیں ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا کر
”نہ لگاؤ مجھے میں نے کہا نہیں، میں صبا نہیں ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا کر

”نہ لگاؤ مجھے میں نے کہا نہیں، میں صبا نہیں ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا کر
”نہ لگاؤ مجھے میں نے کہا نہیں، میں صبا نہیں ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا کر

”نہ لگاؤ مجھے میں نے کہا نہیں، میں صبا نہیں ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا کر
”نہ لگاؤ مجھے میں نے کہا نہیں، میں صبا نہیں ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا کر

”نہ لگاؤ مجھے میں نے کہا نہیں، میں صبا نہیں ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا کر
”نہ لگاؤ مجھے میں نے کہا نہیں، میں صبا نہیں ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا کر

”نہ لگاؤ مجھے میں نے کہا نہیں، میں صبا نہیں ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا کر
”نہ لگاؤ مجھے میں نے کہا نہیں، میں صبا نہیں ہوں۔“ وہ جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑا کر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر



”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر
”چلیں۔“ اس کے ذہن سے ہر بات نکل گئی صرف آسیہ کا خیال تھا جو سونیا کے ٹوکنے کی پروا کیے بغیر

”گرینڈ فور شاہ حیات محمد۔“ وہ اس کا رد عمل دیکھنے کی خاطر اس پر نظریں جماتا رہا۔
وہ ایک دم اچھل پڑی۔

”جس کیساتھ کیا تھا، تم تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ آسیہ کے پاس تمہاری بیٹی ہے یا بیٹا۔“ بابا جان نے کہا تو وہ انہیں
نے کی بجائے سہولت سے بولے۔

”شاہ حیات محمد۔ یہ شاہ پور ہے، یعنی میں۔“
”جی، آپ شاہ پور میں ہیں۔“ وہ کہہ کر واپس کمرے کے اندر چلا گیا۔

تو وہ کچھ دیر اس کے پیچھے دیکھتی رہی پھر جیسے خواب کے عالم میں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ریڈنگ کے پاس
نیچے دیکھنے لگی۔ وسیع و عریض لاؤنج تیز روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ درمیان میں ایرانی قافین کے چاروں اطراف

صوفیوں پر جانے کون کون راجمان تھا۔ کسی شناسا چہرے کی تلاش میں اس کی نظریں بہکتی ہوئی شاہ سکندر
نہیں تو اس کے دل میں ایک لہری اٹھی تھی اور دوسرے پل وہ سیڑھیاں اتر کر ان سب کے درمیان آ
ہوئی۔

”ہیں“ بابا جان نے تعجب سے اسے بول دیکھا جیسے یہ کہاں سے آئی۔
”میں نے سوچا“ آپ لوگ اپنی جیت کی خوشی منا رہے ہوں گے۔ میں بھی آپ کے ساتھ شامل ہو جاؤں۔

کہہ کر زور سے ہنسی اور پھر ایک ایک کو دیکھ کر ہنسی چلی گئی۔ اس کی ہنسی میں واضح مسخرہ تھا۔
شاہ جہانگیر نے بول کھلا کر شاہ سکندر کو دیکھا لیکن وہ اپنی جگہ پریشان ہو کر بابا جان کو دیکھ رہے تھے جن کا چہرہ

اور توہین کے احساس سے سرخ ہو گیا تھا پھر وہ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر دھڑکے۔
”خاموش۔“

مدیہ کی ہنسی وہیں تھم گئی، لیکن وہ خائف نہیں ہوئی بلکہ براہ راست ان کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔
”تو آپ ہیں شاہ حیات محمد، میرے باب کے باب۔“

”صبا، شاہ سکندر نے سرزلش کے انداز میں بولا تھا کہ وہ چچا کر بولی۔
”صبا نہیں ہوں میں لیکن آپ کیا جانیں گے کبھی دیکھا ہو تب تو۔“

”آرام سے بیٹا، آرام سے۔“ شاہ جہانگیر نے صورت حال سنبھالنے کی سعی کی۔
”آرام سے۔“ وہ طنز آمیز تنہائی سے گویا ہوئی۔ ”باب“ واوا، بیٹی کو اغوا کر کے لے آئے ہیں اور یہ بھی

جانتے کہ وہ کون ہے۔ مدیہ ہوں میں مدیہ سکندر۔“
”مدیہ۔“ شاہ سکندر کے ذہن میں جھجک چلنے لگے تھے۔

”آس ہماری بیٹی ہوئی تو ہم اس کا نام مدیہ رکھیں گے۔“
”ہوں“ اچھا نام ہے۔“ اس نے سوچتے ہوئے انداز میں کہہ کر پھر خوشی سے پوچھا تھا۔ ”وہی کا

مدیہ؟۔“
”کیا مطلب؟ تم مجھے ایسا سمجھتی ہو۔“

”میرے خدا۔“ انہوں نے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر سر کو ذرا سا جھکا دے کر مدیہ کو دیکھا تھا۔ وہ
اسی زہر خند سے بول رہی تھی۔

”آپ نے ممّا کو دھوکا دے دیا لیکن اس سے بڑا دھوکا آپ نے خود کھایا ہے۔ صاحت میری ہیں؟۔“
”ہن۔“ بنانے والے نے صرف ہماری تشکیں ایک جیسی بنائی ہیں، مقدر ایک جیسے ہمیں لکھے۔“ آخر

کس خیال سے اس کے لہجے میں آزدگی سمٹ آئی تھی۔
”جھوٹ بولتی ہو تم۔“ بابا جان اس کا یقین کرنے کو تیار نظر نہیں آ رہے تھے۔

”نہیں بابا جان۔“ شاہ سکندر نے آگے بڑھ کر مدیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میری بیٹی جھوٹ
رہی۔“

مدیہ نے چونک کر شاہ سکندر کو دیکھا اور اپنے کندھے پر ان کے ہاتھ کے لمس کو یوں محسوس کیا جیسے
اپنی احساس کو ترس رہی ہو۔

”نہیں۔“ وہ کہہ کر واپس کمرے کے اندر چلا گیا۔
”نہیں۔“ وہ کہہ کر واپس کمرے کے اندر چلا گیا۔

کہا نے پر نہیں آئے؟“

نیا اتنی تمیز نہیں ہے کہ بہوں کو پہلے سلام کیا جاتا ہے اور اندر آنے سے پہلے بھی اجازت لی جاتی ہے۔ یہ یہاں ہم جسے بلاتے ہیں وہی آتا ہے۔ خود سے آنے کی جرات کوئی نہیں کرتا یہ ہم تمہیں پہلی اور بھجھارے ہیں۔ آئندہ خیال رکھنا۔“ بابا جان نے اس کی بدتمیزی کو نوک کر دیا۔

نیا نے سلام نہیں کیا یہ میری غلطی ہے۔ اس کے بعد میں کچھ نہیں جانتی۔ یعنی اس حویلی کے اوبہ اصول۔ نہ ہی وہ مجھ پر لاگو ہوتے ہیں۔ کیونکہ میں یہاں رہی نہیں اور نہ ہی رہنے کا ارادہ ہے۔“ وہ بے کشتی ہوئی بڑے آرام دہ انداز میں صوفے میں دھس گئی۔

فیاض نے ہنس کر کہا: ”تمہاری ماں نے“
 ”وہ فوراً“ بول پڑی۔ ”اے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔“
 ”بابا جان کا ضبط جواب دینے کا تو فضل دین کو پکار کر بولے۔“ سکندر کو بھیجو ہمارے پاس۔“
 ”اس نے سوچا اور میبل سے اخبار اٹھا کر گھنٹوں پر پھیلائی ہوئی انہیں سنا کر بولی۔
 ”میں شاید میرے اغوا کی خبر چھپی ہو۔ کہ شادی ہال سے دلہن کا اغوا۔“
 ”انتہائی فہر اوروں نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔“

نہایت ہی باجانبان۔“

اس پر سے نظریں ہٹا کر شاہ سکندر کو دیکھا اور سلام کا جواب دیے بغیر اس کی طرف اشارہ کر کے

ہی کو سب سے پہلے یہاں کے آداب سکھاؤ۔“ شاہ سکندر اس کی نشست کا انداز دیکھ کر یہی سمجھ کہ باباجان کو اس کا ہے بیٹھنا ناگوار گزر رہا ہے۔ اس لیے بڑے آرام سے بولے تھے۔

”آہستہ یعنی تب تک ہم اس کی بد تمیزیاں اور گستاخیاں برداشت کرتے رہیں، ہرگز نہیں۔ لے جاؤ۔“

”اب اور سمجھاؤ کہ اس وقت تک ہمارے سامنے نہ آئے۔ جب تک ہمارے سامنے مودب کھڑے ہوتا ہے۔“

”باباجان نے اتنے عرصے سے کہہ کہ شاہ سکندر خائف سے ہو گئے لیکن وہ ہنوز اسی لاپرواہ انداز میں ننگے کراٹھے ہوئے بولے۔“

”میں نے ہاتھ باندھ کر۔ سواری یہ تو میں قیامت تک نہیں سیکھ سکتی“ البتہ صبا۔
 ”بھیرے ساتھ آؤ بیٹا۔“ شاہ سکندر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑے۔
 ”وہ حضور۔“ وہ جاتے جاتے رک گئی۔

بابا جان نے خاصے
 افسانے سنانے شروع کیے۔

”موصویت رہی اُن کی۔“ وہ بے شکل اپنی ہنسی روک کر کہنے لگی۔ ”یعنی وہ ابھی ابھی یہ سمجھ

"مہاراجن رخصت کر دیں گی۔ وہ سب جانتے ہیں آپ تو جانتے ہوں گے ماما اور صبا کو میں جانتی ہوں۔"

پس "شاہ سکندر غیر ارادی طور پر پوری جان سے متوجہ ہو گئے تھے۔

ماہر ضعی کی مالک ہوں۔" وہ گردن اگڑا کر بولی۔

اس نے کمرے میں اُدھر اُدھر نظر ڈالی پھر واش روم تک گیا۔ رات دو بجے کے ساتھ ہی پانچواں گھر کی طرف توجہ دلائی۔ اس نے کمرے میں اُدھر اُدھر نظر ڈالی پھر واش روم تک گیا۔ رات دو بجے کے ساتھ ہی پانچواں گھر کی طرف توجہ دلائی۔ اس نے کمرے میں اُدھر اُدھر نظر ڈالی پھر واش روم تک گیا۔ رات دو بجے کے ساتھ ہی پانچواں گھر کی طرف توجہ دلائی۔

اس نے اپنی مصروفیت ترک کر کے بے اختیار سراپا کیا اور الماس کے دونوں ہاتھوں میں بیٹھ کر دیکھ کر غور سے بولی۔

”میں اترن نہیں پہنتی۔“
 ”تمہاری مرضی۔“ الماس نے جواباً ناگوار کی کے کنارے ساتھ دونوں ٹیگر بیڈ پر اچھال دیے اور واپس جانے لگی کہ شاہ سکندر اسے پکار کر بولے۔

”الماس یہ تمہاری بیوی بہن ہے مدحیہ۔“
 الماس کچھ نہیں بولی لیکن انداز ایسا تھا جیسے میں کیا کہیں۔
 ”اور مدحیہ بیٹا!“

یہ میری چھوٹی بہن ہے۔“
وہ فوراً کہہ کر ذرا سا ہنسی پھر شاہِ سندر کو دیکھ کر بولی۔ ”مجھے بھوک لگی ہے۔“
”ہاں چلو، لی لی جان کھانے پر انتظار کر رہی ہیں۔“ شاہِ سندر کہتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے تو وہ ان
پیچھے چلتی ہوئی الناس کے قریب رک کر بولی۔
”تم بھی چلو۔“ شاہِ سندر کے کچھ کہنے سے پہلے اس نے بھگ گئی۔

ہاؤسنگ ہال میں بااجاں کے علاوہ سب موجود تھے اس نے داخل ہوتے ہی سب پر اجنبی نظر والی تہیہ ہی یوں کھانے میں مصروف ہو گئی جیسے ہمیشہ سے پیار رہتی آرہی ہو۔ یعنی کوئی تکلف نہیں، نہ غیرت نہ سب کے درمیان وہ خود کو اجنبی محسوس کر رہی تھی جس کی کہ قریب بیٹھے شاہ سکندر بھی اسے نہیں لگ رہے۔ پھر بھی اس نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا نہ ہی بندو مہمان پوز کیا تھا اور سب سے پہلے کھانا ختم کر کے

”مجھے فوراً چائے چاہیے۔“
 ”فوراً؟“ چائے کس لئے کما تھا۔ اس کے ساتھ ہی بی بی ہنسی۔ جسے وہ نظر انداز کرتی ہوئی ڈانٹتے ہوئے کہتا تھا۔
 ”کراؤنج میں آئیٹیشی اور گلاس وال سے باہر کہنے نہ ٹھہریں اور دوسرے آگے غالباً ڈرائیوے نکالیں۔“
 ”آخری حد نظر نہیں آ رہی تھی۔“

لان جس کی آخری حد ہمیں ارہی سی۔
 ”تو یہ ہے میرے باپ دادا کا گھر۔“ وہ اپنے آپ سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹہلنے کے انداز میں رابدراری نظر آئی اس میں داخل ہو گئی۔ دایمیں بائیں دروازے کو ذرا سا کھول کر دیکھا۔ وسیع دروازے جس کی سجائو آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ وہ فوراً دروازہ بند کر کے آگے چل پڑی۔ آخر میں دایمیں بائیں دروازہ وہ بھی بند تھا۔ اس نے پینڈل کھما کر دروازہ علیاً تو سامنے مسہری پر بابا جان نیم راز تھے۔ جو دروازہ آواز پر ہی متوجہ ہو گئے تھے اور اسے دیکھ کر ان کی بیشائی شکن آلود ہو گئی۔ جس سے وہ چند ثانیے کو ٹھٹھا آرام سے اندر داخل ہوتے ہوئے بولنا۔

”اچھی بات ہے۔ اب آپ بی بی جان کے پاس جاؤ، میں کسی کو بھیج کر آپ کے لیے کپڑے وغیرہ منگوا دے۔ ویسے جو لباس لے کر آئی تھی وہ بھی نئے تھے۔“ انہوں نے جلتے ہوئے کہا۔

”تھے تو اس کے بعد میں جتنا کہ میں نے اس کی چیز لے لی۔“
شاہ سکندر کچھ نہیں بولے اور اسے لاؤنج میں چھوڑ کر باہر نکل گئے۔
وہ بی بی جان کے پیچھے دیکھنے لگی تھی کہ گلاس وال سے نظر کو ریڈرو میں کھڑے علی جمالی پر پڑی اور پھر دھیانی میں اسے ہی دیکھنے لگی۔ سفید کانن کے کلف لگے شلوار سوٹ میں اس کا دراز تھوڑا سا اور نمایاں ہو گیا۔
جائے اس کی رنگت بھی بی ایسی یا سنہری دھوپ کا عکس تھا جو اس کے چہرے کو جاذب نظر بناتا تھا۔
”صبا، تم ہمیشہ سے۔“ وہ جانے کیا سوچنے جاری تھی کہ اسی پل علی جمالی نے نہ صرف متوجہ ہوا بلکہ اس کے آگیا تھا۔

”ہیلو“ خاصا دوستانہ انداز تھا۔
وہ نظرس چا کر دوسری سمت دیکھنے لگی۔
”کب ناراض ہیں؟“ علی جمالی نے پوچھا۔
”چائیں، ابھی تک میں سمجھ نہیں سکی کہ مجھے کس بات کا اظہار کرنا چاہیے۔ ناراضی، خوشی، دکھ، افسوس،“
”بس۔“ وہ ٹوک کر بولا۔ ”جب سمجھ جائیں تو بتا ضرور، دیکھیں گے۔“
”اچھی بات ہے۔“ اس کے ہونٹوں سے اپنے آپ گہری سانس خارج ہوئی پھر ادرادھو دیکھ کر پوچھنے لگا۔
”اتنی خاموشی کیوں ہے۔ سب لوگ کہاں ہیں؟“
”اپنے اپنے کمروں میں۔“ علی جمالی نے سرسری انداز میں بتایا اور اس کے خاموش رہنے پر قدرے سے پوچھنے لگا۔

”سٹیل، آپ اپنے گھر فون نہیں کریں گی۔“
”اپنے گھر میں تو ٹھہری ہوں۔“ وہ سمجھ کر بھی انجان بنی۔
”میرا مطلب ہے اپنی ماما کو۔“
”کیوں کروں؟ یہ بتانے کے لیے کہ میں یہاں خیریت سے ہوں۔ وہ میری فکر نہ کریں اور مزید صبا کو کرنے کا سوچیں۔ سوری، ممانہ تو میری کسی بات کا یقین کریں گی اور نہ ہی عمل، اس لیے فی الحال میرا رابطہ کرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔“
”میری بات کرادیں صبا۔“ وہ کسی طرح اپنے لیے بے قراری چھپا نہیں سکا۔
”سوری آگین، میں جب تک ماما سے یہ معلوم نہ کروں کہ وہ کیا چاہتی ہیں تب تک میں کچھ نہیں کر سکتی۔“
”مما کو فون بھی جب میرا دل چاہے گا کروں گی۔ اوکے۔“ وہ بغیر کسی مروت لحاظ کے صاف منع کر کے آگے بڑھی۔

~~*

آسیر گھنٹوں کے گرو باز دیپٹے میٹھی تھی اور ہر ایک کی بات کے جواب میں اس کی بس ایک ہی تکرار تھی۔
”مجھے مدد چاہیے۔ وہ ظالم اسے مار ڈالیں گے۔“
”تم یہ کیوں بھولتی ہو بیٹا کہ وہاں اس کا باپ بھی موجود ہے اور وہ خواہ کتنا بھی ظالم کیوں نہ ہو بیٹا۔ زیادتی نہیں ہونے دے گا۔“ خلیل بھائی اس کی تکرار سے عاجز آکر بولے تھے۔
”اور کیا تم ناحق پریشان ہو رہی ہو۔“ خلیل بھائی تائید کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ”مدد کو تم جانتی نہیں؟“
سے خائف ہونے والی نہیں ہے۔ زیادتی تو کیا تیز لہجہ برداشت نہیں کر سکتی۔“
”اسی بات سے تو ڈر لگ رہا ہے مجھے۔ جذبات میں جانے کیا کر رہی تھی۔ بس آپ کسی طرح اسے بلا لیں۔“
”تم کیا چاہتی ہو، ہم ان کے در پر جائیں، نہیں۔“ عدیل کو اپنا ایک بار جانا یاد تھا اس لیے سختی سے

کوئی نہیں جائے گا۔ تم انتظار کرو مدد خود آئے گی یا فون کرے گی تو تم خود اس سے بات کر لیتا۔“
”عزیز میری دن گزر گیا۔ اب تک اس کا فون آجانا چاہیے تھا اور نہ آنے کا مطلب۔“ آسیر کی تشویش

”مطلب نہیں ہے۔“ خلیل بھائی نے ٹوک دیا۔
”ہاں، تم حوصلے سے کام لو۔ ابھی تو تمہیں صبا کا معاملہ نمٹنا ہے۔ یوں ہمت باروگی تو یہ بچی ادھر کی۔“ اباجی نے دھیرج سے اسے صبا کا احساس دلایا۔
”ہاں ہے؟“

”کمرے میں۔“ تمہیں اس کا خیال کرنا چاہیے۔ اصل زیادتی اس کے ساتھ ہوئی ہے اور وہی بے چاری محسوس کر رہی ہے کہ اس کی وجہ سے یہ سب ہوا جبکہ اس کا کوئی قصور نہیں۔ زیادہ وہ تمہارے لیے ہے۔ تم اپنے آپ کو سنبھالو تب تو اسے سمجھا سکو گی۔“

بھائی تھک کر رہے تھے۔ وہ اب تک صرف مدد کے لیے پریشان تھی۔ صبا کا خیال ہی نہیں آیا۔
”ولابی اور خلیل بھائی نے احساس دلایا تو وہ اس کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔
بھائی نے سب کو جلنے کا اشارہ کیا تو ایک ایک کر کے سب اٹھ گئے۔

”کی فکر نہیں کرنا بیٹا، وہ اپنے باپ کے پاس ہے۔“ اباجی نے جاتے جاتے کہا تو اس کا ذہن ایک بار پھر اٹھ۔

”کپا پر ہی تو بھروسہ کیا تھا میں نے۔“ اس نے بید کی بیک سے سر نکالتے ہوئے دکھ سے سوچا۔
”کس قدر گرا ہوا شخص ہے شاہ سکندر حیات۔ بیٹی کے معاملے میں بھی فریب دے گیا۔ غلطی میری ہے،“
”کاشین کیوں کہا۔ عدیل بھائی سے کتنی تو شاید اسی وقت علی جمالی کا اصل سامنے آ جاتا۔ یہاں تک پہنچی اور اب تو مجھے ایک نہیں دوں، بیٹیوں کے لیے لڑنا ہے۔“
”نبیل نے دروازے تک آکر اسے پکارا تو وہ اپنی سوچوں سے نکل کر بولی۔
”تہے بیٹا۔ آؤ۔“

”لے کھانا نہیں کھایا۔“ نبیل نے اندر آتے ہوئے کہا۔
”لگے گی تو کھالوں گی۔ تم نے اور صبا نے کھایا۔“ آسیر نے حتی الامکان خود کو نارمل ظاہر کرنے کی سعی

”نبیل، اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گئے تو قدرے توقف سے وہ بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔
”ان تو نہیں آیا۔“
”؟“ نبیل نے بے اختیار کہا تھا۔
”سے فون تو کرنا چاہیے تھا۔“

”کوہا تو ہے پچھو! وہ کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتی اور یہاں تو سمجھیں اس کی ایک آرزو پوری کر رہی تھی۔ شاہ سکندر کے پاس جلی جاؤں گی۔“ نبیل جانے کس خیال میں کھو کر بول رہے تھے۔
”لے بیٹے سے گہری سانس خارج ہوئی تھی۔“

”آپ فکر نہیں کریں، وہ زیادہ دن وہاں نہیں رہے گی۔ آجائے گی جلدی۔ آپ بس صبا کو سوچیں لیکن پانچ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو جو فیصلہ کرنا ہو کر لے لیجئے اس کے بعد ہر کام مجھ پر۔ جیسا آپ چاہیں گی وہی ہو گا۔“ نبیل کے مضبوط لہجے پر وہ کتنی دیر انہیں دیکھتی رہی پھر مبہم سی کے ساتھ بولی تھی۔

”سے ہوتے ہوئے مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔“
”ات اور۔“ نبیل اچانک کسی خیال کے تحت بولے تھے۔ ”کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے صبا سے ضرور

پوچھ لیجیے گا۔“

”صبا۔“ آسہ نہ صرف چونکی بلکہ کچھ ٹھٹھک بھی گئی تھی۔

”جی پچھو، کیونکہ وہ آپ کی بات سے اختلاف کرتی ہے، نہ احتجاج۔ ابھی بھی آپ جو سوچیں گے وہ کچھ نہیں بولے گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ۔“ نیل ایک دم خاموش ہو گئی۔

”تمہارا مطلب ہے وہ علی جمائیکہ کے ساتھ۔“

”میرا ایسا کوئی مطلب نہیں ہے پچھو۔“ نیل فوراً بول پڑی۔ ”میں تو اس لیے کہ رہا ہوں کہ میں غیر اہم نہ سمجھنے لگے کہ اس کی زندگی کے معاملے یوں طے ہوتے ہیں کہ اسے خبری نہیں ہوتی۔ ویسے اس پوچھنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“

”ہوں۔“ آسہ پر سوچ انداز میں سر ہلانے لگی تھی۔

گزشتہ رات بھی اس کی آنکھوں میں کئی تھی اور اب بھی وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تھی، لیکن نیند نہیں دی۔ آخر اس نے بستر چھوڑ دیا اور لائٹ آن کر کے میگزین لے کر بیٹھ گئی۔ لیکن بہت جلد اسے ادھر ہو گیا کہ جن باتوں کو وہ گزشتہ دو روز سے مسلسل ذہن سے جھٹک رہی ہے ان سے مزید پہلو کئی ممکن نہیں ہے۔ ”میرے خدا کیا ضروری تھا کہ جو کچھ ماما کے ساتھ ہوا وہ میرے ساتھ بھی ہو۔“ وہ بہت تھک کر پھر اتر

جگہ پر لیٹی تھی کہ اس کی نظروں کے سامنے فلم سی چل پڑی تھی۔

علی جمائیکہ سے پہلی ملاقات سے لے کر آخری ملاقات تک۔ وہ اس کی ایک بات ایک ایک اندازہ رہی اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ باقاعدہ پلان کے تحت اس کی زندگی میں آیا اور شاہ سکندر کی طرح اسے بھی محبت کا قریب دے کر اسے حاصل کرنا چاہا اور یہ ایسی تلخ حقیقت تھی یا اس کی سوچ بہر حال بے حد کدو والی تھی کہ اس سارے قصے میں اس کا بہت نقصان ہوا تھا کیونکہ اس نے اپنے دل کی بستی میں بڑی مجنوں چاہت سے اس کے نام کے بیچ بوسے تھے اور پھر پوری ایمان داری سے ان کی آبیاری کی تھی اور اب جب کہ بستی پھولوں سے سج گئی تھی تو وہ ماوان مانگ رہا تھا۔

”تم میرے لیے کیا کر سکتی ہو۔“

”میں چاہتا تو نہیں ہوں لیکن اگر چاہوں کہ میری خاطر ساری دنیا کو چھوڑ دو تو چھوڑ دو گی۔“

”نہیں۔“ اس کی آنکھیں یکبارگی آنسوؤں سے لبریز ہو کر کناروں سے چھٹک گئیں۔ ”تم چاہو گے تو نہیں کیونکہ تم جانتے ہی نہیں کہ محبت کیا ہے۔ تم نے صرف محبت کا ڈھونگ رکھا، قریب دیا مجھے اور چاہا تمہاری خاطر ساری دنیا کو چھوڑ دوں۔ میری دنیا ہے ہی کتنی۔“ ماما نیل بھائی اور مدحو، جنہیں اپنی طرف دینے کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا اور کیاستم ظریفی ہے کہ میری ذات ہی دکھ اور ریشائی کا باعث بن گیا کے ذمہ دار تم ہو علی جمائیکہ۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی، کبھی نہیں۔“ اس نے سر کے نیچے سمجھ کر نہ پر رکھ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔

اور اس نے تو اس وقت جب علی جمائیکہ اس کی زندگی میں آیا تھا سوچ لیا تھا کہ اس کے بارے میں جو فیصلہ کرنے کا اختیار صرف آسہ کو ہے اور ابھی بھی اس نے یہی سوچ کر خود کو الگ تنہا کر لیا تھا اور اسے نہیں تھی کہ اس تسلسلے میں آسہ اس سے کوئی سوال جواب کرے گی پھر بھی وہ خود کو ایسی کسی صورت حال میں تیار کرنے لگی تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے کسی بھی انداز سے علی جمائیکہ کے ساتھ اس کو اپنے ہونے محسوس کر کے آسہ کو فیصلہ کرنے میں مشکل ہو۔

پھر صبح جب وہ سوکر اٹھی تو آسہ موجود نہیں تھی۔ اس نے بوا سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ آج کلکلی بھاگ بھاگ بھی واپس اسلام آباد جا رہے ہیں اور اسی لیے آسہ اٹھنے ہی نیچے چلی گئی تھی۔ دل تو اس کا بھی چاہا کہ ممانی سے ملنے جائے لیکن سب کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی پریشان ہو گئی۔ گو کہ اس کا کوئی تصور

رہی اسے تصور وار سمجھ رہا تھا لیکن جن نظروں سے سب دیکھتے تھے اس سے وہ اپنے آپ میں کٹنے لگتی تھی۔ اسے وہ چاہنے کے باوجود نہیں گئی اور باکا سنا سنا کر کے زبردستی خود کو جھاڑ پونچھ میں مصروف کر لیا۔ اس کام خالص ہو کر بوا کی مدد کے ارادے سے پکن کی طرف جاری تھی کہ فون کی تیل پر بہت تیزی سے پلٹ کر اس پروردگار تھا کیونکہ اسے پہلے خیال مدیحہ کا آیا تھا اور اس نے بے اختیار اسے ہی پکارا۔

”پہلو مدحو۔“

”میں ہوں صبا، علی۔“ علی جمائیکہ کی آواز سنتے ہی اس کے اندر ناگواری کے احساس کے ساتھ بے پناہ شکر بھر ”سوری، رانگ نمبر۔“ اس نے فوراً ”ریسیور شیخ دیا اور کتنی دیر وہیں کھڑی خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی اس کا ذہن چمکنے لگا تھا کہ اتنا بڑا دھوکا دینے کے بعد علی جمائیکہ نے اسے فون کرنے کی جرات کیسے کی۔ کیا پھانسا ہے اب وہ اس پر۔“

”صبا۔“ آسہ کی پکار پر وہ نہ صرف چونکی بلکہ فوراً ”نیل فون کے پاس سے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ البتہ جواب دے سکی۔“

”کھ گئیں بیٹا، ناشتا کر لیا۔“ آسہ نے لالی میں آکر اسے دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے اشارت میں سر ہلادیا۔

”ایا بات ہے؟“ وہاں کیوں کھڑی ہو۔“ آسہ نے اس سے کہنے ہوئے نیل فون کو دیکھا تو وہ بوکھلا گئی۔

”ہاں ماما، میں صفائی کر رہی تھی۔ نیل بھائی کا کمرہ اتنا کندہ ہو رہا تھا۔“

”چھامیر سپاس آؤ۔“ آسہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”اللہ۔“ اس نے نیل فون کو خائف نظروں سے دیکھا پھر آسہ کے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بول گئی۔

”کل پاموں چلے گئے۔“

”ہاں، ابھی گئے ہیں۔ تم سو رہی تھیں اس لیے میں نے تمہیں بلایا نہیں۔ چلو پھر آئیں گے تو مل لینا۔“ آسہ

برسری انداز میں کہا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے خود کدو کی انداز میں بولی۔

”ابھی تک مدحو کا فون نہیں آیا۔ بہت غیر ذمہ دار ہے۔“

”دھوکا کیوں لے گئے ماما۔“ اس نے پوچھا تو آسہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر تاسف بھری ذرا سی ہنسی کے ذریعہ۔

”تمہارے دھوکے میں۔ وہ یہی سمجھے کہ دلہن وہی ہے اور یقیناً ”شاہ پور بیٹے“ تک وہ خود کو فلاح سمجھتے رہے ہوں۔“

”خود دلہن۔“ اس کے اندر درد رنگ سناٹا پھیل گیا۔

”پریشان نہیں ہونا بیٹا، مدحو آجائے گی۔“ آسہ اپنی سمجھ کے مطابق اسے تسلی دینے لگی۔ ”میں اپنی غلطی

بڑا نہیں اور مدحو کو نہیں سمجھتے دوں گی۔“

”آپ کی کیا غلطی ہے ماما۔“ اس نے کم سم سے انداز میں پوچھا۔

”میری ہی غلطی ہے، چنا کہ میں نے عارفہ بیگم کے سارے قبھلوں کا اعتبار کر لیا تھا اور ان کے کہنے کے مطابق تمہاری شادی پر آمادہ بھی ہو گئی۔ انہوں نے جلدی کی ہی اس لیے تھی کہ کہیں پول نہ کھل جائے۔ خیر ابھی

ہو نہیں بگڑا۔ ان کی حیات کا نشہ تو ہرن ہو ہی گیا ہو گا مزید۔“

یہ اپنے خیال میں بولتی ہوئی ایک دم خاموش ہو گئی پھر قدرے توقف سے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی۔ ”اب یہ احساس ہو رہا ہے کہ تمہاری شادی طے کرتے ہوئے میں نے تم سے پوچھا تک نہیں تھا۔ پتا

بہت خوش ہے نا۔" اس نے کھکھلا کر بی بی جان کے گلے میں بانٹیں ڈال دیں اور انہیں دامنوں میں لپیٹ کر بولی۔

بہنیں آپ سے مل کر بہت خوش ہوئی ہوں۔ آپ بہت اچھی ہیں۔ اماں جی سے بھی زیادہ۔ اماں جی کو جانتی ہوں۔

اماں جی کہتے ہیں۔ جیسے آپ سب کی بی بی جان ہیں۔" وہ ان سے الگ ہوتی ہوئی بولی۔

ہماری اماں جی سے زیادہ اچھی ہوں۔" بی بی جان خوش ہو کر بولیں۔

بہنیں بابا جان، اباجی سے زیادہ اچھے نہیں ہیں۔" اس نے فوراً حساب برابر کر دیا پھر ایک دم خیال آنے پر بولی۔

ہم آپ سے کیا کچھ چاہتے تھے۔ کہاں ہیں بابا، میں نے صبح سے انہیں نہیں دیکھا۔

بی بی جان نے اسی قدر کہا تھا کہ اسے یاد آگیا۔

رات بتایا تھا انہوں نے کہ حج چھ بجے ان کی فلائٹ ہے اور یہاں سے تو وہ دو تین بجے ہی نکل گئے۔

ہاں، علی جی تھکے آتے ہوئے اس کا آخری جملہ سن کر کہا۔

لام تباہ گئے ہیں۔" علی جی تھکے نے کچھ بے دھیانی میں کہا تو وہ جتا کر بولی۔

بہنیں مجھے معلوم ہے اور یہ بھی کہ وہ کب آئیں گے۔

نہ روز اس باس کر بی بی جان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اباجی سے کہتے ہیں۔" اس نے بتا کر پوچھا تو وہ چند لمحوں سوچنے کے بعد بولی۔

ہاں، علی جی تھکے۔" اس نے بتا کر پوچھا تو وہ چند لمحوں سوچنے کے بعد بولی۔

ہاں، علی جی تھکے۔" اس نے بتا کر پوچھا تو وہ چند لمحوں سوچنے کے بعد بولی۔

ہاں، علی جی تھکے۔" اس نے بتا کر پوچھا تو وہ چند لمحوں سوچنے کے بعد بولی۔

کر سکو، بالائی بالائی فیصلہ کر لیا، جیسے مدیہ کے وقت میں کیا تھا۔ شاید اسی کی سزا ملی ہے مجھے۔ امر نے وہاں شاہی کھانا اور تمہارے ساتھ یہ سب ہوا۔

"نہیں، ممّا، آپ ایسا نہیں سوچیں۔" اس نے آسیہ کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ "آپ کے فیصلے غلط نہیں تھے۔ بس میری اور مدح کی قسمت۔"

"قسمت خراب نہیں ہوتی بیٹا۔" آسیہ کے لمبے میں بے پناہ آزر دگی سمٹ آئی تھی اور جانے کس خیال سے آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اس مقام پر شاید وہ ٹوٹ رہی تھی۔

"ممّا، آپ رورہی ہیں۔" وہ تڑپ کر اس سے ٹپٹپٹ ہوئی۔

"نہیں بیٹا، میں رو نہیں رہی۔" آسیہ نے ہنسنے کا قہر پورا کر کے اسے خود سے الگ کیا پھر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولی۔

"بہت زیادتی ہوئی ہے تمہارے ساتھ۔ تم مدحو جیسی کیوں نہیں ہو۔ جیسے وہ ذرا اسی بات پر ہنگامہ کھڑا کر دیتی ہے۔ تم کیوں نہیں کرتیں۔ کیوں اتنا ضبط کرتی ہو۔"

وہ حیران اور پریشان بھی ہو گئی تھی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں ممّا آپ مجھے بہت الجھن ہو رہی ہے۔" وہ آہستگی سے آسیہ کے ہاتھ ہانک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ہمیشہ سے آپ کو یہ شکایت رہی کہ مدحو میرے جیسی کیوں نہیں ہے اور اب۔"

"ہاں اب احساس ہو رہا ہے کہ وہی ٹھیک ہے۔ وہ نہ ملے تو چھیننا جانتی ہے اور چھین جائے تو بزدلوں کی طرح چھپ کر آنسو نہیں بہاتی۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" اس نے دھیرے سے کہا اور جانے لگی کہ آسیہ روک کر بولی۔

"سنو بیٹا، میں اصل بات کہنا تو بھول گئی۔"

"جی۔" وہ سوالیہ نشان بن گئی۔

"وہ کسی بھی طرح سہی علی جی تھکے کے ساتھ تمہارا نکاح ہو چکا ہے۔ اب تم بتاؤ مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا ہے۔ میرا مطلب ہے تم کیا چاہتی ہو، یہ رشتہ قائم رہے یا۔" آسیہ فصداً "بات اور حوری چھوڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں کچھ نہیں چاہتی ممّا، جو آپ کا دل چاہے کریں۔" وہ جلدی سے کہہ کر اس کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

وہ یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرنے کی غرض سے بی بی جان کے کمرے میں آئی تھی۔ لیکن آگے مہر النساء کبلی جان کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر اسے جانے کیا سو بھی حواس پر جتا کر پوچھنے لگی۔

"بی بی جان، میرے پیار کہاں ہیں؟"

مہر النساء بری طرح تھملا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی تھی کہ وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔

”کیا بات ہے۔“ وہ جیسے بادل خواستہ رکھا تھا۔
 ”وہ آپ کراچی جا رہے ہیں ناں تو صبا سے بھی ملیں گے۔“
 ”نہیں۔“ اس نے فوراً ”نہیں کہہ کر ہونٹ بھیج لے۔“
 ”کیوں؟“

”اس کا جواب نہیں دے سکتا اور آپ میرے ذریعے سے اس سے کیا کہلواتا جانتی ہیں۔ جو بھی کہتا ہے۔
 کہیں۔ کیلی فون موجود ہے۔“ علی جہانگیر کو اب تک یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آخر وہ گھر فون کیوں نہ
 کرتی۔

”فون تو میں کر لوں گی لیکن جو چیزیں میں اس سے منگوانا چاہتی ہوں۔ وہ فون کے ذریعے سے تو نہیں آسکتی
 خیر چھوڑیں یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ خدا حافظ۔“ وہ یکدم بے نیازی سن گئی۔

”خدا حافظ۔“ وہ اندر ہی اندر جڑبڑہاتا ہوا ہر نکل گیا۔
 ”میلی فون موجود ہے۔“ وہ اپنے آپ بڑبڑاتے لگی۔ ”آخر سب یہ کیوں چاہتے ہیں کہ میں گھر فون کو لے
 جانا چاہتے ہیں کہ مہار کیا بہت رسی ہوگی ورنہ۔ کوئی فرق نہیں پڑا ہو گا ماما کو۔ میں پہلے کون ساں کے پاس رہ
 تھی۔ البتہ صبا ضرور پریشان ہوگی اور وہ بھی اس خیال سے کہ کہیں میں نے اس کی سچا رقبہ تو نہیں کر لیا۔“
 ”کر بھی سکتی ہوں۔“ اس نے اپنے آپ شامی ہو کر سوچا تھا کہ رابعہ اس کے پاس آکر بولی۔

”سنو، ہمیں باباجان بلارہے ہیں۔“

”کیوں؟“
 ”یہ تو تم ان ہی سے پوچھنا۔ ویسے باباجان کے بلانے پر یہاں کیوں کا سوال کوئی نہیں اٹھاتا، اس فوراً ہل
 ہے۔ یہ میں تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ کہیں تم ان سے نہ پوچھ لو۔“ رابعہ نے بڑے مخلصانہ انداز میں
 سمجھا یا۔

وہ کندھے اچکا کر چل پڑی اور اس بار باباجان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی انہیں سلام کیا تھا۔
 ”وعلیکم اسلام“ آؤ بیٹھو۔“ باباجان نے اپنے برابر اشارہ کیا۔
 ”شکریہ۔“ وہ کمرے سے بیٹھ گئی۔

”خوش ہو، یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔“ باباجان پتا نہیں اچھے موڈ میں تھے یا اس سے بات کرنے کا
 انہیں یہ لہجہ اور ہنار پڑ رہا تھا۔

”تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہے۔“ اس نے سیدھا سادا جواب دیا۔
 ”اور اپنی ماں کو فون کیا تم نے۔“ باباجان نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔
 ”نہیں۔“

”کیوں۔ وہ پریشان نہیں ہوگی تمہارے لیے۔“
 ”ہو نا تو نہیں چاہیے کہونکہ میں اپنے باپ کے گھر میں ہوں۔ ویسے آپ کو ان کی پریشانی سے۔“

باباجان ایک دم کھانسنے لگے۔
 وہ سمجھ کر نظر انداز کرتی ہوئی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ جب ان کی کھانسی رک گئی تب انہیں دیکھ کر بولا۔
 ”معاف کیجیے گا باباجان، آپ بہت بزدل ہیں۔“

”ہاہاہاہ۔“ باباجان نے زوردار قہقہہ لگایا۔
 ”میں مذاق نہیں کر رہی، سچ کہہ رہی ہوں۔ ماما سے بیٹی لینے کے لیے آپ نے طویل انتظار کیا اس نے۔“

براہ راست ان سے بات نہیں کر سکتے۔ کیوں یہ خدشہ تھا نا کہ ماما انکار کر دیں گی۔ تو وہ تو انہیں کرنا ہی تو
 بعد ا صل جنگ لڑتی تھی آپ کو۔“ وہ انہیں بزدل ثابت کرنے کے لیے بڑی جرات کا مظاہرہ کر رہی تھی۔
 باباجان کی آنکھوں میں خیر سمٹ آیا تھا۔

اب تو آپ کبھی نہیں جیت سکتے کیونکہ آپ نے ماما کے ساتھ فائل کھلیا ہے۔ ویسے مجھے یہ کیم بڑا دلچسپ
 پانے اور میری دعائیں اپنے باپ دادا کے ساتھ ہیں۔“ آخر میں وہ بڑے محفوظ انداز میں مسکراتی تھی۔

”نہیں۔ ابھی اسے باپ دادا کو صرف دیکھا ہے، جانا نہیں۔ ہم بارنا نہیں جانتے۔ آسہ سے بیٹی چھین لانا
 بے باک ساتھ کا تھیل تھا لیکن ہم تمہارے باپ سے کیے وعدے سے مجبور تھے۔ جو میں چاہتا تھا کہ آسہ
 بی بی جینی جائے اور ہمیں آسہ کے سامنے دامن پھیلا نا گوارا نہیں تھا۔“ باباجان بڑے مضبوط چہانچا کر بول
 تھے۔

بابا کیوں نہیں چاہتے تھے۔“ وہ اسی ایک بات میں انک گئی تھی۔
 ”خوش ہے وہ۔“ باباجان نے شاہ سکندر کی حماقت سوچ کر سر جھٹکا۔ اسے بتانا غالباً ”ضروری نہیں سمجھا۔
 ماما ہی احمق ہیں، ابھی احمق۔“ اسے سیسا بھانسی کا آسہ کو احمق کہنا یاد آ گیا تھا۔ جب ہی زیر لب بڑبڑاتی
 پھر چپک کر پوچھنے لگی۔

”آپ نے بتایا کہ میں بابا سے کیا حماقت کی۔“
 ”کوئی ایک حماقت۔“ باباجان کو فوراً احساس ہو گیا۔ ”نہیں تم بچی ہو۔ اپنے باپ کے بارے میں تمہیں ایسی
 نہیں کرنی چاہیے۔ چلو جاؤ۔“

”آپ نے مجھے بلایا کیوں تھا۔“ وہ سمجھی شاید وہ اصل کام بھول گئی تھی۔
 ”تمہارا حال و احوال پوچھنے کے لیے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ دینا اور ہاں آنا سے کو تمہیں رعبہ
 پر کرا لائے اور اپنے باپ کا فارم بھی دیکھو جا کر۔“

”تھکے جائے گا ہونہ۔“ وہ آغا کا رویہ سوچ کر نخوت سے سر جھٹکتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

بے بے کیف سے دن تھے۔ زندگی میں جیسے کچھ رہا ہی نہیں تھا، سوائے انتظار کے۔
 رعبہ کے فون کا انتظار۔

نہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرتی تھی۔
 اس انتظار کے اختتام پر کیونکہ اسے کسی اچھی بات کی امید نہیں تھی اس لیے اس کی طوالت غنیمت لگ

گئی۔ البتہ خدشات چھین نہیں لینے دیتے تھے۔ مدیجہ کا خیال آتا تو وہ گھنٹوں اس کے بارے میں سوچتی رہتی
 ہوتے شاہ پورا لے اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ شاید اسے کسی کال کو ٹھہری میں بند کر دیا ہے جب۔

اس نے فون نہیں کیا۔ ورنہ وہ پہلی فرصت میں اسے فون کرتی اور ایک ایک کے بارے میں بتاتی، خصوصاً
 رعبہ کے بارے میں اور یہ ضرور ہوتی کہ وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اس کا یہی جملہ سننے کو بڑی بے چین
 لگتی تھی اس کی سلامتی کی دعا میں مانگتی۔

نہیں۔ کسی بار اسے علی جہانگیر کا خیال بھی آتا تھا۔ لیکن یوں کہ اس کے وجود میں نفرت اور تنفر کی آگ سی
 جلتی تھی اور ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ اس کے خیال کو فوراً ”جھٹک بھی نہیں پاتی تھی۔ اس کی طرح اس کا
 بی بی زور اور تھا۔ وہ لاکھ خود کو ادھر ادھر مصروف رکھنے کی کوشش کرتی لیکن اس کی گرفت سے نہیں نکل

تھا۔ آخر اپنی بے بسی پر رو پڑتی۔
 ٹھانے بھی کسی کا برا چاہنا نہ سوچا پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔“ کبھی آسہ بھی ایسا ہی سوچتی تھی۔ اب

بہرحال اس بات پر انک جاتی تھیں۔

نہایت وہ ٹھیس پر بیٹھی خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی اور اسے دکھ میں وہ تھی بھی تھا۔ کیونکہ کسی کو
 بتا تھا نہ ہم نوا۔ سب اس کے ساتھ ہونے والے صرف ایک الگے کو جانتے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ
 تانہ زور پر وہ اس شخص کی سنگت میں کتنی دور نکل گئی تھی کہ واپسی کا سفر اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا۔

اسے اپنے خوابوں کی کرجیاں سمیٹتے ہوئے آتا تھا۔
 ”صبا! نیل نے دوسری بار پکارا۔ تب اس نے چونک کر دیکھا لیکن ہمیشہ کی طرح اپنی جگہ سے کھڑی نہیں ہوئی۔

”تامت سوچا کرو۔“ نیل اس کے قریب چیر کر کھینچتے ہوئے بولے۔ ”سوچنے سے مسئلے حل نہیں ہوتے۔ تم نے تو سب کچھ چھو چھو کر چھوڑ دیا ہے پھر تمہیں کیا پریشانی ہے۔“
 ”مدحو! میں مدحو کے لیے پریشان ہوں۔“ وہ نظریں چرا لی ہوئی بولی۔
 ”صرف مدحو کے لیے۔“ نیل کے کنبے میں جانے لگا تھا کہ اس کا دل پوری قوت سے پھیل کر سماتا تھا۔
 ”سنو! میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں تمہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں لیکن جانتا ضرور ہوں۔ اس بات سے تم پر نہیں کر سکتیں کہ بہت ساری باتیں تمہارے لیے بتا جان لیتا ہوں۔“

اس نے بہت خائف ہو کر سر جھکا لیا کہ جانے وہ کیا کہنے جا رہے ہیں۔
 ”اور تمہاری زندگی کے نئے باب کو میں نے اس وقت جان لیا تھا جب تم نے اس کا عنوان تجویز کیا تھا۔ رازداری برت لی تم نے صبا! اب مت چھبواؤ۔ میں صرف تمہارا بھائی ہی نہیں دوست بھی ہوں۔ کیا ہر مسئلے ہم نے دوستوں کی طرح شیر نہیں کیا۔“ نیل نے بہت دھیرج سے اس کے راز میں شریک ہونے کا دعوہ کر لیا تھا۔

اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو ٹپک کر گود میں رکھے اس کے ہاتھوں پر گرنے لگے تھے۔ جنہیں دیکھ کر نیل ایک دم خاموش ہو گئے پھر کمرے تو قف سے اپنے آپ کہنے لگے۔
 ”میں علی جمالی سے چند بار ملی ہوں اس لیے زیادہ اسے نہیں جانتا اور جتنا جانا اس کے بارے میں اب یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا پھر بھی میں تمہیں بتاؤں کہ پہل ملاقات میں وہ مجھے بہت سچا اور کھرا لگا تھا۔ اس کے بعد جب رشتے کی بات چلی تب میں نے محسوس کیا کہ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ جبکہ اس کے ہر انداز میں مجھے بناوٹ نظر آتی تھی۔ جسے میں نے یوں اہمیت نہیں دی کہ ایک تو علی جمالی کے ہر لحاظ سے مضبوط لگ رہا تھا یعنی ہر مخالفت کو زیر کرنے والا۔ دوسرے تم تمہاری محبت مجھے یقین تھا کہ تمہاری ساری محبت بہت جلد عارفہ بنیم کو تمہارا کر دینا وہ ہمارے گی اور علی جمالی کو پسند ہے۔“ وہ خاموش ہو کر جیسے اپنی سوچنے لگے تھے۔

وہ ابھی بھی اس طرح سر جھکائے بیٹھی تھی لیکن پوری جان سے ان کی طرف متوجہ تھی۔
 ”چاہ نہیں میں نے علی جمالی کو سمجھنے میں غلطی کی یا تمہارا؟ تمہیں کیا لگتا ہے؟“ انہوں نے سوچتے ہوئے میں کہہ کر اچانک اس سے پوچھا۔
 ”وہ کچھ بول سکتا ہے ان کی طرف دیکھنے کی ہمت ہوئی۔ اگر علی جمالی تمہارے ساتھ ایماندار ہوا تب بھی وہ خاموش مت رہو صبا! مجھے بتاؤ، تم کیا چاہتی ہو۔“
 ”صرف اس لیے ٹھکرا دو گی کہ وہ شاہ جمالی کا بیٹا ہے۔ نہیں ایسا مت کرنا۔ یہ اس کے ساتھ ہی تمہارے ساتھ بھی ظلم ہو گا کیونکہ تم کسی سے نفرت کر رہی نہیں سکتیں۔“
 ”کرتی ہوں، علی جمالی سے شدید نفرت کرتی ہوں۔“ وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

”بے وقوف!“ نیل کے ہونٹوں پر مہم س مسکراہٹ پھیل گئی اور بڑے سکون سے اس کے چپ انتظار کرنے لگے۔
 ”کتنی دیر بعد وہ ہتھیاروں سے آنکھیں رگڑنے لگی تو نیل جیب سے رومال نکال کر اسے تھمتاتے ہوئے خود کو دھو کا مت دو۔ تم صرف پھوپھو کا خیال کر رہی ہو۔“
 ”ہاں! مجھے ماما کا خیال ہے۔ ماما کے لیے میں جان بھی دے دوں گی۔ علی جمالی کی محبت اور ایمان مجھے کوئی غرض نہیں۔ میں وہی کروں گی جو ماما کہیں گی۔“ وہ رومال سے آنکھیں اور چہرہ صاف کرتے ہوئے

پالے جا رہی تھی۔
 ”پھر روٹی کیوں ہو؟“

”مجھے اپنے آپ پر رونا آتا ہے۔ کیوں نہ ہو کے میں آگئی میں۔“
 ”جا جاؤ پہلے منہ دھو کر آؤ اور نواسے چائے کا بھی کھتی آنا۔ نیل کو اس کے بے تحاشا بتے آنسوؤں سے دکھ تھا۔ جب ہی اسے اٹھایا۔“



”اف! نیل بھائی سب جانتے ہیں۔“ اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے سوچا پھر دوبارہ ان کے پاس کے خیال سے ہی پریشان ہو گئی۔
 ”اگر وہ؟“ بوا سے چائے کا کمرہ شش و پنج میں کھڑی تھی کہ فون کی بیل پر نیل وہیں سے پکار کر بولے۔
 ”ملاؤ کھجور کس کا فون ہے۔“
 ”اس نے اگر ریسیور اٹھالیا۔“

”کیسی ہو صبا اور ماما کیسی ہیں؟“ دوسری طرف مدحو تھی۔
 ”مدحو! مدحو! تم ٹھیک تو ہو۔“ وہ ایک دم بے اختیار ہو گئی۔
 ”ہاں! ٹھیک، فرسٹ کلاس اور بہت خوش۔“ مدحو ہنسی ہوئی آواز میں شروع ہو گئی تھی۔
 ”میں بتا نہیں سکتی صبا! کہ مجھے یہاں آکر کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ یہ تو جج کوئی اور ہی دنیا ہے۔ کوئی غم، کوئی فکر، بارود، علی جمالی کے کتنا پیار، کتنا سہارا اور اتنا ہی محبت کرنے والا۔ اس پوری حویلی میں سب میں نمایاں ہے۔“
 ”مدحو! آواز سن کر جتنی خوش ہوئی تھی اب اتنی ہی غم صم اور دل تھا کہ اندر کسی اتھاہ میں ڈوبا جا رہا تھا۔
 ”ماما! نیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے دبایا تھا۔
 ”نیل! وہ دن لائی آنکھوں سے نیل کو دیکھا تو وہ اس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر اپنے کان سے لگا کر بولے۔
 ”پلو! گون؟“

”میں ہوں مدحو۔ وہ صبا کہاں گئی۔“ ادھر سے مدحو نے ہنوز اسی انداز میں پوچھا۔
 ”میں ہوں مدحو! کہاں ہو؟“ نیل اس کا سوال نظر انداز کر گئے۔
 ”شاہ پور! اپنے باپ کے پاس۔ آپ نے تو میری بات نہیں مانی تھی نیل بھائی پھر بھی دیکھ لیں، میں پہنچ گئی۔“ مدحو نے کھلکھلا کر کہا۔
 ”اب تمہاری آرزو پوری ہو گئی۔ کسی بھی طرح سی۔“ نیل نے بابل خواستہ کہا تھا، جبکہ نظریں صباحت پر ٹپ۔ جس کی آنکھیں روانی سے چھلک رہی تھیں۔
 ”آپ کو افسوس ہو رہا ہے؟“ ادھر سے مدحو نے ٹوکا۔
 ”اب تمہاری آرزو پوری ہوئے پر نہیں بلکہ غلط طریقے سے پوری ہوئے پر افسوس ہے۔“ انہوں نے تاسف سے کہا۔
 ”مجھ کو پتہ ہے کہ آپ تو میں سر پہ کر رہی گئی لیکن کسی نے میری نہیں سنی۔ اس لیے مجھے کوئی افسوس نہیں۔ خیر! یہ بتائیں ماما کہاں ہیں۔“
 ”یامطلب! اتنے سے دنوں میں تم یہ بھی بھول گئیں کہ پھوپھو اس وقت کہاں ہوتی ہیں۔“ نیل کے جتانے کے شرمندہ ہونے کے حیرت سے بولی۔

”کلینک واقعی ممالیکین گئی ہیں؟“

”تم کب آری ہو؟“ نیل اس کی حیرت اور سوال نظر انداز کر گئے۔

”کبھی نہیں۔“ مدیہ نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ تو نیل ریسیور رکھ کر صباحت سے بولے۔

”تم اس کے لیے رو رہی ہو، جسے کسی بات کی پروا ہی نہیں۔“

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر اور شدت سے رونے لگی۔

”میرے خدا! مجھے ہمیشہ یہ افسوس رہے گا کہ پچھو پچھو نے تم دونوں کی خاطر خود پر زندگی کے دروازے بند کر دیے۔ کاش وہ اپنے لیے سوچتیں۔“

نیل کو جانے اس کے رونے پر غصہ آیا تھا یا مدیہ پر۔ گو کہ بہت ضبط کے بعد بولے تھے پھر بھی ان کا لہجہ سخت تھا۔

”بند کرو رونا، ورنہ میں تمہیں بھی اسی وقت شاہ نور پتھوڑ آؤں گا۔“

”نہیں۔“ وہ اسی طرح روتی ہوئی بھاگ کر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔

~~*

علی جاگیر نے اپنے لیے اس خسارے کو منتخب کیا تھا جس کی تلافی ممکن ہو سکتی تھی۔ یعنی اس نے سچا تھا کہ شادی کے بعد وہ صباحت کو یقین دلانے کا کہہ کر ان سارے جھگڑوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی وہ کسی سازش میں شریک رہا ہے۔ بلکہ اس نے تو اس وقت صباحت کو پسند کر کے اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا جب وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور اسے یقین تھا کہ فوراً ”نہیں“ تو دھیرے دھیرے وہ اس کا اپنی محبت پر اعتبار حاصل کرنا میں کامیاب ہو جائے گا۔

لیکن یہاں تو سارا معاملہ ہی خراب ہو گیا تھا۔ یعنی حالات عجیب صورت اختیار کر گئے تھے اور بابا جان کی حکمت عملی تو اس کی سمجھ میں آ رہی تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس تمام عرصے میں مدیہ کہاں گئی؟ اس کی ماں اور بہن کو بھی نظر نہیں آئی۔ البتہ صباحت کے منہ سے اس نے ایک ادھ بار سن کا ذکر سنا تھا۔ وہ اس نے خصوصی طور پر نہیں بتایا تھا۔ ایک بار تو اس کے فون کرنے پر ادھر سے مدیہ نے ترغ کر کہا تھا کہ صباحت نہیں ہوں اور دو سری بار بھی کوئی ایسا ہی معاملہ تھا جو اسے اب سوچنے پر یاد آ رہا تھا اور یہ بھی کہ خود نے مدیہ کے ذکر کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی ورنہ اگر وہ دلچسپی ظاہر کر کے پوچھتا تو یقیناً ”صباحت اس کے بارے میں بتاتی۔“

بہر حال اب تو اس نے خود ہی دیکھ لیا تھا بلکہ جان بھی گیا تھا کہ وہ صرف ظاہراً ”صباحت سے مشابہ ہے اور“

پر اسے افسوس ہی نہیں، دکھ بھی تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہی نہیں، دلی محو جب وہ مایوس ہو کر واپس کراچی آ گیا تھا اور چھٹی منسوختہ کرا کے آفس بھی جوائن کر لیا تھا ورنہ اگر مدیہ اس فون پر ہی صباحت سے بات کرانے کی ہامی پھر لیتی تو اتنی جلدی وہ کبھی نہ آتا۔ گویا دونوں بہنوں نے ہی اسے ایسا کیا تھا اور مدیہ کی تو اسے زیادہ پروا نہیں تھی۔ البتہ صباحت کی طرف سے بہت فکر مند تھا کہ وہ لڑکی جانے کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی اور لتنا روٹی ہوگی۔ اس کے آنسوؤں پر بند باندھنے کے لیے ہی وہ دن میں اس کے نمبر ڈائل کرتا تھا۔ خصوصاً ”ان اوقات میں جب اسے یقین ہوتا کہ وہ اکلی ہوگی لیکن اس کا بھی کوئی نہیں تھا کیونکہ ادھر وہ اس کی آواز سنتے ہی فون رکھ دیتی تھی۔ جس پر وقتی طور پر وہ جھنجھلا تا، غصہ بھی آتا پھر حق بجانب سمجھتے ہوئے نئے سرے سے اس تک رسائی حاصل کرنے کی تدبیر سوچنے لگتا۔

اس وقت اچانک اسے نیل کا خیال آیا تھا اور یہ سوچ کر کہ وہ کم از کم فون تو بند نہیں کریں گے۔ اس نے دیکھ کر ان کی موزونگی کا یقین کر کے نمبر ڈائل کیے تھے۔

تیسری بیل پر ریسیور اٹھنے کے ساتھ کسی خاتون (وا) کی آواز تھی۔ اس نے فوراً ”نیل کو بلانے کا کہہ نا

ت کوئی سوال نہ ہو۔“

نیل کی آواز سنتے ہی وہ سنبھل کر بولا۔

”سلام علیکم۔“ نیل کی آواز سنتے ہی وہ سنبھل کر بولا۔

”میں علی جاگیر کیا آپ مجھ سے بات کرنا پسند کریں گے؟“

”خالی ہے“ اخلاقی طور پر ابھی میں اتنا دیوالیہ نہیں ہوا کہ نہیں کہہ کر سلسلہ منقطع کر دوں۔“ نیل نے کہا

نیل ہی بل میں شکر کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی آپ؟“

”ہم ایک آپ سنا میں کیسے یاد کیا؟“

”جیسے گائیل صاحب! ہم ان رسمی باتوں سے آگے نکل آئے ہیں۔“ اس نے جڑبڑہو کر کہا تو ادھر

نیل نے سناستہ بولے تھے۔

”آگے۔“ ان کے لہجے میں طنز بھی تھا۔ جسے محسوس کر کے وہ نظر انداز کر گیا۔

”ہاں میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کئی اعراض نہیں۔“

”یک دن میں جو وقت آپ کو سوٹ کرے بلکہ میرٹ میں لپچ پر میں آپ کا انتظار کروں گا۔“

”خدا حافظ۔“ ادھر سے سلسلہ منقطع ہوتے ہی اس نے گہری سانس کھینچی پھر ریسیور رکھ کر کل کا

ہونے لگا تھا۔

”ہاں اس نے آفس سے ہی میرٹ میں نیل ریڈرو کو مالی تھی اور مقررہ وقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ بھی گیا

کے بعد اسے کوفت میں مبتلا کرنے والا انتظار ابھی نہیں کرنا پڑا۔ یعنی نیل ٹھیک وقت پر آگئے تھے۔

”یہ آپ نے میری دعوت قبول کی۔“ وہ بیٹھتی ہی بولا۔ پھر مینو پر نشان لگانے کے بعد پوری طرح نیل کی

توجہ پکڑنے لگا۔

”اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا۔ اس لیے نہیں کہ میرے پاس کتنے کو کچھ نہیں بلکہ میں بہت عجیب سا

لوں گا اپنے ادا کے اس اقدام کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے۔ جس سے میری پوزیشن اتنی اگروڑ ہو گئی

ہو گی کہ میری آواز تک سننے کی روادار نہیں رہی۔“

”یاد رکھنا غلط اور ناجائز تو نہیں ہے۔“ نیل نے قدرے چھپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”نہیں۔“ وہ فوراً ”بولتا تھا۔“ میں انہیں حق بجانب سمجھتا ہوں۔“

”تو اب کو سکون سے اس کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے بلکہ اس کی ماکے فیصلے کا۔ کیونکہ وہ ہر بات کا

نیا نیا کو سوچ کر خود الگ ہو گئی ہے۔“

”نہیں کہنا تو کچھ کہتے کہتے ایک دم ہونٹ بھیج گیا۔ ساتھ ہی اس کی پیشانی پر لکیریں بھی نمودار ہو گئی تھیں،

جیسے انداز میں انہیں دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”اب صباحت کو مجھ سے ملنے پر آمادہ کر سکتے ہیں؟“

”نہیں۔“

”صرف ایک بار۔“

”اس کی بے قراری اور آنکھوں سے چھلکتے جذبول کی سچائیاں دیکھ کر آہستہ سے اثبات میں سر ہلا کر

نیل کر رہا۔ البتہ کوشش ضرور کروں گا۔“

”نیل کو بلاؤ پلینز۔“ اس نے شکریہ کے ساتھ انہیں کھانے کی طرف متوجہ کیا، پھر رٹا ہر بلکہ پھلکے انداز میں

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ صباحت کی کوئی ہنس بھی ہے بلکہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ جب مدحیرہ نے بتایا تو بھی باباجان تو یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھے۔“

”اور آپ؟“ نیل ایک دم پوری جان سے متوجہ ہو گئے تھے۔ ”آپ نے اس کی بات کا یقین کر لیا۔“

”فورا۔“

”کیوں۔ میرا مطلب ہے بظاہر تو کوئی فرق نہیں ہے دونوں میں۔“

”میں صرف ظاہر نہیں دیکھتا۔“ وہ یہ اختیار کر کے فوراً اپنی پلیٹ پر جھک گیا تو مبہم سی مسکراہٹ کے نیل نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائی تھیں۔

~~*

وہ لاؤنج میں بیٹھی گود میں رکھی مونگ پھلی کھانے کے ساتھ گلاس وال سے الماس کو دیکھ رہی تھی۔ جو روڑ یوں ٹھل رہی تھی جیسے کسی کا انتظار ہو۔ اور خود اسے شاہ سکندر کا انتظار تھا جن کی آن اسلام آباد سے آ رہی تھی۔ جب ہی الماس کے اس طرح ٹھلنے پر وہ یہی سمجھی کہ وہ اپنے انتظار کو اس پر جتا کر باپ کے ساتھ اس زیادہ اپنی وابستگی ظاہر کرنا چاہتی ہے۔

اور وہ مدحیرہ تھی۔ ایسے فطری مظاہر کو بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ نانا بابا کے گھر میں اس کی کسی کر بنی ہی اس لیے نہیں تھی کہ صباحت کو اس کے مقابلے میں زیادہ توجہ اور محبت حاصل تھی اور اس کی وجہ صبا کا ہر ایک پر جان چھڑکنا تھا لیکن اس نے یہ بھی نہیں سوچا تھا۔ بس اپنے آپ متفر اور شاکی ہو جاتی تھی۔ ابھی یہی حال تھا۔ الماس کے خلاف دل میں خواہاں ابال اٹھنے لگے تھے اور بالکل غیر ارادی طور پر وہ مونگ پھلی والے منہ میں ڈالتی اور چٹکے الماس کی طرف اچھال رہی تھی۔ جیسے اس کا نشانہ لے رہی ہو۔ حالانکہ درمیان گلاس وال بھی اور اس سے بھی کافی فاصلے پر الماس ٹھل رہی تھی۔

بڑے گیٹ سے جیپ اندر داخل ہوئی تو کچھ دیر کو اس کا دھیان الماس کی طرف سے ہٹ گیا لیکن جب الماس کے قریب رکی اور اس میں سے اتر کر شاہ تیمور نے جس انداز سے مسکرا کر اسے سلام کیا اس سے جگہ اچھل پڑی۔

”او گاڈ! تو یہ معاملہ ہے؟“

شاہ تیمور اسی طرف اُتر رہا تھا۔ وہ فوراً انجان بن کر اپنی مونگ پھلی میں مصروف ہو گئی لیکن جیسے ہی شاہ اس کے قریب سے گزرنے لگا اس نے پکار لیا۔

”ہمکسکیوزی کزن۔“

”جی، مجھ سے کچھ کہا۔“ شاہ تیمور نے رک کر اسے دیکھا۔

”ہاں، وہ میں یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ وہی ہیں نا جو مجھے میرن ہال سے اٹھا کر لائے تھے۔“ اس نے غلا:

سادگی سے پوچھا۔

شاہ تیمور نے ہنس کر ایک طرح سے اعتراف کیا تو وہ ہتھیلی پر مونگ پھلی رکھ کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے۔

”لیجیے، مونگ پھلی کھائیے۔“

”شکریہ۔“ شاہ تیمور اس کی ہتھیلی سے چند دانے اٹھا کر آگے بڑھ گیا تو اس کے غائب ہونے تک وہ:

پچھتے دیکھتی رہی پھر کسی خیال سے کندھے اچکا کر گردن سیدھی کی تو الماس کو سر پر کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

”مہراں۔“ الماس نے اسے جواب دینے کے بجائے ملازمہ کو پکارا اور اس کے آنے پر ادھر ادھر بکھر:

کے چٹکوں کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”صاف کر دیہ سب۔ پتا نہیں کہاں سے آ جاتے ہیں جاہل، جنگلی۔“

انہیں جاتے جاتے لائے جاتے ہیں۔ ”وہ خلاف عادت ایک دم آپ سے باہر ہونے کے بجائے آرام سے ہمتی

بڑھ کھڑی ہوئی۔ جس سے اس کی گود میں رکھی مونگ پھلی کاربٹ پر پھیل گئی تھی اور وہ اس کی طرف اشارہ

الماس سے بولی۔

”ہم کھالو، تھوڑی آٹا کو بھی دے دینا۔“

”بہنہ۔“ الماس نے نخوت سے سر جھٹکا۔

”بہنہ! وہ اس کی نقل اتار کر ہنسی ہوئی اور آگئی۔

یہ کامرہ شاہ سکندر کے اسٹڈی روم سے ملتی تھا اور وہ جب دل چاہتا درمیانی دروازہ کھول کر اسٹڈی میں چلی

کی۔ حالانکہ اسے مطالعے کا شوق کبھی بھی نہیں تھا اور ابھی بھی وہ ایسے کسی خیال سے نہیں آئی تھی۔ نہ

لے اندر کوئی جستجو تھا کہ اپنے باپ کا انتخاب ہی دیکھ لے۔ اس کی جگہ اگر صباحت ہوتی تو ایک ہی دن میں

نگال چکی ہوتی لیکن اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ محض مہر النساء پر اپنی اہمیت جتانے کی غرض سے اس نے

رے میں آنا اپنا معمول بنالیا تھا۔ اصل میں اس کے یہاں آنے کے دوسرے دن مہر النساء ہی نے اپنے طور

یہ یاد کرانے کی کوشش کی تھی کہ یہ شاہ سکندر کا خاص کمرہ ہے جس میں کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں

اس کے کچھ دیر بعد ہی وہ شاہ سکندر کے پیچھے اس کمرے میں نہ صرف داخل ہو گئی بلکہ درمیانی دروازے کا

ہی ان سے کھلوایا تھا۔ یہ کہہ کر کہ وہ جب بور ہوئی یا گھبرائے گی تو کتابوں میں اپنا دھیان پٹانے کی کوشش

گی اور شاہ سکندر ظاہر ہے منع نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ پہلی بار آئی تھی در نہ شاید پس و پیش ضرور

۔ بہر حال اس وقت وہ اپنے کمرے میں رکے بغیر سیدھی اسٹڈی میں آکر بیٹھی تو کچھ دیر الماس کے ساتھ

والی معمولی سی جھڑپ اپنے آپ محفوظ ہوئی رہی پھر ایک دم اس کا دھیان گھر کی طرف چلا گیا تھا۔ ”آسیہ“

صباحت وہ سب سے شکی تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں کوئی بھی اس کے لیے پریشان نہیں تھا۔ اس کے

اپنے معاملات میں یوں مصروف ہو گئے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

مجھے کب کسی کی پروا ہے۔ بہت خوش ہوں میں یہاں اگر۔ سب میرے اپنے ہیں۔“ وہ جانے کس احساس

کو خود کو یاد کرانے لگی تھی کہ اچانک ٹیوب لائٹ آن ہونے سے چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور شاہ سکندر کو

فعدا مسکرائی۔

”پکب آئے؟“

نور ہوئی۔ نیچے باباجان کے پاس تھا۔ ”شاہ سکندر ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اس کے قریب آگئے پھر

ناگہمے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”پااس تو نہیں ہو؟“

”میں اواس کیوں ہوں گی۔“

”ماام اور سسٹر کے لیے فون کیا تھا؟“

”ہاں، بات نہیں ہوئی۔ صبا اور نیل بھائی ٹھیک ہیں اور پوچھ رہے تھے کہ میں کب واپس آؤں گی۔“

”کمری انداز میں بتایا تو انہوں نے فوراً پوچھا تھا۔

”بہنہ کیا کہا؟“

”نہیں۔ ماما پوچھیں گی تو انہیں بھی میں یہی جواب دوں گی۔“

”اس کا مطلب ہے آپ یہاں خوش ہو سوری گد۔“

”ہاں، خوش ہوں پاپا! لیکن صبا یہاں آکر بھی خوش نہیں ہوگی۔ اسے ماما اور نیل بھائی کے علاوہ اور کوئی نظر

نہیں دے ان سے ہٹ کر کچھ سوچ سکتی ہے۔ ڈرنی بھی بہت ہے ماما۔ اگر وہ یہاں آجاتی ناں تو رو رو کر

ہنس سلسلے میں؟“ اس نے سروانچا کر کے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”شاہ علی جاگیر کے بارے میں۔“

”نیل بھائی پلینے میں یہ نام سننا نہیں چاہتی۔“ وہ عاجزی سے نوک کر گویا ہوئی۔ ”اور پھر میرا کیا تعلق۔ میں

چھوڑ چکی ہوں۔ آپ ان سے پوچھیں کہ انہوں نے کیا سوچا ہے۔“

”پوچھنا ہی رکھتی کا سوچ رہی ہیں۔“ نیل نے اس کا رد عمل دیکھنے کے لیے اپنی طرف سے کہہ دیا۔

”مگر نہیں۔ میں ذہر کھالوں کی اگر ممانے ایسا کچھ سوچا تو۔“ وہ ایک دم تیز ہو کر بولی تھی۔

”اے رے۔“ نیل نے اسے ایک بازو کے حلقے میں لے لیا۔ ”میں نے تو یوں ہی کہہ دیا ہے ورنہ مجھے نہیں

پوچھوئے کیا سوچا ہے۔ البتہ تمہارا ارادہ معلوم ہو گیا ہے بہت خطرناک ہے۔ آخر ہونا دیکھ کی بہن۔“

”صرف ہنگامیاں دیتی تھی۔ میں عمل کروں گی۔“

”نم آن صبا! تمہارے منہ سے ایسی باتیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ بیٹا! اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے اور تم تو

ایک نہیں تھیں پھر اب تمہیں کیا ہوا ہے۔ اگر مرہات پھوپھو پر چھوڑ چکی ہو تب تو تمہیں ہر دو صورتوں کے

بار دنا چاہیے۔“ نیل نے دھیرج سے ٹوکنے ہوئے کہا۔

”خاموش رہی۔“

”میری ایک بات مانو گی۔“ قدرے توقف سے نیل نے پوچھا۔

”ہر لو نچا کر کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔“

”میں چاہتا ہوں۔ تم ایک بار علی سے مل لو۔“

”اگلیں میں کیوں ملوں۔ اپنی پہچان کرانے کے لیے۔ اسے بتاؤں کہ میں صابحت ہوں اور وہ جو اس کے پاس

ہے۔ وہ مدد ہے۔ نہیں میں یہ نہیں کر سکتی۔ مدد وہاں خوش ہے تو بس ٹھیک ہے۔ اسے وہیں رہنے

دے۔“ وہ ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

”نیل! اس کی باتوں میں الجھ گئے تھے۔ اس کے رونے پر بس چپ چاپ دیکھتے رہے۔ کچھ دیر بعد وہ ہتھیلیوں سے

نزل کر گئی ہوئی اٹھنے لگی تھی کہ انہوں نے ایک دم اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بے اختیار بولے تھے۔

”سو محبت کرنے والے اپنی محبت کو چہروں سے نہیں ڈل سے پچانتے ہیں۔ کیا کبھی میں نے تم پر مدد کا گمان

ہے؟“

”نیل!۔“ وہ متحیر سی پوری آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

”اب میں۔ مدد سے محبت کرتا ہوں۔“

”اب کی تمام تبدیلیوں اور ہٹو ہٹو ہٹو کے باوجود۔“

”اے کہ تو ہن آمیزخ رویوں کے باوجود۔“

”اپنے لیے اس کی نفرتیں جاننے کے باوجود میں صرف اسی سے محبت کی ہے۔“

”نیل! مجھے بے خودی میں بول رہے تھے۔ ان کے لہجے میں جذبول کی سچائیاں تھیں۔ آنکھوں میں وہ رنگ

تھے جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اور جو اس وقت دل کا آئینہ بن گیا تھا۔ شفاف آئینہ جس

کے حق رویوں کی لکیریں واضح نظر آرہی تھیں۔“

”نیل!۔“ اس نے اس تحیر کے عالم میں آہستی سے ان کا ہاتھ تھاما تو وہ ایک دم ہوش میں آکر اٹھ کھڑے

”نیل!۔“ وہ ان کے ساتھ کھڑی ہو کر چیخ پڑی۔ ”آپ! مدد سے محبت کرتے ہیں۔ اس پتھر سے جس پر

جان بڑے دیتی۔“ وہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھی۔

”شاید اس کے ذہن میں یہاں کا تصور خوفناک ہو گا۔“ شاہ سکندر نے کچھ سوچتے ہوئے انداز میں کہا تو وہ

سُنی کر کے ان کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”اس روز باباجان کہہ رہے تھے کہ ان کے لیے ممانے بیٹیں چھین لانا کچھ مشکل نہیں تھا لیکن وہ آپ سے

وعدے سے مجبور تھے کیونکہ آپ ایسا نہیں چاہتے تھے۔ کیا یہ سچ ہے؟“ اس نے ریک کی طرف جاتے جاتے

کر شاہ سکندر کو دیکھا تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگے۔

”پھر تو باباجان کے اس سارے پلان سے بھی آپ بے خبر رہے ہوں گے۔“

”وہ ہنوز سرسری انداز اختیار کیے ہوئی تھی، لیکن اس بار شاہ سکندر کچھ ہلچل گئے اور جواب سے بچ

خاطر سامنے نیل پر ناگہم سیدھی کرتے ہوئے بولے۔

”میں بہت تھک گیا ہوں بیٹا! مراں سے کھو چائے لے آئے اور دیکھنا میں موبائل کہاں چھوڑ آیا ہوں۔“

”بیدروم میں ہو گا۔“

”وہ انہیں دیکھتی ہوئی کمرے سے نکلی تو پہلے مراں کو پکار کر چائے کا کما پھر ان کے بیدروم سے موبائل

واپس آئی تو انہیں سہمانے کے بجائے خودی نمبر ہنسنے لگی۔

”مجھے دو۔“ شاہ سکندر نے ہاتھ بڑھایا تھا لیکن پھر ایک دم خاموش ہو گئے۔

”ہیلو۔“

”کون، نیل بھائی؟“ وہ غیر محسوس طریقے سے شاہ سکندر کی طرف سے رخ موڑ کر بات کرنے لگی۔

”مما کو بلائیں۔ میں ان سے بات کروں گی۔“

”شاہ سکندر اس کی پشت پر نظریں جمائے پوری جان سے متوجہ ہو گئے تھے۔

”کچھ دیر بعد وہ چیخ کر بولی تھی۔“

”کیا یہ مطلب ہے آپ کا؟“

”کیوں کیوں نہیں کرتا چاہتیں۔“

”ظاہر ہے۔ جہاں ہوں وہیں سے بات کر رہی ہوں۔“

”نہ میں آپ کو نہیں ممما کو بتاؤں گی۔“

”مجھے بات ہے انتظار کریں۔“ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور کچھ دیر اسی طرح کھڑی رہی پھر

موبائل شاہ سکندر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”مما! شاہ سکندر کی طرف بڑھاتے ہوئے بات نہیں کرتا چاہتیں۔“

”شاہ سکندر کچھ نہیں بولے۔ اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر اپنا نمبر ہنسنے لگے تو وہ مزید کچھ کہنے کا

ترک کر کے اس کمرے سے نکل آئی تھی۔

”مجھ سے کس بات ہے ناراض ہو؟“ نیل نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا تو وہ بہت سا پٹ لہجے میں بولی

”میں ناراض نہیں ہوتی۔ یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”تو پھر تمہاری اس خاموشی کو اور کیا نام دیا جائے، بولو۔“ نیل نے اس کے جھکے ہوئے سر کو بلایا۔

”نہیں تو اپنی پریشانی تو بتاؤ۔“

”آپ سے کس نے کہا کہ میں پریشان ہوں۔“

”پہلے کون کتنا تھا۔ خیر اس بحث کو چھوڑو اور یہ بتاؤ۔ تم نے کیا سوچا ہے؟“ نیل فوراً اصل بات

کوئی بات اثر نہیں کرتی۔ جذبول کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں پھر آپ نے اپنے جذبے اس کے نام کو لکھ دیا۔ بہت رسوا کرے گی وہ آپ کو۔“

”دھیرج، دھیرج۔“ وہ اس کا ہاتھ تھک کر زرا سا مسکرائے۔
”نہیں بھائی! میں آپ کو رسوا نہیں ہونے دوں گی۔“

”تو اس راز کو اپنے اندر دفن کر دو۔“ ان کے لہجے میں اچانک آزر و گی سمٹ آئی تھی پھر ایک دم خود پر قابو پا کر کہنے لگے۔ ”تم نے مجھے کہاں الجھا دیا۔ اصل بات تو وہیں رہ گئی۔ میں کیا کہہ رہا تھا۔ ہاں وہ علی جمائیکہ کیا نہیں اس کی محبت پر بھروسہ نہیں ہے۔“
”محبت ہوئی تب تا۔ وہ تو باقاعدہ ایک پان کے تحت آیا تھا۔“ وہ تاسف سے کہہ کر ان کی طرف سے رخ موڑ گئی۔

”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ تو کیا اس کے بعد محبت نہیں ہو سکتی؟“
”نہیں، اور اگر ہو تب بھی میں یقین نہیں کروں گی کیونکہ اس کی بنیاد میں جھوٹ اور فریب شامل ہے اور اگر اسے بھی نظر انداز کروں تو بھی میں ماما کو تو دکھ نہیں دے سکتی۔ آپ نے دیکھا نہیں مدحو کے جانے سے ماما ہو گئی ہیں۔ کمزور اور خاموش گو کہ ہم پر ظاہر نہیں کرتیں لیکن میں جانتی ہوں وہ اندر سے کتنی دکھی ہیں۔ کاش مدحو میں احساس نام کی کوئی چیز ہوئی۔“ آخر میں اس کی آواز بھرا گئی تھی۔
”مجھے لگتا ہے اس کے حصے کی حسدیت بھی تم میں آگئی ہے۔“ نیل نے گہری سانس کھینی۔

”پھر بھی آپ اس سے۔“
”چھوڑو یہ سب باتیں۔ جاؤ منہ دھو کر آؤ پھر نیچے چلتے ہیں۔ پتا ہے ایک دو دن میں ٹھیک لپچا آنے والے ہوں گی شادی کی تاریخ رکھنے۔“
”اے میں۔ اشعر بھائی آگے کیا؟“ اس نے فوراً ان کی طرف گھوم کر پوچھا۔
”نہیں، میں تاریخ کو آ رہا ہے۔“
”تو کیا ان کے آتے ہی شادی ہوگی۔“
”ہاں، چلو باقی معلومات نیچے سے حاصل کرتے ہیں۔“
”میں منہ دھو لوں۔“ وہ آتش و دم کی طرف بڑھ گئی۔
نیل اس کا دھیان بٹ جانے پر ہنسنے لگے تھے۔

شاہ سکندر باباجان کے کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں شاہ جمائیکہ کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ باباجان نے انہیں مقصد سے بلایا ہے اور اس بار انہوں نے انجان بننے کی کوشش نہیں کی۔ سلام کر کے بیٹھنے ہی نہ گئے۔
”باباجان! آج صبح کولانے کا مسئلہ ہے تو اب آپ کو ڈائریکٹ آسیہ سے بات کرنی چاہیے۔ دیکھیں کیا کہتی ہیں۔“
”تمہارا مطلب ہے۔ ہم اس کی مرضی پر چلیں۔“ باباجان نے اپنی ناگواری چھپا کر کہا۔

”مجبوری ہے۔ چلنا پڑے گا۔“
”نہیں، نہیں سکندر! مجبوری ہمارے ساتھ نہیں، اس کے ساتھ ہے۔ ایک بیٹی ہم اس کی لے کر بیٹھے ہیں جو اس کے پاس ہے۔ وہ بھی اس کی نہیں۔ کیوں جمائیکہ ہم غلط کہہ رہے ہیں؟“ باباجان کو شاہ سکندر کا بچہ ڈالنے والا انداز قطعاً پسند نہیں آیا تھا۔
”نہیں باباجان! صبحات، علی کی منکوحہ ہے۔“ شاہ جمائیکہ نے فوراً ان کی تائید کی۔
”اس سے پہلے وہ میری بیٹی ہے۔“ شاہ سکندر بھی فوراً بولے تھے۔ ”مدحہ کو جس طرح آپ لے کر

جی جگہ کوئی اور ایسی جرات کرتا تو میں اسے شوٹ کر دیتا۔ اس حویلی میں بیٹیاں اس طرح نہیں بیاہی گئیں ہیں لانے کے لیے کیا آپ سوالی بن کر نہیں گئے پھر میری بیٹی کے لیے سوال کرنا آپ کی شان کے خلاف ہے؟“

”ہم صرف سوال نہیں، تمہارے سامنے پورا دامن پھیلا دیتے ہیں۔“ باباجان ان کے بدلے ہاتھ اندر ہی اندر قھٹک گئے تھے لیکن معاملہ فہم تھے اس لیے فوراً دامن پھیلا دیا تھا۔
”برے سامنے نہیں باباجان! ان کی ماں کے سامنے۔ کیونکہ میں بہت پہلے بچپن کے تمام اختیارات ان کی ہونچکا ہوں۔“ شاہ سکندر نے ناراض لہجے میں کہا تو باباجان ناگواری سے بولے۔
”نہیں ہو سکتا۔“

”میرا صحت کو لانے کا خیال بھی چھوڑ دیجیے۔“
”پورا دامن ناممکن ہے۔ ہم شاہوں کی بیٹیاں عیروں میں نہیں بیاہی جاتیں۔“
”فریقے سے بیاہی جاتی ہیں اور طریقے سے لائی جاتی ہیں، اس طرح گن پوائنٹ پر اٹھا کر نہیں لائی جاتیں۔“
”نیک اس سارے معاملے میں خاموش رہا اور جہاں ضرورت پڑی وہاں آپ کا ساتھ بھی دیا تو صرف اس میں نے آپ کی بات کا یقین کر لیا تھا کہ میری بیٹی کو خاندان کا نام دینے کے ساتھ آپ نے اس کے بہتر ان کی ضمانت دی تھی۔“

”ابھی بھی ضمانت دے رہے ہیں۔“ باباجان فوراً بولے تھے۔
”ابن اس کے ساتھ آپ میری غیرت سے بھی کھیل رہے ہیں اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ مدحہ اور میری بیٹیاں ہیں۔ خواہ میاں رہیں یا آسیہ کے پاس، آپ کو ان کے لیے اسی طرح سوچنا ہو گا جیسے الماس، اور دوسری بچیوں کے لیے سوچتے ہیں۔ صباحت کو بیاہ کر لانا ہے تو خود چل کر جائیں۔ اگر اس میں آپ اپنی محسوس کرتے ہیں تو جمائیکہ کو بھیج دیں۔ میرے دقت میں بھی تو آپ نے انہیں ہی بھیجا تھا لیکن اب بلاش نہیں ہوئی۔“ شاہ سکندر نے جانے بیٹیوں کی محبت میں یا اپنی غیرت پر چوٹ پڑنے سے سارے لحاظ لے لیے تھے۔

”سکندر! باباجان کا ضبط جواب دے گیا۔“ تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ سن رہے ہو جمائیکہ! ہمیں اس دو کوڑی لٹکے کے سامنے جھکا نا چاہتا ہے۔“
”مصلح آپ کی سوچ ہے باباجان! اور آسیہ سے بغض ورنہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کچھ لینے کے لیے بلانا پڑتا ہے۔ صباحت کی جگہ اگر الماس ہو تو کیا آپ مہر النساء سے بات نہیں کریں گے۔“ شاہ سکندر رنج سے بولے تھے۔

”میں۔“ باباجان ہٹ دھرمی سے گویا ہوئے۔ ”مہر النساء سے کیوں بات کریں گے۔ ہم اپنے طور پر جو فیصلہ کر رہے ہیں اس میں کسی دوسرے فرد کو شامل نہیں کرتے، پوچھ لو جمائیکہ۔ علی کے معاملے میں میں نے اس کی ناس کی بیوی سے اور جو کہا انہوں نے وہی کیا۔“
”نہیں کر سکتا۔“ شاہ سکندر کے صاف انکار پر باباجان کچھ دیر تک خشکیں نظروں سے انہیں گھورتے رہے۔

”اے کچھ کہہ بھی نہیں رہے سکندر!“
”میرا اٹھ کھڑے ہوئے پھر جاتے جاتے رک کر شاہ جمائیکہ سے مخاطب ہوئے۔
”میرا بھائی! آپ صباحت کے لیے آسیہ سے بات کر لیجیے۔ وہ اگر اسے رخصت کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو آپ علی کے لیے کوئی اور لڑکی دیکھیں۔“
”بات ختم کرتے ہی وہ کمرے سے نکل آئے کیونکہ باباجان کا رد عمل جانتے تھے اور یہ نہیں تھا کہ انہیں

پروا نہیں تھی بلکہ وہ مزید بحث نہیں کرنا چاہتے تھے پھر بابا جان کی ضد سے بھی واقف تھے اور جو کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا وہ بھولے نہیں تھے لیکن وہی بات کہ انسان اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو نظر انداز کریتا ہے لیکن جب اولاد کی بات آتی ہے تو مصلحت بھی کوئی زیادتی برداشت نہیں ہوتی۔

اور شاہ سکندر اس سارے معاملے میں اگر خاموش رہے تھے تو اس کی کئی وجوہ تھیں۔ ایک تو بابا جان کی ضمانت، دوسرے علی جمائیکر کی ہر لحاظ سے انریکٹو سٹائن کی تیسری بڑی وجہ یہ بھی کہ انہوں نے صاحت کو دیکھا نہیں تھا تو اس کے لیے ان کے اندر وہ محبت نہیں تھی جو ساتھ رہنے والی اولاد سے ہوتی ہے۔ اس لیے انہوں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ آیا وہ لڑکی شاہ پور آتا بھی چاہے کی یا نہیں۔ گویا اس کے احساسات کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور اگر مدیہ کی جگہ صاحت ہی آجاتی تب بھی شاید وہ اسے اہمیت نہ دیتے، خواہ وہ کتنا دایلا مچائی۔ وہ یہ سوچ کر اطمینان سے رہتے کہ بابا جان نے اس کے ساتھ اچھا کیا۔ خاندان کا نام اور علی جی صاف سزا سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا لیکن اب یہ نہیں سوچ سکتے تھے۔ کیونکہ درمیان میں مدیہ آگئی تھی جس کے وجود سے ہی وہ لاعلم تھے۔ اس نے اچانک ان کے اندر سولی محبت کو یوں بیدار کیا تھا کہ اس کے ساتھ ان کی غیرت بھی جوش میں آگئی تھی اور اب وہ صرف باپ بزرگ کو سوچ رہے تھے تو انہیں بابا جان کا طرز عمل انتہائی نامناسب اور گھنایا لگ رہا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ صاحت کو لانے کے لیے بابا جان پھر کوئی ایسا پلان بنائیں جس سے بیٹیوں کی نظروں میں وہ بھی بے وقعت ہو کر رہ جائیں۔

گو کہ مدیہ نے ابھی تک ان پر کچھ جنایاں نہیں کیں لیکن وہ اس خیال سے بھی پریشان ہو جاتے تھے کہ کسی دن وہ ان کے مقابل کھڑی ہوگئی تو وہ اسے کیا جواب دیں گے۔ ان کی زندگی میں یہ دو سرا شاید تیسرا مشکل ترین مرحلہ تھا۔ جہاں اگلے لمحے کے تصور سے ان کا دل بیٹھے لگ تھا اور ذہن بری طرح منتشر ہو جاتا۔

پہلا مرحلہ وہ تھا جب جلہ عروسی میں موہو پکارتے ہوئے وہ کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آگئے تھے۔ دوسری بار جب آسہ کے ہاتھ میں لٹاف ڈھکایا تھا۔ اور اب اولاد کے لیے بھی بابا جان ان سے یہ توقع کر رہے تھے کہ وہ ان کے اشاروں پر چلتے رہیں گے۔ ”ہرگز نہیں۔“ مدیہ اور صاحت لاورث نہیں ہیں۔ میں ان کا باپ ہلینے مشر شاہ سکندر حیات میری اپنی ذاتی حیثیت ہے، شناخت ہے اور میں اپنی شناخت کے ساتھ اپنی بیٹیاں رخصت کروں گا۔“ وہ بہت مضبوط ارادے کے ساتھ سوچ رہے تھے۔ تب ہی دروازہ کھلنے کے ساتھ مدیہ اندر آتے ہوئے بولی۔

”آپ یہاں ہیں بابا! میں آپ کو نیچے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔“

”خیریت؟“ انہوں نے اسے اپنے برابر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”میں بہت بور ہو گئی ہوں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ سب اپنے اپنے کمروں میں بند۔ کھانے کے وقت نکلے ہیں پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ مجھ سے کتراتے ہیں یا۔۔۔“

”نہیں بیٹا! آپ سے کیوں کتراتے ہیں۔ بس سب کا اپنا اپنا مزاج ہے اپنی اپنی دلچسپیاں ہیں۔ آپ کی ہیل کیا اہلکم و غیر تھیں؟“ انہوں نے اس کی بات کاٹ کر نرمی سے پوچھا۔

”کوئی خاص نہیں پھر بھی زندگی متحرک تھی۔ صبح ناشتے کے ساتھ ساتھ ماما کی پھر کالج جانے کی تیاری۔ صابا جلدی جلدی کا شور مچاتی رہتی۔ مجھے اسے تنگ کرنے میں بہت مزہ آتا ہے اور نیکل بھائی کو بھی۔ اور عرب ساتھ تو میری بیٹی ہی نہیں ہے۔ بہت لڑائی ہوتی ہے ہماری لیکن ہم ناراض نہیں ہوتے۔ بس لڑتے ہیں اور اب لڑتے بھی نہیں ہیں کیونکہ میں وہاں نہیں رہتی۔ آپ کو پتا ہے میں اسلام آباد میں ہوتی ہوں۔ اپنے خلیل کے پاس۔“

”اس سے شاید سب یاد آ رہے تھے جو وہ شوق سے بتانے بیٹھ گئی تھی۔

”کیوں ان کے پاس کیوں؟“ شاہ سکندر نے پوچھا تو وہ اصل بات گول کر گئی۔

مجھے اسلام آباد جانے کا شوق تھا۔ وہاں گئی تو پھر آئے کوئل ہی نہیں چاہا۔ ماما سے ضد کر کے وہیں رہ گئی ہیں ایڈیشن بھی لے لیا۔ اب میرا تو بہت نقصان ہو گیا۔ ایک ہفتے کی چھٹی تھی اور یہاں ایک مہینہ سے ایکدم اپنا کالج یاد آ گیا۔

”کون کون ہے آپ کے خلیل ماما کے گھر میں؟“ انہوں نے ایک خیال کے تحت پوچھا تھا۔

”س ماما جی اور ماما جی ہیں۔ سمعیہ جی کی شادی ہو گئی اور اشعر بھائی لندن میں ہیں۔ شاید آنے والے ہیں یا ہو سکتا ہے وہیں شادی کر لیں جیسے۔“ وہ روائی میں بتاتی ہوئی ایکدم خاموش ہو گئی۔

”وہ صاحت؟“ وہ بھی آپ کی طرح ہے؟“ شاہ سکندر چاہتے تھے وہ یوں ہی بولتی رہے، جب ہی اس کے خاموش ہونے کا سوال کر رہے تھے۔

”نہیں، وہ بہت ڈرپوک ہے۔ شادی والے روز اگر میری جگہ وہ ماما پر بند و قیں تنی ہوئی دیکھ لیتی تو اس کا تو وہیں ہل جاتا۔“

”صاحت کی تعریف میں ہمیشہ سب سے پہلے اس کی بڑی کا ذکر کرتی تھی۔

”شاہ سکندر اندر ہی اندر جزیبہ ہوئے اور صاحت کے بارے میں مزید جاننے کا خیال چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”کے بیٹا! آپ اپنے کمرے میں جاؤ، مجھے کچھ کام کرنا ہے۔“

”ہلے میرا مسئلہ تو حل کریں۔“

”ایسا مسئلہ ہے؟“ انہوں نے فوراً پوچھا۔

”ہریت۔“ اس نے بوری شکل بنا کر کہا۔

”بیٹا!۔۔۔ آپ کا کیا دل چاہتا ہے پڑھنا چاہتی ہو تو اسلام آباد لے چلوں یا نئے سرے سے کہیں اور۔“

”نہیں، مجھے نہیں پڑھنا۔“ وہ بیزار سی بولی۔

”ہلے بیٹا! کم از کم گریجویشن تو کر لینا چاہیے آپ کو۔“

”اٹل فائدہ نہیں۔“ جتنی تانج میری اب ہے مگر گریجویشن کے بعد بھی اتنی ہی رہے گی۔ کوئی اضافہ نہیں ہو گا۔

”مگر کیا ہاتھ آئے گی۔ کیا کروں گی ڈگری لے کر۔“ نوکری تو نہیں کرنی مجھے۔“

”یہ دن میں آیا بولے جارہی تھی اور اسے دیکھتے ہوئے شاہ سکندر کا ذہن کہیں پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے کہا تھا۔

”میرے خواب ایک خوبصورت گھر تک محدود نہیں ہیں۔ جس مقصد کے تحت میں نے تعلیم حاصل کی اسے نہیں چھوڑ سکتی۔“

~~*

گرمیوں کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے لیکن خوشیوں میں بے ساختگی نہیں تھی بلکہ جیسے ہر بات صوب کر اور سنبھل کر ہو رہی تھی۔ لڑکیاں ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو ایک لائن سے رلے رٹائے گانے شروع ہوتے۔ درمیان میں نہ کوئی چھینا چھینا، نہ ہنسی مذاق۔ شاید اس لیے کہ اس سے پہلے کی شادی نے جو مسائل لایے تھے گو کہ اس کی لپیٹ میں سب نہیں آئے تھے لیکن اپنے اپنے طور پر سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ یوں ہر پر اس کے تمام پیچھے بھینچا جان چھڑکتے تھے پھر کیسے ممکن تھا کہ اس کی پریشانی کو وہ محسوس نہ کریں۔

”آسیہ ظاہر نہیں کرتی تھی اور بھرپور طریقے سے ہر کام میں حصہ لے رہی تھی اور اسی کی طرح صاحت بھی کس کر رہی تھی کہ وہ اس خوبی پر اپنے ساتھ ہونے والی ٹریڈی کا سایا بھی نہ پڑنے دے۔ جب ہی کچھ زیادہ ہی دیکھ کا مظاہرہ کر رہی تھی پھر بھی سب بہت محتاط تھے۔

”یوٹار رخصت ہو کر اسلام آباد چلی گئی تو اگلے دن باقی سب گھر والے ویسے میں شرکت کے لیے روانہ ہو گئے۔

”مے گھر ایکدم خالی ہو گیا۔ صرف اماں جی، آسیہ اور وہ تھی۔ اماں جی کی حیثیت خراب تھی۔ اس لیے آسیہ سے اپنا جانا ملتی کرنا پڑا، ورنہ پروگرام تو ان کا بھی تھا اور آسیہ نے اس سے تو بہت کہا کہ وہ بھی چلی جائے لیکن

جہل میں آنے والے ہیں۔“

ماخذ احافظ۔“

ابن مسعودؓ نے کہا کہ یہی تھی کہ پھر بتلایا تھا۔

اس بار اس نے کچھ بیزاری سے ریسپورڈ اٹھایا تھا۔

یہاں پر جا رہا ہوں۔ مدحیہ کے لیے کوئی پیغام ہو تو بتا دیں۔“ دوسری طرف علی تھا۔ بغیر سلام دعا کے

یہی بولا اور اس کا داغ جھٹھکا گیا۔ حسب سابق ریسپورڈ پہنچنے لگی تھی کہ اچانک کسی خیال کے تحت رک گئی

کچھ نہیں اور اس کے مزید کچھ کہنے کا انتظار کرنے لگی۔

بہاجت! قدرتے توقف سے دھر سے وہ پکار کر کہنے لگا۔ ”خفگی ناراضگی بجاہے لیکن پلینیری بھی تو

بہ کیا تم مجھ سے مل سکتی ہو۔“

نے ہونٹ جھنجھو کر خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا۔

مگر تم پر اس سلسلے میں کوئی باندی لگائی گئی ہے تو میں آجاتا ہوں۔ اب تو آسکتا ہوں اپنی منکوحہ سے ملنے

پر کسی کو اعتراض بھی نہیں ہونا چاہیے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا۔“ آخر میں اس نے اس کی خاموشی

کا سہارا لیا۔

میں اس نے ریسپورڈ لیا اور اس کی دیدہ دلیری پر تلعلاتی ہوئی دوبارہ اماں جی کے پاس جا بیٹھی تھی اور کچھ

بے انداز سے احمر کے بارے میں سوچ رہی تھی اب اس کی جگہ شاہ علی جمائیکر آگیا تھا۔

نہرے روز سب لوگ اسلام آباد سے واپس آئے۔ کیونکہ سب کام کان والے تھے۔ بس ایک وہ اور ٹوپیہ

آئی۔ ٹوپیہ کو رزلٹ کا انتظار تھا۔ اس کے بعد اس کا ارادہ میڈیکل میں جانے کا تھا اور رزلٹ تو اس کا بھی

نہا کیا تھا لیکن فور تھ ایئر میں ایڈمیشن شروع ہو چکے تھے اور اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ آسیہ نے

بارے میں کیا سوچا ہے۔ یعنی اس کی پڑھائی کے متعلق اور وہ خود چاہتی تھی کہ دوبارہ سے کالج جانا شروع

لیکن آسیہ سے کہتے ہوئے ڈرتی تھی۔ کیونکہ ان دنوں آسیہ کا مزاج کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں

تھی۔ بہت مہربان اور کبھی ذرا سی بات پر ہتھ سے اکھڑ جاتی۔ اس لیے وہ ضرورت کے علاوہ ضروری بات بھی

اکر کرنے لگی تھی اور گوکہ ایڈمیشن بہت ضروری تھا پھر بھی وہ ڈرتی تھی اور بہت ہمت کرنے پر بھی آسیہ

اکہ سکی اور نیل کے پاس چلی آئی۔

بھائی! بے کار وقت ضائع کرنے سے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ میں بی اے کروں۔“ اس نے نیل کے

نے کا کپ رکھتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ فوراً تائید کرتے ہوئے بولے۔

ما تمہیں پڑھنا چاہیے۔“

اب ماما سے کہیں نا۔“

ناہ منع کر رہی ہیں کیا؟“

ناہ۔ وہ میرا مطلب ہے، میں نے ان سے بات نہیں کی۔ مجھے ڈر لگتا ہے نیل بھائی! شاید وہ منع کر دیں

ماتے کچھ الجھ کر اپنا خدشہ ظاہر کیا تو نیل مجھے کر بولے۔

خیال ہے وہ پڑھنے سے نہیں روکیں گی۔ خبر میں بات کروں گا۔ ایڈمیشن تو ہو رہے ہیں۔ تم لیٹ نہیں

پکے خیال کیوں نہیں آیا تمہیں۔“

مگر لیکن ماما سے کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے انہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹ دیتی

تھیں۔ مگر بولی۔

اؤف! تمہیں ان سے شاک کی نہیں ہونا چاہیے۔ جانتی تو ہو وہ کتنی پریشان ہیں۔ تم سے زیادہ انہیں مدحو

بہ نیل نے مدحرج سے اسے ٹوک کر کہا تو وہ صوفے سے اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھی۔

اس کا دل کچھ اچھا سا ہو گیا تھا۔ اماں جی کا ہانا کر کے رک گئی کیونکہ آسیہ سارا دن تو گھر میں نہیں ہوتی تھی۔

اس وقت بھی آسیہ کلینک جا رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے گیٹ بند کر کے واپس اماں جی کے پاس آ کر بیٹھی اور ان

کی ٹانگیں دباتے ہوئے کہنے لگی۔

”مگر بھائی! آخر نہیں آئے۔ کتنا انتظار کیا ماما جی نے، اور سونیا آپلی تو بہت دور رہی تھیں۔ انہیں اگر نہیں تا

تھا تو صاف منع کر دیتے۔ خواہ آس دلائی۔“

”ہاں! اماں جی نے ہاں کی صورت لمبی سانس کھینچی۔“ پتا نہیں پردیس کی مٹی کیسی ہے۔ سارے رشتے بھلا

دیتی ہے۔“

”مگر بھائی! ایسے تو نہیں تھے اماں جی! وہ تو سب سے بہت محبت کرتے تھے اور مذہ واد بھی بہت تھے۔“ وہ ان

دونوں میں کھو کر بولی جب احمر یہاں تھا۔

اماں جی پر غصہ کی طاری ہو رہی تھی۔ اس کی بات پر بس ہوں کر کے رہ گئیں تو ان کا چہرہ دیکھ کر اس نے خاموشی

اختیار کر لی پھر آہستگی سے ان کے پاس سے اٹھ کر گزرا۔ آہستگی میں آہستگی اور احمر ہی کو یاد کرتے ہوئے وہ جانے کیا

سوچنے لگی تھی۔

”مگر احمر بھائی! وہاں شادی نہ کرتے تو شاید یہ حالات نہ ہوتے۔ اس کے برعکس جیسے اشعر بھائی اور ان کی ایک

ساتھ منگنی ہوئی تھی تو اب شادی بھی دونوں کی ساتھ ہی ہوتی۔ سونیا جی رخصت ہوئیں اور مدحو یہاں بیٹھی ہوئی

ولسن بنی ہوئی۔ بہت غلط کیا احمر بھائی نے۔ انہیں شاید مدحو سے محبت بھی ہی نہیں۔ محض دل لگی با۔“ فون

نیل سے اس کی سوچیں منتشر ہو گئیں اور اماں جی کی نیند خراب ہونے کے خیال سے اس نے بھاگ کر ریم

اٹھایا تھا۔

”ہیلو۔“

”کون مدحو! کہی ہو؟“ دوسری طرف وہی تھا جسے ابھی وہ یاد کر رہی تھی اور اس کے منہ سے مدحوں کو دہنا

بولی۔

”جی نہیں میں صبا ہوں اور اتفاق سے ابھی آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“

”اچھا! دھر وہ خوش دلی سے۔“ پھر یہ نہیں کہو گی۔ بڑی عمر ہے تمہاری۔“

”کیوں نہیں۔ اللہ آپ کو میری عمر بھی لگا دے۔“

”بہت بے وقوف۔ چلو ذرا امی کو بلاؤ۔“ اصرار نے پار بھری سرزنش کے ساتھ کہا۔

”مامی جی نہیں ہیں بلکہ کوئی بھی نہیں ہے۔ سب اسلام آباد گئے ہیں دیکھ میں۔ آپ کیوں نہیں آئے؟“

اس نے بتا کر بوجھا۔

”بس یا ر! پھٹی نہیں ملی اور سنو ہم کیوں نہیں گئیں؟“

”اماں جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے ماما اور میں نہیں گئے۔“

”اور مدحو! اچھا ہاں وہ تو وہیں ہوتی ہے نا۔“ اصرار نے ایک مدحو یاد آنے پر کہا تھا۔

”نہیں مدحو شاہ پور میں ہے۔ شاہ سکندر کے پاس۔“

”کیوں میرا مطلب ہے وہاں کیوں چلی گئی۔ پھوپھو نے جانے دیا۔“

”جی! اس نے اختصار سے کام لیا۔“

”یقیناً بہت ضد کی ہوگی اس نے۔ ضدی تو وہ شروع سے ہے۔ آئے گی کب؟“ اصرار نے مدحیہ کے اس الفا

پر تأسف کا اظہار کر کے پوچھا تو اس نے لاعلمی ظاہر کر دی۔

”پتا نہیں۔“

”اچھا میں پھر فون کروں گا۔ کب تک آئیں گے سب لوگ؟“

”آپ تو کہتے تھے نبیل بھائی کہ مدحواس گھر کے علاوہ اور کہیں بھی زیادہ دن نہیں رہ سکتی۔“

”میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔“ نبیل فوراً بولے۔

”بس کریں بھائی! اتنے دن تو ہو گئے ہیں۔ کل بھی اس کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی۔ کبھی نہیں آؤں گی۔“

”سختی رہو اس کی باتیں۔ وہ نارمل نہیں ہے۔ ہمیشہ سے یہی سب کرتی رہی ہے کہ کسی نہ کسی سبب سے اس کے لیے پریشان رہیں۔ جس دن اسے اس کے حال پر چھوڑ کر سب اس سے بے پروا ہو گئے وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“

”نبیل نے کہا تو اسے ان کی بات بالکل پسند نہیں آئی۔“

”ہائے نہیں نبیل بھائی! اس سے تو وہ اور چڑ جاتی ہے۔“

”کب تک چڑے گی۔“

”بس جانے دیں۔ یہ بتائیں۔ آپ مماسے کب بات کریں گے میرے کالج جانے کے سلسلے میں۔“ وہ پورا

بات برآئی۔

”مجھے ہی اور تم بس تیار رہو۔ مجھے یقین ہے پھوپھو منع نہیں کریں گی۔ بلکہ وہ اس بات پر ناراض ہوں گی کہ

نے پہلے کیوں نہیں یاد دلایا۔“

نبیل نے بات کے اختتام پر خالی کپاٹھا کر اسے یوں تھمایا جیسے اب تم جاؤ یہاں سے اور وہ بھی اٹھ کھڑی

تھی پھر دروازے کے قریب رگ کر پوچھنے لگی۔

”نبیل بھائی! آپ مدحواس کے لیے سنجیدہ ہیں نا؟“

نبیل نے بہت بری طرح اسے گھورا تھا۔

وہ ہنستی ہوئی ہار نکل گئی۔

~~*

وہ بی بی جان کو ڈھونڈتی ہوئی پہلے ان کے کمرے میں، پھر ہال میں دیکھنے کے بعد باباجان کے خاص کمرے

طرف آئی تھی لیکن دروازے کے پاس ہی رک گئی کیونکہ اندر سے باباجان کے تیز بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

نے پینڈل پر ہاتھ رکھ کر کچھ دیر سوچا پھر اندر جانے کا ارادہ ترک کر کے واپسی پلٹی تھی کہ باباجان کی آواز پر پھر

گئی اور بہت آہستہ سے دروازے کے قریب ہو کر کھنکھائی۔

”سکندر کا دماغ خراب ہے۔ کہتا ہے، ہم اس ڈاکٹر کی کپاس جائیں اور اس پر بھی اس کی مرضی کو دینا

پانہ دے۔ ہونہ۔“

”بہت خیال کر لیا ہم نے سکندر کا۔ اب نہیں کریں گے۔“ باباجان کی آواز تو قفوف سے آ رہی تھی۔

غصے میں ادھر سے ادھر نکل رہے تھے اور جانے اندر اور کون کون تھا۔

”تم پہلی فرصت میں اس عورت کو بیگم بیجو کو مدیہ کی سلامتی چاہتی ہے تو فوراً“ علی کی منکوحہ اس کے

پہنچا دے۔“

”میرے خدا!“ اس نے بہت دہل کر دروازے کو دیکھا تھا۔

”اور سنو، مدیہ پر کڑی نظر رکھو۔ وہ ضرور اپنی ماں کو فون کرتی ہوگی۔ ہم علی کا مسئلہ حل کر لیں پھر

بارے میں بھی سوچتے ہیں۔“

وہ اسی طرح سہمی ہوئی اگلے قدموں دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگی تھی پھر امدادی کے موڑ پر تیزی

ہوئے علی جمائیکر سے ٹکرائی اور اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے چیخ بلند ہوئی جلدی سے اپنا ہاتھ ہونٹ

لایا۔

”کیا بات ہے؟“ علی جمائیکر نے اس کی سہمی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر قدرے تشویش سے پوچھا۔

لے سے قاصر تھی۔ نفی میں سر ہلایا پھر بے اختیار علی جمائیکر کا بازو مضبوطی سے تھام کر کھینچتی ہوئی لاؤنچ

تلی اور اسے صوفے پر دھکیل کر یوں دیکھنے لگی جیسے آیا وہ قابل اعتبار ہے کہ نہیں۔

نے کچھ کہا ہے۔ باباجان نے۔ ”علی جمائیکر نے پوچھا پھر خود ہی قیاس کیا۔“

نہیں۔ وہ میں بارہ درری کی طرف نکل گئی تھی۔ ڈر سی گئی۔ ”اسے فوری طور پر جو سمجھ میں آیا کہہ دیا۔“

”کون تھا وہاں؟“

”اوہ جو گھنٹا سا بیڑا ہے نا اس میں جھانک رہا تھا۔“ وہ اب اپنی بات پر قائم رہنے کے لیے پوری کمانی

بٹا رہی تھی۔

”کچھ کہا تو میں اس نے تمہیں؟“ علی جمائیکر نے بے ساختہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر پوچھا۔

”وہ نظرس چرا کر سیدھی ہو گئی پھر ایک دم خیال آنے پر پوچھنے لگی۔ ”آپ کراچی سے آ رہے ہیں؟“

”اور مجھ کو ایس بھی جانا ہے۔ سکندر بیچا پیس ہیں یا نہیں اور پر اٹھتے ہوئے ہیں۔“

”ہاں۔“ کچھ دیر پہلے میں نے انہیں اپنے اسٹڈی روم میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ آپ وہیں چلے

باباجان سے مل لیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا پھر جاتے جاتے رک کر بولا۔ ”میں نے صبا سے پوچھا تھا کہ

لے کوئی پیغام ہو تو۔“

”کیا ملاقات ہوئی اس سے؟“ اس نے فوراً پوچھا۔

”ہاں۔ میں نے فون کیا تھا۔ البتہ نبیل بھائی سے باقاعدہ ملاقات ہوئی۔ میں اپنی زندگی میں بہت کم لوگوں

بڑھا ہوں اور ان کم لوگوں میں ایک فرد کا اضافہ نبیل بھائی۔ ہی از دیری جینسنس۔“ اس نے کہا تو وہ بے

عکاسہ اچکا کر بولی۔

”کیا جگہ اگر صبا ہوئی تو نبیل بھائی کی تعریف پر خوشی سے پاگل ہو جاتی۔ اس کے اب جائیں ملیں اپنے

سے اور دیکھیں انہوں نے آپ کی شادی کی دوسری اور آخری قسط کا پلاٹ تیار کیا کہ نہیں۔“

”کیا دوسری بات پر جربز ہو کر آگے بڑھ گیا۔“

”ناتجربہ خطرناک لوگ ہیں۔ اپنی ہار کو جیت کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“ اس کی نیند اڑ چکی تھی۔

”ایسا تو کوہوتے ہوئے اسے اپنی زندگی کا اختتام نظر آنے لگا تھا۔“

”رب تو میں ماما کو فون کر کے خبردار بھی نہیں کر سکتی۔ کتنی مجبور ہوں گی ماما۔ اگر انہوں نے میری وجہ سے

نکال دیا تو پھر وہ بھی ہم دونوں کو نہیں دیکھ سکیں گی۔ ان لوگوں کو مجھ سے اور صبا سے کوئی محبت نہیں ہے بلکہ یہ

سے ہمارا وجود ہی تسلیم نہیں کرتے۔ اس لیے ہمیں میٹا نا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہوگی۔“

غائب سوچتے سوچتے رات کے آخری پہر جا کر سوئی تھی پھر بھی صبح بہت جلدی اٹھ گئی اور یہ یقیناً ”اس

کا فون تھا جس نے اسے گہری نیند سونے نہیں دیا تھا۔ دل دماغ دونوں بوجھل ہوئے تھے۔ منہ پر پانی

پینے کا کردہ ہاتھوں ہی سے چہرہ تھپتھپاتی ہوئی دوبارہ کمرے میں آئی اور تازہ ہوا کے لیے کھڑکی سے پردے

کھینچے۔ لان میں شاہ سکندر اور علی جمائیکر ایک ساتھ چمچل قدمی کرتے نظر آئے۔ اسے لگا جیسے وہ دونوں

کے اگلے پلان پر بات کر رہے ہوں۔ اس نے کچھ دیر سوچا پھر دوپٹہ اٹھا کر کمرے سے نکلی اور بیڑھیاں

نہا گئی ہوئی ان کے پاس چلی آئی۔

”ارے کیا ہوا؟“

”کج کج آپ جلدی اٹھ گئیں؟“ شاہ سکندر رک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”مجھے یہ خیال تھا کہ میرے اچھے سے پہلے کہیں آپ نکل نہ جائیں۔ رات آپ کو نہ جانے کی بات

تھا۔“ اس نے حاضر دماغی سے کام لیا۔

”ہاں لیکن آج تو میرا جانا کفرم نہیں تھا۔ دوسرے میں البتہ کراچی جاؤں گا۔ علی تم بھی میرے ساتھ ہی رہنا۔“
اسے بتا کر وہ علی سے مخاطب ہوئے۔
”جیسے آپ کہیں۔ انہیں بھی لے چلتے ہیں۔ یہ یہاں ڈرتی ہیں۔ کل شاید کوئی بہوت وغیرہ دیکھ لیا تھا۔ ہم
جہاں گئے شہرارت سے اسے دیکھا تو وہ بے ساختہ بولی۔
”وہ تو میں ابھی بھی دیکھ رہی ہوں۔“

شاہ سکندر نے ہلکا سا تھوہ لگایا پھر اسے اپنے ساتھ لگا کر چلتے ہوئے بولے۔
”میری بیٹی بہت بھاری ہے۔“
”وہ ہلکا آپ کراچی جا رہے ہیں۔ میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔“ وہ فوراً اصل بات کی طرف آئی۔
”آج نہیں بیٹا! پھر کسی دن۔“ شاہ سکندر نے بہت نرمی سے آئندہ پر ٹالا۔
”نہیں بیٹا! میں آج ہی جاؤں گی۔ مجھے۔“ وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ ورنہ کہنے جاری تھی کہ مہاراجہ یا اور

یہ۔
”صلی! تمہاری پرورش کا کیا ہوا؟“
شاہ سکندر ان سنی کر کے علی کو مخاطب کرتے ہوئے اس کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے تو وہ سمجھ گئی کہ
اسے لے جانا نہیں چاہتے اور وہ جان ہی گئی تھی۔ البتہ شاہ سکندر سے کچھ امید تھی کہ وہ اگر بابا جان کے
اگلے پلان سے آگاہ ہو گئے تو شاید وہ خود ہی اسے یہاں سے نکال لے جائیں گے لیکن انہوں نے منع کر کے
صرف اس کی امید توڑ دی بلکہ اسے شاک بھی کر دیا تھا۔
اس نے بہت غیر محسوس طریقے سے اپنے کندھے سے شاہ سکندر کا ہاتھ ہٹا دیا اور اسی طرح پہلے ان سے
قدم پیچھے ہٹ کر پھر رک کر انہیں علی جہاں گئے کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔
کافی آگے جا کر شاہ سکندر واپس پلٹے تو انہیں دوبارہ اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ حرکت میں آئی۔ کیا یہ کچھ
جا کر کچھ پھول توڑے اور ان کا گلہ نہ بنانے لگی۔ بظاہر وہ بڑے اٹھناک سے اس کام میں مصروف تھی لیکن اگر
ذہن کوئی ایسی تدبیر سوچنے لگا تھا جو شاہ سکندر اسے اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور ہو جائیں۔

~~*

اس نے کالج جو ان کر لیا تو اب آنے جانے کا مسئلہ ہو گیا تھا۔ پہلے مدیہ اور ثویہ ساتھ ہوتی تھیں۔ اب
دونوں نہیں تھیں۔ مدیہ تو خیر پہلے ہی اسلام آباد چلی گئی تھی اور ثویہ رزلٹ کے بعد میڈیکل میں جانے والی
ہوں اس کا راستہ الگ ہو گیا تھا اور وہ کیونکہ کبھی اکیلی نہیں نکلتی تھی اس لیے بہت پریشان ہو رہی تھی۔
آسیہ نے اسے باقاعدہ لیکچر دینے کے ساتھ ڈانٹا بھی تھا کہ وہ اب کبھی نہیں ہے جو ابھی بھی انگلی پکڑ کر کھڑکی کا
پیمیں سے عادت ڈالنی چاہیے ورنہ زندگی میں کچھ نہیں کر سکے گی اور وہ آسیہ کے سامنے تو خاموش ہو گئی۔
نبیل کو راضی کر لیا کہ وہ صبح آن کے ساتھ جایا کرے گی۔ البتہ واپسی کا کوئی زیادہ مسئلہ نہیں تھا۔ کیونکہ کافی
کافی لڑکیاں نکلتی تھیں۔

یوں کچھ دنوں میں وہ سیٹ ہو گئی تھی کہ کسی دن نبیل دیر کرتے تو وہ صبح بھی خود ہی نکل جاتی۔ ان دنوں
بڑھنے کے علاوہ مزید کچھ کرنے کی دھن سوار ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو بالکل آسیہ کی طرز پر سوچنے
کہ اس کی زندگی بھی ایسی ہی ہوگی جیسی اس کی ماں نے گزارا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ
جائے۔ اپنی اس خواہش کا اظہار اس نے نبیل کے سامنے کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹالا تھا کہ پہلے بی بی اے
سوچنا۔

”وہ تو میں کر رہی رہی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر کوئی کورس کر لوں تو کیا برا ہے۔“
”برا تو کوئی نہیں ہے لیکن تمہیں جلدی کیا ہے۔ بہت دقت ہے تمہارے پاس۔ بی بی اے کے بعد ایم اے

نہارے لیے بہتر ہی ہے کہ ایم اے میں پوزیشن لاکر لیکچر شپ کے لیے اپلائی کرو۔“
ہل نے بہت اچھا مشورہ دیا تھا۔ جو کہ اس وقت تو اسے بالکل پسند نہیں آیا تھا لیکن اب میڈم عاصمہ کو دیکھ
بہ صرف نبیل سے اتفاق کر رہی تھی بلکہ اندر سے اپنی پرورش ہو گئی تھی کہ دل چاہ رہا تھا جلدی جلدی
بہ چلا لگتی ہوئی میڈم عاصمہ جیسی بن جائے۔
”نبی! باری ہیں میڈم عاصمہ! اللہ اگر نبیل بھائی ماں جائیں تو میں کموں گی ان سے بلکہ مہاراجہ سے بات کروں
نبی۔“

ایک خوش کن تصور لیے جانے لیا کچھ سوچتی آ رہی تھی کہ قریب گاڑی رکنے کے ساتھ ہوں دروازہ کھلا کہ
راستہ رک گیا اور اس سے پہلے کہ وہ پیچھے ہٹ کر کنارے سے نکلتی، دوسری طرف سے نکل کر علی جہاں گئے
کے سامنے آ گیا۔

”السلام علیکم۔“
”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔
”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔
”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔

”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔
”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔
”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔

”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔
”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔
”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔

”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔
”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔
”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔

”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔
”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔
”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔

”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔
”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔
”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔

”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔
”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔
”نہ۔“ وہ نہ صرف گھبرائی بلکہ خوفزدہ بھی ہو گئی تھی۔

تاگواری اور غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔

”کم آن یا رایہ ضروری تو نہیں ہے کہ جیسا ہم سوچیں، چاہیں ویسا ہی ہو۔ کبھی کبھی۔“ وہ ٹرے نیچے بڑے دلکش انداز میں کہتا ہوا اس کی طرف آنے لگا تھا کہ وہ ایک دم حرکت میں آگئی اور کارنر سے کانچ کاغذ اٹھا کر اسے کارنر کے کنارے پر دے مارا اور اس تیزی سے لوٹے کانچ اپنی مٹھی میں بھر کر بولی تھی۔

”شاہ علی جگنیر! اگر آپ نے مزید ایک قدم بھی میری طرف بڑھایا تو میں یہ سارے کانچ اپنے مٹھے میں اتار لوں گی۔“

علی جگنیر کے قدم وہیں رک گئے تھے۔



اس کی بند مٹھی سے قطرہ قطرہ لہو ٹپکنے لگا تھا۔ ہتھیلی میں کانچ چبھ رہے تھے۔ تکلیف بھی پوری تھی یہ وہ اس طرح کھڑی تھی۔ بہت چونکا۔

علی جگنیر اس کے خطرناک تیوروں کے ساتھ ارادے کی مضبوطی سے خائف ہو گیا تھا۔ یہ ہرگز وہی تھی جو ذرا سا تیز بولنے سے سہم جاتی تھی اور اس کی اس تبدیلی کا سبب خواہ کچھ بھی ہو وہ اس وقت یہ سب سے قاصر تھا۔ اس کا ذہن صرف اس صورت حال پر قابو پانے کی سوچنے لگا تھا۔

”دیکھو، تمہارا ہاتھ زخمی ہو رہا ہے۔ پھینکیو یہ سب۔“ وہ اس کی لہو ٹپکاتی مٹھی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”نہیں آپ ہٹ جائیں سامنے سے اور جب تک میں باہر نہ نکل جاؤں آپ اس کمرے سے نہیں گے۔“ وہ دھیرے دھیرے قدم آگے بڑھتا ہوا بولنے لگی۔

”رکوصاحت! میں وعدہ کرتا ہوں۔ جب تک تم نہیں چاہو گی میں تم پر کوئی حق نہیں جتاؤں گا۔ میرا انتہا اور اس طرح مت جاؤ۔“

”اعتبار! وہ تلخی سے کہہ کر ہونٹ بھیج گئی۔

”اگوا! میں کیسے سمجھاؤں تمہیں۔ سنو تمہیں خود اپنے آپ پر تو بھروسہ ہے نا۔ پھر کیوں ڈرتی ہو؟“

علی جگنیر نے زچ ہو کر کہا پھر ایک دم جھپٹ کر اس کی کلائی تمام ہلی تو اس کے منہ سے بے ساختہ چنگا اور دوسرے پل پورا زور لگا کر اس کی گرفت سے کلائی چھڑانے کی سعی کرنے لگی۔

”پاگل مت بنو صبا! اپنا ہاتھ دیکھو۔“

علی جگنیر نے مجبور ہو کر اسے بیڈ پر دھکیل دیا اور اس کا بازو گھٹنے کے نیچے دبا کر بہت احتیاط سے اس کی بند کھولی تو ایک لٹخہ کو وہ خود بھی چکر اٹھا تھا۔ کتنے کانچ اس کی ہتھیلی میں اندر تک چلے گئے تھے۔

”خیر وار! ہلنا نہیں۔“ وہ اسے دیکھ کر تیز لہجے میں بولا تو اس نے دوسرا بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا کیونکہ یہ تھی کہ اب اس کی کوئی بھی کوشش نہ صرف بے کار ہوگی بلکہ اسے مجبور اور بے بس بھی بنا کر رکھ دے گی۔

نہیں چاہتی تھی۔

وہ دوبارہ اس کے ہاتھ کی طرف متوجہ ہوا اور بہت آرام و احتیاط سے ایک ایک کانچ نکالنے لگا۔ گاہے گاہے اس پر بھی نظر ڈال لیتا جو نکلا ہونٹ و انٹوں میں دبائے بہت مضبوط کر رہی تھی۔ پھر بھی کسی دقت اس کے سامنے نہ آئی۔

”چلو آج یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تم کتنی بہادر ہو۔“ وہ آخری کانچ نکال کر اٹھتے ہوئے بولا۔ پھر دوسرے کمرے سے فرسٹ ایڈ باکس اٹھا کر لایا اور دوبارہ اسی جگہ بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

”جو کانچ مجھے نظر آئے وہ میں نے نکال دیئے ہیں اور اب خون صاف کر کے ٹیوب بھی لگا دوں گا لیکن ذرا احتیاط کر لینا آئی میں ڈاکٹر کو دکھانا ضروری ہے۔ کو تو ابھی لے چلوں۔“

”وہ بس ایک لفظ کہہ کر پھر ہونٹ بھیج گئی۔ جبکہ آنکھوں سے بازو بھی نہیں ہٹایا تھا۔

پاپائی ماما کو دکھانا۔ ویسے کیا ہوگی ان سے؟“ دوسری بات پر وہ خودی منظور ہو کر مسکرایا تھا۔

بولی میں اسپرٹ لگا کر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ صاف کیا اس کے بعد ٹیوب پھینکا کر ہاتھ دھونے کے لیے بیڈ میں چلا گیا تو اس نے پہلے آنکھوں سے ذرا سا بازو ہٹا کر دیکھا اور اسے موندتے پا کر فوراً ”اٹھ کر بیٹھی تھی۔“

”اٹھ کر بیٹھی تھی۔“ وہ ہاتھ صاف کرتا ہوا آگیا اور بہت انجان بن کر بولا۔

”ن گھر جاؤں گی۔“ وہ کہتی ہوئی بیڈ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔

”میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ لیکن اس طرح جانے بھی نہیں دوں گا۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

”ماہ طلب؟“ وہ تڑخ کر بولی۔

”خود جاؤ آرام سے یا چلو پہلے کھانا کھالیں۔ اس کے بعد بات کریں گے۔“

”مجھے نہیں کھانا اور نہ میں آپ کی کوئی بات سنوں گی۔“ اس کے لہجے میں ضد اور خفگی تھی۔

”نویہ طے ہے کہ میں اپنی بات کے بغیر تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ آگے تمہاری مرضی۔ آج جانا چاہو یا چار۔“ وہ ہنوز اسی سنجیدگی سے کہتا ہوا آرام سے صوفے پر جا بیٹھا اور نیبل سے مسکرت اٹھا کر سگالنے لگا تو وہ

”طلب سمجھ کر رہی طرح سلگ کر بولی۔

”بالیا بات کہنی ہے آپ کو؟“

”ن طرح نہیں۔ یہاں آکر بیٹھو۔“ اس نے اطمینان سے اپنے برابر اشارہ کیا تو وہ کچھ دیر تک خستہ گیس

”اسے اسے دیکھتی رہی پھر اس صوفے کے دوسرے کنارے پر خاصے ٹکلف سے بیٹھتے ہوئے استراخیہ انداز

”پ کیا سمجھتے ہیں۔ جو آپ کہیں گے میں یقیناً کر لوں گی۔“

”ن کے لیے میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ تم صرف سچائی سن لو اس کے بعد جو تمہارا دل چاہے کرتا۔“ وہ

”پ سے بڑی سچائی یہ ہے کہ آپ شاہ جگنیر حیات کے بیٹے ہیں اور آپ نے مجھ سے اس حقیقت کو

”رف اس خوف سے کہ کہیں میں تمہیں کھونہ دھل۔“ جس طرح وہ فوراً بولی تھی۔ اس طرف سے بھی

”اب آیا تھا۔ پھر قدرے رک کر کہنے لگا۔

”بہت بعد کی بات ہے۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں دیکھا۔ پسند کیا اور اپنا نہ کا فیصلہ بھی کر لیا تھا اور اس

”ن مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ڈاکٹر آسیہ کی بیٹی ہو جس روز تم گلدان کے پیسے دینے یہاں آئی تھیں اگر

”وہ تو تو میں بابا جان موجود تھے۔ ان کے ساتھ باتوں میں تم نے انہیں بتایا تھا کہ تم شاہ سکندر حیات کی بیٹی

”ن مارا کھیل وہیں سے شروع ہوا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں اس کھیل میں شامل ہی نہیں تھا لیکن میں

”ن میں تھا۔ اس لیے اس تمام عرصے میں بار بار میں نے سوچا کہ تمہیں ساری حقیقت بتا دوں لیکن تمہاری

”ن میں نے مجبوراً خود کو باز رکھا کیونکہ تم میں اپنے بارے میں سوچنے اور فیصلے کرنے کی جرات ہی

”ن میں اس خفیہ یا خامی سے تم خود بھی اچھی طرح آگاہ ہو۔ پھر بتاؤ میں خاموش نہ رہتا تو کیا کرتا۔“ وہ کچھ دیر

”ن خاموش ہو گیا کہ شاید وہ بولے گی لیکن وہ کچھ گم صم سی بیٹھی تھی۔

”ن میں اس لیے محبت سے دستبردار ہونا آسان ہے اس لیے اسے اختیارات تم نے اپنے ہیوں کو سوچ

”ن اسے بولنے پر آمادہ نہ دیکھ کر وہ مزید گویا ہوا تھا۔ یہ کوئی قابل خیرات نہیں ہے صبا! اس لیے کہ ہمارے

ہیں۔ اس میں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ کانچ چھ گئے تھے۔“
 نبیل بیٹا! میرا پاس لاؤ۔“ آسیہ اس کی ہتھیلی کو انگلی سے چھو کر دیکھ رہی تھی ایک دو جگہ کانچ کی چھین
 بس ہوئی تو نبیل کو مخاطب کر کے بولی۔
 نبیل پاس لے آئے پھر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولے۔
 ”کم از کم فون تو کر دیتیں۔“

”مجھے ہوش نہیں تھا اور جب ہوش آیا تو فوراً ”چل پڑی۔“ وہ نبیل کی طرف دیکھ بغیر بولی۔ کیونکہ جانتی تھی
 وہ اس کا جھوٹ فوراً ”کچل لیتے ہیں۔“
 ”کہاں ہوا تھا ایک سیل فون؟“ آسیہ نے پاس میں سے کاشن اور بینڈنچ نکالتے ہوئے پوچھا تو وہ اندر رہی اندر
 بان ہو کر کہنے لگی۔

”کانچ کے پاس اور اچھا ہوا کچھ کانچ فیلو ساتھ تھیں اور ان کا گھر بھی قریب تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئیں۔“
 ”بزدلوں سے بچنے کی خاطر دو سرا ہاتھ پیٹ پر رکھ کر بولی۔“ مجھے بھوک بہت لگ رہی ہے۔ آپ نے کھانا کھا
 ”ہاں! نبیل بوا سے کہو اس کے لیے کھانا گرم کر دیں۔“

آسیہ نے اسے جواب دے کر نبیل سے کہا پھر جلدی جلدی اس کے ہاتھ پر بینڈنچ کرنے لگی جب تک یہ کام
 لاہوا تب تک ادھر کھانا بھی گرم ہو گیا تھا اور اس ہانے اسے اچھے کاموں پر مل گیا۔ وہاں اس کا ہاتھ زخمی ہوا تھا اس
 ہاتھ کا ہاتھ سے کھانے میں اسے کچھ دیر لگی اور کچھ اس نے جان بوجھ کر دیر لگائی تاکہ آسیہ کلینک کے لیے
 جانے کا پانچ تو بج رہے تھے۔ نبیل بھی اس وقت یونٹن کے لیے جاتے تھے۔ یوں ان دونوں کے جانے سے
 طرح سے اس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ جس پر وہ شکر کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی اور ان چند گھنٹوں میں جو
 پیش آیا اسے پہلے مرحلے سے سوچنے لگی تو نہیں اس کا دل خوشنوار انداز میں دھڑکا اور کہیں سہم سا گیا۔ گویا
 ملائکات تھیں۔ جنہیں سوچتے ہوئے اس کی آنکھ لگ گئی۔ شاید تھکن کے باعث ورنہ یہ کوئی سوئے کا وقت
 نہ تھا۔ کچھ دیر میں مغرب کی آذان ہونے والی تھی اور پتا نہیں بوانے اسے نماز کے لیے اٹھایا کہ نہیں وہ اٹھ
 نبیل کے اٹھانے پر اٹھی تھی۔

اس وقت سوئے کی کیا تک ہے۔ بقیہ رات کیا جائے گا پروگرام ہے۔“ نبیل نے نوکتے ہوئے کہا تو وہ ہاتھوں
 الٹھیک کرتے ہوئے بولی۔
 ”نہیں کیسے سو گئی۔“ ماما آئیں کیا؟“
 ”نہیں ابھی اٹھ جائے ہیں۔ جاؤ منہ دھو کر آؤ لیکن تمہارا تو ہاتھ۔“
 ”شکر ہے دو سرا ہاتھ سلامت ہے۔“ وہ کہتی ہوئی اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو نبیل کو
 بل پر تھمرا اذکر دیکھ کر پوچھنے لگی۔
 ”اب آپ سو رہے ہیں؟“

”نہیں۔“ نبیل اپنے پیچھے کمرے کی طرف سر ہٹے ہوئے بیٹھ۔ ”تمہارے ہاتھ میں تکلیف تو نہیں ہے؟“
 ”نہیں تو لیکن زیادہ نہیں ہے۔“ اس نے کہا اور پھر یہ سوچ کر کہ جب وہ سب جانتے ہیں تو انہیں یہ واقعہ بھی بتا
 ہے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔
 ”میرا ایک سیل فون تھا۔“ وہ علی جہانگیر ہیں نا وہ راستے میں سے مجھے اپنے گھر لے گئے تھے۔“
 ”اس کی پہلی بات پر متوجہ ہوئے تھے اور دوسری بات پر ان کی پیشانی پر لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔ جنہیں
 علاوہ صرف خائف ہوئی بلکہ اپنی حماقت کا بھی شدت سے احساس ہونے لگا کہ اب اپنے ہاتھ زخمی ہونے کا
 پیش کرے۔“

ہوں کے پیش نظر ہماری بہتری نہیں ہے بلکہ اپنا ہستی میں وہ ایک دوسرے کو بچاؤ کھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔
 ہم دونوں تو ان کی بساط پر محض مہرے بن کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے جذبات ہمارے احساسات ہماری محبت ہمارے
 کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ وہ صرف اپنا کھیل کھیل رہے ہیں۔ جس میں ایک جیتے گا دوسرا ہارے گا۔ پوچھنا
 اپنی جیت کی خوشی میں اور ہارنے والا اپنی ہار کے غم میں یہ بھی نہیں سوچے گا کہ اس میں ہم دونوں کا کیا نقصان
 ہوا۔ ان باتوں سے میرا مقصد تمہیں تمہارے ہوں کے خلاف اکسانا نہیں ہے صبا میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم
 تماشا کی مت بنو۔ تمہاری ممانہ کو یہ خدشہ ہے تاکہ کہیں ان کی کہانی نہ دہرائی جائے تو اس کے لیے وہ مجھ سے
 مرضی کی شرائط طے کر سکتی ہیں۔ تم انہیں بتاؤ کہ تم مجھ سے۔“
 وہ ایک دم خاموش ہو گیا پھر گہری سانس کے ساتھ اپنے آپ سے بولا تھا۔
 ”چاہتیں! تمہیں مجھ سے محبت ہے بھی کہ نہیں۔“
 ”محبت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جائز ناجائز کا فرق ہی بھلا دیا جائے۔“ وہ جن سوچوں میں تھی ان ہی میں گر
 کر بولی تھی۔

”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن خدا کے لیے تم میرے بارے میں ایسا مت سوچو۔ میں
 دھاندلی میں شریک نہیں ہوں۔ اگر ہوتا تو اس وقت تم یہاں نہیں شاہ پور میں ہوتیں۔“ وہ اس کے ایک تھ
 زنج ہو گیا تھا اور وہ شاہ پور کے نام سے اچھل پڑی۔
 ”آپ نے جو کتنا کھانا کھا لیا اب مجھے جانے دیں۔“
 ”مائی گاڈ! اتنی دیر سے میں کیا صرف بکواس کر رہا تھا۔ کم از کم اس پر کچھ تبصرہ تو کر دیا سوچنے کا ہی کہہ دو۔“
 ”جہانگیر نے بڑی آس سے اسے دیکھا تو وہ یہاں سے نکلنے کی جلدی میں اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

”ہوں! سوچوں کی ضرور۔“
 ”گھر! پھر مجھے کسے پتا چلے گا کہ تم نے کیا سوچا ہے۔“
 ”میں فون کروں گی۔“ وہ نظریں چرا کر بولی۔
 ”اچھی بات ہے۔ میں انتظار کروں گا اور ہاں جاؤ گی کیسے۔ میں چھوڑ آؤں؟“ اس نے بڑے سادہ سے انداز
 آفر کی تھی۔
 ”نہیں! میں جلی جاؤں گی۔ میرا ایک شاید آپ کی گاڑی میں ہے۔“ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”چلو۔“ اس نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تو وہ جلدی سے باہر نکل آئی۔ پھر اس سے بیک لیتے ہوئے
 سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔
 ”میری کیسی ہے؟“

”بالکل ٹھیک اور بہت خوش۔“ وہ جانے کس خیال کے تحت مسکرایا تھا۔
 ”میں چلتی ہوں۔“ وہ اس کی مسکراہٹ پر عجیب سا محسوس کرتی ہوئی فوراً ”گیت پار کر آئی تھی۔“

♥ ♥ ♥ ♥
 جب وہ گھر میں داخل ہوئی آسیہ اور نبیل پریشانی سے منہل رہے تھے کیونکہ اسے کبھی اتنی دیر نہیں ہوئی
 اسے خود بھی احساس تھا اور اپنے طور پر انہیں مطمئن کرنے کے لیے اس نے تمام راستہ بہت کچھ سوچا
 بھی آسیہ کو دیکھتے ہی وہ شیشا گئی۔ اس پر آسیہ کا پوچھنا۔
 ”کہاں رہ گئی تھیں؟“
 ”وہ ماما! ایک سیل فون تھا۔ یہ میرا ہاتھ دیکھیں۔“ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ سامنے کر دیا۔
 ”آسیہ نرم پڑ گئی اور فوراً ”اس کی کلائی تھام لی۔“
 ”کیسے ہوا اور کہیں جڑت تو نہیں آئی؟“

”پھر کیا اس نے؟“ نیل نے اس کی مشکل سمجھ کر بات آگے بڑھائی۔

”اپنی صفائی پیش کر رہے تھے اور یہ کہ مجھے ان کا اعتبار کرنا چاہیے وہ میرے ساتھ فیئر ہیں۔“ وہ سر جھکائے رک کر بولی رہی تھی۔

”تم نے کر لیا اس کا اعتبار؟“ نیل کا لہجہ سادہ تھا لیکن نظریں بے حد جھپٹی ہوئیں۔ جو اسے اپنا دوست سمجھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

”نہیں۔ جب میرا اس معاملے سے کوئی تعلق ہی نہیں تو پھر میرے اعتبار کرنے نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”ہاں تمہارا کیا تعلق؟ تم نے تو صرف نکاح تانے پر دستخط کیے ہیں۔ باقی کام دوسرے کریں گے۔“ نیل اس کی بات پر تپ کر بولی تو وہ گھبرا کر انہیں دیکھنے لگی۔

”کونسا مطلب ہے آپ کا۔“

”کوئی مطلب نہیں۔ چلو جاؤ بوا کے ساتھ کھانا لگواؤ۔ پھوپھو آنے والی ہوں گی۔“ نیل اس وقت اس کے ساتھ مزید مغز ماری نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے ڈانٹ کر اٹھادیا۔

”ہمارا رض کیوں ہو رہے ہیں۔ ایک تو میں نے آپ کو سچ بات بتادی۔“ وہ منہ ہچکلا کر بولی۔

”بہت احسان کیا مجھ پر ہونہ۔“ نیل سر جھٹک کر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ ان سے پہلے کمرے سے نکل آئی۔

پھر کھانا لگنے تک آسیہ بھی آنکلی تھی اور نیل پر بیٹھتے ہوئے پہلے اس کے ہاتھ کی بابت پوچھا ساتھ احتیاطاً تاکید بھی کی۔ اس کے بعد نیل کو دیکھ کر کہنے لگی۔

”خامسے گھرے زخم آئے ہیں اور یہ شکر ہے کہ کوئی نس نہیں کٹی درنہ بہت خون جاتا۔“

نیل بس ہوں کر کے رہ گئے جبکہ نظریں اس کے ہاتھ کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

”مما! کھانا کھائیں نا؟“ اس نے اپنی طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے آسیہ کو مخاطب کر کے سالن کا ڈور کاٹ کر سامنے کھڑا کر دیا اور بواں اپنی پلیٹ پر جھک گئی جیسے بہت بھوک لگی ہو۔ اصل میں نیل کی نظروں سے غائب ہو رہی تھی اور یہ دھڑکا بھی لگ گیا تھا کہ کہیں بے خیالی میں ان کے منہ سے کوئی بات نہ نکل جائے اور بے خیالی میں تو نہیں بہت سوچ کر وہ آسیہ کو متوجہ کر کے کہنے لگی۔

”پھوپھو! کل سے صبا کالج نہیں جائے گی۔“

”ہاں مینا! جب تک اس کا ہاتھ۔“ آسیہ جو سمجھی اس کے مطابق اسی قدر کہتا تھا کہ وہ بول پڑے۔

”میں ہاتھ کی وجہ سے نہیں کہہ رہا پھوپھو! ہاتھ تو انشاء اللہ جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“

”پھر؟“ آسیہ کھانے سے ہاتھ روک کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

”پھر یہ کہ جب تک شاہ پور والوں کے ساتھ کوئی معاملہ طے نہیں ہو جاتا تو کوئی فیصلہ تب تک صبا کا باہر ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ ان کا کوئی بھروسہ انہیں کسی دن راستے میں سے اسے بھی لے گئے تو ہم۔“

نیل قصداً بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہو گئے تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ جانے آسیہ کیا کر دیتی ہے۔

”ہوں۔ ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔“ آسیہ خاصی تاخیر سے سوچ انداز میں بولی تھی۔ ”شاہ پور والے بہت

جھکنڈوں پر اتر آئے ہیں اور میں اب تک خاموش اس لیے ہوں کہ مدعو کو اپنے باپ کے پاس جانے کا بہت

تھا۔ اس کا شوق پورا ہو جائے پھر میں دیکھتی ہوں وہ کیسے وہاں رہتی ہے اور صبا کو کیسے کا تو سوال ہی پیدا

ہوتا۔“

اس نے بے اختیار سر اٹھا کر آسیہ کو دیکھا تھا پھر فوراً وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ تو کچھ دیر بعد

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس بات کو محسوس کر رہی ہے۔ آسیہ نے کوئی نئی بات نہیں کی تھی اور اب

ابھی سوچتی رہی تھی۔ بلکہ نیل سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر آسیہ نے اس کی رضی کا سوچا تو وہ زہر

لے لگی پھر اب چانک اس بات سے اس کا دل کیوں بے چین ہو گیا تھا۔

نیں یہ تک وہ ادھر سے ادھر شلتی رہی۔ لیکن دل کی بے چینی کسی طرح کم نہیں ہو رہی تھی۔ پھر اسے نیل پر

لے لگا کہ انہوں نے اس کے کالج نہ جانے کی بات کیوں کی تھی جانیئر کو اگر اسے لے جانا ہو تو آج ہی شاہ پور

آہ۔ وہ تو محض مجھے۔

نیلہ میں کیا سوچنے لگی۔ ”ایک دم سے احساس ہونے پر وہ خود کو سرزنش کرنے لگی۔

کی جانیئر کا اعتبار کر کے کیا میں مسماسے لڑ سکتی ہوں۔ ہرگز نہیں اور وہ شاید یہی چاہتا ہے اور میں کیا کروں‘

اعتبار کر بھی لوں تب بھی ممما کو تو دکھ نہیں دے سکتی۔“ وہ بہت دکھ سے سوچ رہی تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥

کمرے سے نکل کر بالکونی میں آکھڑی ہوئی تھی اور باؤنڈری وال سے آگے دوڑ تک پھیلے کھیتوں کے درمیان

زیریں ہی کسی سڑک کو دیکھنے لگی جو جانے کہاں تک جاتی تھی۔ کھیتوں کی حد ختم ہونے کے بعد یقیناً کسی

ہوئی ہوگی۔ وہ اس سمت کے بارے میں غور کرنے لگی کیونکہ رات اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی دن موقع پا کر

نہ غاموشی سے یہاں سے نکل جائے گی اور اس کے لیے اسے راستوں سے آگاہ ہونا ضروری تھا۔

اس کی طرح میں کراچی پہنچ جاؤں۔“ وہ الجھتی ہوئی سوچ رہی تھی تب ہی کمرے میں آہٹ ہونے سے وہ

بڑھو نکلی۔ بھڑکائی سے اندر بھاٹکا اور مراں کو دیکھ کر مطمئن سی ہو کر کمرے میں آتے ہوئے پوچھا۔

”بات ہے؟“

مٹائی لٹی پی۔ جی۔“ میراں ہاتھ میں براسا کپڑا لیے اس کی اجازت کی منتظر تھی۔

”بات کرو۔“ وہ بے نیازی سے صوفے پر جا بیٹھی اور اسے ایک ایک چیز کو رکڑتے ہوئے دیکھنے لگی۔ کچھ دیر

سایک خیال کے تحت اسے متوجہ کر کے پوچھنے لگی۔

”مراں تم کہاں رہتی ہو؟“

”ای“ (ادھری) مراں کے جواب سے وہ جھنجھلا گئی۔

”مطلب ہے تمہارا گھر کہاں ہے؟“

”جے جو نو کروں کے گھر ہیں اور۔“ ”مراں نے سیدھا سادا جواب دیا۔

”بسے ہو یہاں۔ اس سے پہلے کہاں تھیں؟“

”یہاں میں تو جی پیدا ہی اور ہوئی۔ میری ہاں بھی۔“

”تمہاری نانی بھی اور تمہاری دادی بھی سب ادھری پیدا ہوئیں۔“ وہ سخت مایوس ہو کر بولنے لگی تھی۔

”نانا کف سی ہو گئی۔

”انہو تم کبھی شاہ پور سے باہر بھی گئی ہو۔ میرا مطلب ہے اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں۔“ اس بار اس نے

کے سالن میں پوچھا تھا جیسے ابھی بھی جواب نفی میں آئے گا۔

”نہاں لی جی۔ ایک بار ابانجھے چاچا کے گھر لے گیا تھا۔“ ”مراں نے اس کی توقع کے خلاف جواب دے کر

سارک دیا۔

”تمہارا چاچا کہاں رہتا ہے؟“

”نہ۔“ اس نے سوچتے ہوئے انداز میں دہرایا پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔ ”کیسے گئی تھیں۔ ٹرین میں؟“

”نہی۔ بس میں بہت مزہ کیا تھا۔“

”نہاں ہو گا یہ بتاؤ بس کہاں سے جاتی ہے؟“ وہ فوراً اپنے مطلب پر آگئی۔

”جانتے نہیں جی۔ مجھے تو ابالے گیا تھا۔“ مہراں نے اس بار لا علمی کا اظہار بہت مسکین سی شکل بنا کر کیا۔ تو وانت پتھر کر بولی۔

”تو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“

”وہ جی صفائی۔“

”کوئی صفائی وفاقی نہیں کرنی۔“ وہ غصے سے کھڑی ہوئی تو مہراں نے بھاگ جانے ہی میں غایت سمجھی۔

”بڑی آئی صفائی کرنے والی ہونہ اور یہ میں کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہوں۔ جب جانا ہو گا چلی جاؤں گی۔ کوئی روک سکتا ہے مجھے روک کر تو دکھائے کوئی۔ میں صبا نہیں ہوں جو رعب میں آجاؤں گی۔ میں تو تین تین کر ساری حویلی سربراٹھانوں کی ڈرتی نہیں ہوں میں کسی سے۔“

وہ غصے سے تلملاتی ہوئی ادھر سے ادھر مٹکنے کے ساتھ اپنے آپ بولے جاری تھی۔

”پاپا آجائیں۔“ لیکن نہیں وہ تو بابا جان کے سامنے کچھ بول ہی نہیں سکتے، میں خود بات کرتی ہوں۔ ابھی اس وقت صاف کہہ دوں گی کہ اب میرا دل نہیں لگتا۔ مجھے واپس جانا ہے۔“ وہ ایک دم سے فیصلہ کر کے اس وقت دوپٹہ اٹھا کر شانوں پر پھیلائی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔

لاؤنج میں بی بی جان بڑی سو کے ساتھ جانے کس مسئلے پر بات کر رہی تھیں اسے دیکھ کر انہوں نے اپنی بات روک دی اور اسے پاس بلایا لیکن اس نے فاصلے پر ہی رک کر تجلّت میں پوچھا۔

”بابا جان کیسے کوئی مہمان تو نہیں ہے۔“

”نہیں۔ لیکن شاید وہ ہمیں جا رہے ہیں۔“ بی بی جان نے کہا۔

”مہم بھی گئے تو ہمیں نا۔“ وہ اسی غلّت میں کبھی ہوئی تیز قدموں سے چل پڑی اور بابا جان کے کمرے کے پار رک کر پہلے دستک دی۔ اور ان کا جواب آنے پر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”السلام علیکم بابا جان!“

”جیتی رہو۔“ بابا جان نے اونچا شملہ اپنے سر پر جماتے ہوئے اسے دیکھا تو وہ خاصی بے نیازی سے آگے بڑھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کہیں جا رہے ہیں؟“

”ہوں۔“ جواب میں انہوں نے نیکارا بھرا وہ بھی بادل خواستہ کیونکہ انہیں اپنے معمولات سے متعلق بالکل پسند نہیں تھے نہ کسی کو اجازت تھی اور وہ ان کی ناگواری محسوس کرنے کے باوجود بے ساختہ بولی۔

”میں بھی جا رہی ہوں۔“

”کہاں؟“ بابا جان کا اپنی اسٹک کی طرف بڑھتا ہاتھ رک گیا۔

”کراچی“ ایک دو دن مہما کیس رہوں گی پھر اسلام آباد چلی جاؤں گی کیونکہ میرے کالج بہت حرج ہوا۔ آپ کسی سے کہیں مجھے چھوڑ آئے۔“ وہ بظاہر بڑے آرام سے کہتی ہوئی صوفے میں دھس گئی۔

”یہ اچانک تم نے جانے کا پروگرام کیسے بنالیا۔“ وہ بغور اسے دیکھ رہے تھے۔

”میرے پروگرام ایسے اچانک ہی بنتے ہیں۔“ وہ بول کر خود ہی ہنسی۔ ”حالانکہ اس روز نیانے بہت اصرار کیا۔“

”سکندر سے ملے بغیر؟“

”میں ان کے ساتھ چلوں لیکن اس وقت میرا موڈ نہیں بنا اور اب میں فوراً جانا چاہتی ہوں۔“

”سکندر سے ملے بغیر؟“

”تو میں کون سا ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔ پھر آجاؤں گی۔“ وہ بھی ان ہی کی اولاد تھی۔ کسی طرف نہ ہونے دے رہی تھی کہ وہ اندر سے مٹتی خائف ہے۔

”وہ تو تھک ہے پھر بھی تم اس طرح نہیں جا سکتیں۔ جب تک سکندر نہ آجائے اور ہم اس کی اجازت ہمیں کسی کے ساتھ نہیں بھیج سکتے۔“ بابا جان نے اسے نالہ کی سعی کی تو وہ حیران ہو کر بولی۔

”اب کو بیلا سے اجازت لینے کی ضرورت ہے؟“

”ہاں نہیں وہ تمہارا باپ ہے۔ ہم سے کہہ سکتا ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر ہم نے تمہیں کیوں جانے دیا نہیں جلدی کیا ہے۔ کل شام تک سکندر آجائے گا تب۔“

”ف نہیں۔ کل شام تو بہت دور ہے۔ میں ابھی جاؤں گی، آپ بیلا سے فون پر بات کر لیں وہ منع نہیں کریں۔“ وہ فوراً بولی تھی۔

”بابا جان کچھ دیر تک پر سوچ انداز میں اسے دیکھتے رہے۔ پھر فون کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

”فک ہے، ہم سکندر سے بات کرتے ہیں۔ تم جب تک تیار ہو کر آؤ۔ ہم خود تمہیں لے کر جائیں گے اور سنو ہے کہو بیور کو ہمارے پاس بھیج دے۔“

”بی بہتر۔“ وہ بمشکل اپنی حیرت اور خوشی چھپا سکی اور فوراً ”ان کے کمرے سے نکل آئی۔ اتفاق سے شاہ تیمور عرف آقا تھا۔ وہ بڑی تجلّت میں اسے بابا جان کا پیغام دے کر ادھر چلی آئی۔ کسی خاص تیاری کی ضرورت نہیں رہا۔ اپنے ساتھ کچھ لے جانا چاہتی تھی۔ بس کپڑے بدل لیے۔ پھر کمرے سے نکلی تو جانے کیا خیال آیا کہ پہلے باہر کیس چل آئی اور اسے خطاب کر کے بولی۔

”آئی، میں جا رہی ہوں۔“

”ہاں؟“ مہراں نے یونہی پوچھ لیا اور نہ اسے کوئی غرض نہیں تھی۔

”راچی اپنی مہما کیس۔ بیلا آئیں تو ان سے کہیے گا میں انہیں فون کرتی رہوں گی۔“

”انشاء کے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ خدا حافظ کہہ کر وہیں سے پلٹ آئی اور نیچے آکر بی بی جان کو اپنے جانے کا حتمی کہ شاہ تیمور آگیا۔

”ہوکن بابا جان انتظار کر رہے ہیں۔“

”جہاں بی جان! میں پھر آؤں گی۔“ وہ کہتی ہوئی بی بی جان کے گلے لگ گئی۔

”مارا اپنا کھر ہے۔“ بی بی جان نے اس کی پیشانی چومی۔ تو وہ ان کے گال پر پیار کر کے شاہ تیمور کے پیچھے باہر نکلے۔

”بابا جان! میں بیٹھ چکے تھے اور اس کے لیے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ان کے برابر بیٹھ گئی تو شاہ تیمور نے

”نہ نہ کیا پھر دوسری طرف سے آکر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی گاڑی اشارت کر دی۔

”نہ نہ تک کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ پھر بابا جان اور شاہ تیمور آپس میں کسی زہنی جھگڑے کے بارے میں

”لے لگے تو اس نے آرام سے سیٹ کی پشت سے سر نکالیا اور اس خیال میں کھو گئی کہ جب وہ گھر پہنچے گی تو

”ماس سے کس طرح ملیں گے اور کیسے کیسے سوال کریں گے؟“ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ طویل مدت کے

”پہری ہو۔ دل چاہ رہا تھا اس فوراً پہنچ جائے پتا نہیں کتنی دیر کا سفر تھا۔

”نہ نہ ایک گھنٹے بعد گاڑی ایک رستہ ہاؤس کے سامنے رکی تو اپنے خیال سے چونک کر وہ نا سمجھی کے عالم میں

”نہ نہ کہتے ہوئے بولی۔

”نہ نہ کی جگہ ہے؟“

”نہ نہ جواب دے بغیر اتر گئے اور شاہ تیمور آکر اس کی طرف دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

”نہ نہ کہ یہاں کچھ لوگوں سے ملنا ہے۔ تب تک چلو! میں تمہیں یہاں کی سیر کرادوں۔ بہت خوب صورت

”نہ نہ کہ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔“

”نہ نہ کہ میں؟“ اس نے اترتے ہوئے پوچھا۔

”نہ نہ کہ میں؟“ شاہ تیمور نے بے نیازی سے جواب دے کر چوکیدار کو پکارا تو ایک لحیم ختم

”نہ نہ کہ میں؟“ شاہ تیمور نے بے نیازی سے جواب دے کر چوکیدار کو پکارا تو ایک لحیم ختم

”نہ نہ کہ میں؟“ شاہ تیمور نے بے نیازی سے جواب دے کر چوکیدار کو پکارا تو ایک لحیم ختم

”نہ نہ کہ میں؟“ شاہ تیمور نے بے نیازی سے جواب دے کر چوکیدار کو پکارا تو ایک لحیم ختم

”نہ نہ کہ میں؟“ شاہ تیمور نے بے نیازی سے جواب دے کر چوکیدار کو پکارا تو ایک لحیم ختم

”جی سائیں سلام بڑے سائیں۔“
 ”اپنی گھر والی سے کہو ہماری پوتی کے لیے کھانے کا عمدہ انتظام کرے اور ذرا جلدی کیونکہ ہمیں اسے شہر
 ہے۔“ باباجان نے چوکیدار سے کہا پھر اسے دیکھ کر بولے۔
 ”بس تھوڑی دیر میں چلتے ہیں۔“
 ”جی! وہ یہی کہہ سکی۔“
 ”تیور! تم پہلے اسے ریسٹ ہاؤس کی سیر کراؤ۔“ باباجان کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ تو وہ ان کے پیچھے
 ہوئے پوچھنے لگی۔

”باباجان کہاں جا رہے ہیں؟“
 ”وہ ادھر جہاں لوگ جمع ہیں۔ وہ سب باباجان کا انتظار کر رہے ہیں چلو ہم اندر چلتے ہیں۔“
 اس نے باباجان کی طرف سے دھیان بٹا کر شاہ تیور کو دیکھا پھر اس کے ساتھ اندر آتے ہوئے پوچھنے لگی۔
 ”یہاں کوئی رہتا بھی ہے؟“
 ”چوکیدار اس کی بیوی اور بچے، ہم لوگ اکثر پککے وغیرہ کے لیے یہیں آتے ہیں۔ ویسے یہ سارا علاقہ سکند
 کی ملکیت ہے۔ یہ ریسٹ ہاؤس بھی انہوں نے ہی بنوایا تھا۔“
 وہ اپنے تئیں اسے بڑی مفید معلومات فراہم کر رہا تھا اور اس انداز سے جیسے وہ بڑی مشتاق ہوگی اور وہ ضرور
 اگر جو اس روز باباجان کی باتیں نہ سن چکی ہوئی تو وہ کہہ رہے تھے۔

”اس سے کہو اگر مدد کی سلامتی چاہتی ہے تو صباحت کو ہمارے حوالے کرے۔“
 اس کے بعد اسے کسی بات سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ابھی بھی بہت بے دلی سے سن رہی تھی۔
 ”تم شاید تھک گئی ہو۔“ اس کی خاموشی محسوس کر کے آخر وہ ٹوک گیا۔
 ”باباجان کب تک فارغ ہو جائیں گے؟“ وہ اس کی بات ان سنی کر گئی۔
 ”یا اللہ! تم تو بہت ہی بور لڑی ہو۔ میں مزید تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ تم مجھو یہاں میں باباجان کو
 آتا ہوں اور کھانے کا بھی پتا کرتا ہوں۔ اگر تیار ہوا تو تھیک ورنہ کراچی جا کر کھا میں گے۔“ وہ اس کی بیڑا
 جھینٹا لیا تھا۔

”میں بھی چلتی ہوں۔“
 ”کوئی ضرورت نہیں۔ باباجان یہیں آئیں گے۔“ وہ قدرے غصے سے کہہ کر زبیرہ اتر گیا۔ وہ کہہ رہا
 پیچھے دیکھتی رہی پھر میز پر نکل آئی دور تک سبز ہی سبز تھا۔ اسے پہلی بار اس منظر میں کشش نظر آئی تو
 اس کا دھیان بٹ گیا۔

”یہ سب میرے باپ کی جاگیر ہے۔ کتنے بڑے آدمی ہیں پیپا۔ کتنے امیر کوئی کمی نہیں۔ چار کیا دس بڑے
 کر سکتے ہیں پھر انہوں نے ماما کو کیوں جھوڑ دیا۔ بے شک انہیں شاہ پور لے کر نہ آتے۔ کہیں اور رکھ سکتے
 ان کے بارے میں باباجان کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ بلکہ ماما کو ساتھ لے کر یہ ملک ہی چھوڑ دیا۔
 کیا لگاؤ ملتا تھا ان کا لیکن شاید۔“

اس کی سوچیں جانے کس سمت بہہ نکلی تھیں کہ عقب سے چوکیدار کی بیوی اسے پکار کر بولی۔
 ”بی بی! کھانا کھا لیں۔“

”جی! وہ چونک کر پوری اس کی طرف گھوم گئی اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
 ”کھانا تیار ہے نیچے آجائیں۔“
 ”چلو۔“ وہ ایک طرح سے انتظار ختم ہونے پر شکر کرتی ہوئی پیپا آئی تو سنگدوم میں ہی نیپیل پر کھانا
 اس نے ہاتھ دھونے کے لیے ادھر ادھر دیکھا تو ایک دم سے باباجان اور شاہ تیور کا خیال آنے پر پوچھنے لگی۔

”باباجان کہاں ہیں؟“

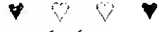
”بڑے سائیں! وہ تو جی چلے گئے۔“ عورت کے جواب سے وہ قدرے تشنگ گئی۔

”کہاں کہاں چلے گئے اور وہ تیور؟“

”پتا نہیں جی! بڑے سائیں اور تیور سائیں دونوں چلے گئے۔ میرے آدمی سے کہہ گئے ہیں آپ کا خیال
 کھ۔ آپ ادھر ہی رہیں گی۔“ عورت اپنے ساتھ سے انداز میں بتا رہی تھی۔

”نہیں۔“ اس کا ذہن بہت تیزی سے سوچنے لگا تھا اور پھر اس نے باہر کی طرف دوڑا لگا دی۔ لیکن آگے گیٹ پر
 دو چوکیدار نے اسے روک لیا تھا۔

”بڑے سائیں کا حکم ہے جب تک وہ نہ کہیں آپ اور سے نہیں جا سکتا۔“



”وہ مدد کو فون تو نہیں آیا؟“ آسیہ نے جاتے جاتے رک کر بظاہر سرسری انداز میں پوچھا تو صباحت اور نیپیل
 یک کر اسے دیکھنے لگے۔

”نہیں ماما! نیپیل کے اشارے پر صباحت نے جواب دیا تھا۔ ”کئی دنوں سے اس نے فون نہیں کیا۔ غالباً“
 لہفتہ ہو گیا ہے۔“

”بہت دل لگ گیا ہے اس کا وہاں۔“ نالائق لڑکی کو اپنی پر دھائی کی بھی فکر نہیں ہے۔ پتا نہیں کیا کرے گی۔“ آسیہ
 نے ناف بھرے انداز میں جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔

”پھوپھو! اگر آپ اجازت دیں تو میں فون کروں مدد کو۔ اس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے۔“ نیپیل نے اپنی
 سے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ فوراً بولی۔

”نہیں یہاں سے کوئی فون نہیں کرے گا۔“

”کیوں پھوپھو! آپ مدد کو سے کیوں بدگمان؟“ وہ خود سے تو نہیں گئی۔

”میں اس سے بدگمان نہیں ہوں۔“ اسے نیپیل کا تو کتنا اچھا نہیں لگا ناگوار ہی چھپا کر بولی تھی۔

”پھر آپ نے اسے اس کے حال پر کیوں چھوڑ دیا ہے بلکہ اس کی مرضی پر۔ کیا وہ اس قابل ہو گئی ہے کہ اچھے
 سے میں تیز کر سکے۔ نہیں پھوپھو! ابھی وہ ہر چھتھی چیز کو سونا سمجھنے والی عمر سے نہیں نکلی۔ ابھی قدم قدم پر اسے
 نہائی کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کہ شاہ پور والے اسے اپنے رنگ میں ڈھال لیں آپ کو اسے وہاں سے
 نکلنے کی ضرورت ہے۔“ نیپیل نے دھیر سے اسے مدد کے احساس دلانے کی سعی کی تو وہ اندر ہی اندر جڑ
 لڑ بولی۔

”میں کیا کروں جب وہ اتنا ہی نہیں چاہتی۔ ایسے میں ہماری کوشش کس کام کی آلتا ہمیں منہ کی کھانی پڑے گی۔
 بڑیہ کہہ دے گی کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں اپنے باپ کے پاس رہنا چاہتی ہے۔“

”وہ ایسا نہیں کہے گی۔“ نیپیل نے جیسے اپنے آپ کو تسلی دی تھی۔

”میرے دکھ سے مسکرائی اور گہری سانس لے کے اندر روک کر کہنے لگی۔

”میرے حال۔ اب مدد کو فون آئے تو تم اس سے پوچھ لیا کہ وہ کیا چاہتی ہے اگر یہاں آنے پر آمادہ ہے تو پھر۔“

”نیپیل بھائی جا کر اسے لے آئیں گے۔“ صباحت درمیان میں بول پڑی۔ پھر کچھ خائف بھی ہو گئی تو وہ اسے
 نے کا خیال چھوڑ کر گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے اور ہاں آج شام واپسی میں بھی دیر ہو جانے کی تم دونوں کھانا کھا لیتا۔“

”نہیں ماما! ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ آپ خواہ گیارہ بجے آئیں۔ کھانا ہم ساتھ کھائیں گے کیوں نیپیل
 صباحت نے کہہ کر نیپیل کا بازو تھام لیا تو وہ بھی اثبات میں سر ہلانے لگی۔

”اگر ایسی بات ہے تو پھر ابھی چائے کے ساتھ کچھ نہ کچھ کھا لیتا۔“ وہ انہیں تاکید کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

”میں اتنی کمزور کبھی نہیں تھی۔ مجھے مدھونے کمزور کر دیا ہے۔“

گاڑی گیٹ سے نکلتے ہی اسے پھر مدیحہ کا خیال آ گیا تھا اور حقیقتاً وہ اس کے لیے بہت پریشان تھی اور بے بس بھی اس لیے اسٹینڈ نہیں لے رہی تھی ورنہ اگر مدیحہ اس کے پاس آنے پر آمادگی ظاہر کرتی تو وہ یوں خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی اور صباحت کے معاملے میں بھی وہ شخص مدیحہ کی وجہ سے چپ کھسی اور چاہتی تھی کہ پہلے شاہ بوروالوں کی طرف سے ہو۔ جنہوں نے اب تک صباحت کے حصول کے لیے جانے کیوں پیش رفت نہیں کی تھی اور اسے کیونکہ رتی برابر بھی کوئی اچھی امید نہیں تھی اس لیے جیسے جیسے دن گزر رہے تھے اس کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا اور ابھی یہ جان کر کہ مدیحہ نے ایک ہفتے سے فون نہیں کیا وہ متوحش بھی ہو گئی تھی گوکہ خود اس نے ایک بار بھی مدیحہ کا فون نہیں سنا تھا پھر بھی اطمینان تھا جو کہ اب اچانک رخصت ہو گیا تھا۔ سارا وقت مرلیضوں کو اینڈ کرنے کے دوران بھی بار بار وہ ہمیشہ کی طرح اسے غیر ذمہ دار اور موڈی کہہ کر خود کو بہلا بھی نہیں رہی تھی۔

”تقریباً“ دس بجے وہ ایک ڈیلیوری کیس سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آئی تو بہت تھک گئی تھی۔ زیادہ ذہن انتشار نہ تھا کیا تھا۔ جو وہ فوراً گھر جانے کی بجائے اپنے اعصاب پر سکون کرنے کی خاطر منہ ہاتھ دھو کر بیٹھ گئی اور ماسی کو بلا کر چائے لانے کا کہا تو وہ اس کے سامنے ٹیبل سے ایک کارڈ اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہو۔

”ہی! یہ آدمی بہت دیر سے بیٹھا ہے۔“
”کون ہے؟“ اس نے کارڈ لے کر اپنی آنکھوں کے سامنے کیا تو اس کے اعصاب مزید تن گئے۔ پیشانی پر ایک ساتھ کئی لکیریں ابھر آئی تھیں۔

”کیا کہوں گی اس سے؟“ ماسی پوچھ رہی تھی۔
اس نے چونک کر ماسی کو دیکھا پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولی تھی۔
”بھج دو اور سونو چائے ابھی مت ملتا۔“
”جی اچھا!“ ماسی چلی گئی تو وہ ایک نظر اپنا جائزہ لے کر سیدھی ہو بیٹھی اور خود کو مصروف ظاہر کرنے کی خاطر اٹھا کر بیڈ پر چلانے لگی۔

”اگلے پل شاہ جہاگیر حیات دروازے میں نمودار ہو کر بولے۔“
”السلام علیکم۔“
وہ سروانجا کر کے براہ راست انہیں دیکھنے لگی۔ بولی کچھ نہیں۔
”امیر آگیا ہوں۔“ شاہ جہاگیر نے ہلکے سے دروازہ ہجا کر اپنے تئیں اسے چونکا تا چاہا لیکن وہ بڑے آرام سے سامنے کر سی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

”تشریف لائیے۔“
”شکر ہے۔“ شاہ جہاگیر آکر بیٹھ گئے۔ تو اس نے پہلے اپنا رستہ واضح پر نظر ڈال کر ایک طرح سے جنابا کے کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے پھر انہیں دیکھ کر بولی۔
”فرمائیے۔ کیسے زحمت کی؟“

”میں صباحت کے سلسلے میں حاضر ہوا ہوں کیا سوچا ہے آپ نے۔“ شاہ جہاگیر نے اس کا نزوٹا انداز ہوئے تہمد کا ارادہ ترک کر دیا۔
وہ اندر تک سلگ گئی تھی۔ دل چاہا اس شخص کو بری طرح بے عزت کر کے نکال باہر کرے۔ لیکن مدیحہ؟
تھا جو اسے بہت ضبط کرنا پڑا پھر بھی جب بولی تو بے میں نصہ تھا۔
”آپ کو صباحت کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس بات سے سروکار کہ میں اس کے

”ناپ بھول رہی ہیں کہ وہ میرے بیٹے علی کی منکوحہ ہے۔“ انہوں نے فاتحانہ انداز میں جنابا تو وہ بھی تنفر

ن میں کچھ نہیں بھولی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ایک بار پہلے بھی آپ میرے باپ کے دروازے پر آئے

بری باتیں دہرانے نہیں آیا۔“ وہ فوراً بولے تھے۔ ”مجھے صرف صباحت کی رخصتی طے کرنی ہے۔“
یہ شاہ جہاگیر حیات! اتنے نادان نہیں ہیں آپ جو میرا جواب نہ جانتے ہوں۔ انسان ایک بار دھوکا
دوہ بھی انجانے میں سمجھے آپ اور اب آپ جاسکتے ہیں۔“ وہ اب مزید ضبط نہیں کر سکتی تھی۔ انہیں
کر خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی تو شاہ جہاگیر اس کی تقلید کرتے ہوئے بولے۔

”ملٹی کر رہی ہیں ڈاکٹر آسیہ۔“
گوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنی چیزیں سمیٹنے میں لگ گئی اور گوکہ شاہ جہاگیر بھی اس کی طرف
افزائی کی امید لے کر نہیں آئے تھے پھر بھی اس کا رویہ انتہائی ہنگ آمیز لگا، بمشکل خود پر ضبط کرنے
لے تھے۔

بال ہے اس وقت آپ تھکی ہوئی ہیں۔ اس لیے میری بات سمجھ نہیں رہے ہیں۔ گھر جا کر آرام سے
رکھو گی فیصلہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ مدیحہ ہمارے بٹنے میں ہے۔“

”لب ہے آپ کا۔“ وہ ایک دم پیچھے تھی۔
”کی سلامتی کے لیے۔“

”اپ جہاگیر حیات!“ وہ کسی طرح خود پر قابو نہیں پاسکی۔ ”آپ مجھے بلیک میل نہیں کر سکتے۔ ناؤ گیٹ
گیر نے چند لمحوں کے لیے رک کر اس کے تپے ہوئے سرخ چہرے کو دیکھا پھر ذرا سے کندھے اچکا کر باہر نکل گئے
پار دو نوں ہاتھ جہاگیر خود کو سہارا دیے کھڑی تھی ان کے جاتے ہی کرسی پر ڈھے گئی اور دونوں ہاتھوں میں
مذہن کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ مزید جسم سے جان بھی نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔
بعد سرسختی کام سے اس کے کمرے میں آئی تو اسے اس حالت میں دیکھ کر پریشان ہو گئی۔
”امیدم؟“

”نہ آواز سن کر بھی کوئی حرکت نہیں کی تو سرسخت جلدی سے جا کر گلو کو زینا کر لے آئی اور اپنے ہاتھ سے گلاس
نٹوں سے لگا دیا۔“

”نٹ لے کر اس نے اپنا سر چیئر کی بیک پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ تب ہی فون کی بیل بج اٹھی۔
لے رہی ہو راتھا کر بھلو کہنا۔ پھر اس سے بولی۔“

”آپ کے گھر سے فون ہے۔“
”خفاقت محسوس کر رہی تھی۔ ذرا سی آنکھیں کھول کر ہلسمز کو دیکھا اور آہستہ آواز میں بولی۔
”میں فارغ نہیں ہوں۔“

”اس کی بات دہرا کر فون بند کر دیا تو اس نے اسے جانے کا اشارہ کر کے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تنہائی
لیکن تنہائی کہاں تھی۔ بند پلوں کے اندر ایک فلم کی چلنے لگی تھی۔ جس میں تسلسل نہیں تھا۔ ماضی
واقعات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ ایسے ہی چہرے اور آوازیں تھیں۔
”ان رکھیں۔ کم از کم بیٹی کے معاملے میں تو میں کوئی کوتاہی نہیں کر سکتا۔ اچھا ہی سوچوں گا اچھا ہی

شاہ سکندر نے کہا تھا اور ان کا اعتبار کر کے ہی اسے یہ دن دیکھنا پڑا تھا کہ دونوں بیٹیوں میں سے ایک کو اپنے ہاتھوں سے سولی چڑھانا تھا اور وہ ٹکس کی طرف سے دل پر پتھر ٹکے۔
”مرد جو صبا۔“
”صبا، جو۔“

بالکل غیر ارادی طور پر وہ انتخاب کرنے لگی تھی کہ ایک دم گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ جسے ہمیشہ سے جاگی ہو۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور پیشانی کے ساتھ ہتھیلیاں بھی پیسنے سے تر ہو گئی تھیں۔
”میرے خدا!“ اس نے دونوں ہاتھوں کو آپس میں ملا کر گڑا پتھر انگلیاں بالوں میں پھنسا کر سر کو زور دے جھٹکے دے کر ایک طرح سے ساری سوچوں سے نجات حاصل کرنے کی سعی کی اور کسی حد تک کامیابی ہوئی۔
گھر کا خیال آیا۔ بارہ بج چکے تھے۔ کھڑی دیکھتے ہی وہ گاڑی کی چابی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ کبھی اس طرح اور اتنا نہیں روئی تھی۔ نہ کبھی کہیں شکست تسلیم کر کے ہتھیار ڈالے تھے۔ اس کے ذرا سی زیادتی پر سارا گھر سربراہ اٹھ اٹھتی تھی اور جب تک اپنی منوا نہیں لیتی جین سے نہیں ہوتی تھی۔ لیکن کون تھا اس کی سننے والا۔ اتنے بڑے ریسٹ ہاؤس میں چوکیدار اس کی بیوی اور دو بیٹے جن پر بیچ بچا کر اہل حاصل نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ بابا جان کے حکم کے غلام تھے اور ان بے بسوں سے بھی بڑھ کر اس پر بے ہوئی تھی جس نے اسے اتار لایا تھا۔ دوسرے شام ہو گئی اور پھر تاریکی کے ساتھ ساتھ خوفناک سناٹا پھیلنے لگا۔ وہ جس کمرے میں بیٹھی تھی اس کی کھلی کھڑکیوں سے دور تک نہیں زندگی کے آثار نظر نہیں آتے تھے، پھیلا ہوا ہونے کے اجالے میں جتنا دلکش تھا اب اتنا ہی خوفناک اس نے چاہا کہ اٹھ کر کھڑکیاں بند کر دے۔
ہمت ہی نہیں ہوئی تو سرگھٹنوں میں چھپا لیا۔

کچھ دیر بعد مٹن آن ہونے کی ہلکی سی آواز کے ساتھ روشنی محسوس ہوئی تب ہی اس نے ڈرتے ڈرتے کیا اور چوکیدار کی بیوی کو دیکھ کر کچھ ڈھارس بندھی تو پوچھنے لگی۔

”کوئی آیا ہے؟“
”نہیں بی بی! اس وقت کون آئے گا۔ آپ یہ کھانا کھا لو۔ دوسرے میں بھی نہیں کھایا۔“ چوکیدار نے اس کے سامنے زرخیز پھر نیچے بیٹھتے ہوئے کہنے لگی۔

”آپ روتی کیوں ہو۔ یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“
”یہ کون سی جگہ ہے؟“ اس نے ان سنی کر کے پوچھا۔
”شاہ سکندر سامیں کی جاگیر ہے۔ آپ پہلے کبھی آرہیں آئیں؟“ اس نے بتا کر پوچھا۔
”نہیں! آپا آتے ہیں یہاں؟“
”کون؟“ وہ سمجھی نہیں۔

”بابا! شاہ سکندر جن کی یہ جاگیر ہے۔ وہ یہاں آتے ہیں؟“ اس نے اپنی بات پر زور دے کر پوچھا۔
”نہیں تو جب سے یہاں ہوں نہیں آئے اس سے پہلے کا پتا نہیں۔ آپ بی بی کھانا بھی کھانا۔“ چوکیدار نے اس کے سامنے کھانا کھانا تو اس نے پانی کا گلاس اٹھا لیا اور ایک گھونٹ لے کر پوچھنے لگی۔

”تم کب سے یہاں ہو اب یہ مت کہہ دینا کہ پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں۔“
”نہیں جی۔ شاید ہو کر اور آئی۔ اس سے پہلے تو بڑے سامیں کی حویلی میں تھی۔ بڑی چہ خدمت کی ہے میں نے اور میری ماں وہ تو ابھی بھی ادھر ہی ہے۔“
”اچھا کون ہے تمہاری ماں؟“ اس نے گلاس رکھ کر کھانا شروع کرتے ہوئے پوچھا۔ اصل میں وہ جانے سے خائف تھی اس لیے بات کو طول دے رہی تھی۔

چراں۔“

پھر وہ مرزا تمہاری بہن ہوئی۔“
”ہاں جی۔ آپ کو کیسے پتا؟“ چوکیدار نے اسے یوں کہنے لگی۔ جیسے پچھنے کی کوشش کر رہی ہو۔
”میں وہیں سے آ رہی ہوں۔“

”جی۔ میں نے تو آپ کو ادھر نہیں دیکھا۔“
”ہاں جی۔ وہ آگیا جی۔“ چوکیدار نے اسے یوں کہنے لگی۔ جیسے پچھنے کی کوشش کر رہی ہو۔
”اور کیا بات کروں۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”اچھا! بتاؤ بابا جان دوبارہ کب آئے کو کہہ گئے ہیں۔“ اس نے فوراً اسے مشکل سے کہا۔
”نہیں جی۔ میرے آدمی کو بتا دو گا پوچھ کر آؤں گا۔“ وہ اٹھنے لگی کہ اس نے روک دیا۔
”نہیں! صبح میں خود معلوم کروں گی اور سنو۔ تم یہیں میرے پاس سونا۔ بے شک اپنے دونوں بچوں کو لے

”اپنے آدمی سے پوچھتی ہوں۔ وہ کہے گا تو آجائوں گی۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے سامنے سے ٹرے اٹھا کر باہر آئی۔

”میرے کسے لوگ ہیں دنیا میں کوئی حکمرانی کے نشے میں چور ہو کر بھی خوش نہیں اور کوئی غلامی میں بھی خوش۔“
خانے کے بعد بدن میں چھ توانائی آگئی تھی اور وہ بھی سوچنے کے قابل ہو گیا تھا البتہ اندر خوف بول کا توں رہا تھا۔ جب ہی چوکیدار نے اس کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگی اور وہ کوئی پندرہ منٹ کے بعد آئی تھی۔ اپنے بچے کو سینے سے لگائے ہوئے۔ اس کے بیدار کے۔ باہر نیچے گدا بچا کر نیچے کو سلا یا اور خود بھی اس کے ساتھ لیٹ بیٹھ کر سوئی۔ ساری کارروائی خاموشی سے دیکھ رہی تھی فوراً پوچھنے لگی۔

”تم سو رہی ہو جی۔“
”نہیں جی۔ مجھے پتا ہے آپ کو ڈر لگ رہا ہے۔ جب تک آپ سو نہیں جاؤ گی میں نہیں سوتی۔“ اس نے لمبی لمبی آنکھیں پونے کوئی ڈر نہیں لگ رہا۔ تم سو جاؤ آرام سے۔“

”ہاں جی۔“
”اس کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔ چچ کر بولی پھر سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ادھر سے ادھر لگی۔“

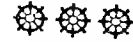
چوکیدار نے جب سادھ لی اور کچھ دیر میں سو بھی گئی تھی۔ اور سونا تو وہ بھی چاہتی تھی، لیکن فینڈ کا کہیں پتا نہ تھا۔ غصے غصے تھک گئی تو لائٹ آف کر کے اپنی جگہ پر آکر لیٹی اور کھڑکی سے ہوتی ہوئی اس کی نظریں آسمان پر جا لگاتے ستاروں میں بیٹھنے لگیں۔ جبکہ ذہن کے درجہوں پر ایسی ہی کتنی قندیلیں جلتے بجھنے لگی

”ان جو لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ سب کی محبتوں کے ساتھ اسے اس کے منفی رویوں کی چھب دکھلا رہے تھے۔“

”ناقصہ! الماری زور سے نہ کرنا کہ ادھر نہیں بیٹھی اپنے کمرے میں اچھل پڑتے۔“
”جو کبھی مہمانوں کے ساتھ تو وہ فوراً شاکی ہو کر، سبکی دیتی۔“
”نہایت پاپ کے پاس چلی جاؤں گی۔“
”ناقصہ! خلاف کر دیتی تھی وہ اپنے ایک چھل سے۔“ کو خدہ صبا تو اس کے سامنے ہاتھ دوڑ کر رو پڑتی

تھی۔
”خدا کے لیے دو! تم شاہ سکندر کا خیال چھوڑ دو۔“
”کیوں؟ کیوں چھوڑ دوں۔ میرا باپ ہے وہ، کتنا ذمہ دار تھا اسے جو نیل کے سمجھانے کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ جو وہ جب بھی موقع ملتا اسے اور صبا کو احساس دلاتے تھے کہ ان دونوں کو صرف اپنی ممانعت کا خیال چاہیے جنہوں نے ان کی خاطر اپنی زندگی تیاگ دی اور میری سچ تھا لیکن اس کے اندر تو جیسے احساسِ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اننا ضد باندھ لیتی۔“

پھر اجمرے ہاؤس شادی کیا کی اس کے دل میں ہر ایک کے خلاف نفرت بھر گئی تھی۔
اف ایک شخص کا بدلہ میں نے کس کس سے نہیں لیا۔ ماما جی، سونیا آبی بھلا ان کا کیا قصور تھا اور ماما جی تک کیا میں نے اس کی آنکھیں یکبارگی پائیوں سے بھر گئیں اور پھر ہر شخص کے ساتھ اپنا رویہ سوچ کر رد رہی تھی۔



صبح جب سورج کی کرنیں براہ راست اس کے چہرے پر پڑیں تب وہ انھی تھی اور منہ ہاتھ دھو کر کمرے نکلنے لگی تھی کہ شاہ تیور کی آواز سن کر رک گئی۔
”لی بی کہاں ہے؟“ وہ چونک کر ارنی سے اس کا پوچھ رہا تھا۔
”سورہی ہیں۔“

”شور تو نہیں مچایا تھا اس نے؟“
”نہیں جی، شور تو نہیں مچایا پر روٹی بہت تھیں۔“ چونک کر ارنی کے جواب پر وہ جزبہ ہونے لگی۔
”کھانا کھایا تھا؟“

”دوپہر میں تو نہیں رات میں کھایا تھا۔“
”اچھا! جاؤ! اٹھاؤ! اسے“ وہ محاکم سے کہہ رہا تھا۔
وہ جلدی سے دروازے کے پاس سے ہٹ کر دو بارہواش روم میں بند ہو گئی اور خود کو اس کا سامنا کرنے کے تیار کرنے لگی۔ رات اس نے اس سب سے نہیں سوچا تھا کہ بابا جان کے اس اقدام پر اسے کیا رد عمل ظاہر چاہیے ابھی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس یہ خیال تھا کہ اسے کمزور نہیں پڑنا اور نہ ہی لڑنا ہے۔ کیونکہ جاز تھی کہ وہ ان کا کچھ نہیں رگڑ سکتی۔
چونکہ ارنی اس کے دروازے پر دستک دے کر جا چکی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ کتنی دیر سوچتی رہی۔ پھر باہر کر آئی تو شاہ تیور کو دیکھتے ہی کھلتی مفسر اہٹ کے ساتھ بولی تھی۔
”ہیلو کزن، کیسے ہو؟“

شاہ تیور غالباً ”کچھ اور سوچے بیٹھا تھا جس جی جان ہو کر دیکھنے لگا۔“
”بابا جان! نہیں آئے؟“ وہ اس کی حیرت سے نظریں چڑا کر اڑھادھڑکھنے لگی۔
”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ شاہ تیور نے اس کی بات ان سنی کر کے پوچھا تو وہ بے اختیار اس کی ٹاٹ متوجہ ہو کر بولی۔

”میری طبیعت کو کیا ہوا؟“
”شریاف جارا رہی تھی، کل تم روتی رہی ہو۔“ وہ اس کے چہرے پر جانے کیا کھوجنے لگا تھا۔
”ہاں، میں بہت روتی۔“ وہ سادگی سے اعتراف کرتے ہوئے بولی۔
”آپ مجھے چھوڑ کر جو چلے گئے تھے۔ اگر کراچی نہیں لے جانا تھا تو صاف منع کر دیتے۔ میں نے وہاں؟“

کوئی اتنی ضد تو نہیں کی تھی خیر چھوڑیں۔ یہ بتائیں اب کیا پروگرام ہے؟“
الغالب تمہیں یہیں رہنا ہے۔“ وہ فوراً ”کہہ گیا پھر فوراً“ ہی وضاحت بھی کرنے لگا۔ ”میرا مطلب ہے تم رہو گئی تھیں اس لیے بابا جان نے پروگرام بنایا کہ تمہیں تمام رقبوں کی سیر کرائی جائے تاکہ تم فریض ہو۔“
”کیا؟ اس کے علاوہ اور کتنے رہتے ہیں۔“ وہ متاثر نظر آنے لگی۔
”ہاں۔ تم پہلے ناشتا کر لو پھر چلتے ہیں۔“ اس نے کہہ کر شریفان کو پکارا اور اس کے آنے پر مدد کے لیے نے کو گماتا وہ بول پڑی۔
پائے ضرور لانا۔ میں نے کل سے چائے نہیں پی۔“ پھر آرام سے بیٹھتے ہوئے شاہ تیور سے بولی ”اور کزن کو لے آتے۔“
”آؤں گا، کل لے آؤں گا۔“ وہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تو اندر کے خوف کے باعث اس نے فوراً ”پوچھا۔“
”مل جا رہے ہیں؟“

”سے دیکھ کر مسکرایا یوں جیسے سمجھ گیا ہو۔“
”میرا مطلب ہے آپ ناشتا نہیں کریں گے؟“ اس نے جزبہ ہو کر بات بنائی۔
”نہیں اگلیتہ چائے پی لوں گا۔“ وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔
یوہر بد شریفان ناشتا لے آئی تو اس نے پہلے چائے بنا کر ایک کپ اسے تھمایا پھر خود ناشتے میں مصروف ہو سنا، ”تم کراچی کیوں جانا چاہتی ہو؟“ قدرے توقف سے شاہ تیور نے اسے مخاطب کر کے پوچھا تو وہ سوچ کر لگی۔
”اصل میں تو مجھے اسلام آباد جانا ہے۔ وہاں میرا کالج ہے۔ کراچی تو بس ایک دو دن رہوں گی۔ کچھ اپنی چیزیں لے کر اور ماما سے یہ پوچھنا ہے کہ وہ صبا کی رخصتی کب کر رہی ہیں۔“
”تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ اسے رخصت کر دیں گی؟“
”گنا تو چاہیے۔“ وہ لا پرواہی سے کہہ کر وہاں سے ہاتھ صاف کرنے لگی پھر چائے کا آخری گھونٹ لے کر فریض سمجھ میں نہیں آتا اس بات کو اتنا مسئلہ کیوں بنایا گیا ہے کیا یہ معاملہ آرام سے بیٹھ کر طے نہیں ہو سکتا؟
”بابا جان کی مرضی وہ جیسے بھی طے کریں۔ یہ ہمارے سوچنے اور سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ چلو۔“ وہ موضوع لے لے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
”تو نہ بابا جان کی مرضی۔“ وہ تنفر سے سوچتی اس کے پیچھے باہر نکلی تھی۔

اسے شاہ پورو والوں سے کوئی اچھی امید تو نہیں تھی لیکن یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ صبا کے حصول کے لیے وہ بڑا کوا قاعدہ بر غمال بنالیں گے اور پھر بیٹی کے بدلے بیٹی کی شرط رکھ کر اسے تھما ڈالنے پر مجبور کریں گے وہ بڑی طرف سے مطمئن تو پہلے بھی نہیں تھی بس یہ خیال تھا کہ وہ اپنے باپ کے گھر میں ہے جہاں اگر وہ آرام نہیں تو تکلیف میں بھی نہیں ہوگی اس لیے اس نے ابھی تک مدد کی واپسی کے لیے کوئی پیش رفت نہیں کی۔ دوسرے اسے یہ بھی یقین تھا کہ جس روز مدد کا وہاں سے دل اچاٹ ہو گیا۔ وہ اسی روز واپس آجائے۔ یہ تو اسے اب معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنی خوشی سے وہاں نہیں رہ رہی بلکہ اس کے باپ دادا نے زبردستی اسے روکا ہے تاکہ اسے چارے کے طور پر استعمال کر سکیں۔ یعنی ان کے نزدیک مدد کی کوئی اہمیت نہیں تھی تو ایسی

صورت میں دو صاحت کو وہاں پہنچے تاکہ سوچ سکتی تھی۔ وہ بھی اسی کی بیٹی تھی۔

شاہ جہانگیر کو رات اس نے صاف جواب دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد اب تم اسے ایک ماہ نہیں آیا تھا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح مدیہ کو ان کے پتھر سے نکال لائے۔ اس کی سلامتی سے اپنی انا خود داری و قارب اور بگاڑ سکتی تھی۔ جسے برسوں پہلے شاہ سکندر کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔ اسے دم شاہ سکندر کا خیال آیا تو اس کے اندر دہشت الاؤ میں شدت آئی تھی۔ ہش و دہرے ہنسنے میں اس عجیب گریبان پکڑ سکتی۔

”لیکن میں اسے اتنے تو دیکھا سکتی ہوں۔“ اس نے کھولتے ہوئے ماغ سے سوچا اور اس وقت کارڈ لیس اڈ لیکن ان کا کوئی نمبر اس کے پاس نہیں تھا۔ برسوں پہلے جب شاہ پور فون کیا تھا تب بھی ڈائریکٹری میں نمبر نہیں اور ابھی پتا نہیں وہ کہاں تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ صاحت نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا اور غالباً ”نئے پتہ اندر آئی تھی لیکن اسے ابھی تک بستریں دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”مہا! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“

”ہاں کیوں؟“ اسے اس وقت صاحت کی مداخلت سخت ناگوار لگ رہی تھی۔

”طبع سے کمرے میں جو بند ہیں اس لیے پوچھ رہی ہوں۔ گیارہ بج رہے ہیں۔ کلینک نہیں جانا آ رہا صاحت اس کے کیوں سے قدرے سٹنا کر بولی تھی۔

”نہیں اس وقت نہیں جاؤں گی، سسٹر فون آئے تو منع کر دینا۔ کتنا شام میں آؤں گی۔“

”جھٹا میں یہ بتانے آئی تھی کہ میں نیچے اماں جی کے پاس جا رہی ہوں۔ کوئی کام ہو تو بلا لے لیجیے گا۔“

”ابھی بات ہے، جاؤ اور یہ دروازہ بند کر دو۔“ وہ سرسری انداز میں کہہ کر اپنے لیے تکیہ ٹھیک کرنے میں لگی۔ پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر سیدھی ہوئی اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کارڈ لیس پر علی جہانگیر کے نمبر

”میں شاہ علی جہانگیر!“ تیسری بیل کے بعد اس کی آواز سنائی دی تھی۔

”میں ڈاکٹر آسیہ بات کر رہی ہوں۔“ اس نے خاصے روکے انداز میں کہا تو ادھر سے وہ فوراً بولا۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام کیا تم بتا سکتے ہو کہ شاہ سکندر حیات اس وقت کہاں ہوں گے؟“ اس نے مختصر جواب کے پوچھا۔

”جی اس وقت کوئٹہ میں ہیں اور شام چھ بجے وہاں سے اسلام آباد کے لیے روانہ ہوں گے۔“ اس نے سکندر کا گلاب و گرام بھی بتا ڈالا۔

”کوئٹہ کا کوئی نمبر موبائل نمبر؟“ اس نے سائڈ کارڈ سے پین اور ڈائری اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”جی موبائل نمبر ہے۔“ علی جہانگیر نمبر بتا کر پچھو اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے فوراً ہٹ کر یہ کہہ کر قطع کر دیا اور پھر خود کو شاہ سکندر سے بات کرنے کے لیے تیار کرنے کے بعد ان کے نمبر مائلے تھے۔

”میں شاہ سکندر حیات!“ بالکل وہی انداز تھا جو اس سے پہلے علی جہانگیر کا تھا۔

”جی میں ڈاکٹر آسیہ۔“ اس بار وہ اسی قدر کہہ سکی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ ان کے لہجے میں ایک لخت اشتیاق در آیا تھا اور وہ ہنسنے پڑنے کو تیار تھی، ہنسنے لگی۔

”میرے جواب سے آپ کو مایوسی ہوگی۔ یعنی میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”یہ تو خوشی کی بات ہے۔“ انہوں نے کہا تو وہ سکندر ان کی سرکے پوچھنے لگی۔

”میری بیٹی مدیہ کہاں ہے؟“

”درمیں خیریت۔“

مدیہ کی خیریت مطلوب ہے۔“ وہ ایک دم تیز ہو کر بولی تھی۔

”کیا کسی نے اس کے بارے میں کچھ کہا آپ سے؟“ شاہ سکندر اس بار کچھ ٹھٹھکے تھے۔

”کے بھائی شاہ جہانگیر آئے تھے میرے پاس۔ موصوف یہ کہہ گئے ہیں کہ اگر میں مدیہ کی سلامتی چاہتی

حت کو ان کے بیٹے کے ساتھ رخصت کر دوں۔“ اس نے چہا چہا کر کہا تو دوسری طرف ایک دم خاموشی

شاہ سکندر حیات! آپ سن لیں۔ اگر میری بیٹی مدیہ کو کچھ ہوا تو۔“

”نہیں ڈاکٹر آسیہ! آپ اطمینان رکھیں اسے کچھ نہیں ہوگا۔“ وہ فوراً بولے تھے۔ ”کسی میں اتنی

ہیں ہے کہ میری بیٹی کو ہاتھ بھی لگا سکے۔ جہانگیر بھائی نے جو کچھ کہا اس کے لیے میں آپ سے معافی

وہ شاید اس صورت حال سے بوکھلا گئے ہیں۔“

یہ سب نہیں جانتی۔ آپ مدیہ سے کہیں فوراً واپس آجائے۔ مجھے اس کی طرف سے بہت تشویش

تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ صرف آپ کی ہی نہیں میری بھی بیٹی ہے۔“ شاہ سکندر گو کہ شاہ

اس اقدام پر اندر رہی اندر تملارے تھے، لیکن اسے مسلسل اطمینان دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اور آپ اس کے لیے اچھا سوچیں گے اچھا کریں گے۔ جیسے صاحت کے لیے۔“ اس نے ان کی بات پر

بڑکایا۔

اس بات پر بحث نہیں کروں گا۔ کیونکہ آپ صرف ایک پہلو سے سوچ رہی ہیں اور ہاں آپ کو مدیہ کی

کی ضرورت نہیں ہے وہ اب میری ذمہ داری ہے اور صاحت پر بھی آپ مکمل اختیار نہیں رکھتیں۔ اس

میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیجیے گا۔“

الہہ اچانک بدل گیا تھا۔ جانے اس کا طنز کرنا برا لگا تھا یا کوئی اور بات یاد آئی تھی۔ وہ بہر حال چند لمحہ کو

ن آگئی پھر ایک دم جیسے ہوش میں آ کر انہیں پکارا لیکن ادھر سے سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔

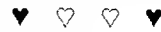
”ف!“ اس کا دماغ کھولنے لگا تھا۔ دل چاہا ہر شے تھس تھس کر دے۔

مجھے ہن شاہ پور والے میں ان کی دھمکیوں سے مرعوب ہو جاؤں گی۔ ہرگز نہیں۔ وہ میرا معاملہ تھا جو

ناموشی اختیار کر لی تھی۔ مدعو اور صبا کے لیے تو میں زمین آسمان ایک کر دوں گی۔ بڑے آئے حق جتانے

اسے پوچھ کر فیصلہ کروں ہونم۔“

رخو سے سوچ رہی تھی اور پھر اسی وقت ایک فیصلہ کر کے ہی اٹھی تھی۔



اور نیل کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر ادھر سے ادھر چکراتی رہی، پھر اپنی الماری ٹھیک کرنے کھڑی ہو گئی۔

ما کی ضرورت نہیں تھی لیکن کرنے کو اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ جب سے نیل نے اس کا کالج جانا بند

اس کا خوسے بھی کچھ پڑھنے کو دل نہیں چاہتا تھا اور کام بھی کوئی اتنے نہیں ہوتے تھے۔ سارا وقت بیکار

عاس کا ذہن بھی مٹا رہا تھا۔ کوئی اچھا خیال تو آتا ہی نہیں تھا اور وقت بھی جیسے ٹھہر سا گیا تھا یا اسے

من ہوتی ہے شام ہوتی ہے اور بس، انہیں کوئی بالکل نہیں تھی کسی کسی وقت اس کا دل چاہتا وہ مدیہ کی

اچلا کر سب کو اپنی طرف متوجہ کرے اور پھر خوب بنے یا خوب روئے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہونے

بہ سب کچھ آسیہ پر چھوڑ کر بھی چین سے نہیں تھی۔ کیونکہ اسے اب علی جہانگیر کا خیال آتا تھا۔ جس کا

غما کہ وہ شاہ جہانگیر کا بیٹا تھا اور یہ تصور کم از کم آسیہ تو معاف نہیں کر سکتی تھی۔ یہ وہ اچھی طرح جانتی

مالیہ بہت چاہنے کے باوجود وہ علی جہانگیر کو فون نہیں کر رہی تھی کہ کہیں اس کی محبت میں ہار کر وہ اپنی ماں

کون غلط نہ سمجھنے لگے۔ وہ حقیقتاً ”اب دور ہے“ آکھڑی ہوئی تھی۔
 ”صائب! فون آیا ہے۔“ بوائے اس کے کمرے کے دروازے میں آکر پکار کر کہا تو وہ الماری کا پٹ بند کر
 پوچھنے لگی۔
 ”کس کا ہے؟“

”پتا نہیں کون ہے، پہلے نیل میاں کا پوچھا میں نے کہا نہیں ہیں تو بولا گھر میں جو بھی ہے بلاؤ۔“ بوائے
 بتانے لگھڑی ہوئی تھیں۔ وہ درمیان ہی میں نکل کر لابی میں آئی اور ریسیور اٹھا کر تیلو کہا تو دوسری طرف علی
 تھا۔ چھوٹے ہی بولا۔
 ”یار! تمہیں ذرا احساس نہیں۔ میں کتنی شدت سے تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔“

”کیوں؟“ وہ بلا ارادہ کہہ گئی۔
 ”کیوں کا کیا مطلب؟ کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ میری باتوں کو سوچنے کے بعد مجھے فون کرگو۔“ علی جہانگیر
 دلایا تو وہ آزدگی میں گھر کر گئی۔
 ”مجھے یاد ہے۔“

”پھر؟“
 ”پھر کہ میں نے کچھ نہیں سوچا اور نہ سوچوں گی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے آپ کی باتوں سے اختلاف ہے
 مجھے مہم کا خیال ہے اور میں کسی مقام پر بھی ان سے نظریں نہیں چرا سکتی۔“ وہ ہنوز آزدی صاف گوئی سے
 رہی تھی۔

”اب میں تم سے کیا کہوں۔“ وہ جیسے عاجز آ گیا تھا۔
 ”کچھ نہ کہیں، کیونکہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔“
 ”چھ ماہ سنا، تمہیں معلوم ہے۔ آج تمہاری ممانے مجھے فون کیا تھا۔“ علی جہانگیر نے اصل میں یہی کیا
 لیے اس وقت فون کیا تھا۔

”نہیں! کیا تمہیں معلوم ہے؟“ اس نے لاعلمی کے اظہار کے ساتھ فوراً ”پوچھا۔
 ”ہمارے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ سکندر چچا کا پوچھا اور ان کا موبائل نمبر لیا تھا۔ اس کے بعد مجھے
 معلوم انہوں نے سکندر چچا سے بات کی یا نہیں میں صبح سے ٹرائی کر رہا ہوں لیکن سکندر چچا کا موبائل بند پڑا۔
 اب پتا نہیں تمہاری ممانے سے بات کرنے کے بعد انہوں نے بند کیا ہے یا۔“

وہ اس انداز سے بول رہا تھا جیسے اس کا وہ بیان اس بات کی طرف ہو کہ شاہ سکندر اور آسیہ کے درمیان کیا
 ہوئی ہوگی۔
 اور اس کا وہ بیان آسیہ کی طرف چلا گیا کہ صبح وہ کلینک نہیں گئی تھی اور اپنے کمرے میں بند رہی تھی۔
 ”ہیلو صبا! قدرے توقف سے علی جہانگیر نے پکارا تو وہ چونک کر بولی۔

”جی۔“
 ”تم آج کل کالج نہیں جا رہیں؟“
 ”نہیں۔“
 ”کیس میری وجہ سے تو نہیں چھوڑ دیا۔ دیکھو سچ بتانا۔“

وہ خاموش رہی جبکہ اس کے قیاس پر دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔
 ”یہ توقف لڑکی! تم کیا سمجھتی ہو، میں تمہیں اس گھر سے اٹھا کر نہیں لے جا سکتا۔ سب کی موجودگی
 جانے کی جرات رکھتا ہوں۔“ تبھی تم۔“
 ”میرے خدا! اس نے گہرا کر ریسیور رکھ دیا اور ہاگ کرا اپنے کمرے میں آ گئی۔ یوں جیسے وہ ابھی آ رہا ہو۔“

”مدحہ مدحہ کے لیے فون کیا تھا۔ اسے واپس بلانا چاہتی ہیں لیکن۔“ نیل ایک دم خاموش ہو گئے۔
 ”لیکن کیا وہ نہیں آنا چاہتی؟“ اس نے فوراً ”جو چھوٹا نیل گہری سس کھینچ کر کہنے لگا۔
 ”جی نہیں وہ کیا چاہتی ہے۔ شاید آنا چاہتی ہے لیکن شاہ پور والے اسے نہیں آنے دے رہے۔ ان کا منہ
 پہلے نہیں رخصت کریں پھر وہ مدحہ کو یہاں بھیجیں گے۔ یہ انتہائی اہمیت کو شش ہے ان کی پھوپھو کو بیک میا
 کر رہے ہیں۔“

وہ سناٹے میں آکر انہیں دیکھ کر جاری تھی۔

”اب تک ہم سب سمجھتے رہے کہ مدحہ وہاں اپنی مرضی سے رہ رہی ہے اور خوش ہے لیکن وہ خوش نہیں ہے۔
 جانتا ہوں۔ وہ اس گھر کے علاوہ کہیں نہیں رہ سکتی۔ اس پر جب کیا گیا تو وہ مر جائے گی۔“

”اف نہیں۔“ وہ ایک دم ہاتھوں میں چروچھا کر رو پڑی تو نیل ایک نظر اسے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

”کچھ دیر بعد وہ ہاتھ نیچے گرا کر پوچھنے لگی۔

”پھر آپ اسے کیسے لائیں گے؟“

”لے آئیں گے پہلے تمہارا معاملہ نمٹالیں۔“ نیل نے ہاتھ بھرا کر تنکیے کے نیچے سے ایک لفافہ کھینچا۔

اسے دیکھ کر بولے۔ ”پھوپھو نے تمہارے بارے میں فیصلہ کر لیا ہے۔“

وہ کچھ بولی نہیں لیکن اس کی نظریں ان کے ہاتھوں میں پکڑے لفافے پر جا پڑی تھیں جبکہ اندر دل لکڑ

خاموش ہو گیا تھا۔

”مدحہ کو بھیجنے کے لیے جو شرط انہوں نے رکھی ہے۔ پھوپھو پہلے اس کا خاتمہ کر رہی ہیں۔ اس کے بعد وہ

دعا نہیں کر سکیں گے۔“

نیل نے کہتے ہوئے لفافے میں سے پیپر نکال کر اس کے سامنے کر دیے جن پر ایک نظر ڈال کر اس

ناجی کے عالم میں انہیں دیکھا تو وہ قدرے رک کر بولے۔

”خلع کے کاغذات ہیں سائن کر دو۔“

اس کے اندر چھن سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔ پھی پھی آنکھوں سے کورٹ پیپر دیکھنے لگی جس پر اس کی طرف

تحریر لکھی گئی تھی۔ کیا ستم ظریفی تھی کہ اپنے دل کی ہستی اسے اپنے ہاتھوں سے اجاڑی تھی اور کوئی اجازت

نہیں کرنا تھا۔ کیونکہ پہلے مرحلے پر ہی اس نے فیصلے کا اختیار آسمہ کو سونپ دیا تھا۔

نیل نے بین اس کے ہاتھ میں تھا کہ پیپر پر اس جگہ اپنی انگلی رکھ دی جہاں اسے سائن کرنا تھا۔

اس کی آنکھیں یکبارگی پانیوں سے بھر گئیں اور اس سے پہلے کہ کوئی قطرہ پلکوں سے گرے وہ سائن کر کے

کھڑی ہوئی اور تیزی سے جانے لگی کہ نیل پکار کر بولے۔

”سنو میں جانتا ہوں تم پھوپھو کے اس فیصلے سے خوش نہیں ہو۔ اگر کو تو میں انہیں مزید اقدام سے روک

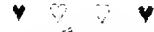
کوشش کروں۔“

”نہیں نیل بھائی! میں نے اپنی ساری زندگی ہمارے لیے وقف کر دی۔ میں کیا ان کے لیے اتنا بھی نہیں

کہ ان کے فیصلے کو قبول کر لوں۔“

وہ بہت ضبط سے کہہ کر ان کے کمرے سے نکل آئی، لیکن اپنے کمرے میں پہنچنے سے پہلے ہی اس کی آنکھ

پانی چھلک گیا تھا۔



شاہ سکندر کے تین دن اسلام آباد میں بے انتہا مصروف گزرے تھے۔ لیکن اس مصروفیت میں بھی انہیں

کا خیال آ رہا تھا اور انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے شاہ پور نہیں رہنے دیں گے۔ جیسا کہ اس نے بتا دیا

اسلام آباد میں رہتی ہے تو وہ اس پر اسے اسلام آباد لے آئیں گے اور بائبل میں اس کی رہائش کا نفاذ

اسے اور جب تک آسمہ کا ان کی طرف سے دل صاف نہیں ہو جاتا اور بخوشی انہیں دونوں بیٹیوں سے ملنے

نے کی اجازت نہیں دے دیتی وہ مدحہ کو اعتماد میں لے کر آسمہ سے دور رہی رکھیں گے کیونکہ اس عرصے میں

ان کے دل میں الماس اور آغا کے برابر جگہ بنا چکی تھی۔ اس لیے اب ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ آسمہ

بٹی کی خاطر ہمیشہ کے لیے مدحہ اور صبا سے دستبردار ہو جائے۔ ایک بار پہلے وہ آسمہ کی خاطر ایسا کر چکے تھے

انہیں صرف اس کا خیال تھا اور اب اس کے خیال کے ساتھ بیٹیوں کا احساس بھی تھا جنہیں وہ سمجھتے تھے اب

ان ضرورت ہے ان کی ماں لاکھ پڑھی لکھی ذہین عورت سہی پھر بھی تمنا ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔

بہر حال تین روز بعد جب وہ اسلام آباد کی مصروفیات سے نکل کر شاہ پور پہنچے تو سیدھے مدحہ کے کمرے میں

ہوتے اور اسے موجود نہ پا کر یہی سمجھے کہ کہیں ادھر ادھر یا بی بی جان کے پاس ہو گی اس لیے اپنے کمرے میں آ

نہوں نے میرا نساء سے اس کے بارے میں فوراً ”نہیں پوچھا تھا۔ یوں بھی میرا نساء کو یہ بات ناگوار گزرتی

وہ چاہتی تھی ان کی ساری توجہ اس کی اولاد پر مرکوز رہے۔

”تمہاں کہاں ہے؟“ وہ جب ایڑی ہو کر بیٹھے تو پہلے میرا نساء سے آغا کا پوچھا تھا۔

”ہاں وہ لالہ کی طرف گیا ہے۔“ میرا نساء نے بتایا۔

”خیر۔ تم نے کسی کام سے بھیجا ہے یا۔“

”شربانو نے بلوایا تھا۔“ میرا نساء فوراً ”بولی تھی۔“ ”ہو گا اسے کوئی کام۔ آغا آئے گا تو خود ہی اس سے پوچھ

”تم نے نہیں پوچھا تھا؟“ انہیں میرا نساء کی غیر ذمہ داری بہت کھٹکتی تھی جب ہی نوکے بغیر رہ نہیں سکے۔

”جیسے کہاں بتا ہے۔“ وہ صاف وامن بجا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چائے کا کون جیراں سے؟“

”ہاں اور زرا مدحہ کو میرے پاس بھیج دو۔“ انہوں نے کہا تو وہ جاتے جاتے رک کر بولی۔

”وہ تھک چکی گی۔“

”کس؟“ وہ ایک دم سیدھے ہو بیٹھے۔

”راچی! اپنی ماں کے پاس۔“ میرا نساء کا انداز بے حد سرسری تھا۔

”کس کے ساتھ گئی ہے؟“ ان کی پیشانی پر ایک ساتھ کئی لیکرس نمودار ہو گئی تھیں۔

”ہاں شاید بابا جان لے گئے تھے۔“

”بابا جان! وہ بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”لالہ جا رہے ہیں۔ میں چائے گا۔“

اسے بولتا چھوڑ کر کمرے سے نکل آئے تھے۔

فدیر بعد وہ بابا جان کے کمرے میں داخل ہوئے اور انہیں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ کیونکہ بابا جان

بین سے بات کر رہے تھے اور جب اسے فارغ کر کے ان کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے دوبارہ سلام کیا۔

”سلام علیکم!“

”دش رہو۔ کب آئے؟“ بابا جان نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

”فدیر ہوئی۔ ابھی میرا نساء نے بتایا ہے کہ آپ مدحہ کو کراچی چھوڑ آئے ہیں۔“ انہوں نے جواب کے

لی بغیر کسی تہد کے اپنی بات کہہ دی۔

”بہت ضد کر رہی تھی شاید گھبرا گئی تھی یہاں۔ شہراؤں کا بھلا کہاں مل لگتا ہے گاؤں میں۔“ بابا جان

”جیسے کہ کے نیچے ہاتھ ڈال کر جانے کیا تلاش کرتے ہوئے بول رہے تھے۔

”اب بابا جان! آپ کو میرا انتظار کرنا چاہیے تھا۔“ وہ مدحہ کے جانے کی تصدیق ہونے پر الجھ گئے تھے۔

”اتھا ہم نے اس سے کہ اسے باپ سے مل کر جانا لیکن وہ نہیں مانی کہنے لگی۔ میں کوئی ہمیشہ کے لیے تو نہیں

”پھر آؤں گی تو بابا سے مل لوں گی۔“ بابا جان نے مدحہ کے الفاظ دہرا کر انہیں دیکھا تھا۔

”چنانچہ نہیں پھر آئے گی بھی کہ نہیں۔“ انہوں نے خود کلامی کے انداز میں کہا تھا۔ لیکن باباجان سن کر بولے۔

”ضرور آئے گی۔ وعدہ کیا ہے اس نے ہم سے۔“

”آپ خود جھوڑ کر آئے ہیں اسے یا کسی کے ساتھ بھیجا ہے۔“ انہوں نے اچانک کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”کسی کے ساتھ کیوں بھیجتے، ہم خود لے کر گئے تھے اور اس کے گھر کے سامنے اتار کر آئے ہیں۔“

باباجان نے اس انداز سے کہا جیسے انہیں کسی کے ساتھ بھیجنے والی بات بری لگی ہو۔

”اچھا!“ شاہ سکندر یقین کر بھی رہے تھے اور انہیں بھی اور اندر ہی اندر الجھ رہے تھے کہ پانچ روز پہلے اس نے فون پر ان سے جو کچھ کہا تھا اس میں کتنی صداقت تھی۔

”ابھی رہو گے یہاں یا پھر کہیں جانا ہے؟“ باباجان نے انہیں سوچتے دیکھ کر فوراً ان کا دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔

”بس دو دن ہوں پھر کینڈا جانا ہے۔“ انہوں نے سرسری اپنا پروگرام بتایا پھر پوچھنے لگے۔ ”آپ کو معلوم ہے جہانگیر بھائی ڈاکٹر آسیہ کے پاس گئے تھے۔“

”اچھا کب؟“ باباجان بکرا بکرا بن گئے۔

”تھیں!“ ایک ہفتے پہلے۔“

”تھیں کیسے معلوم ہوا؟“

”ڈاکٹر آسیہ کا فون آیا تھا۔ بتا رہی تھیں، جہانگیر بھائی نے صباحت کی رخصتی پر زور دیا اور جب وہ نہیں مانیں تو دھمکی کے طور پر یہ کہہ آئے کہ مدیہ ان کے قبضے میں ہے۔“ شاہ سکندر صاف گوئی سے بتا کر کہنے لگے۔

”جہانگیر بھائی بہت غلط کر رہے ہیں۔ میں اپنی بیٹیوں کے بارے میں کوئی ایسی بات برداشت نہیں کروں گا برسوں پہلے آپ نے آسیہ اور اس کے گھر والوں کو مار دینے کی دھمکی دی تھی۔ لیکن اب آپ بس لیں کہ اس گھر میں میری بیٹیاں رہتی ہیں۔ دھمکی تو دور کی بات اگر انہیں کوئی نقصان پہنچانے کا سوچا بھی کیا تو۔“

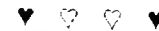
وہ قصداً بات ادا ہو کر پھر بولنے لگے۔

”تم نا حق بدگمان ہو رہے ہو سکندر۔ تمہاری بیٹیاں کیا ہماری کچھ نہیں لگتیں۔ خون ہیں ہمارا اور تم سے پتا ہم جہانگیر سے پوچھیں گے کہ اس نے ڈاکٹری سے ایسی بات کیوں کی۔“

باباجان کو کہ اندر ہی اندر اس صورت حال سے بوکھلا گئے تھے۔ لیکن ظاہر نہیں کیا اور ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہ جہانگیر پر غصہ کرنے لگے تھے۔

”بہر حال جہانگیر بھائی کو دوبارہ وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کینڈا سے واپسی پر صباحت کا معاملہ میں نہ طے کروں گا۔“ وہ خوشگلی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ہاں اور کوشش کرنا مدیہ کی بات بھی یہیں طے ہو جائے۔ تیور کے ساتھ۔“ باباجان نے کہا تو وہ انہیں دہرا کر رہ گئے تھے۔



”کتنی خوب صورت جگہ ہے اور کتنا سکون ہے یہاں۔ میرا بس چلے تو میں ساری زندگی کے لیے یہیں جاؤں۔“ وہ چاروں اور دیکھتی ہوئی ایک جذب کے عالم میں بولی تھی۔

چند قدم آگے چلتا شاہ تیور اس کی بات سن کر رک گیا اور پلٹ کر پوچھنے لگا۔

”رہ سکوں گی؟“

”کیوں نہیں؟ یہ تو میرے خوابوں سے بھی زیادہ حسین جگہ ہے۔ لیکن میرے اور کون سے خواب پورے ہوئے جو یہ ہو گا۔“ وہ اچانک آزرہ نظر آنے لگی۔ لہجہ میں بھی دکھ سمٹ آیا تھا جسے محسوس کر کے شاہ تیور

کے قریب آ گیا۔

”مخواب بھی دیکھتی ہو؟“

”جس حقیقت میں کچھ میسر نہ ہو، وہ خواب ہی دیکھتے ہیں۔“

وہ کالج کی طرف جاتی سرخ بھری کی روش پر قدم رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”آپ قصور بھی نہیں کر سکتے کہ میں اور صبا کس ماحول میں پروان چڑھے ہیں۔ کاش بابا شروع ہی میں ہمیں پیاس لے آتے تو ہمارے اندر اتنی محرومیاں نہ ہوتیں۔ ہر بات ہر چیز کو ترسے ہیں، ہم ماما کے ساتھ جو کچھ

آپس میں ہمارا انوکھی قصور نہیں تھا لیکن انہوں نے اور ان کے سب گھر والوں نے ہمیں ہی قصور وار سمجھ لیا جی، ہم سے بدلہ لیتے رہے۔ بہت زیادتیاں ہوئی ہیں ہمارے ساتھ۔“

”پھر بھی تم وہاں جانا چاہتی ہو؟“ شاہ تیور نے فوراً ”نہ کا تو وہ ایک دم تیز ہو کر بولی۔

”کس نے کہا، میں جانا چاہتی ہوں۔ سچ پوچھیں تو میں کبھی نہیں جانا چاہتی میرے تو دوبارہ وہاں جانے کا سوچ کر اونگھنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پہلے سے بھی زیادہ برا سلوک ہو گا میرے ساتھ۔ لیکن میں کیا کروں۔ اوسر بابا جان

جو جلی میں بھی میرے لیے جگہ نہیں ہے شاید۔“

”ارے یہ تم سے کس نے کہا۔“

”میں محسوس کر سکتی ہوں شاہ تیور! کوئی نہ کہے تب بھی میں جانتی ہوں کہ مجھے کوئی پسند نہیں کرتا۔ یہاں تک

کہ اگر کو بھی میری پروا نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میری اصل شناخت یہیں سے ہے اگر ماما نے اتنی پابندیاں نہ لگائی ہوتیں تو میں بہت پہلے یہاں آچکی ہوتی اور اسے ساتھ صبا کو بھی لے آتی۔“

”غیر وہ تو اب آئی جائے گی اور تم بھی نہیں جاؤ گی۔“ شاہ تیور نے کہا تو وہ قدم روک کر اسے دیکھنے لگی۔

”میں کہہ رہا ہوں ناں تم نہیں جاؤ گی۔“ اسے یقین دلائے کی خاطر اس نے زور دے کر اپنی بات دہرائی پھر کہنے لگی۔

”تمہیں یہ کالج پسند ہے تو ہم نہیں رہیں گے۔“

”ہم؟“ اس کے ہونٹ ذرا سے تھموا ہو کر پھر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

”تم اور میں؟ یا تمہیں میرے ساتھ رہنے پر کوئی اعتراض ہے۔“ شاہ تیور نے شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس

کا انگوٹھ میں جھانکا تو وہ غرور سے ہو کر آگے بڑھتے ہوئے بولے۔

”چاہتا ہوں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”ارے!“ وہ ذرا سا ہنسا۔ پھر قدم بڑھا کر اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ ”میں تمہارے خوابوں کو

نبیوت کی بات کر رہا ہوں۔ سچ بتاؤ اپنے خوابوں کی حسین راہ گزر پر تم کس کا ہاتھ تھام کر چلتی رہی ہو، کوئی ماورائی

تقلید یا مجھ جیسا عام انسان۔“

”خدا حافظ!“ اس نے موبائل بند کر کے واپس جیب میں رکھا پھر اس کے پیچھے اندر آیا تو وہ کھڑکی کے پاس کھڑی جانے کن سوچوں میں گم تھی۔

”اے!“ شاہ تیور نے قریب جا کر اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لرایا تو وہ چونک کر دو قدم پیچھے ہٹی پھر جانے کیا ہوا ہاتھوں میں چوہ چھپا کر رونے لگی۔

”ارے مدحیہ!“ شاہ تیور نے آہستگی سے اس کی دونوں کلاسیاں تھام کر ہاتھ نیچے کیے۔ ”کیا ہوا ہے؟“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”کس سے مجھ سے؟“ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سانس کی طرف جھکا۔

”نہیں۔“ وہ ہتھیائیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

”پھر!“

”میری قسمت سے!“ اپنے خوابوں سے کہیں مجھے رسوا نہ کر دیں۔“

”بیوقوف! میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ اپنے دل سے سارے ڈر، سارے خوف مٹاؤ والو اور بھول جاؤ اب تک جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا۔ بہت جلد ہم نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔“

وہ بہت مضبوط لمحے میں اسے اپنے ذات کا نام دے رہا تھا۔

وہ پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھنے لگی۔

”کیا تم میرا یقین نہیں کر رہی؟“

وہ ذرا سا اثبات میں سر ہلا کر اس کی طرف سے رخ موڑ گئی۔ تب ہی باہر گاڑیاں رکنے کی آواز پر وہ چونک کر بولا۔

”لو آگئے سب لوگ۔“

”کون؟“ اس نے بے دھیانی میں پلٹ کر پوچھا۔

”کرزنز۔“ جاؤ تم منہ دھو لو ورنہ سب سمجھیں گے۔ میں تم پر ظلم و ستم تو ڈرتا رہا ہوں۔“ اس نے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بھاگ کر واش روم میں بند ہو گئی۔

چند لمحوں بعد سارے میں ایک شور مچ گیا، علی جمائیر بھی آیا تھا جسے دیکھ کر شاہ تیور حیرت بھری آواز میں چلایا۔

”ارے ڈی سی صاحب بھی آئے ہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ خدا کی قدرت ہے۔“

مدحیہ واش روم سے نکل کر آ رہی تھی۔ بے ساختہ بولی۔

”کبھی، کبھی، کبھی!“ اس نے اپنے کھڑکے کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں! ہم ہمارے قافلے میں تو نہیں تھیں۔ علی جمائیر نے حیران ہو کر مدحیہ کو دیکھا تو اس سے پہلے شاہ تیور بول پڑا۔

”ہم قافلے کا استقبال کرنے کے لیے پہلے سے آگئے تھے۔“

”اچھا!“ علی جمائیر ایک نظر شاہ تیور پر ڈال کر پھر سوچتے ہوئے انداز میں مدحیہ کی طرف متوجہ ہوا تو وہ تھکا ہوا مسکرا کر بولی۔

”کیسے ہیں آپ؟“

”تھک ہوں، تم کیسی ہو؟“

”بالکل تھک اور اس کاٹھ میں آکر تو بہت خوش۔“

”تیور بھائی! اہانے پینے کا کیا انتظام ہے۔“ ایک طرف سے رابعہ نے پکار کر پوچھا تو شاہ تیور ادھر متوجہ

گیا۔

دست سب کی فہرست ڈسٹر تیار کر دئی ہیں۔“

وہ کس بات کی ہے۔ بس فوراً دست خوان بچھو اور پھر مجھے جانا ہے۔“ علی جمائیر نے کہا۔

مطلب؟ آتے ہی جانے کی بات کرنے لگے۔“

بابا! میں بہت ضروری کام چھوڑ کر آیا ہوں۔ سکندر بیچا سے ملنا تھا لیکن وہ میرے شاہ پور پہنچنے سے پہلے ہی تھے۔ اب جتنا نہیں کراچی میں بھی ان سے ملاقات ہوتی ہے کہ نہیں۔ پانچ بجے ان کی کینڈا کی فلائٹ

جانگیر نے کہا تو مدحیہ بے ساختہ پوچھنے لگی۔

”کیڈا جا رہے ہیں؟ واپس کب آئیں گے؟“

”دس دن تو لگیں گے، تم چلنا چاہو کراچی تو میرے ساتھ چلو۔“ علی جمائیر نے جواب کے ساتھ کہا تو تیور لپ پڑا۔

میں یہ میرے ساتھ جائے گی کیوں مدحیہ؟“

بابا! اس کے جواب پر علی جمائیر ذرا سے کندھے اچکا کر بولا۔

”بے تمہاری مرضی اب پلیر نہ کھانا۔“

”اچھا! مدحیہ! امیر بانی کے فرائض نبھادیں۔“ شاہ تیور نے چلتے ہوئے مدحیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”سب حیران ہو کر دیکھنے لگے تھے۔“

”لہنا کھاتے ہی علی جمائیر بہت غلت میں سب کو خدا حافظ کہتا ہوا نکل گیا تو کتنی دیر تک سب اسی کے غم باتیں کرتے رہے۔ خصوصاً“ اس کی شادی پر جو بد مزگی ہوئی تھی اس کا سب کو افسوس تھا۔ اور یہ کہ

اس کا معاملہ طے کیوں نہیں ہوا۔

”جان و ہیل دے رہے ہیں ورنہ ان کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔“ شاہ عازم نے کہا تو آغا اس کی تائید

دہلا۔

”اچھے میرے باپ کو ڈھیل دی تھی۔ فرق اتنا ہے کہ انہیں اس چنگل سے نکالنا تھا اور علی کو پھنسانا ہے۔ با

آخر میں اس کے ساتھ دو چار تھپتھپ اور بھی شامل ہو گئے تھے۔

”یہ کچھ پریشان سی ہو کر ایک ایک کی شکل دیکھ رہی تھی۔“ معا“ شاہ تیور کی اس پر نظر پڑی تو سب کو خاموش

نہوئے بولا۔

بابا! فضول باتیں شروع کر دی ہیں تم لوگوں نے۔ چلو مدحیہ! ہم باہر چلتے ہیں۔“

”نابہ علی کی طرح یہ بھی۔“ عازم کے مسخرانہ انداز پر وہ اسے گھورتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور سب کے درمیان

یہ کہا تھا پکڑ کر اسے بھی اٹھا دیا۔

بابا! لے جاؤ گے اسے؟“ آغا نے پوچھا لیکن وہ ان سنی کرتا ہوا مدحیہ کو لے کر چل پڑا تو عقب سے الماس کی

ناکلی تھی۔

بابا! کا انجام بھول گئی ہے۔“

”جو آپ کو یقین آگیا کہ مجھے کوئی پسند نہیں کرتا۔“ گیت سے نکلتے ہی مدحیہ نے دکھ سے کہا۔

”اُمیں جو کرتا ہوں، کیا تمہارے لیے صرف میری محبت کافی نہیں ہے اور کسی کی پروا مت کرو۔“

”میں نہیں کروں۔ آپ نے سنا نہیں۔ الماس کیا کہہ رہی تھی۔ اگر بابا کی طرح آپ نے بھی مجھے۔“ اس کی

ناکلی تھی۔

”نوف! سکندر بیچا نے تمہاری ماں کو اپنی مرضی سے نہیں چھوڑا تھا۔ بابا جان نے مجبور کیا تھا انہیں۔“ وہ

تو تمام کر روش پر دھیرے دھیرے چلتا ہوا ساری کہانی دہرانے لگا تھا۔

وہ سراسیمہ سی سن رہی تھی۔

من نہیں تھی۔ کوئی اور معاملہ ہوتا تو وہ ہفتہ کیا میدان انتظار کر سکتا تھا اور اب تو جیسے ایک ایک پل اتنا اہم اس کا بس چلتا تو وہ وقت کو بیکس روک دیتا تو اس کی زندگی چھیننے کے درپے ہو گیا تھا۔

سوچنے کے بعد اس نے باباجان کو فون کیا اور جب انہیں نوٹس کا بتایا تو وہ چیخ پڑے تھے۔
ہو گئی ہے وہ عورت، اپنی زندگی سے سبق نہیں سیکھا اس نے جواب بنی کو طلاق دلو اگر گھر بٹھانا چاہتی ہے سمجھا دو کوڑ پکھری کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہم اس کے پورے خاندان کو گھسیٹ لیں

اگر بس باباجان! غصے اور جوش سے میرا مسئلہ حل نہیں ہو گا نہ ہی میں کوئی دھاندلی چاہتا ہوں آپ میری کو پیچھیں ڈاکٹر آسیہ کے پاس۔ اس نے ناراض لہجے میں ٹوک کر کہا۔

خاتما رہا باپ، اسی پر تو ڈاکٹر نے یہ قدم اٹھایا ہے۔ باباجان سخت تلملائے ہوئے لگ رہے تھے۔
بکب گئے تھے اب؟ اس نے فوراً پوچھا۔

مڈبھ ہفتہ ہوا ہے۔ بہت بے عزتی کی اس عورت نے تمہارے باپ کی اس کے بعد بھی اگر تم چاہتے ہو بارہا سے وہاں جانے کو کہیں تو۔

ن۔ وہ ایک دم بول پڑا۔
پتاؤ ہم کیا کریں۔

الحال تو میری اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا پھر بھی میں یہ ضرور کروں گا کہ اس سارے قصے میں صباحت کا کوئی بس ہے۔ اس لیے اس کی ہاں کے کیے کی سزا سے نہیں ملنی چاہیے۔ اس نے کہا۔

کا خیال کر کے تو ہم خاموش ہیں ورنہ۔ باباجان فوراً بولے اور خاموش بھی ہو گئے۔
باباجان! میں پھر بات کروں گا۔ اس نے اجازت لے کر فون بند کر دیا۔

بہرمت سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اب شاہ سکندر ہی کو ڈاکٹر آسیہ کے پاس جانا چاہیے اور اس ہاے بہت جمل سے شاہ سکندر کا انتظار کرنا تھا۔

نیک تیل بن رہی تھی۔
لے لے کچھ دیر انتظار کیا کہ صباحت فون اٹھائے گی، لیکن وہ پتا نہیں کہاں تھی آخر انہیں خود ہی کمرے سے

ایک نیک دوسری طرف کوئی مشغل مزاجی سے منتظر تھا۔
بولے، ٹیل نے ریسور اٹھایا اور دوسری طرف کی آواز سننے ہی بے اختیار ہو گئے تھے۔

دو کیسی ہو؟ کہاں ہو؟
اتنے دنوں سے فون کیوں نہیں کیا۔ تم ٹھیک تو ہونا۔؟

بابا کیا تم نے؟
نیک! سامعین نے جانے کیا سنا تھا کہ پورا وجود سن ہو گیا۔ بڑی مشکل سے انہوں نے ہاتھ نیچے گرا کر ریسور

فون اس کے بعد بھی وہیں کھڑے رہے اتفاق سے اسٹک بھی ہاتھ میں نہیں تھی ورنہ اس کے سارے خود کو ٹپکتے۔ انتہائی بے بسی سے اپنے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے بے اختیار صباحت کو پکارا تھا۔

بابا!
بخت اپنے کمرے سے نکل کر آئی اور انہیں دیکھتے ہی بٹھک گئی تھی۔

بابا ت ہے ٹیل بھائی؟
بھوک کراس دیکھنے لگے۔ بولے کچھ نہیں تو قریب آکر صباحت نے ان کا بازو تھام لیا۔

نواؤ بھائی۔ میاں کیوں کھڑے ہیں؟ پھر فون پر نظر پڑی تو اندر ہی اندر پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔ کس کا تھا؟

علی جہانگیر ایئر پورٹ پر بس تھوڑی دیر کے لیے شاہ سکندر سے مل سکا تھا اور اصل بات جو وہ ان سے پوچھنا چاہتا تھا وہ بھی نہیں پوچھ سکا کیونکہ وہ اپنے وفد کے ساتھ تھے۔ اس لیے بس سلام دعا ہی ہوئی۔ البتہ اس بات پر اس نے بہت زور دیا کہ کینڈا اسے واپسی پر وہ شاہ پور جانے سے پہلے اس کے پاس آئیں اسے ان سے بہت ضروری کام ہے اور انہوں نے ہائی تو بھلی تھی پھر بھی وہ ان کی واپسی کی تاریخ کنفرم کر کے آیا تھا تاکہ خود انہیں ریسور کرنے جاسکے۔ اصل میں وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ آسیہ نے ان سے صباحت اور اس کے معاذ کیا بات کی۔ فطری سی بات تھی وہ یہی سوچ سکتا تھا، مدحیہ کی طرف اس کا بالکل دھیان نہیں گیا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر کو سی آف کر کے جب وہ گھر پہنچا تو کمرہ دن چائے کے ساتھ ہی اسے ایک لفافہ بٹھا کر ملا۔

اس بھی ایک آؤی دے گیا ہے۔ میرا لٹوٹھا بھی لٹوایا تھا اس نے۔

”اچھا جاؤ۔“ وہ لفافے پر تامل دیکھ رہا تھا۔ فوراً کمرہ دین کو بھیج کر چائے کا کپ ٹیل پر رکھا اور لفافہ کھول کر یہ نکالتے ہی ٹھنک گیا۔ پھر جب خمر پر نظریں دوڑائیں تو بری طرح چکرا گیا۔ دل کسی طرح یقین نہیں کر رہا تھا

صباحت خلع کا دھوا کر سکتی ہے۔

”میرے خدا۔“ اس نے صوفے کی بیک پر سر رکھا تو اس کا ذہن بری طرح چیخ رہا تھا جو بات گمان میں نہیں

وہ ہو گئی تھی۔

گزشتہ تین چار روز سے وہ کتنا متحس ہونے کے ساتھ پر امید بھی تھا کہ آسیہ اور شاہ سکندر کے درمیان را ہونے سے اس کا معاملہ اب خوش اسلوبی سے طے پا جائے گا اور اس خیال کے ساتھ اس نے اس ہنر کی

کے حوالے سے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اسے اپنے گھر میں چلتی پھرتی نظر آنے لگی تھی۔ بھائی

میں تو کبھی کچن میں اور بیڈ روم میں جانے کیوں وہ دے پاؤں داخل ہوتی تھی۔ وہ بند آنکھوں سے اسے دیکھ

محسوس کرتا تھا اور بھی بے اختیار اسے چھونے کے لیے اس کا ہاتھ ہوا میں اٹھ کر رہ جاتا۔ تو اسے لگتا جیسے وہ محسوس کرتا تھا اور بھی بے اختیار اسے چھونے کے لیے اس کا ہاتھ ہوا میں اٹھ کر رہ جاتا۔ تو اسے لگتا جیسے وہ

کو نے میں کھڑی ہنس رہی ہے۔ کیسی بدھنسی ہوتی تھی جو اس کے اندر خوشوار سی پچھل چلاؤتی تھی۔

”نہیں صباحت شاہ! تم ایسا نہیں کر سکتیں۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیوں کو زور سے دبا دیا پھر جھٹکے سے سیدھا ہو بیٹھا اور ٹیلی فون سیٹ قریب سمجھتی کراس کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

تیسری ٹیل کے بعد اس کی آواز سنائی دی تھی۔

”ہیلو!“

”بھئی! ابھی تمہاری طرف سے نوٹس موصول ہوا ہے۔ تم نے اپنی مرضی سے بھیجا ہے یا۔“ وہ چھوٹنے لہجے میں بولا۔

اپنی مرضی سے بھیجا ہوا کسی اور کی کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ دھڑ دھاری ہوئی لگ رہی تھی۔

”فرق پڑتا ہے صباحت شاہ! فرق پڑتا ہے۔“ وہ زور دے کر بولا۔ ”تم مجھ پر ہی نہیں اپنے آپ پر بھی ظلم

ہو۔“

”میں فون بند کر رہی ہوں۔“

”یہی کر سکتی ہو تم۔“ اس نے خودی ریسور پوچھ دیا۔

اس لڑکی کو وہ نہیں سمجھا سکتا تھا اور خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ کبھی سوچتا خود اکثر

پاس جائے اور اپنی صفائی پیش کرنے کے ساتھ صباحت کے ساتھ وابستگی بھی بتا ڈالے۔ لیکن زیادہ دیر تک

سوچ پر قائم نہیں رہ سکا کیونکہ اس کے خیال میں وہ ڈاکٹر آسیہ سے زیادہ بحث نہیں کر سکتا تھا البتہ شاہ

صباحت پر اپنا حق بننا کہ کچھ بھی کہہ سکتے تھے۔ لیکن وہ بھی آج ہی باہر گئے تھے اور ایک ہفتے سے پہلے

”کسی کا نہیں، وہ میں نے اسٹک پتا نہیں کہاں چھوڑ دی۔“ انہوں نے بات بناتے ہوئے خود کو سمارا دیا۔
 خاطر مباحث کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
 ”جس نیل بھائی! اب اسٹک کا پیچھا چھوڑ بھی دیجیے۔ اس کے بغیر چل تو سکتے ہیں۔“ وہ ان کی اسٹک سے چڑھ کر بولی تھی۔

”کیا کروں؟ عادت ہو گئی ہے۔ اس کے بغیر خود کو خالی خالی سامحوس کرتا ہوں ابھی دیکھو ہاتھ میں نہیں تھم میں۔“ وہ جانے کیا کہتے جا رہے تھے کہ ایک دم خاموش ہو گئے۔
 ”یہ یہاں رکھی تو ہے۔“ صباحت ان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تو سامنے اسٹک دیکھ کر بولی۔
 ”ارے، میں سمجھا شاید راستے میں نہیں گر گئی۔“ انہوں نے قصداً حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”دگر ہی جاتی تو اچھا تھا۔“ وہ یونہی کہہ گئی۔
 ”کیوں کیا تمہیں بھی مدحو کی طرح اس کی آواز بری لگنے لگی ہے۔“ انہوں نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ر پوچھا تو وہ اپنی یونہی کسی گئی بات پر جڑ بڑی ہو کر بولی۔
 ”نہیں تو۔“

”اچھا جاؤ اپنا کام کرو۔ میں نے خواستہ تمہیں ڈسٹرب کیا۔“ وہ اپنی رائفنگ نیل پر بیٹھتے ہوئے بولے۔
 ”میں کوئی کام نہیں کر رہی تھی۔“ اس نے ان کے بلڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا تو نیل نے ذرا سی گردن موڑ کر دیکھا پھر اپنے سامنے فائل کھول دی اور بظاہر اس پر نظریں دوڑانے لگے جبکہ ذہن مدحیہ کو سوچنے لگا تھا۔
 آواز ہمیشہ کی طرح کھٹکتی ہوئی تھی۔ کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کسی دباؤ میں ہے۔ بلکہ یہاں سے بھی آزاد و جب ہی تو اپنے بارے میں فیصلہ کر کے خوش ہو کر انہیں بتا رہی تھی۔ ان کی ساعتوں میں ابھی بھی اس الفاظ گونج رہے تھے۔ جو ان کی روح پر کسی تازیانے سے کم نہیں تھے اور جب آسید پھو بھی سنیں گی تو۔
 اس سے آگے سوچ کر ہی وہ پریشان ہو گئے اور بے حد مضطرب۔ تب ہی صباحت انہیں پکار کر پوچھنے لگی۔
 ”نیل بھائی! اس کا فون تھا؟“

”کب؟“ انہوں نے بہت سنبھل کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
 ”ابھی کچھ دیر پہلے جب آپ لابی میں کھڑے تھے۔ مجھ سے مت چھپائیے میں نے خود تیل سنی تھی اور اٹنڈ کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ صباحت کے ذہن میں علی جمائیکر کا خیال تھا جب ہی وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کا کیا کیا۔

”پھر اس میں اچھنے کی کیا بات ہے۔ کیا میرا فون نہیں ہو سکتا۔“ انہوں نے تنبیہی انداز میں کہا۔
 ”ہو کیوں نہیں سکتا۔“ وہ الجھ گئی۔
 ”پھر؟“

”پھر یہ کہ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔“ انہیں ایک دم غصہ آ گیا۔
 ”ہاں چھپا رہا ہوں، ضروری نہیں ہے کہ ہر بات تمہیں بتائی جائے۔“ انہیں ایک دم غصہ آ گیا۔
 ضبط کرنے کی وجہ سے۔

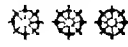
”اور تم آپ کیا جاننا چاہتی ہو۔ تمہارے بارے میں پھوپھو نے جو فیصلہ کرنا تھا اگر لیا اور اس پر تم سے کروالیے اور شاید علی جمائیکر کو بھیجا بھی چکی ہیں۔“
 ”میں جانتی ہوں۔“ وہ ان کے غصے سے خائف ہو کر بولی۔
 ”پھر اور کیا جاننا چاہتی ہو۔ اس نوٹس پر علی جمائیکر کا رد عمل تو مجھے نہیں معلوم اور نہ ہی میں قیاز ہوں۔“ ان کا لہجہ ہنوز تھا۔ جس پر وہ چڑھ کر کہنے لگی۔
 ”آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ بالکل میری طرح ہیں آپ۔ بزدل اور کم ہمت۔ اپنے آپ پر ذرہ برابر بھرا

”ہا چانک جیسے ٹوٹ گئے۔“ اپنے آپ پر بھروسا ہوتا تو یوں جانے دیتا اسے، کبھی نہیں اور وہ بھی کیسی بول کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔
 وہ ان کے ٹوٹتے لیجے پر کچھ گم صم سی ہو گئی تھی۔

تی ہو، اب وہ کیا کرنے جا رہی ہے؟“ انہوں نے اپنے خیال سے نکل کر اسے دیکھا اور اس کے نفی پر گرمی سانس کھینچ کر بولے۔

احت کے صرف ہونٹ کھلے تھے، حلق سے آواز نہیں نکلی تھی اور نیل بھی جیسے کسی پاتال میں سے

ہاس کا فون آیا تھا۔ خود تار ہی تھی کہ وہ شادی کر رہی ہے۔ شاہ تیور کے ساتھ۔“
 صباحت کا سر نفی میں ہلٹا چلا گیا اور نیل نے جیسے تھک کر چیڑ کی بیک پر سر نکالیا تھا۔



یہ بعد صباحت اپنی جگہ سے اٹھ کر نیل کے پاس آئی اور آہستہ سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی
 ”مائی! یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے ہمیں۔“
 ہاتھ تھام کر اپنے سامنے کرتے ہوئے کہنے لگے۔

ارائیں، ہمارے ماں باپ کا ہے۔ جنہوں نے اپنی اپنی اثا میں اولاد کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ اگر ہماری ماںیں کبیر و ماثر کر لیتیں تو ہم ادھورے ہوتے نہ ہمیں ایسے حادثات پیش آتے۔ میں مدحو، تم، ہم ابھی مکمل نہیں ہے۔ ہمارے اندر ہمیشہ ایک محرومی کا احساس رہا جس نے ہماری شخصیت کی تکمیل دی۔

”رجد حساس۔ اس کے ساتھ تمہارے لاشعور میں ہمیشہ یہ خوف رہا کہ کہیں کوئی تمہیں تمہاری ماں یا ندوے مارے۔ ہر مقام پر جھپتی اور ٹوٹی چلی گئیں۔ یہ نہیں تھا کہ تمہارے اندر لڑنے اور احتجاج اکت ہی نہیں تھی۔ تھی، لیکن اس خوف نے تمہیں اپنا دفاع تک نہیں کرنے دیا۔“

”جو اس خوف نے الٹا اثر ڈالا۔ یعنی تمہارے بالکل برعکس وہ بے حس، خود سر اور باغی ہو گئی اور اپنی نہ ہر ایک سے لینے لگی اور وہی ٹھیک ہے۔ جو نہ جھپتی ہے، نہ ٹوٹی ہے۔ اور جو چاہتی ہے، پھینک دیتی ہے۔“
 ”اور انہیں کرنی۔ میں اب سے نہیں، شروع سے اسے پسند کرنا ہوں۔ مجھے وہ چنچ چلا کر اپنی بات منوالی چلی گئی۔ لیکن وہی بات جو ابھی تم نے کہی کہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مجھے اپنے آپ پر بھروسا

بست اور اعتماد کی کمی نے ہی مجھے بزدل بنادیا، جو میں اس کے سامنے اظہار نہیں کر سکا اور تمہاری طرح نظام پر جھٹکا اور ٹوٹنا چلا گیا۔ حالانکہ سب لوگ ہم سے بہت محبت کرتے ہیں، لیکن یہ ساری محبتیں بھی محرومی کے احساس کو کم نہیں کر سکیں۔ اس لیے ابھی صبح وقت پر صبح فیصلہ نہیں کر سکے۔ ہم ڈرتے ڈرتے رہیں گے۔“

”کچھ نہیں دیکھ تھا،“ تنہی بھی سٹ آئی تھی۔
 ”ہاں کچھ ہی نہیں سن رہی تھی۔ جب آخر میں انہوں نے ہونٹ بھیج کر جانے بقیہ تنہی اپنے اندر دھکی لی کوا ہر آنے سے روکا، تب تنہی: دنی آواز میں پوچھنے لگی۔

اپنے آپ کو قصور وار سمجھ رہے تھے۔ شاید ان کے لشعور میں کہیں یہ خیال تھا کہ وہ اگر صحیح وقت پر اپنے اظہار کرنے کے ساتھ اسے خوبصورت زندگی دینے کا وعدہ کرتے تو وہ بھی فرار کا راستہ اختیار نہ کرتی اور یہ اس کے ہر عمل کے ذمہ دار رہی ہوں گے۔

نہیں تمہیں سمجھا سکتا روک سکتا ہو! انہوں نے بے بسی اور دکھ سے سوچا تھا۔
ہرات کے تیسرے پیر جب وہ ہر طرح سونے کی کوشش میں ناکام ہو گئے تو اٹھ کر میسر پر آگئے۔ خاموش ہو کر سر سر ہٹ، بہت لمبا سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ جبکہ روشنی کہیں نہیں تھی۔ ان کا دل چاہا، ساری وجہ تک کریمیں ننگے فرش پر سو جائیں۔ کتنی دیر ادھر سے ادھر ٹھل کر وہ اپنے ذہن کو پرسکون کرنے کی کرتے رہے اور جب کسی حد تک کامیاب ہو گئے تب لانی میں آکر امریکا کی کال مانے لگے، کیونکہ خود کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ انہیں بار بار امریکا کا خیال بھی آ رہا تھا کہ وہ اگر مدیہ کے ساتھ وفاداری نبھاتا تو وہ کبھی

سے نہ جاتی۔ بہر حال چند لمحوں بعد جب ادھر احوال سن پر آیا تو وہ چھوٹے ہی بولے تھے۔
نہارے ایک غلط قدم نے یہاں کس کس کی زندگی خراب کی۔ کبھی سوچا تم نے۔
وہ؟ نیل بھائی! کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ احمران کی آواز سن کر جہاں خوش ہوا وہاں الجھ بھی گیا تھا۔
مرا چھی طرح سمجھ رہے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ انہوں نے جج کر کہا تو احمری جیسے سمجھ کر گہری سانس کھینچ

میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا جس پر شرمندہ ہوں۔
اب تم کیوں شرمندہ ہو گے۔ شرمندہ تو میں ہوں، میں نے پھپھو کو یقین دلایا تھا کہ مدحو کے لیے تم سے بہتر اور بس ہو سکتا۔ ان کا لہجہ ہنوز تھا۔

نپ کو شرمندہ ہونا بھی چاہیے، کیونکہ آپ نے پھپھو سے غلط بیانی کی تھی۔ ورنہ آپ اچھی طرح جانتے مدحو کے لیے بہتر کون تھا۔ احمران کی بات سے خائف ہونے کے بجائے آرام سے بولا تو انہوں نے مکر پر چھا۔

نیل! احمران نے ان پر چڑھے، اتنی خول پر کاری ضرب لگائی تھی کہ ان کا پورا وجود جھنجھٹا گیا۔ بند ہونٹ کھلے۔
نور آواز نکلی تھی۔

نیل! احمران نے ان پر چڑھے، اتنی خول پر کاری ضرب لگائی تھی کہ ان کا پورا وجود جھنجھٹا گیا۔ بند ہونٹ کھلے۔
نور آواز نکلی تھی۔

نیل! احمران نے ان پر چڑھے، اتنی خول پر کاری ضرب لگائی تھی کہ ان کا پورا وجود جھنجھٹا گیا۔ بند ہونٹ کھلے۔
نور آواز نکلی تھی۔

نیل! احمران نے ان پر چڑھے، اتنی خول پر کاری ضرب لگائی تھی کہ ان کا پورا وجود جھنجھٹا گیا۔ بند ہونٹ کھلے۔
نور آواز نکلی تھی۔

نیل! احمران نے ان پر چڑھے، اتنی خول پر کاری ضرب لگائی تھی کہ ان کا پورا وجود جھنجھٹا گیا۔ بند ہونٹ کھلے۔
نور آواز نکلی تھی۔

”اور نیل بھائی! مدحو؟“
”اس نے فرار کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اپنے آپ سے بھی بھاگ رہی ہے۔ پتا نہیں کہاں تک جائے گی۔ کرے کسی راستے میں جج اس کی منزل آجائے وہ پالے اپنی منزل۔ ہم میں سے کوئی ایک تو۔“ وہ بولے۔
خود ہی چونے اور جیسے اپنی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔
”مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ نیل بھائی! اور جب ممانیں گی تو کتنی پریشان ہوں گی۔“ وہ رو بائی ہوئی۔
”دکھ اور پریشانی کی بات تو ہے، لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں۔ بہر حال ابھی پھپھو کو معلوم نہیں ہوتا چاہیے۔ تمہاری ٹینشن انہیں کیا کم ہے۔“
”اور۔ اور کیا کہہ رہی تھی مدحو؟“

”کچھ نہیں، بس یہی بتایا کہ وہ شادی کر رہی ہے۔“
”مجھے لگتا ہے۔ وہ پاگل ہو گئی ہے یا پھر اسے معلوم ہی نہیں ہو گا کہ میرا معاملہ کورٹ میں چلا گیا ہے۔ نے پر سوچ انداز میں کہا تو نیل کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے پھر اٹھتے ہوئے بولے۔
”بس ختم کرو یہ موضوع۔ کہیں پھپھو سنتی ہوئی نہ آجائیں۔ اور ہاں دیکھو، میں تمہارے لیے ایک کتاب تھا۔ وہ نیکی کے لباس رکھی ہے، لے لو۔“
اس نے وہیں کھڑے کھڑے کتاب کی طرف دیکھا پھر منہ بنا کر بولی۔
”میرا کچھ پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔“

”دل چاہے یا نہ چاہے پھر بھی پڑھنی ہے۔ اٹھاؤ اسے۔“ انہوں نے رعب سے کہا تو اس نے ہلکا سا اٹھائی اور وہیں کھینچنے لگی تھی کہ وہ ٹوک کر بولے۔
”یہاں نہیں اپنے کمرے میں جاؤ۔ مجھے لیکچر تیار کرنا ہے۔“
”تیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ ایسے ہی لیکچر دینے میں ماسٹر ہیں۔“

وہ تپتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل گئی تو انہوں نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا پھر آکر لیٹ گئے کرنے کا تو بہانا تھا۔ اصل میں تنہائی چاہتے تھے۔ حالانکہ جانتے بھی تھے کہ تنہائی کتنی عذاب ہوگی مگر اذیت پسند ہو رہے تھے۔ اپنے جرم پر خود اپنے آپ کو سزا دینا چاہتے تھے۔ مدیہ سے محبت کر کے انہوں ہی کیا تھا۔ وہ تو ایسا ہی سمجھ رہے تھے۔ بلکہ شروع سے خود کو سرزنش کرتے آ رہے تھے۔ جانے کیوں کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ کوئی بہت اعلیٰ اور ناقابل حصول نہیں تھی، لیکن انہیں اپنے تھی۔ سب سے الگ، سب سے جدا۔ شاید اس لیے کہ نظروں میں سما کر ان کے دل میں اتار گئی تھی اور اتار جائیں وہ یوں ہی سب سے الگ، سب سے جدا لگتے ہیں۔ بہر حال اس میں ان کا شعوری عمل دخل یوں بھی دل کے معاملے میں کبھی کبھی انسان بالکل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ وہ بھی بے اختیار تھے اس انہوں نے بھی اس کے حصول کی تمنا نہیں کی تھی۔ انہی محبت کو اس غرض سے پاک ہی رکھا تھا اور سوچا کہ وہ ان کی نہیں تو کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس اس کے لیے اچھا ہی سوچتے تھے۔ جب کے ساتھ مل گئی ہوئی تھی تب بھی وہ خوش تھے تو اس خیال سے کہ وہ احمر کے ساتھ خوش رہے گی۔ کہ تھی ادنیٰ کا خیال آتا تو وہ فوراً سر جھٹک دیتے تھے۔

پھر انہیں احمر کے باہر شادی کر لینے کا دکھ بھی اس کی وجہ سے تھا۔ ایک بار بھی اپنی محبت میں خود نہیں سوچا۔ بس اس کے دکھ کا احساس تھا جو وہ اب تک احمر سے ناراض تھے۔
اور اب گو کہ اس نے بہت خوش ہو کر بتایا تھا کہ وہ شاہ تیمور کے ساتھ شادی کر رہی ہے، لیکن اندر لگتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ ان کے اندر اسے پانے کی کوئی تمنا جاگ اٹھی تھی، بلکہ انہیں یقین تھا کہ اگر دیر یا نہیں ہو سکتی۔ وہ یقیناً ”دھوکا کھانے جاری ہے اور یہ سراسر اس کا اپنا عمل، اپنا فعل تھا۔ اس کے

ساتھ ہی خوش رہ سکتی ہے۔ بس اب دیر نہیں کریں خلیل بھائی! س سے پہلے کہ۔۔۔“ احمر کی بات جاری
لاسن کٹ گئی۔
”میرے خدا!“ ان کا ریسور والا ہاتھ یوں نیچے گرا جیسے اس میں جان ہی نہ ہو، پھر اپنے کمرے میں بجز
کھینٹے ہوئے آئے تو مدحیہ کے ساتھ احمر کا وہ بھی ان کے ساتھ تھا۔

~~*

شاہ تیسوڑ سے پچھو شہر یانو کے پاس جموڑ کو خود شاہ پور چلا گیا تھا۔
اور گو کہ رست باؤس اور کالج کی نسبت وہ پھوپھی کے گھر میں خود کو محفوظ محسوس کر رہی تھی اس
سکون سے سو نہیں سکی۔ رات بھر وقفہ وقفہ سے اس کی آنکھ کھلتی رہی تھی پھر بھی من اس نے جلدی
دیا اور منہ ہاتھ دھونے کے بعد کمرے سے نکل کر پچھو شہر یانو کو ڈھونڈتی ہوئی گول برآمدے میں آئی تو
بہی سحر نگین بیابوں والی چارپائی پر بیٹھی روئی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے مرغیوں کے آگے ڈال،
اسے دیکھا تو قدرے حیرت سے پوچھنے لگی۔

”تم اتنی جلدی اٹھ گئیں؟“
”بس اچانک آنکھ کھل گئی پھر میں نے دوبارہ سونے کی کوشش نہیں کی۔“ وہ کہتی ہوئی چارپائی کے کنارے
گئی۔

”آرام سے بیٹھو۔ لمبی پیوگی۔“
”نہیں! لمبی نہ چائے سب کے ساتھ ناشتا کروں گی۔“ وہ اس کے سامنے سے روئی کے ٹکڑے
مرغیوں کو ڈالتے ہوئے بولی۔

”سحر خاموش رہی تو قدرے توقف سے پوچھنے لگی۔
”پچھو کب اٹھیں گی؟“
”امی تو آؤ ان کے وقت ہی اٹھ جاتی ہیں۔ ابھی قرآن شریف پڑھ رہی ہیں۔ پھر پہلے احمد اور حسن کو
گی اس کے بعد ہماری باری آئے گی۔“ سحر یہی کہتی تھی کہ وہ ناشتے کی وجہ سے پچھو کا پوچھ رہی ہے؟
پورا پروگرام بتا ڈالا۔ تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”ہماری باری نہ بھی آئے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“
”کیوں تم ناشتا نہیں کرتیں؟“
”کبھی کرتی ہوں، کبھی نہیں۔ ویسے جب سے یہاں آئی ہوں۔ میرا مطلب ہے شاہ پور تو بلیا
کراتی ہیں۔“ اس نے کہا اور شہر یانو کو آتے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”السلام علیکم پچھو!“
”جیتی رہو۔ بیٹھو، کھڑی کیوں ہو گئیں۔ یا اگر ناشتا کرنا چاہو تو احمد حسن۔“
”نہیں پچھو! میں آپ کے ساتھ کروں گی۔“ وہ فوراً ”کہہ کر بیٹھ گئی۔
”اچھی بات ہے۔“ شہر یانو آگے بڑھ گئیں تو سحر اسے متوجہ کر کے پوچھنے لگی۔
”سنو رات شاہ تیسوڑ سے تھے کہ بابا جان تم دونوں کی شادی کر رہے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہانے پر اکتفا کیا۔
”لیکن تمہاری امی اس شادی کو تو مان نہیں رہیں۔ وہ جو تمہاری بہن کی ہوئی ہے۔ وہ
کر رہیں۔“
”میرا خیال ہے میری شادی کے بعد مصاصبا کی رخصتی پر آمادہ ہو جائیں گی۔“ اس نے یقین سے
سے پوچھنے لگی۔

ماری شادی پر آمادہ ہو گئیں؟“

”مانہ ہوں میں تو آمادہ ہوں۔“ وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسی۔
”ہاں دیکھ رہی تھی جیسے اسے سمجھ نہ پاری ہو۔“

”ہیں یہ بات عجیب کیوں لگ رہی ہے۔ میری شادی کا فیصلہ میرے دادا نے کیا ہے اور میں ان کے فیصلے سے
وں۔ جس پر ماما کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے اور اگر اعتراض کریں تب بھی بابا جان کے نزدیک میری خوشی
م ہے۔ میں شاہ پور میں رہنا چاہتی ہوں اور مجھے شاہ تیسوڑ پسند ہیں۔“

”میری نا سچائی پر تعجب کا اظہار کرنے کے بعد وضاحت کر رہی تھی کہ اپنے پیچھے آہٹ محسوس کر کے خاموش
بروز اسی گردن موڑی تھی کہ شاہ تیسوڑ سامنے آگیا۔ اس کے ہونٹوں میں دلی دنگش مسکراہٹ دیکھ کر وہ سمجھ
وہ اس کی آخری بات سن چکا ہے۔ پھر بھی انجان سی ہنسنے کی کوشش کرنے لگی۔ تو وہ براہ راست اس کی
میں دیکھ کر بولا۔

”باکھ رہی تھیں ذرا پھر سے کہو۔“

”میری بات دہرایا نہیں کرتی۔“ وہ ایک اداسے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں کہاں رہی ہو؟“ شاہ تیسوڑ نے فوراً ”آگے آکر اس کا راستہ روکا تو وہ مسکرا کر بولی۔

”ہیں میں ڈائننگ ہال تک۔“ پھر پلٹ کر سحر سے مخاطب ہوئی۔ ”چلو سحر ناشتا کر لیں۔“

”جھانسنو ناشتے کے بعد کیا پروگرام ہے۔ میرا مطلب ہے میں رہنے پر جا رہا ہوں۔ اگر چلنا چاہو تو۔“
”ہیں میں آج پچھو کے پاس رہوں گی۔ رات تو وہ جلدی سو گئی تھیں۔ میری ان سے زیادہ بات ہی نہیں
اس نے سہولت سے منع کرتے ہوئے کہا تو شاہ تیسوڑ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

”اٹھک ہے۔ تم ابھی ایک دو دن نہیں رہو بلکہ جب تک تمہارا دل چاہے۔“
”دل کی بات نہ کریں۔ دل تو جتنا نہیں کیا کیا چاہتا ہے۔“ وہ کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی تو اس کے پیچھے دیکھتے
ہو پور ڈاسے کندھے اچکا کر مسکرایا پھر سحر کو اپنے جانے کا پتا کر رہیں سے باہر نکل گیا تھا۔

”کہہ شہر یانو کا رویہ اس کے ساتھ لیا دیا تھا۔ اس کے باوجود ناشتے سے فائدہ نہ ہوتے ہی وہ اسے گھر کر بیٹھ گئی
بریک یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی ساتھ لگاؤ کا مظاہرہ بھی کیا۔ جس سے شہر یانو کی سرد مہری
نا تھی۔ وقفہ وقفہ سے بے اختیار ہو کر کبھی اس کا گال چھوتی، کبھی پیار سے ہاتھ ہاتھوں میں لے لیتی اور
نا سے بھی اظہار کر دیا۔

”بہت پیاری بیٹی ہو۔ اگر بابا جان تمہیں تیسوڑ کے ساتھ منسوب نہ کر چکے ہوتے تو میں تمہیں ہمیشہ کے لیے
ن لے آتی۔“

”ہو!“ وہ ان کا مطلب سمجھ کر شہر یانو نے اسے گلے لگا کر پیار کیا پھر پوچھنے لگی۔

”خوش ہوتا؟“

”لیکن مجھے ڈر بھی لگ رہا ہے۔“ اس نے اپنے ناخنوں سے کھیلے ہوئے کہا۔

”ہاں ڈر کیوں لگ رہا ہے۔ تیسوڑ ماشاء اللہ بہت اچھا بہت محبت کرنے والا لڑکا ہے۔“

”لیکن۔“ وہ ہچکچا گئی۔

”نہ کیا؟ کہو بیٹی! جو بھی بات سے کہہ ڈالو۔ کیوں ڈرتی ہو۔“ شہر یانو نے بہت اچانکیت سے کہا۔

”ڈنکوں پچھو اصل میں امی کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ وہ کہتی تھیں، اگر ہم شاہ پور گئے تو ہمارے ساتھ بھی
سنا سوچ کر ڈرتی ہوں۔“ اس نے رک رک کر اپنے ڈرنے کا سبب بتایا تو شہر یانو فوراً ”بولی تھیں۔
سے نہیں بیٹا! تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہو گا۔ تم اور صبا تو اس گھر کی بیٹیاں ہو اور اپنی بیٹیوں کے لیے
مکے بڑے سخت اصول ہیں۔“

تو کہیں فوراً چلا گیا اور چند لمحوں بعد ہی علی جہانگیر آگیا تھا۔
 عتاب ہو گئے تھے تم؟ ”انہوں نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اسے دیکھا۔
 ”نہا چچا جان!“ علی جہانگیر ان کے پاس آ بیٹھا اور ہاتھ میں پکڑا لفافہ ان کے سامنے کر دیا۔
 ”یہ ہے؟“ انہوں نے لفافہ لیتے ہوئے پوچھا۔
 ”خود دیکھ لیں۔“

”ن نے چائے کا کپ رکھ کر لفافے میں سے بیچہ زنکا لے اور پھر تحریر پر نظریں دوڑاتے ہوئے ان کی پیشانی پر
 کا خیال بنایا تھا۔

ناگہ بغور انہیں دیکھ رہا تھا۔ آخر میں ان کے ہونٹ بھینپنے پر کہنے لگا۔
 ”ایسا نہیں چاہتا چچا جان! اور صباحت بھی نہیں چاہتی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس اقدام کے
 مجبور کیا گیا ہے۔“

”یوت ہے تمہارے پاس؟“ انہوں نے سوچتے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔
 ”یوت۔“ وہ کہہ کر ہونٹ بھیج گیا۔

مکندر جو تک کر دیکھنے لگے تو قدرے توقف سے مزید گویا ہوا۔
 ”چچا میں تو صباحت سے تصدیق کروا سکتے ہیں۔ میں کسی پلاننگ کے تحت اس کی زندگی میں داخل نہیں ہوا
 نے اس وقت ایک دوسرے کو پسند کیا جب ہم ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اور تب
 تھا مجھے بھی آپ کی طرح سب کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کیونکہ بابا جان نے
 ات میں ہی جان لیا تھا کہ وہ آپ کی بیٹی ہے۔“

”جان نے۔“ وہ کسی طرح اپنی حیرت نہیں چھپا سکے۔ ”وہ کب کہاں ملے تھے صباحت سے؟“
 ”اسی گھر میں۔ اتفاق سے جس روز وہ آئی تھی بابا جان ہمیں موجود تھے اور یہ جاننے کے بعد کہ وہ آپ کی
 انہوں نے مجھے منع کیا تھا کہ میں اسے اپنے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔“

”کی تفصیل بتا رہا تھا اور شاہ سکندر کا ذہن کہیں اور بھٹک گیا۔ جب بابا جان نے ایک دن اچانک انہیں بلا کر
 کہہ ڈاکٹر آسیہ کے پاس ان کی کوئی اولاد ہے اور اگر ہے تو اسے اس کا حق ملنا چاہیے۔ اس وقت وہ کتنے
 گئے تھے کہ پتا نہیں آسیہ کے پاس کا بیٹا ہے یا بیٹی۔ جبکہ بابا جان جانتے تھے اور باقاعدہ اسے لانے کا پلان
 بناتے تھے۔“

”کیا سوچنے لگے چچا جان؟ میرا یقین کریں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں صباحت کے ساتھ اتنا ہی فیئر ہوں
 آپ کے ساتھ۔“ علی جہانگیر نے عاجزی سے ٹوکتے ہوئے کہا۔

”انہوں نے اسی سوچتے ہوئے انداز میں ہوں کی آواز نکالی پھر سگارا اٹھا لیا اور اسے سلگانے کے بعد
 علی جہانگیر کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”میں مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“
 ”چچا جان! آپ ایک بار ڈاکٹر آسیہ سے ملیں۔ انہیں بتائیں کہ صباحت اور میں۔۔۔“ وہ روانی سے بولتا
 اٹھاموش ہو گیا۔

”ہے پہلے میں صباحت سے بات کرنا چاہوں گا۔ تمہارے پاس اس کا نمبر تو ہو گا؟“ انہوں نے جب سے
 لے ہوئے پوچھا اور جو لفافہ وہ لایا تھا اس پر نمبر لکھنے کے بعد اسے جانے کا کہا تو وہ کچھ جربز سا ہو کر کمرے
 لایا تھا۔

مکندر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد اپنے موبائل پر نمبر پیش کیے تھے۔

لپٹا رہی اور اٹھنے کے ساتھ جیلو کی آواز آئی تھی۔

”جی، میں نے سنا ہے کہ وہ اپنی بیٹیاں غیروں میں نہیں بیاہتے۔“
 ”یہ حقیقت ہے اور جو کچھ تمہاری ماں نے تم سے کہا۔ اس پر میں یہی کہوں گی کہ وہ عورت اپنی جگہ صحیح
 اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کے بعد وہ تمہارے سامنے شاہ پور والوں کی کوئی اچھی تصویر پیش نہیں کر سکتی
 تھی۔ یقیناً اس نے تمہیں ڈرایا ہو گا۔ اس لیے تمہارے اندر خوف ہے۔“ شہرانا نے کچھ فیہ جانب اور
 مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو وہ تائید کرتے ہوئے بولی۔

”جی، اور بے بنیاد تو نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے۔ پاپا بھی تو بہت اچھے بہت محبت کرنے والے انسان ہیں
 بھی انہوں نے ماما کو طلاق دے دی تھی۔“

”اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر بابا جان تمہاری ماں کو طلاق نہ دلاتے تو یہاں دو گھر برباد جاتے
 شہرانا کے ایک ہی جملے سے ان ساری باتوں کی تصدیق ہو گئی تھی جو اسے شاہ تیسو نے بتائی تھیں۔

”ہاں۔“ اس نے ماں کی صورت گہری سانس کھینچی۔
 ”میری بات سمجھ گئی ہو نا۔ علی اور تیسو کے ساتھ وہ مسئلہ نہیں ہے جو تمہارے باپ کے ساتھ تھا۔ بابا جان
 جتنی محبت تمہارے باپ کو واپس لانے میں کرنی پڑی تھی اس سے زیادہ تمہارے اور صبا کے حصول کے لیے

پڑ رہی ہے۔ صرف اس لیے کہ انہیں شاہوں کی بیٹیاں غیروں میں نہ چلی جائیں۔ تم اپنے دل سے سارے
 سارے خوف نکال دو۔ تمہارے اور صبا کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ بلکہ بہت خوش رہو گی تمہارا۔“
 ”میں ابھی بھی بہت خوش ہوں۔“ اس نے خوشی کا اظہار شہرانا کے گلے میں بازو ڈال کر کیا تھا۔

~~*

ٹھیک دسویں دن شاہ سکندر کی واپسی ہوئی تھی اور اپنے استقبال کے لیے آنے والوں میں علی جہانگیر کو کچھ
 کچھ ششکے تھے۔ حالانکہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، البتہ اس کے چہرے پر سفیدگی غیر معمولی تھی
 انہوں نے پہلی نظریں ہی محسوس کی اور اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے پوچھا۔

”سب خیریت ہے نا؟“

”جی! اس وقت وہ یہی جواب دے سکتا تھا، پھر فوراً پوچھنے لگا۔

”اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟“

”دو تین روز کے لیے شاہ پور جاؤں گا اس کے بعد۔“

”نہیں چچا جان!“ وہ فوراً بول پڑا۔ ”آج آپ میرے مہمان ہوں گے۔ میں اسپیشلٹی۔ آپ کو لے
 ہوں۔“

”کوئی خاص بات؟“ انہوں نے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔
 ”جی!“ علی جہانگیر نے جی کہہ کر ہونٹ بھیج لیے تو انہوں نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔ اسے ساتھ آنے کا

کر کے باہر نکلے اور پھر پہلے اپنے ساتھیوں کو رخصت کیا اس کے بعد اس کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔
 تمام راستہ انہوں نے قصداً ”کچھ پوچھنے سے گریز کیا تھا اور گھر آکر علی جہانگیر یہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ
 کر لیں اس کے بعد بات کرے گا۔ اس لیے انہیں خاص ان کے لیے مخصوص کیے گئے بیڈ روم میں جہاں

چائے کا کمنے کے بہانے نکل گیا تھا۔
 شاہ سکندر ایک سگارا پینے تک بیٹھے پھر شاور لینے کے ارادے سے واش روم کا رخ کیا۔

کچھ دیر بعد جب وہ شاور لے کر نکلے تو کہیں تو کہیں چائے کے ساتھ موجود تھا۔ انہوں نے چھوٹی سی پوچھ
 ”علی کہاں ہے؟“

”جی اپنے کمرے میں۔“
 ”وہاں کیا کر رہا ہے۔“ جھجھو اسے میرے پاس۔“ وہ اب مزید صبر نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے قدرے درشت

”مجھے صباحت سے بات کرنی ہے۔“ انہوں نے اپنا سارا دھیان دوسری طرف رکھ کر کہا۔
 ”جی آپ کون؟“ ادھر سے پوچھا گیا۔ آواز بالکل مدحیہ جیسی تھی۔ وہ سمجھ گئے صباحت ہی ہے۔ کیونکہ مدح
 آپ کون کا سوال نہیں اٹھا سکتی تھی۔
 ”بیٹا صاحب! میں ہوں شاہ سکندر حیات۔“ انہوں نے بڑی محبت سے اس کا نام لے کر کہا۔
 دوسری طرف ایک دم خاموشی چھا گئی۔ پتا نہیں وہ کس کیفیت میں گھبرائی تھی۔ وہ سمجھ نہیں سکے اور چند لم
 رک کر ایک بار کرکے نکلے۔
 ”بیٹا! مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ آپ سن رہی ہو نا؟“

کوئی جواب نہیں آیا۔
 ”صبا! خاموش مت رہو بیٹا۔ میں بہت جلد آپ کے پاس آؤں گا۔ اس وقت مجھے صرف ایک بات کا جو
 ہے۔ وہ یہ جو قطع کا نوٹس آپ نے بھجوا دیا ہے۔ کیا اس میں آپ کی مرضی شامل ہے؟“
 بہت ہلکی سی آواز آئی تھی۔ جیسے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر سسکی کودیا گیا ہو۔
 ”آپ دروری ہو؟“ انہوں نے بہت بے چین ہو کر فوراً پوچھا تھا۔

ادھر سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔
 ”ہائی گا!“ انہوں نے موبائل آف کر دیا اور اس کے رونے کا سبب سوچنے لگے، لیکن کچھ دیر بعد ہی ان کا ذہ
 اس سے آگے کی سوچنے لگا تھا اور پھر وہ اسی وقت آسیر کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔
 شام کے سات بج رہے تھے جب انہوں نے ڈاکٹر آسیر کے روم کے کھلے دروازے پر ہلکے سے دستک
 تھی۔

آسیر ایک خاتون کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔ دستک کی آواز پر ادھر متوجہ ہوئی اور انہیں دیکھ کر ہنسی
 کے ساتھ پیشانی پر بل ڈال کر قد رے ناگواری سے بولی۔

”آپ پلئیز باہر انتظار کریں۔“
 وہ ان سنی کر کے آگے بڑھ آئے اور بڑے آرام سے اس کے سامنے والی کرسی سمیٹ کر بیٹھ بھی گئے تو آسیر
 تماشا کرنے کے خیال سے جلدی جلدی خاتون کو چیک کر کے میڈیسن لکھ کر اسے تھما کر جانے کا اشارہ کر دیا۔
 ”سنس! باقی مریضوں سے کہہ دیں کہ ڈاکٹر صاحب ایک ایمرجنسی کے سلسلے میں باہر جا رہی ہیں۔ اس لیے
 کل دیکھیں گی۔“ خاتون کے جاتے ہی شاہ سکندر نے سنس کو مخاطب کر کے کہا تو وہ آسیر کو دیکھنے لگی۔
 آسیر نے ناچار سنس کو جانے کا اشارہ کیا پھر چیر کی بیک سے کمر نکاتے ہوئے بولی۔

”میں کہیں نہیں جا رہی۔“
 ”اچھی بات ہے۔“ شاہ سکندر اٹھ کر دروازے کے پاس گئے اور ایک نظریا ہر دیکھنے کے بعد دروازہ بند
 آسیر کی طرف پلٹے تو وہ بہت ضبط کرتے کرتے بھی چیخ پڑی۔

”شاہ سکندر حیات! آپ بہت غلط کر رہے ہیں۔“ وہ کہتے ہوئے دوبارہ اسی جگہ آ بیٹھے۔
 ”اب تک جو کچھ میرے ساتھ ہو تا رہا وہ بہت ٹھیک تھا؟“ وہ کہتے ہوئے دوبارہ اسی جگہ آ بیٹھے۔
 ”مجھے نہیں معلوم آپ کے ساتھ کیا ہوا اور نہ میں جانا چاہتی ہوں۔ آپ پلئیز صاف لفظوں میں اپنے
 مقصد بیان کریں اور۔“

وہ روائی میں بولتی ہوئی ہونٹ سمیٹ گئی تو وہ کچھ دیر تک اس پر نظر بس جمائے خاموش بیٹھ رہے پھر
 لفافہ نکال کر اس کے سامنے بھینکتے ہوئے بولے۔
 ”جب میں نے آپ سے کہا تھا کہ صباحت کے بارے میں آپ خود سے کوئی فیصلہ نہیں کریں گی پھر
 نوٹس کیوں بھجوا دیا؟“

”لیے کہ مجھے یہ رشتہ قائم نہیں رکھنا۔“ وہ ہٹو ہٹو سے بولی تھی۔
 ”صباحت! وہ کیا چاہتی ہے؟“ انہوں نے جھپٹتے ہوئے لمبے میں پوچھا۔
 ”اگر ہے اس کی مرضی سے۔“

”نہیں۔“ وہ فوراً ”نوٹ“ گئے۔ ”اس کی مرضی آپ کو معلوم ہی نہیں ہے ڈاکٹر آسیر! آپ خود جو کچھ کرنا
 میں اس پر زبردستی محبت سے یا کسی بھی طرح اسے راضی کر لیتی ہیں۔ یہ جاننے کی آپ نے کبھی ضرورت ہی
 مجھی کہ افضل میں وہ کیا چاہتی ہے۔“

حاف۔ سمجھ گئے شاہ سکندر! میں اپنی بیٹی کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ بہت نیک سعادت مند اور محبت
 والی بچی ہے۔ اس نے کبھی میری کسی بات سے اختلاف نہیں کیا اور اس معاملے میں تو اس نے شروع ہی
 رائے اختیار مجھے سونپ دیا تھا کہ میں جو چاہوں فیصلہ کروں۔“ آسیر نے صباحت کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔
 ”تو خوب اس محبت کرنے والی بچی کی سعادت مندی کا یہ صلہ دیا آپ نے اسے کہ اس کے دل کی بہتی
 نے کا سامان کر دیا۔“ وہ طنز آمیز لہجے میں بولے تھے۔
 ”مطلب ہے آپ کا؟“ آسیر کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”نہ آپ کے بے خبری پر افسوس ہے ڈاکٹر آسیر! میرا تو خیال تھا۔ ماں ہونے کے ناتے آپ بیٹیوں سے بہت
 دران کی ہر بات سے آگاہ ہوں گی اور یہ بھی جانتی ہوں گی کہ صباحت اور علی جہاگیر ایک دوسرے کو پسند
 ہیں۔“ انہوں نے تاسف کے اظہار کے ساتھ کہا تو آسیر کی پیشانی کی شکنوں میں مزید اضافہ ہو گیا لیکن
 انہیں۔

”رحال میں آپ کو آگاہ کر رہا ہوں۔ اس کے بعد یہ کہوں گا کہ جو ظلم آپ نے اپنے ساتھ کیا وہ صباحت پر
 دنا چاہیے۔“ ان کے انداز میں وارننگ تھی۔

”آپ سے کس نے کہا کہ میں نے اپنے ساتھ ظلم کیا تھا۔ نہیں شاہ سکندر حیات! میں زندگی میں کبھی نہیں
 اور میری بیٹی بھی نہیں سمجھتا ہے۔ آج بھی ہو سکتا ہے اسے دکھ ہو اور میرے اس فیصلے کو ظلم سمجھ رہی ہو
 تو وقت گزرنے کے بعد وہ سمجھ جائے گی کہ میں نے اس کے ساتھ ظلم نہیں کیا تھا، بلکہ آنے والے مظالم
 لیا تھا۔“ وہ ان کی وارننگ پر تیز ہو کر بول رہی تھی۔

”شاہ سکندر حیات! آپ کیوں اپنی بیٹی کے دشمن ہو رہے ہیں۔ سمجھتی کی محبت میں بیٹی کو نظر انداز کر رہے
 صرف اس لیے کہ اس نے میری کوکھ سے جنم لیا۔“
 ”خاموش ہو جائیں آسیر! انہوں نے غصے سے ٹوکا تو وہ، نوز اس لیے میں بولی۔
 ہاں، سچ نہیں سن سکتے۔“

”ہی سننا چاہتا ہوں، سچ ہی کہنا چاہتا ہوں اور سچ ہے کہ میں آج بھی آپ سے محبت کرتا ہوں۔“ جانے
 ہانڈہ اچانک غالب آکر انہیں بے اختیار کر گیا تھا پھر فوراً ”ہونٹ“ سمیٹ گئے۔
 ”ایک دم سنائے میں آگئی تھی۔“
 ”اگر وہ ایسا یہ کس موڑ پر لے آئی تھی۔“

ضبط کا عہد بھی ہے، شوق کا پیلا بھی ہے
 عہد و پیلاں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
 درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے نحر برپا
 اور سکون ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے
 کہلے لمبے بہت حیران ہو کر ان ساکت وجودوں کو دیکھ رہے تھے۔ جن کے دل ایک ہی لے پر دھڑک رہے
 ٹکٹن کہتے بے بس تھے دونوں کہ درمیان میں حائل خلیع عبور کرنے کا حوصلہ کر بھی لیتے تب بھی ایک

۔ بڑی مشکل سے خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا۔

”تم روری ہو؟“ فیمل نے آہستہ سے اس کے منہ پر سے تکیہ ہٹایا اور جل تھل کا سماں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔
”صبا! کیا ہو گیا ہے۔ کیوں اس طرح روری ہو؟“ انہوں نے پہلے نرمی سے پوچھا پھر اسے جھنجھوڑا لالہ تو وہ جھجک کر

”میری مرضی میرا دل چاہ رہا ہے رونے کو۔ اور اس سے آپ کا کیا بگڑ رہا ہے۔ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑیں۔“

”یہی تو مشکل ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ وہ اس کے چپخنے پر حیران ہوتے ہوئے بولے تھے۔
”کوئی مشکل نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں جا کر آرام سے بیٹھ جائیں۔“ وہ دوپٹے سے آنکھیں اور ناک صاف کرتے ہوئے بولی۔

”آرام سے۔“ ان کی ذرا سی ہنسی میں دکھ تھا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولے۔ ”چلو منہ دھو کر آؤ۔ پوآنے والی ہوں گی۔“

”آؤ آجائیں ان کے سامنے کیا میں نہیں رو سکتی۔“
”کوئی وجہ بھی ہو رونے کی۔“

”ضروری نہیں ہے۔ بس میرا دل چاہ رہا ہے اور آپ پلیز مجھے منع نہیں کریں۔“ اس نے پھر لٹ کر تکیہ منہ پر دیا تو فیمل ابھگ گئے کہ آخر ایسی کیا بات ہو گئی ہے جو وہ ان سے چھپا رہی ہے۔ گواہیں یقین تھا کہ کوئی بات ہوئی ہو رہے کچھ دیر تک قیاس کرتے رہے۔ زیادہ گمان یہی تھا کہ علی جمائیکر کا فون آیا ہو گا اور اسی نے کوئی ایسی بات کہی ہے جس سے وہ ہرٹ ہوئی ہے یا پریشان ہو کر روری ہے۔ اور یہ طے تھا کہ اس وقت وہ کچھ نہیں بتائے پاس لیے انہوں نے مزید اصرار کا ارادہ ترک کر دیا اور اسے مخاطب کر کے بولے۔

”سنو، میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں لیکن آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔ یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔ اس لیے رونے سے دل بھر جائے تو میرے آرام سے سونے کا خیال کر لینا۔“ اپنی بات ختم کرتے ہی وہ اس کے کمرے نکل گئے۔

’ہرگز نہیں۔ اب میں کسی کا خیال نہیں کروں گی۔ ماما کا بھی نہیں۔“
’جو کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوتی کبھی سب سے ناراض ہو کر سوچنے لگی تھی۔ بے سرو پا سوچیں تھیں جو ہر احساس سے عاری کر رہی تھیں۔ اور اس سے پہلے کہ کوئی ایک احساس بیدار ہوتا، فیمل نے اسے اپنے پاس سے بھی غافل کر دیا تھا۔

بلکہ ادھر فیمل اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ہمیشہ کی طرح کچھ دیر میں ہی وہ ان کے پیچھے نائے کی اور کھڑے کھڑے ایک ہی سانس میں اپنے رونے کا سبب بتا کر کہے گی۔ اب بہت خراب ہیں فیمل نے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کچھ دیر نہیں بہت دیر ہو گئی۔ تب فیمل تشویش میں مبتلا ہو گئے اور کسی طرح رہا نہیں رہا۔ پھر اس کے کمرے میں آ گئے۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ انہوں نے آہستہ آواز میں ایک دوبار پکارا کہ شاید کچھ غصے بیدار ہو جائے، لیکن اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ تب اس کے پاس بیٹھے ہوئے انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا اس کی پلکوں پر موتی چمک رہے تھے اور گالوں پر لکیریں سی بن گئی تھیں۔

”یہ رونا بے سبب تو نہیں ہو سکتا۔“
”میں حقیقتاً بہت دکھ ہو رہا تھا۔ بہت احتیاط سے اس کے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کیا پھر اٹھتے ہوئے بے انداز اس کی پیشانی چوم لی۔ اس سارے جہاں میں ایک وہی تو تھی جس کے ساتھ وہ دیکھ سکھ شیز کرتے تھے اور انہوں نے اس کی آغوش میں اپنے دل پر محسوس ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر اس کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑے رہے۔

”ہائیں اگر علی جمائیکر کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔“

دوسرے تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔
”آئی ایم سوری۔ میں نے آپ کا بہت وقت خراب کیا۔“ کتنی دیر بعد شاہ سکندر بولنے کے قابل ہوئے تو معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”مگر کر سکیں تو ایک بار اور میرا اعتبار کر لیں۔ میرے پیش نظر پہلے بھی صباحت کی بہتری تھی اور ابھی بھی میں اس کا خیال کر کے آیا ہوں۔ آپ کی خاطر وہ علی سے نانا توڑنے پر آمادہ تو ہو گئی ہے، لیکن اس کے بعد وہ خوش رہتا تو دور کی بات، زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ وہ آپ کی طرح بہادر نہیں ہے۔ مجھے مدد دینے سے بڑا ہٹھا کہ وہ بہت بزدل ہے۔ ایسی صورت میں تو آپ کو اس کا اور خیال کرنا چاہیے۔ میں ابھی بھی آپ کو فورس نہیں کر رہا، بلکہ درخواست کر رہا ہوں کہ اگلا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے میری باتوں پر غور ضرور کیجیے گا اور بالکل غیر جانبدار رہے۔ اوسے۔“

وہ اپنی بات ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تو آسیہ کے سینے سے بے اختیار گہری سانس خارج ہوئی، پھر کچھ ٹارنار لہجے میں بولی تھی۔

”میں کچھ نہیں سوچ سکتی جب تک مدد میرے پاس نہیں آ جاتی۔“
”مدد ہے! وہ بری طرح چونکے لیکن خود کو مزید کچھ کہنے سے روک بھی لیا۔ جبکہ ان کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔

”جی، شاہ جمائیکر کی دھمکی کے بعد میں اس کی طرف سے بہت فکر مند ہوں اور صباحت کا فیصلہ بھی اس دھم کا مہم ہون منت ہے۔ میں کیسے اس گھر میں اپنی بیٹی دے سکتی ہوں جہاں اس کی سلامتی کی کوئی ضمانت نہیں۔ سوچتے ہوئے انداز میں بول رہی تھی۔ میں ابھی شاہ پور جا رہا ہوں اور کل انشاء اللہ مدد میرے آؤں گے۔“

انہوں نے بہت سنبھل کر اسے اطمینان دلایا اور خدا حافظ کہہ کر ہانکے تو ان کا اپنا اطمینان رخصت تھا۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ علی جمائیکر کس شدت سے ان کا انتظار کر رہا ہو گا۔ صرف مدد کا خیال تھا جو ہر گاڑی شاہ پور کے راستے پر ڈال دی تھی۔

~~***
اس کے اندر بھی شاہ سکندر کو دیکھنے اور ان سے ملنے کی آرزو تھی۔ لیکن اس نے کبھی مدد میرے کی طرح نہیں کیا تھا۔ بلکہ اسے بھی اظہار سے روکتی تھی۔ کیونکہ اسے آسیہ کا خیال تھا اور اسے دکھ دینے کا تو وہ نہیں سوچ سکتی تھی۔ اس لیے باپ سے فطری محبت کو اس نے ہمیشہ دبا رکھا تھا اور اس کے لیے اسے زیادہ تر وہ نہیں دیتا تھا۔ بس ایک سوچ ہی کافی تھی کہ اس شخص نے اس کی ماں کو دکھ دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ان بھرا جاتا اور محبت جانے کن کوئے تھدروں میں جا چھٹی، جو اگر کبھی سراجا جاتی بھی تو اس کی بڑائی اسے تھک کر سدا جاتی تھی۔ لیکن ابھی شاہ میں شاہ سکندر نے فون کر کے جس محبت سے اسے مخاطب کیا تھا اس سے

بری طرح بکھری تھی کہ اس کے بعد سے اب تک خود کو سنبھالنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ آٹھ سو دن کی آوا جھٹکتے تھے، اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی ان کی شدت میں اضافہ ہی ہو جا رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ باندھنے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ البتہ چھوٹیوں کو روکنے کے لیے اس نے منہ پر تکیہ رکھ لیا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب فیمل آئے اور حسب عادت پہلے اس کے کمرے میں بھانکا تو اسے بے وقت

میں منہ چھپائے دیکھ کر کچھ ہنسنے لگے، پھر پکارتے ہوئے اس کے سر پر آکھڑے ہوئے۔
”صبا! کیا ہو ایسا؟“

اسے زندگی میں پہلی بار فیمل کی آمد بہت بری لگی تھی۔ دل چاہا سارے لحاظ بھلا کر انہیں چلے

ادھر سے پہلی بیل کے ساتھ ہی جس طرح ریسور اٹھایا گیا اس سے یہی لگا جیسے وہ فون کے انتظار میں بیٹھا تھا۔
 ”میں ہوں نیل۔“ انہوں نے اس کی بیل کے جواب میں کہا تو اس بار اس کا انداز مایوسی لیے ہوئے تھا۔

”جی فرمائیے۔“
 ”مجھے یہ پوچھنا ہے کہ شام میں آپ کی صباحت سے کیا بات ہوئی تھی؟“ انہوں نے بغیر کسی تمہید کے اور بڑے یقین سے پوچھا۔

”میری۔“ علی جمالی کی حیرت بھری آواز پر وہ زردے کر بولے۔

”جی آپ کی۔“
 ”جی نہیں، میری صباحت سے بات نہیں ہوئی۔ البتہ چچا جان نے فون کیا تھا۔“

”چچا جان؟“

”شاہ سکندر حیات کیوں خیریت؟“ علی جمالی نے نام بتا کر فوراً ”پوچھا۔ لیکن وہ شاہ سکندر کا نام سننے ہی کا یکدم خاموش ہو گئے اور فون بھی رکھ دیا۔ کیونکہ مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ صباحت کا ردوان ان کی سمجھ میں آ گیا تھا اور اس کا سبب نہ جانا بھی حیرت انگیز نہیں رہا تھا۔ کیونکہ دو سال پہلے طویل مدت بعد جب وہ اپنی ماں سے ملے تھے تو ان کی بھی یہی کیفیت تھی اور انہوں نے تو ابھی تک کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ شام میں یونیورسٹی کے بعد اپنی ماں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ جہاں ان کے دو بہن بھائی اور بھی ہیں۔ جو ان سے اسی طرح ملتے ہیں۔ جیسے اپنی اولادیں۔ سمیرا، راجا اور مریم۔

”کتنے چاہنے والے ہیں ہمارے پھر بھی ہم اکیلے ہیں۔“ انہوں نے صباحت کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا پھر اپنے کمرے میں آکر آرام سے بیٹھ گئے تھے۔

~~*

شاہ سکندر رات بارہ بجے کے بعد شاہ پور پہنچے تھے اور باباجان کے آرام کا خیال کیے بغیر اسی وقت سیدھے ان کے کمرے میں چلے آئے۔ زیرِ پاؤں کی مدھم مدھم دھنسی میں باباجان ہوتا نہیں سو رہے تھے یا یوں ہی آنکھیں بند کیے لیا تھے۔

”باباجان!“ سکندر نے انہیں ہلکانے کے ساتھ ٹیبلٹ کاٹن آن کر دیا۔
 باباجان نے ذرا سی آنکھیں کھولیں اور انہیں دیکھ کر تکیے سے سرواٹھا کرتے ہوئے بولے۔

”نیم سکندر! ابھی آرہے ہو؟“
 ”مدیہ کہاں ہے؟“ شاہ سکندر نے ان کی بات سیکر ان سنی کر کے پوچھا۔ ”نمرے ہوئے سرد لہجے میں جیسے کوئی طوفان چھپا تھا۔

باباجان ایک لحظہ کو ٹھٹھکے پھر فوراً ”انجان بن گئے۔“

”مدیہ؟“ میری بیٹی۔ کہاں چھپا دیا ہے آپ نے؟“ اور کیوں؟“ شاہ سکندر کسی طرح ضبط نہیں کیا رہے تھے۔
 ”آرام سے آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔“ باباجان نے انہیں پرسکون کرنے کی سعی کی۔

”میں آرام سے نہیں بیٹھ سکتا باباجان! جب تک مجھے مدیہ نہیں مل جاتی۔ آپ بتائیں کہاں ہے؟“
 ”ہم کیا بتائیں۔ ہم تو اسے کراچی چھوڑ کر آئے تھے۔ تم کراچی والوں سے معلوم کرو۔“ وہ یقیناً ”پھر تمہیں دے رہے ہیں۔“ جیسے پہلے انہوں نے تم سے تمہاری بیٹی کو چھپایا تھا۔

باباجان نے اتنے ٹھوس لہجے میں کہا کہ کچھ دیر کو وہ خاموش ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس بات میں واقعی مدعا تھا۔
 ”آئیہ نے انہیں ایک بیٹی کا بتایا تھا۔“

”میں کراچی ہی سے آ رہا ہوں باباجان! اور مجھے وہیں سے معلوم ہوا ہے کہ مدیہ وہاں نہیں پہنچی۔“ اس بار شاہ سکندر کا لہجہ کمزور تھا۔

”کیسے نہیں پہنچی۔ ہم خود اس کے دروازے پر چھوڑ کر آئے تھے۔“
 باباجان اپنی بات پر قائم رہ کر تیز لہجے میں بولے۔ ”معلوم کرو اس ڈاکٹرنی سے کہ اب وہ ہم سے اور کیا چاہتی ہے۔ ہم اپنی پوتیوں کے صدمے میں اسے بہت کچھ دے سکتے ہیں۔“

شاہ سکندر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس کا یقین کریں۔ آئیہ کا یا باباجان کا۔ ان دونوں کے درمیان وہ خود کو الٹی اسحق لگتے لگتے تھے۔

”بیٹا! تم ناحق پریشان ہو رہے ہو۔ مدیہ اپنی ماں کے پاس ہے اور اس کی ماں بہت شاطر عورت ہے۔ اس کی س تم نہیں سمجھ سکتے۔ جانتے ہو صباحت کی طرف سے وہ طلع کا دعوا دار کر چکی ہے۔“

باباجان ان سے ہمدردی جتا کر آئیہ کے خلاف بولنا شروع ہو گئے تھے۔

”جی، مجھے علی نے بتایا ہے اور میں اس سلسلے میں آئیہ کے پاس گیا تھا۔ تاکہ اسے نوٹس واپس لینے پر مجبور سکوں۔“ ادھر سے ادھر ملتے ہوئے شاہ سکندر نے رک کر بتایا تو باباجان نے فوراً ”پوچھا۔

”پھر کیا کہا اس نے؟“
 ”اس کا کہنا ہے جب تک مدیہ اس کے پاس نہیں پہنچ جاتی، وہ کچھ نہیں سوچ سکتی۔“

”دیکھ لو اس کی چالاکی۔“
 اگر جو یہ اس کی چالاکی سے تو بہت ہنگامی پڑے گی اسے۔“ شاہ سکندر نے انتہائی تنفر سے کہا اور ایک نظر باباجان کی طرف کران کے کمرے سے نکل آئے تھے۔

پھر مرزا النساء کی نیند خراب ہونے کے خیال سے وہ بیڈ روم میں جانے کی بجائے اپنے اسٹڈی روم میں آ گئے۔
 ما کو جو توں کی قید سے آزاد کیا۔ گلے سے ٹائی کھینچ کر ایک طرف ڈالی پھر مگسٹرا گارڈوں پر دروازہ کھولے۔ ان اٹھ بری طرح بچ رہا تھا۔ کیونکہ باباجان اور آئیہ دونوں کی باتیں ایک ساتھ ان کے ذہن پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ اور اس میں وہ یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ ان دونوں میں سے کون سچا ہے۔ اور کوئی بھی ہوا نہیں مدیہ کا پتا چلنا ہے۔

”کس سے معلوم کروں؟“ انہوں نے سلگتے ذہن کے ساتھ سوچتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ یہاں سب سو رہے تھے لیکن کراچی میں تو اس وقت رات شروع ہوئی تھی۔ اس خیال کے ساتھ وہ اٹھ کر اور اپنا موبائل اٹھا کر آن کیا تھا کہ بزرگ بیٹے لگی۔ غالباً ”کوئی مسلسل ٹرائی کر رہا تھا۔“

پہلو! انہوں نے بہت بے دلی سے پہلو کہا تھا۔
 ”چچا جان! کہاں ہیں آپ؟“ دوسری طرف علی جمالی تھا۔ ان کی آواز سن کر جیسے اس کی جان میں جان آئی۔

”میری بیٹا! میں بالکل بھول گیا کہ مجھے تمہارے پاس آنا تھا۔ ویری سوری۔“ انہیں ایک دم احساس ہوا کہ وہ اس انتظار میں چھوڑ آئے تھے۔ بہت معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”اصل میں بات یہی ایسی ہو گئی تھی کہ میں وہاں رک نہیں سکا اور سیدھا شاہ پور چلا آیا۔“
 ”کس کی کیا بات؟“ وہ غالباً ”اپنے متعلق سوچ کر پریشان ہوا تھا۔“

”وہ بیٹا! مدیہ کا معلوم کرنا تھا کہ کہاں ہے؟“ انہوں نے قصداً ”سرسری انداز اختیار کرتے ہوئے اسی قدر کہا۔
 ”دوبل پڑا۔“

”رہے پر۔“
 ”کہاں؟“ وہ ایک دم پوری جان سے متوجہ ہوئے تھے۔

”رہے پر چچا جان! جہاں مایا جی کا کاش ہے۔ جس روز آپ کینیڈا جا رہے تھے اس روز میں نے اسے وہیں دیکھا۔
 ”وہ کہہ رہی تھی کہ اسے وہ جگہ بہت پسند آتی ہے۔“ اس نے کہا۔ میرا خیال ہے اس کی خواہش کو دیکھتے

ہوئے بابا جان نے اسے وہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ آپ بابا جان سے معلوم کر لیں۔“

علی جہانگیر نے تفصیل بتانے کے ساتھ مشورہ بھی دیا تو وہ چونک کر نکلے۔

”ہاں، ابھی تو بابا جان سو رہے ہیں۔ صبح معلوم کروں گا اور سنو ہم صبح جتنی جلدی ممکن ہو سکے رتبے پر پہنچ جائیں گے۔“

”جی ہمت۔“

”خدا حافظ۔“ انہوں نے موبائل بند کر دیا اور دل تو چاہا اس وقت جا کر بابا جان کو جھنجھوڑا لیں، لیکن ان کی شاطرانہ چالوں کا سوچ کر انہیں ضبط کرنا پڑا۔ اور یہ بھی سوچ لیا کہ جب تک مدحیہ کو حاصل نہیں کر لیتے بابا جان کچھ ظاہر نہیں ہونے دیں گے۔ کیونکہ ان سے کچھ بعد نہیں تھا۔ اپنی بات سچ ثابت کرنے کے لیے وہ مدحیہ کی جان بھی لے سکتے تھے۔ بہر حال انہیں مدحیہ کا پتا چل گیا تھا، اس کے بعد اپنا اگلا اقدام کا سوچ کر وہ کافی حد تک مطمئن بھی ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود تمام رات سو نہیں سکے اور فجر کی اذان کے ساتھ ہی حویلی سے نکل آئے تھے۔

مسلسل ڈیزہ گھننے کی ڈرائیو کے بعد جب وہ کالج پہنچے۔ سورج نکل آیا تھا۔ سرخ بجزری کی روش پر گاڑی روک کر وہ نیچے اترے تو جو کیدار دور سے بھاگا آیا۔

”سلام صاحب!“

وہ سر کے اشارے سے جواب دیتے تیز قدموں سے آگے چل پڑے۔ کالج کا گیٹ کھلا تھا۔ وہ رکے بغیر اندر چلے آئے۔ کوریڈور اور پھر ہال میں کوئی نہیں تھا، نہ کسی کی موجودگی کے آثار نظر آ رہے تھے پھر بھی انہوں نے قدرے اونچی آواز میں پکارا۔

”مدحیہ!“ خاموشی میں ان کی آواز گونج کر رہ گئی۔

”لی لی یہاں نہیں ہیں صاحب!“ عقب سے جو کیدار نے کہا تو فوراً اس کی طرف پلٹے۔

”پھر کہاں ہے؟“

”پتا نہیں صاحب! مجھے بتا کر تو نہیں گئیں۔“ جو کیدار ان کے جارحانہ انداز سے خائف ہو کر بولا۔

”بتا کر نہیں گئی۔ اس کا مطلب ہے یہاں آئی تھی۔“ انہوں نے پر سوچ انداز میں خود کامیابی پر بھرپور کیدار

دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”یہاں سے کب گئی ہیں؟“

”چارپانچ روز ہو گئے ہیں۔“

”کون لے گیا تھا اسے؟“

”شاہ تیور۔“

”یہاں کتنے دن رہی تھی؟“

”پہلے تو جی دو دن رہیں پھر چلی گئیں پھر آئیں تو چار دن رہیں اور جاتے ہوئے پھر آنے کا بھی گئی ہیں۔“

جو کیدار نے باقاعدہ انگلیوں پر حساب لگاتے ہوئے بتایا تو انہوں نے فوراً پوچھا۔

”کب؟“

”یہ تو نہیں بتایا تھا۔ کیا پتا آج آجائیں یا کل۔ آپ شاہ تیور سے معلوم کر لیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے، تم جاؤ اور کوئی ناشتہ وغیرہ کا انتظام کرو۔“

وہ جو کیدار کو بھیج کر گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ اور دونوں باتوں میں سرگم لیا۔ اب اس مقام پر کاہن مزید کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ رات بھر جاگنے نے انہیں اتنا نہیں تھکا تھا جتنا ناکامی نے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ کچھ دیر بعد جو کیدار نے ناشتا کران کے سامنے رکھا تو اس وقت علی جہانگیر بھی آگیا۔

”السلام علیکم پچا جان!“

جس نے علی جہانگیر کی آواز پر ہاتھوں سے سرو اٹھایا تھا اور اسے دیکھ کر انہیں کافی حوصلہ ہوا۔

”بیٹا اب وقت پر آگئے۔“

بابا جان پچا جان! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ علی جہانگیر نے ان کے تے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ہنس پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔ بیٹا! دعا کرو، آگے سب ٹھیک ہو جائے۔“ انہوں نے جو کیدار کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

”یہ کہاں ہے؟“ علی جہانگیر کی نظریں ادھر ادھر بہکتے لگیں۔

”کی تلاش میں تو آیا ہوں۔ پتا نہیں تیور اسے کہاں لے گیا ہے۔ ادھر میں آسمان سے وعدہ کر آیا ہوں کہ مورت مدحیہ کو اس کے پاس لے کر آؤں گا۔ اب بتاؤ میں کیا کروں۔ کہاں تلاش کروں اسے۔“

”مات لوان کا۔ سب کیا دھرا ان ہی کا ہے۔“ ان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

”جہانگیر حیران اور قدرے خائف بھی ہو گیا تھا۔“

دیر بعد خود پر قابو پا کر شاہ سکندر نے ساری باتیں تفصیل سے بتا دیں۔ جنہیں سن کر وہ واقعی چکر اٹھا۔

”ہاں! خاطر خود کو سنبھال کر بولا۔“

”فکر نہیں کریں پچا جان! مدحیہ کو کچھ نہیں ہو گا۔“

بابا جان تک وہ بابا جان کے قبضے میں ہے۔ میں اس کی فکر سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ ایسا کرو تم ابھی شاہ پور جاؤ۔ بطور بابا جان سے معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ مدحیہ کے بارے میں انہوں نے کیا سوچا ہے اور ہاں، اگلے انہیں یہ بتا دینا کہ رتبے پر تمہاری مدحیہ سے ملاقات ہو چکی ہے۔ جبکہ مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی۔

”یہ ہوتا ہے؟“

”اے علی! جہانگیر سمجھ کر اثبات میں سر ہانے لگا۔“

”اب تم جاؤ۔“ انہوں نے اس کا کندھا تھپک کر اٹھا دیا تھا۔

”کون سی جگہ ہے؟“ مدحیہ نے سرسوں پر اچھی خاصی رونق دیکھ کر پوچھا تو شاہ تیور نے کچھ بے دھیانی میں

”جا تھا۔“

”دیر آباد۔“

”دیر آباد ہے۔“ وہ اشتیاق سے بولی تو اس بار وہ متوجہ ہو کر پوچھنے لگا۔

”ہاں، تمہیں حیدر آباد دیکھنے کا شوق تھا؟“

”اس نے سوچا آج تمہیں شاپنگ کرادوں۔“ شاہ تیور نے شاہانہ انداز سے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

”ہاں ہے۔“

”سے کیا سمجھتی ہو۔ جو رانٹی اور کوالٹی یہاں سے کہیں نہیں ملے گی۔“ وہ گاڑی بند کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں دیکھ لینے ہیں۔“ وہ احسان کرتی ہوئی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتری تو سامنے کھڑی بس کے پاس کھڑا

”رہا تھا۔“

”جی! گراچی! گراچی۔“

”شاہ تیور چکر کاٹ کر اس کے پاس آکر بولا تو وہ چونک کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ لیکن اس کا دھیان

”بچنے کی طرف تھا۔“



اس کے قدموں کی رفتار بہت ست تھی۔ شاہ تیمور نے ٹوکا تیرہ سو جھٹک کر تیز تر چل پڑی۔
پھر کئی دکانوں پر رک کر شاہ تیمور نے اپنی پسند سے اس کے لیے سوٹ خریدے۔ وہ کہیں ویسی ظاہر
کسین چپ چاپ دیکھتی رہی۔ آخر اسے آکٹا ہٹ ہونے لگی تو مزید آگے چلنے سے انکار کر دیا۔
”بس چور! میں تھک گئی ہوں۔“
”ارے اتنی جلدی ان کے ساتھ بیچنگ شوز اور جیولری نہیں لوگی؟“ شاہ تیمور نے دوسری چیزوں کے
کراے مزید چلنے کے لیے آکٹا چاہا لیکن وہ منہ بنا کر بولی۔
”پھر سی۔“
”شوز لے لو جیولری پھر سی۔ چلو مجھے بھی جو گرز لینے ہیں۔“ شاہ تیمور نے کہا اور اسے کچھ کئے کاموں

بغیر چل پڑا۔ تو اسے ناچار اس کی تقلید کرنی پڑی۔
پھر شوز اور سینڈل وغیرہ دیکھنے کے لیے وہ شوئیس کے پاس ہی رک گئی تھی۔
شاہ تیمور دکان کے اندر داخل ہو گیا اور سیلز مین سے جو گرز دیکھانے کا کہہ کر بیچ پوچھ گیا۔
سیلز مین فوراً ”حرکت“ میں آگیا اور ایک کے بعد ایک ڈبہ کھول کر اس کے سامنے رکھنے لگا۔
اس نے باری باری سب میں بیز ڈال کر دیکھا پھر چونپند آیا اسے پیک کرنے کا کہہ کر مدحہ کی طرف
وہ شوئیس کے پاس موجود نہیں تھی اس نے اپنے اطراف — نظروں کی پھر دکان سے باہر نکل کر ادھر
کے بعد کاؤنٹر پر آکر منیجر کو مخاطب کیا۔
”ایکسکوز می۔ یہاں ایک لڑکی شوز دیکھ رہی تھی۔ کچھ بتائیں گے کس طرف گئی ہے؟“

منیجر نے پہلے ادھر ادھر دیکھا پھر نفی میں سر ہلایا۔
”کہاں چلی گئی؟“ اس نے سوچتے ہوئے انداز میں سامنے دیکھا جہاں کچھ لڑکیاں کھڑی تھیں۔ پھر
دکان میں جھانکتا ہوا مارکیٹ سے نکلا تو ایک دم سے احساس ہوا کہ وہ اسے چھو چکا ہے اور اس خیال نے
پریشان کر دیا تھا۔ بابا جان کے سامنے جواب دیں سے زیادہ اسے اپنا خیال تھا کہ وہ صحیح گج اسے چاہئے لگاؤ
”نہیں“ وہ کہیں نہیں جاسکتی اور جانے گی کہاں، کسی دکان میں کھڑی ہوگی۔“
وہ خود کو تسلی دیتا ہوا دوبارہ مارکیٹ کے اندر گیا اور پھر ایک ایک دکان دیکھ ڈالی۔ لیکن وہ کہیں منیر
واپس آتے ہوئے اس کی پریشانی میں غصہ بھی شامل ہو گیا تھا کہ وہ لڑکی اسے چکر دے گئی تھی اور
وے کر۔

”فریب، نہیں، نہیں۔“ اس کا دل ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ یقیناً
کے لیے کہیں چھپ گئی ہے۔ وہ ٹریفک میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا اپنی گاڑی کے پاس آیا اور جوشاہزادہ
رکھنے کے لیے پچھا اور واڑہ کھولا تو تھک گیا، وہاں وہ سارے شاپرز رکھے تھے جو مدحہ کے ہاتھ منیر
مطلب تھا کہ وہ باتو نہیں کہیں موجود ہے یا اس کی چیزیں واپس کر کے گئی ہے۔ ایک جسمیں ایسی۔
کتنی دیر گاڑی کے پاس کھڑا رہا۔ شاید ایک گھنٹے سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ تب بہت مایوس ہو کر وہ گاڑی
وہیں سے شاہ پور چل پڑا۔

تقریباً ”ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ حویلی پہنچا تو سید بابا جان کے کمرے کا رخ کیا۔
”السلام علیکم بابا جان!“ اس نے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے سلام کیا۔ تو بابا جان یوں جو
آمد غیر متوقع ہو۔ پھر فوراً ”سامنے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔
”آؤ تیمور! ابھی علی تمہارا ہی پوچھ رہا تھا۔“

”علی۔“ وہ ادھر متوجہ ہوا تو علی جہانگیر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف مصافحے کے لیے آئے
بولے۔

ہوتے ہو یا راکیا کا بیج میں مستقل ذرہ جمایا ہے؟“
”میں بابا جان کے کام سے حیدر آباد گیا تھا۔ ابھی وہیں سے آ رہا ہوں۔“ اس نے علی جہانگیر کا برہنہ ہوا
رکھا۔ پھر اس کے ساتھ بیٹھا تو پوچھنے لگا۔ ”تم کب آئے؟“
”آؤ ہاتھ نہ ہوا ہے اور بس ابھی جانے ہی والا تھا۔“
”ارہا ابھی آتا ابھی جانا میری سمجھ میں نہیں آتا۔“
ری ملازم ہوں۔ اپنا کام بس ایسے ہی چلتا ہے۔“ علی جہانگیر کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اچھا بابا جان! میں
لیلی جان سے مل لوں۔“

ناؤ۔ تمہاری ماں انتظار کر رہی ہوگی۔“ بابا جان نے کہا۔
انگیر نے جاتے جاتے شاہ تیمور کو اشارہ کیا کہ وہ بابا جان سے فارغ ہو کر اس کے پاس آئے۔
درے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے جانے کے بعد بابا جان کو دیکھ کر کہنے لگا۔

”ابن لہو مدحہ پتا نہیں کہاں چلی گئی۔“
”؟“ بابا جان نیکیے کا سہارا چھوڑ کر یکدم سیدھے ہوئے ”کیا کہا تم نے؟ کہاں چلی گئی؟“
”نہیں معلوم کہاں چلی گئی۔ بس کچھ دیر کو میری توجہ اس کی طرف سے ہٹی تھی اور اتنی ہی دیر میں وہ
شاہ تیمور کے انداز میں حد درجہ پیچھے تھکا۔“

”شہر مانو کے گھر سے؟“ بابا جان نے پوچھا تو وہ کتنی دیر نفی میں سر ہلانے کے بعد بولا تھا۔
”میں آج اسے حیدر آباد لے گیا تھا۔“ کچھ اپنی چیزیں لینی تھیں کچھ اس کے لیے، بس وہیں سے لگتا ہے
لے کی تلاش میں بھی پھر میں نے بہت ڈھونڈا اسے۔ کہیں نہیں ملی۔“
”تم آگئے۔“ بابا جان کے لیے کچھ میں ایسی چھین تھی کہ وہ تھلا گیا۔

”راہساری زندگی وہیں کھڑا رہتا۔ میں یہ بھی کر سکتا تھا اگر جو وہ خود سے نہ گئی ہوتی۔ اور مجھے اس کے جانے
پا نہیں ہے۔ دکھ اس بات کا ہے کہ اس نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا۔“
”نہ! بابا جان نے اس کا مطلب سمجھ کر نخوت سے سر جھکا پھر اٹھ کر ادھر سے ادھر ٹھٹھٹے ہوئے بولے۔
”کی ہماری توقع سے زیادہ چالاک نکلی۔ ادھر سکندر الگ، ہمیں پریشان کر رہا ہے۔ خیر یہ بھی اچھا ہے کہ ہم
اس سے کہہ چکے ہیں کہ وہ کراچی چلی گئی اور سنو۔“

”ابن لہو مدحہ رک کر اس سے مخاطب ہوئے۔
”ابن لہو مدحہ کے بارے میں ضرور پوچھ گچھ گا۔“ اسے یہی بتانا کہ وہ آٹھ دس دن پہلے ہی چلی گئی تھی۔ ہم چھوڑ
نے اسے سمجھے۔“

”بے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ ہی اثبات میں سر ہلایا تو بابا جان غصے میں بولے۔
”تم نے ہم نے کیا کہا۔“

”اس نے بابل خواستہ جی کی آواز نکالی تھی پھر اٹھ کھڑا ہوا تو بابا جان نے سخت لہجے میں تنبیہ کر۔
”دار علی کے سامنے کچھ اچھل مت دینا۔ ہمیں اس وقت اس کی آمد خاصی مشکوک لگ رہی ہے۔“
”میرے بعد میری آمد بھی مشکوک لگے گی۔“ وہ سوچتا ہوا ان کے کمرے سے نکل آیا۔

”تا کہ میری نہیں کہاں تھا۔ اس نے لاؤنج میں رک کر جہاں سے پوچھا اور اس کے لڑکھائی ظاہر کرنے پر اپنے
مٹک چلا آیا۔ خود اس کا اس وقت کسی سے بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ علی
نہ اس کے پاس آئے گا اس لیے اس سے ہر قسم کی بات کرنے کے لیے وہ خود کو تیار کرنے لگا تھا۔

♥ ♥ ♥ ♥
”نکبے حد خوفزدہ تھی، اس لیے مٹھی میں جتنے پیسے تھے رکشہ والے کو تھما دیے اور بھاگ کر گیٹ پار کر

میں تمہارے لیے بہت محبتیں، بہت چاہتیں ہیں۔ بہت پیار کرتے ہیں سب تم سے۔ تمہارے بگھر بہت سونا ہو گیا تھا اور ہم سب بہت اداس۔“
 میں تو سب کو بہت تنگ کرتی تھی۔“ وہ گم سم سے انداز میں بولی تھی۔ تب ہی صباحت نے کمرے میں ما۔
 ہی ہیں۔“

نہ گردن موڑ کر دیکھا تو صباحت جڑبڑی ہو کر واپس پلٹنے لگی کہ وہ پکار کر بولی۔

اے ماما کیوں پریشان کیا۔“
 انہیں تو ماما تو بہت خوش ہوئیں تمہارا سن کر اور ہاں تم نیچے سب سے مل کر آ رہی ہو! صباحت
 ارا رہہ ترک کر کے اس کے پاس آئی تھی۔

کوئی نظریہ نہیں آیا۔ میں سیدھی اوپر چلی آئی۔ اس نے جواب دیتے ہوئے بیڈ کی بیک پر سر رکھا تو
 اس مسافت کو سوچنے لگا جو وہ طے کر کے آئی تھی۔
 در اسے دیکھ رہے تھے اور صباحت کی نظریں نیل پر تھیں۔

بہت خاموشی سے سرکتے جا رہے تھے۔ تینوں میں سے کسی کو پتا نہیں چلا کہ آسہ کمرے میں داخل
 اس کی پکار نے ایک دم ہلچل مچا دی تھی۔

ور صباحت چونک کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے۔ جبکہ وہ چونکنے کے ساتھ ہی چھلانگ لگا کر آسہ کے
 جاگتی اور یوں چل چل کر روئی کہ اسے چپ کراتے کراتے آسہ نڈھال ہو گئی تھی۔ آخر سکون کا
 نارا سے سلام دیا اور کچھ دیر اس کے پاس رکنے کے بعد نیل اور صباحت کو لے کر کمرے سے نکل کر آئی
 ہری انداز میں پوچھنے لگی۔

پھوڑ گیا ہے مدحو کو۔“
 میں پھوڑ گیا اس نے کچھ بتایا ہی نہیں اور مجھے اس وقت خیال ہی نہیں آیا کہ میں باہر نکل کر دیکھتا۔ اصل
 اہل آقا تخی خوفزدہ تھی اور اتنا رو رہی تھی کہ میں۔“

ہاتے ہوئے ایک دم خاموش ہو گئے تو آسہ نے مزید نہیں کرید اور ان دونوں کو کھانا کھانے کی تاکید کرتی
 باکرے میں آگئی کل شاہ سکندر اس سے کہہ کر گئے تھے کہ وہ آج مدحہ کو لے آئیں گے۔ اس کے خیال
 سے پھوڑ گئے ہوں گے۔ لیکن مدحہ کا خوفزدہ ہونا اور رونا اس کے خیال کی نفی کر رہا تھا۔ کتنی دیر وہ اسی
 لپکتی رہی۔ پھر سر جھٹک کر لیٹ گئی کہ اصل بات مدحہ سے معلوم ہو جائے گی۔ جسے اس نے انجکشن
 ہاتھ اور شام سے پہلے اس کا اٹھنا متوقع نہیں تھا۔ اس لیے اس کی طرف سے کچھ بے فکر ہو کر آسہ خود
 ٹکی۔ یوں بھی دوسری نیند اس کے معمول میں تھی اور معمول کے مطابق ہی وہ ساڑھے چار بجے اٹھ
 پہلے مدحہ کے پاس جا کر اسے چیک کیا پھر اس کے قریب پریشان بیٹھی صباحت کو دیکھ کر قصداً مسکرا کر

بالر کی بات نہیں ہے بیٹا یہ ابھی تھوڑی دیر میں بہت فریش اٹھے گی۔ جب تک تم چائے کے ساتھ کچھ
 نظام کر لو۔ کیونکہ اس نے دوسرے میں کچھ نہیں کھایا تھا۔“

پہلے بھی تو کھانا نہیں کھایا تھا؟“ صباحت نے اٹھتے ہوئے کہا۔
 مجھے بھی بھوک لگ رہی ہے۔ لیکن پہلے میں شاور لوں گی۔“

بس یہ ماما! اتنے میں بکٹ اور کیگ منگوا لیتی ہوں اور ہاں ماما جی دوبارہ کو دیکھ کر جا چکی ہیں کہہ
 نا کہ جب یہ اٹھے تو مجھے بلا لیتا۔“ صباحت نے دراز میں سے پیسے نکال کر اسے دیکھا۔

آئی۔ آنگن اور برآمدے میں کوئی نظر نہیں آیا تو اس نے کسی کو پکارا بھی نہیں اور اسی طرح بھاگتی ہوئی یہ
 پھاگ کر اوپر آئی تو لالی سے نکلتے نیل کو دیکھ کر بالکل بے اختیار ہو کر ان کے سینے سے جا لگی اور ایسے
 اختیار اس کے آنسو چھلکے تھے۔ جبکہ پورا وجود بچے کی طرح لرز رہا تھا۔
 ”مدحو!“ نیل کو اس اچانک اور غیر متوقع صورت حال نے گنگ کر دیا تھا۔ بہت آہستہ سے اس کے کمرے
 جا مل کر کے اسے اپنی پناہوں میں تولے لیا پھر بھی غیر یقین سے تھے۔

”نیل بھائی! مجھے چھپا لیں، مجھے چھپا لیں نیل بھائی۔ وہ میرے پیچھے آ رہا ہو گا۔“ وہ روتی ہوئی کہہ رہی
 ”کون؟ کوئی نہیں آئے گا۔“ نیل عمل طور پر ان لمحوں کی گرفت میں تھے۔ جانے کیسے یہ چند لفظ کہہ
 ”آپ نہیں جانتے انہیں۔ بس آپ سارے دروازے بند کر دیں۔“ وہ ان کے بازوؤں میں چل کر چڑھ
 کی آواز سن کر صباحت اپنے کمرے سے نکلتی ہوئی پوچھنے لگی۔

”کون ہے نیل بھائی؟“ پھر ایک دم ٹھٹھک کر دیکھنے لگی تو نیل جیسے ہوش میں آ گئے۔ فوراً اسے
 سے تھا مگر خود سے الگ کرتے ہوئے بولے۔

”مدحو ہے۔“
 ”مدحو!“ صباحت بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔ ”کیا ہوا مدحو! تم رو کیوں رہی ہو؟“
 ”یہ سوال جواب بعد میں کرنا، پہلے اسے کمرے میں لے جاؤ۔“ نیل نے صباحت کو ٹوکتے ہوئے کہا۔
 ”آپ! آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ اس نے صباحت کو پھوڑ کر نیل کا بازو تھام لیا۔
 ”کہیں نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ آؤ؟“ نیل اس کا ہاتھ تھام کر صباحت کے کمرے میں لے
 اس کے ساتھ خود بھی بیٹھتے ہوئے بولے۔

”صبا! جاؤ پانی بلکہ گلو کو زلا کر لے آؤ۔“
 صباحت اٹھنے والی قدموں واپس پلٹ گئی اور کچھ ہی دیر میں گلو کو زلے کر آگئی تو نیل نے گلاس لے کر
 ہونٹوں سے لگا دیا۔

وہ ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر گئی۔ پھر باری باری ان دونوں کو دیکھ کر بولی۔
 ”میں سچ بھگت کر رہی ہوں، صبا! نیل بھائی میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ناں۔“
 ”اف مدحو! تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تم کیسی باتیں کر رہی ہو اور تم آئی کس کے ساتھ ہو؟
 حسب عادت پریشان بھی تھی اور فوراً ”ساری باتیں جان بھی لینا چاہتی تھی اور جانتا تو نیل بھی چاہے
 اس کی حالت کے پیش نظر بہت محل کا مظاہرہ کر رہے تھے اور صباحت کو بھی ایک بار پھر ٹوک دیا۔

”تم صبر نہیں کر سکتیں۔ ذرا آرام کرنے دو۔“
 ”ہاں، میں بہت تھک گئی ہوں۔“ اس نے نا انگلیں سیدھی کرتے ہوئے کہا تو نیل اٹھ کھڑے ہو۔
 ”طیبت جاؤ لیکن سونا نہیں۔ میرا مطلب ہے کھانا کھا کر سونا۔“
 ”مما! آئیں گی تیں تو ج رہے ہیں۔“ اس نے سامنے وال کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔
 ”مما آج دیر سے نہ کا کہہ گئی ہیں۔ کم تو فون کر دوں۔“

”نہیں، انہیں پریشان مت کرو۔“ اس نے تنکیر پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن پھر فوراً
 گئی اور بے حد خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

”میں ماما کو فون کرتی ہوں۔“ صباحت نے کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی تو نیل اس
 ہوئے بولے۔

”سنو، تم تو بہت بہادر ہو۔ تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے اور پھر اب تو تم اپنے گھر میں ہو۔“
 وہ بہت خاموشی سے انہیں دیکھنے لگی۔ اس کی سرخی مائیں آنکھوں میں ابھی بھی نمی تیر رہی تھی۔

”ہاں بلا لو۔“ وہ کہہ کر اپنے کمرے میں آگئی اور وارڈروب سے کپڑے نکال کر واش روم کا رخ کیا۔
 کچھ دیر بعد جب دوبارہ مدھیہ کے پاس آئی تو وہ چھت پر نظر میں جمائے ساکت لیٹی تھی۔
 ”یہ جو آجیسی ہو بیٹا؟“ آسیہ نے اس پر جھک کر پوچھا تو اس نے ذرا سی پلکیں جھپکیں پھر گری سانس کے ساتھ بولی تھی۔

”میں ماما کے پاس سوؤں گی نہیں۔ میرا مطلب ہے جب وہ سو جائیں گی تو تمہارے پاس آ جاؤں گی تم سونا
 بک ہے پھر میں آئی ہوں۔“ وہ کہہ کر آسیہ کے کمرے میں آئی تو زیر و پاؤں کی مدھم روشنی میں نیم دراز آسیہ
 نگار کر رہی تھی۔

”جھک بھول ماما۔“
 ”نہ! آسیہ نے اس کی پیشانی چومی پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”چلو منہ ہاتھ دھو لو پھر چلا
 نہیں گئے۔“
 ”مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے لیکن ابھی کھانا نہیں کھاؤں گی۔“ وہ واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولی۔
 ”صبا نے انتظام کر دیا ہے تم آؤ تو۔“
 وہ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آسیہ کے ساتھ کمرے سے نکل کر رآمدے میں آگئی جہاں صباحت نے چائے
 ساتھ اچھا خاصا ایتھام کر ڈالا تھا۔ اور خود جانے کہاں تھی۔

”صبا کہاں چلی گئی اور نیل بھائی؟“ اس نے کرسی بچھ کر بیٹھے ہوئے پوچھا۔
 ”نیل! آسیہ نے وہیں سے نیل کو پکارا۔ پھر اسے دیکھ کر بولی۔ ”صبا آ رہی ہے تمہاری مائی جی کو لے کر۔“
 ”اماں جی اور اباجی کیسے ہیں؟“
 ”سب ٹھیک ہیں بیٹا! چائے پی کر پھر نیچے چلتے ہیں۔“ آسیہ نے پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ تب
 نیل آگئے اور ادھر سے صباحت بھی میمونہ بھائی کے ساتھ آ رہی تھی۔
 السلام علیکم مائی جی! ان کے قریب آنے پر اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سلام کیا اور میمونہ بھائی کے گلے لگا
 گئی۔

”جیتی رہو۔ خوش رہو۔“ میمونہ بھائی نے اس کے گال پر پیار کیا پھر بیٹھے ہی پوچھنے لگیں۔ کس کے ما
 آئی ہو؟“
 ”آسیہ اس کا جواب سننے کے لیے بے اختیار اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔
 ”کسی کے ساتھ نہیں۔ اکیلی آئی ہوں۔“ اس کے جواب پر آسیہ کی پیشانی پر ہلکی ہلکی لکیریں ابھر آئی تھیں
 جبکہ میمونہ بھائی اچھل پڑیں۔
 ”اکیلی شاہ پور والوں نے تمہیں اکیلا بھیج دیا؟“
 ”انہوں نے نہیں بھیجا بلکہ وہ تو بھیجنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ میں خود آئی ہوں کسی کو بتائے بغیر۔“ وہ ابھی
 کے خلاف کچھ نہیں بولنا چاہتی تھی۔ اس لیے سارا الزام اپنے سر لیا اور پھر خود بھی حیران سی ہوں۔ شاید
 لیے کہ یہ سارا موقع تھا جو اس نے کسی مصلحت کا دامن تھا تھا۔
 ”کسی کو بتائے بغیر۔“ آسیہ نے کچھ دیر سوچا پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں کلینک فون کروں۔“

”آپ کلینک جا رہی ہیں ماما؟“ مدھیہ نے فوراً پوچھا۔
 ”نہیں بیٹا! اس لیے تو فون کر رہی ہوں۔“ آسیہ اس کا گال تھپک کر آگے بڑھ گئی تو اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے
 جانے کیا سوچنے لگی تھی۔

وہ دیکھ رہی تھی کہ صباحت اس سے شاہ پور والوں خصوصاً ”شاہ سکندر کے بارے میں جاننے کے لیے کتنی
 چین ہے اور وہ خود بھی اب تک کی ساری روداد کو سننا چاہتی تھی اور اس کے لیے دونوں انتظار کر رہی
 کہ نیل اور آسیہ سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں جائیں لیکن جب سونے کا وقت آیا تو آسیہ نے اسے
 پاس بلا لیا۔ جس پر اسے حیرت تو نہیں ہوئی البتہ حیرت ہوئی۔ اور جاتے جاتے مڑ کر صباحت سے کہنے لگی۔

”ماما! وہاں سے شاہ تیمور مجھے کہیں اور لے گئے تھے پھر پھوپھو شہر بانو کے پاس تین دن چھوڑا اور آج دن
 بلالے کر آئے تھے۔ شاہنگ کے لیے وہیں مجھے موقع ملا اور میں انہیں چھوڑ کر بس میں سوار ہو گئی۔“
 ”یاد تو آسیہ سوچ انداز میں اسے دیکھ گئی۔
 ”مجھی ڈر لگ رہا ہے ماما! وہ لوگ یہاں تو نہیں آجائیں گے۔“ اس نے آسیہ کا ہاتھ ہلکا کر کہا۔

وہ دیکھ رہی تھی کہ صباحت اس سے شاہ پور والوں خصوصاً ”شاہ سکندر کے بارے میں جاننے کے لیے کتنی
 چین ہے اور وہ خود بھی اب تک کی ساری روداد کو سننا چاہتی تھی اور اس کے لیے دونوں انتظار کر رہی
 کہ نیل اور آسیہ سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں جائیں لیکن جب سونے کا وقت آیا تو آسیہ نے اسے
 پاس بلا لیا۔ جس پر اسے حیرت تو نہیں ہوئی البتہ حیرت ہوئی۔ اور جاتے جاتے مڑ کر صباحت سے کہنے لگی۔

”کون؟“ آسیہ نے چونک کر پوچھا۔
 ”شاہ پور سے کوئی تھی۔ آپ کسی کو نہیں بتائیے گا کہ میں آپ کے پاس ہوں۔ میں اب کہیں نہیں جاؤں گی اور شاہ پور تو کبھی بھی نہیں پایا کو اگر ملنا ہو گا تو وہ یہیں۔“ اس نے ایک دم بچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا اور پھر خائف بھئی ہو گئی تھی۔

”یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ تم ڈرو مت۔ کسی میں اتنی جرات نہیں ہے کہ میرے پاس سے تمہیں باہر نکال دے۔“ آسیہ نے اس کا گال تھپک کر تسلی دی پھر اپنے پیچھے سے ایک تکیہ نکال کر برابر میں رستے ہوئے بولی۔

”چلاؤ اب تم سو جاؤ۔“
 ”یہاں نہیں ماما! میں اپنے کمرے میں سوؤں گی۔“ وہ صباحت کا خیال کر کے اٹھ گئی۔

”ڈرو گی تو نہیں؟“
 ”اگر ڈر گا تو آپ کے پاس آ جاؤں گی۔“ وہ آسیہ کے گلے میں بائیں ڈال کر بولی۔ پھر شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

دو بج رہے تھے لیکن صباحت جاگ رہی تھی۔ وہ اس کے برابر لیٹتے ہوئے بولی۔
 ”میں آتی ہوں لیکن تمہاری کس بات کا جواب نہیں دے سکوں گی کیونکہ مجھے نیند آ رہی ہے۔“

صباحت خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ بولی کچھ نہیں۔
 ”ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔“

”تم ڈرا بھی نہیں بدلیں۔“ صباحت نے کہا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
 ”کیا مطلب ہے تمہارا۔“

”کوئی مطلب نہیں چلو سو جاؤ۔“ صباحت کروٹ بدلنے لگی تھی کہ وہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی۔
 ”سونا ہوتا تو میں ماما کے پاس نہ سو جاتی۔ تمہارے لیے آئی ہوں میں یہاں مجھے پتا ہے تم اندر سے کشی۔“

چین ہو اور کس کے بارے میں جاننا چاہتی ہو۔“
 ”کس کے؟“

علی جمالیہ کے اور کس کے۔“ اس نے شرارت سے اس کے بازو میں چٹکی کاٹ کر کہا۔
 ”جی نہیں، میں اس کے بارے میں جان کر کیا کروں گی۔ بلکہ مجھے کسی سے کوئی غرض ہے نہ دلچسپی۔ تم صرف اپنی بات کرو۔ تم نے ہم سب کو اتنا پریشان کیوں کیا؟“ صباحت نے اپنے اندر کے سارے جنس کو دبا کر بات کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔ تو وہ حیران ہو کر بولی۔

”میں نے میں نے کیا پریشان کیا۔“
 ”کیوں شاہ پور پہنچنے کے کتنے عرصے بعد تم نے یہاں اپنی خیریت کی اطلاع دی تھی اور میں نے جب تم سے آئے کا کہا تم نے یہی جواب دیا کہ تم کبھی نہیں آؤ گی اور ابھی کچھ دن پہلے تم نے اپنی شادی کی اطلاع دے کر ہم پر برا احسان کیا تھا۔“ صباحت خاصی ناراضی سے اسے لٹاؤنے لگی تھی۔ وہ سن کر کبھی کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔

گہری سانس کھینچ کر کہنے لگی۔
 ”یہ صحیح ہے، البتہ میں نے تمہارے قصداً سب کو پریشان کیا۔ یہاں اور وہاں بھی، کیونکہ میں سب سے متفرق تھی اور اس متفرق کردار کے وجہ سے سب کی تمہارے ساتھ محبت جبکہ میرے لیے کسی کے دل میں کوئی جگہ نہیں۔ اب بتائیں واقعی ایسا تھا یا محض میری سوچ نے مجھے سب سے شاک کر دیا تھا۔ بہر حال شاہ پور جا کر میں نے یہی سوچا تھا کہ جب کسی کو میری پروا نہیں تو پھر میں کیوں اپنی خیریت کی اطلاع دوں جبکہ وہاں بھی سب خصوصاً بابا جان، علی جمالیہ اور پاپا اس بات سے پریشان تھے کہ میں ماما کو فون کیوں نہیں کر رہی۔ وہ تو خیر یہ جاننا چاہتے تھے کہ میں ماما پر کیا بیت رہی ہے اور میں انہیں کوئی اطمینان نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے ان کے بار بار ٹوکنے پر ہی میں نے فون

نہ کیا اور جب کیا تو تم پر ہی ظاہر کیا کہ میں وہاں بہت خوش ہوں اور کبھی واپس نہیں آؤں گی اور میں سچ کہوں تو قدرت میرے اندر عجیب سی رقابت تھی کہ میں وہاں ہر جگہ صبا صبا کی پکارے اور میں کہیں نہیں۔ مقدر رکھنے والے نے آخر سب کچھ تمہارے کھاتے میں کیوں ڈال دیا۔ میرے لیے کیوں کچھ نہیں۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں لیم ہوا کہ کائنات کے سارے نظام دو اور لو کے اصول پر چل رہے ہیں اور میں تو دینا جانتی ہی نہیں صرف لینا جانتی ہوں۔ ہونہ۔“

اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔
 ماما صم سے انداز میں اسے دیکھتے جا رہی تھی۔

”وہاں بھی میں شاید صرف لینا چاہتی تھی۔“ اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ ”خود سے کسی کی طرف دوستی کا ہاتھ نہ بٹھایا اور یہ توقع کرنے لگی کہ سب میری طرف آئیں گے، جیسے میں کوئی بہت اہم، ہستی ہوں۔ اہم تو کیا میری زندگی کے نزدیک رہی برابر حیثیت نہیں تھی یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب میں نے بابا جان کی باتیں سنیں۔ تب مسامحتی تو خطرے میں نظر آئی، ہی ساتھ تمہاری فکر نے بھی گھیر لیا تھا۔ میں سوچتی تھی اگر ماما نے بابا جان کی باتیں کر تھیں رخصت کر دیا تو پھر وہ ہمیشہ کے لیے دونوں بیٹیوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی اور میں چاہتی تھی کہ ان کو خوار کروں لیکن جب بھی فون کرتی کوئی نہ کوئی اس پاس آن ہو جودھو ہوتا تب اسے سنانے کے لیے مجھے یہ کہنا کہ میں بہت خوش ہوں اور کبھی نہیں آؤں گی کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ بابا جان کو میری طرف سے ذرا سا شہہ ہو جس طرح وہ بظاہر مجھ سے اچھے طریقے سے ملتے تھے تو میں بھی ان پر ایسا ہی ظاہر کرتی تھی۔“

پھر ایک بار میری وہی پہلے والی خود سری عود کر آئی اور میں نے سوچا کہ میں کیوں ان لوگوں سے ڈر رہی ہوں مجھے لفظوں میں کہہ دینا چاہیے کہ میں واپس جانا چاہتی ہوں اور جب میں نے بابا جان سے ضد کی تو وہ مجھے رقبے ڈائے اس رات مجھے تم سب بہت یاد آئے۔ تم سب کی محبتیں اپنی زیادتیاں کیا کیا نہ یاد آیا اور مجھے لگانا اور چاہتوں سے منہ موڑنے کی سزا مل رہی ہے مجھے اور ملتی بھی چاہیے تھی۔ ہے نا۔“

اس نے صباحت کی پوری کھلی آنکھوں میں دیکھ کر تائید چاہی۔ لیکن اوھر کوئی جنبش نہیں ہوئی۔ تو قدرے سے وہ مزید گویا ہوئی۔
 اس کے بعد مجھے بابا جان کی مرضی کا کھیل کھیلنا پڑا۔ شاہ تیور پر میں نے یہ ظاہر کیا جیسے ماما کے گھر میں ہمیں میر نہیں ہے مزید سب کے رویے بھی ناقابل برداشت ہیں اور یہ کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں بابا بابا۔“

اپنی آخری بات پر وہ خود ہی ہنسی پھر کہنے لگی۔
 بہر حال میں اس کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور اس کے موبائل پر میں نے یہاں فون کر کے غامکہ میں اس سے شادی کر رہی ہوں۔ اس کے بعد میرا خیال تھا میں کسی دن اس سے کراچی چلنے پر اصرار مانگی تو وہ منع نہیں کرے گا، لیکن اتفاق سے مجھے اس سے پہلے ہی موقع مل گیا اور میں اسے چکر دینے میں بے ہوش ہو گئی اور دیکھ لو تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔ زندہ سلامت۔ حالانکہ خود مجھے یقین نہیں آ رہا۔ یوں لگ رہیے ابھی آنکھ کھلے گی اور ارف نہیں۔“

اس نے جھرمجھری لی پھر صباحت کا بازو ہلا کر بولی۔
 ”مجھے بھولو گی نہیں۔ اچھا باباں تمہارے علی جمالیہ کا تو میں نے بتایا نہیں وہ بے چارہ۔“

”موجو پلین۔“ صباحت نے عاجزی سے ٹوکا۔ ”مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں جاننا۔“
 ”کیوں؟“

”اسی لیے کہ ماما نے اسے خلع کاٹوٹس بھجوا دیا ہے۔“ صباحت نے بتایا تو وہ اچھل پڑی۔
 ”اب؟ کیوں؟“

”کیوں کا کیا۔ مطلب تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے بعد کیا یہ رشتہ قائم رہ سکتا ہے۔“

ہاں کی آخری بات پر پری طرح چونکے تھے۔
”وہ شہزادوں کے ہاں کب گئی تھی؟“

”چنانچہ، مجھے تو آج صبح شہزادوں کا فون آیا تو اس نے بتایا کہ مدیحہ دو تین دن اس کے پاس رہ کر گئی ہے۔ کیوں کیا ہاں اس کے شہزادوں کے گھر جانے پر اعتراض ہے؟“ ”لی بی جان نے جواب دینے کے ساتھ پوچھا۔
”ہمیں، اعتراض کیوں ہو گا۔ بلکہ میں تو خود چاہتا تھا کہ وہ سب سے ملے اور اور کیا کہہ رہی تھی شہزادوں۔“ وہ پردی مشکل سے خود پر ضبط کر رہے تھے۔ ورنہ دل یہ چاہ رہا تھا ایک دم سے ہر بات اٹھا لیں۔
”بس اسی کی باتیں تھیں اور ہاں یہ تم باپ بیٹے نے اتنی خاموشی سے کیسے مدیحہ کی بات طے کر دی۔“ ”لی بی جان بے اچانک باو آیا تھا۔

”نہیں تو میرا مطلب ہے آپ سے کس نے کہا؟“ وہ مزید ٹھنھکے تھے۔
”وہی شہزادو بتا رہی تھی بلکہ گلہ کر رہی تھی کہ بابا جان نے مدیحہ اور تیور کی نسبت طے کر دی اور اسے بلایا۔ میں نے لاکھ کہا میاں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی لیکن وہ مانی نہیں۔ کس نے کئی مدیحہ نے خود حاکم کو بتایا ہے کہ لی تیور کے ساتھ شادی ہونے والی ہے۔“

”پتا نہیں لی بی جان! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں تو کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا۔“ ان کا ذہن چٹختے لگا تھا۔ بالوں میں اہل چٹساکر سر کو جھٹکا دیتے ہوئے بولے تھے۔

”تو کیا تمہیں بھی معلوم نہیں ہے؟“ ”لی بی جان نے تعجب سے پوچھا۔
”مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ میری بیٹی کہاں ہے۔ زندہ بھی ہے یا نہیں۔“ ان کی بے بسی اور ٹوٹے ہوئے ریلی بی جان دہل گئیں۔
”کیا تمہارے ہو؟“

”بابا جان سے پوچھیں جا کر کہ وہ میری بیٹیوں کو کس جرم کی سزا دے رہے ہیں۔ میں اگر ان کے مقابل کھڑا ہوا تو بات ادھوری چھوڑ کر خاصے جارحانہ انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے تو لی بی جان حواس باختہ ہو گئیں۔
”کون کہاں جا رہے ہو سکندر؟“

”انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور تیزی سے کمرے سے نکل آئے۔ پیچھے لی بی جان پکار رہی تھیں۔ لیکن وہ نہیں پہلے شاہ پورس حیات کے پورشن میں جا کر ان سے شاہ تیور کا پوچھا پھر وہیں سے باہر نکلے اور گاڑی میں بی بی ڈرا سور سے شاہ پارون کے ہاں چلنے کو کہا تھا۔

”فریبا“ دو گھنٹے بعد وہ شہزادوں کے پاس موجود تھے۔
”شہزادوں نے انہیں دیکھ کر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن ان کے ذہن پر مدیحہ سوار تھی۔ اس کے اتنے والہانہ کے جواب میں بس اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور فوراً پوچھا۔
”مدیحہ آئی تھی؟“

”آئی تھی، ماشاء اللہ بہت۔“
”کس کے ساتھ آئی تھی؟“ ”انہوں نے فوراً“ ”دوسرا سوال کیا تو خوشی کا اظہار کرتی ہوئی شہزادوں ایک دم خاموش ہو کر ان کے تیور دیکھ کر کچھ خائف سی ہو کر بولی۔
”تیور کے ساتھ؟“

”نہیں دن رہی تمہارے پاس؟“
”نہیں دن؟“

”تیور بھی ساتھ تھا؟“
”نہیں وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔“

مدیحہ فوراً ”کوئی جواب نہیں دے سکی۔ تو وہ بیزار سی سے ٹوک کر بولی۔

”چھوڑو اس بات کو۔ تم مجھے پایا کا بتاؤ۔ وہ کیسے ہیں اور تمہارے ساتھ اتنا کچھ دوا انہوں نے کچھ نہیں کیا بڑا اشیانہ نہیں لیا۔“

”وہ کیا اشیانہ لیتے انہیں تو شاید کسی بات کا پتا ہی نہیں اور مجھے موقع ہی نہیں ملا۔ بلکہ پہلے تو میں یہ سمجھتی رہی کہ بابا جان کے منصوبوں میں وہ بھی شامل ہیں۔ اس لیے میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی اور بعد میں میری اور سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ کنیڈا چھپ گئے تھے ابھی بھی شاید وہیں ہیں۔“

مدیحہ نے بتایا تو وہ کچھ دیر تک پرسوج انداز میں اسے دیکھتی رہی پھر اسے انداز میں کہنے لگی۔
”میرا خیال ہے وہ وہیں کراچی میں ہیں۔ کل انہوں نے میس سے فون کیا تھا مجھے۔“

”پاپائے؟“ ”مدیحہ نے فوراً پوچھا۔
”ہاں۔“

”کیا تمہارے تھے؟“
”نہیں رہے تھے میں جلد تم سے ملنے آؤں گا۔“ وہ بتا کر خائف سی ہو گئی پھر اس کا ہاتھ تھام کر منت سے بولی۔
”سنو ماکو نہیں بتاتا۔“

”کیوں؟ جب وہ ملنے آئیں گے تب ماکو پتا نہیں چلے گا یا وہ کوئی سلیمان ٹوپی پہن کر آئیں گے۔“ ”مدیحہ۔

”تک کر کہا۔“
”جب آئیں گے تب دیکھا جائے گا۔ تم بہر حال ماکو نہیں بتاؤ گی، سمجھیں۔“ ”صباحت بھی تیز ہو کر بولی تھی۔
”سمجھ گئی۔“ ”خلاف عادت وہ بڑی جلدی مان کر لیٹ گئی تھی۔



شاہ سکندر اس امید پر دو دن کا بیچ میں رکے تھے کہ شاید مدیحہ آجائے حالانکہ علی جمائگیر نے شاہ تیور۔ معلوم کرنے کے بعد انہیں بتا دیا تھا کہ وہ کراچی جا چکی ہے اور پھر اس نے انہیں اپنے ساتھ چلنے پر اصرار بھی کیا۔ لیکن وہ نہیں مانے۔ انہیں اب کسی کی بات کا اعتبار نہیں تھا۔ اس لیے بھی کہ اگر مدیحہ کراچی پہنچ چکی ہو، آسمان اس کی واپسی کا مطالبہ نہ کرتی اور اب تو خود انہیں بھی اس کی سامتی کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ بابا جان بات سچ ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے اور اس بار اپنے اشاروں پر چلانے کے لیے انہوں نے شاہ تیور انتخاب کیا تھا۔

ان دو دنوں میں شاہ سکندر نے بہت ساری باتیں سوچی تھیں تو انہیں بابا جان کی وہ بات بھی یاد آئی جو انہوں نے کہا تھا کہ آسمان سے صبح کی رخصتی کی بات کرو تو مدیحہ کی بات بھی کر لیں۔ شاہ تیور کے ساتھ۔ گویا وہ دوسری بیٹی کے لیے بھی باقاعدہ پلان بنا چکے تھے اور وہ اتنے بے خبر تھے انہیں اپنی بے خبری پر بھی غصہ آیا۔ بہر حال تیسرے دن صبح وہ شاہ پور پہنچے تو بابا جان سے بس سلام دعا کی حد تک ہی ملاقات کی۔ مدیحہ کے بارے کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ جانتے تھے ادھر سے ایک ہی جواب آئے گا۔ جس کا انہیں یقین نہیں تھا اور بابا سے مزید نہ پوچھنے کا وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ اس لیے ان پر ظاہر بھی نہیں کیا کہ وہ مدیحہ کی تلاش میں گئے۔ نہ اس کی طرف سے فکر مندی کا اظہار کیا تھا البتہ دوسرے کھانے کے بعد لی بی جان کے پاس آکر بیٹھے اور اپنے کا حال احوال پوچھا پھر ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے مدیحہ کا ذکر لے آئے۔

”مدیحہ کے جانے سے آپ کو بھی کوئی فرق پڑا ہے لی بی جان کہ نہیں؟“
”کیوں نہیں۔ بجی صبح شام میرے پاس آکر بیٹھتی تھی اور دوسری لڑکیوں کو بلاؤ تو سوہمانے ہوتے تھے۔ آتی تھی۔ بہت محبت کرنے والی تھی ہے۔ شہزادو بھی تعریف کر رہی تھی کہ وہ دن میں اس کے ساتھ ایسے گئی جیسے پتا نہیں کب سے اس کے پاس رہ رہی ہو۔“ ”لی بی جان مدیحہ کی تعریف کرتے ہوئے بتا رہی تھیں۔

”پھر اسے لینے بھی دی آیا تھا؟“
 ”جی۔ خیر تو ہے ناں بھائی! کیا ہوا ہے؟“ شہر بانو نے تشویش سے پوچھا۔ لیکن انہوں نے جیسے سنا ہی نہیں۔
 ”کہاں لے گیا ہے؟“
 شہر بانو نے کوئی جواب نہیں دیا۔
 ”بتاؤ شہر بانو! تم سے کچھ تو کہا ہو گا تیور نے۔“
 ”میاں سے کہاں جانے کا پروگرام تھا اس کا؟“ وہ اس کی چند لمحوں کی خاموشی سے جھنجھلا گئے تھے۔
 ”پتا نہیں بھائی! مجھے تو کچھ نہیں بتایا۔ خدا کے لیے آپ یہ تو بتائیں کیا ماجرہ ہے؟“ شہر بانو ان کے سوا اور سے پریشان ہو کر عاجزی سے بولی۔
 ”ناجرا! وہ نہ۔“ وہ بہت مضطرب سے ادھر سے ادھر ٹھلنے لگے۔
 شہر بانو اندیشوں کی زد میں آکر اندر رہی اندر ہونے لگی تھی۔ انہیں مخاطب کرنا چاہتی تھی، لیکن بہت نہیں ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ رک کر اس سے مخاطب ہوئے۔
 ”سنو شہر بانو! اب اگر تیور مدیحہ کو لے کر یہاں آئے تو فوراً“ مجھے اطلاع کرنا اور میرے آنے تک مدیحہ کو اپنے پاس روک رکھنا۔“
 شہر بانو سمجھی یا نہیں، لیکن فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔
 ”میں چلتا ہوں۔“ وہ جانے کا کہہ کر چل بھی پڑے تو شہر بانو حیران پریشان سی ان کے پیچھے لپکی۔
 ”بھائی! اتنے عرصے بعد آئے ہیں کچھ دیر بیٹھیں تو کوئی چائے پالی۔“
 ”ابھی بہت کام ہیں شہر بانو! پھر آؤں گا۔“ انہوں نے پلٹ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا پھر تیز قدموں سے باہر تھے۔
 ”میاں سے مایوس ہو کر اب انہیں کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا مزید آئیہ کے سامنے جو ادبی کا خیال پریشان کرنے لگا۔ وہاں سے اگلے دن ہی مدیحہ کو لانے کا کہہ کر آئے تھے اور یہاں چار دن ہو گئے تھے۔
 ”یا اللہ کہیں تو اس عورت کے سامنے مجھے سرخرو کرو۔“ انہوں نے پہلے آسمان پر نظریں جماتے ہوئے سیٹ کی بیک پر رکھ لیا۔
 گاڑی اونچی نیچی راستوں سے نکل کر شفاف سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔ دور سے چوراہا دیکھ کر انہوں نے ادم کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ڈرائیور سے گاڑی ستر جانے والی سڑک پر موڑنے کا کہہ کر پھر آئیہ کو سونپ دیا۔
 جس کے سامنے چند دن پہلے وہ اعتراف کر کے آئے تھے کہ وہ ابھی بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور اسے جتا میں گے کہ ان کی زندگی میں آنے والے سارے امتحان ساری آزمائشیں اور ساری تکلیفیں اسی محبوبہ مرہون منت ہیں۔

شام کے سائے گرے ہو رہے تھے جب وہ علی جمالیہ کے بیٹے پر پہنچے مسلسل سفر اور مسلسل منشن نے اُسی طرح تھکا دیا تھا پھر بھی ان کا آرام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ خیال تھا شاید لوگ آئیں گے۔ اور ایک لپ کے ساتھ علی جمالیہ سے شاید کوئی نئی بات معلوم ہو جائے۔ بس اسی لیے اس کے بیٹے پر آگئے تھے۔
 علی جمالیہ کچھ دیر پہلے ہی اُس سے آیا تھا۔ ان کی آمد پر تو حیران نہیں ہوا لیکن ان کا غلیہ پریشان کن تھا۔
 ”خیریت چچا جان؟“ ان کے گلے لگتے ہوئے اس نے فوراً پوچھا۔
 ”مدیحہ کا کچھ بتا چلا؟“ ان کے سوال میں جواب موجود تھا۔
 ”مدیحہ!۔“ وہ ان کی پریشانی سمجھ کر خاموش ہو گیا۔

”میں سارے میں معلوم کر آیا ہوں بابا جان نے پتا نہیں اسے کہاں چھپا دیا ہے اور اس بار یہ کھیل انہیں بہت پڑے گا۔ خیر تم جلدی سے چائے بناؤ مجھے آئیہ کے پاس جانا ہے۔“ انہوں نے اچانک عود کر آنے والے روڈ پر کمر کر کہا۔

یہ پوچھنا چاہتا تھا۔ آئیہ کے پاس کس سلسلے میں لیکن ان کی پریشانی سمجھتے ہوئے خاموش رہا پھر کمر دین کو پار کر کے چائے کا کہا۔ اس کے بعد انہیں دیکھ کر بولا۔
 ”چائے سے پہلے آپ ہاتھ لے لیں۔“
 ”ہاں! وہ اپنے کسی خیال سے چونک کر اٹھے تھے۔
 پھر کچھ دیر میں وہ ہاتھ لے کر آئے تو غالباً وہی کپڑے دوبارہ پہننے کی وجہ سے خاصے جھنجھلائے ہوئے تھے۔
 نے بیٹے ہوئے بھی ان کے چہرے پر مسلسل ناگواری کا تاثر رہا۔
 علی جمالیہ کچھ دیر انتظار کر رہا کہ وہ کچھ کہیں گے لیکن جب وہ متوجہ ہی نہیں ہوئے تب اسے خود مخاطب کرنا

چاہا۔ انہوں نے یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ کیا آپ کو یقین ہے مدیحہ کو بابا جان نے کہیں ادھر ادھر۔“

اب حالات یہی ظاہر کرتے ہیں۔ مجھے سے انہوں نے اس وقت جب میں کنیڈا جا رہا تھا۔ کہا تھا کہ وہ مدیحہ کو ہجومز آئے ہیں۔ جبکہ وہ رہے برنجی۔ خود تم نے اسے کانچ میں دیکھا۔ اس کے بعد وہ تین چار دن شہر بانو ن رہی۔ وہاں سے پتا نہیں چل رہا کہ تیور اسے کہاں لے گیا ہے۔ بہر حال کہیں بھی ہو میں اسے۔“ وہ بولتے ایک دم ہونٹ بھیج گئے پھر چائے کا آخری گھونٹ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ تو وہ ان کی تقلید کرتے ہوئے لگا۔

”اب ڈاکٹر آئیہ کے پاس کیوں جا رہے ہیں؟ میرا مطلب ان سے مدیحہ کے بارے میں کیا کہیں گے؟“
 ”جی کہ میں اس کی بیٹی کی حفاظت نہیں کر سکا۔“ وہ بے اختیار کہہ گئے۔ پھر کچھ یوں وضاحت کرنے لگے۔
 ”کہاں تک میں ان سے غلط بیانی کر رہا ہوں غلط بیانی کی وجہ سے ہی سارے کام خراب ہو رہے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ یہ حقیقت معلوم ہو جانی چاہیے۔“

یہاں تک اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس لیے بس سر ہلا کر رہ گیا۔
 ”اگے میں چلتا ہوں۔“

”اب واپس بیٹیں آئیں گے نا۔“ وہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھنے لگا۔
 ”کہہ کہ نہیں سکتا۔ تم انتظار نہیں کرنا۔“ وہ اس کا کندھا تھپک کر گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔
 ہوں نے علی جمالیہ سے تو بڑے آرام سے کہہ دیا تھا کہ آئیہ کو حقیقت معلوم ہو جانی چاہیے۔ لیکن جیسے ایک قریب آ رہا تھا ان کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی اور اس بار وہ سیدھے آئیہ کے کمرے میں داخل نہیں ہو سکے۔ پہلے چوکیدار سے کہلوایا اور اس کا جواب سن کر باہری اسٹول پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ اس وقت انہیں اتنی یقینیت یاد نہیں تھی۔ بلکہ ایسا باپ جو گمشدہ بیٹی کی تلاش میں ناکامی کے بعد اب اس کی ماں کے سامنے سے خوفزدہ ہو کر اسے کیا کہے گا۔

”نا! آئیہ گھنٹے بعد غالباً آئیہ نے اپنے مریضوں سے فارغ ہو کر انہیں بلوایا تھا۔ اور اتنی دیر میں وہ بجائے ہر کم کی صورت حال کے لیے تیار کرنے کے منہی سوچوں میں گھبر رہے تھے۔ جب ہی آئیہ کے کمرے کی جگہ کی طرح داخل ہوئے تھے اور ان کے برعکس وہ بڑی پراعتاد تھی۔
 ”خیر رہیں۔“

کی معمول کی طرح بیٹھ گئے تو آئیہ نے یوں دروازے کی سمت دیکھا جیسے کسی اور کی آمد متوقع ہو پھر ان کی متوجہ ہو کر پوچھا۔

”مدھو نہیں آئی؟“
انہوں نے خاموشی سے سر جھکا دیا۔ جبکہ اندرا چانک ایک جنگ شروع ہو گئی تھی کہ وہ کیوں اس سے خائف ہو رہے ہیں۔ مدھیہ صرف اس کی بیٹی تو نہیں ہے۔

”آپ کچھ پریشان ہیں؟“ ”اسیہ ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔
”ہاں نہیں۔“ ”وہ اچھے گئے۔ پھر بالوں میں انگلیاں پھنسا کر وہ جیسے بے اختیار ہو گئے تھے۔
”میں تھک گیا ہوں اسیہ! اتنا سفر جانے کیسے طے ہو گیا۔ مزید ایک قدم نہیں چل سکتا۔ کوئی سارا نہ ہو نہیں کیا کروں کس سے کہوں کہ کس جرم کی سزا پائی ہے میں نے جو ختم ہونے میں نہیں آتی، تم ہاں تم سے تموا گا۔ کیونکہ ابتدا تم سے ہوئی تھی۔“

اسیہ سر اٹھادی انہیں ٹوٹتا بھرتا دیکھ رہی تھی۔
اور انہیں جیسے کسی بہت اپنے کا کاندھا میسر آیا تھا جس پر سر رکھ کر رو لینے سے دل کا سارا غبار دھل جاتا ہے وہ بھی اپنی کتاب زندگی کے تمام اوراق اس کے سامنے الٹ کر شانت ہو گئے تھے۔ کرسی کی بیک پر سر رکھ آٹکھیں بند کر لیں۔

اسیہ کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ اس بے قصور شخص کو معاف کر دے یا اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال دے جیسے کہ یہ ساری باتیں اس نے اس وقت اسے کیوں نہیں بتائیں جب اس کے دل کی ہستی اس کے دم سے نکلتی۔ اب کیوں تیار ہا ہے جب اندر سب کھنڈر ہو چکا۔

اس کی زندگی کی خاطر بابا جان کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے یہ کیوں نہ سوچا کہ اس کے بنا وہ کیسے جئے گی۔
اف سکندر حیات تم نے تو حد کر دی۔ اب اس مقام پر یہ کہہ رہے ہو کہ یہ زندگی بھی بابا جان کی بخشی ہے۔

میرے خدا! شرف المخلوقات بنایا تو ایک ذرا سا اختیار وقت پر بھی دیا ہوتا۔ میں ایسا کیا کروں جو گزرے سال سمٹ کر میری مٹھی میں آجائیں پھر یا تو میں اپنا ہر دن اس شخص کو دان کرئی جاؤں یا خود اپنے ہاتھوں سے زندگی کا خاتمہ کروں۔

تم ایسے بزدل سکندر حیات! اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی لے ڈوبے۔
کاش یہ اعتبار پہلے کرتے مجھ پر تو شاہ پور کار میں کوئی یاد دنیا کی کوئی طاقت میرے دل کی ہستی نہیں اجاڑ سکتی؟
کتنا دکھن مرحلہ آیا تھا جو گزر کے نہیں دے رہا تھا۔ اس کے اندر صف ماتم کچھ گئی تھی۔ سارے دکھ ساتھ سکنے لگے تھے وہ بھی جو ابھی ابھی شاہ سکندر نے اس کی جھوٹی میں ڈالے تھے اور سدا کا بے رحم وقت نظریں چرا لے کر گزر رہا تھا کیونکہ ان دکھوں کا مداوا انہیں کر سکتا تھا۔

کتنی دیر بعد شاہ سکندر نے آٹکھیں کھول کر دیکھا تھا۔ وہ پیپر ویٹ پر نظریں جمائے جانے کس کرب رہی تھی۔ جو اس کی آنکھوں سے جھٹک رہا تھا۔ وہ قصداً ”ذرا سا کھائے تو وہ جو نکلنے کے ساتھ سیدھی ہوئی“
کچھ دیر خود پر قابو پانے کے بعد کہنے لگی۔

”حالات و واقعات مقدر کے تابع ہوتے ہیں شاہ سکندر حیات! جو کچھ ہمارے لیے لکھا گیا ہوتا ہے وہ ضرور ہوتا ہے۔ خواہ کسی بھی طرح سہی۔ میرے لیے اب ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی کہ کسی نے کیا کیا نصیب تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اندھے کنوئیں میں یہ سوچ کر چھلانگ لگا دوں کہ مٹا اگر ڈونا مرنا نہیں لکھا تو میں زندہ سلامت نکل آؤں گی۔ نہیں اللہ نے ذہن دیا ہے سوچنے سمجھنے کی صلاح ہے پھر حالات و واقعات ہمیں اور بہت کچھ سکھاتے ہیں اور سیکھنے کے بعد بھی اگر دوبارہ وہی غلطی دہرائی اس کے نتائج پہلے سے بھی زیادہ خوفناک نکلتے ہیں۔ آپ میری اس بات سے تو اتفاق کریں گے ناں۔“

شاہ سکندر بہت آہستہ آہستہ اثبات میں سر ہلانے لگے تھے۔

میرا آپ بتائیں میں کیا کروں۔ جس راستے پر کانٹے ہی کانٹے بچھے ہوں میں جانتے بوجھتے اپنی بیٹیوں کے لیے ہ کا انتخاب کیسے کروں۔ گزشتہ بار آپ نے کہا تھا کہ میں ایک بار اور آپ کا اعتبار کروں، ایسے کر لوں آپ کو معلوم نہیں ہے کہ مدھیہ کہاں ہے جبکہ صاحت کے بارے میں آپ جانتے تھے۔ میرا مطلب ہے۔ اس بی کے سلسلے میں آپ کے بابا جان نے جو پانا تنگ کی اس سے آپ بے خبر نہیں تھے بلکہ آپ ان کے ساتھ تھے کیوں؟“ وہ ان کا محاسبہ کرتے ہوئے سوال نشان بن گئی تھی۔

میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی یہی کہوں گا کہ میرے پیش نظر صاحت کی بہتری تھی اور ہے۔ ”انہوں نے پھر زور دے کر گویا اس رشتے کو قائم رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔
”وہ کتنی دیر ان پر تاسف سے نظریں جمائے بیٹھی رہی پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

میں شاہ سکندر حیات! آپ پتا نہیں کس پہلو سے صبا کی بہتری سوچ رہے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے بے ایک بار پھر۔“

میں۔ ”وہ فوراً بول پڑے۔“ ”یہ صحیح ہے کہ بابا جان نے صاحت کے حصول کے لیے غلط طریقہ اختیار کیا تھا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“

یہ نہیں پہنچا سکتے۔ مدھیہ تم سے ساتھ انہوں نے کیا کیا۔ ”وہ زچ ہو کر بولی تھی۔
سکندر ابھی خود ہر بات کا اعتراف کر چکے تھے اس لیے لا جواب ہو کر رہ گئے پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے

مدھیہ کو انہوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کی دونوں پوتیاں شاہ پور میں بیاباں اور اسی مقصد سے انہوں نے مدھیہ کو اپنے پاس روک رکھا ہے۔ شادی کے بعد اس پر کوئی پابندی نہیں ہو جب چاہے گی آپ کے پاس آئے گی۔ اس طرح صاحت بھی۔“

لیکن مجھے اپنی بیٹیاں شاہ پور میں نہیں بیاباں اور یہ صرف میری ضد نہیں ہے میری بیٹیاں بھی ایسا نہیں ہے۔ آئی ایم سوری شاہ سکندر حیات!“ وہ جتنی انداز میں کہہ کر گھڑی دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔
وہ سکندر اسے جانے پر آمادہ کر کچھ کر بھی خاموش بیٹھتے رہے۔

اپنی چیزیں سمیٹ کر انہیں دیکھنے لگی۔ لیکن وہ متوجہ نہیں ہوئے پتا نہیں قصداً ”انجان بن رہے تھے یا بوج میں تھے۔

ابہن کر رہے ہیں، بچے انتظار کر رہے ہوں گے۔“ وہ انہیں مخاطب کیے بغیر خود کلائی کے انداز میں بولنے

بچے۔ ”انہوں نے سوچا اور کھوجتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ کہیں سے بھی پریشان نہیں لگ رہی مدھیہ مدھیہ کاس کر اس تمام عرصے میں اس نے کوئی داؤدا بچایا تھا کہ اسے ہر صورت اپنی بیٹی چاہیے۔

”نہ۔“ وہ ان کی نظروں سے الجھ کر اس اسی قدر کہہ سکی۔
”ہاں چلنا چاہیے۔“ وہ ہاں کی صورت گہری سانس کھینچتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے پھر دروازے کے پاس جا کر

پہلٹ کر اسے مخاطب کیا۔
”الکر اسیہ! میں صاحت اور مدھیہ سے ملنا چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے اس پر آپ کو اعتراض نہیں ہوگا۔ کل

بچے سہ پہر گاڑی بھیج دوں گا۔ اوکے۔“
”بھئی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ یقین سے بولے۔

میں جانتا ہوں مدھیہ آپ کے پاس ہے۔“ اس کے ساتھ ہی دوبارہ نکل آئے تھے۔



شاہ سکندر واپس علی جمالتیر کے پاس آئے تھے اور اسے اپنے انتظار میں بیٹھے دیکھ کر انہیں تعجب و تہنیت ہو
پھر بھی نوک گئے۔

”تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟“
”میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“ علی جمالتیر نے صاف گوئی سے کہا۔
”لیکن میں نے یقین سے تو واپس یہاں آنے کو نہیں کہا تھا۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولے۔
”کھانا گرم کروں آپ کے لئے؟“ علی جمالتیر ان کی بات ان سنی کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔
”ہاں یا رہا! بھوک تو لگ رہی ہے اور بس کھانے کے بعد کافی بھی ضرور پوں گا۔ گرم دین سے کتنا۔“
”گرم دین نہیں ہے۔ میں بناؤں گا کافی بھی۔“ علی جمالتیر کہتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا تو انہوں نے آرام سے
سامنے ٹیبل پر ٹائلیں سیدھی کر لیں اور اگلے دن کا پروگرام سوچنے لگے جو وہ آتے ہوئے آسیہ سے کہہ آئے تھے
کہ کل مدیہ اور صباحت کے لئے گاڑی بھیج دیں گے۔

”آئیے چچا جان۔“ کچھ دیر بعد علی جمالتیر نے آکر کہا تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا پھر فوراً اٹھ کر اس کے
ساتھ ڈائننگ روم میں آگئے اور کرسی بھیج کر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگے۔
”تم نے کھانا کھایا یا میرے انتظار میں۔۔۔؟“
”کھانا تھا۔“ وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑا۔

”گڈ!“ شاہ سکندر کھانے میں مصروف ہو گئے۔
علی جمالتیر بہت توجہ سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا تھا، جس پر اب کسی تردد، کسی پریشانی کی لکیر نہیں تھی۔ اس
برعکس اطمینان جھلک رہا تھا جس سے وہ سمجھ گیا کہ انہیں مدیہ کا سراغ مل گیا ہے۔
”مدیہ نہیں کراچی میں ہے نا؟“ قدرے توقف سے اس نے تصدیق کی خاطر پوچھا۔
”ہاں!“ انہوں نے نمبکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

”کب سے۔۔۔ آئی مین کون چھوڑ گیا ہے اسے؟“
”چنانچہ۔۔۔ یہ ساری تفصیل نہیں پوچھی میں نے۔ مدیہ سے معلوم کروں گا۔ ہاں، تم کافی بنانے وا۔“
تھے۔“ شاہ سکندر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جی۔ آپ چلیں میں لے کر آتا ہوں۔“ وہ فوراً کچن کی طرف بڑھ گیا۔
شاہ سکندر لاؤنج سے ہوتے ہوئے اپنے رہائشی کمرے میں آگئے اور کپڑے نکالنے کی غرض سے الماری کھولا
لیکن پھر خیال آیا کہ وہ تو بغیر کسی پروگرام کے ہو نہی چلے آئے تھے۔ یعنی اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لائے تھے۔
”چچا جان!“ علی جمالتیر نے غالباً ”کمرے میں داخل ہونے سے پہلے پکارا تھا۔“

”ہاں۔ آجاؤ۔“ انہوں نے الماری بند کر کے کہا۔
علی جمالتیر اندر آیا تو چھوٹی سی ٹرے میں کافی کے دو گم تھے۔
”تمہیں صبح آفس نہیں جانا؟“ انہوں نے ایک گم اٹھاتے ہوئے پوچھا تو وہ سمجھ کر بولا۔
”جانتا ہے بس یہ ہے کہ کچھ لیٹ ہو جاؤں گا۔“

”اور اس کا ذمہ دار مجھے ٹھہراؤ۔“ انہوں نے مسکرا کر کہا تو علی جمالتیر تندرے جھینپ لیا۔
”نہو سر! آپ نے تو نہ مجھے انتظار کرنے کو کہا تھا اور نہ اپنے ساتھ کافی پیئ کی آفر کی۔“
”گویا اپنے ہر عمل کے تم خود ذمہ دار ہو۔“

شاہ سکندر نے کافی کے ایک دو سب لینے کے بعد سگریٹ ساگن تھی اور ایک ساتھ دونوں سے شفا کر
ہوئے، تاہم علی جمالتیر کی مودگی بھول گئے یا قصداً ”نظر انداز کر رہے تھے۔ کچھ بھی تھا بہر حال علی جمالتیر
لئے ان کی لالچاتی خاصی تکلیف دہ تھی۔ کچھ دیر یہ وہ خود پر جبر کر سکا، پھر پہلے ذرا سا کھاس کر انہیں اپنی مودگی

دلایا اس کے بعد مخاطب کر کے کہنے لگا۔

چچا جان! وہ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ ڈاکٹر آسیہ نے ہمارے بارے میں کیا سوچا ہے۔ آئی مین میرے اور
”کے۔۔۔؟“

”آئی ڈونٹ نوٹا! میری ان سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔“ انہوں نے پہلے سرسری انداز میں کہا پھر
احساس ہونے پر اسے تسلی دیتے ہوئے بولے۔

تم فکر نہیں کرو میں انشاء اللہ جلد ڈاکٹر آسیہ سے بات کروں گا۔ اصل میں وہ سب سے زیادہ تمہارے باپ
نفر ہیں۔ اگر تم غیر جانبداری سے دیکھو تو وہ حق بجانب ہیں اس لئے میں انہیں زیادہ فورس نہیں کر سکتا۔
دش کروں گا اور مجھے امید ہے کہ وہ صباحت کی خاطر مان جائیں گی۔“

”صباحت سے ملے؟“ علی جمالتیر نے جانے کس خیال کے تحت پوچھا تھا۔
”نیل کل۔۔۔“ شاہ سکندر اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گئے تھے۔

”مما!“ دونوں ایک ساتھ کمرے سے نکلیں تو آسیہ ایک نظر ان پر ڈال کر ڈائننگ کی طرف بڑھتے ہوئے
”ہینا! کھانا کھالیں۔“

”مما! نیل بھائی تو ابھی آئے نہیں۔“ صباحت اچھنے میں گھر کر بولی۔
”کون کوئی جواب نہیں دیا تو وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتی ہوئی اس کے پیچھے ڈائننگ روم میں آگئیں۔
ارات تمہیں بتانا بھول گئی۔“ آسیہ ڈونگا اٹھا کر ان دونوں کی ہلٹیوں میں سالن نکالتے ہوئے بظاہر
انداز میں بولنے لگی۔ ”اور صبح بھی یاد نہیں آیا ورنہ اسی وقت تم سے کہہ جاتی۔ خیر ابھی کافی وقت ہے۔ تم
ہتاری کر سکتی ہو۔ تین بجے تمہارے پیپا کی گاڑی آئے گی۔ تم دونوں چلی جانا۔“

”ہاں!“ دونوں کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔
میں نہیں کہہ سکتی کہ وہ کہاں ملیں گے بہر حال وہ تم دونوں سے ملنا چاہتے ہیں اور مجھے اس پر کوئی اعتراض
ہو کہ تم دونوں اب سمجھ دار ہو۔“ آسیہ ہنوز سرسری انداز میں کہہ کر اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔
اگر وہ ہمیں شاہ پور لے گئے؟“ مدیہ نے فوراً خدشہ ظاہر کیا تو آسیہ ایک دم سراپا کچا کر کے اسے دیکھنے لگی
و خود بھی اس خدشے سے پریشان تھی لیکن ان پر ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ اب تو مدیہ نے کہا تو وہ سوچ میں
رہتی دیر بعد اس نے ان دونوں سے زیادہ جیسے خود کو تسلی دی تھی۔

”میرا خیال ہے، وہ ایسا نہیں کریں گے۔“
”مما!“ مدیہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے نوک دیا۔
”کی کوئی بات نہیں ہے بیٹا! پھر تم تو پہلے بھی ان سے مل چکی ہو کئی مرتبہ۔۔۔ یہ دے دینا صباحت کم
تھی۔“

”ٹھیک ہے ممما! لیکن انہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں۔“ مدیہ نے ایک دم خیال آنے پر پوچھا تو
تے ہوئے بولی۔
”ہو گیا معلوم اب تم جلدی سے کھانا کھا کر تیار ہو جاؤ۔ شاہ سکندر کی گاڑی زیادہ دیر تک اس دروازے پر
ٹھاپے۔ اوکے۔“ آسیہ اپنی بات ختم کرتے ہی کمرے سے نکل گئی

”مجھے جلدی کرو۔“
”نیل جاؤں گی۔“ صباحت نے اسی گم صم انداز میں کہا۔
”ان کیوں نہیں جاؤ گی؟ اب تو ماما خود بھیج رہی ہیں ہمیں۔ چلو اٹھو۔ کھانا وانا بھی وہیں کھالیں گے پیپا کے

ساتھ۔ ”وہ زبردستی اسے وہاں سے اٹھا کر کمرے میں لے آئی اور الماری کھول کر کپڑوں کا انتخاب کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ”تو یہ تھی ماما کی پریشانی۔ عجیب ہیں ماما بھی۔ اگر انہیں پیلا پر اعتبار نہیں ہے تو صاف منع کر دیتیں۔ خیر تبو دیکھو۔ سوٹ تم پہن لو۔ یہ میں۔“

”ہاں میں۔“ صاحبہ اچھل پڑی۔ ”ہم کسی شادی میں نہیں جا رہے۔“

”جنتیں کیا پتا شاہ پور کی خواتین گھر میں بھی ایسے ہی جگہ اس سے اچھے اور جھللاتے ہوئے کپڑے ہیں۔“ وہ بڑے آرام سے صحبت کے اعتراض کو نظر انداز کرتے ہوئے وہی کپڑے استری کرتے کھڑی ہو گئی۔

”تمہاری مرضی لیکن میں یہ نہیں پہنوں گی۔“ صحبت نے اپنے لئے دوسرا سوٹ نکال لیا تھا۔

پھر ٹھیک تین بجے وہ دونوں آسیہ سے کمرہ کر نیچے اتریں تو اسی وقت گاڑی بھی آئی تھی۔

”مدحو! اس سے پوچھو پیلا کہاں ہیں؟“ صحبت نے اسے کہنی مار کر ڈرائیور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ دیا۔

”یا اللہ! یہ تم اتنا ڈر کیوں رہی ہو۔ تمہاری زور رنگت دیکھ کر تو پیلا، لیکن نہیں، انہیں پتا ہے تم بہت ڈر ہو۔“ مدحیہ اس سے کمرہ فوراً ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”سنو پیلا اس وقت کہاں ہیں؟“

”جی گھر پر۔“ ڈرائیور نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

”گھر پر۔“ مدحیہ کو پیلا خیال شاہ پور کا آیا جب ہی فوراً پوچھنے لگی۔ ”تمہارا مطلب ہے شاہ پور میں۔“

”نہیں جی۔ یہاں کا فیشن روڈ پر۔“

”اچھا۔“ مدحیہ نے ”اچھا“ کو یوں لبا کھینچا جیسے بہت اچھی طرح واقف ہو پھر صحبت کی طرف ہوا سرگوشی میں کہنے لگی۔

”سن لیا۔ ہم منسٹر اس جا رہے ہیں۔ اب اپنی شکل ٹھیک کرو اور ڈر اگردن بھی اکرالو۔“

”بکو مت۔“ صحبت نے دانت پیسے۔ ”میری جان پرینی ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔“

”مذاق! میں ہر مذاق نہیں کر رہی۔“

”اچھا بس چپ رہو۔“

”انتہائی فضول ہو تم۔“ وہ سر جھٹک کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد گاڑی بڑے سے سیاہ گیٹ میں داخل ہو کر رک گئی۔ تب وہ صحبت کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے ”چلو، تمہیں پیلا سے ملواؤں۔“

”سنو، یہاں صرف پیلا ہی ہیں یا۔؟“ صحبت نے اس کے پیچھے اترتے ہوئے پوچھا تو وہ اندھے اچکا کر ”مجھے کیا پتا۔ یہ تو اندر جا کر معلوم ہو گا کہ اور کون کون ہے اور کوئی ہو بھی تو نہیں کیا۔“

”آئیے لی لی! صاحب انتظار کر رہے ہیں۔“ ایک باوردی ملازم نے قریب آکر کہا تو وہ صحبت کا ہاتھ دے کر پیچھے چل پڑی۔

طویل گیلری کے بعد گول کمرہ تھا۔ وہیں شاہ سکندر موجود تھے۔

”بابا!۔“ مدحیہ انہیں دیکھتے ہی بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔

”ہیسے ہو بیٹا! شاہ سکندر نے اس کی پریشانی چوم لی پھر صحبت کی طرف دیکھا جو کچھ فاصلے پر ہی رک ہوئی تھی اور پھر اگلے بل بے اختیار ان کے سینے میں منہ چھپایا تو اس کے آنسو بھی بے اختیار جھٹک گئے۔

”نہیں نہیں بیٹا! روتے نہیں۔“ شاہ سکندر نے فرط محبت سے اسے اپنے بازوؤں میں گھونٹ لیا تو۔

جیسے طویل مسافتوں کے بعد شجر سایہ دار میسر آیا ہو، جس کی بھی ٹھنڈی چھاؤں میں وہ جی بھر کر دلی تھی

نے غلط تو نہیں کہا تھا یا! یہ روتی بہت ہے۔“ مدحیہ نے بڑی مشکل سے اسے الگ کر کے بٹھاتے ہوئے سکندر قصداً ”ذرا سا مسکرائے پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولے۔

”نہیں روئے گی۔“

”کو نہیں بتا۔ اس کی آنکھوں میں مسند روں جتنا پانی ہے۔“

روں جتنا۔ ”شاہ سکندر خامے محفوظ ہوئے۔“ کیوں بیٹا صبا! یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“

ت نے فنی میں سر ہلا کر دوپٹے سے اپنی آنکھیں اور چہرہ صاف کرنے لگی تو شاہ سکندر نے آہستہ سے اس کا ہاتھ پھران دونوں کے درمیان سے اٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”نے کھانا کھا لیا یا۔“

نے تو تھوڑا بہت کھا لیا تھا، البتہ صبا نے بالکل بھی نہیں کھایا۔“ مدحیہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے پہلے کھانا کھاؤ۔“ شاہ سکندر نے کہہ کر ملازم کو پکارا اور اس کے آنے پر ان دونوں کو ڈانٹنگ ہال میں لے آکر مدحیہ کو مخاطب کر کے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

”اگر وہ ہے بیٹا! آپ دونوں کھانے کے بعد ادھر ہی آجانا۔“

کھانا نہیں کھائیں گے؟“ مدحیہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”نچ نامم دو بجے ہے۔“ وہ کمرہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے



نے کے بعد وہ دونوں شاہ سکندر کے کمرے میں آئیں تو کچھ دیر تک وہ ہلکے ہلکے انداز میں ان کی تعلیم ان کی منہ کے بارے میں پوچھتے رہے اور یہ کہ جڑواں ہونے کے ناتے کون سی باتیں اور عادات دونوں میں ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے مدحیہ سے پوچھا تھا کہ وہ شاہ تیور کے ساتھ رہنے پر اپنی مرضی سے گئی تھی یا نے زبردستی اسے بھیجا تھا اور یہ کہ وہ کراچی کس کے ساتھ آئی ہے۔

بابی مدحیہ نے انہیں تمام حالات کہہ سنائے۔ وہ بہت متفہم ہو رہی تھی اور برملا اظہار بھی کر رہی تھی۔

میں کتنی بار صحبت نے اسے خاموش ہونے کا اشارہ کر کے احساس دلانا چاہا کہ اسے شاہ سکندر کا خیال ہے یعنی ان کے سامنے ان کے خاندان کو برا نہیں کہنا چاہیے لیکن وہ اس کا اشارہ سمجھ کر بھی خاموش رہی۔

مندر دہلا ہر بڑے سکون سے سن رہے تھے اور اس کے خاموش ہونے پر اسی سکون سے بولے تھے۔

پہاں پریشان ہو، میں اور مجھے بھی پریشان کیا۔ حولی میں تو آپ کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ وہیں رہ کر آپ نظر کرنا چاہتے تھے۔ میں کینڈا گیا تھا یا امریکہ۔ مجھے واپس تو وہیں آنا تھا۔ اس طرح آنے کا مطلب تو یہ ہے کہ مجھ پر بھی بھروسہ نہیں تھا؟ ان کے تھمرے ہوئے پر سکون لہجے میں تنبیہ بھی یا چیچن، مدحیہ کو نہ بہت رازگاہ، سر جھکا کر اسے ناخن دیکھنے لگی۔

بکے اس اقدام سے میری پوزیشن کتنی آگورڈ ہو گئی ہے۔ خود اپنے آپ میں گھٹی فیل کر رہا ہوں میں کہ بیٹا کو تحفظ نہیں دے سکا، یہ نیشیت ہے میری۔“

”بابا!۔“ مدحیہ رو پڑی تو وہ ہونٹ چھینچ کر اسے دیکھنے لگا۔

شکاؤل اندر ہی اندر بیٹھے لگا کہ جانے اب وہ کیا نہیں اور اگر اس کے معاملے پر بات کرنے لگے تو وہ کیا کہے گا؟

”بابا! شاہ سکندر نے یکدم لہجہ بدل لیا اور مدحیہ کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولے۔ ”میں تو آپ کو یہ نہیں چھوڑوں، ان باتوں کو اور یہ بتاؤ، آؤں کریم کیسی تھی؟“

”ماں۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

”صرف اچھی۔“ انہوں نے صباحت کو دیکھا تو وہ فوراً بولی۔
”بہت اچھی۔“

”گڈ! اور اب آپ دونوں میں سے مجھے بہت اچھی چائے کون پلائے گا؟“ انہوں نے باری باری دونوں کو دیکھ کر صباحت نے اپنی طرف اشارہ کیا اور مدعیہ بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔
”صبا! صبا! اچھی چائے بنائی ہے۔“

”اور آپ۔“
”میں صرف اچھی۔“ اس نے یوں برا سامنہ بنا کر کہا کہ وہ صاف منع کر دیں لیکن وہ مڈ میں تھے۔
”چلو تو آج ہم صرف اچھی چائے پی لیتے ہیں بہت اچھی پھر سی۔“
”مجھے پتا تھا آپ یہیں کہیں گے۔“ وہ سدا کی کام چور بہت بے دلی سے انہی تھی مزید صباحت کی مسکراہٹ سے تپ گئی تو جاتے جاتے اس کے بازو میں چٹکی کا تکی گئی تھی۔
”آف!“ صباحت اپنا بازو سسلانے لگی۔

شاہ سکندر نے قعدا ”اس کی طرف سے دھیان ہٹالیا اور اٹھ کر دیوار گیریک کا شیشہ کھولا تھا کہ فون کی بیل واپس پلٹ کر اسی جگہ آئی تھی اور ریپور اٹھالیا۔
”لیس شاہ سکندر۔“
”اوہ علی! کیسے ہو بیٹا؟“

صباحت کا دل اتنی زور سے دھڑکا کہ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔
شاہ سکندر نے پہلے نا سمجھی کے عالم میں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر ایک دم سمجھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھالیا جبکہ ادھر کی بات بھی توجہ سے سن کر کہہ رہے تھے۔
”نہیں، میرا ایسا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ البتہ کل میں شاہ پور جانے کا سوچ رہا ہوں۔ وہ بھی کنفرم نہیں ہے۔“
”اوہ بھی، نہیں ابھی نہیں۔ کل آجانا۔“
”اوکے خدا حافظ۔“ انہوں نے ریپور رکھ دیا اور کچھ دیر جانے کیا سوچنے کے بعد بہت آہستہ سے صباحت کو کدھا تھپک کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

♥ ♥ ♥ ♥
جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، نیل کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ کبھی لابی میں آکر فون کے پاس کھڑے ہو جاتے کبھی میز پر جا کر دور تک دیکھتے۔ اس پرڈ میں اٹھ بچ گئے تو ان کے اضطراب میں خدشات بھی شامل ہو جینیں وہ کسی طرح دبا نہیں سکے تو آسیر کو فون کر ڈالا۔

”پھوپھو! مدد! اور صبا! ابھی تک نہیں آئیں؟“
”آجائیں گی بیٹا!“ آسیر کے لیے کے اطمینان نے انہیں مزید منتشر کر دیا۔
”کب میرا مطلب ہے کب تک آئے گا کہہ گئی تھیں۔ آجھ تو بچ گئے ہیں۔“
”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ جب ان کا باپ بھیجے گا تب ہی آئیں گی ناں۔“
”کیا ہو گیا ہے پھوپھو آپ کو۔ آپ نے انہیں جانے کیوں دیا تھا۔ پتا نہیں شاہ سکندر انہیں کہاں لے گئے۔“
”نیل نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے بھی ”مصلحتاً“ شاہ پور کا نام نہیں لیا۔
”کہیں نہیں لے گئے۔ یہیں اسی شہر میں ہیں۔ تم فکر نہیں کرو آجائیں گی۔“ آسیر نے پھر خود کو تسلی دینا شروع کر دیا۔

”میرے خدا!“ نیل ریپور رکھ کر پھر میز پر نکل آئے اور ریڈنگ کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھنے لگا۔
تک مسلسل ٹھنسنے کے باعث ان کی اکڑی ہوئی کمریں ٹھنسنے لگی تھیں۔

شہ غلط فیصلے کرتی ہیں پھوپھو۔“ جیسے جی بیک سے کمر نکالتے ہوئے انہوں نے سوچا۔ اور اس بار تو انہوں نے ابھی نہیں سمجھا کہ شاہ سکندر رہیں۔ سے ملنا چاہتے ہیں۔ شاید تھک گئی ہیں پھوپھو یا پھر۔۔۔
”ہنسی کی آواز سے وہ بری طرح چونکے اور انہی اٹھنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ صباحت نے لابی سے پکارا۔
بل بھائی!“

مینکس گھاڑ۔“ انہوں نے گہری سانس کھینچی اور اٹھنے کا ارادہ ترک کر کے جیسے جی بیک پر سر رکھ لیا۔
بل بھائی۔“ دوسری پکار کے ساتھ ہی صباحت سامنے آتی ہوئی بولی۔
پہاں کیا کر رہے ہیں۔ سو گئے کیا؟“

بل نے آنکھیں کھول دیں لیکن بولے کچھ نہیں۔
ابو! نیل بھائی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ صباحت متوحش سی ہو کر آگے آئی اور ان کی پیشانی پر ماتوہ آہستہ سے اس کی کلائی تھام کر بولے۔
”ٹھیک ہوں بالکل! بس ذرا پریشان ہو گیا تھا۔“
”بات ہے؟“ وہ بھی نہیں۔

”جا جائے دو۔ تم اپنی سناؤ۔ مل آئیں اپنے پیارے؟“
نیل بھائی!“ اس کی آنکھوں میں ایسی ہی چمک تھی جیسے برسوں کی آرزو پوری ہوئی ہو اور ایک جذبہ میں کرسی کے بازو پر دونوں ہاتھ جما کر فرش پر گھٹنے ٹیک گئی تھی۔
”ہے گے!“

”اتجھ۔ بہت محبت کرنے والے، مجھے لگا جیسے۔“ مدعیہ کی آمد سے اس کی بات ہونٹوں میں رہ گئی۔
مدعیہ کی آمد خاموشی سے نہیں ہوئی تھی خاصی اونچی آواز میں بول رہی تھی۔
”نہیں۔ تم یہاں ہو۔ یقیناً“ نیل بھائی کو پوری سہمی سناری ہوئی۔ بس کو صبا! سسرال جاؤ گی تو بڑا مسئلہ روزانہ بھاگ کر آنا پڑے گا تمہیں۔ نیل بھائی کو دن بھر کی روداد سنانے کے لئے۔“
”دمت۔“ اسے غصہ آ گیا۔

”ایک نہیں رہی۔ عرض کر رہی ہوں کہ خدا کی بندی رحم کرو نیل بھائی پر۔ بے چارے عاجز آگئے ہوں یوں نیل بھائی؟“

”رہنے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ جھنجھلا کر بولی۔
”آپ کبھی سچ نہیں بولیں گے۔“
”لے لے کہ تم میں سچ سننے کا حوصلہ ہی نہیں ہے۔“ صباحت نے کہا تو نیل فوراً ”مداخلت کرتے ہوئے“

”باہو جاتا ہے تم دونوں کو۔ فضول میں لڑنے لگتی ہو۔ چلو جاؤ جینج کر کے کھانا گاؤ۔“
”ناٹا تو ہم کھا کر آئے ہیں۔“ مدعیہ نے کہا۔

”کھا کر آئے ہیں۔ ماما اور نیل بھائی تو ہیں۔ آپ چلیں نیل بھائی میں بس ابھی جینج کر کے آتی ہوں۔“
”مکنتی ہوئی اندر چلی گئی تو نیل مدعیہ کو دیکھ کر بولے۔
”نہیں روکا نہیں انہوں نے۔“ نیل جانے کیا معلوم کرنا چاہ رہے تھے۔
”میں۔ وہ زیادہ یہاں رہتے کب ہیں۔ آج یہاں ہیں۔ کل شاہ پور میں ہوں گے۔“ وہ انتہائی لاپرواہی سے دے رہی تھی۔

”اوہ تم سے پوچھا نہیں انہوں نے کہ تم شاہ پور سے کیسے آئیں؟“
”پچھا تھا اور لانا مجھ پر ناراض ہو رہے تھے کہ میں اس طرح کیوں آئی۔ مجھے وہیں شاہ پور میں رہ کر ان کا

انتظار کرنا چاہئے تھا۔" مدحیہ کو اب اس بات پر غصہ آنے لگا تھا۔

"یعنی سارے حالات سننے کے بعد بھی کہہ رہے تھے کہ میں وہیں رہتی۔ آپ بتائیں میں روکتی تھی۔"

فیملی ذرا سافنی میں سر ہلا کر پوچھنے لگے۔

"اور صبا کے بارے میں کیا کہا انہوں نے؟ میرا مطلب ہے اس کی رخصتی شادی کی کوئی بات کی۔"

"بالکل کبھی نہیں۔ حالانکہ اب انہیں اس مسئلے کو سلجھانا چاہئے۔ بے ناں۔" اس نے پھر تہہ پانی و نمبر بے ساختہ مسکراہٹ کے ساتھ بے ساختہ بولے تھے۔

"ہاں ناں۔"

رات کے گیارہ بج رہے تھے جب علی جہانگیر شاہ پور پہنچا تھا۔ بھوک اور سفر کی تھکان دونوں ہی غائب تھیں پہلے اس نے سوچا چپ چاپ جا کر سو جائے لیکن خالی پیٹ نیند آتی بھی مشکل تھی۔ اس نے پلن میں جھانک دیکھا تو پھر انظر آئی۔

"جیراں! جو بھی کھانا ہو گرم کر کے نکالو میں ابھی آتا ہوں۔" وہ دروازے میں سے کہہ کر واپس پلٹا اور قدموں سے اپنے پورشن میں آیا تو شاہ جہانگیر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا جس کا مطلب تھا وہ سوئے نہیں ہیں۔ اس نے رک کر ان کے دروازے پر دستک دینے کے ساتھ کہا۔

"اباجی! میں ہوں علی۔"

"علی! ہاں اندر آ جاؤ۔" شاہ جہانگیر کے لہجے میں تعجب غالباً اس کی بے وقت آمد پر تھا۔

اس نے ہینڈل کھٹا کر دروازہ کھولا اور سر اندر کر کے بولا۔ "السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ خیر تہ سے تو ہو نا بیٹا۔"

"جی۔ دعائیں ہیں آپ کی۔"

"تو اندر آؤ۔"

"وہ بابا میں نے کھانا نہیں کھایا۔ اگر آپ۔۔۔"

"ہاں! ہاں جاؤ پہلے کھانا کھاؤ۔ کوئی ہے کچن میں یا سو گئے سب۔" شاہ جہانگیر لوں کھڑے ہو گئے جیسے نو کے لئے کھانا گرم کرنے کو تیار ہوں۔

"جیراں ہے اب اور میں اس سے کھانا نکالنے کا کہہ آیا ہوں۔ آپ بیٹھیں آرام سے میں کھانا کھا کر آپ

پاس ہی آؤں گا۔ آپ ابھی سو تو نہیں رہے نا؟"

"نہیں۔" شاہ جہانگیر دوبارہ بیٹھ گئے تو وہ آہستہ سے ان کا دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آیا۔ اس کا صرف منہ ہاتھ دھونے کا تھا لیکن جب آئینے میں خود کو دیکھا تو پھر شاور لے کر بیٹھا اور ڈاکٹنگ میں جا کر کھا

اس کے بعد دوبارہ شاہ جہانگیر کے کمرے میں آیا تو اب وہ باقاعدہ اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"سوری! میں نے بے وقت آپ کو تنگ کیا۔" اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں بیٹا! میں تو جاگ ہی رہا تھا اور کہو تو تمہاری ماں کو بھی اٹھا دوں۔" شاہ جہانگیر نے اسے کھوجتے نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو فوراً بولا۔

"نہیں امی کو نہیں اٹھائیں۔ مجھے بس آپ سے بات کرنی ہے۔"

"کیا بات؟" ان کے صفحے پر وہ اپنے آپ میں الجھ کر اور جیسے اکتا کر بولا تھا۔

"کوئی نئی بات نہیں ہے اباجی پرانا قصہ ہے میری شادی کا۔ کیا سوچا ہے آپ نے؟ اگر آپ صبا سے نہیں بہنا چاہتے تو صاف کہہ دیں میں خود اسے طلاق دے کر سارا قصہ ہی ختم کر دیتا ہوں۔"

"ہاں نہیں۔" شاہ جہانگیر اچھل پڑے۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو تنگ چھوڑ دو گے۔"

"ہاں یہ تو ہوں گا۔ صرف اسے ہی نہیں آپ سب کو بھی۔ زندگی بھر میری صورت نہیں دیکھیں۔"

بس ابھی فیصلہ کر لیجئے۔ صباحت کو بوسہ ملتا ہے کہ نہیں۔" اس نے ٹھوس حتمی لہجے میں کہا تو شاہ جہانگیر گھٹے۔

تا تو چکے ہیں۔ میرا مطلب ہے نکاح ہوا ہے تمہارا اس سے۔ باقی رخصتی کے لئے اس کی ماں نہیں مان رہی

یوں نہیں مان رہی۔" وہ فوراً بول پڑا۔ "آپ گئے تھے اس کی ماں کے پاس؟"

ن۔ نہیں۔" شاہ جہانگیر نظریں چراگئے۔

سب گئے ہی نہیں تو پھر کیسے کہہ رہے ہیں کہ وہ نہیں مان رہی۔ آپ ایک بار جائیں تو اور بابا جان کے

بے بن کر نہیں بلکہ میرے باپ بن کر جائیں۔ اگر آپ کو میری خوشیاں میری زندگی مطلوب ہے تو اس کے

پ کو دامن پھیلانے میں ہچکچانا نہیں چاہیے اور یہ کام تو آپ کو بہت پسند ہے کہنا چاہئے تھا لیکن آپ منظر سے

بہت دور ہیں پہلے مرٹلے پر ہی ختم ہو جاتی۔"

ہاں اس لئے کہ آپ لوگ فینر نہیں تھے۔ اگر فینر ہوتے تو آپ کے اندر پہلے مرٹلے پر ہی بات ختم ہونے

بلکہ لیکن نہ ہوتا۔"

ابا مطلب ہے تمہارا؟" شاہ جہانگیر نے ناگواری سے دیکھا تھا۔

آپ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں اباجی۔ پھر بھی اگر میرے منہ سے سننا چاہتے ہیں تو سنیں کہ بابا جان کے دل میں

کے خلاف جو نفرت، انہض اور دشمنی ابھی وہ انہیں طلاق دلوانے کے بعد بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ جب ہی تو

انہیں صباحت کا بیٹا چلا تو وہ ایک بار پھر ڈاکٹر آسیہ کو زبردستی کرنے کا سوچنے لگے۔ انہیں میری شادی سے کوئی

نہیں تھا۔ ان کا مقصد صرف ڈاکٹر آسیہ سے بیٹی چھیننا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو بھی چکے تھے۔

یہ نے درمیان میں اگر سارے کئے کرانے پر پانی پھیر دیا۔ جس سے وہ اور تھملا گئے اور صباحت کے

کے لئے مدحیہ کو استعمال کرنے لگے۔ کیس کیسی مقام پر انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ وہ دونوں لڑکیاں ان کا بیٹا

ہ۔ ان کے ذہن پر صرف آسیہ سوار رہی اور وہ بس اس کے خلاف سوچتے اور بلاناہتے رہے۔ اگر پوتوں

میں اور واقعی ان کی بہتری سوچ کر وہ آسیہ سے بیٹی مانگتے تو میں یقین سے کہوں گا کہ وہ بھی انکار نہ

نہیں جانتے بیٹا وہ عورت۔۔۔"

رت ہی سے نا۔" وہ فوراً بول پڑا۔ "جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ پہلی سے پیدا کی گئی ہے۔ اسی کی

رک اور بیڑھی اگر آرام سے محبت سے سیدھا کرو گے تو سیدھی ہو جائے گی ورنہ ٹوٹ جائے گی اور ٹوٹی

رت کو رام کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ وہ ٹوٹ کر صرف بھرتی ہی نہیں بھر بھی جاتی ہے۔ آپ خدا کے

مہاجان کے اشاروں پر چلنا بند کریں اپنے ذہن سے سوچیں کیا مباحات اور مدحیہ سکندر پچا کی بیٹیاں نہیں

ملیں۔ میں کیا آپ کی اولاد نہیں ہوں۔"

ا نہیں۔" شاہ جہانگیر مکمل طور پر اس کی گرفت میں آ چکے تھے۔

رکوں آپ میری خوشی کا خیال نہیں کر رہے۔ مجھے تو اس سارے فتنے میں آپ نے ایک طرف ڈال دیا

بے پیری کوئی اہمیت کوئی حقیقت ہی نہیں۔"

نہیں بیٹا۔"

نہیں۔ اس تمام عرصے میں ایک بار بھی آپ نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا چاہتا ہوں یا میرا خیال کر کے

مل آپ صرف بابا جان کے اشاروں پر چلے رہے۔ ان ہی کی زبان بولتے رہے اور ابھی تک وہی کرتے

اجان کہتے ہیں۔"

فکرتیجے گا اباجی! میں کاٹھ کا الو نہیں ہوں جو نا۔۔۔ شہنشاہی بنا دیکھتا رہوں اور نہ ہی میں مزید انتظار کر سکتا

ہوں۔ صاحت میری منکوحہ ہے اور یہ طے ہے کہ ڈاکٹر آسیہ خود اسے لاکر میرے گھر نہیں چھوڑ جائیں گی۔ آپ جانتا ہے گا۔ امی اور آپ اور یہ سمجھ لیتے کہ میری زندگی کی وراثی رشتے کے ساتھ بندھی ہے۔“
اس کے آخری جملے پر شاہ جہاگیر منہ کھولے اسے دیکھتے رہ گئے کیونکہ اس نے ان کے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی اور وہ انہی اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن گھڑی دیکھ کر پھر کسی وقت پر چھوڑنا پڑا۔
ہوا۔

”اچھا بابا۔ اب آپ آرام کریں بہت رات ہو گئی۔“
”نہیں۔ تم کہاں جا رہے ہو؟“ شاہ جہاگیر نے چونک کر پوچھا۔
”اپنے کمرے میں۔ جاؤں؟“ وہ بتا کر مسکرایا۔

”ہاں اور یہ لائٹ آف کرتے جاؤ۔“
”اوکے شب بخیر۔“ وہ لائٹ آف کر کے ان کے کمرے سے نکل آیا۔
دو بج رہے تھے جب اس نے تکیے پر سر رکھا اور اپنی باتوں کو سوچتے ہوئے کچھ ہی دیر میں سو بھی گیا تھا۔



کافی دن چڑھ آیا تھا جب عارف بیگم نے آگرا سے انھیں لایا تھا۔
اس نے آگرا میں کھولیں تو پہلے حیران ہوا پھر ایک دم یاد آیا کہ وہ رات ہی یہاں آیا تھا۔ فوراً اٹھتے ہوئے
”السلام علیکم ای!۔“
”جیتے رہو۔ رات کس وقت آئے تھے؟“ عارف بیگم نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے پوچھا۔

”گیارہ بج رہے تھے شاید۔“
”گیارہ! تمہارے ابا تو ہمارے تھے دو بجے سوئے ہو تھ جب ہی میں نے صبح تمہیں انھیں لایا تھا۔“
”جی آیا تو میں گیارہ بجے تھا پھر ابا کے ساتھ باتوں میں دو بج گئے تھے۔ ابا اٹھ گئے یا سو رہے ہیں ابھی۔“
”وہ تو صبح ہی اٹھ گئے تھے۔ چلو تم منہ ہاتھ دھو لو۔ میں تمہارے لئے ناشتہ بھجواتی ہوں۔“ عارف

کھڑکیوں سے پردے ہٹاتے ہوئے کہا۔
”یہاں بھجوائیں گی۔ نہیں میں ادھر ہی آ رہا ہوں۔ حیراں سے کہنے کا جائے میں دودھ کم ڈالے۔“
کچھ دیر بعد نیچے اتر کر آیا تو بس برائے نام ناشتا کیا۔ اس کے بعد بابا جان کے کمرے کی طرف جا رہا تھا
سے شاہ تیور نے اسے پکار لیا۔

”علی! سنو!“
اس نے پلٹ کر دیکھا پھر قصداً ”مسکرا کر بولا۔

”ہیلو! کیسے ہو۔“
”ٹھیک ہوں۔ تم کہاں جا رہے ہو۔“ شاہ تیور نے بہت عجلت سے جواب دے کر پوچھا۔
”یہیں بابا جان کے پاس، تو چلو۔“ اس نے بہت سادہ سے انداز میں کہا۔
”نہیں تم جاؤ بلکہ بعد میں چلے جانا پہلے میرے ساتھ آؤ۔“ شاہ تیور نے اسی عجلت میں آگے آکر
پکڑا تو وہ حیرت سے بولا۔

”ارے میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا اور جانا کہاں ہے؟“
”تم آؤ تو۔“ شاہ تیور نے اس کا ہاتھ کھینچا تو وہ ناچار اس کے ساتھ چل پڑا۔
برآمدہ میں آکر شاہ تیور رک گیا اور اس کا ہاتھ چھوڑ کر رازداری سے پوچھنے لگا۔
”سنو! تم نے مدیہ کو دیکھا ہے؟“
”ہاں۔“ اس نے بڑے آرام سے اثبات میں گردن ہلائی تو شاہ تیور یک دم پر جوش ہو گیا۔

”کہاں۔ کہاں دیکھا ہے؟“
”یہیں اسی گھر میں۔“

”اسی گھر میں! میں یہاں کی بات نہیں کر رہا۔“ شاہ تیور کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔
”پھر کالج میں۔“ ہاں آخری بار میں نے اسے تمہارے ساتھ کالج میں دیکھا تھا۔ کیوں کیا ہوا اسے؟“ وہ سارا
بلکہ سمجھ کر انتہائی معصوم اور انجان بن گیا تھا۔
”کچھ نہیں۔“ شاہ تیور باپوسی سے نفی میں سر ہلانے لگا۔
”نہیں۔ تم کچھ چھپا رہے ہو۔ بتاؤ کیا بات ہے؟“ اس نے اصرار سے پوچھا تو شاہ تیور کچھ دیر پر سوچ انداز میں
”دیکھنے کے بعد کہنے لگا۔
”مدیہ چلی گئی یہاں سے۔ کسی کو بتائے بغیر۔ کیا تم اس کے گھر سے معلوم کر سکتے ہو کہ وہ خیریت سے پہنچ
گئی۔“

”میں! امیرا تو وہاں آنا جانا نہیں ہے۔“ اس نے ایک طرح سے مددوری ظاہر کی۔
”آنا جانا نہیں ہے فون تو کرتے ہو گے۔“ شاہ تیور نے بے قراری سے کہا۔
”وہ بھی نہیں۔“
”کیوں؟“

”میں کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔“ اس کے آرام سے کہنے پر شاہ تیور جھنجھلا گیا۔
”عجب آدمی ہو تم۔ اپنی منکوحہ کو فون بھی نہیں کرتے نمبر چھپی ہے تمہارے پاس یا وہ بھی نہیں ہے۔“
”ہے نمبر ہے۔“ وہ اندر ہی اندر اس کی حالت سے خاصا غفلت پور رہا تھا۔
”تو بھائی میرے، میری خاطر ہی فون کر کے مدیہ کا معلوم کرو۔“ شاہ تیور نے خوشامد سے کہا۔
”اگر تو یوں لیکن فرض کرو اگر مدیہ وہاں نہیں پہنچی تو میں تو پھنس جاؤں گا۔ سو رہی یا ریا کر دو مجھ سے نمبر لے لو
معلوم کرنا ہے خود کرو۔“ اس نے چین کے لئے جیسٹیں ٹٹولتے ہوئے کہا پھر اسے دیکھا۔ ”چین ہے تمہارے
؟“

”ہاں۔“ شاہ تیور نے جب سے چین نکال کر اسے دیا تو وہ اس کے ہاتھ پر نمبر لکھ کر بولا۔
”اگر تمہاری بات ہو مدیہ سے تو میری منکوحہ کو میرا سلام کھلوانا۔“
”صرف سلام۔“ شاہ تیور نے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔
”صرف سلام۔“ وہ کھل کر مسکرایا اور اسے ہاتھ ہلاتا ہوا اندر آیا تو کچھ دیر بی بی جان کے پاس بیٹھا پھر بابا جان
لڑے میں آیا۔

”السلام علیکم بابا جان!“ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی سلام کیا تھا۔
”تو صابرا دے! ہم کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ بابا جان نے کہا تو وہ بڑھ کر پوچھنے لگا۔
”کیا میری آمد کی اطلاع کس نے دی؟“
”مجھ سے۔“ شاہ تیور نے باپ سے بتایا تھا کہ رات گیارہ بجے تم آئے بغیر کسی اطلاع کے۔“
”گوئی اتنی دور سے تو نہیں آتا ہو تا بابا جان جو سینل سے پروگرام بنایا جائے اور یہاں اطلاع کی جائے۔ بس جب
پہنچتا ہے چل پڑتا ہوں۔ آپ سنائیں کیا مصروفیات ہیں آج کل؟“ اس نے اپنی بات سرسری انداز میں کہہ کر
نی مصروفیات جاننے میں دلچسپی ظاہر کی۔

”ہماری مصروفیات وہی ہیں جو ہمیشہ سے چلی آ رہی ہیں۔ زمینوں کے بکھیرے پھر تم لوگوں کے مسائل۔ کیا ہوا
اڑی شادی کا۔ کچھ بات بنی؟“ بابا جان نے یوں کہا جیسے اس مسئلے کو سلجھاتے سلجھاتے تھک گئے ہوں۔
”بات بنانے سے نفی ہے بابا جان! جبکہ ادھر سے ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی گئی۔“ اس کی صاف گوئی پر بابا

جان کی پشانی شکنیں آلود ہو گئی۔
 ”جی نہیں۔ میں نے اسے نہیں دیکھا۔“

”اس بند کو سکندر اور چلے جاؤ ہمارے سامنے سے ورنہ۔“ بابا جان کا اشتعال انتہا کو چھو رہا تھا۔
 ورنہ کیا۔ شوٹ کریں گے مجھے ہر دین۔“ شاہ سکندر اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ خاموشی سے دیکھ اور سن رہا
 دم حرکت میں آیا۔
 چچا جان ابلے چلیں۔“

میں۔ آج دیکھ لینے دو کہ کتنا دم خم ہے ان میں۔“ شاہ سکندر کی طرف سے کھا چیلنج تھا۔
 دم خم دیکھنا چاہتے ہو؟“ بابا جان دیوار پر لٹکی ہندو کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھتے تھے۔
 ”گڈ! وہ دماغی پریشان ہو گیا اور بھاگ کر بابا جان کے سامنے آکر بولا۔“ خدا کے لئے بابا جان! یہ کوئی مذاق
 ہے۔“

اٹ جاؤ علی۔“ بابا جان نے اسے دھکیلنے کے لئے ہاتھ اٹھائے تو اس نے ان کی دونوں کانیاں تھام لیں۔
 اتنی مضبوط تھکی کہ بابا جان کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑ گئیں اور اس سے پہلے کہ ان کی کمزوری ظاہر ہوئی وہ
 اور شاہ سکندر کی طرف سے منہ موڑتے ہوئے بولے۔
 ”لے جاؤ اسے یہاں سے۔“

سکندر نے اونہ کے انداز میں سر جھٹکا اور کین کی چیر کو پیر سے ٹھوکر مارتے ہوئے کمرے سے نکل گئے تو
 بے مطمئن سے وہ کر بابا جان کے پیروں کے پاس بیٹھنے ٹیکتا: وا بولا۔
 یس بابا جان، ریلیکس۔“ پھر ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہیں ریلیکس کر کے ہی ان کے کمرے سے نکلا

”اس نے صباحت کو پکارتے ہوئے نیل کے کمرے میں جھانکا تو وہ کتاب سے نظرس ہٹائے بغیر بولے۔
 ”نہیں ہے۔“

”ماں ہے؟“ اس نے پورا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔
 ”نہی ہوگی۔“ اس بار نیل نے کتاب بند کر کے اسے دیکھا تو وہ برا سامنہ بنا کر بولی۔
 ”کالونی نام ضرور ہونا چاہئے۔ کتنا عجیب لگتا ہے۔ نیچے۔ نیچے۔ نیچے۔ نیچے۔ نیچے۔ نیچے۔“
 بے ساختہ مسکرائے لیکن بولے کچھ نہیں۔
 ”آپ کو عجیب نہیں لگتا؟“ وہ نیچے اوپر کی گردان سے جھنجھا کر ان سے پوچھنے لگی۔

”لئے کہ آپ خود عجیب ہیں۔“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔
 ”نہی لگتا۔“ نیل نے خاصے محفوظ انداز میں تاکید کی تو وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔
 ”کہا۔“

”بس عجیب ہوں۔“ نیل نے کہا تو وہ کچھ دیر انہیں دیکھنے کے بعد بولی۔
 ”رگتے عجیب بھی نہیں ہیں۔“
 ”واہ تھوڑا سا۔“ نیل بھی ابھی ہی اس موڈ میں آتے تھے۔
 ”مے بھی صبا کی وجہ سے ہیں۔“ اس نے کہا تو نیل حیران: ہوئے۔
 ”صبا کی وجہ سے کیوں؟“

پوری عجیب، بلکہ عجوبہ ہے اور آپ یہ تھوڑا بہت اس کا اثر آیا ہے۔“
 تم نے نئی بات بتائی۔“ نیل نے ہلکی سی منہ پر کر کے کہا تب ہی فون کی بیل پر وہ انہیں ابھی آئی
 کرفون کے پاس آئی تھی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا بابا جان۔“ وہ خاصا جڑ بڑ ہوا۔
 ”پھر کیا مطلب ہے تمہارا کیا چاہتے ہو تم؟“ بابا جان کے لہجے میں طنز تھا جیسے تم مجھے مشورہ دو گے۔
 اس نے مصلحتاً ”خاموشی اختیار کر لی اور پھر اسی خاموشی سے اٹھ کر جانے لگا کہ اسی پل دروازہ کھلی سی رہ سکتا
 ساتھ کھلا اور شاہ سکندر اندر داخل ہوئے تھے۔
 ”السلام علیکم چچا جان۔“ اس نے سلام میں پہل کی۔
 ”شاہ سکندر سر کے اشارے سے جواب دے کر بابا جان کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔
 ”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔“ بابا جان نے انہیں جواب دے کر فوراً علی جمائیکر کو دیکھ کر پوچھا۔ ”تم دونوں ساتھ آ
 تھے؟“
 ”جی نہیں۔ میں رات کو آیا تھا اور چچا جان شاید ابھی آرہے ہیں۔“ اس نے کہا تو شاہ سکندر آگے آتے ہو
 بولے۔

”شاید نہیں یقیناً۔“
 ”ہوں۔“ بابا جان نے یوں ہٹکارا بھرا جیسے ان دونوں کی آمد کو کوئی معنی پسند ہے ہوں۔
 ”آپ کس سوچ میں پڑ گئے بابا جان۔“ شاہ سکندر نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بابا جان کو نوکا تو وہ چو
 کر بولے۔

”ماں بیٹھو۔“
 ”شکر ہے۔“ شاہ سکندر نے بیٹھتے ہوئے علی جمائیکر کے کندھے پر دباؤ ڈال کر اسے بھی اپنے ساتھ بیٹھا لیا تو
 قصداً ”بابا جان کو سنا کر اس سے کہنے لگے۔

”کل میں نے تمہیں اپنے ماں آنے سے روک دیا تھا تم نے ضرور مانتا ہو گا۔“ آئی ایم سوری۔ اصل
 اس وقت صباحت اور مدحیہ میرے پاس آئی ہوئی تھیں۔“
 ”مدحیہ۔“ بابا جان بے اختیار بول کر خاموش ہو گئے تو شاہ سکندر انہیں دیکھتے ہوئے بولے۔
 ”جی مدحیہ۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ کراچی میں ہے۔ اپنی ماں کے پاس لیکن آپ اسے چھوڑ کر نہیں
 تھے۔“

”کوئی بھی چھوڑ آیا ہو۔“ بابا جان نے اس بات کو قطعی غیر اہم قرار دے کر اپنی طرف سے موضوع ختم کر دیا
 ”کوئی بھی نہیں بابا جان! کوئی بھی نہیں۔“ شاہ سکندر ایک دم آپے سے باہر ہو گئے۔ ”دکھ تو اس بات کا۔
 میری بیٹی کو یہاں سے اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ کیوں۔۔۔ کیوں کیا آپ نے اس کے ساتھ ایسا۔ رقبے پر
 چھوڑ دیا۔“
 ”شکر کرو رقبے پر چھوڑا، کہیں اور نہیں پہنچا دیا۔“ بابا جان کا کھیل ختم ہو چکا تھا لیکن وہ بارہا سنے والوں میں
 نہیں تھے۔

”ارادہ تو آپ کا ایسا ہی تھا، لیکن۔۔۔“
 ”خدا الزام مست لگاؤ سکندر۔۔۔“ بابا جان زور سے دھاڑے۔ ”اگر ہمارا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو تم کبھی اس
 دیکھ نہیں سکتے تھے کیونکہ ہم کبھی اپنے ارادے میں ناکام نہیں ہوئے۔“
 ”ناہمی ہی نے آپ کو بولکھا دیا ہے بابا جان! جو آپ کوئی رشتوں کی پہچان بھی بھول گئے ہیں۔“ شاہ سکندر
 کے دھاڑنے کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”مدحیہ ہیں۔“ دوسری طرف شاہ تیمور تھا۔ جانے آواز بدل کر بولا تھا یا وہ نہیں پہچانی تھی۔
”جی آپ کون۔“

”مدحیہ، میں ہوں تیمور۔“ شاہ تیمور نے اس بار اسے پہچان کر کہا تو وہ لہک کر بولی۔

”اوشاہ تیمور، کیسے ہیں آپ؟“
”کیسا رکھنا چاہتی ہو تم؟“ شاہ تیمور کے جذباتی لہجے پر وہ ایک لحظہ کو کھٹکی پھر فوراً سنبھل کر کہنے لگی۔
”جیسے آپ ہیں۔ ویسے یہ امید کم ہے کہ میں دوبارہ آپ کو دیکھ سکوں گی۔“

”کیوں؟“

”جانتی نہیں۔“ وہ ٹال کر موضوع بدل گئی۔ ”اور سب لوگ کیسے ہیں؟“
”تھیک ہیں۔ یہ بتاؤ تم اس طرح کیوں چلی گئیں بغیر بتائے۔“ شاہ تیمور کے لہجے میں چور تھا۔ وہ زور سے نہ
”بابا!۔ آپ کا مطلب ہے مجھے بتا کر آنا چاہئے تھا۔ کسے آپ کو یا بابا جان کو؟“

”کسی کو بھی۔“ وہ اس کی ہنسی سے مزید جڑ بڑھا تھا۔
”اچھا، آئندہ خیال رکھوں گی اور کوئی بات۔“ اس نے بے نیازی سے کہہ کر پوچھا تو وہ فوراً بولا۔

”میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں؟“
”مدحیہ! ایسا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ میں تم سے کیوں ملنا چاہتا ہوں؟“ شاہ تیمور نے نوکر
”کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“ وہ یکدم اجنبی بن گئی۔

”تم جانتی ہو۔ اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ شاہ تیمور نے زور سے کہہ کر کہا تو وہ چیخ
”شٹ اپ شاہ تیمور! مجھے اس حال میں پھانسنے کی کوشش مت کرو۔ میں تم سے تمہارے پورے
سے نفرت کرتی ہوں۔ شدید نفرت۔ مجھے تم اور آئندہ کبھی مجھے فون مت کرنا۔“

اس نے انسانی غصے سے ریسیور ختم کر دیا اور جیسے ہی پلٹی سامنے نیل اور صباحت کھڑے نا سمجھنے والے
ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔



”اومنہ محبت! ایسی ہی پاگل احمق ہوں نا میں جو ان کے قریب میں آ جاؤں گی۔ سو بار لعنت مجھے
اسے جرات کیسے ہوئی یہاں فون کرنے کی۔“ وہ بقیہ غصہ اپنے آپ بول کر نکالنے لگی تھی۔
”اؤفہ! کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ کون تھا؟“ نیل کے اشارے پر صباحت نے اس کے قریب آ کر پوچھا۔
”وہ شاہ۔ شاہ تیمور جسے میں چکر دے کر بھاگی تھی۔“ اس نے یوں بتایا جیسے اگر وہ سامنے ہوتا تو اسے

لیتی۔

”کیا کہہ رہا تھا؟“ صباحت نے اس کے غصے سے خائف ہو کر کچھ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
”کہہ رہا تھا کہ اسے مجھ سے محبت ہے اور ملنا چاہتا ہے۔ ہونہ۔“
اس نے استغناء سے انداز میں کہہ کر سر جھٹکا تو صباحت نے بے اختیار نیل کی طرف دیکھا۔ جن
ایک سایہ سالہا رہا تھا۔ پھر بھی بڑے ضبط سے بولے تھے۔

”تو اس میں ناراض ہونے والی کیا بات ہے؟“
”کیا! وہ مزید سلگ کر چینی۔“ آپ کے خیال میں مجھے خوش دونا چاہیے؟“
”ہے تو خوشی کی بات کہ تمہارے لیے جی شاہ پورے۔“
”بس نیل بھائی! خاموش ہو جائیں۔“ وہ چیخ کر بولی اور پھر ایک مہلتوں میں چہرہ چپا کر رو پڑی۔

رہے۔“ نیل نے پریشان ہو کر صباحت کو دیکھا تو اس نے اشارے سے اسے چھوڑنے سے منع کیا لیکن
ہ نہیں سکے اور قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا کہ وہ ایک جھٹکے سے ان کا ہاتھ ہٹا کر پیچھے ہٹتے
پول۔

بات بات کر رہی تھی۔ مجھ سے۔ میں جانتی ہوں! آپ سب مجھ سے تنگ ہیں۔ میں چلی جاؤں گی یہاں سے۔“
جلی، تو ہم بالکل۔ ایسا کیا کہہ دیا ہے نیل بھائی نے جو تم ان پر ناراض ہو رہی ہو۔“ صباحت نے ٹوکتے ہوئے
نیل یہ شاہ پور والوں کی فیور نہیں کر رہے۔“ وہ روتے ہوئے اسی طرح بولی۔

میں۔ میں نے کب کسی کی فیور کی ہے۔ میں تو یونہی ایک بات کہہ رہا تھا۔“ نیل نے کہا تو وہ چیخ کر بولی۔
”نی ضرورت نہیں ہے آپ کو یونہی ایک بات کہنے کی۔ بہت برے لگتے ہیں مجھے شاہ پور والے، بد مزہ، ظالم
“

نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ انداز میں کہنے لگے۔ ”سوچ سمجھ کر
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو وہیں کے کن گاہری تھیں۔ یہاں آنا ہی نہیں
تھیں۔“

نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ انداز میں کہنے لگے۔ ”سوچ سمجھ کر
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو وہیں کے کن گاہری تھیں۔ یہاں آنا ہی نہیں
تھیں۔“

نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ انداز میں کہنے لگے۔ ”سوچ سمجھ کر
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو وہیں کے کن گاہری تھیں۔ یہاں آنا ہی نہیں
تھیں۔“

نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ انداز میں کہنے لگے۔ ”سوچ سمجھ کر
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو وہیں کے کن گاہری تھیں۔ یہاں آنا ہی نہیں
تھیں۔“

نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ انداز میں کہنے لگے۔ ”سوچ سمجھ کر
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو وہیں کے کن گاہری تھیں۔ یہاں آنا ہی نہیں
تھیں۔“

نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ انداز میں کہنے لگے۔ ”سوچ سمجھ کر
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو وہیں کے کن گاہری تھیں۔ یہاں آنا ہی نہیں
تھیں۔“

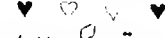
نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ انداز میں کہنے لگے۔ ”سوچ سمجھ کر
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو وہیں کے کن گاہری تھیں۔ یہاں آنا ہی نہیں
تھیں۔“

نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ انداز میں کہنے لگے۔ ”سوچ سمجھ کر
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو وہیں کے کن گاہری تھیں۔ یہاں آنا ہی نہیں
تھیں۔“

نیل نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ پھر تیسہ انداز میں کہنے لگے۔ ”سوچ سمجھ کر
غصے میں بالکل ہی آؤٹ ہو جاتی ہو۔ شاہ پور میں تمہیں تو وہیں کے کن گاہری تھیں۔ یہاں آنا ہی نہیں
تھیں۔“

”وہ کیا چاہتے ہیں؟“ کاش تم جان سکو۔“ صباحت کی دھیمی آواز اس نے سن لی تھی پھر بھی پوچھنے لگی۔
”کیا کام نہ ہے؟“

”کچھ نہیں۔ چلو آؤ نیچے چلتے ہیں۔ میں نے عمر سے کچھ کتابیں منگوائی تھیں پتا نہیں لایا ہے کہ نہیں۔“
صباحت بات بدل گئی۔
”تم جاؤ۔“ وہ اس کے بات بدلنے پر چڑکریوں اور اس کے بے بعد دھیمی آواز میں ٹیپ آن کرتی رہ گئی تھی۔



شاہ سکندر آج تیسرے دن بھی حویلی ہی میں تھے۔ لیکن بابا جان سے دوبارہ ان کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ قصداً ”گریز کر رہے تھے کیونکہ ان کے اندر ابھی بھی غصہ بھرا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ بابا جان سے پھر ان کا ملای ہو۔ اتنا تو وہ جان گئے تھے کہ بابا جان کو صباحت اور مدیحہ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ انہوں نے صرف آپنی ضد باریک رکھا ہے جبکہ خود ان کے پیش نظر ان کی دونوں بیٹیاں تھیں اور وہ صرف باپ بن کر ان کے لیے رہے تھے تو ان کی خواہش تھی کہ بابا جان نے جس طرح اپنی دوسری اولادوں اور ان کی اولادوں کی شادیاں کر اسی طرح اور اسی شان سے ان کی بیٹی صباحت کو بھی رخصت کرالیں۔ اور وہ اس سلسلے میں بابا جان سے ہر بات کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مدیحہ کے معاملے میں جوان کے ساتھ سچ کھائی ہوئی تھی اس کی وجہ سے خود موزا ابھی تک خراب تھا۔ کتنی بار مرنساء نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی، لیکن ہر بار انہوں نے جھڑپا کر اسے خاموش کر دیا تھا اور اس بار تو کمرے سے ہی نکل جانے کو کہا تو وہ ہری طرح تپ کر ان کے مقابل اٹھ گئی تھیں۔
”شاہ! یہ گھرتو توں بھی آپ کے لیے سرائے ہے۔ دو ایک دن کے لیے آتے ہیں ان میں بھی اپنے مسائل اچھے رہتے ہیں۔ میرے لیے بچوں کے لیے آپ کی پاس کوئی وقت نہیں۔“
”میرے مسائل الگ نہیں ہیں۔ بچوں ہی کے لئے پریشان ہوں۔“ وہ اس کا تپا ہوا سرخ چہرہ دیکھ کر د

نرم ہو گئے لیکن انداز میں ناگواری تھی جیسے بات نہ کرنا چاہتے ہوں۔
”میں بھی بچوں کی بات کرنا چاہتی ہوں۔“ مرنساء نے کہا تو اس بار وہ کچھ سنبھل کر بولے۔
”کیا بات؟“

”آغا! ماشاء اللہ شادی کے قابل ہو گیا ہے۔ اس کے لیے میں شہر بانو کی بیٹی لانے کا سوچ رہی ہوں۔ بلبل بھی یہی چاہتی ہیں اور الماس کے لیے۔“
”الماس ابھی چھوٹی ہے۔“ وہ فوراً بول پڑے۔ ”اس کے لیے تمہیں ابھی سے فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ میں اسے بہت بڑھانا چاہتا ہوں۔ انٹرمیڈیٹ مارکس لے آئی تو میڈیکل میں ایڈمیشن کرا دوں گا۔“
مرنساء نے فوراً کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر ان کی بات سے متفق ہو کر کہنے لگی۔
”ٹھیک ہے الماس پڑھے گی لیکن آغا تو زمین جائیداد دیکھنے والا ہو گیا ہے اس کی شادی میں دیر کیوں کریں۔“
”دیر صرف صباحت کی شادی میں ہے۔ وہ بھی بابا جان کر رہے ہیں۔ آج اگر وہ اسے رخصت کرالیں۔“

”اس کی شادی سے ہمارا کیا تعلق؟“ مرنساء نے چڑکر ان کی بات کاٹ دی۔
”تمہارا ہو یا نہ ہو میرا تعلق ہے اور گو کہ وہ آغا سے چھوٹی ہے، لیکن خود بابا جان نے پہلے اس کی شادی کی چھٹی ہی تھی اور یہ طے ہے کہ جب تک اس کا معاملہ سلجھ نہیں جاتا میں اور کسی بچے کی شادی کا سوچوں؟“
نہیں۔ ”شاہ سکندر نے جتنی انداز میں کہہ کر بات ختم کر دی۔
”اس کا معاملہ تو ساری زندگی نہیں سلجھے گا۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی بیٹھی رہے گی اس گھر میں۔“ مرنساء جل کر کہا تو وہ چیخ پڑے۔

”شٹ اپ مرنساء۔“

”نہیں خاموش ہو سکتی میں۔ آپ میری اولاد کا حق مار رہے ہیں۔ آپ کا بس چلے تو ساری زمین جائیداد ان ہی دیکوں کے نام لکھ دیں اور لکھ بھی دیتے اگر میری جگہ کوئی عام سی عورت ہوتی۔ میں نے اپنا حق چھوڑا نہ اولاد کا۔ رڈوں کی اور سن لیں اس لڑکی کا معاملہ سلجھ نہ سکتے تھے۔ آغا کی شادی کرنی ہے۔“
شاہ سکندر بند ٹٹھی ہو نونوں پر جمائے شعلہ بار نظروں سے اسے چلاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ خاموش ہو، تب صباحت سے بولے تھے۔

”سنو مرنساء! میں اگر چاہوں تو ابھی بھی اپنا سب کچھ مدیحہ اور صباحت کے نام لکھ سکتا ہوں، کوئی نہیں روک اچھے لیکن میری صرف وہی دو بیٹیاں نہیں ہیں، تین بچے یہاں بھی ہیں اور میں سب کے لیے ایک جیسا سوچتا ہوں۔“

”ایک جیسا سوچتے ہیں تو پھر آغا کی شادی پر اعتراض کیوں کر رہے ہیں؟“
”میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کی شادی وہیں ہوگی جہاں تم چاہتی ہو، لیکن صباحت کی شادی کے بعد اس کے لیے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں ابھی بابا جان سے بات کرتا ہوں۔“ وہ ایک دم بابا جان بات کرنے پر آمادہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

ور جب بابا جان کے کمرے میں داخل ہو کر انہیں سلام کیا تو وہ یہی سمجھے کہ اپنے اس روز کے رویے پر نادم آئے ہیں۔ جب ہی چھوٹے ہی کہنے لگے۔

”تم کبھی کبھی حد سے بڑھ جاتے ہو سکندر! اور یہ جرات تم اس لیے کرتے ہو کہ جانے ہو، ہم اپنی اولادوں میں سے زیادہ تمہیں چاہتے ہیں۔“

اس سکندر نے صرف اس لئے انہیں نہیں جھٹلایا کہ اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے تھے۔
”کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھو۔“ بابا جان نے ان کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا بابا جان۔“ وہ بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”مجھے صباحت کے مسئلے میں یہ پوچھنا اس کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے۔ کب تک وہاں کے گھر بیٹھی رہے گی؟“

”تب تک اس کی ماں چاہے گی۔“ بابا جان نے فوراً کہا تو وہ زور سے کربولے۔
”اس کی ماں کو چھوڑیں۔ میں اس کا باپ اسے رخصت کرنا چاہتا ہوں کیونکہ میرے آگے اور بھی اولاد ہے اور

باحث کے فرض سے سیکدوش ہو کر ہی اوروں کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔“
”تو اچھی بات ہے۔ جہاں تکیر کے ساتھ بیٹھ کر کوئی قریبی تاریخ طے کرلو۔“
”بلے سارے معاملات میں نے اور جہاں تکیر بھائی نے طے نہیں کیے تھے۔“

”ی نے بھی کیے ہوں، تمہیں اب بیٹی رخصت کرنی ہے۔“
”لیکن اس طرح جس طرح آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ آئیہ سے بیٹی چھینیں گے نہیں بلکہ اس کے

ر رخصت کر کے لائیں گے۔“ شاہ سکندر نے انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا۔
”لیا، ہم گئے نہیں تھے۔“ بابا جان کے اطمینان سے کہنے پر وہ بری طرح سلگ گئے۔

”نندرا! کیا چاہتے ہو تم؟“
”اب اچھی طرح جانتے ہیں اور میں آپ کو فوراً اس لئے کر رہا ہوں کہ یہ سارا کھیل آپ نے شروع کیا تھا

میری طرف سے پہل ہوئی تو میں خود اس سے بیٹیاں چھین لانا۔ خیر چھوڑیں ان باتوں کو جو ہو گیا سو ہو گیا۔
نزدیک اب سب سے اہم صباحت کی رخصتی ہے اور وہ اسی وقت عمل میں آئے گی جب آپ خود جا کر آئیہ

نہیں گئے۔“ شاہ سکندر رضی الامکان اپنے لہجے پر قابو پا کر بول رہے تھے۔ پھر بھی ان کی آواز قدرے تیز

ہو گئی تھی۔

”جی ہاں!“ الماس فوراً ہی آگئی تھی۔
دینا میری الماری میں جتنا سامان ہے، سوٹ کیس میں پیک کر دو۔“ انہوں نے الماس سے بات کرتے ہوئے
چہ زخم کر لیا تھا۔

”سارا سامان۔“ الماس کو حیرت اس بات پر تھی کہ سارا سامان ایک سوٹ کیس میں کیسے آئے گا اور وہ سمجھ کر
”سوٹ کیس لے لو، دو میں تو آجائے گا ناں۔“

”شاید۔“ الماس ڈرینگ روم کی طرف بڑھ گئی تو انہوں نے قصداً ”مہر النساء کو نظر انداز کر دیا اور اپنا بریف
ن اٹھا کر بیڈ پر رکھا پھر دراز کھول کر اس میں سے تمام کاغذات اور دوسری چیزیں نکال کر بریف کیس میں رکھنے

”شاہ! آپ نے باباجان سے کہہ دیا ہے کہ آپ یہاں سے جارہے ہیں۔“
”کیوں؟“ وہ سراوٹھائے بغیر اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”ان سے کہنا ضروری ہے کیا یا تم یہ سمجھتی ہو کہ وہ
بروک لیں گے۔ نہیں مہر النساء! بروک تو وہ مجھے پہلے بھی نہیں سکے تھے۔“
”آپ گئے ہی ایسے تھے کہ۔۔۔“

”اب اس طرح رات کے اندھیرے میں نہیں جاؤں گا۔“ وہ فوراً بول پڑے۔
”جاؤ کرو سارے میں اعلان کہ میں ہمیشہ کے لئے یہاں سے جارہا ہوں۔ جاؤ مہر النساء۔“
مہر النساء ان کے غضب ناک ہونے پر خائف سی ہو کر کمرے سے نکل گئی۔
”ٹان سینس۔“ انہوں نے سر جھٹکاتے ہی الماس ڈرینگ سے نکل کر پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا بابا؟“
”کچھ نہیں بیٹا! تم اپنا کام کرو۔ اور ہاں سنو! اسٹڈی میں رانٹنگ ٹیبل کی دراز میں جتنی ڈائریاں ہیں وہ سب
ایک کس میں رکھ دو۔“

”آپ کہاں جارہے ہیں بابا! میرا مطلب ہے کیا بہت زیادہ دنوں کے لئے جارہے ہیں؟“ الماس نے قدرے الجھ
رہو چھا تو وہ یوں اسے دیکھنے لگے جیسے سمجھ نہ پا رہے ہوں کہ کیا جواب دیں۔ پھر اسے قریب بلا کر پوچھنے لگے۔
”تم چلو گی میرے ساتھ!“

”کہاں؟“
”کراچی۔ میں نے مستقل وہیں سکونت کا فیصلہ کر لیا ہے۔“ انہوں نے کہا تو وہ فوراً پوچھنے لگی۔

”اسی جی جارہی ہیں؟“
”میں نے تو ان سے طے کر لیا ہے آگے ان کی مرضی۔“ وہ کہہ کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے تو الماس کچھ
بہونے کے بعد پوچھنے لگی۔

”پاپا! اگر اسی نے انکار کر دیا تب بھی آپ جائیں گے؟“
”ہوں۔“ انہوں نے پہلے مصروف انداز میں جواب دیا پھر اسے دیکھ کر کہنے لگے۔ ”بیٹا! جیسے تم میری بیٹی ہو اسی
نح صاحبہ اور مددگار بھی ہیں۔“

”تو آپ ان کے لئے جارہے ہیں۔“ ان کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ الماس بول پڑی تھی۔
”ہاں! لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں تم سے غافل ہو جاؤں گا۔ ہرگز نہیں۔“ وہ بریف کیس بند کر کے
ٹھکڑے ہوئے۔ ”چلو بیٹا! جلدی سے پکینگ کرو مجھے ابھی جانا ہے۔“

الماس بڑی بے دلی سے اٹھ کر دوبارہ ڈرینگ روم میں چلی گئی تو وہ بی بی جان سے ملنے کے ارادے سے نیچے آئے
تو انہی میں بی بی جان کے ساتھ بابا جان اور مہر النساء کو دیکھ کر وہ مجھ گئے کہ ان کے خلاف کیا محاذ کھل چکا ہے
وہ اس کے لئے تیار بھی تھے لیکن لڑنا نہیں چاہتے تھے، کیونکہ جانتے تھے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

باباجان ان کی آخری بات پر یوں بن گئے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

”یہ آسیہ کی ضد نہیں ہے باباجان!“ وہ ان کے انجان بننے پر زچ ہو کر کہنے لگے۔ ”وہ تو سرے سے صاحبہ
یہاں بیٹھنا ہی نہیں چاہتیں۔ آپ جانتے ہیں وہ خلع کا دعویٰ دائر کر چکی تھیں۔ اگر میں درمیان میں نہ آتا تو
تک فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ پھر بتائیں آپ کیا کرتے۔“ اپنی پلاننگ کے بعد کیا حاصل ہوتا آپ کو۔ انسا آپ کا وقت
مجموع ہوتا اور میں زیادہ عرصہ تک آسیہ کو مزید اقدام سے نہیں روک سکوں گا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس
کے اگلے نوٹس سے پہلے ہی آپ صاحبہ کو رخصت کرالائیں۔“

”جب وہ ڈاکٹری اسے یہاں ہی رہنے کو تیار ہی نہیں ہے تو پھر تم کس حساب سے ہمیں اس کے پاس جانے
مجبور کر رہے ہو؟“ ان کی پوری بات سننے کے بعد بڑے سکون سے کہا تھا۔

”وہ آپ کی بات نہیں ٹالے گی۔ مجھے یقین ہے۔“ انہوں نے بڑی امید سے کہا۔
”یہ یقین نہیں اس ڈاکٹری نے دیا ہے؟“ باباجان کے مشکوک لہجے نے انہیں بری طرح ہرٹ کیا تھا
انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی برداشت کی حد ختم ہو چکی ہے مزید اگر باباجان نے ایک لفظ بھی کہا تو وہ پھٹ پڑ
گئے۔ ”بس باباجان!“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”میں نے جان لیا کہ آپ کسی قیمت پر صاحبہ کو رخصت کرانے نہ

جائیں گے۔“
ان کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جانے کیا تھا۔ باباجان ایک لحظہ کو ٹھٹکے پھر فوراً بولے تھے۔

”ہم یہاں اس کا استقبال۔۔۔“
”نہیں۔“ انہوں نے بھی فوراً ٹوک دیا۔ ”صباحت یہاں نہیں آئے گی۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ باباجان نے گوشش سے اپنے لہجے کو مضبوط بنایا تھا۔
”اس کی ماں نے جو فیصلہ کیا ہے وہی ٹھیک ہے۔ میں ناحق اسے روکتا رہا۔“ وہ باباجان کی طرف دیکھے بغیر
اپنے آپ سے کہتے ہوئے ان کے کمرے سے نکل آئے تھے۔

”مہر النساء! میرا سارا سامان پیک کر دو۔“ شاہ سکندر نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی مہر النساء کو ٹھٹکا
کر کے کہا تو وہ تعجب سے پوچھنے لگی۔

”سارا سامان کیوں؟“
”میں یہ جو ملی بلکہ شاہ پور چھوڑ رہا ہوں ہمیشہ کے لئے تم اور بچے بھی اگر میرے ساتھ چلو تو مجھے
ہوگی۔“ انہوں نے بہت سادہ لہجے میں کہہ کر سگریٹ کیس اٹھا لیا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر
میں دیا۔ پھر لاٹری تلاش میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے انہیں خیال آیا کہ مہر النساء نے کوئی جواب نہیں دیا۔
پلٹ کر دیکھا تو وہ پشیمانی پر بے شمار شکلیں ڈالے جانے کیا سوچ رہی تھی۔

”مہر النساء! سنا نہیں تم نے، میں نے کیا کہا ہے۔“ انہوں نے قدرے اونچی آواز میں اسے پکارا تو وہ چونچ
بولی۔ ”ہاں، جو ملی چھوڑ رہے ہیں، لیکن کیوں؟“

”میری مرضی۔ تم یہ بتاؤ میرے ساتھ چلو گی کہ نہیں۔“ انہوں نے فیصلہ کن انداز میں پوچھا۔
”کیا ہو گیا ہے شاہ آپ کو۔ اگر باباجان نے کچھ کہہ دیا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ خود
دیں۔ ایسا کریں آپ دو چار دنوں کے لئے شہر چلے جائیں۔ واپس آئیں گے تو باباجان کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا
نساء الٹا انہیں سمجھانے کھڑی ہوگی۔

”تو تم نہیں جاؤ گی۔“ وہ اس کے سمجھانے پر تپ کر بولے اور اونچی آواز میں الماس کو پکار لیا۔

”مجھے اجازت دیجئے لی بی جان۔“
 لی بی جان کچھ گھبرا کر بابا جان کو دیکھنے لگیں تو وہ آگے آتے ہوئے بولے۔
 ”تو مہر النساء ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس ڈاکٹرنی کے لئے تم ہمیں اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر جا رہے ہو۔“
 شاہ سکندر ان کے ڈاکٹرنی کہنے پر بری طرح تلملا گئے تھے۔
 ”بابا جان۔ اگر آپ باریجیت کا کھیل کھیل رہے تھے تو ان لیں کہ آپ بارگئے کیونکہ اس عورت کو میری
 سے بے شک آپ نے نکال دیا لیکن اپنے ذہن سے کبھی نہیں نکال سکے۔ وہ ہمیشہ آپ کے لئے چیلنج بنی
 حالانکہ اس نے کبھی آپ کو چیلنج نہیں کیا۔ بہر حال آپ سن لیں کہ میں اس کے لئے جا رہا ہوں یا کسی اور
 لئے اپنے بال بچوں کو نہیں چھوڑ رہا۔ مہر النساء سے میں پہلے ہی ساتھ چلنے کو کہہ چکا ہوں۔ لیکن اسے جانے
 بات کا زعم ہے۔ شاید سمجھتی ہے کہ پہلے کی طرح۔“
 وہ گزشتہ بائیس دہرانہیں چاہتے تھے اس لئے سر جھٹک کر خاموش ہو گئے۔

بابا جان کو ان کی پہلی ہی بات نے گویا آسمان سے زمین پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس کے بعد اتنی دیر انہیں اپنے
 حسیات پر قابو پانے اور خود کو سہارا دینے میں لگی تھی۔ پھر بھی جب بولے تو آوازیں وہ دبدبہ تھانہ کرج۔
 ”ہماری اولاد ہی ہمارے خلاف ہوئی سکندر! تو ہم کسی اور کو کیا کہیں۔ تم جانا چاہتے ہو تو شوق سے جاؤ
 ایک بات یاد رکھنا کہ ہم کبھی جھک سکتے ہیں نہ ٹوٹ سکتے ہیں اور ہمارا تو ہماری لغت ہی میں نہیں ہے اور یہ بھی
 کہ ہم باریجیت کا کھیل نہیں کھیل رہے تھے۔ ایسے کھیل ہم اپنے برابر والوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ ہمیں
 تمہاری بیٹیوں کا خیال تھا اور ابھی بھی ہے۔“

”بہت شکریہ بابا جان! آپ جتنا ان کا خیال کر سکتے تھے کر لیا۔ اب وہ میری ذمہ داریاں ہیں۔“ وہ بات
 کرتے ہوئے لی بی جان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔
 ”چلو تمہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس تو ہوا۔“ بابا جان نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ بھی ان
 انداز میں بولے۔

”دیر آید درست آید۔ اب یقیناً میں ان کے بارے میں بہتر فیصلے کر سکوں گا۔“
 ”یقیناً“ لیکن یہ کبھی مت بھولنا کہ ہم شاہ ہیں اور شاہوں کی بیٹیاں شاہوں میں ہی بیاہی جاتی ہیں۔ بابا
 نے انہیں باور کرائے کی کوشش کی تھی کہ کچھ بھی کر مدد کر اور صباحت کو ہر حال میں یہیں آنا ہے اور وہ
 کہنے لگے۔

”یہ اصول آپ کے ہیں بابا جان! آپ کے۔ وہ جو شاہوں کے شاہ ہیں جنہیں کل عالم کے لئے رحمت بنا کر
 گیا انہوں نے انسانوں کے درمیان فرق پیدا کرنے والے سارے نفرتے مٹا ڈالے تھے۔ ذات پات،
 نسب مقرر کا کالا، میاں تک کہ عربی کو بھی بر فضیلت نہیں ماسوائے تقویٰ کے اور مجھے افسوس ہے کہناڑ رہا۔
 جان! کہ آپ اپنی نسبت تو ان ہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جوڑ رہے ہیں لیکن ان کی تعلیم
 عمل نہیں کر رہے۔“

”جاؤ سکندر! ہمیں تم سے کوئی غرض ہے نہ تمہارے کسی معاملے سے۔ جو تمہارا دل چاہے کرو۔“ بابا
 لا جواب ہو کر دوڑے تھے اور رکے بھی نہیں۔ فوراً اپنے کمرے کا رخ کیا تھا۔
 شاہ سکندر کچھ دیر ان کے پیچھے دیکھتے رہے۔ پھر دوبارہ لی بی جان کے پاس بیٹھتے ہوئے مہر النساء کو مخاطب
 بولے تھے۔

”مہر النساء! دیکھو الماس نے میرا سامان پیک کر دیا۔ اس سے کمو جلدی کرے میں شام اترنے سے پہلے
 سے جانا چاہتا ہوں۔“
 ”شام تو ہو جائے گی شاہ! مجھے اپنا سامان اکٹھا کرتے کرتے۔“

بہت جلد اپنے امی ابا کو تمہارے گھر پہنچ رہا ہوں۔ انہیں وہاں سے باپوس نہیں لوٹنا چاہئے، سمجھیں تم۔“
”نہیں“ میرا مطلب ہے میں کیا کر سکتی ہوں۔“ وہ رو بہا ہی ہو گئی تھی۔

”بس صبا! میں اب یہ نہیں سنا چاہتا کہ تم نے سارا اختیار اپنی ماما کو دے رکھا ہے اور وہ جو چاہیں فیصلہ کر رہے۔ ان کا فیصلہ اب بھی وہی ہو گا۔ وہ اور بابا جان ہمارے لئے نہیں سوچتے۔ یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ پھر ان کے فیصلے پر سر جھکا کے نامطلب یہ سراسر اپنی ذات کے ساتھ ظلم ہے صبا! میری بات سمجھ رہی ہوں اور یہ بھی سن لو کہ یہ میری آخری کوشش ہے اگر میرے امی ابا تمہارے گھر سے باپوس لوئے تو پھر واقعی ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے اور اس کا زہم دار میں سب سے زیادہ تمہیں ٹھہراؤں گا اور کبھی معاف بھی نہیں کروں گا۔ خدا حافظ۔“

اس نے اپنی بات ختم کرتے ہی ریسیور رکھ دیا کیونکہ اس کا رونا محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے کمزور پڑنے سے پہلے ہی سلسلہ منقطع کر دیا اور کچھ دیر اس کی بریڈی پر کڑھتا رہا پھر اپنا دھیان بنانے کے لئے باہر نکلا تو رات کے ٹیگ سڑکوں پر ہی گاڑی دوڑاتا رہا تھا۔ حقیقتاً ”وہ بے حد مضرب تھا اور بے حد باپوس۔ شاید اس مقام سے بھی آگے نکل آیا تھا جہاں انسان کے اندر کسی معجزے کے رونما ہونے کی ایک آخری امید زندہ رہتی ہے۔ اس کے اندر وہ بھی نہیں سمجھتا کہ وہ اتنا شاکا ہو رہا تھا۔ اور جب گھر لوٹا تو مزید خاموشی اور تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ حالانکہ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پھر بھی وہ شدت سے محسوس کر رہا ہوا وہیں لاؤنج میں صوفے پر دراز ہو گیا تھا۔

صبح نہ تو معمول کے مطابق خود سے اس کی آنکھ کھلی اور نہ کرم وین کے اٹھانے پر اٹھا تھا۔ بس ذرا سی آنکھیں کھولیں اور اسے جانے کا اشارہ کر کے دوبارہ سو گیا تھا۔ اس کے بعد کرم وین نے اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گیارہ بجے کے قریب اسے اپنے سر پر شاہ جہانگیر کی آواز شانی دی تو نمند میں ہونے کے باعث پہلے وہ بھی سمجھا کہ خواب دیکھ رہا ہے لیکن دوسرے پل عارفہ بیگم اس کا بازو ہلکا کر پکارتے لگیں۔

”علی علی! خیر تو ہے۔ ابھی تک سو رہے ہو اور یہاں۔“
وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے کے بعد سلام کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔
”آپ کب آئے؟“

”ابھی آ رہے ہیں۔“ شاہ جہانگیر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”تمہیں کرم دین نے نہیں بتایا۔ رات میں نے فون کیا تھا۔“

”وہ۔۔۔ میں اصل میں دیر سے آیا تھا۔ آپ بیٹھیں امی میں منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔“ وہ ان کے مزید دیر سے آنے اور اتنی دیر تک سونے سے متعلق سوالوں سے بچنے کی خاطر منہ دھونے کے بہانے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا اور پہلے آفس فون کر کے اپنے آپ نے آنے کا بتایا پھر وارڈ روم سے کپڑے نکال کر واش روم کا رخ کیا۔
نہانے سے وہ کافی ہلکا ہوا تھا لیکن باپوسی کا ابھی بھی وہی عالم تھا۔ شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم کی آمد نے بھی کوئی امید نہیں جگائی تھی پھر بھی وہ آخری کوشش ضرور کرنا چاہتا تھا تاکہ بعد میں کوئی ملال نہ رہے۔
”ہاں تو کیا کہتے ہو تم۔ ہم آسیہ کے پاس جائیں۔“ وہ ناشتے سے فارغ ہوا تو شاہ جہانگیر نے اصل بات چھیڑ دی۔
”جی۔۔۔!“

”جانے کو تو تم تیار ہیں لیکن بابا جان کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ تم جانے ہو وہ۔۔۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ سکندر سہاں آنے کے بعد کیا کہتا ہے۔“ شاہ جہانگیر نے بات ادھوری چھوڑ کر پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ سمجھا نہیں۔
”تمہارے چاچا سکندر؟ وہ ادھر ہی آگئے ہیں ناں! اپنے بال بچوں کو لے کر۔ تمہیں پتا نہیں ہے؟“ عارفہ بیگم نے بتا کر اس کی لاعلمی پر تعجب کا اظہار کیا۔

”چچا جان فیملی کے ساتھ یہاں آگئے ہیں۔ کب؟“ اس کی حیرت میں الجھن بھی تھی اور سوچ بھی۔
”ایک ہفتہ تو ہو گیا ہے اور میرا خیال ہے ہمیں آسیہ سے پہلے اس کے پاس جانا چاہئے کیونکہ یہی تو اس کی بھی

بہ۔ پھر اگر وہ کہے گا تو ہم ادھر بھی چلے جائیں گے۔“ شاہ جہانگیر اسے یوں دیکھنے لگے جیسے وہ فوراً تائید کرے گا لیکن اس کا ذہن شاہ سکندر میں الجھ گیا تھا۔ اس لئے ان کی بات کا جواب نہیں دے سکا۔

”آپ چھوڑیں نا سکندر کو۔ بس جہاں علی کہتا ہے وہیں چلتے ہیں۔ ہمیں اپنی اولاد کی خوشی دیکھنی ہے۔“ عارفہ بیگم اس کی خاموشی سے جانے کیا سمجھیں۔

”اسی کی خوشی کی خاطر تو یہاں آیا ہوں۔ بتاؤ ناں علی۔ کیا کہتے ہو تم؟“ شاہ جہانگیر نے اسے مخاطب کیا تو وہ ذرا باجوں کا پھر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا بابا! جو آپ کا دل چاہے کریں۔“
”کیا۔۔۔ کیا سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔ بابا جان نے کچھ کہا ہے تم سے یا سکندر نے مجھے بتا دیا کیا بات ہوئی ہے۔“

”میرے ساتھ کوئی بات نہیں ہوئی۔ آپ بتائیں پچا جان فیملی کے ساتھ یہاں کیوں آئے ہیں۔ میرے سامنے انہوں نے بابا جان سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔“

”مجھے خود نہیں بتایا! میں زمینوں پر تھا واپس آیا تو معلوم ہوا سکندر حویلی چھوڑ گیا ہے اور میرا خیال ہے اسی کی شادی کے لئے چھوڑی ہوئی اس لئے میں کہہ رہا ہوں پتہ اس پتہ میں ہو سکتا ہے اس کی آسیہ کے ساتھ اس سلسلے میں کوئی بات ہوئی ہو۔“

شاہ جہانگیر نے اس کے اٹھنے پر دھیرج سے کہا تو وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتا رہا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے لا۔

”ہوں! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ پہلے آپ چچا جان کے پاس جائیں۔“
”ہم جائیں! تم نہیں چلو گے؟“ شاہ جہانگیر نے نڈرے تعجب کا اظہار کیا۔
”نہیں۔ میں کیوں جاؤں! پناہ رشتہ لے کر کیا میں گیا تھا؟“ اس نے روٹھے لہجے میں کہا تو عارفہ بیگم فوراً اس کی نڈر کرتی ہوئی بولیں۔

”ہاں ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔ یہ کیوں جائے گا۔ اسے تو بس اب سرابا ندھ کر ہی لے جائیں گے۔“
”انشاء اللہ۔ اچھا بیٹا پھر ہم چلتے ہیں۔“ شاہ جہانگیر نے کہا تو وہ گھڑی دیکھ کر بولا۔
”اس وقت کہاں جائیں گے۔ کھانے کے بعد۔۔۔“
”کھانا ہم سکندر کے ساتھ کھائیں گے۔ چلو عارفہ! اب دیر نہیں ہونی چاہئے۔“

شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم کو دیکھ کر شاہ سکندر کا منسلکنا فطری بات تھی اور انہیں پسلا خیال ہی آیا تھا کہ بابا نے ایک بار پھر ان کے خلاف سازش کر کے انہیں بھیجا ہے۔ اس لئے انہوں نے مروتاً بھی ان کی آمد پر دُش کا اظہار نہیں کیا اس کے برعکس خالصا دیا انداز تھا۔
”کیسے آئے آپ لوگ؟“

”براؤں کا ہمارا آنا؟“ شاہ جہانگیر فوراً ہی ان کی بے اعتنائی محسوس کر گئے تھے۔
شاہ سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا اور کچھ بیگانے پن کا بھی مظاہرہ کر گئے تو شاہ جہانگیر نے آگے بڑھ کر انہیں اندھوں سے تھام لیا۔

”میں جانتا ہوں سکندر! تم کیا سوچ رہے ہو۔ بخدا! مجھے بابا جان نے نہیں بھیجا۔ میں خود آیا ہوں تمہارے۔ اسے بیٹے کی خوشیاں مانگنے اور میں تو بہت پہلے تم سے ملنا چاہتا تھا لیکن تمہارا اصرار تھا کہ بابا جان آسیہ لپکاس جائیں۔ مجھے تو کسی نے کچھ سمجھا ہی نہیں۔ بابا جان نے نہ تم نے۔ حالانکہ علی کا پاپ میں ہوں۔ بہر حال ناماری باتوں سے قطع نظر میں یہ کہوں گا کہ ہمیں اپنی اولاد کی خوشیاں دیکھنی چاہئیں۔ آخر ان کا کیا تصور ہے؟“

شاہ سکندر آہستہ سے اپنے کندھوں سے ان کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولے۔
 ”میری تو میں پوچھتا رہا کہ میری بیٹی کا کیا قصور ہے۔ اس کے لئے بابا جان اس طرح کیوں نہیں سوچتے جیسے دوسری اولادوں کے لئے سوچتے ہیں۔“

”دوسری اولادوں کے لئے سوچتے ہوئے بھی وہ ان کی خوشی کا خیال کب کرتے ہیں۔ وہ تو زبردستی اپنے فیصلے مسلط کرنے کے عادی ہیں اور جو ذرا سالانہ کے فیصلے سے اختلاف کرتا ہے وہ اپنی ضد بنالیتے ہیں لیکن خدا کے لئے سکندر تم اس بات کو ضد مت بناؤ کہ بابا جان ہی صاحت کو رخصت کرانے جاتیں گے۔“

”نہیں، میرا بابا جان سے کوئی تعلق نہیں اور جہاں تک صاحت کی رخصتی کا سوال ہے تو اس کا فیصلہ اس کی ماں کرے گی اور مجھے نہیں معلوم اس کی ماں نے کیا سوچا ہے؟“ شاہ سکندر صاف دامن بچا گئے۔

”ہم اسی لئے تمہارے پاس آئے ہیں کہ تمہاری اجازت سے ہم آئیہ کے پاس جانا چاہتے ہیں۔“ شاہ جاگیر ان کے پہلو تھمی کرنے پر اندر ہی اندر جزبہ زہر کر رہے تھے۔

”مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ جب آپ کا دل چاہے جائیں۔ پھر کھانے کے بعد شاہ سکندر معذرت کر کے اپنے کسی کام سے چل گئے تھے۔

عارف بیگم، مہر النساء کے ساتھ باتوں میں لگ گئیں تو شاہ جاگیر کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔ انہیں شاہ سکندر کے روتے بے خاصا ماہوس کیا تھا اگر علی کا خیال نہ ہوتا تو وہ بیسیں سے واپس شاہ پور لوٹ جاتے لیکن انہیں علی کی بات یاد بھی ہو جاس لے نہ تھا۔ ”میری زندگی کی دور اسی رشتے سے بندھی ہے۔ جسے مضبوط کر کے لئے وہ اب اپنا سب کچھ داؤ پر لگا سکتے تھے۔ جب ہی شاہ سکندر کے رویے سے دلہواشت ہوئے کے باوجود وہ

ٹھیک چار بجے عارف بیگم کے ساتھ آئیہ کے دروازے پر موجود تھے۔

تیل کے جواب میں گیٹ ٹوہی نے کھولا تھا اور وہ عارف بیگم کو پہچانتی تھی اس کے باوجود فوری طور پر انہیں اندر آنے کو نہیں کہا بلکہ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔

”ڈاکٹر صاحبہ ہیں یا ان کے والد صاحب۔ ہمیں ان سے ملنا ہے۔“ شاہ جاگیر نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے کہا تو وہ گیٹ اسی طرح کھلا چھوڑ کر اندر بھاگ گئی۔

عارف بیگم یوں شاہ جاگیر کو دیکھنے لگیں جیسے بری بے عرق ہو گئی۔

”ولادی کا خاطر عارف بیگم! بہت کچھ سہنا رہا ہے اور پھر شروعات تو ہماری طرف سے ہوئی تھیں۔ اب جو کہیں چپ چاپ سہنا ہے۔“ شاہ جاگیر ان کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر آواز دبا کر بول رہے تھے تب ہی اباجی نے آکر پورا گیٹ کھول دیا۔

”السلام علیکم۔“ شاہ جاگیر بس ایک نظر اس بوڑھے شخص کو دیکھ سکے پھر سر جھک گیا تھا۔

”وعلیکم السلام۔ آئے۔“ اباجی اگر خندہ پیشانی سے نہیں ملے تو پیشانی پر بڑھاپے کی عطا کردہ شکنوں میں کو ناگوار شکن کا اضافہ بھی نہیں ہوا تھا۔

”شکر ہے! شاہ جاگیر نے عارف بیگم کو آگے چلنے کا اشارہ کیا اور ان کے پیچھے اباجی کے ساتھ ان کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو انہیں اچانک وقت بہت پیچھے لے گیا تھا۔ پہلی بار جب وہ یہاں آئے تھے تو انہیں دیکھ کر سب لوگوں کے چہرے کھل گئے تھے اور وہ سب کے درمیان راجہ اندر رہنے سب کو حیران کر رہے تھے۔ اب خود حیران تھے کہ زندگی کیسے کیسے مذاق کرتی ہے۔

”آپ بیٹھیں میں آئیہ کو بلاتا ہوں۔“ اباجی کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے تو عارف بیگم ان کا ہاتھ ہلا کر پوچھنے لگیں۔

”شاہ جی! آپ کو کیا ہوا؟“

”ہیں۔“ وہ چونک کر دیکھنے لگے۔

بجہ جا میں۔ وہ آئیہ کو بلانے گئے ہیں۔“

”انہوں نے ماں کی صورت گہری سانس کھینچی پھر بیٹھنے کے لئے اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں برسوں پہلے تھے لیکن کتنا فرق تھا اب اور اب میں۔ جو گردن غرور سے تھی اب اس وقت نے جرم کا احساس دے کر غما۔

ناور ہو گئی۔ اباجی آئے نہ آئیہ نہ کسی اور نے جہاں تک کر دیکھا تھا۔

فہ بیگم پہلو پر پہلو بدلنے لگی تھیں۔ کسی وقت بڑھانے بھی لگتیں۔ لیکن شاہ جاگیر ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ وہ مسلسل اپنا محاسبہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

پا آوہ گئے بعد اباجی آئیہ کو ساتھ لے کر آئے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ بہت مجبور کرنے پر آئی ہے۔ جہاں تک اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے اور عارف بیگم بھی اٹھنے لگی تھیں کہ آئیہ نے ہاتھ اٹھا کر

ایا۔

لہذا تشریف رکھیں۔“

جہاں تک بیٹھ گئے تو پوچھنے لگی۔

یہ زحمت کی آپ نے؟“

اری آمد کا مقصد آپ جانتی ہیں۔“ شاہ جاگیر کو حقیقتاً ”بولنے میں دقت ہوئی تھی۔

ما نہیں، میں بالکل نہیں جانتی۔“ وہ رکھائی سے بولی تو اباجی فوراً ”کہنے لگے۔

ن جانتا ہوں۔ آپ یقیناً ”صاحت کے لئے آئے ہیں۔“

ما ہی صاحت بیٹی کے لئے۔ ہمیں آنا تو بہت پہلے چاہئے تھا لیکن۔“ شاہ جاگیر کوئی بات نہیں بتا سکے تھے۔

ما ف کیوں نہیں کہنے کہ اپنی ساری چالوں میں ناکام ہونے کے بعد۔“ وہ ہر خند سے بول رہی تھی کہ اباجی

سویا۔

سہ! تمہیں گھر آئے مہمانوں کا خیال کرنا چاہئے۔“ پھر ان دونوں کو دیکھ کر بولے تھے۔ ”آپ اس کی باتوں کا رہا نیے گا۔“

کی نہیں، انہیں حق ہے۔ چاہیں تو ہمیں گھر سے ہی نکال دیں۔ لیکن اس طرح یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا۔“

یہ نے ہونٹ پیچھے لے کر چونکہ اباجی نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

س سے پہلے جو کچھ ہوا اس کے لئے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔“ شاہ جاگیر نے اپنا رخ اباجی کی طرف ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تو آئیہ ہونہ کے انداز میں سر جھکتی ہوئی فوراً اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔

ما کے پیچھے پردہ ہل رہا تھا۔ باقی سب ساکت ہو گئے تھے۔

میں اجازت۔“ لکھی دیر بعد شاہ جاگیر غالباً ”کہنا کچھ اور چاہتے تھے اور کہہ کچھ گئے تو بول کھلا کرو صاحت

لگے۔ ”ہم ہی ڈاکٹر صاحبہ کاموڑ ٹھیک نہیں ہے، ہم پھر آجائیں گے۔“

ل! لیکن چائے چائے آ رہی ہے۔“ اباجی کو فوراً ہی بات سمجھ میں آئی اور وہاں سے اٹھنے کا سامانہ بھی مل گیا

ب کیا کر س شاہ جی! ڈاکٹر کی تو بات سننے کو بھی تیار نہیں ہے۔“ اباجی کے کمرے سے نکلتے ہی عارف بیگم

سے بولیں۔

پر کرو۔ اس کے اباجی سے بات کرتا ہوں، وہ اسے سمجھالیں گے۔“ شاہ جاگیر خود بھی فکر مند تھے لیکن بیگم

نیں کر رہے تھے۔

سیر جے کی ملی کی طرح سارے میں چکراتی پھر رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شاہ جاگیر اور عارف

دھکے دے کر نکال باہر کرے۔

”بابی نے انہیں اندر رکوں آنے دیا۔ کیا وہ بھول گئے کہ مجھے تباہ کرنے والا یہی شخص ہے۔ وہ بھول سکتے ہیں لیکن میں نہیں بھول سکتی۔ کیسے بھول جاؤں اتنے برسوں میں کوئی ایک دن ایسا نہیں جب میرے دل کی ہمتی اپنے اجزے کا ماتم نہ کیا ہو۔“

خس نے دیکھا وہ لمبو جو قطرہ قطرہ میرے دل سے ٹپکتا رہا۔
کس نے دیکھے وہ آنسو جو شب تنہائی میں میری آنکھوں سے تکیے میں جذب ہوتے رہے۔

کسی نے نہیں دیکھے جب ہی میری بیٹی کو اسی راتے پر دھکیلنا چاہتے ہیں۔
وہ سیکلے ذہن کے ساتھ جانے کیا کچھ سوچتی ہوئی ریٹنگ کے قریب رگ کر بیچے دیکھنے لگی۔ شاہ جہانگیر کی گاڑی موجود تھی جس سے وہ مزید سلگ کر واپس پلٹی اور درجہ کو نیچے بھیجنے کے خیال سے اس کے کمرے تک آکر۔
پکارنا چاہتی تھی کہ اندر سے آئی اس کی تیز آواز سن کر رگ گئی۔ وہ صباحت پر ناراض ہو رہی تھی۔
”تم انتہائی احمق پاتل ہو“ اپنے آپ میں گھٹ کر مرنے سے بہتر ہے ماما سے کہہ دو کہ تم علی کو پسند کرتی ہو یا؟

میں کہہ دوں گی۔
”نہیں بدحو! تمہیں میری قسم۔ تم ماما سے کچھ مت کہنا۔“ صباحت کی منت بھری آواز آئی تھی۔
”کیوں؟ کیوں اتنا درتی ہو۔ ماما تمہیں جان سے تو نہیں مار دیں گی۔“

”میں مرنے سے نہیں ڈرتی۔ مجھے بس ماما کو دکھ نہیں دینا۔“ گرنے دوا نہیں جو فیصلہ کرتی ہیں۔ میں بھول جاؤ گی علی جہانگیر کو۔ میرا یقین کرو میں نے اپنے دل کی ہمتی میں اس کے نام کے جتنے پھول کھلائے تھے سب! ہاتھوں سے نوح ڈالوں گی۔ پھر تم دیکھنا میں کبھی نہیں روؤں گی۔“ آنسوؤں کے درمیان صباحت رک رک کر رہی تھی۔

”نہیں۔“ آسیہ نے دروازہ دھکیلنے کے لئے جو ہاتھ اوپر اٹھا رکھا تھا وہ بے اختیار اپنے سینے پر رکھ لیا تھا
آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ بہت دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگی۔ اپنے کمرے میں آتے ہی اس دروازہ بند کر لیا اور بستری ڈھے گئی۔ اس کی سانسیں تیز تیز جلنے لگی تھیں جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آئی عجیب سی بے بسی طاری ہو رہی تھی اس پر۔ آنکھیں الگ جلنے لگی تھیں۔ تکیے پر سر رکھ کر اس نے دونوں آنکھوں پر رکھے تو ذہن کے درپچوں پر اس کے اپنے الفاظ دستک دینے لگے تھے۔

”میرا دل پھولوں کی بستی ہے۔ اسے اجاڑنے کی سعی وہی کر سکتا ہے جسے مجھ سے میری زندگی سے پیار نہ؟“
اس نے شاہ سکندر سے کہا تھا۔

اور اسے لگا جیسے اس کی جگہ صباحت آن کھڑی ہوئی ہو۔
”نہیں۔“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ ”دل کی بستی اجڑ جائے تو پھر کیا رہ جاتا ہے۔ ایک درد مسلسل جو دیتا ہے نہ مرنے۔ ایسی کڑی سزا میں اپنی بیٹی کو نہیں دوں گی۔“

”صبا!“ اس نے یوں پکارا جیسے وہ سامنے کھڑی ہو۔ پھر کمرے سے نکلی تو پہلے ریٹنگ کے پاس جا کر بیچے جھانک دیکھا۔ شاہ جہانگیر کی گاڑی موجود نہیں تھی۔ ایک لحظہ کو اسے لگا جیسے وہ ہو گئی لیکن فوراً ہی اس نے اس خیا جھٹک دیا۔ پھر کلینک جانے کے لیے تیار ہو کر بیچے آئی تو قصداً ”انجان بن کر اور بہت سرسری انداز میں اما سے پوچھنے لگی۔

”چلے گئے مہمان؟“

”ہاں۔“ اماں جی نے ناراض لہجے میں مختصر سا جواب دیا تو وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی پھر ان کے پاس ہوئے عاجزی سے بولی۔

”اماں جی! میں کیا کروں۔ ان لوگوں کو دیکھ کر میں خود پر قابو نہیں رکھ سکتی۔ کم از کم آپ کو تو میری کیفیت چاہئے۔“

”میں سمجھتی ہوں۔“ عقب سے میمونہ بھا بھی نے کہا تو اس نے پہلے گردن موڑ کر انہیں دیکھا پھر اٹھتے ہوئے
”اماں جی کو بھی سمجھا نہیں۔“

”ان کو میں سمجھا لوں گی، پہلے تم سمجھ لو کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرتا۔“
”آئندہ۔“ اس کی سوالیہ نظروں میں بے تابی تھی۔

”ہاں آئندہ۔ وہ پھر آنے کا کہہ گئے ہیں۔“ میمونہ بھا بھی نے کہا تو اس نے بشکل خود کو ”کب؟“ کہنے سے روکا
ذرا سا اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

”جھا! ابھی تو مجھے کلینک سے دیر ہو رہی ہے۔ واپس آکر آپ سے بات کروں گی تب تک آپ اماں جی کو
عادت ہے کہ مجھ سے ناراض نہ ہوں۔“

”ارے تم سے کون ناراض ہوتا ہے۔ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ پتا نہیں کون سے جہاں میں رہتی
”میونہ بھا بھی کو اس سے یہی شکوہ تھا جس پر وہ ہمیشہ کی طرح ہمتی ہوئی باہر نکل آئی۔

لو کہ اس وقت اس کا کلینک آنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اب وہ دیر نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے چند
پضوں کو اٹھانے کے بانی کو ڈاکٹر صائمہ کے پاس بھیج دیا اور سسر کو دروازہ بند کر کے جانے کا کہہ کر ٹیلی فون سیٹ
پہنچ لیا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد شاہ سکندر کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔

میری نیکل کے بعد ان کی آواز آئی تھی۔
”ہیں! شاہ سکندر حیات!“

”السلام علیکم! اس نے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ یہ ماں اسے حاصل ہو گیا تھا کہ وہ ہمارا کر بھی
ت گئی ہے۔

”علیکم السلام۔ کیسی ہیں آپ؟“ شاہ سکندر کو جیسے خوشگوار احساس ملا تھا۔
”میں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ مصروف نہیں ہیں تو یہاں میرے کلینک
آئیں۔ مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“ اس نے بغیر کسی جھجک کے کہا۔

”ظاہر ہے ضروری بات ہی کرنی ہوگی لیکن کیا یہ بھی ضروری ہے کہ ہم کلینک ہی میں بیٹھ کر بات کریں۔“ شاہ
مدر نے قدرے جتا کر کہا تو وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔

”نہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔“
”تھنک یو۔“ ٹھیک چندر منٹ بعد میں آپ کو وہاں سے پک کروں گا“ اوکے۔“

”اوکے“ اس نے ریمیورر کہ کر گھڑی دیکھی اور پھر بونٹی بیٹھنے کے بجائے راؤنڈ پر نکل گئی۔ بندرہ منٹ میں وہ
نہ جزل وارڈ ہی کا راؤنڈ لگا سکی تھی۔ وہ بھی بڑی جگت میں۔ پھر سسر سے کہہ کر وہیں سے باہر نکل آئی۔

شاہ سکندر گاڑی سے اتر رہے تھے اسے دیکھا تو وہیں رک گئے اور دروازہ اس کے لیے کھلا پھوڑ دیا۔
”جس اعتماد سے چل رہی تھی اسی اعتماد سے ان کے ساتھ بیٹھی تھی اور پندرہ منٹ بعد ایک فائیو اسٹار میں
با آئے سائے تھے۔

”مجھے صباحت کے سلسلے میں بات کرنی ہے۔“ اس نے بیٹھتے ہی کہا تھا۔
”ہوں! کیا بات؟“ شاہ سکندر نے سگار ساگنانے کے بعد پوچھا تھا۔

”وہی اس کی شادی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔ آج آپ کے بھائی شاہ جہانگیر حیات اپنی بیگم کے
فر آئے تھے۔“

”آپ نے کیا کہا ان سے؟“ آسیہ نے بات ختم نہیں کی تھی کہ وہ بول پڑے۔
”میری ان سے بات نہیں ہوئی۔ میں اصل میں پہلے خود کسی نیچے پر پہنچنا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد ان سے

وَعَلَيْكُمْ السَّلَامُ کیا بہت تھک گئی ہو یا بھوک زیادہ لگ رہی ہے؟ ”میسونہ بھابھی نے سلام کا جواب دینے کے پوچھا۔

نکھانا میں کھانچکی ہوں۔“

ہاں، ہم صیاحت کی شادی کی بات کر رہے تھے۔ تمہیں تو شاید احساس نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے پاس تہہ کہ تم اپنی بیٹیوں کے بارے میں سوچ سکو۔“ اباجی نے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے سخت ست

لکھنؤ سے دلچسپی ہے۔ آخر کیا سوچا ہے تم نے ان کے بارے میں اگر ان کی شادی نہیں کرنا چاہتیں تو کم از کم تمہیں ان کی تعلیم تو دلا دو کہ وہ تمہاری طرح۔۔۔“

مزید کہنا بھی پڑھا لوں گا کہ نہیں سکتی ہیں نہ کیچر اور پھر بہتر یہی ہے کہ ان کی شادی ہو جائے۔“

ہاں یہی میں غم سے کہنا چاہتا ہوں۔“ اما جی فوراً بول پڑے تھے۔ ”میں نے شاہ جہانگیر کو جمعہ کے دن بلایا

یہ بھی ابا جی! اسے تو کوئی اعتراض نہیں۔ آپ کس بات سے پریشان ہیں۔“ خلیل بھائی نے ابا جی کو مخاطب

کے لئے تیار ہو کر بیٹھے کیونکہ تیار ہو کر کیوں اسے؟" سبیل بھائی نے اس سے پوچھا۔
 "جی تیار تو ہے۔"

میں نے تو کھانا کھا لیا ہے۔“

نے کانگولوانے کے ساتھ صباحت کو نئے موسموں کا سندیہ بھی پہنچ دیا ہے۔

ان سب باتوں کو چھوڑیں۔ مجھے صرف آپ کی غمات چاہئے۔"

اس کی طرف میڈول کرنے کی خاطر۔ ٹارائش ٹرے میں ڈال دیا پھر اور است اسے دیکھ کر کہنے لگے۔
 ”بچے کہ میرے پیش نظر صحت کی بہتری تھی اور ہے کیونکہ مجھے علی گاہ ٹیپر اور اور اس کی محبت پر پورا

میں مداحات نہیں کرے گا، کوئی سازش ہو سکتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ صباحت میری بیٹی ہے اس لئے کہ وہ علی کے بہن ہو گئے۔ آپ اسے نہ اسے تمام خدشات نکال دیں۔ آپ کی بیٹی انشاء اللہ بہت خوش رہے گی اور جب تک

”نہیں، غلطی شرط نہیں۔“ وہ جوان کی باتوں کے دوران کچھ گم صدم سی ہو گئی تھی اسی انداز میں بولی تھی۔
”پھر بھی آپ سوچ لیں اور جب تک آپ کا دل اس رشتے پر مکمل طور پر مطمئن نہ ہو جائے شادی کی باتی نہ

ہوئوں پر بے ساختہ سی مسکراہٹ در آئی تھی۔
شاہ شہزاد کو اس کی مسکراہٹ بڑی بھلی لگی لیکن وہ اسے کوئی نام نہیں دے سکے۔

بے مقصد باتیں۔ انہوں نے کہا تو وہ قدرے حیران ہو کر بولی۔

”راست“ ان کے ہر انداز سے خوشی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”ویسے ہم موسموں کی رنگوں اور خوشبوؤں کی باتیں بھی کر سکتے ہیں۔ اتنا آپ کمر لگائیں۔“

تمام است آسے کے ہونا اسے مسکراہٹ اور شہر ہو گیا تھا اور ہر سارا کمال اس لیے مقصد گفتگو کا تھا۔

514

”نبیل نے انہیں ٹوک کر کہا۔
 ”نہا کو میں بلاتی ہوں“ آپ چلیں۔“ مدحیہ بھاگ کر اپنے کمرے میں آئی تھی۔
 صاحت الماری کے اندر سرگھسائے جانے لگا کر رہی تھی۔
 ”نہا نہیں ملے گا۔“ مدحیہ نے اس کے قریب آکر زور سے کہا تو وہ اچھل پڑی۔
 ”کیا؟“
 ”علی۔“

”افسوس! تم بہت بد تمیز ہو۔“
 وہ تو میں ہوں اور خالی پیٹ میں اور بھی بہت کچھ ہو جاتی ہوں۔“ مدحیہ نے بڑے آرام سے اعتراف کے
 بھوک کا احساس دلایا۔
 ”تو جاؤ، کھانا کھاؤ۔“
 کھانے ہی کے لیے بلائے آئی ہوں تمہیں، چلو۔“

جیہ نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور اس کی ایک ٹمبل سنی۔ کھینچنی ہوئی ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔
 ”نہا کھانے کے دوران ٹمبل یوں سے رہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو اور انہوں نے مدحیہ اور ثوبیہ کو بھی اشارا
 اٹھا لیکن وہ کہاں باز آنے والی تھیں۔ مسلسل اسے چھیڑتی رہیں جس سے وہ کھانا چھوڑ کر اٹھنے لگی تھی کہ
 نو آتے دیکھ کر نبیل کے نیچے مدحیہ کو پیر مارتے ہوئے بولی۔

”مما آ رہی ہیں۔“
 ”مما! آپ نے بہت اچھا کیا۔“ مدحیہ نے بے اختیار ہو کر نعرہ لگایا پھر ایک دم سٹیپا بھی گئی کیونکہ آسیہ تینہ ہی
 سے دیکھنے لگی تھی۔
 ”آئیے پھوپھو!“

”بس بیٹا! تم لوگ آرام سے کھاؤ میں ذرا چینیج کر لوں۔“ آسیہ ایک نظر صاحت پر ڈال کر وہیں سے واپس پلٹ
 ”نبیل مدحیہ کو دیکھ کر پوچھنے لگے۔
 ”تمہیں کیا ہوا تھا؟“

”جھوٹیں نبیل بھائی! ممابھی بس ایسی ہی ہیں انضمام الحق جیسی۔“
 جیہ نے برا سامنے بنا کر کہا تو وہ تینوں بے ساختہ ہنسنے کے ساتھ بولے تھے۔
 ”لیا مطلب ہے تمہارا۔“

”انضمام الحق! تمہارا لگائے یا بولڈ ہو جائے اس کی شکل پر کوئی تاثر نہیں ابھرتا۔“ مدحیہ ہنوز اسی انداز میں کہہ کر
 کھڑی ہوئی تو ثوبیہ بمشکل اپنی ہنسی روک کر کہنے لگی۔

”جی نہیں پھوپھو! کچھ روپاٹ نہیں ہے۔ پھر ان کی آنکھیں بھی بولتی ہیں۔ بے نا نبیل بھائی۔“
 نبیل نے اس بات میں سہلائے پر اکتفا کیا پھر مدحیہ کو جاتے دیکھ کر فوراً ”پکار کر بولے۔
 ”مدحیہ! تم نے کھانے کے بعد چائے پلانے کا کہا تھا۔“

”میں لاتی ہوں چائے۔ ثوبیہ! تم جانا نہیں۔“ صاحت کو وہاں سے اٹھنے کا ہمانہ مل گیا تھا۔
 ”نہا میں آکر اس نے چولہے پر چائے کا پانی رکھا پھر اسٹول کھینچ کر بیٹھی تو اس کا دل چاہا اب کوئی اس کے پاس نہ
 نہ اور نہ اسے بلائے۔ اس کے گرد جو ایک خوب صورت ساحصار کھینچ گیا تھا وہ اس سے نکلتا نہیں چاہتی تھی،
 چند لمحوں بعد ہی مدحیہ کی آواز نے سارا طلسم توڑ دیا تھا۔ وہ چتا نہیں کس سے کیا کہہ رہی تھی اور شاید اسی
 سے آ رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر نیپاٹ میں چائے دم کرنے لگی تب ہی مدحیہ کچن میں آکر بولی۔
 ”اگرے چائے تمہارا رہی ہو؟“

”مدحیہ نبیل پر کھانا لگا کر دوبارہ آنگن میں نبیل اور صاحت کے پاس آکر بیٹھی تھی کہ میز چیلوں پر قدموں کی آ
 سن کر نبیل کہنے لگے۔

”میرا خیال ہے پھوپھو آ رہی ہیں۔“
 ”دھنیک گاؤ، چلیں اب آپ دونوں بھی انہیں مجھے بہت بھوک۔“ ثوبیہ کو دیکھ کر مدحیہ نے بات دہرائی جھوٹا
 برا سامنے بنایا تھا۔

”او ٹوبیہ! کیا خبر لائی ہو؟“ نبیل نے اس کے بھاگ کر آنے پر یونہی کہہ دیا تھا جس پر وہ حیران ہو کر بولی۔
 ”آپ کو کیسے پتا کہ میں کوئی خبر لائی ہوں؟“
 ”اس کا مطلب ہے واقعی کوئی خبر ہے۔“ نبیل نے داد طلب نظروں سے صاحت کو دیکھا لیکن وہ متوجہ نہ
 تھی۔ البتہ مدحیہ نے ان کی بات میں غلڑا لگایا تھا۔
 ”وہ بھی اچھی۔“

”ہاں اچھی بہت دنوں سے کوئی اچھی خبر نہیں سنی۔ جلدی بتاؤ ثوبیہ کیا بات ہے۔“ نبیل نے مدحیہ کی تہ
 کرتے ہوئے کہا تو ثوبیہ نے باری باری تینوں کو دیکھا پھر بڑے آرام سے بولی تھی۔
 ”وہ پھوپھو کہہ رہی ہیں۔ آپ تینوں کھانا کھالیں۔“

”اور مما خود کہاں ہیں؟“
 ”نیچے سب کے ساتھ بیٹھی ہیں اور وہ کھانا کھا کر آئی ہیں۔ اس لیے انہوں نے کہا ہے کہ تم لوگ ان کا ہا
 نہیں کرو۔“ ثوبیہ نے مدحیہ کو جواب دے کر نبیل کو یوں دیکھا جیسے یہ بھی اچھی خبر۔
 ”یہاں آؤ۔“ نبیل نے تحاشہ سے اسے اپنے پاس بلایا تو اس کی ساری خوشی ہوا ہو گئی۔
 ”کیوں نبیل بھائی؟“

”میں کہہ رہا ہوں یہاں آؤ۔“
 ”میں میس سے جتا دیتی ہوں۔ پھوپھو صبا کی شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی ہیں۔“
 ثوبیہ نے نبیل کے غصے سے ڈر کر جس تیزی سے کہا اسی طرح صاحت نے جھکا ہوا سر اونچا کیا تھا جبکہ نبیل
 مدحیہ خوشگوار حیرت میں گھر گئے تھے اور اسی انداز میں دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو پھر صاحت کو دیکھا تو وہ
 کراٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایک منٹ روک صبا!“ مدحیہ اپنی جگہ سے اچھل کر اس سے لپٹ گئی اور اس کے کان میں دھیرے سے سہ
 کی۔ ”مبارک ہو۔“

”صاحت کے چہرے پر بڑے خوب صورت رنگ اتر آئے تھے۔ دھڑکنیں الگ بے ترتیب ہو گئی تھیں۔
 ”یہ بے ایمانی ہے نبیل بھائی! ان سے بھی تو پوچھیں کہ یہ چپکے چپکے کیا باتیں کر رہی ہیں۔“ ثوبیہ نے نبیل
 دونوں کی طرف متوجہ کر کے احتجاج کیا تو اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے صاحت خود کو چھڑا کر اندر بھاگ گئی۔
 ”ہاں کیا کہہ رہی ہو تم؟“ مدحیہ نے ثوبیہ کی طرف گھوم کر پوچھا تو وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

”کچھ نہیں۔“
 ”ارے تم تو ناراض ہو گئیں۔ چلو آؤ ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ اس کے بعد میں تمہیں بہت اچھی چا
 گی۔“ مدحیہ نے اسے مناتے ہوئے کہا۔

”تم چائے پلاؤ گی؟“ ثوبیہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلایں تو وہ چیخ پڑی۔
 ”کیوں کیا پہلے بھی نہیں پلائی۔“
 ”ہاں میں یہ تم دونوں کس خوشی میں لڑنے لگیں۔ چلو مدحیہ! تمہیں بہت بھوک لگ رہی تھی اور اسے“

”اچھا سنو ابھی میں مماسے تمہاری شادی کا پوچھ کر آرہی ہوں، ان کا ارادہ ایک مہینے میں تمہیں رخصت دینے کا ہے اور میں نے سوچا ہے اب جتنے دن تم یہاں ہو میں تمہیں کوئی کام نہیں کرنے دوں گی۔ البتہ شادی بعد جب تم علی کے ساتھ آؤ گی تب میں سارے کام تم سے کراؤں گی چاہے علی کو برا لگے یا بھلا۔ ویسے تمہارا خیال ہے اسے برا لگے گا۔“ مدحیہ نظارہ بڑی بنیدگی سے پوچھ رہی تھی لیکن وہ اس کی شرارت سمجھ رہی تھی۔
ہی گئی جواب نہیں دیا اور بڑے اٹھا کر اسے تھما دی۔



شاہ جہانگیر جمعہ کے دن پھر عارفہ بیگم کو ساتھ لے کر آگئے تھے۔ گوکہ گزشتہ بار آسیہ کا رویہ انتہائی بائوس تھا۔ لیکن اس کے بعد اباجی اور میمونہ بھابی نے اپنے طور پر آسیہ کے رویے کی تلافی کرنے کی کوشش کی تھی یہ بھی کہا تھا کہ وہ اسے سمجھائیں گے۔ لیکن اس کے مان جانے کا یقین نہیں دلایا تھا اس لیے شاہ جہانگیر کچھ ز پر امید نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا وہ ابھی بھی ٹال دیے جائیں گے البتہ کھڑے چلتے ہوئے علی کو سہل آئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے اسے آسیہ کے رویے کے بارے میں نہیں بتایا تھا صرف اس لیے کہ انہیں خد تھا کہ علی دوبارہ انہیں آسیہ کے پاس نہیں جانے دے گا اور خود فیصلہ کر کے نہ صرف اس رشتے کو ختم کر دے گا سب سے بھی تا تا توڑے گا۔ وہ یقیناً ”ان دونوں ہر ایک سے اس قدر متنفر ہو رہا تھا کہ اس سے ہر قسم کے اقدام توقع کی جا سکتی تھی اور جیسا کہ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے ہی کھیل جاتا۔ اسی لیے شاہ جہانگیر اور عارفہ جہاں بکھلائے ہوئے تھے وہاں اس کے سامنے محتاط بھی اتنے ہی تھے جتنے تھے کہ وہ کتنا اصول پسند ہے۔ اس کے دل میں ہر رشتے کی اپنی جگہ اور مقام ہے۔ وہ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دے سکتا۔ نہ صباحت کی خاطر ماں با کو چھوڑے گا اور نہ ماں باپ کی خاطر صباحت کو اگر انتخاب کا مرحلہ آتا تو وہ خود کو درمیان سے ہٹالے گا۔ اس میں اور شاہ سکندر میں یہی فرق تھا اور یہ شاہ سکندر بھی جان گئے تھے جب ہی اس کی ضمانت لیتے ہو انہوں نے آسیہ سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ شاہ پور چھوڑ دے گا بلکہ صباحت کے جانے کا بھی مبہم سا اشارہ دے کہ جب آسیہ چاہے گی تب وہ بھی جائے گی۔

بہر حال شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم اس وقت کوئی اچھی امید لے کر نہیں آئے تھے البتہ یہ اطمینان ضرور گھر کے دوسرے افراد ان سے اچھی طرح سے ملیں گے، حسب سابق اباجی ہی انہیں ڈرائنگ روم تک لا تھے اور انہیں بٹھا کر اندر چلے گئے تھے۔

”سوری“ آپ کو انتظار کی زحمت ہوئی میں اصل میں ابھی آفس سے آیا تھا۔“

”پھر تو ہم نے آپ کو زحمت دی۔“ شاہ جہانگیر نے کہا۔

”بالکل نہیں، پلیز تشریف رکھیں۔“

شاہ جہانگیر نے اباجی کو دیکھا اور ان کے بیٹھنے کے بعد بیٹھے تھے کہ دوبارہ کھڑے ہو گئے کیونکہ میمونہ بھابی کے ساتھ داخل ہوئی تھیں اور ان کے پیچھے آسیہ بھی۔

پھر ابتدائی رسمی جملوں کے بعد کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تھی۔

شاہ جہانگیر کو اندازہ نہیں تھا کہ ادھر سب منتظر تھے کہ بات وہ شروع کریں۔ سوچنا بڑا تھا جبکہ ادھر سب منتظر تھے کہ بات وہ شروع کریں۔

عارفہ بیگم کو پہلے ہی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اس طویل ہوئی خاموشی سے مزید گھبرا کر وہ بول پڑیں۔

”پھر کیا سوچا آپ نے؟“

شاہ جہانگیر نے چونک کر اپنی بیگم کو دیکھا پھر ان کی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔

”ہم اچھی امید لے کر آئے ہیں۔ آپ بڑے ظرف کے لوگ ہیں۔ یقیناً ”اچھا سوچا ہو گا جس میں پورا بہتری ہوگی۔“

”ماں باپ تو بہتری ہی سوچتے ہیں۔ دعا کریں۔ آگے لکھنے والے نے بہتری لکھی ہو۔“ خلیل بھائی نے کہا تو اباجی ان کی بات کی تصحیح کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”لکھنے والا بہتری ہی لکھتا ہے بس ہم انسان اس کی مصلحتیں نہیں سمجھتے۔ ٹوٹے رشتے پھر سے استوار ہونے میں بھی یقیناً ”اس کی کوئی مصلحت ہوگی اور ہمیں چاہیے ہم گزشتہ ساری باتوں ساری رنجشوں اور کدورتوں کو مٹا کر ایک دوسرے کو معاف کر دیں، ہمارے دل صاف ہوں گے تو آگے راستہ خود بخود صاف ہو جائے گا۔“ اباجی نے خاموش ہو کر باری باری سب کے ہتھکے ہوئے سروں کو دیکھا پھر کہنے لگے۔

”بہر حال آپ اچھی امید لے کر آئے ہیں اور ہم اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے آپ کو مایوس نہیں کریں گے، شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سرا سیمہ سے اباجی کو دیکھ رہے تھے۔

”کچھ چاہئے وغیرہ۔“ خلیل بھائی نے ان دونوں کو اس کیفیت سے نکالنے کی خاطر فہرے اونچی آواز میں کہا تو واقعی وہ بڑی طرح چونکے، پھر ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر اباجی کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے حد ممنون لہجے میں بولے تھے۔

”آپ نے تو ہمیں خرید لیا۔ میرے پاس الفاظ نہیں جو میں آپ کا اور ڈاکٹر صاحبہ کا شکریہ ادا کر سکوں۔“
”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اباجی نے ان کا کندھا تھک کر انہیں بیٹھنے کے لیے کہا پھر عارفہ بیگم کو کھڑے دیکھ کر آسیہ کو اشارہ کیا تو وہ اٹھ کر ان کے گلے لگتے ہوئے بولی تھی۔
”مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔“

شاہ جہانگیر اور عارفہ بیگم کو ان کی توقع کے بالکل برعکس اور اچانک جو خوشی ملی تھی، وہ ان سے چھپائی نہیں جا رہی تھی۔ عارفہ بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فوراً ”علی کو اطلاع دے کر اس خوشی میں شریک کریں۔ بڑی مشکل سے انہوں نے صبر کیا تھا۔ تاریخ رکھنے کے بعد چائے پینے تک رکھیں پھر سب نے کھانے کے لیے بہت اصرار کیا لیکن وہ معذرت کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں البتہ شاہ جہانگیر نے بہت محل کا مظاہرہ کیا تھا۔ فردا ”فردا“ سب سے ملے اور اپنے ہاں آنے کی دعوت دے کر آئے تھے۔

”کمال ہو گا شادی! اس روز تو ڈاکرنی۔“ عارفہ بیگم شروع ہوئی تھیں کہ انہوں نے نوک دیا۔
”بس عارفہ بیگم! اس روز کیا ہوا کیا نہیں بچھلی ساری باتیں بھول جاؤ۔ بس آج کو یاد رکھو اور آج کے بعد آنے والا ہر دن ایسا ہی خوشیوں بھرا ہونا چاہیے۔“

”انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔“ عارفہ بیگم فوراً بولی تھیں۔

اور جب وہ گھر پہنچے تو آگے علی ان کا انتظار تو کر رہا تھا، لیکن کھانے کے لیے جب ہی دیکھتے ہی کہنے لگا۔
”بس اسی جلدی سے آجائیں۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا تو

شاہ جہانگیر نے عارفہ بیگم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر علی کے پیچھے ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے پوچھنے لگے۔
”کوئی خاص ڈش بنوائی ہے کیا؟“

”ہاں نہیں اب! اگر مہینے نے کیا کیا بنایا ہے، آئیے بیٹھیں۔“

”بھوک تو نہیں ہے پھر بھی تمہارے ساتھ کھا لیتے ہیں۔ بیٹھو عارفہ!“ شاہ جہانگیر نے عارفہ بیگم کے لیے کرسی بھیجی پھر اپنے لیے بھیج کر بیٹھے تو بظاہر سرسری انداز میں کہنے لگے۔
”کھانے کے لیے وہ لوگ بھی بہت روک رہے تھے لیکن تمہاری ماں کو بہت جلدی تھی۔“

”کس بات کی؟“ اس نے سالن کا ڈونگا ان کے سامنے کرتے ہوئے یوں ہی پوچھ لیا۔

”تمہیں خوشخبری سنائے گی، ہم تمہاری شادی کی تاریخ طے کر آئے ہیں۔“ عارفہ بیگم نے ابھی بھی بہت جلدی بھائی تھی۔

اور علی جہانگیر کی بھی وہی حالت ہو گئی جو ان دونوں کی ہوئی تھی۔ سرا سیمہ باری باری دونوں کو دیکھ گیا۔

”تمہاری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے بیٹا! اگلے مہینے کی بارہ تاریخ طے ہوئی ہے۔“ شاہ جہانگیر پوری تفصیل کے ساتھ آئندہ کار و گرام بھی بتانے لگے اور وہ بظاہر سب سن رہا تھا لیکن اس کا ذہن کہیں اور بھٹک گیا تھا۔ وہ بڑبڑلائی لڑکی جو اس کی ہر بات کے جواب میں رونے لگتی تھی۔ یا پھر ایک بات کہتی۔
”میں کیا کروں۔ میں ماما کو دکھ نہیں دے سکتی۔“
ادھر شاہ جہانگیر سارا پروگرام بتانے کے بعد پتا نہیں کیا پوچھ رہے تھے اس نے سنا ہی نہیں تو جواب کیا دیا۔
تب عارفہ بیگم اونچی آواز میں اسے پکار کر بولی تھیں۔
”علی! تم سے پوچھ رہے ہیں۔“

”جی!“ وہ چونکنے کے ساتھ بیٹھا بھی گیا۔ ”جی بابا کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“
”میں کہہ رہا ہوں ادھر کا مسئلہ تو حل ہو گیا اب بابا جان سے کیا کہوں؟“ شاہ جہانگیر نے اس بار زور دے کر اپنی بات دہرائی تھی۔
”کیا مطلب؟“ وہ سمجھا نہیں۔

”مطلب یہ کہ میں بابا جان سے کہہ کر نہیں آتا تھا کہ یہاں میں تمہاری شادی کے معاملات طے کرنے آرہے ہوں اور اس بات پر وہ ناراض ہوں گے کہ ان کے علم میں لائے بغیر اور ان سے مشورہ کیے بغیر میں نے شادی طے کر دی۔“

”بابا! آپ ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔ کیا بابا جان یہ نہیں چاہتے تھے کہ ڈاکٹر آسیہ بغیر کسی شرط کے صحت کو رخصتی پر آمادہ ہو جائیں اور اسے وہ اپنی کامیابی سمجھ کر خوش ہوں گے تاکہ ناراض۔“
اس نے زنج ہو کر عارفہ بیگم نے اس کی تائید کی۔

”ٹھیک تو کہہ رہا ہے۔“ شاہ جہانگیر نے یوں سر جھکا جیسے ان دونوں سے بات کرنا فضول ہے۔ پھر علی کا نشانہ کر کے اٹھ گئے تھے۔



جس روز شاہ سکندر حوٹلی چھوڑ کر گئے تھے بابا جان اپنے سب کام بھول گئے تھے۔ ملنے ملانے کا سلسلہ ہم ترک کر رکھا تھا سارا وقت اپنے کمرے میں بند۔ بس یہی سوچتے تھے کہ سکندر نے ڈاکٹر انی اور اس کی بیٹیوں کو ان ترنچ دے کر اچھا نہیں کیا۔ اس کے بعد ان کا ذہن مسلسل ان کے خلاف سوچتا رہتا تھا۔ شاہ سکندر سے تو انہوں نے کہہ دیا تھا کہ وہ ہرجیت کا کھیل نہیں کھیل رہے تھے اور لاکھ وہ خود کو بھی یہی کہہ کر فریب دیتے لیکن ان کی کیفیت اس جواری کی سی تھی جو ہارنے کے بعد انتقام پر اتر آتا ہے اور ان کے اندر انتقام کی آگ تو شروع ہو چکی تھی اب مزید شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ لیکن وہ کتنی پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔
اس وقت بھی جب شاہ جہانگیر نے ان کے کمرے میں داخل ہو کر سلام کیا تو وہ سر کے اشارے سے جواب دے کر بہت بلکے بھٹکے انداز میں پوچھنے لگے۔
”کہاں چلے گئے تھے تم؟“

”کراچی گیا تھا بابا جان!“ شاہ جہانگیر ان کے موڈ کا اندازہ کرتے ہوئے بولے۔

”علی کے پاس گیا ہے علی، آیا نہیں بہت دنوں سے؟“

”ملازم آدمی ہے بابا جان! چھٹی مل جاتی ہے تو آ جاتا ہے۔“

”ہوں۔“ وہ ہوں کے انداز میں لمبی سانس باہر نکال کر خاموش ہو گئے۔

شاہ جہانگیر کو کہ خود کو بہت تیار کر کے آئے تھے، پھر بھی انہیں اپنی بات کہنے میں بہت دقت ہو رہی تھی۔ اص میں انہیں اندازہ نہیں تھا کہ بابا جان کا رد عمل کیا ہو گا اور یہی دیکھنے کے لیے وہ بہت سوچ کر بولے۔

وہ بابا جان میں علی کی سرال گیا تھا۔

علی کی سرال؟ بابا جان نے یوں دیکھا جیسے ہم سے پوچھتے بغیر۔

جی وہ علی کی شادی طے کرنے۔ شاہ جہانگیر نظریں چرا کر بولے جیسے کسی جرم کا اعتراف کر رہے ہوں۔

ہو گئی طے؟ بابا جان نے طنز سے پوچھا۔

جی اگلے مہینے کی بارہ تاریخ۔ شاہ جہانگیر اسی قدر کہہ سکے۔

ہوں۔ بابا جان کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھنے لگے۔ ”کیا شرائط رکھی ہیں اس ڈاکٹر انی نے؟“

شرائط! نہیں بابا جان! انہوں نے کوئی شرط نہیں رکھی۔“

اب جواب سے بابا جان کو اپنی اہمیت کم ہونے کے احساس سے شدید دھچکا لگا تھا۔ کتنی دیر انہیں خود پر قابو میں لگی پھر بھی طنز سے بولے تھے۔

اس کا مطلب ہے بیٹی بہت بھاری ہو گئی ہے اس پر۔“

ناہ جہانگیر مصلحتاً ”خاموش رہے۔“

خیر مبارک ہو تمہیں۔ اپنی بی بی جان کو بتایا؟“ بابا جان اب انہیں ٹالنا چاہتے تھے۔

جی نہیں میں سیدھا آپ کے پاس آ رہا ہوں۔“

تو اب جا کر بتاؤ انہیں تاکہ وہ تیری کر سکیں۔“

آپ! آپ چلیں گے بابا جان؟“ شاہ جہانگیر نے ایک دم خوش ہو کر پوچھا تو وہ سمجھ کر بھی انجان بن گئے۔

کہاں؟“

کراچی میرا مطلب ہے شادی میں شریک ہوں گے نا؟“

ہم کیا چاہتے ہو؟“ بابا جان بڑی کھوجتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھنے لگے تھے۔

میں تو یہی چاہوں گا کہ علی کے سر پر سہرا آپ سجائیں۔“ شاہ جہانگیر ہر طرح سے ان کا مان ان کی بڑائی رکھنا چاہتا تھا۔

”اُہ!“ بابا جان نے طویل قہقہہ لگایا پھر کہنے لگے۔

”ہم اپنی اولاد کی خواہش رد نہیں کرتے جہانگیر! یہ تم جانتے ہی ہو۔ سکندر نے شہر میں شادی کرنی چاہی تھی تو ہم خود تمہیں بھیج کر اس کی شادی کرادی تھی۔ علی نے جو چاہا اس کے لیے ہمیں کیا کچھ نہیں کرنا پڑا۔ ہم اس تک چین سے نہیں رہے جب تک اس لڑکی کو علی کی منگوتہ نہیں بنادیا اور اب تم چاہتے ہو کہ علی کے سہرا راہم سجائیں تو تمہاری یہ خواہش ہم علی کی دوسری شادی میں پوری کر دیں گے۔“

”جی۔“ شاہ جہانگیر حقیقتاً ”چکرا گئے تھے۔ دیواریں گھومتی ہوئی لگ رہی تھیں اور ساعتوں میں بابا جان کی زحمت کی پکھلا ہوا سیہ کس قدر سفائی سے بول رہے تھے۔

اپنی اولاد کی خواہش ہم ضرور پوری کرتے ہیں جہانگیر! اس کے لیے ہمیں خواہ بستیوں کی بستیاں اجاڑنی پڑیں، بیوی نہیں کرتے چھوٹے سے گھر کی کیا اہمیت ہے۔ بس تھوڑا سا انتظار کرو۔ محبت کا نشہ اتر جائے پھر علی بھی طرح ہمارے پاس آئے گا جیسے سکندر آیا تھا۔“

”میں، نہیں بابا جان نہیں۔“ شاہ جہانگیر نفی میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”آپ گھر اجاڑ سکتے ہیں۔ بستیاں اجاڑ سکتے ہیں لیکن دل کی بستیاں اجاڑنے پر آپ قادر نہیں ہیں۔ سکندر کو دیکھ لیں اس کے دل میں بیوی عورت بہتی ہے۔“

”اُہ!“ بابا جان پھر قہقہہ لگا کر بولے تھے۔ ”اور علی کے دل میں اس کی بیٹی۔“

”ہاں اور اب آپ وہ کہانی دوبارہ نہیں دہرائیں گے۔ اس سے نقصان ہمارا ہی ہو گا بابا جان! آپ خدا کے لیے ہنچوں پر رحم کریں ہم نے ہمارے اولاد نے کوئی ایسے جرم نہیں کیے جن کی پاداش میں آپ ہم سے زندہ رہنے

کا حق بھی چھین رہے ہیں۔“ شاہ جہانگیر ان کے عزائم سوچ کر پریشان ہو گئے تھے۔
 ”ہم چھین رہے ہیں۔ ہم اپنا تم لوگوں کو ان شر والیوں نے باطل کر دیا ہے جو ایک کے بعد ایک ہمارے مقابلہ کھڑا ہو رہے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں آخر ایسی کیا بات ہے ان ماں بیٹیوں میں جن کے لیے پہلے سکندر ہمیں چھوڑ گیا تم ہمیں نفع نقصان سمجھا رہے ہو۔“

بابا جان غصے سے بول رہے تھے، لیکن آخر میں آپ ہی آپ ان کے لہجے میں بے بسی سمٹ آئی تھی۔
 ”آپ نہیں سمجھ سکتے بابا جان! کیونکہ آپ کے نزدیک جذبات کی کبھی اہمیت نہیں رہی۔ محبت پر آپ کا نہیں تھا۔ ورنہ آسہ کو طلاق دلوانے سے پہلے ایک بار تو ضرور سوچتے اور اس وقت ہمیں تو اب سوچ لینا کہ عورت کے لیے کوئی کمی نہیں تھی، پھر بھی اس نے خود پر سارے دروازے بند کر دیے کیوں اس لیے کہ جو ایک بار دل سے جس کو اپنا مان لے پھر ہمیشہ کے لیے اسی کی ہو جاتی ہے۔ خواہ اس کا محبوب اسے مٹی میں دے، ٹھوکر مار کر کہیں چلا جائے یا بیوی کی چادر اوڑھا کر اس کے دل سے نہیں نکلتا اور ایسی عورت کے چھوڑنے والے تخت و تاج چھوڑ دیتے ہیں۔ سکندر تو پھر ڈنڈی مار گیا ہے۔ اپنی زندگی بڑے آرام سے گزارا بھی وہ اس کی خاطر یہاں سب چھوڑ کر نہیں گیا۔ اپنی بیٹیوں کے لیے خنہیں آپ ان کا اصل مقام در تیار نہیں اور چاہتے ہیں کہ باپ بھی ان کے بارے میں نہ سوچے، وہ اپنی بیٹی کے لیے گیا ہے بابا جان اور میرے بیٹے کی محبت سے مجبور ہوں۔“

شاہ جہانگیر بولنے پر آئے تو بولنے چلے گئے تھے۔
 ”اب ہمیں اپنی مجبوریوں کی داستان مت سناؤ جہانگیر! جاؤ جو تمہارا دل چاہے کرو۔“
 بابا جان بہت دیر سے ضبط کر رہے تھے بلا تخریج پڑے اور انہیں کمرے سے نکل جانے کا اشارہ بھی کیا جہانگیر نے یوں ہونٹ پیچھے جیسے مزید پتھر سے سر نکلانے کا کوئی فائدہ نہیں پھر کمرے سے نکل گئے تھے۔
 ”مجبور ہو رہا ہوں، تم تو کبھی مجبور نہیں ہوئے یہ ہماری اولاد بتائیں۔“
 بابا جان غصے سے سر جھٹک کر اپنے آپ بول رہے تھے کہ شاہ تیمور کے آنے پر ہونٹ بھیجنے کے لیے ان کی آنکھوں سے ابھی بھی غصہ جھلک رہا تھا۔ جس سے شاہ تیمور خائف سا ہو کر دروازے کبابا رک گیا۔

”کیا بات ہے؟“ بابا جان نے پوچھا تب وہ آگے آتے ہوئے بولا۔
 ”میں ایک ضروری بات کہنے آیا ہوں بابا جان!“
 ”ضروری بات۔“ بابا جان کی پیشانی سکڑ گئی۔
 شاہ تیمور کو اگر معلوم ہو تاکہ اس کے آنے سے پہلے یہاں شاہ جہانگیر اور بابا جان کے درمیان کیا بات تھی تو وہ ہرگز اس وقت نہ آتا لیکن اسے کیونکہ معلوم نہیں تھا اس لیے سہولت سے کہہ گیا۔
 ”جی میں مدیحہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور یہ شادی آپ ہی کر سکتے ہیں۔“
 ”مدیحہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“ بابا جان پر سوچ انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کر اوپر سے اوھر ٹپٹلے گئے دم رک کر بولے تھے۔

”کیوں خاندان میں اور لڑکیاں بھی تو ہیں مدیحہ سے زیادہ خوب صورت پڑھی لکھی اور جائیداد والی! نظر نہیں آتیں۔“
 شاہ تیمور خاموش رہا لیکن اس کے ہر انداز سے بغاوت جھلک رہی تھی۔ بابا جان کچھ دیر تک اسے دیکھ کر رازداری سے پوچھنے لگے۔
 ”کیوں کر نا چاہتے ہو مدیحہ سے شادی؟“
 ”اس نے میری توہین کی ہے بابا جان! میرا مذاق اڑایا ہے۔ مجھے دھوکا دیا ہے اور میں اسے بتاؤں گا۔“

وہ ہے۔“ شاہ تیمور کا سگلتا ہوا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس کے اندر کیسی آگ بج رہی ہے۔
 ”ہوں!“ بابا جان کے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی تھی۔ پھر بیٹھے ہوئے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا ورنہ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگے۔

”یہ سبق تو اسے ضرور ملنا چاہیے۔ وہ اتنی سی لڑکی، ہم سب کو دھوکا دے گئی۔ خیر تم فکر نہیں کرو۔ ہم تمہارے آپ سے کہتے ہیں کہ وہ پہلی فرصت میں سکندر کے پاس جائے اور مدیحہ سے تمہاری شادی کی بات کرے۔“
 ”سکندر رچا نہیں مانیں گے۔“ شاہ تیمور نے باپ سے کہا۔
 ”کیوں کیوں نہیں مانے گا۔ علی کی شادی ہو رہی ہے کہ نہیں۔ تمہاری بھی ہو جائے گی اور پھر تمہارے باپ کا وہ بہت لحاظ کرتا ہے۔ اس کی بات خود نالے گا، نہ ڈاکٹری کو نالے دے گا تبھی تم فکر مت کرو۔“

”آج اتوار تو نہیں ہے پھر نیل بھائی گھر پر۔“ وہ سوچتے ہوئے نیل کے کمرے میں آئی اور انہیں بیڈ پر دیکھ کر بت کے مطابق پریشان ہو گئی۔
 ”کیا ہوا نیل بھائی! آپ کی طبیعت خراب ہے۔“
 ”نہیں، بس ذرا سر میں درد تھا، وہ بھی اب نہیں ہے۔“ نیل نے بوا کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے اطمینان بولا۔

”لیکن آپ کی تو آنکھیں بھی لال ہو رہی ہیں۔“ وہ کہاں مطمئن۔ ہونے والی تھی۔
 ”سو کر اٹھا ہوں اس لیے ہو رہی ہوں گی۔ اب تم زبردستی مجھے کوئی بیماری لگا دو۔“ نیل نے چڑ کر کہا۔
 ”بیاری لگے آپ کے دشمنوں کو۔ آپ کو تو میری عمر لگ جائے۔“
 ”صبا!“ نیل نے فوراً ٹوکا۔ ”تفضل بائیں مت کیا کرو۔“
 ”ڈانٹ کیوں رہے ہیں۔ ایک تو میں پہلے ہی بور ہو رہی ہوں۔“ وہ منہ پھلا کر بولی۔

”کیوں مدحو کہاں ہے؟“
 ”بازار گئی ہے۔ میں بھی چلی جاتی تو اچھا تھا۔“
 ”ہاں ذرا سکون ہو جاتا۔“ نیل نے اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر مزید چھیڑا تو وہ جھنجھڑ کر بولی۔
 ”فکر نہیں کریں میں آج جا رہی ہوں پھر آپ سکون سے رہے گا۔“
 ”کہاں؟ تم کہاں جا رہی ہو؟“ نیل نے چائے کا گھونٹ لے کر پوچھا۔
 ”پیلا کے پاس! ابھی ان کی گاڑی آئے گی اور اب بس میں وہیں رہوں گی۔ یہاں نہیں آؤں گی آپ کو سکون ہے نا اور ہاں مدحو بھی میرے ساتھ جائے گی۔“

وہ ناراض سی ہو کر لوتی چلی گئی اور جب خاموش ہوئی تب بھی نیل کچھ نہیں بولے جانے کیا سوچنے لگے تھے۔
 ”نیل بھائی!“ اس نے پہلے پکارا پھر ان کے پاس آئی بیٹھی اور آہستہ سے ان کا ہاتھ ہلا کر پوچھنے لگی۔ ”آپ کیا سوچنے لگے؟“
 ”ہاں!“ نیل نے چونک کر اسے دیکھا پھر افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ”کچھ نہیں۔“
 ”اچھا بتائیے میں کیا کہہ رہی تھی؟“
 ”تم اپنے جانے کی بات کر رہی تھیں۔ خیر تمہارا جانا تو یوں بھی طے ہو گیا ہے لیکن مدحو کو تو ابھی یہیں رہنا ہے جب تک اس کی کہیں بات طے نہیں ہوتی۔“
 نیل نے بڑے ہلکے ہلکے انداز میں کہا تو وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی پھر بہت سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔
 ”آپ چاہتے ہیں مدحو کی کہیں بات طے ہو؟“
 ”ہاں کیوں نہیں۔ ساری زندگی وہ یونی تو نہیں بیٹھی رہے گی اس گھر میں۔“ نیل نے نظریں چرا کر بولے تھے۔

”جانا اپنے اختیار میں ہے آنا نہیں۔ خدا حافظ۔“ وہ بیگ اٹھا کر جس تیزی سے کمرے سے نکلی اس سے مدد چاہنے لگی۔ اس نے ہٹا کر گئی اور اسے منانا کون سا مشکل تھا جو وہ اس کے پیچھے بھاگتی بس گہری سانس کھینچ کر نکلیا بات ہے کچھ چاہیے؟“

”ہاں تمہارے در سے میں ہمیشہ کچھ لینے ہی تو آتا ہوں۔“ عمر نے کہا تو وہ آگے بڑھی۔

”میں اس وقت تم سے کوئی بحث نہیں کروں گی۔“

”بحث کون کر رہا ہے۔ یہ بتاؤ صبا ناراض ہو کر کیوں گئی ہے؟“

”میں اس کے ساتھ نہیں گئی اس لیے اب یہ مت پوچھنا کہ میں کیوں نہیں گئی۔“

”تو یہ کہہ مجھے کیا پالے گئے نے کاٹا ہے جو میں تم سے کچھ پوچھوں گا۔“ عمر کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا وہیں سے پلٹا تو اس نے ایک دم پکار لیا۔

”سنو عمر!“

عمر رک گیا لیکن اس کی طرف رخ نہیں موڑا تھا۔

”وہ ماما کیلی ہو جاتیں نا میں اس لیے نہیں گئی۔“ اس نے کہا تو عمر جھٹکے سے اس کی طرف پلٹا اور حیرت سے اس میں بھاڑ کر بولا۔

”یہ سنیں دوسروں کا احساس کب سے ہونے لگا۔ تمہاری بلا سے کوئی اکیلا ہوا۔“ عمر اس کے گھورنے پر ادھوری پھوڑ کر ہاتھ ہلاتا ہوا کمرے سے نکل گیا تھا۔

ایک میری ہی ہر بات پر گرفت کیوں ہوتی ہے۔“ وہ سوچتی ہوئی دروازے تک آئی۔ پھر اسے پسند کر کے اس ساتھ کمر ٹیک کر کھڑی ہو گئی اور یونہی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اچانک اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں شاید کوئی ماس ملا تھا۔ کچھ کھونے کا کچھ پانے کا لیکن وہ سمجھ نہیں پاری تھی۔

”یہ صبا کیا کہہ رہی تھی نیل بھائی ہے؟“

اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے سوچا اور ست روی سے آگریڈر لٹ گئی۔ اس کے اندر دل کسی کشتی میں آگیا تھا اور ذہن کے پردوں پر کہیں دھندلے عکس ابھر رہے تھے، کہیں بہت واضح اور ہر جگہ ایک ست نمایاں تھا جسے اس نے ہمیشہ نظر انداز کیا تھا اور آپ ہی آپ اس سے دشمنی بھی باندھ لی تھی کہ وہ کیوں اہاں کی محبت میں حصہ دار بن کر آگیا تھا۔

اب وہ پھوٹی تھی تب بھی اس کی نیل پر زور اسی توجہ پر چھ چلا کر احتجاج کرتی تھی اور اس پر بس نہیں تھا اس حد نیل سے بھی لڑتی تھی، لیکن انہوں نے کبھی اس کی کسی بات کا برا نہیں مانا تھا۔ اناس کی طرف واری تھے اور اب تک ایسا ہی تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی اسی عادت کو صبا نے محبت سمجھ لیا تھا یا واقعی وہ اس سے محبت تھے۔ کتنی دیر تک وہ اس بات میں الجھتی رہی لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی اور نہ ہی مجھے کیا کہہ کر اس ذہن سے جھٹک سکی۔ شاید یہ نیل کے جذبے تھے جو اپنا آپ منوارے تھے۔

صبا اہاں صبا سے پوچھتی ہوں۔“ اسے ایک دم صبا کے خیال آیا تو فوراً اٹھ کر کھڑی ہوئی اور اسے فون نے کے ارادے سے لابی میں آئی تو اسی وقت فون کی بیل بجنے لگی تھی۔

”ہیلو صبا!“ وہ کیونکہ صبا نے اسے ہی بات کرنے کا سوچ رہی تھی اس لیے ریسور اٹھاتے ہی اسے پکارا تھا۔

”میں صبا نہیں اصر ہوں۔“ دوسری طرف سے اصر کی آواز سننے ہی وہ منبھل گئی۔

”جی کیسے ہیں آپ؟“

”نہم کیسی ہو۔“ اصر نے جواب نہیں دیا تو وہ بھی گول کر گئی۔

”آپ چاہیں تو وہ اس گھر میں رہ سکتی ہے اور یونہی نہیں۔“ اس نے زور سے کرکنا تو نیل اس کا مطلب کر خاموش ہو گئے۔

”مسئلہ یہ ہے کہ آپ چاہتے ہی نہیں ہیں۔“ وہ ان کے خاموش رہنے پر اپنے آپ بولنے لگی تھی۔ ”پتا نہ کیا سوچ کر کھا ہے آپ نے یا آپ کو کسی خاص وقت کا انتظار ہے، یہی بات ہے نا۔“

”میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔ تمہاری فضول باتیں سننے سے بستر ہے میں۔“ وہ بولتے ہوئے بیڈر دوسری طرف اتر گئے۔

”فضول باتیں! آپ مدحو سے محبت کرتے ہیں یہ فضول بات ہے۔“

”بس خاموش ہو جاؤ صبا!“ نہیں جانے کیوں غصہ آگیا تھا۔

”آپ واقعی بزدل ہیں نیل بھائی اور آپ کو اپنی محبت پر بھروسہ بھی نہیں ہے ورنہ مدحو کوئی آسمانی مخلوق نہ ہے جس کے سامنے اعتراف نہ کیا جاسکے۔ میں بتاؤں گی اسے کہ آپ۔“

”ہاں بتا دینا اور اس کے بعد بھول جانا کہ یہاں کوئی نیل بھی تھا۔“ انہوں نے اسی غصے سے کہا تو وہ اچھل کھڑی ہو گئی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

نیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وارڈروب سے کپڑے نکال کر واش روم میں چلے گئے۔ تو وہ پہلے جھینلائی پڑی دل ہی دل میں افسوس کرتی ہوئی وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں آئی اور آگے مدیہ کو کھڑے دیکھ کر تعجب بولی۔

”ہائیں۔ تم لوگ اتنی جلدی آگئے۔“

مدیہ نے کوئی جواب نہیں دیا نا ہی اس کی طرف متوجہ ہوئی تو وہ چند قدم آگے آکر اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھ گئی۔

”کیا بات ہے مدحو؟“

”وہ میں یہ بیگ دیکھ رہی تھی۔ کہیں جارہی ہو کیا؟“ مدیہ نے ابھی بھی اس کی طرف نہیں دیکھا اور بیگ کے اندر ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگی تھی۔

”صرف میں نہیں ہم دونوں جا رہے ہیں پاپا کے پاس۔ وہ چاہتے ہیں میں کچھ دن ان کے ساتھ رہوں۔“

”ہاں پھر تو تمہاری شادی ہو جائے گی۔“ مدیہ نے یہ بات بھی کچھ کھوئے ہوئے انداز میں کہی تھی۔

”اچھا دیکھو میں نے تمہارے یہ سوٹ رکھے ہیں۔“ اس نے بیگ اپنی طرف کھینچ کر مدیہ کے سوٹ نکال کر اس کے سامنے کیے تو وہ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولی۔

”میرے کیوں؟ میں تو نہیں جا رہی۔“

”کیوں؟“

”کیوں کا کیا مطلب۔ یہاں اتنے کام ہیں وہ کون کرے گا پھر ماما بھی اکیلی ہو جائیں گی۔ نہیں میں نہیں جاؤں گی۔“ مدیہ قدرے ترشی سے کہتی ہوئی الماری کی طرف بڑھ گئی۔

”ٹھیک ہے پھر میں بھی نہیں جاتی۔“

”جو کومت پاپا نے بلایا ہے تمہیں ضرور جانا ہے۔ چلو اور جو کچھ رکھنا ہے رکھو بیگ میں ورنہ میں ابھی ماما کو فون کرتی ہوں پھر ان کی ڈائنٹ سن کر روٹی ہوئی جاؤ گی۔“ مدیہ پتا نہیں کیوں ناراض ہو رہی تھی۔

”صبا! منشر صاحب کی گاڑی آگئی ہے۔“

”آ رہی ہوں بلکہ جا رہی ہوں۔“ اس نے بیگ بند کر کے مدیہ کو دیکھا تو وہ بے اختیار بولی تھی۔

”زیادہ دن مت رکنا۔“

ایا توں کوڈہن سے جھٹک دے، لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ جتنا اپنا دھیان ادھر ادھر کرتی کوئی نہ کوئی بات جانی۔

نیل بھائی کیا چاہتے ہیں۔ کاش تم جان سکو۔ ”ایک بار صباحت نے کہا تھا۔
وہ بہت گہرے ہیں کبھی ظاہر نہیں کریں گے۔ پتا نہیں احمر کیسے ظاہر ہو گئے تھے جو وہ کہہ رہا تھا۔
نادان لڑکی! اصل بات سوچو دنیا میں بے غرض و بے لوٹ محبت نایاب ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ۔“
بے غرض و بے لوٹ محبت۔ ناممکن۔ وہ جھٹلائے کی سعی کرنے لگی۔ کائنات کا سارا نظام دو اور لوکے اصول پر
ہا ہے۔ سودے بازی ہر جگہ سودے بازی۔
نڈیا ادھار۔

سود سوچتے ہیں۔
ندگی کے کاروبار میں گھائلے کا سودا کوئی نہیں کرتا۔
بت بھی کاروبار ہے۔ سرا سرد کا نداری۔
س کے عوض دل۔

یوں ہی اوٹ پٹانگ سوچے جاری تھی کہ آسیہ کی آواز پر چونک گئی۔
سے نیل کو پکار رہی تھی۔ وہ سامنے کی تو کچھ حیرت سے پوچھنے لگی۔
تم گئیں نہیں بیٹا۔ ”پھر خود ہی کہنے لگی۔“ اچھا کیا یہاں آئے کام ہیں۔“
جی ماما! میں اسی لیے نہیں گئی اور میں یہ بھی دیکھنا چاہتی ہوں کہ صبا چلی جائے گی تو کیسا لگے گا۔“ اس نے
، صورتی سے بات بنائی۔ تب ہی نیل کمرے سے نکل کر آئے تو آسیہ جو اس سے کچھ کہنے جاری تھی، نیل
رف متوجہ ہو کر بولی۔
چلو بیٹا! بوائے کھانا لگایا ہے۔ آؤ دو۔“
جی ماما چلیں۔“ اس نے آسیہ کے بعد نیل کو اندر جانے دیا پھر ان کے پیچھے ڈانٹنگ میں داخل ہوئی تھی۔



صباحت کے ساتھ مہر النساء اور الماس کا رویہ خاصا نرم تھا اور ناگواری لیے ہوئے تھا۔ بس شاہ سکندر کے
نے الماس نے اس سے رمی جملے بولے تھے جبکہ مہر النساء نے اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی اور وہ مدیہ
تھی جو جو اب اپنے ہر عمل سے ان پر یہ جتا کی کہ اسے بھی ان کی پروا نہیں ہے۔ اسے پروا بھی جب ہی تو اسے
رف بری طرح محسوس ہو رہا تھا بلکہ بہت دکھ بھی ہو رہا تھا اور رات جب تک اسے نیند نہیں آئی، وہ کڑھتی
رہی۔

صبح معمول سے بہت پہلے اس کی آنکھ کھل گئی۔ شاید نئی جگہ کی وجہ سے بہر حال اس نے دوبارہ سونے کی
ش نہیں کی اور اٹھ کر نماز پڑھی۔ اس کے بعد کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی۔ کراچی کے موسم کا کچھ پتا نہیں
دسمبر شروع ہو چکا، لیکن سردی بس برائے نام ہی تھی۔ صبح کے وقت کچھ ٹھنڈک محسوس ہوتی یا پھر شام

س وقت فضا میں قدرے خنکی تھی جو کہ بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اترتے اجالے میں
لے منظر واضح ہونے لگے تھے۔ اس نے کھڑکی میں آگے کی طرف جھک کر بائیں سمت دیکھا تو لان کا کچھ حصہ
آیا۔ اتنے سے حصے میں ہی خوش رنگ پھولوں کی بہتات تھی اور وہ پھولوں کی دیوانی وہیں سے کود کر لان میں آئی
جتنی اس کی روح تک سرشار ہو گئی۔ ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس نے تلتے چکر لگا ڈالے اور ابھی
کلیہ شغل جاری تھا کہ شاہ سکندر آگئے۔

”صبا اور نیل بھائی دونوں نہیں ہیں اس وقت اور ماما بھی کلینک گئی ہوئی ہیں۔“
”اور مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ احمر نے فوراً کہا۔

”جی! اس نے سننے کا اشارہ دیا تو وہ جلدی سے بولا۔
”نیچھ! ابھی ٹوبہ کے خط سے صبا کی شادی کا پتا چلا ہے میں نے سوچا ماما کب ادے دوں۔“
”شادی اگلے مہینے کی بارہ تاریخ کو ہے۔ بہر حال پیشگی مبارکباد کا پیشگی شکریہ اور کوئی بات؟“
”ہاں ایک بات اور ہے تم برا تو نہیں مانو گی۔“ احمر نے رک رک کر پوچھا تھا۔
”میرے برائے نہ مانے کو چھوڑیں۔ آپ اپنی بات کہیں۔“ وہ خاصی بے مروتی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔
”میں نہیں اس شخص کا بتانا چاہتا ہوں جو تمہارے ساتھ سب سے زیادہ خلص ہے بہت محبت کرتا ہے وہ تم
سے۔“

”کون؟“ اس کی دھڑکنیں رکنے لگی تھیں۔
”نیل بھائی! احمر بتا کر خاموش ہو گیا تھا۔
اسے لگا وہ اس سچائی کو کبھی نہیں جھٹلا سکے گی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ایک خیال آیا تھا۔ فوراً احمر کو پکار کر
پوچھنے لگی۔

”احمر! آپ کو کس نے بتایا۔“
”تمہارا کیا خیال ہے نیل بھائی نے بتایا ہو گا۔ نہیں وہ بہت گہرے ہیں، کبھی ظاہر نہیں کریں گے۔“ احمر نے
کہا تو وہ اندر ہی اندر الجھ کر بولی۔
”پھر آپ کو کیسے پتا چلا؟“
”اس بات کو چھوڑو نادان لڑکی اور اصل بات سوچو۔ دنیا میں بے غرض و بے لوٹ محبت نایاب ہے، تم خوش
قسمت ہو کہ۔“
شاید لائن کٹ گئی تھی۔ اس نے چونک کر دو تین بار کریڈل پر ہاتھ مارا پھر ریسیور رکھ کر پلٹی تو سامنے سے نیل کو
آتے دیکھ کر وہ ان ہی کے انتظار میں وہیں رک گئی تھی۔



اور جب نیل قریب آئے تو وہ کچھ سٹپا کر نظروں کا زاویہ بدل گئی۔
”کیا بات ہے؟“ نیل نے رک کر پوچھا تو وہ آہستہ سے بولی۔
”کچھ نہیں۔“
”پھر یہاں کیوں کھڑی ہو۔ میرا مطلب ہے کسی کے فون کا انتظار ہے۔“ نیل کا انداز ہمیشہ کی طرح سادہ تھا۔
کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اپنے اندر اس کے لیے سب سے الگ جذبے چھپائے کھڑے ہیں۔
”وہ میں صبا کو فون کر رہی تھی لیکن نمبر ہی نہیں مل رہا۔“ اس نے بات بنائی۔
”صبا کو! اچھا ہاں، شام میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنے پیارے ہاں جاری ہے۔ تم نہیں گئیں؟“ نیل نے ایک
دم باؤ آنے پر پوچھا۔

”نہیں۔“
”کیوں؟“
”بس بدل نہیں چاہا۔“
”دل نہیں چاہا۔“ نیل ذرا سا مسکرائے پھر آگے بڑھتے ہوئے بولے ”ٹھیک ہے، تم نمبر ڈائی کرو۔“
اس نے خاموشی سے انہیں کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا پھر ٹیرس پر نکل آئی اور بہت چاباکہ صباحت اور پھر

”سلام علیکم بیبا۔“ وہ انہیں دیکھتے ہی تیز قدموں سے ان کے قریب چلی آئی تھی۔
 ”وعلیکم سلام آج کی صبح ہمیشہ سے زیادہ خوب صورت لگ رہی ہے۔“ شاہ سکندر خوش دلی سے بولے۔
 ”مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ اس نے کہا تو شاہ سکندر نے ہلکا سا تھمہ لگایا پھر اس کے ساتھ لان پیڑ پر بیٹھے اور کچھ دیر ایسی ہی ہلکی ہلکی گفتگو کرنے کے بعد کہنے لگے۔
 ”بیبا! مجھے افسوس ہے کہ الماس اور اس کی ممی نے آپ کے ساتھ کچھ اچھا بایا ہیو نہیں کیا۔ آپ نے ضرور مانتا دیکھا ہوگا۔“

”نہیں بیبا۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”مجھے دکھ ضرور ہوا لیکن ان سے کوئی شکایت نہیں ہے اور میں کو خوش کروا گیا کہ انہیں بھی مجھ سے شکایت نہ ہو۔“
 ”گڈ بوا آر آؤلی ڈائر۔“ شاہ سکندر کو اس کے جواب سے خوشی ہوئی۔
 ”تھینک یو۔“

”اور بیبا! آپ کے ساتھ مدیجہ نہیں آئی۔“
 ”پتا نہیں بیبا! اس کے موڈ کا کچھ پتا نہیں چلتا۔“
 ”ہوں۔“ مودی لڑکی ہے۔“ انہوں نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔ ”غالباً“ ان کا ذہن کہیں اور بھٹک گیا تھا۔
 وہ کچھ دیر تک انہیں دیکھتی رہی۔ پھر پکار کر پوچھنے لگی۔
 ”بیبا! آپ کے لیے چائے لاؤں۔“
 ”چائے۔“ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔
 ”ابھی تک چائے نہیں آئی۔“

”میں لاتی ہوں۔“ وہ فوراً اٹھ کر اندر آئی تو آگے خانہ سال چائے لیے بکھن سے نکل رہا تھا۔ اس نے ٹرے میز ایک کپ دیکھا تو وہیں سے اپنے کمرے میں آگئی۔ کیونکہ اس کا چائے پینے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔
 پھر ناشتے کے بعد شاہ سکندر چلے گئے تو وہ کتنی دیر اجنبیوں کی طرح لاؤنج میں بیٹھی رہ گئی۔ حالانکہ دو تین بار الماس وہاں سے گزری تھی لیکن مروتا بھی اس سے بات نہیں کی اور مہر النساء تو اپنے کمرے ہی سے نہیں نکلی تھی۔ اس لیے الماس سے بڑی ہونے کے باوجود اس نے پہل کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی اور خود اس کے کمرے میں چلی آئی۔

الماس ایک کونے میں نیچے کارپٹ پر بیٹھی اپنے سامنے اخبار پھیلائے اس پر جھکی ہوئی تھی۔ جبکہ اس کے اطراف کچھ ساوہ پیرز کھڑے ہوئے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے فوراً ”سراونجا کیا تھا اور اسے دیکھ کر اس تیزی سے ادھر ادھر بکھرے پیرز سمیٹنے میں لگ گئی۔ تو وہ اس کی اس حرکت کو قصداً ”نظر انداز کرتی ہوئی دوستانہ انداز میں بولی۔

”کیا ہو رہا ہے۔“ الماس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ یوں جیسے سنا ہی نہیں۔
 ”میں بہت بڑھ رہی ہوں۔ حالانکہ یہاں میرے شوق اور دلچسپی کے لیے بہت کچھ ہے لیکن پتا نہیں کیوں نہ میرا لپاکا لائبریری میں دل لگانا۔“
 وہ اپنے آپ بولتی ہوئی ایک دم خاموش ہو گئی تو الماس بلا ارادہ اسے دیکھنے لگی اور اس کا مقصد اسی طرح اسے متوجہ کرنا تھا۔

”تم کوئی کام کر رہی تھیں۔ میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی۔ تم آرام سے اپنا کام کرو۔“ وہ اس سے کچھ فاصلے پر نیچے بیٹھ گئی۔ پھر ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بولی۔
 ”تمہارے کمرے کی سینگ بہت خوب صورت ہے۔ اگر تمہارے خود کی ہے تو یقیناً“ تم آٹھ ٹنک مانتا ہو تمہارے سبھی کٹ کیا ہیں؟“

الماس خاموشی سے اسی دیکھے جا رہی تھی۔ وہ بالکل مدیجہ جیسی لگ رہی تھی، لیکن اس کا ہر انداز اس سے مختلف تھا نہ لمبے میں تنفر نہ آنکھوں میں خشونت اس کے برعکس اپنائیت کا احساس دیتی لگ رہی تھی۔
 ”فائن آرٹس۔“ اس نے جواب نہ پا کر خود ہی قیاس کر کے کہا تو اس بار الماس بے اختیار بولی تھی۔
 ”نہیں سائنس۔“

”اے تم سائنس کی اسٹوڈنٹ ہو۔ کون سی کلاس میں ہو۔“ اس نے حیرت کے اظہار کے ساتھ دلچسپی بھی ظاہر کی۔
 ”انٹر کا امتحان دیا ہے۔“
 ”دیری گڈ۔ آگے کیا ارادہ ہے؟“

”بیبا! کاروائی میڈیکل میں میرا لائڈیشن کرانے کا ہے۔“ الماس قدرے جھجک کر جواب دے رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس سے پہلے کبھی کسی نے اس کی ذات میں اس طرح دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی۔
 ”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ اس نے فوراً ”کہا پھر اس کی بات پر غور کر کے پوچھنے لگی، ”کیا تم نے بیبا کا ارادہ ٹوکیا تمہیں شوق نہیں ہے ڈاکٹر بننے کا۔“

”مجھے بھی ہے لیکن امی نہیں چاہتیں۔“ الماس نے کہا۔
 ”کیوں؟“ وہ کچھ کر خود ہی جزبزی ہو گئی کیونکہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی امی کیوں نہیں چاہتیں۔
 ”آپ نے کہاں تک پڑھا ہے؟“ الماس خوب صورتی سے بات بدل گئی۔
 ”میں مہر ڈائر کے پیروے چکی تھی اس کے بعد کالج چھوڑ دیا۔“
 ”کیوں؟“ الماس نے بھی اس کی طرح فوراً ”پوچھا لیکن پھر خود ہی سمجھ کر کہنے لگی۔
 ”اچھا ہاں، پھر آپ کی شادی ہو گئی تھی۔“
 ”شادی۔“ وہ ہنسی تو الماس قدرے جھینپ کر بولی۔
 ”شادی ہی تھی۔“

”اچھا چھوڑ دیا۔ بتاؤ۔“ وہ جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ مہر النساء کی آواز پر خاموش ہو گئی۔
 مہر النساء نے الماس کو پکارنے کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ لیکن جب اسے دیکھا تو اندر نہیں آئی اور وہیں دروازے ہی میں رک کر بولی تھی۔

”الماس! میں عمو کے ساتھ بازار جا رہی ہوں۔ تم بھی چلو۔“
 ”میں چلوں۔“ الماس نے چند لمحوں کے بعد روک کر سوچا پھر کہنے لگی۔ ”میں نہیں جا رہی۔ صابجی اکیلی ہو جائیں گی۔“
 مہر النساء کو اس جواب سے خاصی مایوسی ہوئی جبکہ وہ بے انتہا خوش لیکن بہت سنبھل کر بولی۔
 ”اے نہیں۔ میری وجہ سے تم اپنا جانا ملتوی نہیں کرو۔“

”نہیں۔ بس میں نہیں جا رہی۔“ الماس نے اس سے کہتے ہوئے مہر النساء کو دیکھا۔
 ”اچھا تھک ہے۔ تم لوگ کھانا کھا لیتا۔“
 پھر دو دن میں الماس اس کے ساتھ بہت گھل مل گئی تھی اور مہر النساء کو کہ خود اس سے بات نہیں کر رہی تھی، لیکن اس کی بات کا جواب دینے لگی تھی۔ اس کے انداز میں وہ تنفر اور ناگواری بھی نہیں رہی تھی اور اس کے لیے فی الحال یہی بہت تھا۔ یوں بھی ابھی وہ بہت زیادہ دنوں کے لیے نہیں آئی تھی۔ اس کا خیال تھا مزید دو دن تک وہ چلی جائے گی۔ اس وقت الماس کے ساتھ لان میں کھتے ہوئے وہ اس سے بھی یہی کہہ رہی تھی کہ کل یا سول وہ چلی جائے گی۔

”کیوں، میرا مطلب ہے“ اتنی جلدی کیوں جائیں گی۔ ابھی تو آپ کی شادی میں بہت دن ہیں۔“ الماس نے متحاج کرتے ہوئے کہا تو وہ رک کر بولی۔

”وہ تو ہیں لیکن مجھے مدحو کا خیال آ رہا ہے۔ جب میں آ رہی تھی تو وہ کچھ خفا سی لگ رہی تھی اور دیکھو اس نے فون بھی نہیں کیا۔“

”آپ فون کریں۔ میں امی کے پاس سے ہو کر آتی ہوں۔“ الماس اسے لابی میں جھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ وہ نمبر وائل کر کے انتظار کرنے لگی۔ ماما اور نینیل بھائی کا تو اسے پتا تھا کہ اس وقت دونوں گھر پر نہیں ہوں گے ورنہ جیہ نے تفتی دیر بعد رسوراٹھایا تھا۔

”کیا کر رہی تھیں؟“ اس نے چھوٹے ہی ٹوکا۔

”سرسرچ۔“ ادھر مدحیہ جانے کس موڈ میں تھی وہ سمجھ نہیں سکی۔

”کھا ہے؟“

”یہ میں تجھ سے نہیں بتاؤں گی۔ بلکہ میں اب کوئی بات تمہیں نہیں بتاؤں گی۔“ مدحیہ نے زور دے کر کہا۔

”کیوں مجھے کیوں نہیں بتاؤ گی۔“ اس نے حیران ہو کر ٹوکا۔

”اس لیے کہ تم ہر بات مجھ سے چھپاتی رہی ہو۔“

”کیا میں نے کیا بات چھپائی ہے؟“

”اپنے آپ سے پوچھو۔“

”میں بالکل نہیں جان پاؤں گی۔ تم بتا دو پلیز۔“ اس نے لجاجت سے کہا۔

”جو کومت یہ بتاؤ واپس کب آ رہی ہو۔“

”اگلے ہفتے۔“ وہ روٹھے لہجے میں بولی۔

”اگلے ہفتے کیوں؟ اگلے مہینے آنا۔“ مدحیہ پر اس کی لجاجت کا اثر ہوا تھا نہ روٹھنے کا ”فورا“ فون بند کر دیا۔



علی جہانگیر کو اس وقت صاحت کے نمبر وائل کرتے ہوئے ادھر سے کسی اور کے رسوراٹھانے کا خدشہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ اس کی آواز سننے کو ملے۔ لیکن دوسری طرف مدحیہ بھی جس کی آواز سننے سے وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔

”تمہیں کیا پھرے پر بٹھایا ہوا ہے۔“

”جناب! آپ کو کوئی اعتراض ہے۔“ وہ ہنسی کے درمیان بولی تھی۔

”اعتراض ہو بھی تو تم کون سا ماننے والی ہو۔ چلو بلاؤ اسے۔“ اس نے رعب سے حق جتایا تو ادھر سے کورا جواب آیا۔

”وہ نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب وہ یہاں نہیں ہے۔ پیپا کے ہاں گئی ہوئی ہے۔“ مدحیہ روانی سے بتا کر پوچھنے لگی ”اور بتائیں کس کو بلاؤں۔“

”کسی کو نہیں۔ بس سب کو سلام کہہ دنا۔“ وہ غلت میں فون بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور وہیں سے عارفہ بیگم کو پکار کر بولا تھا۔

”امی! میں پچا جان کی طرف جا رہا ہوں۔“

اور پھر آدھے گھنٹے کا فاصلہ اس نے بیس منٹ میں طے کر لیا تھا۔ طویل راہداری سے گزر کر جب وہ گول کمرے میں داخل ہوا تو سامنے ہی وہ الماس کے ساتھ بیٹھی نظر آئی، جس پر اسے حیرت ہوئی کیونکہ مدحیہ کو اس نے شاہ پور میں کسی کے ساتھ اس طرح باتیں کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

”سلام علیکم۔“ اس نے اپنی حیرت چھپا کر قدرے اونچی آواز میں سلام کیا تو جہاں وہ چوک کر بھا ارادہ کھڑی ہو گئی وہاں الماس نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

”رے علی بھائی آپ۔“

”ہاں مجھے ابھی پتا چلا تھا کہ جسے میں سارے شہر میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں وہ تمہارے پاس ہے۔“ وہ کن اکھیوں سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

”جی نہیں۔ ابھی آپ ان سے نہیں مل سکتے۔“ الماس فوراً ”صاحت کے سامنے کھڑی ہو گئی اور دونوں بازو! نہیں بائیں پھیلا دیے۔“

”پھر کب مل سکتا ہوں۔ ان سے پوچھ کر بتاؤ۔“ اس نے شرارت سے اسے دیکھنے کی سعی کرتے ہوئے کہا تو وہ ہلک کر کمرے میں چلی گئی۔

”مل گیا جواب، وہ ملنا ہی نہیں چاہتیں۔“ الماس نے کہا تو وہ مایوس سی شکل بنا کر بولا۔

”اب کیا کروں؟“

”صبر۔“ الماس ہنسی۔

”شٹ اپ! یہ بتاؤ پچا جان اور چچی جان کہاں ہیں؟“

”وہ کئی تقریب میں گئے ہیں۔“

”اور تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ جاؤ جائے کے ساتھ کچھ کھانے پینے کا انتظام کرو، میں اتنے دنوں بعد آیا ہوں۔“ وہ اسے سامنے سے بناتا ہوا اسی کمرے کی طرف چل پڑا۔ پیچھے الماس نے اسے روکنے کی کوشش میں یہاں تک کہا کہ دیکھیں پیپا آ رہے ہیں لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور کمرے میں داخل ہو کر رہی رکا تھا۔

وہ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اس میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی، گھبراہٹ میں بھی پردہ ادھر پھینچتی کبھی ادھر۔

”لاؤ میں تمہاری مدد کروں۔“ وہ اس کے قریب جا کر بولا اور پردے کے بجائے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچا تو وہ بمشکل اپنا توازن قائم رکھ کر بولی۔

”آپ کیوں آئے ہیں۔“

”یہ دیکھنے کے اپنے دل کی بستی میں تم نے میرے نام کے جو گل کھلائے تھے، ان میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔“ وہ پرشوق نظروں سے اس کے چہرے پر اترتے رنگ بکھ رہا تھا۔

”میرا ہاتھ جھوڑیں۔“ وہ بہت ترس ہو رہی تھی۔

علی جہانگیر نے ایک بار اس کے ہاتھ کو زور سے دبایا پھر ہونٹوں سے لگا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہنے لگا۔

”مجھے یقین کر لینے دو صبا کہ ہم ساری آزمائشوں سے گزر کر اس مقام پر آ گئے ہیں جہاں سے ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ سو، تمہارے دل میں اگر کوئی خدشہ باقی رہ گیا ہو تو اسے بھی نکال پھینکو۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ ہمارے راستے میں اب صرف پھول ہی پھول کھلیں گے کوئی کانٹا نہیں ہو گا۔ بہت کانٹے ہوں گے۔ جتنے پھول ان سے زیادہ کانٹے۔ لیکن میں تمہیں ان سے نہیں الجھنے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

وہ اس کے دلنشیں لہجے میں کھوکھرا سے دیکھے جا رہی تھی۔

”اور ہاں۔“ مجھے تمہاری ثابت قدمی نے بہت امپریس کیا ہے۔ اول روز تم نے جوابات کسی آخر تک اس پر قائم رہیں کہ تمہاری ماما جو فیصلہ کریں گی۔ تمہیں وہی قبول کرنا ہے اور اب جبکہ ہمارے حق میں فیصلہ ہو چکا ہے تو کیا میں امید رکھوں کہ تم میری محبت میں بھی ایسی ہی شدت پسندی کا مظاہرہ کرو گی۔“ وہ اپنی نظریں اس کی پوری کھلی آنکھوں میں اتار کر سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

صاحت نے پلکیں جھپکا کر ذرا سا اثبات میں سر ہلایا پھر اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر غیر محسوس طریقے سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولی تھی۔

”اگر کبھی آپ کو میری آزمائش مطلوب ہو تو جان مانگیے گا۔“
 ”اوس ہوں۔“ اس نے اپنی شہادت کی انگلی سے بہت نرمی سے اس کے ہونٹوں کو چھوا تھا۔
 ”ماٹوں گا، نہیں، جان دوں گا۔“

وہ اس کی مزید کسی حسرت سے بچنے کی خاطر، قدم اور پیچھے ہٹ کر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
 ”الماس آ رہی ہے شاید۔“

”معتی بیوقوف نہیں ہے وہ۔“ وہ مسکراتا ہوا پھر اس کے قریب آنے لگا تھا کہ دروازے پر دستک کے ساتھ
 اس پکار کر بولی۔

”معتی بھائی! آیا آگئے ہیں۔“

”افسہ تو واقعی ہے ووقوف ہے۔“ وہ گہری سانس کے ساتھ بڑبڑایا تو وہ بے ساختہ ہنسی کے ساتھ پردہ کھینچ کر پھر
 کی اوٹ میں ہوئی۔

”اوکے، جلدی ملیں گے۔“ وہ اس کے پردے کو مضبوطی سے تھامے ہاتھ کو ہلاتا ہوا کمرے سے نکل آیا اور
 اس کے اشارے پر جلدی سے اس جگہ آ بیٹھا جہاں کچھ دیر پہلے وہ بیٹھی تھی۔

چند لمحوں بعد ہی شاہ سکندر اور مہرا لہنا اس کمرے میں داخل ہوئے تھے۔
 ”اسلام علیکم۔“ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سلام کیا تو شاہ سکندر خوش دلی سے بولے۔

”وعلیٰ علیکم۔“ بڑے دنوں بعد آئے؟“

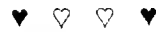
”بس چچا جان! سوچتا تو روز تھا آنے کا لیکن۔“ وہ اس قدر کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”ابا کہاں ہیں تمہارے؟“ شاہ سکندر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے پوچھا۔
 ”شاہ پور۔ امی البتہ یہیں ہیں۔“

”مہرا لہنا بھی لے آئے۔“ مہرا لہنا نے کہا۔

”لے آؤں گا چچی جان! ابھی میں گھر سے نہیں آ رہا۔“ اس نے مبالغے سے کام لیا۔
 ”اور کھانا وغیرہ کھایا۔“

”نہیں۔ چائے کا کھا تھا الماس سے۔“ اس نے الماس کو دیکھا تو وہ جلدی سے بولی۔
 ”چائے آپ کو ضرور ملے گی لیکن کھانے کے بعد۔“



شادی کی تیاریوں میں دن بڑی تیزی سے گزر رہے تھے اور اس بار مدیہ ہر کام میں پیش پیش تھی۔ اسلام آباد
 سے سیما بھائی، سمینہ اور سونیا بھی آگئی تھی۔ سمینہ کی گود میں چند ماہ کا بیٹا تھا اور سب کی زیادہ توجہ اس بچے نے

بھیجی لی تھی۔ سمینہ سارا وقت اسے ڈھونڈتی پھرتی۔
 ”ابھی عمر کس تھا۔“

”مدو سے پوچھو، وہ اس کے کپڑے بدل رہی تھی۔“ سارا دن ایسی آوازیں گونجتی رہتیں اور رات میں ڈھولک
 کے ساتھ ہنسی مذاق میں محفل کتنے رنگ بدلتی تھی۔ کبھی سب سنجیدہ ہو جاتے کبھی بہت شوخ، ایسے میں جب

جیہ چائے لے کر آتی تو وہ ہر روز نئے سرے سے باقاعدہ حیرت کا اظہار کرتے اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ
 کی کہ وہ برا نہیں مان رہی تھی اور پلیٹ کر جواب دیتا تو جیسے بھول ہی گئی تھی۔

اس وقت وہ چائے لے کر آئی تو سب سے پہلے عمر شروع ہوا تھا۔
 ”واؤ، مدو چائے لے آئی۔ آج ضرور سورج مشرق سے طلوع ہوا ہو گا۔“

”مشرق ہی سے ہوتا ہے۔“ شمر نے کہا تو وہ روائی میں ہلانا تھا۔
 532

”میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں۔“ سب کے بے ساختہ قہقہوں سے وہ بوکھلا گیا تھا۔
 ”بس عمرا اب اور کچھ مت کہنا۔ کیونکہ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔“ نیل نے دھیرے سے عمر کو ٹوکا تو وہ سر
 کھجاتے ہوئے بولا۔

”گیا کروں نیل بھائی! مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا۔ اس لڑکی سے پانی ماٹو تو کورا جواب ملتا ہے۔ خودی لو کہاں
 چائے آخراں میں یہ انقلاب آیا کیسے۔“

”کیسے آیا۔“ نیل خود حیران تھے۔ اسے کیا جواب دیتے۔ بس ذرا سے کندھے اچکا کر مدیہ کو دیکھنے لگے
 پھر رات دو بجے تک یہ محفل جی رہی اور آسہ کے کہنے پر ہی سب اٹھے تھے۔ مدیہ ڈرائنگ روم اور لابی کی

لائسنس آف کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی تو آگے صباحت کو بیٹھے دیکھ کر تعجب سے بولی۔
 ”ہائیں! تم جاگ رہی ہو؟“

”تختے شور میں بھلا میں سو سکتی تھی۔“ صباحت اپنی نیند خراب ہونے کی وجہ سے ناراض تھی۔
 ”تو کیا چاہتی ہو تم۔ خاموشی سے ہم تمہیں رخصت کر دیں۔“ وہ اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے بولی۔

”نہیں خوب صوم دھڑکے سے کرنا۔ لیکن یہ پندرہ دن پہلے سے ڈھولک پینے کی کیا تک ہے۔“
 ”ناراض کیوں ہوتی ہو۔ یہ تو میری خوشی سے تمہیں اگر اچھا نہیں لگ رہا تو کل سے نہیں بجے گی ڈھولک

دولک۔“ وہ کہتی ہوئی دوسری طرف کروٹ بدل گئی۔ جانے کیا تھا اس کے لہجے میں کہ صباحت پہلے ایک دم
 خاموش سی ہو کر اسے دیکھ گئی۔ پھر آہستہ سے اٹھ کر اس کے بیڈ پر آ بیٹھی اور اس کا کندھا ہلا کر بولی۔

”مدو! ادھر میری طرف دیکھو۔“ اس نے دیکھا نہ کچھ بولی۔
 ”مدو! کیا ہوا ہے تمہیں۔ تم رو رہی ہو ناں۔“ صباحت کو اس کا رونا محسوس ہو رہا تھا۔ جب ہی بے چین ہو کر

اسے جھنجھوڑنے لگی۔
 ”تم رو رہی ہو ناں مدو! تم رو رہی ہو ناں۔“

”ہاں۔“ وہ ایک دم اٹھ بیٹھی اور گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر سسکنے لگی تو صباحت نے اس کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا
 یا اور اس کے سر پر اپنی پیشانی ٹکاتی ہوئی بولی۔

”ممت رو مدو! مجھے بتاؤ تمہیں کیا ہوا ہے۔ میری بات بری لگی ہے تمہیں یا کسی اور نے کچھ کہا ہے۔“
 اس نے آہستہ سے سراونچا کیا اور ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتی ہوئی بولی۔

”کسی نے کچھ نہیں کہا۔“
 ”بس میرا دل چاہ رہا تھا رونے کو۔“ اس نے کہا تو صباحت کچھ دیر تک اس کے بھیگے چہرے کو دیکھتی رہی پھر اس

کی ٹھوڑی پھونک کر بولی۔
 ”پتا ہے بنا کسی بات کے رونے کو دل کب چاہتا ہے۔ جب اندر کوئی احساس جاگتا ہے یا کوئی درد۔“

اس کی بھیگی آنکھوں میں کچھ تیر سمٹ آیا تھا۔
 ”میں غلط تو نہیں کہہ رہی۔ اس احساس اس درد کا نام ہے محبت۔“ صباحت نے معنی خیز شریر مسکراہٹ کے

ساتھ کہا تو وہ نظریں چراتی ہوئی بولی۔
 ”مجھے پتا ہے۔“

”واقعی پھر جلدی سے بتاؤ کون ہے؟“ صباحت نے خوش ہو کر پوچھا۔
 ”کیا مطلب ہے تمہارا۔“

”تجربہ مت بنو مدو! میں بہت دنوں سے تمہیں نوٹ کر رہی ہوں۔ باتیں کرتے کرتے کھو جاتی ہو۔ آنٹوں پر
 پوکتی ہو اور صبح تو میں نے تمہیں اپنے آپ مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ جبکہ ابھی رو رہی تھیں بنا کسی بات کے۔“

”تھینکس۔“ شاہ سکندر کی نظروں میں تشکر تھا اور ممنونیت کہ اس نے ان کا ہاں رکھ لیا تھا۔
 گو کہ رات اتر آئی تھی پھر بھی انہوں نے گاڑی ساحل کے قریب جا کر روکی تھی۔ اندھیرے میں سمندر نظر
 نہیں آ رہا تھا لیکن لہروں کا شور اس کے ہونے کا یقین دلا رہا تھا۔
 وہ ان کے ساتھ چلتی ہوئی بالکل انجانے میں اس جگہ آ بیٹھی جہاں برسوں پہلے انہوں نے لفافے میں بند
 آزاد دی کا پروانہ اسے تھمایا تھا۔

شاہ سکندر جتنے سرشار آئے تھے۔ اس جگہ کو دیکھ کر انہیں شدید دھچکا لگا تھا اور بیٹھتے ہوئے بے اختیار کہہ
 گئے۔ ”یہاں سے ہم جدا ہوئے تھے۔“

آسیہ نے چونک کر پہلے انہیں دیکھا پھر اپنے اطراف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں لیکھت دھندلا گئی تھیں۔
 ”بہت مشکل ہے فرار، کم از کم اس شہر میں تو ناممکن۔ قدم قدم پر یادیں بھری پڑی ہیں۔“ شاہ سکندر نے کہہ کر

گہری سانس کھینچی تھی۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان خاموشی کی ایک دیوار حائل ہو گئی۔

خاموشی	کا	تو	نام	ہوتا	ہے
دور	یوں	بھی	کلام	ہوتا	ہے
آنکھ	سے	آنکھ	نہیں	ملتی	ہے
دن	سے	دل	ہم	کلام	ہوتا

اور یہاں دل بول رہے تھے۔

جذبہ بول رہے تھے جو وقت اور عمر کے محتاج نہیں ہوتے۔

بیس برسوں میں کس پر کیا بیتی؟ ہوا میں پوچھ رہی تھیں۔

آسیہ کی نظریں تاریک آسمان پر دور تک پھٹنے لگیں۔ کہیں کوئی ستارہ نہیں تھا۔

پتا نہیں کہاں چھپ گئے تھے وہ سب تارے جو اس کے رت جگلوں کے امین تھے۔ وہ چاند جو اس کے

آنسوؤں پر بھی مسکراتا اور کبھی بادلوں میں چھپ جاتا تھا۔

وہ لکھاؤں کی راہ گز جہاں ہر قدم پر اس سے ایک ہی سوال ہوتا۔ تیرا ہم سفر کہاں ہے۔

کیسی دھند بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”آسیہ۔“ شاہ سکندر نے دھیرے سے بولا تھا۔

زہرا سناچو کئی پھر ان کی طرف متوجہ تو ہو گئی لیکن انہیں دیکھا نہیں۔

”ایک بات پوچھوں؟“ شاہ سکندر براہ راست اسے دیکھتے ہوئے تکرار ہے تھے۔

اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا تو وہ قدرے رک کر بولے تھے۔

”تم نے پھر شادی کیوں نہیں کی؟“

”کیا سنتا جاؤں گے۔ سچ یا جھوٹ؟“ وہ اپنی انگلی میں واٹ گولڈ کے رنگ کو بہت دھیرے دھیرے گھما رہی

تھی۔ اس کی نظریں بھی اس پر جمی تھیں۔

”جو تم آسانی سے بول سکو۔“ شاہ سکندر نے کہا تو اس نے ایک دم سراونچا کر کے انہیں دیکھا پھر دکھ سے گویا

ہوئی۔

”آسانی سے تو ایک ہی بات کہی جاسکتی ہے کہ بچوں کی خاطر۔ ہر وہ عورت جو ایسے کسی ایسے سے دوچار ہوتی

ہے وہ یہی کہتی ہے اور شروع میں تو یہی سچ ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے عورت اپنے لیے سوچنے لگتی

یہ ساری علامات ظاہر کرتی ہیں کہ کسی مسافر نے تمہارے دل کی کشتی میں ٹھکانا کر لیا ہے۔“ صبا بکھ بکھ
 تھکے انداز میں اس پر گرفت کر رہی تھی۔

”لیکن بدحوالہ! اب تم کوئی دھوکا مت کھانا۔ پہلے دیکھ لینا کہ اس کی محبت میں کتنی سچائی! کتنی ایمانداری ہے۔“
 ”سچائی ہی سچائی! ایمانداری ہی ایمانداری۔“ وہ اپنے آپ بولنے لگی تھی۔

”میں جیران ہوں کہ میری تمام تر خامیوں، میری نفرتوں اور عداوتوں کے باوجود وہ مجھ سے محبت کرتا رہا کرتا
 ہے۔ میں اس کی نفی کرتے کرتے ہار گئی صبا! وہ محبت کا آسمان ہے۔ جانے کب سے اس نے میرے لیے اپنی
 بانٹیں وا کر رکھی ہیں۔ میں سراٹھا کر اسے دیکھ سکتی ہوں لیکن چھو نہیں سکتی کیونکہ اس کے سامنے مجھے اپنا آپ
 بہت کمتر بہت حقیر لگنے لگا ہے۔ میں اس کے قابل نہیں ہوں صبا! پھر تم کیوں اسے مجبور کرتی ہو کہ وہ مجھ سے اپنی
 محبت کا اظہار کرے۔“

♥ ♥ ♥ ♥

شاہ سکندر کے لیے شاہ پونس کا آنا اور مدحیہ کے لیے شاہ تیمور کا پرپزل دینا دونوں باتیں ہی غیر متوقع تھیں

لیکن انہوں نے ظاہر نہیں کیا کیونکہ شاہ پونس سب سے بڑے تھے اور وہ ہمیشہ سے ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

اس لیے انہیں صاف جواب بھی نہیں دے سکے اور یہی کہا کہ وہ مدحیہ کی ماں سے مشورہ کر کے بتائیں گے۔ پھر ان

کا ارادہ تو نہیں تھا اس سلسلے میں آسیہ سے بات کرنے کا لیکن یہ سوچ کر کہ شاہ پور میں قیام کے دوران ہو سکتا ہے

مدحیہ اور شاہ تیمور کے درمیان انڈراشینڈنگ ہوئی ہو انہوں نے آسیہ سے بات کر لینا ضروری سمجھا۔ ان کے

خیال میں اگر آسیہ اس رشتے پر راضی ہوئی تو پھر صبا بکھ کے ساتھ ہی مدحیہ کی شادی بھی کر دیں گے، اسی لیے

انہوں نے جلدی کی تھی اور اس شام آسیہ کے کلینک پہنچ گئے تھے۔

اس بار آسیہ نے ان کے ساتھ جانے کے بجائے وہیں اپنے کمرے میں انہیں بلا لیا تھا اور ابتدائی رسمی جملوں

کے بعد ان کی آمد کا مقصد پوچھا تو وہ کہنے لگے۔

”میں مدحیہ کی بات کرنے آیا ہوں۔ آئی مین اس کی شادی کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے۔“

”صبا کے بعد۔“ آسیہ نے بہت مختصراً ”جواب دیا۔ تو وہ قدرے رک کر پوچھنے لگے۔

”کوئی ہے آپ کی نظر میں اس کے لیے کیا؟“

”میرا بھتیجا فیمل۔“ وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

”فیمل۔“ انہوں نے کچھ دیر سوچا پھر کہنے لگے ”اے اوکے! اب تو ایک ٹکڑے میں بھی ایک پرپزل لایا تھا لیکن میرا

خیال ہے۔ اب اس کے بارے میں کچھ کہنا فضول ہے یا آپ جاننا چاہیں گی۔“

”بالکل نہیں۔ آئی ایم سوری۔“

”تو سوری بھول جائیں کہ میں نے آپ سے ایسی کوئی بات کی ہے۔“ وہ کہہ کر فوراً ”موضوع بدل گئے۔“

”پھر کیا خیال ہے۔“ انہوں نے کہا پھر ادھر ادھر چلتے ہوئے بولے۔ ”لیکن یہاں رنگ ہیں نہ خوشبو اور موسم

کا بھی پتا نہیں چل رہا۔ کیا خیال ہے کہیں باہر چلیں، کھلی فضا میں کھلے آسمان تلے۔“

آسیہ فوراً ”جواب نہیں دے سکی اور سوچنے کے بعد بھی شش و پنج میں تھی۔ انہوں نے اپنا لٹریچر جو بے خیالی

میں اس کی فیمل پر رکھ دیا تھا۔ وہ اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے گویا چلنے کا اشارہ دیا تھا پھر شہر کر گیا ہوئے۔

ہمارے بعد میں کچھ لوگ کیسے دیکھ تو آئیں

چلو اس شہر کو اک بار پھر سے دیکھ تو آئیں

آسیہ کسی غیر ملکی طاقت کے زیر اثر اٹھتی ہوئی بے ساختہ گویا ہوئی تھی۔

بہت دن سے سمندر کی ہوا گم صم کی آتی ہے۔

نہ ہوں طوفانوں کے سفر پر بیٹھنے دیکھ تو آئیں

ہے لیکن اس کے ساتھ بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ اسے بچوں کے ساتھ کوئی قبول نہیں کرتا اور وہ بچوں کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتی، یوں بقیہ ساری زندگی ایک ایسے شخص کو ڈھونڈنے میں گزر جاتی ہے جو اس کے ساتھ اس کے بچوں کو بھی تحفظ دے سکے اور ایسا شخص ہزاروں نہیں لاکھوں میں کوئی ایک ہوتا ہے۔“

شاہ سکندر بغور اسے دیکھ اور سن رہے تھے اس کی بات حتم نہیں ہوئی تھی۔ غالباً سانس لینے کو رکھ تھی کہ وہ بے صبری کا مظاہرہ کر گئے۔

”نہیں۔“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ حالانکہ میرے ماں باپ، بھائیوں اور بھانجوں نے بہت چاہا اور وہ جولا لکھوں میں کوئی ایک ہوتا ہے وہ بھی خود چل کر میرے پاس آیا۔ وہ بہت ناکس بہت فیر تھا لیکن۔“

وہ بولتے ہوئے کچھ کھوسی گئی تھی۔

لیکن شاہ سکندر کی بوہڑ نکلیں رکنے لگی تھیں۔

”میرا دل نہیں مانا کہ میں اس کے ساتھ منافقت کروں۔ اس کے سچے جذبوں کے ساتھ بے ایمانی کروں۔ گوکہ اپنے دل کی بہتی سے میں نے وہ سارے پھول خود اپنے ہاتھوں سے نوچ ڈالے تھے جن کی آبیاری میں میری ساری محبتیں شامل تھیں اور محبتیں تو فنا نہیں ہوتیں شاہ سکندر!“

انسان فانی ہے روح کو فنا نہیں اور جو روح میں بس جائے اس کے لیے کوئی دروازہ بند نہیں ہوتا پھر میں ایسی کوشش کیوں کرتی۔

کیا ہوا اور دل کی بہتی اجڑ گئی۔

کیا ہوا جو قرین فاصلوں میں بدل گئیں۔

یہ سب تو وقت کی ادا میں ہیں۔

کبھی دے جاتا ہے

کبھی لے جاتا ہے

یہی زندگی ہے۔

اور زندگی کے ساتھ وقت خواہ کتنی آنکھ پھولی کھیل لے روح کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔

اور میری روح میں جو محبت رچ بس گئی اسے نکال پھینکنے پر میں قادر ہی نہیں تھی۔ پھر کیسے میں کسی اور کا ہاتھ تھام لیتی۔ یہ تو سراسر بے ایمانی ہوتی۔ اس کے ساتھ خود اپنے ساتھ اور اس بے ایمانی پر میری محبت روتی، تڑپتی سکتی۔ نہیں یہ مجھے منظور نہیں تھا۔“

شاہ سکندر اپنی جگہ بالکل ساکت ہو گئے تھے۔ نظریں اس محبت و وفا کی دیوی پر جم کر رہ گئی تھیں اور ساتوں میں صرف اس کی آواز تھی۔ جیسے کائنات میں بس ایک وہی سچ ہے وہی حقیقت بالی سب فریب۔

جانے ایک طویل خواب کے بعد اب بیداری کا وقت آیا تھا۔

یا۔

ساری عمر جاگتے جاگتے تھکی ہوئی آنکھوں میں اب نیندا تڑی تھی۔ کچھ بھی ہو یہ لمحے خواب یا حقیقت زندگی کا حاصل تھے ان کے سینے میں ہلکا بکا درد کو میں لینے لگا تھا۔

”اے وقت بس اب ٹہر جا۔ اس سے آگے اب کچھ نہیں ہے۔

نہ کوئی آرزو نہ کوئی خواہش۔

نہ امنگ نہ ترنگ۔

نہ کوئی آرزو نہ کوئی خواہش۔

نہ رنگ نہ ترنگ

تو اب کس کے ساتھ آنکھ پھولی کھیلے گا

زندگی تو بس یہیں تک تھی

اس کے بعد روح کا سفر ہے اور تو روح کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔

کہہ دے اس بے درد دنیا سے کہ

روح سے روح کا ناتا جو گیا ہے اب اسے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ تو بھی نہیں، تو بھی نہیں۔

ان کے سینے میں درد بڑھتے بڑھتے ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔

”آس!“ ساری توانائیاں صرف کر کے بھی ان کے ہونٹوں سے بہت مدھم آواز نکلی تھی۔ پھر بھی آسیہ نے فوراً سرا نچا کیا اور انہیں سینے پر ہاتھ رکھ جھکتے دیکھ کر اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

”سکندر! سکندر!“ بے حد پریشان ہو کر وہ انہیں پکارنے لگی۔ اس کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ پھر بھی اس نے بہت بہت کر کے انہیں ٹھیک کر دیں پھر ملی زمین پر لٹایا اور ان کے سینے پر دونوں ہاتھ جما کر زور زور سے دبانے کے ساتھ مدد کے لیے لوگوں کو پکارنے لگی۔

اودھرا دھرے کالی لوگ جمع ہو گئے کسی نے موبائل پر ایسوی لینس دیا۔

اور ایسوی لینس کے آنے تک وہ مسلسل اپنی کوشش میں مصروف رہی تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥

ایک ایک بل قیامت تھا۔ اس کی نظریں بند دروازے پر جمی ہوئی تھیں، جبکہ ذہن اور دل دونوں ہی کسی نامعلوم شعبے میں جکڑ گئے تھے۔ جب ہی ہونٹوں پر کوئی دعا نہیں تھی۔ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ جب ڈاکٹر نے آکر اسے متوجہ کیا تب بھی وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”آپ کے ساتھ کوئی اور نہیں ہے؟“ ڈاکٹر نے پوچھا تو اس کا سر آپ ہی آپ لٹی میں ہل گیا۔

”کسی کو بلا لیں۔“ ڈاکٹر نے پھر کہا تو اس کا سما ہوا دل مزید سسم گیا۔ بہت کوشش کر کے بولنا چاہا تو بس ایک ہی لفظ کہہ سکی۔

”ک۔۔۔ کیوں؟“

”اس لیے کہ آپ پریشان ہو رہی ہیں۔ پلیز بیٹھ جائیں۔“

”مم۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں وہ۔۔۔“ اس نے بند دروازے کی طرف دیکھا۔

”دعا کریں۔“ ڈاکٹر اسی قدر کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

”دعا۔“ اس کے احساسات پر جیسے کوئی جھنجھوٹے والی ضرب پڑی تھی، اور دل یکبارگی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

”میرے اللہ۔ میرے اللہ۔“ اس سے آگے اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یونہی اللہ کا درد کرتے ہوئے اس نے پی سی او کا رخ کیا۔ پھر گھر کے نمبر ڈائل کرتے ہوئے سامنے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔

دوسری طرف مسلسل بیل جا رہی تھی۔ کتنی دیر بعد ریسورائٹنے کے ساتھ ہی ڈھولک کی آواز نے اس کے ندر کی دنیا تہہ وبالا کر دی تھی۔ اس کے بعد غالباً ”مدحیہ تھی۔“

”ہیلو۔۔۔ ہیلو۔۔۔“

”میرے خدا۔“ اس نے آہستہ سے کرڈیل پر ہاتھ رکھ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد علی جمائگیر کے نمبر ڈائل کیے تو اودھرنیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند لمحوں بعد ہی اس کی آواز آئی تھی۔

”بس۔۔۔ علی جمائگیر۔“

”علی! یہ میں ہوں“ آئیہ“ وہ کسی طرح اپنی آواز کی لرزش پر قابو نہیں پاسکی تھی۔

”جی آئی! خیریت؟“ علی جھانگیر نے اس کی بدلی ہوئی آواز سے ٹھٹھک کر پوچھا۔

”خیریت نہیں ہے بیٹا! میں اس کا رڈیو سے بول رہی ہوں۔ تم آ کر آگے ہو تو فوراً آجاؤ۔“

”میں آ رہا ہوں آئی! آپ پریشان نہیں ہوں اور پلیز یہ تو بتائیں کہ کون۔“

”بس تم آجاؤ۔“ اس نے غلی جھانگیر کی بات پوری ہونے سے پہلے کہا اور فون رکھ دیا۔ پھر کوریڈور تک آ

آئے اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

”میرے اللہ۔ میری بچیوں کو اب ان کا باپ ملا ہے۔ ان کے سروں پر یہ سائبان سلامت رکھنا۔“ اس نے

کے لیے ہاتھ اٹھائے پھر ان ہی ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا کیونکہ آنسو روانی سے چھٹک گئے تھے اور اس تیزی سے

کے ہونٹ حرکت کرنے لگے تھے۔ ساری دعا میں اس شخص کے لیے تھیں جو اس کا کچھ نہیں تھا اور بہت

تھا۔

تقریباً اندرہ منٹ بعد علی جھانگیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پکارا تھا۔

”آئی!“

اس نے چونک کر ہاتھ نیچے گرائے تو اس کی آنسوؤں سے بھری ہتھیلیاں دیکھ کر علی جھانگیر مزید پریشان ہو گیا

”آئی پلیز! بتائیں کیا ہوا ہے۔ صاحت اور مدحیہ۔“

وہ زور زور سے نفی میں سرہانے لگی۔

”پھر کون ہے یہاں؟“ وہ اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا اور اس کی آنسوؤں سے بھری ہتھیلیوں پر

ہاتھ رکھ کر پوچھا تو وہ رک کر بولی۔

”شاہ سکندر۔“

”سکندر بچا۔ کیا ہوا ہے انہیں؟“ علی جھانگیر ضبط کرنے کی کوشش میں اس کے ہاتھوں کو زور سے دبا گیا تھا۔

”ہارٹ۔“ وہ اسی قدر کہہ کر خاموش ہو گئی۔

”اوہ گا!“ علی جھانگیر کے ذہن میں کتنے سوال ابھرے۔ کب کہاں، کیسے لیکن اس کی حالت کے پیش نظر

نے مزید کچھ نہیں پوچھا اور تسلی دیتے ہوئے بولا۔

”سب ٹھیک ہو گا آئی! آپ پلیز خود پر قابو رکھیں میں ڈاکٹر سے مل کر آتا ہوں۔“

”سندو! میرے گھر فون کر گئے نیل سے کہنا یہاں آجائے خیال رکھنا مدد اور صبا کو ابھی معلوم نہیں

چاہئے۔“

”جی، مہتر۔“ وہ تسلی کے انداز میں اس کے ہاتھ تھپک کر پہلے کاؤنٹر پر آیا اور وہاں موجود نرس سے ڈاکٹر کا محلہ

کر کے فوراً اس طرف چل پڑا۔

راہداری میں تیسرے دروازے پر ڈاکٹر اکرام اللہ کے نام کی تختی دیکھ کر اس نے اس دروازے پر آہستہ

دھک دی اور کم ان کی آواز پر اندر داخل ہو کر بولا۔

”السلام علیکم سر!“

”و علیکم السلام۔“ جواب کے ساتھ ڈاکٹر صاحب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ جب سے اپنا کارڈ نکال

ان کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

”مسٹر شاہ سکندر حیات میرے بچا ہیں۔“

”اوہ۔“ ڈاکٹر نے ہونٹ، سیکڑ کر اس کے کارڈ پر نظر ڈالی پھر اسے دیکھ کر کہنے لگے۔

”بہت سیریس کنڈیشن ہے ان کی۔ اگلے چوبیس گھنٹوں تک میں کچھ نہیں کہہ سکتا سوائے اس کے کہ

کریں۔“ اس بات کے جواب میں وہ کیا کہتا۔ چپ چاپ انہیں دیکھے گیا۔

”ہم اپنی سی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ آگے زندگی موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ دعا کریں ان کی زندگی

”آمین!“ اس نے چیخ کر ہاتھ جما کر گویا خود کو سہارا دیا پھر ٹیلی فون کی طرف دیکھا تو ڈاکٹر اکرام اللہ نے اسے

نے کا اشارہ کرنے کے ساتھ ٹیلی فون سیٹ اس کی طرف کھٹکا دیا۔

”ٹھٹھک پو۔“ اس نے بیٹھتے ہی آئیہ کے گھر کے نمبر ڈائل کیے اور اس کے ساتھ ہی وہی ہوا۔ ریسپور انڈیٹ

بھولک کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو ایک لمبے کووڈ چکر لگیا کہ جہاں خوشی کے شادیانے بجنے رہے ہیں

وہ یہ خبر کیسے دے۔

”ہیلو، ہیلو۔“ اس بار ادھر سے نیل بول رہے تھے۔

”السلام علیکم نیل بھائی! میں علی جھانگیر۔“ وہ بہت سنبھل کر بولا۔

”خیریت علی! اس وقت کیسے فون کیا؟“ رات کے دو بجے نیل کی تشویش فطری تھی۔

”بس نیل بھائی خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔ آپ ابھی کسی سے نہیں کہیں اور فوراً کارڈیو آجائیں۔ سکندر

وہ ریس انیک ہوا ہے۔ آئی آئیہ بھی ہمیں ہیں۔“

اس نے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ کر ان کا جواب سننے بغیر فون بند کر دیا۔ پھر شاہ پور کے نمبر ڈائل

نے لگا ”کیونکہ ڈاکٹر اکرام اللہ نے اسے کوئی امید نہیں دلائی تھی اس لیے اس نے باباجان کو اطلاع کرنا ضروری

مانھا۔

”ہیلو!“ کتنی دیر بعد باباجان کی نیندیں ڈبلی آواز آئی تھی۔

”السلام علیکم باباجان! میں علی بات کر رہا ہوں۔“

”علی! باباجان کو غالباً“ بیدار ہونے میں کچھ وقت لگا۔ ”ہاں علی! کیا بات ہے؟“

”وہ باباجان۔۔۔“ وہ اسی قدر کہہ سکا۔

”ہاں کمو، ہم سن رہے ہیں۔ کیا پھر تمہاری شادی میں کوئی۔۔۔“

”میری شادی کو گولی ماریں باباجان! بس آپ فوراً یہاں آجائیں، سکندر بچا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ ان

ات کاٹ کر بولا۔

”ک۔۔۔ کہا ہوا ہے اسے؟“ باباجان اب ٹھٹھکے تھے۔

”اب آ کر دیکھ لیں۔“ وہ ہارٹ انیک کا بتانا نہیں چاہتا تھا۔

”ہلے ڈاکٹر کو تو دکھاؤ۔“ باباجان دھاڑے تھے۔

”ڈاکٹر ہی کے پاس ہیں کارڈیو میں۔ آپ کو آنے میں تین گھنٹے لگیں گے باباجان۔“ اس نے وقت کی نزاکت کا

س دلایا۔

”ہاں، ہاں ہمیں معلوم ہے۔ ہم بس ابھی آرہے ہیں۔ تم سکندر کے پاس رہو۔“

”نہن ہی کے پاس ہوں۔“ اس نے کہہ کر فون رکھ دیا پھر ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے ان کے کمرے سے نکلا تو

اری ہی میں نیل مل گئے۔

”کیسے ہیں انکل سکندر؟“ نیل نے اسے دیکھتے ہی پوچھا تو وہ بس ذرا سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔

”ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں؟“

”دعا کریں جو میں گھنٹے خیریت سے گزر جائیں۔“

”تتی سیریس کنڈیشن ہے؟“

”ہوں۔“ اس نے ہونٹ کی صورت گہری سانس خارج کی پھر انہیں لے کر آئیہ کے پاس آ گیا۔

آئیہ نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھ کر دوبارہ سر جھکا لیا تھا۔

”پھوپھو!“ نیل نے اس کے پاس بیٹھ کر اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے لیا۔ ”آپ بہت بہادر ہیں پھوپھو! آپ کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔ اللہ چاہے گا انکل بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔“
 آسیہ کی آنکھوں میں رے ہوئے آنسو پھر قطرہ قطرہ اس کے ہاتھوں پر نکلنے لگے۔
 ”رو میں نہیں پھوپھو پلینز۔“ نیل نے اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کیے۔
 ”مدد اور صبا اپنے باپ سے مل کر کتنی خوش تھیں۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔
 ”ان کی یہ خوشی قائم رہے گی انشاء اللہ۔“ نیل نے فوراً کہا تو وہ دل میں آمین کہہ کر پوچھنے لگی۔
 ”تم نے انہیں بتایا تو نہیں؟“
 ”نہیں البتہ طلیل پچاسے کہہ آیا ہوں۔“ نیل اسے جواب دے کر علی جمائیکر کی طرف متوجہ ہو گئے۔
 ”علی! بیٹھ جاؤ یا ر، ٹھک جاؤ گے۔“

”آئی ٹھک گئی ہیں۔ میرا خیال ہے آپ انہیں گھر لے جائیں۔“ علی جمائیکر نے رک کر کہا تو نیل نے آ۔
 کو یوں دیکھا جیسے چل رہی ہیں۔
 ”نہیں بیٹا! جب تک ڈاکٹر اطمینان نہیں دلاتے میں نہیں جاسکتی۔“ آسیہ کا جواب سن کر علی جمائیکر نے م کچھ نہیں کہا اور اپنی رستہ واضح کر لیا۔
 پھر جس طرح وہ بار بار گھڑی دیکھنے کے ساتھ ریٹنگ سے بچے جھانک رہا تھا اس سے نیل سمجھ گئے کہ اسے ک کا انتظار ہے اور ان کا ذہن شاہ جمائیکر کی طرف گیا تھا۔ اس لیے وہ بھی لاشعوری طور پر ان ہی کا انتظار کرنے لگے۔
 آسیہ جتنی قرآنی آیات یاد تھیں ان کا ورد کرنے میں لگ گئی تھی۔
 پھر جھری اذانوں کے ساتھ ہی بابا جان کی آمد ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ شاہ جمائیکر تھے۔
 نیل نے دور ہی سے شاہ جمائیکر کو دیکھ لیا تھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی طرف بڑھنا چاہتے تھے کہ ان ساتھ بابا جان کو دیکھ کر وہ قدرے خائف سے ہو گئے اور دوبارہ بیٹھ کر آسیہ کو متوجہ کرتے ہوئے بولے۔
 ”پھوپھو! شاہ پور سے لوگ آرہے ہیں۔“

آسیہ نے چونک کر سرواٹھ کیا تو اس کی پہلی نظری بابا جان پر پڑی تھی۔ گو کہ اس سے پہلے اس نے انہیں نیہ دیکھا تھا پھر بھی وہ انہیں پہچان سکتی تھی۔ اونچا شملہ سر پر سجائے اس وقت وہ بہت کمزور لگ رہے تھے۔ ان چال بھی بہت دھیمی تھی۔ اس نے بہت خاموشی سے انہیں اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا پھر سرگوشی نیل سے بولی۔

”گھر چلو نیل! اذان ہو رہی ہے۔ نماز گھر میں پڑھوں گی۔“

بابا جان نے بہت چاہا کہ وہ ایک نظری شاہ سکندر کو دیکھ لیں لیکن ڈاکٹر نے اجازت نہیں دی۔ تب وہ بہت مایوس ہو کر اس جگہ آ بیٹھے تھے جہاں کچھ دیر پہلے آسیہ بیٹھی تھی اور وہ تو نہیں البتہ شاہ جمائیکر آسیہ کو دیکھ چکے تھے اس لیے بابا جان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے انہوں نے اشارے سے علی سے پوچھا کہ آسیہ کہاں گئی۔ جواب میں اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

”کون لایا تھا سکندر کو یہاں؟“ بابا جان نے علی کو دیکھ کر پوچھا تو وہ بہت سنبھل کر بولا۔

”جائیں بابا جان۔“
 ”تمہیں کیسے خبر ہوئی تھی؟“

”میرے پاس فون آیا تھا۔ رات ایک بجے کے قریب کہ شاہ سکندر کو انیک ہوا ہے اور وہ کارڈیو میں ہیں۔ بہر اتنا سن کر ہی میں بھاگا چلا آیا۔ پھر ڈاکٹر نے ان کی کنڈیشن معلوم کرنے کے بعد میں نے آپ کو فون کیا تھا۔“
 پورے دھیان سے بابا جان کی طرف متوجہ تھا کہ ان کی ہر بات کا جواب دے سکے۔

اس کے گھر میں خبر ہے، عمر النساء اور بچوں کو؟“ بابا جان نے سوچتے ہوئے انداز میں پوچھا۔
 میرا خیال ہے کہ نہیں۔ اگر ہوئی تو عمر النساء چچی یہاں موجود ہوں گی۔“
 ہوں۔“ بابا جان ہنکارا بھر کر خاموش ہو گئے پھر قدرے توقف سے پوچھنے لگے۔
 ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“

جمائیکر نے کوئی جھوٹی آس دلانے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔
 جاؤ معلوم کرو ڈاکٹر سے۔ اگر اس کے بس میں نہیں ہے تو ہم باہر لے جاتے ہیں سکندر کو۔ جاؤ جمائیکر تم بات بابا جان کو علی کی خاموشی بری طرح کھٹکی تھی۔

میرے بابا جان! صبر۔ ایسی حالت میں ہم سکندر کو کہیں نہیں لے جاسکتے۔ ویسے اس طرف سے آپ ان رکھیں۔ یہاں بہت قابل ڈاکٹر موجود ہیں۔“ شاہ جمائیکر نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔
 یہ قابل ڈاکٹر ہمیں دیکھنے کیوں نہیں دے رہے۔“ بابا جان ٹوٹ رہے تھے۔ ”ایک نظر ہمیں ہمارے بچے کو بہت ناراض ہو کر آیا تھا وہ ہم سے ہمیں اسے منانے دو۔“
 بابا جان! بابا جان پلینز۔“ علی جمائیکر نے انہیں کندھوں سے تھام لیا۔ ”حوصلے سے کام لیں، پچا جان ٹھیک ہوں گے۔“

ٹھیک ہوتا ہے اسے۔ اس کی بیٹی کی شادی سر پر کھڑی ہے۔ جاؤ، بتاؤ اسے ہم آئے ہیں۔ اس کی بیٹی کو ت کرانے۔“ بابا جان یکدم لاچار ہوڑھے نظر آنے لگے تھے۔
 جمائیکر کے لیے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا تو آہستہ سے ان کے کندھوں سے ہاتھ ہٹا کر دھیرے دھیرے کھسکتا ہداری میں نکل آیا۔ لیکن اس کا دھیان ابھی بھی بابا جان کی طرف تھا۔ بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنے اب تقدیر کے سامنے کس قدر بے بس ہو گئے تھے۔ سب آن بان شان دھری رہ گئی تھی۔
 نر انسان سمجھتا کیوں نہیں

تقدیر کے آگے کوئی تدبیر نہیں چلتی
 زکو خدا سمجھنے والے بھول جاتے ہیں کہ ایک دن خدا کے سامنے جانا ہے۔
 زخدا تو برابرے نیاز ہے اور اسی قدر باخبر۔
 سے کچھ پوشیدہ نہیں
 سب دیکھتا ہے سب جانتا ہے۔

انسان کس زعم میں ہے۔ سمجھتا ہی نہیں لیکن کب تک وہ ایک حد تک ہی رسی دراز کرتا ہے۔
 اس کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ چاہے تو اولین لحوں میں ہی گرفت کرے، لیکن وہ بندوں کو موقع دیتا

کی شان ہے
 ان شان والے سے کون لڑ سکا ہے
 میں
 کے سامنے سب بے بس ہیں۔

ان لیتا ہے اور کوئی نہیں مانتا اور جو نہیں مانتا اس سے وہ یوں منواتا ہے۔
 یہی سوچتا ہوا ہر نکل کر آیا تو اس کا دل چاہا یہاں سے کہیں بہت دور چلا جائے جہاں نہ کوئی بے بس ہو نہ بالاختیار۔ سب کے دکھ سکھ ایک جیسے ہوں۔ شاید بابا جان کی بے بسی پر اسے رحم آنے لگا تھا۔ اس لیے وہ نہیں سکا اور گھر چلا آیا۔
 بیگم اس کے بارے میں کرم دین سے سوال جواب کر رہی تھیں۔ اسے دیکھا تو اس پر ناراض ہونے

”یہ رات میں کون سی ڈوبی ہوئی ہے تمہاری اور مجھے بتا کر نہیں جاسکتے تھے۔“

”آپ سو رہی تھیں۔“ وہ تھکا تھکا ماصو نے پڑھے گیا۔

”اب تو جاگ رہی ہوں۔ اب بتاؤ کہاں سے اُڑے ہو؟“ عارفہ بیگم اس کے سر پر آن کھڑی ہوئیں۔

”کرم دین! ایک گھر اس چائے اور ناشتے کا نقش تیار کرو، جلدی۔“ اس نے پہلے کرم دین کو مخاطب کر کے کہا پھر عارفہ بیگم کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولا۔

”میں رات باپٹل میں تھا، سکندر چچا کے پاس۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”ہائیں۔ اسے کیا ہوا؟“ عارفہ بیگم پریشان ہو گئیں۔ ”بتاؤ ناں کیا زیادہ طبیعت خراب ہے؟“

”بس امی دعا کریں۔ شاہ پور سے بابا جان بھی آگئے ہیں۔ وہیں باپٹل میں ہیں ابائے ساتھ۔ میں نے رات انہیں فون کر کے بلایا تھا۔ اب شہ سکندر چچا کے گھر میں ابھی کسی کو بتا نہیں ہے۔ آپ ایسا کریں ڈرائیور کے ساتھ مرالہا چچی کے پاس چلی جائیں لیکن انہیں کچھ بتائیے گا نہیں، جب تک میں فون کر کے آپ کو چچا جان کی خبریت سے آگاہ نہ کروں۔“ وہ جیسے سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

”کہا کہ رہے ہو علی!“ عارفہ بیگم کا دل ہونے لگا تھا۔

”افہ آپ تو۔۔۔ بس آپ کہیں انہیں جارہیں، ہمیں بیٹھی رہیں۔“ وہ جھجھکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کرم دین سے کہیں جلدی کرے میں دو منٹ میں شاہ پور لے کر آتا ہوں۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ عارفہ بیگم نے کہا، لیکن وہ اُن سنی کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا کیونکہ یہ بحث کا وقت نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد وہ کمرے سے ہی کرم دین کو پکارتا ہوا نکلا تو آگے عارفہ بیگم تھرا س اور نفن لیے کھڑی تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے انہیں اپنے ساتھ جانے سے روکا اور ان کے ہاتھ سے وہ ڈون چیزیں لے کر جلدی سے باہر نکل آیا۔

شاہ جہانگیر راداری میں ٹھل رہے تھے اور بابا جان پتا نہیں کہاں تھے۔ وہ ان کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتا ہوا شاہ جہانگیر کو پکار کر پوچھنے لگا۔

”بابا بابا جان کہاں ہیں؟“

”ڈاکٹر کے کمرے میں۔ تم نے ناحق انہیں بلا لیا۔ بہت پریشان ہو رہے ہیں۔“ شاہ جہانگیر نے جواب دینے کے ساتھ کہا تو وہ گہری سانس سچھتے ہوئے بولا۔

”پریشانی کی بات تو ہے۔ چلیں آپ بھی ادھر ہی چلیں، میں آپ کے لیے ناشتا لایا ہوں۔ کسی طرح بابا جان کو بھی کچھ کھلا یادیں۔“

”متم کو خشک کر دیکھو، مجھے تو منع کر چکے ہیں۔“ شاہ جہانگیر نے کہا اور اس کے ساتھ ڈاکٹر کے کمرے میں آئے تو آگے بابا جان بڑی عاجزی سے شاہ سکندر کو ایک نظر دیکھنے پر اصرار کر رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب ان کے مسلسل اصرار سے تنگ ہو رہے تھے جب ہی شاہ جہانگیر کو دیکھتے ہی نلنے لگے۔

”پلیز! آپ انہیں گھر لے جائیں۔ جب مریض کو ہوش آئے گا تب میں خود انہیں کال کر لوں گا۔“ شاہ جہانگیر نے یوں سر ہلایا جیسے یہ نہیں جائیں گے پھر آگے بڑھ کر بابا جان کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

”بابا جان! ایک میں علی آپ کے لیے گھر سے ناشتا لایا ہے۔“

”سہیل! سکندر کو دیکھیں گے۔“ بابا جان کی اپنی ضد تھی۔

”اوکے! میں ڈاکٹر سے یہ کہتا ہوں۔ اگر وہ اجازت دیں گے تو۔“ ڈاکٹر اکرام اللہ کہتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔ ”چلو! ہمیں لے جاؤ ڈاکٹر صدیقی کے پاس۔“ بابا جان بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

آسیہ کی رات تو کارڈ بوی میں آنکھوں میں کئی تھپی پھر گھر آکر فجر کی نماز کے بعد وہیں جا نماز پر کچھ دیر کو اس کی لگ لگ گئی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک وہ جلے پیر کی جلی کی مانند سارے میں پکراتی پھر رہی تھی۔ کبھی اپنے رے میں بند ہو کر جا نماز پچھا کر بیٹھ جاتی اور کبھی بھاگ کر فون کا سہوڑا نکالتی۔

نیل کے کتنے پر میوند بھابھی نے مدحیہ اور صاحت کو نیچے بلا کر کسی کام میں مصروف کر دیا تھا۔ اس لیے وہ ان بالکل بے خبر تھیں ورنہ آسیہ کی حالت سے اگر وہ اصل بات تک نہ پہنچیں تب بھی متوحش ضرور ہوتیں۔ پھر جانے کی کوشش بھی کرتیں اور نیل کے لیے ان کے بے کئے سوالوں کے جواب دیتا بہت مشکل تھا کیونکہ کانپاؤ، ہن بری طرح متاثر ہوا تھا۔ خاص کر آسیہ کی پریشانی ان سے دیکھی نہیں جاری تھی اور مشکل یہ تھی کہ سے تسلی بھی نہیں دے پارے تھے نہ کچھ کھانے پر مجبور کر سکے۔

دوسرے میں میوند بھابھی اوپر آئیں تو انہوں نے زبردستی آسیہ کو تھوڑا کھانا کھلایا

”کوئی فون نہیں آیا۔ پتا نہیں سکندر کیسے ہیں؟ انہیں ہوش آیا کہ نہیں۔“

”آجائے گا ہوش اور وہ ٹھیک بھی ہو جائیں گے۔“ میوند بھابھی اسے تسلی دیتے ہوئے کہنے لگیں۔ ”تم پہلے بے آپ کو تو سنبھالو اگر مدد اور صابانے تمہیں اس حالت میں دیکھ لیا تو۔“

”آپ نے انہیں بتایا تو نہیں؟“ اس نے فوراً پوچھا۔

”ابھی تک تو نہیں بتایا لیکن اب بتانے جارہی ہوں، کیونکہ کسی بھی وقت ان کا ہاسپٹل سے بلاوا آسکتا ہے۔“ نہ بھابھی نے کہا تو اس نے چونک کر پوچھا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ان کے دادا کہہ سکتے ہیں کہ بچیوں کو باپ کے پاس ہونا چاہئے اور ایسی حالت میں ہم منع بھی کر سکتے، یا تم منع کرو گی؟“ میوند بھابھی نے وضاحت کر کے پوچھا تو وہ آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

پھر کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم پہلے سے انہیں تیار کر لیں۔ میں ابھی انہیں بلا کر بتاتی ہوں کہ۔۔۔ ”دروازہ کھلنے نواز سے میوند بھابھی بات ادھوری چھوڑ کر ادھر متوجہ ہو گئیں تب ہی نیل اندر آئے اور کارڈ لیس آسیہ کی بڑھاتے ہوئے بولے۔

”چھو پھو! شاہ جہانگیر آپ سے بات کریں گے۔“

آسیہ نے جھپٹنے کے انداز میں کارڈ لیس لے کر کان سے لگایا تھا۔

”ہیلو!“

”السلام علیکم ڈاکٹر صاحبہ! ایسی ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ آپ سکندر کا پتا میں انہیں ہوش آیا؟“ وہ کسی طرح اپنی بے تالی چھپا نہیں سکی۔

”آپ کو بلانے کے لیے اس کا ہوش میں آنا شرط تو نہیں ہے۔ آئی مین وہ بے ہوشی میں بھی آپ ہی کو پکار رہا ہے۔“ شاہ جہانگیر نے کہا تو وہ کچھ بوکھلا کر میوند بھابھی کو دیکھنے لگی تھی۔

”نیلو ڈاکٹر صاحبہ!“ دوسرے شاہ جہانگیر نے پکارا تب وہ سنبھل کر بولی۔

”جی فرمائیے!“

”آپ آجائیں پلیز! اپنے مریض کے پاس۔“ شاہ جہانگیر نے ہاتھ لے کر کہا۔

”میں۔۔۔“ وہ کہنے جاری تھی کہ میں آ رہی ہوں، لیکن اچانک بابا جان کا خیال آئے پر ہونٹ بھیج گئی جبکہ بن منتظر تھیں اور اس بار اس کی سماعتوں سے جو آواز نکلا وہ شاہ جہانگیر کی نہیں تھی۔

”ہمارے سکندر کی ہر سانس تمہیں پکار رہی ہے۔ آس تمہی ہوتاں۔“

”کن؟“ وہ بوڑھی کمزور آواز اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں اچھٹی۔

”ہم شاہ حیات محمد۔“ بابا جان جو ہمیشہ اپنا نام بتاتے ہوئے فخر سے گردن اکر لیا کرتے تھے اس وقت ان کا بھرانہ سالنڈا تھا۔
آسیہ کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہے کیا کرے۔ خود کو بے بس ہی محسوس کر رہی تھی بڑی مشکل سے خود کو سہارا دے کر بولی۔

”جی شاہ صاحب! کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟“
”ہم کیا چاہیں گے وہ جو چاہئے والا ہے وہ تمہیں پکار رہا ہے۔ اس کی پکار پر آؤ گی یا ہم فریاد کریں؟“
”جی نہیں آپ کو فریاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آ رہی ہوں۔“ اس نے جلدی سے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا اور کارڈ ایس ایک طرف رکھ کر آنکھوں میں اتر آنے والی نمی آنکھوں سے صاف کرنے لگی۔
”کیا کہہ رہے تھے جہانگیر۔ ہوش آگیا سکندر کو؟“ میمونہ بھابھی نے اس کی کلائی تھام کر پوچھا۔
”جی نہیں بھابھی! کچھ بتایا نہیں انہوں نے۔ میں سسہ میں جا رہی ہوں، نیل، مدحو اور صبا بلاؤ انہیں بھی لے چلیں گے۔“ وہ میمونہ بھابھی سے نظریں چرا کر بولتی ہوئی بیڈ سے اتر گئی۔
”انہیں کیوں لے جاؤ گی؟“ میمونہ بھابھی نے ٹوکا۔
آسیہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور نیل کو اشارہ کر کے ڈرننگ روم میں چلی گئی تھی۔
تقریباً پندرہ منٹ بعد جب وہ نیل کے ساتھ گاڑی میں آکر بیٹھی تو صبا صحت اور مدحیہ نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

”کیا ہوا ہے بابا کو؟“
”کہاں ہیں وہ اس وقت؟“
”آپ کو کس نے بتایا؟“
”تم دونوں اگر اس طرح کرو گی تو ہمیں اتار دیوں گا۔“ نیل کی تنبیہ پر دونوں ایک دم خاموش ہو گئیں تو قدرے توقف سے آسیہ گردن پیچھے موڑ کر انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔
”بیٹا! صبر اور حوصلے سے کام لو۔ تمہارے پیپا کارڈز میں ہیں اور وہاں ان کے پاس تمہارے دادا اور چچا بھی آئے ہوئے ہیں انہوں نے ہی ہمیں بلایا ہے۔“
”دادا! یعنی بابا جان؟“ صبا صحت نے خفیف نظروں سے مدحیہ کو دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا پھر آسیہ سے پوچھنے لگی۔

”ممما! کیا کوئی ایک ہوا ہے؟“
”ہاں۔“ آسیہ نے اختصار سے کام لے کر اپنا رخ سیدھا کر لیا اور کچھ دیر آگے بھاگتی ہوئی گاڑیوں کو دیکھتی رہی۔ پھر بیک سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ذہن کے پردوں پر کچھ جانے، کچھ انجانے نقش ابھرنے لگے۔
”بیٹا! اس وقت تمہیں صرف اپنے پیپا کا خیال کرنا ہے! منڈرا شینڈ۔“
”جی ممما! مدحیہ اثبات میں سر ہل کر سامنے دیکھنے لگی۔
بابا جان شاہ جہانگیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بہت ست روی سے اسی طرف آرہے تھے۔
”ممدو! مدحیہ! بابا جان آرہے ہیں۔“ مدحیہ نے دھیمی آواز میں آسیہ کو متوجہ کر کے کہا۔
”ہاں! جہاں ملوان سے۔“ صبا کو بھی لے جاؤ۔“ وہ ان دونوں کو بھیج کر نیل کو بھیج پر بیٹھے کا اشارہ کرتی ہوئی دیر سے پلیٹ کر ڈاکٹر اکرام اللہ کے کمرے میں آ گئی۔

”اسلام علیکم! ڈاکٹر صاحب! میں ڈاکٹر آسیہ صلاح الدین۔“
”جی جی۔ میں نے کل رات ہی آپ کو پہچان لیا تھا۔ آپ ڈاکٹر عبدالوہاب۔ کے پاس پیشل میں ہوتی ہیں۔“
”آپ کی یادداشت کی داد دینی پڑے گی ڈاکٹر صاحب! کیونکہ یہ بہت پرانی بات ہے تقریباً پندرہ سال پرانی۔“

س نے کہا تو ڈاکٹر اکرام اللہ حیرت سے بولے۔
”واقعی۔“

”جی۔“
”اور اب آپ کہاں ہوتی ہیں؟“

”میں کلینک میں اور اس وقت میں اپنے عزیز شاہ سکندر حیات کو دیکھنے آئی ہوں۔“ اس نے رسمی گفتگو مختصر کر کے اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا۔

”ہاں رات آپ شاہ سکندر کے ساتھ آئی تھیں۔ وہ آپ کے عزیز ہیں؟“
”جی۔ اب کیسے ہیں وہ؟“

”بہتر تو نہیں کہہ سکتا بہر حال خطرے سے باہر ہیں۔“ ڈاکٹر اکرام اللہ اٹھتے ہوئے بولے۔

”تھینک گاڈ! وہ ان کے ساتھ باہر آئی اور پھر آئی سی یو کی طرف جاتے ہوئے اس نے قصداً ”اس طرف نہیں یکھا جہاں بابا جان اس کی بیٹیوں کے ساتھ بیٹھے تھے جبکہ ان کی نظریں اسی پر تھیں اور وہ محسوس بھی کر رہی تھی ہر بھی انہیں دیکھنے بغیر نکل آئی۔“

شاہ سکندر کے چہرے پر آکسیجن ماسک فٹ تھا۔ سانسوں کے ساتھ ان کی ہند پلکیں بہت دھیرے دھیرے رکت کر رہی تھیں۔

وہ ان کے پیروں کے پاس رک گئی اور ایک ٹک انہیں دیکھتے ہوئے بالکل غیر ارادی طور پر اس نے اپنا ہاتھ ان کے پیروں پر رکھ کر ٹپکے سے دیا یا تھا کہ ان کی سانسوں میں ایسی اس کے نام کی ممک نے سارے میں پھیل چکی تھی۔
”آس۔ آس۔“

اس کے احساسات پر نرم نرم بھوار پڑنے لگی تھی۔
انسان فانی ہے روح کو فنا نہیں اور جو روح میں بس جائے اس کے لیے کوئی دروازہ بند نہیں ہوتا۔
زندگی کے ساتھ وقت خواہ کتنی آنکھ پھولی پھیل لے روح کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔
یہی کہا تھا ناں میں نے۔ یہی سچ ہے اب وقت ہمارا کچھ نہیں باگڑ سکتا۔ ہم اس کی آنکھ پھولی سے بہت آگے نکل آئے ہیں جہاں دنیاوی بندھن کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

اے میری روح کے امین۔ اس نے ایک بار پھر ان کا پاؤں دیا یا تھا۔
شاہ سکندر کی آنکھیں ذرا سی کھلیں اور پھر نظریں اس وفا کی دیواری پر جم گئیں۔
کتنے لمحے سرک گئے۔ درمیان میں کوئی پردہ حائل نہیں تھا۔ جانے کون سی دنیا کے درواہ پر ہے تھے۔
”آس! آس! بار شاہ سکندر کی آواز داغ تھی۔

وہ چونکنے کے ساتھ جیسے ہوش میں آ گئی۔ تب ہی اپنے سر پر ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔
”کون؟“ اس نے ذرا سی گردن موڑی اور اپنے ساتھ بابا جان کو کھڑے دیکھ کر سن سی ہو گئی۔
بابا جان نے آہستہ سے اس کا سر تھپکا پھر شاہ سکندر کو آنکھیں بند کرتے دیکھ کر عاجزی سے بولے تھے۔
”ہم سے رو نہ مومت سکندر! ہم تمہاری خوشی پوری کرنے آئے ہیں۔ تمہاری بیٹی کو بہت شان سے رخصت کرا کے لے جائیں گے۔ سن رہے ہو ناں۔“ شاہ سکندر سب سن رہے تھے لیکن انہوں نے آنکھیں نہیں کھولیں کیونکہ بند پلکوں کے اندر آنے والے دنوں کا بڑا حسین تصور تھا۔ جس کی دلکشی ان کے چہرے کا احاطہ کر رہی تھی۔

♥ ♥ ♥ ♥
”نیل بھائی! آپ کو مہملا رہی ہیں۔“ صبا صحت نے نیل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔
”کہاں ہیں پھپھو۔“ نیل اٹھ کھڑے ہوئے۔
”اپنے کمرے میں۔“

”چلو۔“

”مجھے نہیں آپ کو لایا ہے، آپ جائیں۔“ وہ کتابوں کے ریک کی طرف بڑھتی ہوئی ہوئی۔
”اچھا دیکھو ابھی یہاں سے کوئی کتاب مت اٹھانا۔“ نیل اسے تنبیہ کرتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل کر آسیر کے کمرے میں آگئے۔
”جی سچو۔“

آسیر جانے کس خیال میں تھی چونک کر انہیں دیکھا پھر اپنے برابر اشارہ کرتی ہوئی ہوئی۔

”آؤ بیٹا بیٹھو۔ کوئی ضروری کام تو نہیں کر رہے تھے؟“

”نہیں بھوپھو۔“ نیل بیٹھ گئے۔ ”آپ کو کوئی کام ہے تو بتائیں۔“

”کام تو نہیں ہے البتہ ضروری بات کرنی ہے۔“

”جی۔“ نیل پوری طرح متوجہ ہو گئے تو کچھ دیر رک کر وہ کہنے لگی۔

”یہ اس روز کی بات ہے جس دن شاہ سکندر کو بارٹ انیک ہوا تھا۔ اس وقت وہ میرے پاس آئے تھے۔ مدحہ کار پوزل لے کر شاہ تیور غالباً ان کا ہتھیار ہے لیکن میں نے انہیں منع کر دیا تھا کیونکہ میں جانتی تھی کہ تم مدحہ کو پسند کرتے ہو۔“

نیل کے ہونٹوں پر میسم سی مسکراہٹ نے چھب دکھائی تھی جس سے آسیر مطمئن ہو کر ہوئی۔

”تم پر کوئی زبردستی نہیں ہے بیٹا اور نہ ہی تم اسے میری خواہش سمجھ کر پوری کرنے کی سوچنا۔ تم صرف اپنا سوچو۔“

”آپ نے مدحہ سے پوچھا ہے وہ کیا چاہتی ہے۔“ نیل نے اس کی یہ بات آن سنی کرتے ہوئے پوچھا تو وہ بے اختیار ہوئی تھی۔

”وہ تمہیں چاہتی ہے۔“ پھر فوراً ہی احساس بھی ہو گیا تو بات بتاتے ہوئے ہوئی۔ ”میرا مطلب ہے میں نے اس سے نہیں پوچھا اور نہ پوچھوں گی کیونکہ وہ اپنے بارے میں بہتر فیصلہ نہیں کر سکتی ہے مجھے یقین ہے کہ وہ میرے فیصلے سے اختلاف بھی نہیں کرے گی۔“

”پھر بھی پوچھو! آپ اس سے پوچھ لیں۔“ نیل نے کسی خیال کے تحت کہا۔

”یہ کام تم خود کرو! اس کے بعد خود تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔“ آسیر نے بڑے آرام سے خود کو بری

”فیصلہ تو ہو چکا۔“ نیل نے سوچا پھر آسیر کی اجازت لے کر اپنے کمرے میں آئے تو صباحت کو خونخوار نظروں سے گھورنے لگے۔

”کیا ہوا ہے نیل بھائی؟“ صباحت واقعی ڈر گئی۔

”پھوپھو کو تم نے بتایا ہے؟“ انہوں نے ایسے ہی خونخوار لہجے میں پوچھا۔

”نہیں کیا؟“

”کہ میں مدحو کو پسند کرتا ہوں۔“

”نہیں ایمان سے میں نے نہیں۔“ وہ اپنی صفائی میں بولتی ہوئی ایک دم خاموش ہو کر ان کی بات پر غور کرنے لگی پھر چیخ پڑی۔

”ہائے نیل بھائی! ماما کو پتا چل گیا۔ سچ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ اب آپ اور مدحو بھی کچھ نہیں کر سکتی۔ بہت

ایک دوسرے سے چھپا لیا آپ دونوں نے لیکن ممدادی گریٹ۔“

”شٹ اپ!“ نیل نے اسے خاموش کرانے کی کوشش کی۔

”کوئی شٹ اپ نہایت نہیں۔“ وہ انہیں چڑائی ہوئی بھاگ گئی۔

”نیل بھائی۔“ صباحت پھر دروازے میں آکھڑی ہوئی۔

”ماما کہہ رہی ہیں مجھے باپسل لے جائیں باپا کے پاس۔“

”کیوں وہاں مدحو ہے تو۔“

”مدحو ہے تو کیا مطلب۔ مجھے نہیں جانا چاہئے اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے، مجھے بابا جان نے بلایا ہے ابھی ماما کے پاس ان کا فون آیا تھا۔“ وہ تفصیل بتانے لکھڑی ہو گئی۔

”اچھا چلو تم میں آ رہا ہوں۔“ وہ اسے ٹوک کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

کچھ دیر بعد جب وہ صباحت کے ساتھ شاہ سکندر کے پاس پہنچے تو انہیں کمرے میں مدحہ نظر نہیں آئی جبکہ تمام راستے وہ اس کے بارے میں سوچتے آئے تھے تب ہی کچھ بے چین سے ہو گئے اور شاہ سکندر سے معافیہ کرتے ہوئے بے اختیار ان سے پوچھ لیا۔

”مدحہ کہاں ہے؟“

”مدحہ ابھی تو نہیں تھی۔“ شاہ سکندر نے بابا جان کو دیکھا۔

”کون مدحہ وہ مہر النساء کے ساتھ نیچے اسٹور تک گئی ہے ابھی آتی ہوگی، تم بیٹھو بر خودار! بابا جان نے ان کے لیے اپنے برابر جگہ بنائی تو بیٹھتے ہوئے ان کی نظر صباحت پر پڑی جو انہیں دیکھ کر شرارت سے مسکرا رہی تھی۔

”مان سینس۔“ وہ اسے گھور کر فوراً ”شاہ سکندر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”اب کیسی طبیعت ہے انکل آپ کی؟“

”پہلے سے بہتر۔“ شاہ سکندر نے مسکرا کر کتابت ہی مدحہ آگئی اس کے پیچھے مہر النساء تھی جسے دیکھ کر نیل اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر ہوئے۔

”سلام علیکم۔“

مہر النساء جواب دینے کے بجائے شاہ سکندر کو دیکھنے لگی تو ان سے پہلے صباحت بول پڑی۔

”یہ نیل بھائی ہیں! ہماری سب سے بڑے ماموں کے سب سے بڑے بیٹے۔“

”اچھا اچھا علیکم السلام۔“ مہر النساء نے اب جواب دیا تو مدحہ بے ساختہ ہنسی پھر فوراً ”ہونٹوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

”بس چلتا ہوں، صبا کو چھوڑنے آیا تھا اور ہاں مدحو تم جلا میرے ساتھ۔“ انہوں نے آخر میں ایک دم مدحہ کو مخاطب کر کے کہا تو صباحت نے بھی فوراً ”ان کی تائیدی کی۔

”ہاں مدحو! تم جاؤ نیل بھائی کے ساتھ یا پاپا کے پاس اب میں رہوں گی۔“

”نہیں نہیں۔“ مدحہ نے اسی قدر کہا تھا کہ بابا جان ہاتھ اٹھا کر بولے۔

”باری باری ادھر الماس آنے کو تیار ہے۔ ویسے اب تین چار دنوں کی بات ہے پھر انشاء اللہ سکندر گھر جائے گا تو سب مل کر اس کی سیوا کر لیتا۔ کیوں سکندر؟“

”جی!“ شاہ سکندر اثبات میں سر ہلا کر مدحہ اور نیل کو دیکھنے لگے۔ اچانک انہیں آسیر کی بات یاد آئی تھی، جب ہی کچھ کھو سے گئے تھے۔

”اوکے انکل!“ نیل مصلحہ کے لیے شاہ سکندر کی طرف ہاتھ بڑھا کر پوچھنے لگے۔

”آپ کی اجازت ہے مدحہ کو لے جاؤں۔“

”ہاں ضرور۔“ شاہ سکندر نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

”تھنک یوس۔“ نیل نے ان کا شکریہ ادا کر کے بابا جان سے معافیہ لیا پھر مدحہ کو ساتھ آئے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئے۔

راہداری میں انہوں نے اپنے قدموں کی رفتار آہستہ کر لی تھی پھر بھی اختتام تک پہنچ گئے تھے تب مدحہ آتی ہوئی نظر آئی تو انہوں نے رک کر اس کا انتظار کیا پھر اسے ساتھ لے کر باہر آئے تھے۔

”تین چار دن کی تو بات تھی، میں رہ جاتی یا پاپا کے پاس۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہی مدحہ نے انہیں سنا کر کہا۔

انہوں نے اس کی بات پر کوئی بصرہ نہیں کیا خاموشی سے گاڑی اشارت کر کے آگے بڑھا دی تو وہ سامنے سے کیسٹ اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی پھر اسے رکھ کر سرائیکسٹ اٹھایا پھر تیسرا آخر میں مایوس سی ہو کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی تھی۔
 نیپیل وقفہ وقفہ سے مر میں اس پر نظر ڈال رہے تھے اس کے رخ موڑنے پر انہوں نے ایک کیسٹ لگا کر آن کر دیا۔

دل نے یہ کہا ہے دل سے
 محبت ہو گئی ہے تم سے

میری جان میرے دلبر میرا اعتبار کر لو
 بے تنابے قرار ہوں میں، خود کو بے قرار کر لو

نیپیل نے تو بونٹی ایک کیسٹ اٹھا کر لگا دیا تھا اب یہ اتفاق تھا کہ گانے کے بول ان کے جذبوں سے ہم آہنگ بلکہ ترجمانی بھی کر رہے تھے۔ اور یہ حسین اتفاق انہیں بڑا بھلا لگ رہا تھا، جب ہی ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ اس موڈ میں نہیں تھے بلکہ کچھ اور ہی سوچے بیٹھے تھے۔
 اب یہ نیپیل بھائی کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے اپنی شور مچاتی دھڑکنوں سے پریشان ہو کر سوچا۔ پھر بہت ہمت کر کے اپنا رخ سیدھا کیا اور کیسٹ آف کر دیا تو ایک دم خاموشی چھا جانے پر نیپیل نے گردن موڑ کر اسے دیکھا لیکن بولے کچھ نہیں۔

اور دوبارہ ونڈا سکرین پر نظریں جمادیں۔

کچھ راہ تیر خاموشی میں کٹ گیا پھر باہر دیکھتے ہوئے وہ چونک کر پوچھنے لگی۔

”یہ آپ کس طرف جا رہے ہیں؟“

نیپیل پتا نہیں کیوں خاموش تھے۔

”نیپیل بھائی! وہ ان کا بازو ہلانے لگی، کہاں جا رہے ہیں؟“

”گھر۔۔۔ گھر۔۔۔ پر۔۔۔ گھر۔۔۔“ عجیب جواب تھا وہ اب بچہ نہ تھی۔

”کیا مطلب؟“

”کتنے حصوں میں بنا ہوا ہوں میں، پتا نہیں میری جڑیں کہاں ہیں، کہیں بھی مضبوطی سے قدم جما کر کھڑا نہیں ہو سکتا۔“ نیپیل بولنا شروع ہوئے تھے کہ خاموش ہونے کے ساتھ ہی گاڑی بھی روک دی۔ تو وہ گھر دیکھ کر بولی۔

”ارے یہ تو بڑے ماموں کا گھر ہے۔“

”ہاں میرے باپ کا گھر، اسے میں اپنا گھر نہیں کہتا، جیسے تم اپنے باپ کے گھر کو اپنا گھر نہیں کہتیں، یہ ایک قدر مشترک ہے ہم میں۔“ نیپیل نے کہہ کر ایک نظر اسے دیکھا پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔

وہ ان کی بات میں الجھ گئی تھی، جب ہی ٹوکا نہیں کہ وہ باہر ہی سے کیوں جا رہے ہیں اور ابھی وہ ٹھیک سے کچھ نہیں پاتی تھی کہ پھر گاڑی رک گئی۔ اس بار سامنے عالی شان گھر تھا۔

”یہ۔۔۔؟ اس کی الجھن مزید بڑھ گئی۔

”یہ میری ماں کا گھر ہے، چلو تمہیں ان سے ملواؤں۔“ نیپیل کہتے ہوئے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئے۔ پھر نیپیل کا ہنسنے پیش کرتے ہوئے انہوں نے اسے دیکھا وہ خاصی حیران اور پریشان سی آ رہی تھی۔

”ارے تم تو یوں حیران پریشان ہو جیسے۔“

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ غوراً بولی۔

”بے وقوف۔۔۔“ وہ مسکرائے اور گیٹ کھلنے پر اس کا ہاتھ تھام کر اندر لے آئے۔

”سنی۔۔۔!“ لاؤنج میں رک کر انہوں نے پکارنا شروع کر دیا۔ ”رونا جی! کہاں ہیں آپ۔“
 ”نیپیل بھائی! می! نیپیل بھائی آئے ہیں۔“ سامنے کے دروازے سے ایک لڑکی بھاگتی چلائی، بولی آر نیپیل سے مل گئی پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگی۔
 ”یہ کون ہے نیپیل بھائی؟“

”مدحہ میری پھوپھو کی بیٹی اور مدحہ میری بہن رونا ہے۔“ انہوں نے تعارف کرایا۔

”ہاؤ سوئیٹ، گلنڈ ٹو میٹ یو۔“ رونا کا حلیہ سی نہیں لہجہ بھی انگریزی تھا۔

”ٹھیک یو۔“ وہ کچھ خائف سی، دو لڑکی تھیں جب ہی تو ہاتھ ملا کر پیچھے ہٹ گئی تب ہی نیپیل ایک کمرے سے نکلتی آئی بولیں۔

”نیپیل! کیسے، ویٹا! اتنے دنوں بعد آئے کیسے باہر چلے گئے تھے کیا؟“

”نہیں می! بیٹیل تھا، آپ کیسی ہیں؟“

”بالکل ٹھیک یہ لڑکی؟“ نیپیل اسے دیکھ کر بولیں۔

”مدحہ ہے می! پھوپھو کی بیٹی۔“

”اسی کی، ارے یہاں آؤ بیٹی میرے پاس۔“ نیپیل نے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگایا پھر اپنے ساتھ لے کر بیٹ تو پوچھنے لگیں۔

”تمہاری ماں کیسی ہے؟“

”جی ٹھیک ہیں۔“

”ارے۔۔۔!“ نیپیل اس کی منمناتی آواز پر زور سے ہنسیں۔ ”تم تو بالکل اپنی ماں جیسی ہو۔ ڈرپوک، بزدل۔“

”کیا؟“ نیپیل الجھ پڑے۔ ”پھوپھو ڈرپوک بزدل نہیں ہیں می۔“

”تمہیں کیا پتا، اس عمر میں ایسی ہی ہوتی تھی۔ اپنے بھائیوں کے سامنے جائز بات بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔“

”لیکن یہ تو کسی سے نہیں ڈرتی می! بلکہ سب اس سے ڈرتے ہیں۔“ نیپیل نے شرارت سے اسے دیکھا۔

وہ رونا جی ہو کر اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگی تھی۔ تب نیپیل کو اس پر رحم آگیا، موضوع بدل گئے۔

”کسی نظر نہیں آ رہا می۔“

”وہ اپنے ماں کے ساتھ اٹلی گیا ہے۔“

”تم نہیں جانتیں۔“ نیپیل نے رونا سے پوچھا تو وہ ترش کر بولی۔

”جہاں سنی جائے گا وہاں میں بھی نہیں جاؤں گی۔“

”اؤں، وں، تمہیں سنی کے ساتھ خند نہیں اٹلی چاہیے، چھوٹا بڑا وہ تم سے۔“ نیپیل نے نرمی سے ٹوکا۔

”یہ بات آپ اسے سمجھائیں۔“

”اوکے بابا اوکے! اسے بھی بتا دوں گا۔“ نیپیل کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اچھا می! اجازت دیجئے۔“

”ارے ابھی تو آئے ہو، بیٹھو میں کھانا کھاؤ،“ وں۔“

”کھانا پھر سی ابھی نہیں آگے جانا ہے۔“ نیپیل نے سہولت سے کھانے کو منع کر دیا اور آگے بڑھا۔
 اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھنا چاہتے تھے کہ وہ خود ہی کھڑی ہو گئی۔

”اچھا بیٹی! اپنی ماں کو میرا سلام کہنا اور تم پھر ضرور آنا۔“ نیپیل نے اس کے گلے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”جی۔۔۔“ وہ رونا سے ہاتھ ملا کر جلدی سے باہر نکل گئی۔ وں اس کے پیچھے دیکھتے ہوئے نیپیل کہہ گئے۔

”می! آپ پوچھتی تھیں تاکہ میں اس سے شادی کروں، تو اب آپ اسے دیکھ لیا۔ اچھی بات ہے۔“

”بہت اچھی۔“ نیپیل نے پہلے رو رو کر بولی۔ ”میں بھی تو اس کی آپ کی شادی میں۔“

”ہاں! رات ڈھل گئی۔“ بابا جان نے اباجی کو گھٹے وقت سے نکال کر آنے والے روشن دنوں کی نوید دے کر بٹھایا پھر کہنے لگے۔

”ہم کبھی گئے وقت کا کلام نہیں کرتے۔ ہماری نظرس ہمیشہ آنے والے وقت پر رہتی ہیں۔“

”اچھی بات ہے۔ جو دسترس سے نکل گیا اس کا کلام کیسا۔“ اباجی کی تائید دیکھ بھری تھی۔

آسیہ نے ذرا سی پلٹیں اٹھا کر اباجی کو دیکھا تھا پھر بابا جان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ”پوچھ رہے تھے۔“

”پھر آپ نے کیا طے کیا۔ دونوں بچوں کی شادی ایک ساتھ کریں گے؟“

”ہی ہاں نہیں یہی چاہتی ہوں“ آگے آپ کی مرضی۔“

”ہماری کیا مرضی، ہم تو ایک عرض لے کر آئے ہیں۔“ بابا جان نے کہا تو اباجی فوراً ”بولے۔“

”جی فرمائیے۔“

”دونوں بچوں کی شادی ایک ساتھ ٹھیک ہے لیکن ہماری خواہش ہے کہ مدیہ ہمارے گھر سے رخصت ہو۔“

یعنی شاہ پور سے، ہم وہاں سے علی کی بارات لے کر آئیں گے اور صابحت رخصت ہو کر وہیں شاہ پور جائے گی پھر اگلے روز ویسے کی تقریب کے ساتھ ہم مدیہ کی رخصتی رکھیں گے۔“ بابا جان اپنا پروگرام بتا کر سب کو یکنیتے لگے۔

”فورا“ کسی نے جواب نہیں دیا۔ یوں بھی گفتگو صرف بابا جان اور اباجی کے درمیان ہو رہی تھی۔ اس لیے سب اباجی کو دیکھنے لگے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے تھے۔

”ہوں اچھی بات ہے ایک بیٹی ماں کے گھر سے رخصت ہوگی تو ایک باپ کے گھر سے۔“

”واو کیا پروگرام طے کیا ہے۔“ میوندہ بھابھی نے آسیہ کو کہنی مار کر سرگوشی میں کہا پھر اٹھ کر مٹھائی لینے چلی گئیں۔

پچھ دیر بعد میوندہ بھابھی واپس آئیں تو مٹھائی کے ساتھ مبارک سامت کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ پھر بابا جان نے اسی وقت مدیہ کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی تو آسیہ کے اشارے پر میوندہ بھابھی اتار تیار کرنے کے لیے اوپر آگئیں۔

”صابینا! جلدی سے ایک بیگ میں مدحو کے کچھ کپڑے رکھ دو۔“ میوندہ بھابھی نے ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا تو وہ حیران ہو کر بولیں۔

”کیوں مای! مدحو کہاں جا رہی ہے؟“

”شاہ پور اپنے بابا جان کے ساتھ۔“

”کیوں مای! میں نہیں جا رہی۔“ اس نے احتجاج کیا تو میوندہ بھابھی آگے جا کر اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولیں۔

”بیٹا! کچھ دنوں کی بات ہے پھر ہم تمہیں رخصت کرا کے ہمیں لے آئیں گے۔“

”بولیں۔“ صابحت سمجھ کر خوشگوار حیرت میں گھر گئی۔

”کیا کہہ رہی ہیں مای؟“ مدیہ کچھ بھی کچھ نہیں۔

”صابینا! جلدی کرو وہ لوگ جانے کو تیار ہیں۔“ میوندہ بھابھی اس کا گال تھپک کر صابحت سے کہتی ہوئی چلی گئیں۔

”بے وقوف تمہاری شادی طے ہو گئی ہے نیل بھائی کے ساتھ۔“ عمر جانے کب سے دروازے میں کھڑا تھا۔

مدحو کی ہونٹ شکل دیکھ کر چلایا ”پھر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔“

”ہائے بے چارے نیل بھائی! ان کی ساری زندگی تمہیں درازا سی بات کا مطلب سمجھانے گزر جائے گی۔“

”خیر! راتو آگے ایک لحظہ کہا تو رات میں ابھی نیل بھائی۔“

”کتاب ہے تم آؤ! توشا، بی بی کی ایسے ہے وہ مٹی ہے۔“

”بولے۔“ نیل جانے جس سوچ میں تھیں اپنے آپ کی بات میں سر جھپٹے تھیں۔

”اوکے ٹھیک۔“ انہیں نے متوجہ ہو کر دیکھا تو وہ بولیں۔

”اچھا بیٹا! میں تمہاری بہن چھو کو فون کروں گی مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی بیٹی بہت اچھی لگی۔“

”تھک گئی۔“ انہیں مسکراتے ہوئے انداز نظر دیکھ کر بابا جان نے کہہ دیا کہ وہ فون میں بیٹھ چکی تھی۔

”تھک رہی ہیں نا۔“ انہیں فون کی اشارت کرنے کے ساتھ مخاطب بنے بغیر کہنے لگے۔

”یہاں میں! اشارتوں سے نہ سمجھتی ہوں۔“ انہیں بی بی کی محبت نے جتنی باپ سے۔ اور اسے میں اپنی بہن نہیں جانتی تھی۔

پھر پچھلے دنوں کی غلطیوں میں ہی پچھلے دنوں کے غلطیوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں پکڑ لی۔

”جگہ جگہ کروں تو اس سے ہی پچھلے دنوں کے غلطیوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں پکڑ لی۔“

”جگہ جگہ کروں تو اس سے ہی پچھلے دنوں کے غلطیوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں پکڑ لی۔“

”جگہ جگہ کروں تو اس سے ہی پچھلے دنوں کے غلطیوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں پکڑ لی۔“

”جگہ جگہ کروں تو اس سے ہی پچھلے دنوں کے غلطیوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں پکڑ لی۔“

”جگہ جگہ کروں تو اس سے ہی پچھلے دنوں کے غلطیوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں پکڑ لی۔“

”جگہ جگہ کروں تو اس سے ہی پچھلے دنوں کے غلطیوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں پکڑ لی۔“

”جگہ جگہ کروں تو اس سے ہی پچھلے دنوں کے غلطیوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں پکڑ لی۔“

”جگہ جگہ کروں تو اس سے ہی پچھلے دنوں کے غلطیوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں پکڑ لی۔“

”جگہ جگہ کروں تو اس سے ہی پچھلے دنوں کے غلطیوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں پکڑ لی۔“

”جگہ جگہ کروں تو اس سے ہی پچھلے دنوں کے غلطیوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں پکڑ لی۔“

”جگہ جگہ کروں تو اس سے ہی پچھلے دنوں کے غلطیوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں پکڑ لی۔“

”جگہ جگہ کروں تو اس سے ہی پچھلے دنوں کے غلطیوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں پکڑ لی۔“

”جگہ جگہ کروں تو اس سے ہی پچھلے دنوں کے غلطیوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں پکڑ لی۔“

”جگہ جگہ کروں تو اس سے ہی پچھلے دنوں کے غلطیوں کے ساتھ مجھے بھی اپنی آغوش میں پکڑ لی۔“

”ارے ارے۔۔۔!“ عمر نے فوراً ”ٹوکا“ بھائی مت کہہ دینا نکاح ٹوٹ جائے گا۔“
 ”کہوں گی ایک بار نہیں سو بار کہوں گی۔“ نبیل۔۔۔“ بے ساختہ بولتے ہوئے اس کی زبان تالو سے چپک
 گئی۔
 ”ہاں ہاں بولو آگے بولو۔“ عمر اکسانے لگا۔
 ”تمہارا سہ۔“ اس نے تکیہ اٹھا کر عمر کے سر پر دے مارا تو وہ زور زور سے ہنسنے لگا ”تب ہی تو یہ بھائی
 آگئی۔“
 ”چلو ہمیں مدح و سبائے سب بار ہے ہیں۔“

”مجھے بھی۔“ صحبت نے اپنی طرف اشارہ کیا۔
 ”کیوں تمہارا پردہ ہے سب سے؟“ عمر نے کہا تو وہ اسے دھکیل کر سب سے آگے چل پڑی لیکن ڈرائنگ
 میں داخل ہونے کی ہمت نہیں ہوئی وہیں رک کر انتظار کیا پھر مدحیہ اور عمر کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھی۔
 ”آؤ بیٹا!“ آسیہ اور شاہ سکندر بیٹیوں کو دیکھ کر ایک ساتھ اپنی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے نئے اور دونوں ہی
 ہاتھ ان کی طرف برصائے تھے بالکل بے اختیاری حرکات تھیں جس نے سب کو اپنی اپنی جگہ جیسے ساکت کر
 دیا تھا۔

مدحیہ اور صحبت نے بہت خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر مدحیہ چلتی، دوئیں صبا
 آسیہ اور مدحیہ شاہ سکندر کے پاس میں رکی تو ساکت و دوریکدم متحرک ہو گئے تھے۔
 ”چلو بیٹا۔“

”اجازت دیجئے۔“
 ”انشاء اللہ جلد ملیں گے۔“ مختلف آوازیں گونج رہی تھیں ساتھ گنگے مل رہے تھے اور ان گنگے ملنے لوگوں
 درمیان وہ ندی کے دو کنارے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ان کے اندر اب گئے وقتوں کا مال نہیں
 تھا بلکہ آئے وقتوں کا حسین تصور جہاں ان کی اولاد کی خوشیاں رقص کر رہی تھیں۔ جن کی دھمک انہیں اب
 سے اپنے دل پر محسوس ہو رہی تھی۔

اور وہ دل جس میں محبت گھر کرے وہ پھولوں کی ہستی اجاڑنے والے اسے خواہ کتنا ہی اجاڑ لیس وہ سدا مسک
 رہتی ہے۔
 ”کیا ٹک۔۔۔“
 ”محبت کبھی فنا نہیں ہوتی۔“

